مختصر تاریخ ہند

ڈبلیو - ایچ - مورلینڈ اور اے - سی - چٹرجی کی انگریزی
کتاب " اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا " کا اردو ترجمہ

از

محمد یوسف کوکن - ایم - اے
جونیر لکچرر اردو ، مدراس یونیورسٹی

مدراس یونیورسٹی

سنہ ۱۹۵۲ عیسوی

یہ کتاب نوری پریس لمیٹڈ
۲۲ [illegible] روڈ رائیپورم
مدراس میں چھپی
۱۹۵۲

تعارف

از

افضل العلماء الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری ۔
ایم ۔اے ۔ ال ۔ ٹی ' پروفیسر تاریخ اسلام '
پریسیڈنسی کالج ' مدراس ۔

مدراس یونیورسٹی اپنے مختلف شعبہائے تحقیق کے نتائج کو شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ہر سال تامل ' تلگو ' کنری ' ملیالم ' اردو اور ہندی زبانوں میں جدید اور سائنٹفک علوم و فنون پر انعامی کتابیں لکھواتی ہے اور ان کو اپنے خرچ سے چھپواتی ہے ۔ تاکہ ان مذکورۂ بالا زبانوں کے ادب کو ترقی ہو اور وہ لوگ بھی جدید علوم و فنون سے فائدہ اٹھا سکیں جو انگریزی زبان سے نا واقف ہیں ۔

یہ انعامی کتابیں دو طرح کی ہوتی ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ یونیورسٹی ایک کارآزمودہ کمیٹی کے مشورے سے کوئی خاص موضوع تجویز کرتی ہے اور ایک میعاد مقرر کرکے اہل قلم کو اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھ کر پیش کرنے کی دعوت دیتی ہے اور پھر کمیٹی کی رائے کے مطابق جس کسی کی تصنیف سب سے بہتر سمجھی جاتی ہے اس کو انعام دیا جاتا ہے اور اس کی تصنیف چھپوادی جاتی ہے ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یونیورسٹی ایک کارآزمودہ کمیٹی کے مشورے سے انگریزی زبان کی کوئی عمدہ کتاب منتخب کرتی ہے اور پھر ادیبوں کو اس کے ایک حصے کا عام فہم ترجمہ پیش کرنے کی دعوت دیتی ہے اور پھر کمیٹی کی رائے کے مطابق جس کسی کا ترجمہ سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے اس سے پوری کتاب کے ترجمے کی درخواست کی جاتی ہے اور پھر اس پورے ترجمے

کی جانچ پڑتال کرائی جاتی ہے اور اگر وہ ترجمہ قابل اشاعت ہو تو مترجم کو اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے اور اس کے ترجمے کو شایع کردیا جاتا ہے -

اس اسکیم کے مطابق یونیورسٹی نے سنہ ۵۰ - ۱۹۴۹ء میں مورلینڈ اور چٹرجی کی تصنیف ' اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا ' ترجمے کے لئے منتخب کی تھی - اردو ترجمے کا نمونہ پیش کرنے والوں میں ہمارے رفیق افضل العلماء مولوی حافظ محمد یوسف صاحب کوکن ایم - اے بھی تھے - کمیٹی نے آپ کا ترجمہ پسند کیا اور آپ سے پوری کتاب کے ترجمے کے لئے کہا گیا اور آپ نے مقررہ مدت کے اندر اس ضخیم کتاب کا آسان اور عام فہم ترجمہ پیش کیا .

کوکن صاحب عربی ، فارسی اور اردو کے فاضل اور سند یافتہ ہیں اور مدراس یونیورسٹی کے ایم - اے ہیں - آپ نے دارالمصنفین ، اعظم گڈھ میں ایک مدت تک تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے فی الحال مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جونیر لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں -

یونیورسٹی کے ایما سے میں نے آپ کے اس پورے ترجمے کا بغور مطالعہ کیا - ترجمے کا کام جس قدر مشکل ہے وہ ارباب علم پر پوشیدہ نہیں ہے - کوکن صاحب نے جس قابلیت اور محنت کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین و مبارکباد ہے - اصل کتاب کے مفہوم کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو قابل مترجم نے واضح نہ کیا ہو - زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے اور یہ ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ وہ بذات خود ایک مستقل تصنیف معلوم ہوتا ہے میں امید کرتا ہوں کہ قارئین کرام اس کو پڑھکر بہت مستفید اور محظوظ ہونگے .

مقدمہ

از

محمد یوسف کوکن مترجم کتاب

' مختصر تاریخ ہند ' ڈبلیو - ایچ مورلینڈ اور سراتل چندر چٹرجی کی قابل قدر تصنیف ' اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا ' کا اردو ترجمہ ہے - مگر یہ ترجمہ لفظ بلفظ یا جملہ بجملہ نہیں کیا گیا ہے - بلکہ مصنفین کے مفہوم کو سہل اور آسان اردو میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے .

مورلینڈ سنہ ۱۸٦۱ء میں پیدا ہوے اور انگلستان میں اعلی تعلیم پائی - سنہ ۱۸۸٦ء میں آئی - سی - ایس کے لئے منتخب ہوے اور صوبہ متحدہ (اتر پردیش) میں اسسٹنٹ کمشنر ' جائنٹ میجسٹریٹ ' میجسٹریٹ اور کلکٹر کی حیثیت سے کام کیا سنہ ۱۸۹۹ء میں ڈائرکٹر آف لینڈ ریکارڈز اینڈ اگریکلچر ہوے اور سنہ ۱۹۱۲ء تک اپنی خدمات انجام دیں - سنہ ۱۹۱۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوے .

ملازمت سے الگ ہونے کے بعد تصنیف و تالیف ہی ان کا خاص مشغلہ رہا اور کئی کتابیں لکھیں جن میں سے ' انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر ' مطبوعہ ۱۹۲۰ء اور ' فرم اکبر ٹو اورنگ زیب ' مطبوعہ سنہ ۱۹۲۳ء بہت مشہور ہیں - انہوں نے ہند کے زرعی اور معاشی نظام کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا - اس سلسلہ میں ان کی کتاب ' دی اگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا ' مطبوعہ سنہ ۱۹۲۹ء خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے انہوں نے سراتل چندر چٹرجی کے ساتھ ملکر ' اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا ' لکھی جو سنہ ۱۹۳٦ء میں شایع ہوی .

مورلینڈ نے شادی نہیں کی اور سنہ ۱۹۳۸ء میں انتقال کیا

اتل چندر چٹرجی سنہ ۱۸۷۴ء میں کلکتہ میں پیدا ہوے یہ رائے صاحب ہیم چندر چٹرجی کے فرزند ہیں - پریسیڈنسی کالج

کلکتہ میں تعلیم پانے کے بعد آپ انگلستان گئے اور وہاں کئی اعلی ڈگریاں لیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں آئی ۔ سی ۔ یس کے کھلے امتحان مقابلہ میں شریک ہوے اور اول درجے میں کامیابی حاصل کی ۔

چٹرجی بھی مورلینڈ کی طرح صوبہ متحدہ میں مختلف سرکاری انتظامی (ایگزیکیٹیو) عہدوں پر مامور رہے۔ صیغۂ مال (ریونیو ڈپارٹمنٹ) میں بھی ایک زمانہ تک کام کیا۔ اس طرح آپ کو انتظامی اور مالی دونوں امور کا تجربہ حاصل ہوا ۔ آپ سنہ ۱۹۲۱ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۲ء تک انڈین لیجسلیٹیو اسمبلی کے رکن رھے ۔ اور وایسرائے کی مجلس عاملہ کے رکن ، انگلستان میں ہند کے ہائی کمشنر اور وزیر ہند کی مجلس کے رکن اور مشیر کی حیثیت سے اپنی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ نے مجلس اقوام کی مختلف کمیٹیوں میں مختلف حیثیتوں سے کام کیا ہے اور لندن ، اٹاوہ اور دیگر بین الاقوامی کانفرنسوں میں حکومت ہند کے نمائندے اور ہندی وفد کے صدر کی حیثیت سے شرکت کی ہے ۔ مختلف کارگزاریوں کی بنا پر آپ کو ملک معظم کی حکومت کی طرف سے کئی خطابات ملے ہیں ۔

چٹرجی نے سنہ ۱۹۰۸ء میں صوبۂ متحدہ کے صنعتی کارخانوں کے متعلق ایک روداد مرتب کی اور سنہ ۱۹۳۷ء میں ' نیو انڈیا ' کے نام سے ایک قابل قدر کتاب شایع کی ۔

مورلینڈ کی وفات کے بعد چٹرجی نے ' اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا ' پر نظر ثانی کی اور آخر میں کئی ابواب اور پھر ایک تتمے کا اضافہ کیا ۔ یہ دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۴۴ء میں نکلا ۔ اس کے بعد یہ کتاب دو مرتبہ یعنی سنہ ۱۹۴۵ء اور سنہ ۱۹۴۷ء میں چھپی ۔ یہ کتاب ایک خاص نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے ۔ اس میں تاریخی واقعات کی بجاے ، جو عام طور پر معلوم ہیں ، باشندگان ہند کے ہر دور کے اہم سیاسی ، اقتصادی اور تمدنی پہلووں کو اجاگر کیا گیا ہے ۔ اس لحاظ سے یہ کتاب واقعی قابل قدر ہے ۔ امید ہے کہ یہ کتاب قدر کی نظر سے دیکھی جائیگی ۔

دیباچۂ طبع دوم

از

اتل چندر چٹرجی

مورلینڈ آنجہانی نے سنہ ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔ اس کی وجہ سے اس کتاب پر نظر ثانی کرنے اور طبع دوم کیلئے اس کو موجودہ دور تک لانے کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوگئی۔

طبع اول میں سنہ ۱۹۱۹ء اور سنہ ۱۹۳۵ء کے دستوری انقلابات کو ایک مختصر اور جامع باب میں قلمبند کیا گیا تھا اور اب کچھ زمانہ گذرنے کے بعد یہ ممکن ہوگیا کہ سنہ ۱۹۱۹ء اور سنہ ۱۹۴۳ء کے درمیان کی ترقیوں کی تفصیلی اور واقعی سرگذشت پیش کی جائے، چنانچہ اس کے متعلق چھ نئے بابوں کا اضافہ کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام پچھلے ابواب پر بغور نظر ثانی کی گئی ہے، مگر ان میں تبدیلیاں کچھ زیادہ نہیں کی گئی ہیں۔ صرف ان چند غلطیوں کی اصلاح کردی گئی ہے جن کی طرف ہمارے ہمدرد نقادوں نے توجہ دلائی تھی، ان میں چند نئی باتوں کا بھی اضافہ کردیا گیا ہے، جو نئی تحقیقات کی بناء پر روشنی میں آئے۔

میں اپنے بہت سے دوستوں کا بیحد ممنون ہوں، مگر میں نے اسی سبب کی بناء پر جس کی تصریح طبع اول کے دیباچہ میں ہوچکی ہے، یہاں ان کے نام نہیں گنائے ہیں۔

جون سنہ ۱۹۴۴ء

کتاب کے آخر میں ایک تتمہ دیا گیا ھے ' جس میں آخری پندرہ مہینوں کے اھم واقعات ھند کی مختصر طور پر توضیح کی گئی ھے .

اے - سی - سی

۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۴۵ء

دیباچۂ طبع اول

از

ڈبلیو - ایچ مورلینڈ اور اے - سی - چٹرجی

ہم نے ہند کی کہانی کو بالکل نئی تحقیقات کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے' اس کی ضخامت متوسط درجہ کی ہے' تاکہ عام قارئین کی دلچسپی اس کے ساتھ قایم رہے۔ ہمارا کام واقعات کو گنانے کی بجائے درحقیقت ان کا انتخاب پیش کرنا ہے' کیونکہ گذشتہ چند برسوں میں تاریخ ہند کی جزئیات کے متعلق اتنی بہت معلومات حاصل ہوگئی ہیں کہ ان سب کا بیان کرنا جو عام طور پر مشہور ہیں ناممکن ہے' ہم نے مجبوراً ان تمام واقعات کو نظر انداز کردیا ہے جو محض ثانوی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم نے اپنی توجہ تمام تر اصل موضوع پر صرف کی ہے' ہمارا اصل مقصد یہ دکھانا ہے کہ ہندی تمدن کو کس طرح تدریجی ترقی ہوی اور غیر ممالک کے ساتھ تعلقات کے قایم ہونے کے بعد اس پر ان کا کیا اثر پڑا۔

یہ ذہن نشین رہے کہ پچھلے ادوار کی طرح آخری دور کیلئے بھی یہی اصول منطبق کیا گیا ہے' ہم نے ہند کے اندر برطانوی حکومت کی برکات کو گنانے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے' ہمارا مقصد زیادہ تریہ دکھانا ہے کہ نئے تاثرات کے مقابلہ میں باشندگان ہند کا کیا طرز عمل رہا' دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ہند کی برطانوی حکومت کی تاریخ لکھنے کی بجاے برطانوی راج کے تحت ہند کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

جگہ کی تنگی تفصیلی حوالوں کے پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتی' ورنہ تاریخی واقعات کے پیش کرنے کیلئے بہت کم گنجایش رہ جاتی' تفصیل کی خواہش رکھنے والے قارئین کو چاہئے کہ کیمبرج کی تاریخ ہند مطالعہ کریں جو کئی جلدوں میں چھپ کر شایع ہوچکی ہے اور جس میں تفصیلی حوالے درج ہیں' ہم نے جو حوالے دئے ہیں وہ متن کے انہی اقتباسات تک محدود ہیں جن

کے ماخذ کیمبرج کی تاریخ هند کے مرتب هونے کے بعد وجود میں آئے اور جن سے کیمبرج کے مورخوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ۔

هندی ناموں کے تلفظ میں هم نے امپیریل گزٹیرآف انڈیا کی پیروی کی هے' جس کی تفصیل ضمیمہ * میں ملیگی چند غیر انگریزی لفظ کو اپنی مشہور شکل پر باقی رکھا هے جیسے مغل یا ستی وغیرہ' یہ لفظ اب انگریزی زبان میں بھی استعمال هونے لگے هیں ۔

بہت سے محققین کے هم شکر گذار هیں' جنہوں نے زبان اور آثار قدیمہ وغیرہ کے مسائل کو حل کرنے میں هماری مدد کی هے' اگر هم ان کے ناموں کو یہاں نہیں گنتے تو اس کا سبب یہ هے کہ کہیں همارے قارئین ان میں سے کسی کو ان غلطیوں کا ذمہ دار نہ بنادیں جو درحقیقت هم سے سرزد هوی هیں ۔

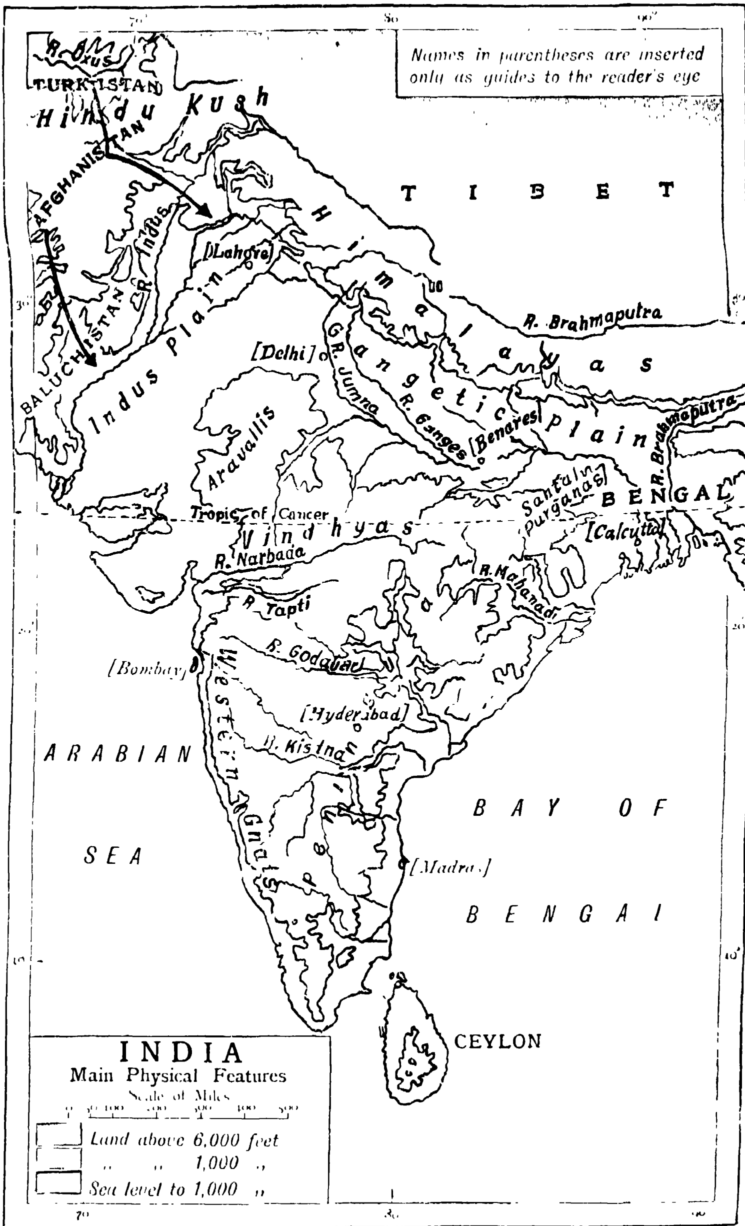
اپریل سنہ ۱۹۳۶ء

* حصہ دوم کی ضخامت کے باعث طبع دوم سے ضمیمہ کو حذف کردیا گیا ہے ۔

فہرست ابواب

باب نمبر | صفحہ نمبر

نقشہ جات



Names in parentheses are inserted only as guides to the reader's eye
R. Oxus
TURKISTAN
Hindu Kush
AFGHANISTAN
BALUCHISTAN
R. Indus
[Lahore]
TIBET
Himalayas
R. Brahmaputra
Indus Plain
[Delhi]
R. Jumna
R. Ganges
Gangetic Plain
[Benares]
R. Brahmaputra
Aravallis
Santal Parganas
BENGAL
Tropic of Cancer
Vindhyas
[Calcutta]
R. Narbada
R. Mahanadi
R. Tapti
R. Godavari
[Bombay]
Western Ghats
[Hyderabad]
R. Kistna
ARABIAN SEA
BAY OF BENGAL
[Madras]
CEYLON
INDIA
Main Physical Features
Scale of Miles
Land above 6,000 feet
" " 1,000 "
Sea level to 1,000 "

مختصر تاریخ ہند

باب ۱

سر زمین ہند اور اس کے باشندے

۱ - سر زمین ہند

سب سے پہلے لفظ ' ہند ' کی شرح ضروری ہے ' کیونکہ گذشتہ زمانہ میں اس کے مختلف معنی مراد لئے جاتے رہے ہیں ' بعض اس سے ساحل کا تنگ علاقہ مراد لیتے تھے اور بعض جنوبی ایشیا کا ایک بڑا حصہ ' ہمارے نزدیک اس سے مراد وہ علاقہ ہے جو سلسلہ ہمالیہ اور بحر ہند کے درمیان واقع ہے ' برما اس میں شامل نہیں ہے ' کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے یہ ہند کا حصہ نہیں بن سکتا ' گذشتہ صدی میں محض نظم و نسق کی سہولت کی خاطر اس کو بتدریج ہندی سلطنت کا جز بنالیا گیا تھا '

دنیا کے اس بڑے علاقہ کو دو قدرتی حصوں یعنی شمالی اور جنوبی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ' ان دونوں کے درمیان حد فاصل بندھیاچل کا ناہموار سلسلہ ہے ' جو خط سرطان کے تقریباً مشرق اور مغرب میں پھیلا ہوا ہے ' اس کی اونچائی اور چوڑائی ہر جگہ یکساں نہیں ہے ' یہ سلسلہ شمال سے جنوب کی طرف آنے جانے کیلئے سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہو ہے ' اگرچہ آجکل ریلوں کی شکل آنے سے یہ رکاوٹ ایک حد تک دور ہوگئی ہے '

جنوبی ہند مثلث شکل کا ایک بلند میدان ہے ' اس کے مغرب میں ایک زبردست پشتہ ہے ' جس کو مغربی گھاٹ کہا جاتا ہے ' یہ بہت ہی ڈھلوان واقع ہوا ہے ' اس کا سلسلہ انتہائی جنوب سے شمال کی جانب دریاے تاپتی تک چلا گیا

ہے ، اس میں درے بہت کم اور دشوار گذار ہیں ، اس کے دامن میں بہت سی وادیاں ہیں ، جہاں کے باشندے کسی زمانہ میں اپنا خاص تمدن رکھتے تھے ۔ جنوبی ہند کے اہم دریا جنوب کی طرف بہتے ہیں ، مشرقی گھاٹ مختلف وادیوں میں منقسم ہے ، آمد و رفت کے لئے یہاں زیادہ رکاوٹیں نہیں ہیں ، یہی وجہ ہے کہ گذشتہ زمانہ میں دکن کے لوگ مغربی گھاٹ کی بجائے مشرقی گھاٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے تھے ، بہت قدیم زمانہ سے مشرقی ساحل کی بندرگاہوں اور جاوا ، سماترا ، برما ، سیام اور انڈو چینا کے درمیان آمد و رفت جاری تھی ، بعد میں مغربی ساحل کی بندرگاہوں کی اہمیت بڑھ گئی کیونکہ مشرقی ایشیا ، بحیرۂ احمر ، یا خلیج فارس کو مال لیجانے والے جہاز یہیں لنگر انداز ہوتے تھے ، جنوبی ہند کے شمال مغرب میں نربدا اور تاپتی کے دو بڑے دریا ہیں جو مغربی گھاٹ کو کاٹ کر نکلے ہیں ، بمبئی کے ترقی میں آنے سے پہلے تجارتی جہاز انہی دریاؤں کے دھانوں پر ہندی مال لادکر یوروپ کی طرف لے جایا کرتے تھے ۔

شمالی ہند بندھیاچل سے کوہ ہمالیہ اور پھر مغرب میں ہندوکش تک پھیلا ہوا ہے ، ہمالیہ کا سلسلہ کوہ جس کی اونچائی ہر جگہ پندرہ ہزار فیٹ سے زیادہ ہے ، زمینی آمد و رفت کیلئے دنیا بھر میں ایک زبردست قدرتی رکاوٹ ہے ، تاہم یہ بالکل ہی ناقابل گذر نہیں ہے ، کچھ تنگ راستے اس کے دروں میں سے ہوکر گذرتے ہیں ، جو تبت یا ترکستان تک جاتے ہیں ، لیکن آدمیوں کی کثیر تعداد کو یا زیادہ وزنی سامانوں کو لیکر ان پر سے گذرنا عملاً ممکن نہیں ہے ، مشرق میں بھی پہاڑوں کا ایک زبردست سلسلہ ہے جس میں سے ہوکر گذرنا تقریباً اتناہی دشوار ہے ، تاہم اس طرف دو راستے ہیں ، ایک ساحل سے لگی تنگ نشیبی زمین ہے ، جس میں سے اراکان کو راستہ جاتا ہے ، دوسرا

راستہ اوپر شمال میں ہے ، برھمپترا کی وادی سے مغربی چین تک بڑی دقتوں کے ساتھ راستہ پیدا کیا جاسکتا ہے ، مغرب میں ہندوکش سے لیکر بحر عرب تک پہاڑوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے ، یہ بھی ایک قدرتی فصیل کا کام دیتا ہے ، اس میں فوجوں کے گذرنے کے قابل چند درے ہیں ، جن میں سے ہوکر ایک طرف افغانستان اور ترکستان تک اور دوسری طرف بلوچستان سے ایران تک جاسکتے ہیں ، پرانے زمانہ میں یونانیوں ، سیتھیوں ، ہونوں ، افغانوں ، مغلوں اور ایرانیوں کے جتنے بڑی حملے ہند پر ہوے وہ سب انہی دروں سے ہوے ہیں -

شمالی ہند میں سندھ اور گنگا کی دو زبردست وادیاں ہیں ، جن میں ان دو بڑے دریاؤں کا وسیع جال پھیلا ہوا ہے ، ان میں پہاڑوں کے مختلف سلسلے ہیں ، جہاں آبادی بہت کم ہے ، ان کی زندگی کا انحصار ان زمینوں پر ہے ، جہاں دریائی کھاد آکر جمع ہوجاتی ہے ، یہ سلسلے تین حصوں میں بٹ گئے ہیں ، مغرب میں راجپوتانہ ہے جو دونوں وادیوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے ، اس کا سلسلہ ان جنگلوں سے مل گیا ہے جو کوھہاڈے ھمالیہ کے دامن میں واقع ہیں ، دھلی کے قریب دو سو میل سے کچھ کم چوڑا ایک راستہ پیدا ہوگیا ہے ، جس میں سے ہوکر شمال مغربی حملہ آور گنگا کی ترائیوں میں پہنچتے تھے ، اس جگہ بہت سی فیصلہ کن لڑائیاں ہوی ہیں ، قدیم زمانہ میں سندھ الگ ہوجانے کی وجہ سے اپنی خاص تاریخ اور روایات کا حامل تھا ، مشرق میں سنتال پرگنہ کی پہاڑیاں ہیں جو گنگا کی ترائی کو بنگال سے جدا کرتی ہیں ، اس جگہ گنگا اور برھمپترا کے دریا ملتے ہیں ، قدیم زمانہ میں بنگال کی سر زمین میں پہنچنا بہت دشوار تھا ، یہی وجہ ہے کہ بنگال کی ایک علحدہ تاریخ ہوگئی ہے ،

شمالی اور جنوبی ہند کے حالات میں ایک اہم فرق؛ یہ ہے کہ شمالی ہند کے دریا برفانی چوٹیوں سے سیراب ہوتے ہیں ، جنوبی ہند کے دریاؤں کا یہ حال نہیں ہے ، یہاں صرف بارش کے موسم میں طغیانی رہتی ہے ، دوسرے دنوں میں پانی بہت کم رہ جاتا ہے اس لئے جہاز رانی نا ممکن ہے ؛ سندھ اور گنگا کے دریا ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے سیراب ہوتے ہیں ، پھر آگے چل کر بہت سے چھوٹے چھوٹے دریا آکر مل جاتے ہیں ، اس کی وجہ سے ان میں ہمیشہ پانی بہتا رہتا ہے ، بعض موسم میں خلیج بنگال سے آگرہ تک اور بحر عرب سے لاہور تک جہاز چلتے تھے ، پرانے زمانہ میں ان کے اندر بڑی آمد و رفت رہتی تھی ، ریلوں کے قائم ہوجانے کے بعد جہازی آمد و رفت بند ہوگئی ، تاہم خلیج بنگال کے دہانوں پر اب بھی کشتیاں اور جہاز رسل و رسائل اور آمد و رفت کا اہم ذریعہ ہیں -

ہمیں جہاں تک معلوم ہے ہند کے لوگ زراعت پیشہ رہے ہیں ، ان کی زندگی تمام تر موسمی ہواؤں پر منحصر تھی ، سال کے ایک بڑے حصہ میں شمال مغربی جانب سے خشک ہوائیں چلتی رہتی ہیں ، اور آگے بڑھکر جنوب کی طرف مڑجاتی ہیں ، ان کے ذریعہ تھوڑی بہت بارش ہوتی ہے ، مگر پانی کی مقدار اتنی نہیں ہوتی کہ زراعت کے لئے کافی ہوسکے ، مئی کے قریب تر موسمی ہوا کا جنوب مغربی تیز دھارا بحر عرب اور خلیج بنگال سے اٹھتا ہے اور تمام سواحل ہند پر برس پڑتا ہے ، اس سے ملک کے ایک بڑے حصہ کو کافی مقدار میں پانی مل جاتا ہے ، خلیج بنگال سے آنے والا دھارا مڑکر گنگا کی ترائی پر برستا ہے ، سال کے اخیر حصہ میں جنوبی ہند کے جنوب مشرقی علاقہ میں بارش ہوتی ہے ، یہ دھارے سال بسال مختلف ہوتے ہیں ، جس کی وجہ سے کبھی بارش اچھی ہوتی ہے اور کبھی بالکل ہی نہیں ہوتی ، اس بے قاعدگی

کی وجہ دریافت نہیں کی جاسکی ، ہر سال جون سے لیکر ستمبر تک کے مہینے بڑی بے چینی اور بے اطمینانی کے ہوتے ہیں ، اگر اچھی بارش ہوجائے تو کم از کم لوگوں کو پیٹ بھرکر روٹی مل جاتی ہے ، اور ملک کے ہر گوشہ سے سامانوں کی مانگ بڑھ جاتی ہے ، اگر بارش نہ ہو تو ہر جگہ قحط کے آثار پیدا ہوجاتے ہیں ، اور لوگوں پر فاقہ کشی اور موت تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے ، لوگ غذا کے لئے ادھر اودھر گھومنے لگتے ہیں ، اس کی وجہ سے بسا اوقات بڑی بڑی آبادیاں ویرانہ بن جاتی ہیں ، گذشتہ چند سالوں میں قحط کا انتظام کافی حد تک ہوگیا ہے ، تاہم پرانی تاریخ کے صفحات پر قدیم قحط سالیوں کی یادگار باقی رہ گئی ہے ۔

۲ — باشندے

یہ نہیں معلوم کہ سب سے پہلے کون سی قوم ہند میں آباد ہوی ، اور وہ کہاں سے یہاں آئی تھی ، ماہرین تحقیقات نے علم الاقوام والالسنہ کے تحت ہند کی اصل آبادی کو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا ہے ، ان کا خیال ہے کہ مختلف وقتوں میں مختلف انسانی ریلے مختلف مقامات سے یہاں آتے رہے ہیں ، مگر یہ دعوی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مفروضہ بالکلیہ صحیح ہے ، اب تک جو باتیں ثابت کی جاچکی ہیں ان سے صرف تین عناصر یا مجموعۂ عناصر کا پتہ چلتا ہے جن کو ایک دوسرے سے تمیز کیا جاسکتا ہے ، یعنی جنگلی قبایل ، دراوڑی اور آریہ ، وسط ہند کے پہاڑوں اور جنگلوں میں اب بھی ایسے قبایل آباد ہیں ، جو اپنی خاص بولی بولتے ہیں ، اور آبادی کا قدیم ترین عنصر معلوم ہوتے ہیں ، غالبا کسی زمانہ میں یہ ایک وسیع تر رقبہ میں پھیلے ہوے تھے ، اور بعد میں دوسری بیرونی اقوام نے ان کو جنگلوں کی طرف ڈھکیل دیا اور خود سارے ملک پر حاوی ہوگئیں ، غالبا پہلے پہل دراوڑ کا لفظ زبانوں کے مجموعہ کیلئے بولا جاتا تھا ، مگر بعد میں

چلکر قوم کیلئے استعمال ہونے لگا ، مختلف دلایل سے معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑی قوم بھی مغرب کی طرف سے ہند میں وارد ہوئی تھی ، آریہ شمال مغربی علاقہ سے ہند میں وارد ہوئے ، ان کا یہاں آنا تاریخ سے ثابت ہے ، دوسرے باب میں ان کے متعلق بحث کی جائیگی ،

آریوں کے بعد سیتھی اور ہون بھی ہند آکر بسے ، ان کے متعلق آئندہ بحث کی جائیگی ، پھر مسلمان یہاں آئے اور وسط ہند تک پھیل گئے ، مگر یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ مذہب سے کسی قوم کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا ، کیونکہ پچھلی چند صدیوں میں سندھ اور بنگال کی کل آبادی مسلمان ہوگئی ہے ، حالانکہ وہ ہندی اقوام سے تعلق رکھتے ہیں ،

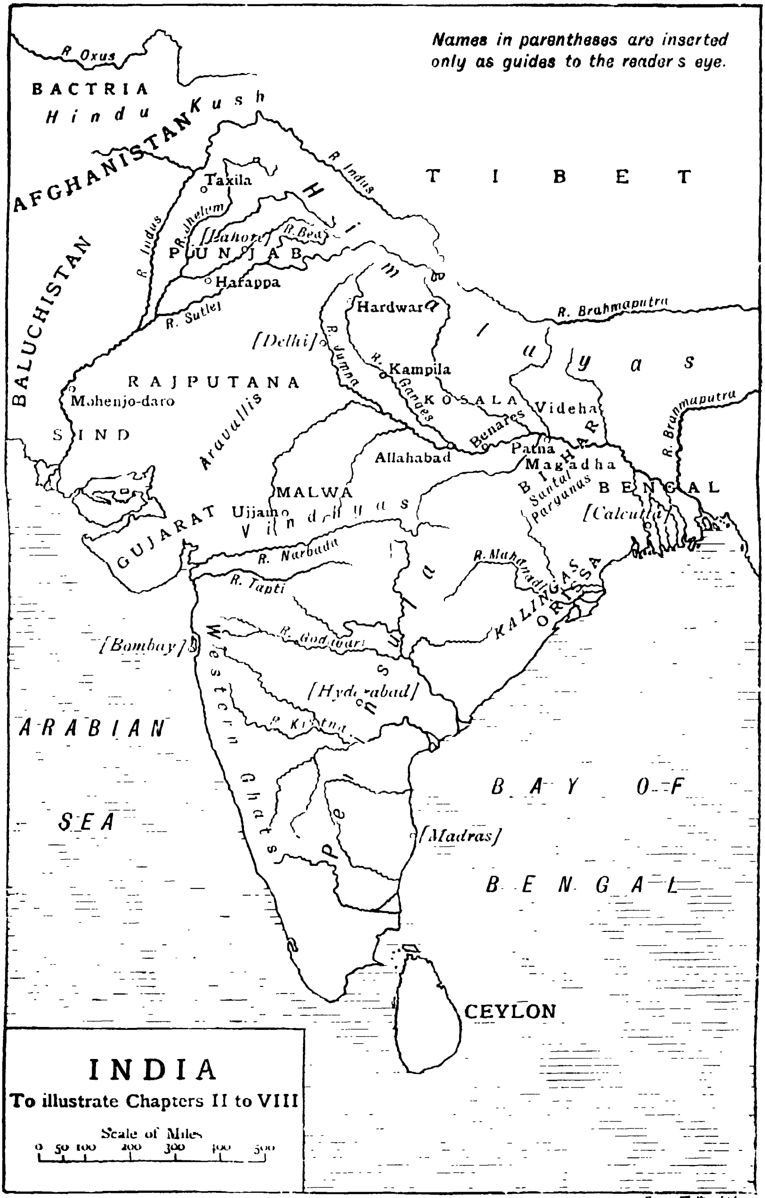
ان ہی اہم عناصر سے ہند کی موجودہ آبادی کی تشکیل ہوی ہے ، ہم کو ان چھوٹی چھوٹی قوموں کا بھی جائزہ لینا ہے جو مختلف وقتوں میں یہاں آکر بس گئے اور آبادی میں اضافہ کیا ، جیسے یہودی ، اہل عرب ، اور آرمینی باشندے جنہوں نے تجارت کی غرض سے یہاں سکونت اختیار کرلی یا پارسی جو اسلام کے دباؤ سے مجبور ہوکر ایران سے نکلے یا حبشی اور ایشیائی جو غلاموں کی حیثیت سے یہاں لائے گئے ، یا پرتگالی اور دوسری مغربی قومیں جو سنہ ۱۵۰۰ ع کے بعد یہاں آئیں ، ان میں سے بعض قوموں نے اب تک اپنی نسلی انفرادیت کو باقی رکھا ہے ، مگر عرب تاجر مغربی ساحل کے باشندوں سے گھل مل گئے ، اور ان کی اولاد کو آج ماپلا کہا جاتا ہے ، مغربی قوموں کے آنے کے بعد ایک نئی قوم وجود میں آئی جس کو کسی زمانہ میں یوریشین کہا جاتا تھا اور اب وہ اینگلو انڈین کے نام سے مشہور ہے

ان پچرنگی قوموں کے میل جول اور باہمی اختلاط کا یہ نتیجہ ہوا کہ مختلف زبانیں بولی جانے لگیں ، ان میں جنگلی قبایل کی بولیاں کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں ، باقی

زبانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے ' ایک دراوڑی جس میں جنوبی ہند کی مشہور زبانیں داخل ہیں ' ان میں سے ہر ایک زبان دوسرے سے اتنی مختلف ہے کہ ایک زبان کا بولنے والا دوسرے کی بولی کو نہیں سمجھ سکتا ' یہاں انگریزی ہی مشترکہ زبان کا کام دیتی ہے ' دوسرا آریائی جس میں شمالی ہند اور ایک حیثیت سے مغربی سرحد تک کی تمام زبانیں داخل ہیں ؛ مگر دراوڑی زبانوں کا ان پر گہرا اثر پڑا ہے ' شمالی ہند کی زبانوں میں سب سے اہم ہندی زبان ہے ' فارسی اور ہندی بولنے والوں کے میل جول سے ایک نئی زبان اردو پیدا ہوی جس کو انگریز ہندوستانی کہتے ہیں ' یہ ایک فصیح و بلیغ زبان ہے ' اس کی مدد سے ہر ایک آدمی نہایت آسانی کے ساتھ شمالی ہند کے تمام مقامات کی سیر کرسکتا ہے ' مگر اس زبان کا بولنے والا جنوبی ہند میں اپنے کو بیکس تصور کرنے لگتا ہے ' اس کے بر خلاف ایک دراوڑی شمالی ہند میں صرف انگریزی ہی کو اپنے خیال کے اظہار کا ذریعہ بنا سکتا ہے ، یہ صحیح ہے کہ سنسکرت ہند کی ایک ٹکسالی زبان ہے اور ملک بھر میں اس کی تعلیم حاصل کی جاتی ہے ' مگر اس زبان کے بولنے والے گنتی کے ہیں ' اس زبان کی افادیت عملاً اتنی بھی نہیں جتنی کہ یوروپ میں لاطینی کی ہے '

یہاں ہم کو ایک قوم کی تاریخ نہیں لکھنی ہے ' یہ صحیح ہے کہ پورا ملک جغرافیائی لحاظ سے ایک ہے ' مگر اس کی وسعت اور قدرتی ساخت آبادی کو مختلف گروہوں میں بانٹ دے رہی ہے ' یہی گروہ دوسرے ملکوں میں مختلف قومیں بن گئے ہیں ' چند سالوں سے یہاں بھی یہ جذبہ کام کرتا رہا ہے کہ ہند کی قومیں ایک قوم یا ملت نہیں ہیں ' اس کے خلاف متحدہ قومیت کے نظریہ کو بھی بہت زور سے پیش کیا جارہا ہے ' اور اب اس نظریہ کو قبولیت حاصل ہوتی جارہی ہے ' تاہم ہند

کے باشندوں کو فرانسیسیوں اور پرتگالیوں کی طرح جدا جدا قوم سمجھنا تاریخی حیثیت سے غلط ہے ، مگر ہم ان سب کو مغربی قوموں کی طرح ایک بھی خیال نہیں کرسکتے ، حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے ۔



Emary Walker Ltd. sc.

باب ۲

تاریخ ھند کی ابتدا

۱ - وادی سندھ کا تمدن

بعض دوسرے ملکوں کی طرح ھند میں بھی حجری عہد کے آثار کا انکشاف کیا گیا ھے ' مگر ایک معمولی طالب علم ان سے کوئی مفید معلومات حاصل نہیں کرسکتا ' ھند کی ابتدائی تاریخ کے متعلق پہلا زبردست انکشاف یہ ھے کہ آج سے تقریباً پانچ ھزار سال پہلے یعنی دو ھزار پانچ سو برس قبل مسیح سندھ کی وادی میں ایک باقاعدہ اور پرانا تمدن تھا جو اپنے ھم عصر عراقی یا مصری تمدن کے برابر یا بعض صورتوں میں ان سے بعض کہیں بڑھ چڑھکر تھا ۔ * حال ھی میں اس کی تحقیق ھوی ھے ' اس سے پہلے صرف قیاس آرائیاں تھیں مگر سنہ ۱۹۲۱ ع کے بعد موھنجو دارو اور ھڑپا کی کھدائیوں نے ان قیاس آرائیوں کو حقیقت سے بدل دیا ھے ' موھنجو دارو دریاے سندھ کے دھانہ سے شمال میں دو سو میل سے زیادہ کے فاصلہ پر واقع ھے ' اور ھڑپا لاھور کے جنوب مغرب میں تقریباً ایک سو میل کے فاصلہ پر ھے ' ابھی پورے طور پر ان مقامات کی کھدائی نہیں ھوی ھے اور دوسری جگھوں کے معائنہ کی ابھی ضرورت ھے ' اس وقت ان سوالات کا جو اس تمدن کی قدامت یا اس کی وسعت کے متعلق پیدا ھوتے ھیں ' کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا جاسکتا ' مکتشفین نے موھنجو دارو میں ایک ایسا شہر کھود نکالا ھے جہاں کافی بلند اور تفصیلی خاکوں کے مطابق تیار کی ھوی بڑی بڑی عمارتیں ھیں ' عوام کے لئے کشادہ حمام بنے ھوے ھیں ' سڑکوں کے کنارے

---

* دیکھو سرجان مارشل کی کتاب " موھنجو دارو اینڈ دی انڈس سویلیزیشن " مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۱) صفحہ ۵ ۔

بدرو نالیاں ہیں ' چھوٹے بڑے کئی سامان ' مٹی کے ظروف ' مجسمے ' پتھر سے بنے ہوے برتن ' آلات اور ہتھیار ' زیورات اور کھلونے ملے ہیں ' سونے ' چاندی ' تانبے ' سیسے اور رانگے کی دھاتوں کو کام میں لایا گیا ہے ' گیہوں اور جوکی کاشت ہوتی تھی ' روئی کا کپڑا بنا جاتا تھا ' فنی اور صنعتی دونوں حیثیت سے پتھر کی نقش نگاری بہت ترقی کر چکی تھی ' تختیاں اور مہریں جو زیادہ تعداد میں ملی ہیں ' اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ ان کے ہاں تحریر کا رواج تھا ۔

آخر یہ کون لوگ تھے جن کو دنیا کی یہ آرام و آسایش اور عیش و عشرت نصیب تھی ؟ ماہرین تحقیقات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ تمدن آریائی قسم کا نہیں ہے ' لا محالہ دراوڑی قوم کا یا کسی ایسی قوم کا ہوگا جس کا نام تاریخ میں زندہ نہیں رہا ' موہنجو دارو کے تمام تحریری نقوش اب تک پڑھے نہیں جاسکے ' ان کے پڑھے جانے تک بہت سے حالات پردۂ خفا میں رہینگے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ سمیری تمدن سے اس کا کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے ' جس سے عراق کے آثار قدیمہ کے طالب علم اچھی طرح واقف ہیں ' مگر اس تعلق کی نوعیت کیا ہے ؟ مختلف لوگوں نے مختلف نظریے پیش کئے ہیں ' عام آدمی تو یہی خیال کرتا ہے کہ یہ دراوڑی تمدن ہے جو آریہ قوم کی آمد سے پہلے یہاں رائج تھا ' قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ اس خیال کی تصدیق ہوجائیگی ' تاہم یہ بھی نا ممکن نہیں قرار دیا جاسکتا کہ یہ تمدن ایک دوسرے تمدن کی شاخ ہے ' جس کا مرکز اور آگے مغرب میں کسی جگہ تھا اور جس کو ہند میں پھیلنے کا موقعہ نہیں ملا ' اس سوال کو حل کرنے کیلئے بھی بہت سی نئی تحقیقات کی ضرورت ہے ' فی‌الحال اتناهی کہا جاسکتا ہے کہ وادی سندھ کا تمدن آریہ قوم کی آمد سے پہلے کا ہے ' اس کے ثبوت کے لئے واضح شہادتیں موجود ہیں ۔

۲ — آریہ قوم کی آمد

' دراوڑ ' کی طرح آریہ ' کا لفظ حقیقت میں زبانوں کیلئے بولا جاتا تھا ' مگر بعد میں یہ لفظ ان لوگوں کیلئے استعمال ہونے لگا جو آریائی زبان بولتے ہیں ' ہمارے پاس اس قسم کی کوئی اثری شہادت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ ان آریوں کا تمدن ' جو پہلے پہل ہند میں وارد ہوئے ' اس تمدن کے مماثل تھا جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے ۔ اور ان کی زندگی کے حالات سے بھی مماثلت کا پتہ چلانا ممکن نہیں ہے ' کیونکہ وہ شہروں میں بسنے کے عادی نہ تھے ' اور اپنے مکانات لکڑی یا جلد خراب ہوجانے والی چیزوں سے بناتے تھے ' ان کے متعلق سب سے پہلے ہم کو رگ وید سے معلومات حاصل ہوتی ہیں ' جو سنسکرت زبان کی سب سے پرانی کتاب ہے ' اس کے بعد ہماری معلومات کا ماخذ مختلف زبانوں کا تقابلی مطالعہ ہے ' مگر ان سے وہ باتیں نہیں معلوم ہوتیں جن کے دریافت کرنے کی ہم آرزو رکھتے ہیں ' مغرب و مشرق کے محققین نے بڑی بڑی قیاس آرائیاں کی ہیں ' اور ہمیں جو کچھ محدود معلومات حاصل ہیں ' ان کا ماخذ در حقیقت یہی قیاس آرائیاں ہیں ' جن سے کلیۃ انکار کرنا بھی بہت مشکل ہے '

رگ وید در حقیقت بھجنوں کی ایک کتاب ہے ۔ اس کی ضخامت تقریباً الیڈ اور اوڈسی کے برابر ہے ' یہ تمام بھجن مختلف وقتوں کے لکھے ہوئے ہیں ' ان کے اجزاء ترکیبی یا کل مجموعہ کے متعلق تاریخ کی کوئی تعیین نہیں ہوسکتی ' البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سب سے پرانے بھجن ایک ہزار سال قبل مسیح سے کچھ پہلے کے ہیں ' اس سے لا محالہ ہماری معلومات غیر مرتب اور غیر متعین ہیں ' رگ وید سے بہت کچھ مذہبی حالات کا پتہ چلتا ہے ' لیکن زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس سے کوئی روشنی نہیں پڑتی ' تاریخی واقعات تو شاذ اور نادر ہیں ' مذہب کے متعلق بھی صرف وہی معلومات حاصل

هوتی هیں جو زیادہ تر رسوم سے تعلق رکھتی هیں ' عام باشندوں کے اصل عقاید و خیالات پر اس سے کوئی روشنی نہیں پڑتی ' اگرچہ یہ ماخذ غیر اطمینان بخش هے تاهم اس کے علاوہ کوئی دوسرا معتبر قدیم ماخذ بھی همارے پاس نہیں هے '

پہلے پہل مغربی محققین کیلئے سنسکرت ایک مخفی خزانہ تھی ' لیکن بعد میں اس کی حیثیت یونانی اور لاطینی زبان کے برابر تسلیم کرلی گئی اور برابر اس کی تعلیم دی جانے لگی ' اٹھارویں صدی کے آخر میں سرولیم جونس نے زبان کی تحقیقات کی بنیاد ڈالی ' صاحب موصوف کلکتہ کی عدالت عالیہ کے جج تھے ' انھوں نے پہلے پہل یہ نظریہ پیش کیا کہ سنسکرت غالبا ایک بڑے خاندان کی شاخ هے ' جس سے یونانی ' لاطینی ' گاتھی ' کیلٹی ' سنسکرت ' اور پہلوی زبانیں پیدا هوی هیں ' بعد کے محققین نے اس مفروضہ پر اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھتے هوے انڈو-یوروپین زبان کے نظریہ کو ترقی دی ' ان کا خیال هے کہ اس زبان کو وہ قبایل بولتے تھے جو اپنے اصلی وطن سے بتدریج یوروپ اور ایشیا کے ایک بڑے حصہ پر پھیل گئے ' اور نئی بستیوں کا ' جہاں وہ آباد هوے ' ان پر اتنا اثر پڑا ' کہ ان کی زندگی کے طور طریقے بالکل بدل گئے ' اور زبانیں بھی ایک دوسرے سے مختلف هوگئیں '

اصل نظریہ اپنی جگہ پر ٹھیک هے ' مگر اس کی جزئیات پر اب تک یقینی ثبوت نہیں مل سکا ' یہ نہیں معلوم کہ یہ لوگ پہلے پہل کہاں آباد هوے ' اور کب اور کن راستوں سے یہ دوسرے ملکوں میں پھیلے ' بعض کا خیال هے کہ ان کا اصلی مسکن هنگری اور قطب شمالی کے درمیان یوروپ اور ایشیا میں کوئی خطہ تھا ' اور هزاروں سال پہلے انھوں نے اس خطہ سے هجرت کرلی تھی ' جہاں کہیں سے بھی وہ نکلے هوں ' اتنا یقینی هے کہ وہ پہلے پہل افغانستان کے راستہ سے هند میں داخل هوے ' اس خیال کی بھی کوئی تائید

نہیں ملتی کہ دو ہزار سال قبل مسیح آریہ ہند میں وارد ہوئے تھے، اور ان کی حیثیت حملہ آوروں کی نہ تھی بلکہ وہ مہاجر تھے، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قبیلے یکے بعد دیگرے کچھ وقفوں کے بعد ہند میں داخل ہوتے رہے ہیں، ان کا تعلق کسی ایک قوم سے نہ تھا، بلکہ وہ متعدد قوموں سے تھے۔

علم الاقوام والالسنہ سے پتہ لگتا ہے کہ پہلے پہل آریہ سندھ کی وادی میں آباد ہوئے، اور اصل باشندوں کو وہاں سے بھگا دیا تھا، اس کے بعد مشرق کی طرف بڑھنے لگے۔ رگ وید کی جغرافیائی تلمیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے شمال مغرب میں وادی سندھ اور گنگا کے بین دھاروں پر ایک قوم آباد تھی، وہ گنگا کی نشیبی وادی سے واقف نہ تھے، آریہ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، ان کے درمیان آپس میں کبھی کبھی لڑائیاں بھی ہوتی تھیں، مگر ان کی جنگ عموماً دراوڑی قوم سے تھی، جو آریہ کی بہ نسبت زیادہ کالی تھی۔

ایک آریائی قبیلہ متعدد خاندانوں پر مشتمل تھا، عام طور پر ایک مرد ایک ہی عورت سے شادی کرتا تھا، ایک عورت کے ایک سے زیادہ شوہر نہیں ہوتے تھے، باپ کی حیثیت ایک بزرگ کی سی تھی، ماں کی عزت ضرور کی جاتی تھی، مگر اس کا درجہ باپ سے کم تھا، وہ شہری زندگی سے مانوس نہ تھے، غالباً ہر ایک خاندان دوسرے سے الگ تھلگ زندگی گذارتا تھا، جیسے جیسے خاندانوں کی کثرت ہوتی گئی، مختلف قریے آباد ہوتے گئے، ان کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، ہر ایک قبیلہ کا ایک بادشاہ ہوتا تھا، عام طور پر بادشاہت موروثی تھی، ان کی ایک مجلس مشاورت ہوتی تھی، جس کے رکن خاندان کے سر گروہ ہوتے تھے، بادشاہ اور مشیروں کے درمیان گہرا تعلق نہیں تھا، بادشاہوں میں ملک گیری کا جذبہ موجود تھا۔

قبیلوں کی زندگی زیادہ تر زراعت پر تھی ' لیکن فصلوں سے بڑھ کر جانوروں کی رکھوالی سے انھیں زیادہ دلچسپی تھی ' جانوروں میں گائے بیل زیادہ عزیز تھے ' ان کی حقیقی دولت گائے تھی ' اور اس کو زر متبادلہ کی حیثیت حاصل تھی ' لوگ دھیرے دھیرے اس کے تقدس کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے ' مگر بیل کا گوشت ان کی خوراک کا ایک جز تھا ' ان کے بعد گھوڑوں کا درجہ تھا ' جو میدان جنگ میں رتھ کھینچتے تھے ' بھیڑ ' بکری ' خچر اور کتے بھی پالتے تھے ' رگ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ کھلی اوڑھتے تھے ' یا دباغت کیا ہوا چمڑا پہنتے تھے ' روئی کا کوئی نشان نہیں ملتا ' اون کے کپڑے تیار کرنا عورتوں کا کام تھا ' جولاہوں کے علاوہ دباغت کرنے والوں اور بڑھئی اور دھات کا کام کرنے والوں کا بھی ذکر آتا ہے ' لیکن یہ نہیں معلوم کہ کون سی دھات کام میں لائی جاتی تھی ' مچھیارے شاذ و نادر تھے ' شکار کا عموماً شوق تھا ' گھوڑ دوڑ کا بھی رواج تھا ' ہر جگہ جوا کھیلا جاتا تھا اور پانسے پھینکے جاتے تھے ' جوے میں جو لوگ ہارتے تھے وہ بسا اوقات مقروض ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی جیتنے والے کے غلام ہو جاتے تھے۔

آریہ عموماً قدرتی عناصر کی پوجا کرتے تھے ' آسمان ' سورج ' کڑک اور آگ وغیرہ ان کے بڑے دیوتا تھے * ' جن کو وہ جاندار خیال کرتے تھے ' اور ان کو مختلف جانوروں کی شکل میں ظاہر کیا کرتے تھے ' رگ وید کے بھجن ان ہی دیوتاؤں کی تعریف میں کہے گئے ہیں ' ان دیوتاؤں کو آریہ اپنا محسن سمجھتے تھے ' اور بھینٹ چڑھاکر ان کی خوشی اور رضامندی کے ہمیشہ

* وید میں بعض ایسے دیوتاؤں کا بھی ذکر آتا ہے جو حقیقت میں انسانی ہیرو تھے ' اور جن کو بعد میں عام لوگوں نے دیوتا بنالیا تھا اور پروہتوں نے بھی ان کی خدائی تسلیم کرلی تھی ۔ لیکن ان کا درجہ پہلی قسم کے دیوتاؤں کے برابر نہیں تھا ۔

طلبگار رہتے تھے ' اس سلسلہ میں طول طویل رسمیں ادا کی جاتی تھیں ' آریوں کے مذہب کو ایک جامد چیز قرار دینا سخت غلطی ہے ' کیونکہ ان کے خیالات میں وسعت اور ترقی بھی پائی جاتی ہے ' رگ وید کے دسویں حصہ میں جو یقینا دوسرے حصوں سے بعد کی تصنیف ہے ' بہت سے فلسفیانہ افکار ملتے ہیں ' اس میں شرک کے نظریہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی ہے ' اس سے پہلے ایک سے زیادہ دیوتاؤں کا نظریہ عام تھا ' مگر اب ایک خالق کا تصور بھی ان کے دماغوں میں گھومنے لگتا ہے -

یہ نہیں معلوم کہ آئندہ زندگی کے متعلق ان کا کیا خیال تھا ' غالبا انہوں نے اس کے متعلق کچھ سوچاھی نہ تھا ' نئے جنم کے متعلق صرف دھندلے اشارے ملتے ہیں ' بعد میں چلکر اس نظریہ نے سنسکرت زبان و ادب میں ایک مستقل حیثیت اختیار کرلی تھی ' کچھ اشارے اس عقیدے کے بھی پائے جاتے ہیں کہ انسان کی آئندہ قسمت بہت کچھ اس کے اعمال پر موقوف ہے ' مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے بقائے روح کے مسئلہ کو مان لیا تھا -

اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آریوں کے ہاں ذات پات کا نظام تھا یا نہیں ' جس میں کسی انسان کے سماجی اور اقتصادی رتبہ کا فیصلہ نسلی امتیاز کی بناء پر کیا جاتا ہے ' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظام کی بنیاد پڑگئی تھی ' رگ وید کے ایک بھجن میں مشہور چار ذاتوں کے نام ملتے ہیں ' لیکن ان کی شکلیں ابھی تک متعین نہیں ہوی تھیں ' بادشاہت اور پروھتائی عام طور پر موروثی خیال کی جاتی تھی ' لڑائی میں حصہ لینا کسی ایک خاص جماعت کا کام نہ تھا ' بلکہ قبیلہ کے ہر ایک فرد کا اہم فرض سمجھا جاتا تھا ' جولاھے اور کاریگر بھی مستثنیٰ نہیں تھے ' اس دور میں رنگ کی بناء پر ایک دوسرے میں امتیاز کیا جاتا تھا ' چنانچہ رگ وید میں

آریوں کو گورے رنگ کا بتایا گیا ھے ، اور اس رنگ پر ان کو بڑا فخر بھی تھا ، وہ اپنے سیاہ فام دشمنوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ، قیدیوں کی ایک الگ ذات تھی ، اس حد تک تو ذات پات کا نظام تھا ، لیکن اس میں شک ھے کہ اس نظام نے کچھ ترقی بھی کی تھی ، یا بادشاہ اور پروھت کے خاندانوں کو الگ ذات تصور کیا جاتا تھا۔

رگ وید سے آریوں اور ان کے مخالفین کے طرز بود و ماند کے متعلق ایک دھندلی سی روشنی پڑتی ھے ۔ دراوڑیوں کے متعلق کچھ بھی تذکرہ نہیں ملتا ، اتنا معلوم ھوتا ھے کہ ان کے پاس جانور کثرت سے تھے ، آریوں کے حملہ کے وقت وہ چند جگہوں میں پناہ لیتے تھے ، جن کو بعد کی کتابوں میں ' قصبے ' کے نام سے موسوم کیا گیا ھے ، بعض محققین کو اس تعبیر کے تسلیم کرنے پر بڑا اعتراض ھے ، یہ بھی معلوم نہیں کہ ان مورچوں اور پناگاھوں کی کیا شکل ھوتی تھی ، دراوڑی میدان جنگ میں آریوں کے خطرناک دشمن تھے ، اور رگ وید میں ان کی بہادری کا کوئی ذکر نہیں آتا ، ھم آریوں سے یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے دشمنوں کی تعریف کرینگے ' اور غیر جانبدارانہ نظر سے ان کے کارناموں کا تذکرہ کرینگے ' کہیں کہیں ایسا ظاھر کیا گیا ھے کہ وہ وحشی تھے ' جس سے آریوں کی حقارت دراوڑیوں کے ساتھ ظاھر ھوتی ھے ' مگر ایسا معلوم ھوتا ھے کہ اس لفظ کو اس کے اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ھے ۔ اگر یہ ثابت ھوجائے کہ سندھ کی وادی میں دراوڑی تمدن تھا تو یہ تصورات خود بخود کافور ھوجاتے ھیں '

اگرچہ ویدوں میں دراوڑیوں کو آریوں کا بدترین دشمن بتایا گیا ھے تاھم قیاس کہتا ھے کہ دونوں کے درمیان ایک گونہ تعلقات رھے ھونگے ' ھم جانتے ھیں کہ آریوں کے پاس بہت سے دراوڑی قیدی کی حیثیت سے تھے ' جن سے ایک نئی

ذات وجود میں آرہی تھی ' اس کے علاوہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں کا ایک گروہ دوسرے کے مقابلہ میں دراوڑیوں سے امداد کا طالب ہوتا تھا ' یہی وجہ ہے کہ رگ وید میں بہت سے ایسے الفاظ اور شکلیں ملتی ہیں جو خاص دراوڑی ہیں ' آریہ ان الفاظ کو اپنی روز مرہ کی بولی میں استعمال کرتے تھے ' اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مختلف تمدنوں کی آمیزش کی ابتدا اسی دور سے ہوگئی تھی '

۳ ـ ہندومت کا ظہور

رگ وید کے بعد کے زمانہ کے متعلق ہماری معلومات کا تنہا ذریعہ وہ کتابیں ہیں جن میں اصل وید کی تشریح و تفسیر کی گئی ہے ' ان میں بہت سے بھجن ہیں ' اور متعدد مذہبی رسموں کو بیان کیا گیا ہے ' ان کتابوں کی تصنیف کا سنہ معلوم نہیں ' البتہ یہ یقینی ہے کہ ان کے سب سے پرانے بھجن رگ وید کے آخری دور کے معلوم ہوتے ہیں ' اور باقی بھجن ۵۰۰ ق م سے کچھ پہلے کے ہیں ' جب ان سب کو ملاکر دیکھا جائے تو چار یا پانچ سوسال کی زندگی کا مرقع ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے '

ان کتابوں سے ایک اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے ' اور وہ اس طرز زندگی کا ظہور ہے جس کو عام طور پر ہندومت سے تعبیر کیا جاتا ہے ' رگ وید خالص آریوں کی کتاب ہے ' بعد کی کتابیں مختلف تمدنوں کی تدریجی آمیزش کا نتیجہ ہیں ' رگ وید کے زمانے میں یہ آمیزش بالکل ابتدائی درجہ کی تھی ' عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندومت بھی ایک مذہب ہے جو صرف عقیدہ اور عبادت سے تعلق رکھتا ہے ' انسانی زندگی کے اور پہلوؤں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا ' یہودیت کی طرح ہندومت بھی زندگی کا ایک مکمل لائحۂ عمل رکھتا ہے ' اس میں نہ صرف عقائد و عبادات سے بحث کی گئی ہے ' بلکہ

پوری سماجی اور اقتصادی زندگی سے متعلق عام اور خاص قوانین کو بھی بیان کیا گیا ہے ؛

ہندومت میں آریائی اور دراوڑی دونوں تصورات شامل ہیں ؛ لیکن ان کو ایک دوسرے سے جدا کرکے بتانا ممکن نہیں ہے ؛ کیونکہ آریوں کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہیں ؛ اور دراوڑیوں کے متعلق تو بہت ہی کم معلومات ہیں ؛ اسلئے یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ایک نئے نظریہ یا خیال کا ظہور آریائی یا دراوڑی یا دونوں تمدنوں کی آمیزش کا نتیجہ ہوسکتا ہے ؛ اس وقت تک ان کا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا جب تک ماہرین آثار قدیمہ دراوڑی تمدن کو ؛ جو آریوں کے آنے سے پہلے موجود تھا ؛ تفصیلی طور پر مرتب نہ کرلیں ؛

رگ وید کے واقعات اس سر زمین سے تعلق رکھتے ہیں جو سندھ اور گنگا کے درمیان واقع ہے ؛ لیکن ان کتابوں میں ان واقعات سے بحث کی گئی ہے جو گنگا کی ترائی میں ظہور پذیر ہوے تھے ؛ ہندووں کے نزدیک گنگا کی ترائی سب سے زیادہ مقدس تھی ؛ ان کیلئے گنگا سے بڑھکر کوئی دوسرا دریا مقدس نہیں ہے اور ہند کا کوئی شہر تقدس کے لحاظ سے کاشی ؛ پریاگ اور ہردوار کے برابر نہیں ہوسکتا ؛ آجکل بہت سے یاتری کوہہاے ہمالیہ کے دامن میں گنگا کے سر چشموں تک سفر کی سخت تکلیفیں اٹھا کر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ؛ لیکن ان کی تعداد ان لوگوں کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے جو ہردوار میں ہر سال جمع ہوتے ہیں ؛ اس جگہ دریا پہاڑی علاقے سے گنگا کے میدانوں میں بہنے لگتا ہے اور پریاگ کے قریب جس کا نیا نام الہ آباد ہے ؛ جمنا سے جا ملتا ہے ؛ اس زمانہ میں کاشی بھی ایک مقدس شہر مانا جاتا ہے ؛ مگر اس دور میں اس کو یہ اہمیت حاصل نہیں تھی ؛ یہ حیثیت صرف کمپیلہ کو حاصل تھی جو آگرہ اور لکھنو کے درمیان ایک معمولی قریہ ہوگیا ہے ؛ ان کتابوں سے ایک طرف تو بنگال،

کی سرحد تک اور دوسری طرف وادی سندھ کے مغرب تک کے حالات معلوم ہوتے ہیں ، جنوبی ہند کا کوئی ذکر نہیں ملتا ، البتہ بعض ایسے قبایل کا نام آتا ہے ، جو بندھیاچل کے قریب یا اس سے کچھ آگے رہتے تھے ۔

رگ وید کے زمانہ میں آریہ خانہ بدوش تھے ۔ ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ مختلف جگہوں پر مستقل سکونت اختیار کرچکے تھے ، ان کی بادشاہتیں اور ریاستیں قایم ہوچکی تھیں ، شہری زندگی بہت ترقی کرچکی تھی ، رعایا پر بادشاہ کا اقتدار بڑھتا جارہا تھا ۔ اور مشیروں کی قوت کم ہو رہی تھی ۔ اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مقامی حکومتیں بھی وجود میں آگئی تھیں ۔ ان کا صدر قریہ کا سرگروہ یا پٹیل ہوتا تھا ۔ جو بادشاہ سے بالراست یا بالواسطہ احکام لیکر قریہ کے لوگوں پر نافذ کرتا تھا ، اس دور میں عورت کی ... اور وقعت گھٹنے لگی تھی ، لوگ لڑکوں کے زیادہ آرزومند رہتے تھے

آبادی کا ایک بڑا حصہ کاشتکار تھا ، آجکل کی طرح گیہوں ، جو ، چاول ، باجرا ، دال ، گنا اور تیل کے بیج کی کاشت کی جاتی تھی ، روئی کا کوئی ذکر نہیں ملتا ، لوہے اور چاندی کی دھاتیں کام میں لائی جاتی تھیں ، دستی صنعت کاریاں پہلے سے زیادہ بہت ترقی کرچکی تھیں ، لوگ اکٹھے ایک ہی جگہ بسنے کی طرف مائل تھے ، اور بسا اوقات لڑائیوں کی وجہ سے ادھر سے ادھر منتقل ہو جاتے تھے ۔

لوگ مختلف فرقوں میں بٹ گئے تھے ، مگر ذات پات کی اتنی پابندیاں نہیں تھیں جتنی کہ آج پائی جاتی ہوں ، اس دور کے فرقوں کو سماجی گروہوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ، ایک فرقہ کا بچہ دوسرے فرقہ میں ضم نہیں ہوسکتا تھا ، ذات پات کے ترقی یافتہ نظام کی چار خصوصیتیں ہیں ، ایک تو یہ ہے کہ اپنی ذات سے باہر شادی بیاہ کی اجازت نہیں ہوتی ، ایک ذات کے مختلف گروہوں کے ساتھ بھی یہی

اصول برتا جاتا ہے ' دوسری یہ کہ ہر ایک ذات کا پیشہ موروثی ہوتا ہے ' صرف زراعت ہی کا پیشہ ایسا ہے جس کو ہر کوئی اختیار کرسکتا ہے ' تیسری یہ کہ ہر ایک ذات کے کھانے پینے کے اصول جدا گانہ ہوتے ہیں ' ایک ذات والے دوسری ذات والوں کے ساتھ ملکر کھا پی نہیں سکتے ' چوتھی یہ کہ ہر ایک اپنی ذات والوں کو اپنا بھائی اور دوسری ذات والوں کو اپنا دشمن تصور کرتا ہے ' خوشی اور رنج کے موقعوں پر اپنے بھائی کے دکھ سکھ میں شریک رہتا ہے ' اس کے کاموں میں اپنا ہاتھ بٹاتا ہے ' اور تکلیف کے وقت روپیہ پیسے سے اس کی مدد کرتا ہے ' جب کوئی شخص سماجی پابندیوں کو توڑنے کی کوشش کرتا تو اس کو ذات سے باہر کردیا جاتا تھا ' اور اس کے ساتھ برادرانہ سلوک نہیں کیا جاتا ' ایسے آدمیوں کو تنہا دنیا کی مصیبتیں جھیلنی پڑتی تھیں ' مگر جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں ' ذات پات کے نظام پر سختی سے عمل نہیں ہوتا تھا ' ہر دور میں نئی نئی ذات وجود میں آتی اور حالات کے مطابق ذات پات کی پابندیوں میں ترمیم ہوجاتی ' پیشوں کے اختیار کرنے کے متعلق بھی اس زمانہ میں زیدہ پابندیاں نہیں تھیں ' البتہ شادی بیاہ کے معاملہ میں ضرور سختی برتی جاتی تھی ۔

اس دور میں چار ذاتوں کا نام آتا ہے ' برہمن یعنی طبقۂ پروہت ' چھتری یعنی طبقۂ شاہی وسپہ گری ' ویش یعنی عوام اور شودر یعنی نیچ ذات ' ان کے درمیان آپس میں شادی بیاہ بالکل ہی ممنوع نہیں تھا ' مگر جب کبھی اس قسم کی شادیاں ہوی ہیں تو ان کی اولاد ایک الگ ذات کی خیال کی جاتی تھی ' شودر کبھی کبھی اتنی طاقت حاصل کرلیتے کہ وہ دوسری ذاتوں سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے اور عوام سے گھل مل جاتے ' کاریگروں کا درجہ کاشتکاروں سے کم تھا ' تمام لوگ مختلف اسباب کی بنا پر گروہ در گروہ اور ذات

در ذات بٹتے ہوے چلے جارہے تھے ' اسباب کی پوری تحقیق اب تک نہ ہوسکی ' ان کے متعلق جو نظریے پیش کیے جاتے ہیں ' ان کی حیثیت قیاس سے بڑھ کر نہیں ہے ' ہاں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ پہلے پہل رنگ کی وجہ سے کالے دراوڑیوں سے گورے آریوں کا فرق کیا جانے لگا ' اس کے بعد دوسرے اسباب بھی پیدا ہوتے گئے ' جن کی وجہ سے لوگ ذات در ذات بٹتے ہوے چلے گئے ' اور ہر ایک پر ذات کی پابندیاں عائد کردی گئیں * ' بعض ماہرین تحقیقات کا خیال ہے کہ آریوں کے آنے سے پہلے دراوڑیوں میں گورے کالے کی تمیز کی جاتی تھی ' اگر یہ صحیح ہو تو ذات پات کا نظام بہت پہلے سے شروع ہوجاتا ہے ' مگر اس خیال کی تائید میں قطعی شہادتوں کا پیش کرنا بہت مشکل ہے ۔

اس دور میں مذہب اصنام پرستی کا دوسرا نام تھا ' رگ وید کے زمانہ کے دیوتاؤں کی اب بھی پوجا کی جاتی تھی ' مگر ان کی شکل اور اہمیت میں فرق آگیا تھا ' شیو اور وشنو کی اہمیت اب بڑھ گئی تھی ' آجکل ہندو انہی دو دیوتاؤں میں سے کسی ایک کی پوجا کرتے ہیں ' رگ وید کے زمانہ میں وشنو سورج کا دیوتا تصور کیا جاتا تھا ' لیکن اس کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی کہ بعد میں اس کو حاصل ہوی ' تاہم اس کا درجہ رُدرا سے کم تھا ' جس کو آجکل شیو کہا جاتا ہے ' اس کی حیثیت ' معبود کبیر ' کی تھی ' قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر آریائی [illegible]

* اس دور میں ایک ایسے نظام کا بھی پتہ لگتا ہے جس کو بدھمت کی ابتدائی کتابوں میں ' سرینی ' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ، اس کے معنی ' انجمن باہمی ' کے بتائے دیے جاتے ہیں ، اس نظام کی پوری جزئیات معلوم نہیں ہوئیں جن سے اس معنی کی تصدیق ہوسکے ، سرینی ، اس گروہ کو کہا جاتا تھا جس کے افراد کا پیشہ ایک ہی ہو اور وہ سب ملکر ایک پنچایت یا سر گروہ کی ماتحتی کام کریں ، اس کی حیثیت گویا پیشہ کی ذات کی تھی ، اس سے زیادہ اس کے متعلق کوئی مفید مفصل معلومات موجود نہیں ہیں ۔

کچھ نشانیاں موجود تھیں ، کیونکہ بقول سرجان مارشل موہنجوداڑو کا دیوتا شیو کے بالکل مشابہ ہے * غالباً وادی سندھ کا یہ پرانا دیوتا آریوں کے زمانہ میں ردرا بن گیا اور قدامت کی بناء پر اس کو دوسرے تمام دیوتاؤں پر فوقیت حاصل ہوگئی ۔

اس زمانہ میں پروہتوں کا اثر اور رسوخ بڑھ چلا تھا ، یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ ایک پروہت دیوتاؤں سے جبراً کوئی بات منواسکتا ہے بشرطیکہ وہ بھینٹ چڑھانے کی رسم کو کل جزئیات کے ساتھ کسی غلطی کے بغیر ادا کرے ، یہ رسوم اتنے مشکل ہوتے تھے کہ ایک تجربہ کار پروہت ہی ان کو بخوبی ادا کر سکتا تھا ، جان بوجھ کر یا بے سمجھی سے کسی غلطی کا ہوجانا مقصد کو فوت کردیتا تھا ، ایک عام آدمی کو دیوتاؤں کی خوشی حاصل کرنے کیلئے ایک برہمن ہی کی طرف توجہ کرنا پڑتا تھا ، اس لئے وہ قدرتی طور پر اس کی عزت اور تعظیم کرنے پر مجبور تھا اور اپنی کسی تقریب میں بھی اس کو نظر انداز کرنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا ،

ایک طرف پروہتوں کا اقتدار بڑھتا جا رہا تھا تو دوسری طرف افکار مذہبی میں ایک انقلاب ہو رہا تھا ، جس کا لازمی نتیجہ پروہتوں اور رسموں کا بیکار ہوجانا تھا ، اپنشدوں میں جو رگ وید کے بعد کی کتاب ہے ، کائنات کی وحدت اور وجود مطلق پر بہت زور دیا گیا ہے ، کوئی انسان براہ راست وجود ازلی تک نہیں پہنچ سکتا ، اگرچہ ان خیالات میں زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی ، تاہم اسی زمانہ سے مابعد الطبعیاتی مسائل پر دقیق بحثیں کی جانے لگی تھیں جو بعد کی کتابوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے ، ان مسائل کی وجہ سے مفکرین اصنام پرستی کی تخیل سے بہت دور ہٹتے چلے جارہے تھے ،

---

* سرجان مارشل کی مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۵۲ ۔

اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت نئے جنم اور کرما کے مسئلوں کا ظہور ہے ' کرما کے لغوی معنی ' عمل ' کے ہیں ' اس مسئلہ میں انسانی اعمال و کردار کے نتائج سے بحث کی جاتی ہے ' اس سے اس فلسفیانہ خیال کی تائید ہوتی ہے کہ حال ماضی کا مجموعہ ہے ' اور مستقبل کا انحصار لازمی طور سے حال پر ہے ' مگر اس مسئلہ میں شخصی ارادہ کی آزادی کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے ' انسان کو زمانہ حال میں جو کچھ پیش آتا ہے وہ در حقیقت اس کے تمام گذشتہ اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے ' مگر ماضی کے اعمال سے موجودہ عمل کی نوعیت پہلے سے نہیں بتائی جاسکتی ' کیونکہ ہر انسان اپنی راہ عمل کے تجویز کرنے میں بالکل آزاد ہے ' مرنے کے وقت گذشتہ اعمال کے سارے نتائج جمع ہوجاتے ہیں اور دوسرے جنم میں اچھے یا برے جانور کی صورت میں لانے کیلئے اثر انداز ہوتے ہیں ' کسی انسان کا فوری طور پر دوسرے جنم میں آجانا ضروری نہیں ہے ' ایک مدت تک کیلئے اس کو اس کے اعمال کا بدلہ یا ان کی سزا دی جاسکتی ہے ' جس کو مذہبی اصطلاح میں دو لفظوں یعنی جنت اور دوزخ سے تعبیر کیا جاتا ہے ' دوسرا جنم لمبا ہوسکتا ہے مگر اس کا لا انتہا ہونا کوئی ضروری نہیں ' ہر انسان کا نصب العین یہی ہونا چاہئے کہ وجود مطلق کا جزو لاینفک بن جائے ' جب جنم لینے کے تمام دور ختم ہوجاتے ہیں تو اس کا وجود وجود مطلق سے مل جاتا ہے ' برہمن اسی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ' وجود مطلق کے ساتھ متحد یا اس میں جذب ہوجانے کو بعض لوگ ' عدم فنا ' یا ' زندگی جاوید ' سے تعبیر کرتے ہیں ' مگر ان دونوں اصطلاحوں میں ایک باریک فرق ہے ' کیونکہ پہلی شکل میں شخصی وجود فنا ہوجاتا ہے اور دوسری شکل میں وہ ہمیشہ کیلئے باقی رہتا ہے ' یہ خیال کہ شخصی وجود کا خاتمہ سب سے بڑی نیکی ہے لازمی طور سے اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ یہ ایک بہت

بڑی آئی ہے ، اگرچہ ہمارا یہ استنباط اس دور کی کتابوں میں پایا نہیں جاتا ، تاہم یہ یقین ہے کہ اس نتیجہ کے نکالنے میں زیادہ زمانہ نہیں لگا ہوگا ، کیونکہ چھٹی صدی قبل مسیح کے مصلحین کی تعلیمات میں ، جن کی تفصیل پانچویں باب میں آئیگی ، زندگی کا مایوس کن نظریہ پایا جاتا ہے ،

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بعد کے ویدوں کے زمانہ میں گنگا کی ترائی میں ہندومت کی راہیں متعین ہوگئی تھیں ، مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جنوبی ہند میں اس کی اشاعت کسطرح ہوی ، بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ برھمن پرچاریوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں گھوم کر ان نئے خیالات کا پرچار کیا ، لیکن اس کی صحت پر کوئی ثبوت نہیں پیش کیا ہے ، اس لئے صرف اتناھی کہا جاسکتا ہے کہ شمالی اور جنوبی ہند میں تدریجی طور پر ہندومت پھیلا اور وہاں کے باشندوں کی زندگی اس مذھب کے اصول کے مطابق ڈھل گئی ،

باب ۳

هندو معاشرت

مقامی اور عارضی رکاوٹوں کے باوجود تیرھویں صدی عیسوی تک ہندومت سارے ملک پر چھا گیا ، اور جب ملک کے اقتدار کی باگ مسلمان فاتحین کے ہاتھ میں آئی ، تو ہندو طرز معاشرت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ' عام طور پر لوگ ہندومت ہی کے پیرو رہے ' اس جگہ مناسب ہوگا اگر ہندو معاشرت ایک خاکہ پیش کیا جائے ' جو کسی ایک دور سے نہیں بلکہ پورے ہندو عہد سے تعلق رکھتی ہے '

زندگی کا اصول دھرم پر مبنی تھا ' جس کے معنی ' انسان کے کل فرائض ' کے لئے جاسکتے ہیں ' مگر عام طور پر اس کو ' مذہبی مقدس قانون ' کہا جاتا ہے ' اس کے ماخذ وید کی شروح ہیں ' جو آٹھ سو برس قبل مسیح سے آگے کی چند صدیوں میں لکھی گئی ہیں ' یہ شرحیں اب تک نامکمل سمجھی جاتی ہیں ' برطانوی ہند کے جج اس قانون کی ' جس کو اب شخصی قانون کہا جاتا ہے ' مختلف تعبیریں کرتے چلے جا رہے ہیں ' سب سے زیادہ اہم اور مشہور قانون دھرم شاستر کا ہے ' لیکن بعد کے لوگوں نے اس کی جو تشریحات لکھی ہیں وہ اگلوں کی تشریحات پر غالب آگئی ہیں ' ان کی تصنیف کی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں ہے ' ان میں سے بعض ایسے قوانین ہیں ' جن میں بارہا رد و بدل ہوا ہے ' خود منو کے دھرم شاستر میں محققین کا شبہ ہے کہ وہ کس دور کا ہے ' اس کا زمانہ دو سو برس قبل مسیح سے لیکر دو سو برس بعد مسیح تک کا بتایا جاتا ہے۔

مقدس قانون کی پیروی بادشاہوں اور عام لوگوں کیلئے لازم ہے ' اس میں ترمیم نہیں ہوسکتی ' تاہم بعد کے

شارحین نے ایک حد تک ضمنی قوانین کی ترمیم کردی ہے ' بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک حد تک ان میں تدریجی ترقی ہوی ہے ' کیونکہ مختلف نقطۂ خیال والوں نے اپنی سمجھ کے مطابق ان قوانین کی توجیہ کی ہے ' اور بدلتے ہوے حالات کا بھی ان پر کافی اثر پڑا ہے ' اس کے باوجود اصول اپنی جگہ پر ہیں ' ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوی ہے ' ذیل میں ہم ان ہی کا خلاصہ پیش کرنا چاہتے ہیں ۔

مقدس قانون میں ایک سے زیادہ سلطنتوں کے وجود کی گنجائش ہے جن کے آپس میں جنگ بھی ہوسکتی ہے ' ہر ایک بادشاہ اپنی سلطنت کے اندر انسانی شکل میں ایک بڑا دیوتا ہے ' اس کا اہم فرض اپنی رعایا کی حفاظت کرنا ' مفسدوں کو سزا دینا اور لگان وصول کرنا ہے ' جس کا ادا کرنا رعایا پر فرض ہے ' اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک قابل پروہت کو اپنا وزیر اعظم بنائے ' اور مجلس مشورت سے روزانہ راے اور مشورہ لیا کرے ' ملک میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہو اور بادشاہ ان کی دیکھبانی کیلئے سرکاری افسر مقرر کرے ' یہ سرکاری افسر دس قریوں سے لیکر ہزار قریوں کے حاکم ہوتے تھے ' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذہبی طور پر حکومت کی تشکیل کی گئی تھی ' مگر کسی دور میں بھی اسپر عمل نہیں کیا گیا ۔

بادشاہ کو مطلق العنان فرض کیا گیا تھا ' بعض جدید مصنفین نے اس پر بحث کی ہے کہ وہ مجلس مشورت کا پابند سمجھا جاتا تھا ' گویا اس کی حیثیت آجکل کے قانونی بادشاہ کی تھی ' اس جگہ ان کے مختلف دلائل کی تفصیل نہیں پیش کی جاسکتی ' یہ اعتراض ضرور ہوتا ہے کہ اگر اس دور کے بادشاہوں کی حیثیت قانونی تھی تو مجلس مشورت کو بھی فروغ ہونا چاہئے تھا ' حالانکہ ہندو سلطنتوں میں اس

کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔ بدیسی سیاحوں نے بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے ، بلکہ اس کے بر خلاف وہ ہندو بادشاہوں کو مطلق العنان قرار دیتے ہیں ۔ اس کے باوجود شاہی استبداد پابندیوں سے خالی نہیں تھا ۔ چونکہ بادشاہ مقدس قانوں کی فضا میں پل کر بڑا ہوتا تھا اور اس کے مشیر بھی مذہب کے پابند ہوتے تھے اس لئے یہ قیاس کرنا بیجا نہ ہوگا کہ مذہبی تعلیم و تربیت اور مشیروں کا رسوخ بسا اوقات بادشاہ کو مطلق العنان ہونے سے روک لیتا تھا ۔ اس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس زمانے کے بادشاہوں میں خدمت خلق کا جذبہ کس حد تک تھا ۔ بادشاہ اچھے اور برے دونوں قسم کے تھے ، لیکن یہ بتانا دشوار ہے کہ کس کی تعداد زیادہ تھی اور کس کو غلبہ زیادہ تھا ۔

رگ وید کے بعد کے دور میں شہنشاہی کا نظریہ کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا ہے ، مذہبی کتابوں میں ایک خاص قسم کی رسم کا وجود ملتا ہے جو ' فاتح عالم ' کے لئے مناسب اور موزوں تھی ۔ ہندو عہد میں کئی سلطنتیں وجود میں آئیں ، جن کے ماتحت مختلف ریاستیں تھیں ، اور جنہوں نے خراج دیکر اپنی آزادی قائم رکھی ، جب ان سلطنتوں کا شیرازہ بکھر گیا تو ماتحت ریاستیں آزاد ہوگئیں ، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ کے ماتحت بادشاہ کے اصول کو مان لیا گیا تھا ، جب اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت قایم ہوی تو اسی اصول کے ماتحت ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کی اطاعت کرلی ، اور آج تک ہندو ریاستیں اسی اصول پر کاربند نظر آتی ہیں ۔

کسی شخص کا مرتبہ اس کے نسلی امتیاز پر مقرر کیا جاتا تھا ، ذات پات کا نظام موجود تھا ، مگر اتنا وسیع اور سخت نہیں جتنا کہ آج پایا جاتا ہے ۔ مختلف ذاتوں کے درمیان آپس میں کبھی شادی بیاہ بھی ہوتے تھے ، چھوت چھات کو اتنی ترقی

نہیں ہوی تھی ' ہر ذات کا پیشہ متعین تھا اور ہر ایک فرد عام طور پر موروثی پیشہ ہی کو اختیار کرتا تھا ' سب سے اہم پیشہ کاشتکاری کا تھا ' زرعی نظام دیہاتوں کے اصول پر قایم تھا ' ہر دیہات میں آبادی کا سکونت پذیر ہونا کوئی ضروری نہیں تھا ' عام طور پر دیہات کی کاشت وہ لوگ کرتے جو اس کے حدود کے اندر رھتے تھے -

اس زمانہ کے قریہ اور دیہات کے متعلق بہت سی نظمیں بھی لکھی گئی ھیں ' مگر ان میں زیادہ ترتخیل ھی کارفرما ھے ' ان سے اس زمانہ کا ایک صحیح نقشہ مرتب نہیں کیا جاسکتا ' ان سے اتنا ضرور پتہ چلتا ھے کہ مختلف برادریاں خاص خاص دیہاتوں میں سکونت پذیر ھوچکی تھیں ' اور برادری کے ھر ایک فرد کے پاس علحدہ علحدہ زمینیں ھوتی تھیں جن کی وہ کاشت کرتا تھا ' ھر ایک کی ملک موروثی تھی ' اپنے بعد اس کا وارث اس کا جانشین ھوتا تھا ' اور ملک کو بیچنے یا رھن رکھنے کا ھر ایک کو حق حاصل تھا ' لوگ بادشاہ کو لگان ادا کرتے تھے اور اس کے بدلے بادشاہ کا فرض تھا کہ ان کی حفاظت کرے ' لگان کے وصول کرنے کیلئے سرکاری ملازم مقرر تھے ' بیگار بھی ھوتے تھے جن کا کام زمین کی کاشت کرنا ھوتا تھا ' بعض لوگوں کو مزدوری دینے کی بجاے زمین کا ایک حصہ دیدیا جاتا تھا تاکہ اس میں کاشت کرکے اپنی زندگی بسر کریں ' ایسے بھی لوگ تھے جو اجارہ داری کے اصول پر کاشت کرتے تھے ' مگر اس کے متعلق کافی شہادتیں موجود نہیں ھیں ' یہ نہیں معلوم کہ کب سے بیگاروں کا وجود ھوا ' بادشاھوں اور امیروں کی بھی خاص زمینیں ھوتی تھیں ' جن کی کاشت بیگاروں یا اجارہ داروں یا دونوں کے ذریعہ کی جاتی تھی -

زمینوں کی ملکیت کے متعلق تین نظریے پیش کیے گئے ھیں ' ایک یہ کہ زمین کا حقیقی مالک بادشاہ ھے اور لوگ

اس کے اجارہ دار ہیں ' اور جو کچھ لگان بادشاہ کو دیتے ہیں وہ بطور اجارہ کے ہے ' دوسرا یہ کہ لوگ در حقیقت زمین کے مالک ہیں ' اور لگان بطور محصول کے بادشاہ کو ادا کیا جاتا ہے ' تیسرا یہ کہ زمین کی ملکیت کا یہ قانونی تصور مذہبی قانون کی تدوین کے وقت کسی کے ذہن میں نہ تھا ' بادشاہ اور برادری کے آپس کے تعلقات کسی قانون پر مبنی نہ تھے ' بلکہ ان کی حیثیت محض سیاسی تھی ' چونکہ بادشاہ رعایا کی حفاظت کا ذمہ دار تھا اس لئے لگان کا ادا کرنا رعایا کا فرض تھا ' اگر کوئی لگان نہیں ادا کرتا تو یہ مذہبی قانون کی خلاف ورزی اور بادشاہ کے خلاف بغاوت متصور ہوتی ' ہم اس جیسی مختصر کتاب میں ان نظریوں پر تفصیلی بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے ' اس لئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں -

یہ سوال عملاً بہت اہم ہے کہ پیداوار کا کتنا حصہ بادشاہ کو دینا چاہئے ' وید کی وہ عبارتیں جو اس مسئلہ سے متعلق ہیں ' اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ ان سے مقدس قانون کے ارتقا کی کیفیت معلوم ہوتی ہے ' متن کے لکھنے والوں نے عموماً چوتھا حصہ یا سر ... بھی کو مقرر کیا ہے ' مگر منو کا قانون ضرورت کے وقت ایک چوتھائی وصول کرنے کی اجازت دیتا ہے ' بعد کے ایک شارح نے ' جو ... حصہ کہلاتا ہے ' کا فقرہ استعمال کیا ہے ' شاید یہ بتانے کے لئے کہ اس کے زمانہ میں خراج کی طرح اس کسر کے بھی ایک اصطلاحی معنی تھے ' منو کے ایک شارح نے ضرورت کے اوقات میں ' یا ایک تہائی ' کا فقرہ بھی بڑھا دیا ہے ' ایک دوسرا شارح آجکل کے دفتری مثل نویس کی طرح اس کی اس طرح تشریح کرتا ہے کہ چوتھے حصہ میں ایک چوتھائی یا ایک تہائی دونوں داخل ہیں ' غالباً یہ لوگ اپنے اپنے زمانہ کی شرح کو سامنے رکھ کر متن کی تشریح کر رہے ہیں ' پہلے پہل محض ضرورت کے وقتوں پر زیادہ شرح سے لگان وصول کرنے کی اجازت دی گئی تھی ' مگر جیسے جیسے

زمانہ گذرتا گیا عام حالات میں بھی یہی شرح قایم رہی ' اور رعایا پر حد سے زیادہ بوجھ پڑگیا ' اس خیال کی تصدیق جنوبی ہند کی بعض قدیم یادداشتوں سے ہوتی ہے ' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لگان کی حقیقی شرح اس کی روایاتی شرح سے بہت زیادہ تھی '

زمینوں کا لگان شاہی خزانہ کو نہیں پہنچتا تھا ' بلکہ وہ شخص لے لیتا تھا جو اس علاقہ کا حکمران یا عامل مقرر ہوتا تھا ' اس کو شاہی خزانہ سے کوئی تنخواہ مقرر نہیں تھی ' اس کو اس کا پورا اختیار دیا گیا تھا کہ اپنی مرضی کے مطابق رعایا سے لگان وصول کرے اور ان کی حفاظت کا انتظام کرے ' عامل کو جو زمینیں دی جاتیں وہ عارضی ہوتی تھیں اور مندروں کو جو جاگیریں عنایت کی جاتیں وہ دوامی ہوتی تھیں آمدنی کے ذریعے کو اپنے قبضہ میں نہ رکھنے کا یہ دستور برطانوی دور تک جاری رہا ' اور بہت سی حکومتوں کی اقتصادی تباہی اسی دستور کی وجہ سے ہوئی ہے ' تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس زمانہ میں یہی طریقہ زیادہ آسان اور سہل تھا ' عاملوں اور افسروں کو مختلف جاگیریں دینے کے باوجود ابھی اتنی زمینیں بچ رہتی تھیں کہ ان سے بادشاہ کو کافی آمدنی ہوجاتی تھی ' اس کے علاوہ رعایا کے اور طبقوں سے بھی کچھ نہ کچھ وصول کیا جاتا تھا ' چنانچہ تاجروں اور کاریگروں سے بھی محصول لیا جاتا تھا ' اس کا ایک باضابطہ قانون بھی تھا جس کی بعض دفعات رعایا کیلئے سخت نقصان دہ تھیں ' تاہم مصلحین کی بار بار کوششوں کے باوجود مسلمانوں کے دور حکومت تک اسی ضابطہ پر عمل کیا جاتا رہا ' اور اب تک ہند میں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں '

جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے سلطنت کو چلانے اور لگان وصول کرنے کیلئے سرکاری افسروں اور عاملوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی ' اگرچہ مذہبی مقدس قانون کے مطابق حکومت کرنے کی کوشش کی جاتی تاہم سلطنت کے دستور اور اس کے

نظم و نسق کے متعلق خاص کتابوں کے لکھنے کی طرف توجہ کی گئی ، اس سلسلہ کی پہلی کتاب کوتلیہ کی ارتھ شاستر * ہے ، کہا جاتا ہے کہ کوتلیہ چندرگپت موریہ کا وزیر تھا ، چندر گپت ۳۰۰ ق م پٹنہ میں سلطنت کرتا تھا ، بعض جدید مفکرین اس تاریخ کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں ، اور بعض اس کو پانچ سو سال بعد کی تصنیف بتاتے ہیں ، اور بعض کا خیال ہے کہ یہ کتاب تدریجی ترقیوں کا نتیجہ ہے ، اس لئے اس کی تاریخ متعین نہیں کی جاسکتی ، بعض سمجھتے ہیں کہ اس کتاب میں اس دور کے نظام سلطنت کو پیش کیا گیا ہے ، اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت ایک مذهبی کتاب کی ہے ، جس کا اثر آئندہ چلکر مختلف دور کے حکمرانوں اور مدبروں کے خیالات پر پڑا ، اگر پہلی بات ٹھیک ہوتو یہ کتاب ایک ناشایستہ نظام حکومت کا مرقع ثابت ہوتی ہے ، کیونکہ اس میں ایک مضبوط حکومت کے قیام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں جائز اور ناجائز دونوں طریقوں کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے ، تاریخ سے اس کا ثبوت نہیں دیا جاسکتا کہ کسی دور میں بھی اس کتاب کے قوانین وضوابط پر عمل کیا گیا ، یا وہ زمانہ جس میں اس کتاب کی تدوین ہوی دیانت داری اور صاف گوئی کا ایک سنہرا دور تھا ، اس کے بر خلاف ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس زمانہ میں بھی اس قسم کے مظالم ہوتے تھے ، جیسے کہ آج ہر حکومت میں پائے جاتے ہیں ، بلکہ اس کتاب کے مصنفین ایسے مظالم کو ضروری قرار دیتے ہیں ، لیکن اس بات پر کوئی یقینی ثبوت نہیں ہے کہ ہندو سلطنت کے پورے دور میں اس قسم کے مظالم ضرور ہوتے رہے ، یہ کتاب اس حیثیت سے بہت مفید ہے کہ اس سے اس زمانہ کی حکومت کی شکل اور محصول کے نظام کا ایک بہترین خاکہ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے ،

---

* شما ساستری نے میسور سے سنہ ۱۹۲۳ء میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ شایع کیا ہے ،

مذہبی قانون کے مطابق ایک ہی شادی کرنی چاہئے ؛ لیکن یہ حکم کہ موتی کے رسوم صرف مرد وارث کو انجام دینے چاہئیے ، ایک شادی کے اصول کے خلاف ہے ، کیونکہ نرینہ اولاد کی خواہش بسا اوقات ایک سے زیادہ شادیوں کے کرنے پر ترغیب دیتی تھی ، تاہم صرف بادشاہ ہی ایک سے زیادہ شادیاں کرتے تھے ، عوام عام طور پر ایک بیوی پر اکتفا کرتے تھے ، غالبا اسی حکم کی بناء پر لے پالک کا طریقہ جاری ہوگیا ، آج بھی لے پالک لڑکا خاندان کا ایک فرد خیال کیا جاتا ہے ، اور وہ حقیقی لڑکے کی طرح موتی کے ضروری رسوم انجام دے سکتا ہے ، بعض مصنفین بچپن کی شادی اور منگنی پر جو زور دیتے ہیں وہ اسی وجہ سے ہے کہ نرینہ اولاد کی ضرورت ہے ، مگر اس دور کی کتابوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طریقہ عام طور پر رائج نہیں تھا ،

جائداد کی ملکیت کے قوانین میں ایک تدریجی ترقی ہوئی تھی ، خاندان کا سرگروہ جائداد کا مالک ہوتا تھا ، مگر اس کے اختیارات محدود تھے ، نرینہ اولاد ہی جائداد کی وارث ہوتی تھی ، باپ جائداد کا مالک نہیں بلکہ ایک منتظم متصور ہوتا تھا ، اس کے مرنے کے بعد اسکی اولاد برابر برابر کا حصہ پاتی تھی ، جائداد کی فوری تقسیم کوئی ضروری نہیں تھی ، کئی نسلوں تک پوری جائداد ایک خاندان کے قبضہ میں رہ سکتی تھی ، اس کے ساتھ شخصی ملکیت کا اصول بھی تسلیم کرلیا گیا تھا ، اور تقسیم کے وقت اس پر عمل کیا جاتا تھا ، عورتوں کو موروثی جائداد میں سے قانونا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا ، مگر دوسرے ذریعوں سے ان کو کافی جائداد مل جاتی جو ان کی ذاتی ملکیت متصور ہوتی تھی ، اس دور میں عورتوں کا درجہ مردوں سے کم تھا ، اس زمانہ کے لکھنے والوں کے نزدیک عورتوں کی عزت صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ بچوں کی ماں ہوتی ہے اور مذہبی رسوم کے انجام دینے میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہے ، *

* عورتوں کے حقوق ملکیت کے مسئلہ پر ہند کی مجلس قانون ساز غور کر رہی ہے اور اس میں اہم تبدیلیاں ہورہی ہیں ،

اس سلسلہ میں ستی اور پردہ دو چیزوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے ' ستی میں یہ ہوتا تھا کہ بیوہ عورت شوہر کی چتا پر جل کر مرجاتی تھی ' بہت سی قوموں میں اس رسم کا وجود ملتا ہے ' لیکن ہندوؤں ہی کی ایک ایسی قوم تھی جو ایک زمانہ تک اس کے ادا کرنے پر مصر تھی ' یہ نہیں معلوم کہ یہ رسم کس طرح ہندوؤں میں آئی ' بعض مذہبی کتابوں میں اس رسم کو مان بھی لیا گیا ہے ' چوتھی صدی قبل مسیح میں یونانی حملہ آوروں کو اس رسم پر بڑا ہی تعجب ہوا تھا ' اسلئے یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندو عہد میں اس کا رواج تھا ' مسلمانوں کے عہد میں بعض حکمرانوں کے روکنے کے باوجود اس رسم پر عمل ہوتا رہا ' یہاں تک کہ سنہ ۱۸۳۰ع میں اس کو بالکل ہی ممنوع قرار دیا گیا ' اس رسم کے دو رخ ہیں اگر خاندان یا پروہت کے جبر کرنے پر کوئی بیوہ عورت آگ میں جلکر مرجائے تو یہ صریحی طور پر ظلم ہے ' اور اگر اپنی خوشی سے چتا پر لیٹ جائے تو بے لوث محبت کا بلند ترین نمونہ ہے ' سترھویں صدی کے ایک انگریز تاجر ولیم میتھولڈ * کے قول کے مطابق یہ نہیں معلوم کہ شوہروں کے ساتھ عورتوں کی اس بے لوث محبت پر ان کی تعریف کرنی چاھئے یا ان پر افسوس کرنا چاھئے '

دوسری رسم پردہ کی ہے ' مذہبی کتابوں میں س رسم کا کوئی سراغ نہیں ملتا ' اور نہ ہندو عہد کی کسی کتاب میں صراحت کے ساتھ اس کا کوئی تذکرہ ہے ' عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسلامی عہد کی یادگار ہے ' جبکہ ہندوؤں نے حاکموں کے طور طریقے اختیار کرلئے ' قرائن سے پتہ چلتا ہے ' کہ ہندو عہد میں بھی شاہی محل کی عورتیں اپنے خاص خاص کمروں میں رہتی تھیں ' یہ کوئی ضروری

* دیکھو '' ریلیشنس آف گولکنڈہ ،، (مطبوعہ ہکلیوٹ سوسائٹی سنہ ۱۹۳۱) صفحہ ۳۸ ، اور التکار کی کتاب '' دی پوزیشن آف ومن ان ہندو سولیزیشن ،، (مطبوعہ بنارس سنہ ۱۹۳۸) میں اس موضوع پر بہت سی معلومات ملینگی ،

نہیں ہے کہ ہندوون نے اس رسم کو مسلمانوں سے لیا ہو ' ممکن ہے کہ شمالی ہند کے ہندوون کو مسلمانون کی دیکھا دیکھی اس رسم کے عام طور پر اختیار کرلینے کی ترغیب ہوی ہو '

مذہبی قانون غلامی کو تسلیم کرتا ہے ' جنگ میں پکڑے ہوے قیدی اور ان کی اولاد غلام بنالی جاتی تھی ' اگر کوئی جرم کر بیٹھتا یا قرض نہیں ادا کرتا تو وہ بھی غلام بنالیا جاتا تھا ' شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ قحط کے زمانہ میں لوگ اپنی ذات کو یا اپنی اولاد کو بیچ دیتے تھے اور ایک مدت تک کیلئے اس شخص کے غلام بن جاتے تھے جو ان کی پرورش کرنے کا ذمہ لیتا تھا ' ہندو عہد کی مختلف کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گھریلو کاموں کیلئے غلام مقرر تھے ' مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کارخانون میں ان سے کام لیا جاتا تھا ' جیسا کہ دوسرے ملکون میں اس کا رواج تھا ' قریون میں بیگار بھی تھے ' ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا تھا ' چونکہ ان کے متعلق کوئی واضح شہادتیں موجود نہیں ہیں ' اس لئے ان کی قانونی حیثیت کے متعلق صراحت کے ساتھ کوئی بات نہیں لکھی جاسکتی '

ہندو عقیدہ کی کوئی خاص شکل نہیں تھی ' ہر ایک اپنے عقیدہ کا آپ مالک تھا ' جب تک برھمن اور گاے * کی عزت کرتا رہے اور اپنے پڑوسی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے ' وہ ہندو ہی متصور ہوتا تھا ' دیوتاون کی ہر جگہ کثرت تھی ' اور ایک ہندو جس کی بھی چاہے پوجا کرسکتا تھا ' ہر ایک دیوتا کو فیاض اور کریم نہیں خیال کیا جاتا تھا ' دیوتاون

---

* گاے کے تقدس کا عقیدہ بتدریج ظہور میں آیا ، پرانے زمانہ کے ہندو گاے کا گوشت کھاتے تھے اور معزز مہمانون کو کھلاتے تھے ، اگرچہ ان سے ضرور یہ توقع کی جاتی تھی کہ اس کے کھانے سے انکار کرینگے ، حضرت مسیح کی پیدائش کے قریب یہ عقیدہ عام ہوگیا تھا کہ گاے کا ذبح کرنا اور اسے عمداً نقصان پہنچانا زبردست گناہ ہے ، بعد میں بیل کو بھی اس حکم میں شریک کرلیا گیا ،

کی همدردی حاصل کرنے کیلئے هی بھینٹ نہیں چڑھائی جاتی تھی ' بلکہ خبیث روحوں کو راضی کرنے کے واسطے بھی جانور ذبح کئے جاتے تھے ' تمام دیوتاوں میں شیو اور وشنو کی بڑی عزت تھی ' ان دونوں کے علاوہ برهما کو بھی بڑا درجہ حاصل تھا جس کو خالق کائنات سمجھا جاتا ہے ' مگر شیو اور وشنو کے مقابلہ میں اس کی اهمیت کم تھی ' ان دونوں کی پرستش آگے چلکر کرشن اور رام کی پرستش کی صورت میں نمودار هوی ' جو ان هی دو دیوتاوں کے اوتار تھے ' ان کی پرستش ایک حیثیت سے وحدانیت کی ترقی کا موجب هوی ' اس کا ذکر آئندہ آئیگا مذهبی رسوم کی ادائیگی میں برهمن کا رهنا ضروری تھا ' اور وهی ان رسوم کو بخوبی انجام دے سکتا تھا' اس کے بغیر تمام رسوم اور بھینٹ دونوں غیر موثر خیال کیے جاتے تھے ' عوام برهمن کے طلسماتی اثرات کے قایل تھے ' اور یہ عقیدہ تھا کہ برهمن دیوتاوں کو کسی کام کے پورا کرنے پر مجبور کرسکتا ہے ' تیاگ اور تپس کے ذریعہ یہ قوت پیدا کی جاتی تھی ' مذهبی کتابوں میں برهمنون کیلئے ایک مدت مقرر کی گئی ھے جس میں وہ تیاگ اور تپس کے ذریعہ اپنے نفس کا تزکیہ کریں ' یهی مشق آگے چلکر ترک دنیا کا باعث هوی ' بہت سے برهمن گھر چھوڑ کر جنگلوں مین زندگی گذارنے اور اپنے نفس کو طرح طرح کی جسمانی تکلیفیں دینے لگے اور جب سکندر اعظم کے ساتھ آئے هوے یونانیون نے ان کو دیکھا تو انہیں بڑا تعجب هوا ' جسمانی تکلیف کا مقصد یہ تھا کہ نفس کا تزکیہ هوجائے اور غالبا یہ اس عقیدہ پر مبنی تھا کہ ایک انسان اپنے جسم کو عذاب میں ڈالکر دیوتاوں سے بھی زیادہ اپنے اندر قوت پیدا کر سکتا ھے ' پرانے قصوں میں دکھایا گیا ھے کہ کسطرح بڑے بڑے دیوتا بھی رشیوں کی دھمکی سے لرز پڑتے تھے ' اور فوراً ان کے احکام کو مان لیتے تھے ' ورنہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں هلاک نہ کردئے جائیں '

اس دور میں کرما اور نئے جنم کا مسئلہ عام عقیدے کا جز بن گیا تھا ' اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ دیوتاؤں کی اہمیت گھٹنے لگی تھی ' ہندومت کو اصنام پرستی کا مترادف نہیں سمجھنا چاہئے ' کیونکہ اس سے مذہبی جذبات کی پوری تسکین نہیں ہو سکتی ' لوگ ایسے نئے راستہ کی تلاش میں تھے جو ان کو منزل مقصود تک پہنچاسکتا ہو ' اور جہاں پہنچ کر ان کی پوری تشفی ہوسکتی ہو '

ہم نے ہندومت کے متعلق اب تک جو کچھ بحث کی ہے وہ ایک مشہور مذہب کی حیثیت سے ہے ' ورنہ مدرسوں میں اس کے دقیق مسائل پر فلسفیانہ بحثیں کی جانے لگی تھیں ' اور بے شمار کتابیں لکھی گئیں ' جن سے اس دور کے لوگوں کی ذہانت ٹپکتی ہے '. ان میں ان سب مابعد الطبیعیاتی مسائل پر بحث کی گئی ہے جنکا آج یوروپ میں شہرہ ہے ' وجود مطلق کے متعلق ایک مختلف نظریہ پیش کیا گیا ہے ' اس دور کے ہندو مفکرین اصنام پرستی سے بہت دور نظر آتے ہیں ' لیکن ان کے افکار کا عوام پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑا ' عوام میں اب بھی اصنام پرستی جاری تھی ' تعلیم یافتہ لوگ گہرے اور دقیق مسائل کی تحقیق میں لگے ہوے تھے انہیں اصنام پرستی سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی ' اس طرح دونوں طبقوں کی راہیں جدا ہوگئی تھیں ' مگر اس کی وجہ سے ہندومت کو کوئی نقصان نہیں تھا ' کیونکہ ایک مقبول عام مذہب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایسے اختلافات کی گنجایش ہو ' ان اختلافات کے باوجود ہندومت کو ترقی ہوتی رہی ' پرانے زمانہ میں مسلکوں کے اختلاف کی بناء پر خون ریزیاں بھی ہوتی تھیں ' تاہم بہت سے لوگ روحانی تزکیہ میں لگے ہوے تھے ' اور عوام تو پورے خلوص کے ساتھ دیوتاؤں کی حسب معمول پرستش کرتے رہے ' البتہ ان کی قوت کی تاثیر میں بعض کو بعض سے زیادہ اعتقاد تھا '

بعض کا خیال ھے کہ آریوں کے آنے سے پہلے ملک کے اصل باشندوں کے عقاید و خیالات مختلف تھے ' اور جب یہ ھندومت قبول کرچکے تو ان کے عقاید و خیالات کا ھندومت پر زبردست اثر پڑا ' جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ اس میں بھی اختلافات پھیل گئے ' بعد کے تجربوں کی بناء پر یہ کہا جاسکتا ھے کہ یہ خیال بعید از قیاس نہیں ھے ' اب بھی بہت سے جنگلی قبایل موجود ھیں جو ظاھری چیزوں کی پوجا کرتے ھیں ' ان کا خیال ھے کہ ھر ایک قدرتی چیز جیسے پتھر یا جھاڑ وغیرہ میں بھوت پریت اور روحیں رھتی ھیں ' کسی زمانہ میں یہ قبائل آریوں سے بالکل الگ قوم شمار ھوتے تھے مگر دھیرے دھیرے یہ ھندو دھرم میں ضم ھوگئے ' برھمنوں کے لئے ان کا ھندو بنادینا بہت آسان تھا ' وہ ان قبیلوں کو صرف اتنا بتا دیتے تھے کہ یہ روحیں جن کی وہ پوجا کرتے ھیں درحقیقت شیو یا ھندو دیوتاوں میں سے کسی ایک کا پر تو ھے ' یہ دلیل ان کیلئے معقول تھی ' پھر تو وہ برھمن کو اپنا پروھت تسلیم کرلیتے اور اسطرح نہایت آسانی کے ساتھ کسی رکاوٹ کے بغیر باقاعدہ رسوم ادا کرکے ان کو ھندو بنالیا جاتا تھا ' اس طریقہ کے متعلق شک و شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ھے ' تاھم تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا '

باب ۴

هندو اقتدار کا ابتدائی دور

ایک عام تبصرہ

هندووں کے سیاسی اقتدار کے زمانہ میں هند کے اندر چھوٹی بڑی سلطنتیں قائم هوگئی تھیں ' ان کا قبضہ زیادہ تر ملک کے زرخیز علاقوں پر تھا ' جنگلوں ' پہاڑوں اور بیابانوں میں وہ قبیلے آباد تھے ' جن میں ابھی تک تمدن نے ترقی نہیں کی تھی ' عام طور پر یہ سلطنتیں ایک دوسرے سے برسر پیکار رهتی تھیں ' اس کے ساتھ سرحدی قبیلوں سے بھی ان کی لڑائی جاری رهتی تھی ' جب کوئی سلطنت اتنی طاقتور هوجاتی کہ دوسری سلطنتیں اس کی مطیع و فرمانبردار هوجاتیں تو وہ مختلف ریاستوں کے درمیان صلح اور امن قایم کرنے کی کوشش کرتی تھی ' اس دور کی سیاسی تاریخ مرتب طور پر بیان نہیں کی جاسکتی ' کیونکہ مستند واقعات موجود نہیں هیں ' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس دور میں بے شمار کتابیں لکھی گئی تھیں ' قانون ' مذهب اور فلسفہ کے علاوہ جن کا ذکر اوپر هوچکا رزمیہ مثنویوں ' ناٹکوں اور نظموں کا ایک ذخیرہ مرتب هوچکا تھا ' صرف ونحو ' ریاضیات اور دوسرے علوم و فنون کی کتابیں مدون هوچکی تھیں ' قصوں اور افسانوں کے متعلق تھوڑی بہت کتابیں لکھی گئی تھیں ' لیکن ان تمام کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی ایسی نہیں هے جس کو تاریخ یا کم از کم وقائع کہا جاسکتا هو ۔ * البتہ بعض تاریخی واقعات ان کتابوں میں بکھرے پڑے ملتے هیں ' اس دور میں علوم و فنون ' شاعری اور فلسفہ تو بہت زیادہ هے مگر فن تاریخ پر اتنی کتابیں بھی نہیں جتنی کہ عبرانیوں ' یونانیوں اور رومیوں کے پاس پائی جاتی هیں ' همارے نزدیک سیاسی واقعات اور حالات کا مو

* ان میں سے صرف ایک کتاب "راج ترنگنی" مستثنی هے ، یہ بارھویں صدی عیسوی کی تصنیف هے ، اس کو ایک حد تک تاریخی کتاب قرار دیا جاسکتا هے ، مگر ابتدائی دور کے متعلق جتنے واقعات هیں وہ بالکل غیر مستند هیں ۔

کچھ بھی علم ہے وہ بڑی حد تک بدیسیوں سے لیا گیا ہے ' ان کا ماخذ بعض صورتوں میں یونانی اور بعض میں چینی اور تبتی اشخاص کی لکھی ہوی کتابیں ہیں ' جن کی تائید ان بے شمار غیر مکمل سکوں اور کتبوں سے ہوتی ہے ' جن کا اکتشاف حال ہی میں ہوا ہے ' اس لئے ہند کی تاریخ کو مسلسل داستان کی صورت میں پیش کرنا ناممکن ہے ' البتہ اس کے مختلف ٹکڑے ترتیب وار پیش کئے جاسکتے ہیں ۔

پرانے عہد کی تاریخ غیر قطعی ہے اور اس سلسلہ میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ بالکل غیر مستند ہیں ' مگر جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے ' سکوں اور کتبوں کی مدد سے تاریخی واقعات کو مرتب کیا جاسکتا ہے ' یہاں بھی ایک زبردست مشکل یہ ہے کہ سکوں اور کتبوں میں مختلف سنین کو استعمال کیا گیا ہے ' جن کا پہچاننا بہت دشوار ہے ' مغربی محققین نے جب پہلے پہل ان کے حل کرنے کی طرف توجہ کی تو یہ سنین فرسودہ اور کہنہ ہوچکے تھے ' ان کی تحقیق کی ابتدا اس وقت ہوی جبکہ سر ولیم جونس نے یہ ثابت کیا کہ یونانی مورخین نے جس شخص کو ' سندرو کوٹا ' لکھا ہے وہ در حقیقت موریہ خاندان کا چندرگپت ہے جو تین سو برس قبل مسیح میں ہند کا مشہور بادشاہ تھا ' اس کے بعد سے سنہ وار واقعات کی تاریخ زیادہ متعین نظر آتی ہے ' تاہم چند مخصوص واقعات کے متعلق اب بھی اختلاف رائے کی بہت گنجائش ہے ۔

بد قسمتی سے اس دور کی کتابوں میں سنہ تصنیف کا کہیں تذکرہ نہیں ہے ' بعض کتابوں کے متعلق تو یہ بھی نہیں بتایا جاسکتا کہ وہ کس صدی کی تصنیف ہیں ' اس لئے وہ تمام سماجی اور اقتصادی حالات جن کی تصویران کتابوں میں پیش کی گئی ہے ' تاریخی شکل میں مرتب نہیں کئے جاسکتے ' مثلا یہ ممکن ہے کہ رزمیہ مثنویوں میں ذکر کی ہوی زندگی کا ایک مجمل خاکہ پیش کیا جائے ' مگر یہ بتانا بہت دشوار

ھے کہ وہ کس زمانہ کی معاشرت سے متعلق ھے ' یا ان میں جن اشخاص کی تاریخ پیش کی گئی ھے ' وہ کس دور سے تعلق رکھتے ھیں اسلئے ان رزمیہ مثنویوں میں جو کچھ بھی تاریخی واقعات ملتے ھیں ان کا زمانہ متعین نہیں کیا جاسکتا '

اس حیثیت سے والمیکی کی راماڈن سے بہت کم معلومات حاصل ھوسکتی ھیں ' یہ ھند کی سب سے بڑی دوسری رزمیہ مثنوی ھے ' اس میں کوسل یا اودھ کے بادشاہ رام کے کارناموں کو بیان کیا گیا ھے ' مگر اس کے زمانہ کا تعین بہت ھی دشوار ھے ' اس کی یہ سرگذشت کہ کس طرح سیلون کا ایک دیو صفت بادشاہ رام کی بیوی سیتا کو اڑالے گیا اور پھر رام کس طرح س کو واپس لے ایا ھند کی سب سے زیادہ مقبول کہانی ھے ' ھر سال ناٹکون کے ذریعہ اس کی شاندار نقالی ھوتی ھے ' مغربی محققین نے اس کہانی کی مختلف تعبیریں کی ھیں ' لیکن ایک مورخ کیلئے صرف بنیادی واقعہ اھمیت رکھتا ھے ' باقی سب خیال آرائیاں ھیں ' جن کی کچھ بھی تاریخی اھمیت نہیں ھے ' بنیادی حقیقت صرف اتنی معلوم ھوتی ھے کہ ھندو عہد کے ابتدائی دور میں کوسل کی سلطنت نے بڑی اھمیت حاصل کرلی تھی ' اور قرائن سے معلوم ھوتا ھے ساتویں صدی قبل مسیح میں اس سلطنت کا وجود تھا ' جنوبی ھند میں جو فرضی قصے مشہور ھیں ان سے کسی مفید نتیجہ کا نکالنا بہت مشکل ھے ' زیادہ سے زیادہ اتنا ھی کہا جاسکتا ھے کہ رام ایک شخص تھا جس کے کارنامے دیکھنے والوں کو مسحور کرگئے ' آگے چلکر لوگوں نے اس کو دیوتا بنالیا ' برھمنوں نے جب اس کی بڑھتی ھوی اھمیت کو محسوس کیا تو اصل قصہ میں مختلف رنگ آمیزیاں کرکے اس کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور آخرکار رام کو وشنو کا اوتار قرار دیدیا '

دوسری رزمیہ مثنوی مہابھارت کی ھے ' اس میں چند واقعات ایسے ھیں جو مورخ کیلئے تاریخی اھمیت رکھتے ھیں ' چند شاھی خاندانوں کا ذکر ھے ' اور اصل قصہ کو بعد کے پروھتوں نے اخلاقی

نکتوں سے بھر دیا ہے ' یہ ایک رزمیہ داستان ہے جس کو ایک شاندار تاریخ کی حیثیت دی جاسکتی ہے ' کورو اور پانڈو اس ناٹک کے حقیقی اداکار ہیں ' یہ دونوں گروہ دھلی کے قریب رہتے تھے ' پانڈوون کا بادشاہ بیوی ' خاندان اور سلطنت سب کچھ جوے میں کھو بیٹھتا ہے ' اور جب آخری پانسہ میں بھی کامیابی نہیں ہوتی تو بارہ سال کیلئے جلا وطن ہوجاتا ہے ' اور اس مدت کے گذرنے کے بعد اپنے طرفداروں کو لیکر دشمنوں پر حملہ کرتا ہے اور کوروون کو تباہ و برباد کردیتا ہے ' وید کی کتابوں میں بھی کوروون کا نام اکثر آیا ہے ' اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ اس رزمیہ مثنوی کے بعض واقعات دسویں صدی قبل مسیح میں پیش آئے تھے ' لیکن بعد میں اتنی رنگ آمیزیاں کی گئیں کہ اصل قصہ ان میں گم ہوگیا ' ان میں ایسے قبیلوں کا بھی ذکر آتا ہے جو یقینی طور پر بعد کے دور میں تھے ' ان کو طرفین کے طرفداروں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے ' اس لئے قصہ کی تمام جزئیات کو پورے وثوق کے ساتھ ماننا بہت دشوار ہے ' بعض کا خیال ہے کہ یہ جنگ در حقیقت دو تمدنوں کی زبردست ٹکر تھی ' جس نے آخر میں ہند کی قسمت کا فیصلہ کیا ' ممکن ہے کہ ان کے بعض اہم اصول خطرہ میں پڑگئے تھے ' جس کی وجہ سے یہ لڑائی پیش آئی ؛ یا یہ محض چند قبیلے تھے جو ایک دوسرے کے مقابل اور طرفدار ہوکر اس جنگ میں کود پڑے اور آخری وقت تک لڑائی کی '

تمدنی لحاظ سے مہابھارت کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں کرشن کو پانڈوون کے بادشاہ کے رہبر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور نیز اس کو وشنو کا اوتار مان لیا گیا ہے ' اس مثنوی کا بہترین حصہ بھگوت گیتا ہے جس کو کرشن کی زبان سے ادا کیا گیا ہے ' جنگ کے رک جانے کے بعد کرشن تفصیلی طور پر یہ بتاتے ہیں کہ عملی زندگی میں نجات کا راستہ کیا ہے ' غالبا کرشن بھی رام کی طرح ایک مقبول عام ہیرو تھے ' جن کو بعد میں چلکر

دیوتا بنالیا گیا ' اس طرح کرشن اور رام دونوں کی ابتدا ایک ہی حیثیت سے ہوی تھی '

اس رزمیہ مثنوی سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن کو پران کہا جاتا ہے ' ان میں چند شاہی خاندانوں کا تذکرہ ہے ' جو مہابھارت کی لڑائی کے بعد گنگا کے میدانوں پر حکمرانی کرتے تھے ' اصل واقعات میں بہت سی رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں ' اور اصل حقیقت کو توڑ مڑوڑکر پیش کیا گیا ہے ' ان کو تاریخ کی بنیاد نہیں قرار دیا جاسکتا ' البتہ اس دور کے سیاسی جغرافیہ کو سمجھنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے ' اور مختلف ریاستوں کے حدود سلطنت کا ایک دھندلا خاکہ مرتب کیا جاسکتا ہے '

سب سے اہم ریاست جنوبی بہار کی مگدھ ریاست تھی ' گنگا کے اس پار یعنی شمالی بہار میں ودھیا کی ریاست تھی ' مغرب میں ایک طرف کاشی اور دوسری طرف کوسل یہ دو ریاستیں تھیں جن کو موجودہ زمانہ میں بنارس اور اودھ کہا جاتا ہے ' اس دور کی ابتدائی تاریخ ان ہی چار ریاستوں کا تذکرہ ہے ' ان ہی جگہوں پر جین اور بودھ مت کو فروغ حاصل ہوا ' ان ریاستوں میں مگدھ کو بڑی ترقی ہوی اور اس کے حدود سلطنت بہت دور تک پھیلے ' ہماری معلومات کا زیادہ تر حصہ اسی ریاست کے متعلق ہے ' باقی کے متعلق بہت کم معلومات ہیں '

بنگال اور اوڑیسہ کے علاقوں کے متعلق تاریخ میں کچھ بھی ذکر نہیں ملتا ' گنگا کے بالائی میدانوں پر پورو * اور پنچال خاندان کے فرمانروا حکومت کر رہے تھے ' مگر چند بگڑے ہوے ناموں کی ایک فہرست کے سوا تفصیلی حالات کا ہمیں علم نہیں ہے ' قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جمنا کے جنوب اور مغرب میں مشرقی راجپوتانہ اور مالوہ سے لیکر نربدا تک بہت سی ہندو ریاستیں قائم تھیں ' تیسری صدی قبل مسیح سے پہلے جنوبی ہند کا کہیں نام

* وہ تمام قبایل جن کا ذکر قدیم کتابوں میں آتا ہے پوروؤں میں داخل ہیں ' خاصکر کورو کو پوروؤں کہا جاتا تھا '

نہیں ملتا ' تاریخ میں وادی سندھ کا بھی ذکر نہیں ھے ' غالبا ایک زمانہ تک وہ ایرانی سلطنت کا ایک حصہ تھا ' جس کی تفصیل آگے آئیگی '

اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ ھے کہ موروثی بادشاھت کا طریقہ عام نہیں ھوا تھا ' کیونکہ اس دور کی ابتدا میں مختلف قبایل کے سردار آزادانہ یا کسی بادشاہ کے ماتحت ھوکر حکومت کرتے تھے ' چھٹی صدی کی بودھمت کی کتابوں سے معلوم ھوتا ھے کہ شمالی بہار میں ایسے دس سرداروں کی حکومت تھی جن میں سے ایک ودھیا کی حکومت ھے ' جس کا ذکر اوپر ھوچکا ' ایک طرف یہ تمام حکومتیں اپنی آزادی کھو رھی تھیں اور مگدھ کی ریاست میں ملائی جا رھی تھیں تو دوسری طرف پنجاب ' راجپوتانہ اور سندھ میں کئی ریاستیں وجود میں آرھی تھیں ' ان کی تفصیلی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں ھے ' مگر جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا تھا ' ایک زوردار قبیلہ دوسروں کو زیر کرتا اور ایک زبردست ریاست کی بنیاد ڈالتا ' اس وقت اس کی حکومت موروثی ھوجاتی '

پرانی تاریخ کا مواد فراھم کرنے کے سلسلہ میں ایک اھم سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ کب سے تحریر کی ابتدا ھوی ' اس رسم الخط کے علاوہ جو موھنجو دارو کی کھدائیوں میں بر آمد ھوا اور جس کو اب تک حل نہیں کیا جاسکا ' ھند میں دو رسم الخط رائج تھے ' ایک خروشتی اور دوسرا براھیمی ' پہلا رسم الخط آرامی حروف سے لیا گیا تھا ' جو ایرانی سلطنت میں مستعمل تھے ' سب سے پہلے سندھ کی وادی میں یہ استعمال کیا جاتا تھا ' مگر ملک کے اور حصوں میں یہ خط نہیں پھیل سکا ' اب یہ بات مانی ھوی ھے کہ عربی کے سوا ھند کے تمام خطوں کا ماخذ یہی براھیمی خط ھے ' عربی خط کا بعد میں رواج ھوا ' قطعی طور پر یہ نہیں معلوم کہ ھند میں ان خطوں کا کس طرح رواج ھوا ' بعض محققین کا خیال ھے کہ عراق کے تاجر اپنے ساتھ یہ خط لائے اور ھند میں اس کو رائج کیا ' پہلے پہل تجارت

میں اس خط کو استعمال کیا جاتا تھا ، * حال ہی میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ براہمی خط در حقیقت اس خط کی ترقی یافتہ شکل ہے جو موہنجو دارو کی کھدائی میں دستیاب ہوا ہے ، لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ چوتھی صدی قبل مسیح سے پہلے ہی یہ خط تکمیل کو پہنچ چکا تھا اور سنسکرت کی تمام آوازیں اس خط میں پورے طور پر آچکی تھیں ،

ایک قدیم نظریہ یہ ہے کہ کم از کم آٹھ سو برس قبل مسیح تک ہند میں تحریر کا رواج نہ تھا ، وید کی تمام کتابیں زبانی تصنیف کی گئیں اور سینہ بسینہ منتقل ہوتی ہوی آئیں ، اس نظریہ کی وجہ سے بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں ، اور یہ دشواریاں اور بھی زیادہ ہوجاتی ہیں اگر یہ مان لیا جائے کہ تحریر کا فن پرانا ہے ، اور تیسرے دور ہزار سالہ میں سندھ کی وادی میں تحریر کا رواج تھا ، اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ اس عہد میں نہ صرف ہند بلکہ چین ، عراق اور بحر روم کے علاقہ میں بھی لکھنے کا رواج تھا ، جب لکھنے کا فن ایک مرتبہ رائج ہوگیا تو پھر یہ خیال کرنا مشکل ہے کہ اس کو ترک کردیا گیا ہوگا ، ہاں یہ ممکن ہے کہ ایک خط کو چھوڑکر دوسرے کو اختیار کرلیا جاتا ہوگا ، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شمالی ہند میں کتے کے چمڑوں پر اور جنوبی ہند میں تاڑ کے پتوں پر لکھنے کی عادت تھی ، چونکہ یہ چیزیں جلد خراب ہوجانے والی تھیں ، اسلئے پرانے زمانے کی کوئی قلمی تحریر یا کتاب باقی نہ رہ سکی ، پتھروں اور دھاتوں پر کتبوں کے لکھنے کا طریقہ تیسری صدی قبل مسیح سے پہلے نہیں پایا جاتا ہے ، ان وجوہ کی بناء پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ہند میں تحریر کا کب رواج ہوا اور کون سا خط پہلے استعمال کیا گیا ، پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ تیسرے دور ہزار سالہ میں سندھ کی وادی میں تحریر کا رواج تھا ، مگر یہ نہیں معلوم کہ ہند کے تاریخی زمانہ تک یہ فن وہاں باقی رہا ، اور خط میں کانٹ چھانٹ ہوتی رہی ، یا اس کو بالکلیہ ترک کردیا گیا اور پھر باہر سے لیکر اس کو رائج کیا گیا ،

---

* بوہلر قدیم شمالی سامی حروف کو اس کا ماخذ بتاتا ہے ، دیکھو اس کی کتاب "آن دی اریجن آف دی براہما الفابٹ ،، طبع دوم (اسٹراسبرگ سنہ ۱۸۹۸ع)

باب ۵

بودھ مت اور جین مت کا ظہور

تاریخ ہند کی حقیقی ابتدا بودھ مت اور جین مت سے ہوتی ہے ، کیونکہ ان سے پہلے کے واقعات کے متعلق سنین کا کوئی تعین نہیں ہوسکتا ، یہ دونوں مذہب چھٹی صدی قبل مسیح کے آخر میں پیدا ہوے اور ساتھ ساتھ نشو و نما پائی اور تکمیل کو پہنچے ، یہ دونوں حقیقت میں اصلاحی تحریکیں تھیں یا یوں کہنا چاہئے کہ اس زمانہ کے رسوم کے خلاف ایک بغاوت تھی ، بعض صورتوں میں دونوں مشترک ہیں ، دونوں اصنام پرستی اور آبائی رسوم کے مخالف تھے ، کرما اور نئے جنم کے عقیدوں سے دونوں کی ابتدا ہوی ، دونوں شخصی وجود کو مضر اور نقصان دہ سمجھتے تھے ، اور اس سے نجات پانے کا راستہ بتلاتے تھے ، دونوں کے بانی چھتری خاندان سے تھے ، دونوں کی ابتدائی تعلیم عملی تھی ، فلسفیانہ نہ تھی ، لیکن ایک زمانہ کے بعد دونوں کے عقائد و خیالات میں بڑی تبدیلی ہوگئی ، ان میں وہ سیدھی سادھی باتیں نہ رہیں ، جن کی تعلیم ان کے بانی دینا چاہتے تھے ، دونوں مذہبوں پر لکھی ہوئی مذہبی کتابوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہے ، سب سے زیادہ قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ ابتدائی یادداشتیں سنسکرت کی بجاے پراکرت زبان میں ہیں جو اس زمانہ کی روز مرہ اور عام زبان تھی اور جس کو ہند کی تمام جدید زبانوں کی اصل قرار دیا جاتا ہے ،

جین مت کا بانی ور دھمن تھا ، جو مہاویر یا مہابیر کے لقب سے پکارا جاتا ہے وہ ۵۴۰ ق م میں پیدا ہوا اور ۴۶۸ ق م تک زندہ رہا ، وہ ودھیا (شمالی بہار) کے ایک شریف خاندان کا لڑکا تھا ، تیس سال کی عمر میں گھر چھوڑکر جنگل کی راہ لی ، بارہ سال کے بعد اس کو وہ روشنی دکھائی دی جس کی اتنے دنوں سے اس کو تلاش تھی ، اب وہ سچائی کی تبلیغ کیلئے نکل کھڑا ہوا ، اس نے یہ تعلیم دینی شروع کی کہ صحیح علم کے ذریعہ ہی سے

ہستی کی بلا سے نجات مل سکتی ہے ، اور دنیا کو چھوڑنے کے بعد ہی صحیح علم حاصل ہوسکتا ہے ، لوگ ہر طرف سے اس کے گرد جمع ہوگئے ، اور تھوڑے دنوں میں مریدوں اور معتقدوں کی ایک بڑی تعداد نکل آئی ، مگدھ کے دربار میں اس کی بڑی عزت ہوی ، ہر جگہ سے دعوتیں آنے لگیں ، اس کے باوجود جین مت کو کبھی سیاسی اقتدار نہیں مل سکا ، پہلے پہل بہار میں اس کی تعلیم مقبول ہوی ، اس کے بعد اس کا مذہب ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پھیلنے لگا ۔ اس وقت جینیوں کی تعداد پندرہ لاکھ بتائی جاتی ہے ۔ ان کی ایک بڑی آبادی بمبئی اور راجپوتانہ میں ہے ، عام روایات کی روسے مہابیر جین مذہب کا بانی نہیں تھا ، بلکہ اس سے پہلے ۲۳ تیئیس پیغامبر دنیا میں آچکے تھے ، اور سب کے سب چھتری خاندان سے تھے ، کچھ کچھ وقفہ کے بعد وہ یکے بعد دیگرے ظاہر ہوے اور جین مذہب کی تبلیغ کی ، ان سب کا زمانہ لاکھوں سال کا بتایا جاتا ہے ، لیکن یہ تمام روایتیں فرضی ہیں ۔ ان پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا ، بعض کا خیال ہے کہ ۲۳ تیئیسواں پیغامبر واقعی کوئی ایسا شخص تھا ، جس کی شخصیت تاریخی کہی جاسکتی ہے ، مہابیر سے پہلے کی تمام روایات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے ،

بودھمت کا بانی گوتم سدھارت تھا ، جو سکیہ منی کے نام سے مشہور تھا ، روشنی حاصل ہونے کے بعد بودھ کے نام سے پکارا جانے لگا ، وہ غالباً ٥٦٠ ق م میں پیدا ہوا اور ۴۸۰ ق م تک زندہ رہا ، اس کے متعلق اب تک اختلاف ہے کہ اس کی ولادت اور وفات کی صحیح تاریخ کیا ہے ، وہ سکیہ قبیلہ کا ایک فرد تھا ، جو کوسل (جس کو اب اودھ کہا جاتا ہے) کے مشرق میں ہمالیہ کے نشیبی حصوں میں آباد تھا ، کچھ زمانہ کے بعد اس کی زندگی کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہوگئے ، اور بعد کے افسانوں سے اس کی زندگی کے حالات کا پتہ چلانا بہت دشوار ہے ، لیکن اتنی بات صاف ہے کہ وہ چھتری ذات سے تھا ، اور

مہابیر کی طرح زندگی سے اکتاکر گھر سے نکل کھڑا ہوا ، اور سچائی کی تلاش میں ایک رشی کی طرح ادھر اودھر گھومتا رہا ، آخر ایک دن اس کو بھی روشنی ملی اور باقی زندگی سچائی کی تبلیغ میں گذاردی ، اس کی تعلیم بھی بالکل عملی تھی ، فلسفیانہ نہیں تھی ، عقائد کے متعلق ابتدائی کتابیں تعقید سے خالی نہیں ہیں ، اس کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ نئے جنم کی تکلیفوں سے بچنے اور نروونا یعنی فناء ہستی کا مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان خواہشات نفسانی سے بالکل ازاد ہوجائے ، وہ جسم سے زیادہ دل اور دماغ پر قابو پانا چاہتا تھا ، اس کے پاس ترک دنیا کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی کہ مہابیر کے پاس پائی جاتی ہے ، مراقبہ اور استغراق اس کی تعلیم و تربیت کا اصل الاصول تھا ، اس کا نقطۂ نظر بہت وسیع تھا ، اس نے صرف اپنے چند پیرؤوں کی اصلاح پر اکتفا نہیں کیا ، بلکہ عوام کو بھی اپنی تعلیم قبول کرنے کی دعوت دی ، مگر عام مردوں اور عورتوں کو وہ زیادہ تر اخلاق کی تعلیم دیتا تھا ، اس نے ان کے سامنے سچائی کی وہ تصویر پیش کی ، جس کو اخلاق و انسانیت کے دوسرے معلم ہمیشہ سے پیش کرتے آرہے تھے ۔

اس کی تعلیم نے بہتوں کو اس کا گرویدہ کرلیا ، اس کی تربیت مستحکم ہوگئی ، اور ہند کی تاریخ میں اس نے سیاسی اہمیت اختیار کرلی ، لیکن ابتدائی دور میں جین مت کی طرح بودھ مت کی بھی ایک دینی حیثیت تھی ، یہ سمجھنا غلط ہے کہ دونوں کی تعلیم قدیم مذہب کے خلاف تھی ، کیونکہ مہابیر کا دعوی تھا کہ وہ پرانی روایات ہی کی تعلیم دیتا ہے ، بودھ مت کی ابتدائی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ سچائی کی تلاش میں تھے ، مگر ایک ہی شخص کو صحیح راستہ مل سکا ، دونوں نے پہلے پہل مانوس اور عام راستہ اختیار کیا اور جب ماحول سے ان کا جی اکتا گیا تو انہوں نے

جنگل کا راستہ اختیار کیا ' دونوں کی تعلیم کا بنیادی تصوریہ تھا کہ شخصی وجود ایک مضر اور نقصان دہ چیز ہے ' ان کی یہ تعلیم دوسروں سے کچھ الگ نہیں تھی ' کیونکہ اس دور کے ھندو پروھت اسی خیال کی تعلیم دیتے تھے ' اس لئے ھم کو یہ ماننا پڑیگا کہ مہابیر اور گوتم بودھ کی طرح بہت سے پروھت بھی رائج‌الوقت مذھب سے بیزار تھے ' یہ نہیں معلوم کہ دوسرے لوگوں کے خیالات کیوں باقی نہ رہ سکے ' مگر ھم سمجھ سکتے ھیں کہ مہابیر اور گوتم بودھ کی کامیابی ان کے ذاتی کمالات کی وجہ سے ھے ' پھر بعد میں ان کو ایسے پیرو ملے جنھوں نے ان کی تعلیم کو زندہ جاوید بنادیا۔

یہ بات کہ دونوں کامیاب مذھبی رھنما چھتری تھے ' ضرور اھمیت رکھتی ھے ' ھم پہلے بیان کرچکے ھیں کہ رگ وید کے بعد سے پروھتوں کا رسوخ بڑھ چلا تھا ' قرائن سے معلوم ھوتا ھے کہ بادشاھوں نے ان کے بڑھتے ھوے اقتدار کو ناپسند کیا ' کیونکہ ان کے اقتدار کو ٹھیس لگتی تھی ' چونکہ تمام تاریخی روایات پروھتوں ھی کی لکھی ھوی ھیں ' اس لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ھے کہ بادشاھوں نے ان کی بڑھتی ھوی طاقت کو توڑنے کی کہاں تک کوشش کی ' لیکن یہ بات نا ممکن نہیں کہ مہابیر اور گوتم بودھ کی گوشہ نشینی سے پہلے پروھتوں اور بادشاھوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش جاری تھی ' بعض مصنفین نے اس کے متعلق شواھد بھی پیش کئے ھیں ' لیکن ھم اتنا ضرور جانتے ھیں کہ مہابیر اور گوتم بودھ نے پروھتی اقتدار کے خلاف علانیہ بغاوت کی ' اور اسطرح دونوں نئے مذھبوں کے بانی قرار پائے۔

باب ۶

وادی سندھ کی ابتدائی تاریخ

اب ہم بہار اور اودھ کو چھوڑکر وادی سندھ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اب پنجاب ' سندھ اور سرحد کے صوبوں میں منقسم ہے ' پہلے لکھا جاچکا ہے کہ آریوں نے یہاں کے اصلی باشندوں کو نکال دیا تھا اس لئے یہاں مختلف تمدنوں کی آمیزش کی کوئی گنجائش نہ تھی ' جس طرح کہ اور آگے مشرق میں ان کی آمیزش ہوی تھی ' قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے آریوں کے تعلقات ایرانیوں کے ساتھ قایم تھے ' جو ان کی طرح آریہ نسل سے تھے ' دور آخر کی وید کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ گنگا کی ترائی میں رہنے والے آریہ پنجاب کے آریوں سے نفرت کرتے تھے ' شاید اسی وجہ سے پنجاب کے لوگ ایرانیوں سے اپنا رشتہ جوڑنا زیادہ پسند کرتے تھے ' مگر ہماری معلومات کی ابتدا صرف چھٹی صدی قبل مسیح سے ہوتی ہے جبکہ اس کا ایک حصہ ایرانی سلطنت کا ایک جز بنا ہوا تھا ۔

ایران کی تاریخ در حقیقت پے درپے عروج و زوال کی ایک مسلسل داستان ہے ' اس کا ایک شاندار دور سائرس (۵۵۸ - ۵۳۰ ق م) کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے ' مغربی مصنفین کے قول کے مطابق یہ ایک زبردست بادشاہ تھا ' اسی نے یہودیوں کو بابل کی قید سے آزاد کیا ' اور ایران کی مشرقی جانب بڑھکر باختر کا علاقہ فتح کیا ' جو اب افغانستان کا ایک حصہ ہے اور ہندوکش کے مغرب میں واقع ہے ' اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس نے ہند پر بھی فوج کشی کی ' اس کے بعد اس کے جانشینوں کی توجہ مشرق کی بجاے مغربی علاقوں کو فتح کرنے کی طرف رہی ' دارا اول (۵۲۲ - ۴۸۶ ق م) نے غالبا ۵۱۸ ق م میں سندھ کی وادی کا ایک حصہ فتح کیا اور اس کے بعد اس علاقہ میں تقریبا دو سو سال تک ایرانیوں کی سلطنت قایم رہی ' دارا کے جانشین زرکسس نے جب ۴۸۰ ق م میں

یونانیوں کے خلاف ایک فوج روانہ کی تو اس میں ہندیوں کا ایک دستہ بھی شامل تھا ' جو سوتی کپڑوں میں ملبوس تھا ' اسی طرح ڈیڑھ سو سال کے بعد جب سکندر اعظم نے ہند پر حملہ کیا تو اس کی فوج میں بہت سے ہندی سپاہی ہاتھیوں کے ساتھ شریک تھے ' دارا اول کے ایک کتبہ میں ہندیوں کے خراج دینے کا ذکر ہے ' اس سے ہم یہ استنباط کرسکتے ہیں کہ خراج اور فوجی خدمت کی صورت میں ایران کا سیاسی اقتدار ایک زمانہ تک ہند پر قایم رہا ' مگر یہ بتانا بہت دشوار ہے کہ ایرانی طریقہ حکومت کس قسم کا تھا ' اور وادی سندھ کی معاشرت پر اس کا کہاں تک اثر پڑا ' اور اس کی سلطنت کے حدود کہاں تک پھیلے ہوے تھے ' غالباً دریاے سندھ کے کنارے اور ادھر سمندر تک ایرانی حکومت کا اقتدار قایم تھا ' مشرقی سرحد کے متعلق کوئی یقینی بات معلوم نہیں ہے ' اور اس میں بھی شبہ ہے کہ پنجاب کا کوئی حصہ ایرانی سلطنت میں شامل تھا ۔

۳۳۰ ق م میں سکندر اعظم نے زوال پذیر ایرانی سلطنت کو شکست دی ' اور اس کی ماتحت مشرقی ریاستوں کو فتح کرتے ہوے آگے بڑھنے کی کوشش کی ' اس نے بہت جلد افغانستان پر قبضہ کرلیا اور ۳۲۶ ق م میں ہند پر فوج کشی کی ' ہمالیہ کے دامن میں مختلف لڑائیاں ہوئیں اور وہ کامیابی کے ساتھ بیاس تک پہنچ گیا ' اس نے وادی گنگا کے فتح کرنے کا ارادہ کرلیا تھا ' مگر اس کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا ' اس لیے مجبوراً دریاے سندھ کے راستہ سے اس کو واپس ہونا پڑا ' اس نے دریاے سندھ کو اپنی سلطنت کی سرحد قرار دی اور ۳۲۵ ق م میں وہ حدود ہند سے نکلکر اپنے وطن کی طرف واپس ہوگیا ' اس ملک میں اس کی آمد محض ایک تاریخی افسانہ ہے ' ہند کی تاریخ میں سکندر کے حملے کی اہمیت صرف اس بناء پر ہے کہ اس سے ہندی تمدن اور یونانی تمدن کے درمیان میل جول کی ایک راہ پیدا ہوگئی ۔

سکندر اعظم کے عزائم بہت تھے ، وہ اپنی فتوحات کو پائدار خیال کرتا تھا ، اسی لئے اس نے وادی سندھ کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا ، اور ہر جگہ مضبوط قلعے بنائے ، اور ان میں اپنی فوج رکھی ، اور یونانیوں کو مختلف جگہوں پر بسانے کی کوشش کی ، مگر اس کی یہ ساری تدبیرین یونانی سرداروں کی کم مائگی کی بناء پر بیکار ہوگئیں ، جب سنہ ۳۲۳ ق م میں سکندر کی وفات ہوگئی تو یونانی سردار آپس ہی میں لڑنے لگے ، بہت سے لوگ یونان واپس چلے گئے ، جب یونانی اقتدار کی باگ سلوکس اول کے قبضہ میں آئی تو اس نے سب سے پہلے عراق کو فتح کیا اور اس کے بعد ہند کی طرف توجہ کی ، اس درمیان میں ہند کے حالات بالکل بدل چکے تھے ، چندر گپت کے تحت موریہ سلطنت بہت مضبوط ہوچکی تھی ، اور جب تقریبا ۳۰۰ ق م میں سلوکس وادی سندھ کی طرف بڑھا تو چندر گپت ایک زبردست فوج لیکر اس کے مقابلہ میں آیا ، سلوکس نے اس سے فوراً صلح کرلی ، اور سندھ اور افغانستان کے ایک بڑے حصہ کو اس کے حوالے کرکے واپس چلا گیا ۔ اس علاقہ میں صرف باختر ھی اس کے قبضہ میں رھا ، یہاں تک کہ دوسری صدی کے وسط میں یہاں ایک آزاد یونانی ریاست قایم ھوگئی ، آگے چلکر دو یونانی خاندان اس ریاست میں برسر عروج آئے ، جنھوں نے ایک زمانہ تک پنجاب پر حکومت کی تھی ،

سکندر کے بہت سے افسروں نے ہند کے حالات پر کئی کتابیں لکھیں ، اگر یہ سب باقی رھتیں تو شاید اس دور کی ھندی معاشرت کے مرتب کرنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ، مگر تمام کی تمام ضایع ھوگئیں ، بعد کے مصنفین نے ان کے اقتباسات نقل کیے ھیں ، لیکن جستہ جستہ بے جوڑ واقعات سے مسلسل تاریخ کا لکھنا بہت دشوار ھے ، ھند کا ابتدائی تمدن کچھ بھی رھا ھو اتنا تو ضرور ثابت ھے کہ سکندر کے زمانہ میں وادی سندھ کی معاشرت ھندی تھی ، ایرانی نہیں تھی ، یہاں کے سیاسی حالات ، جنگ کے طریقے ، برھمنوں

اور رشیوں کا وجود ، ستی کی رسم ' شیو کی پرستش اور اس قسم کی دوسری جزئیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہندومت ہند کے شمال مغربی سرحد تک پھیل چکا تھا ' البتہ یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ کسطرح یہاں پھیلا '

ہند کے مختلف بادشاہوں کے ساتھ سکندر نے اپنے تعلقات قایم کیے ' نیز اس نے کئی قبیلوں کے ساتھ جو ابھی تک متمدن نہیں ہوے تھے ' اپنا رشتہ جوڑا ' یہ بادشاہ ہر وقت ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے ' اور سرحدی قبائل سے بھی ان کی جنگ رہتی تھی جن کو وہ اپنا مطیع اور فرمانبردار بناکر رکھنا چاہتے تھے ' پنجاب کے علاقہ میں دو مشہور بادشاہ تھے جن کو یونانی ٹیکساڈلز اور پورس نام دیتے ہیں ، اول الذکر ٹیکسلا کا بادشاہ ہے جو دریاے سندھ اور دریاے جھیلم کے درمیان ایک مشہور مقام ہے ' ثانی الذکر پوروؤں کا بادشاہ ہے ' جس کی ریاست دریاے جھیلم کے مشرق میں واقع تھی ' ان دونوں بادشاہوں میں بڑا سخت اختلاف تھا ' سکندر ابھی تک ہندوکش کے شمال ہی میں تھا کہ ٹیکسلا کے راجہ کے بیٹے امبھی نے آگے بڑھ کر صلح کی گفت و شنید شروع کردی ' بعد میں خود راجہ نے کابل کی وادی میں سکندر کا استقبال کیا ، جب سکندر دریاے سندھ کو پار کرکے آگے بڑھا تو امبھی نے ' جو باپ کے مرنے کے بعد تخت نشین ہوچکا تھا ، اپنے صدر مقام ٹیکسلا میں یونانی حملہ آور کی بڑی آؤبھگت کی اور اس سے اپنی بادشاہت کا پروانہ حاصل کیا ' اس کے برخلاف پورس سکندر کے مقابلہ کیلئے تیار ہوگیا ' مگر جھیلم کے کنارے ایک گھمسان لڑائی میں اس کو شکست ہوگئی ' اس نے عزت کے ساتھ سکندر کی اطاعت کرلی ' جس نے پورس کو اس کی سلطنت پر بحال کردیا اور اس کے ساتھ چند اور علاقے اس کے حوالے کردیے ' ٹیکسلا کے مشرق میں ایک پہاڑی ریاست تھی ' اس کے راجہ نے بھی سکندر کی اطاعت کرلی ' دوسرے چھوٹے بڑے راجہ بھی یا تو مطیع ہوگئے یا اپنی ریاست چھوڑکر فرار ہوگئے ' سرحدی

قبائل کو بھی آسانی کے ساتھ زیر کرلیا گیا ' ان تمام لڑائیوں میں جو بات صاف اور واضح ملتی ہے وہ اہل ہند کی نا اتفاقی ہے ' آپس کی ناچاقی کی بناء پر ہر ایک اپنی قسمت کے بنانے کی فکر میں لگا ہوا تھا ' مدتوں تک اہل ہند کی یہی حالت رہی '

جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے سکندر نے پنجاب کے صوبوں پر اپنے حاکم مقرر کئے جن میں سے بعض یونانی تھے ' لیکن پنجاب کا ایک بڑا علاقہ امبھی اور پورس کے قبضہ میں دیدیا گیا تھا ' ان دونوں کی ریاستوں کے درمیان دریاے جھیلم حد فاصل قرار دیا گیا تھا ' جب یہاں سے یونانی اقتدار مٹا تو دونوں آزاد ہوگئے ' مگر کچھ زمانہ بھی گذرنے نہیں پایا تھا کہ موریہ خاندان کے فرمانرواؤں نے ان دونوں کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا ۔

باب ۷

موریہ سلطنت

چندر گپت

چوتھے باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ ۵۰۰ ق م کے قریب جنوبی بہار کی مگدھ ریاست ایک اہم سلطنت بن گئی تھی ، پچاس سال کے اندر اس کے حدود بہت وسیع ہوچکے تھے ، اور شمالی بہار ، بنارس اور اودھ پر اس کا اقتدار قایم ہوچکا تھا ، اور اسی زمانہ میں گنگا کے کنارے ریاست مگدھ کا پاے تخت پاٹلی پتر یعنی پٹنہ تعمیر ہوا ، جس کو یونانی پالی بوترا لکھتے ہیں ۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے تاریخی واقعات کا کچھ پتہ نہیں چلتا ، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مگدھ کی ریاست کو برابر ترقی ہو رہی تھی ، اور نند خاندان کے زمانہ میں کئی نئے مقبوضات حاصل کئے گئے ، یہاں تک کہ وادی گنگا کے تمام مغربی بلکہ جنوب مغربی علاقوں پر ان کا اقتدار قایم ہوگیا ، معلوم ہوتا ہے کہ اس ریاست کا شہرہ سن کر سکندر اعظم نے اس کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا ، اس کے یہاں سے جانے کے چند سال بعد خاندان موریہ کے ایک لائق فرزند چندرگپت نے نند خاندان کو شکست دی اور ان کی مملکت پر قبضہ کرلیا ، اس کے زمانہ میں مگدھ کی قوت اور طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس کو بجا طور پر عظیم الشان سلطنت کہا جا سکتا ہے ۔

چندرگپت کے کارناموں پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے ، کیونکہ اس کے متعلق صاف اور صریح یادداشتیں موجود نہیں ہیں ، جو کچھ روایتیں بیان کی جاتی ہیں ، ان کے آپس میں سخت تضاد پایا جاتا ہے ، خود موریہ لفظ کی اصل نا معلوم ہے ، بعض اس کو قبیلے کا نام بتاتے ہیں ، اور بعض کے نزدیک یہ لفظ مورا سے مشتق ہے ، جو چندرگپت کی ماں کا نام تھا ، وہ نند راجہ کی داشتہ تھی ، اس کی اصل کچھ بھی ہو ، یہ ثابت ہے کہ چندرگپت نند خاندان کا ایک ادنی ملازم تھا ،

وہ نیچے درجوں سے چند دنوں کے اندر ترقی کرکے سپہ سالار بن گیا تھا ، اس نے اپنے آقا کے خلاف سازش کی اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو اپنے سازشی چیلے کوتلیہ کو ساتھ لیکر شمال مغربی علاقوں کی طرف فرار ہوگیا ۔ یہ کوتلیہ وہی ہے جس کو روایات میں چندرگپت کا رہبر بتایا جاتا ہے ، اس نے اصول حکمرانی کے متعلق ارتھ شاستر کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی ، جس کا ذکر پچھلے کسی باب میں کیا جاچکا ہے ، ایک یونانی مورخ کا بیان ہے کہ چندرگپت پنجاب کے کسی پڑاو میں سکندر سے ملا اور مقامی ریاست کی مدد سے نند خاندان پر حملہ آور ہوا ، مقامی ریاست سے مراد غالباً پورس کی ریاست تھی ، بہر حال اس نے نند راجہ کو شکست فاش دی اور اس کو قتل کرکے اس کی ریاست پر قبضہ کرلیا ، ان تمام تفصیلات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے ، البتہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ وہ ۳۰۵ ق م کے بعد ہی سلوکس کے مقابلہ میں صف آرا ہوا اور پھر دونوں میں اس شرط پر صلح ہوگئی کہ افغانستان کا ایک بڑا حصہ چندرگپت کے قبضہ میں رہیگا ، مگر موت نے اس کو مہلت نہ دی اور غالباً ۲۹۰ ق م میں اس کا انتقال ہوگیا ، اس کے حدود سلطنت غیر قطعی ہیں ، مگر اس میں شبہ نہیں کہ بنگال سے لیکر ہندوکش تک اس کی حکومت تھی ، اور غالباً مالوہ اور گجرات بھی ، جو اس کے جانشینوں کی سلطنت کا یقینی جز تھے ، اس کی سلطنت میں شامل تھے ، مگر اس کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ ان پر کس طرح اور کب قبضہ کیا گیا ،

چندرگپت اور سلوکس کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے ، اسی بناء پر سلوکس کا سفیر مگاستھنیز کچھ دنوں تک پٹنہ کے دربار میں رہا ، اور ہند کے متعلق ایک کتاب لکھی ، جو بعد کے یونانی مصنفین کا اہم ماخذ تھی ، اگر یہ کتاب باقی رہتی تو کم از کم چندرگپت کی سلطنت کے متعلق ہم کو کافی معلومات ہوجاتیں ، ہمارے پاس صرف وہ اجزا ہیں جن کو بعد کے مصنفین

نے اپنی کتابوں میں بطور اقتباس نقل کیا ہے ' یہ اقتباسات بھی مگاستھنیز کے الفاظ میں نہیں ہیں بلکہ ان کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے ' بعض لوگوں نے ہند کی کتابوں کی مدد سے موریہ سلطنت کے حالات کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے ۔ مگر یہ طریقہ بہت خطر ناک ہے ' کیونکہ ہندی کتابوں کا سنہ تصنیف معلوم نہیں ہے ' اس لئے مگاستھنیز ہی کو لینا زیادہ مناسب ہوگا ' پھر بھی یہ نہیں معلوم کہ مگاستھنیز نے واقعی کیا لکھا اور ان فنی اصطلاحوں سے جن کو اس نے اپنی کتاب میں جابجا استعمال کیا ہے ' اس کی کیا مراد تھی ' ہمارے پاس جو کچھ ہے اس کا سیاق سباق بھی ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہے ' ہم اس کے ماخذوں کے متعلق صرف قیاس ہی کر سکتے ہیں ' اور ہم کو یہ ماننا پڑیگا کہ مگاستھنیز نے مگدھ کی روز مرہ کی پراکرت زبان سے اپنے خاص صوبہ کی یونانی زبان کے اندر ترجمہ کرنے میں بڑی سخت غلطیاں کی ہونگی *

چندرگپت کے ذاتی حالات کے متعلق ہم کو بہت کم معلومات ہیں ' پھر بھی کہا جاتا ہے کہ جب وہ محل میں ہوتا ' یا انصاف کرنے کیلئے عدالت تک جاتا یا بھینٹ چڑھانے کیلئے پرستشگاہ تک ہو آتا یا شکار کے لئے نکلتا تو اس کے ساتھ زبردست پہرہ ہوتا تھا ' بادشاہ کی بڑی حفاظت کی جاتی تھی ' اس کے متعلق مگاستھنیز نے جو کچھ لکھا ہے وہ بلا شبہ ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے ' لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ چندر گپت نے مگدھ کی ریاست پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا ' اس حالت میں اس کی حفاظت بہت ہی ضروری تھی ' ان اقتباسات سے ایک بات واضح ہے

* جب سکندر اعظم نے ، ٹیکسلا کے رشیوں کے نصائح و حکم معلوم کرنے چاہے تو ایک رشی نے بجا طور پر اعتراض کیا کہ ان کی تعلیمات کو تین ترجموں کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کیچڑ میں سے پانی کو بہانے کی کوشش کی جائے ، (کیمبرج ہسٹری اف انڈیا جلد اول صفحہ ۲۵۹ آئندہ ہم کیمبرج ہسٹری کے مختصر نام سے حوالہ دیا کرینگے)

یعنی یہ کہ چندرگپت کا انتظام سلطنت بہت وسیع اور مرتب تھا اور شہروں اور قصبوں کے درمیان طریقۂ حکومت کے لحاظ سے بے حد فرق تھا ، مگر ھند کی کتابوں سے اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی ،

چندرگپت کے زمانہ میں چند مراعاتی شہر تھے ، جن کیلئے بہت سے لگان معاف تھے ، اور ان کو اپنے معاملات کے خودھی سرانجام دینے کی اجازت تھی ، مگاستھنیز نے یونانی اصطلاح کے مطابق ان کو خود مختار شہروں سے تعبیر کیا ھے ، ان شہروں کے حاکم اپنی رائے سے لگان وصول کرتے تھے اور اس کو امور شہر کی تنظیم میں صرف کرتے تھے ، مرکزی حکومت کو اس کا کوئی حصہ نہیں پہنچتا تھا ، اس سے یونانی سفیر کو غلط فہمی ہوگئی ، اور اس نے خیال کیا کہ یونان کی طرح یہاں بھی خود مختار شہر ھیں ، حالانکہ ھند کی تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ،

زمین کی لگان کے متعلق مگاستھنیز کے جو اقتباسات ملتے ھیں وہ بہت قابل اعتراض ھیں ، اور مختلف طریقوں پر ان کی توجیہ کی گئی ھے ، غالباً مگاستھنیز نے یہاں بھی انھی اصطلاحوں کو استعمال کیا ھے جو یونان میں رائج تھے اور جن کا ھند میں کوئی رواج نہ تھا ، زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ھے کہ مگاستھنیز ادائیگی لگان کے صرف دو طریقوں سے واقف تھا ، پہلا طریقہ تو یہ تھا کہ کاشتکار اپنی پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ خزانۂ شاھی میں دیا کرتا تھا ، دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کل پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ اپنے خرچ کے لئے رکھ لیتا تھا ، پہلا طریقہ ھی ھند میں رائج تھا ، یہاں ایک بات غور کرنے کے قابل ھے ، وہ یہ کہ چندرگپت کے زمانہ میں لگان کی شرح ایک چوتھائی تھی ، نہ کہ چھٹا حصہ جس کو مذھبی کتابوں نے فرض قرار دیا ھے ، دوسرے طریقہ سے غالباً اس کا اشارہ اس نظام عمل کی طرف ھے جو اس زمانہ میں رائج تھا ، یعنی یہ کہ بادشاہ اور امیر اپنی خاص زمینوں

کی کاشت کیلئے اسامیوں اور مزدوروں کو مقرر کرتے تھے ، اور کل پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ بطور مزدوری کے ان کو دیدیتے تھے ، مگاستھنیز نے یہ بھی لکھا ہے کہ آب رسانی کے ذریعہ سال میں دو دفعہ زمین کی کاشت کی جاتی ہے اور قحط کا کہیں وجود نہیں ہے ، پہلی بات کی تصدیق ہم اب بھی ذاتی مشاہدہ سے کرسکتے ہیں ، البتہ دوسری بات کا ثبوت ہندو عہد کی کتابوں سے نہیں ملتا ، غالبا اس کے مشاہدہ میں آئی ہوی زرخیز زمینوں سے اس کو خیال ہوا کہ ہند میں قحط کا ہونا ممکن نہیں ہے ،

مگاستھنیز نے لکھا ہے کہ ہند کے لوگ مختلف گروہوں میں بٹے ہوے ہیں ، جن کے درمیان شادی بیاہ نہیں ہوسکتی ، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک ذات پات کا نظام پورے طورپر قایم ہوچکا تھا ، مگر اس کی سات طبقوں میں ان گروہوں کی تقسیم کبھی قبول نہیں کی جاسکتی ، کیونکہ یہ اس ذات پات کے نظام کے ساتھ کچھ بھی مطابقت نہیں رکھتی ، جس کا ثبوت ہند کی کتابوں سے ملتا ہے ، مگاستھنیز نے پوری آبادی کو سات طبقوں میں تقسیم کیا ہے ، یعنی (۱) ۔ فلسفی یا سوفسطائی ۔ (۲) کسان ۔ (۳) گلہ بان اور شکاری ۔ (۴) کاریگر اور تاجر ۔ (۵) سپاھی ۔ (۶) جاسوس اور (۷) سرکاری ملازم ، یہ طبقے در حقیقت ذات کی بناء پر نہیں بلکہ پیشہ کی حیثیت سے تقسیم کئے گئے ہیں ، اس کو نہیں معلوم تھا کہ بعض سرکاری ملازم فلسفی بھی تھے ، جیسے کہ بعض برھمن تھے اور تاجر کاریگروں سے الگ ایک دوسرا طبقہ تھے ، اسی طرح مگاستھنیز کا یہ بیان کہ ہند میں غلامی کا رواج نہیں ہے ، صحیح نہیں ہے ، کیونکہ اس دور کے متعلق ہند کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کا رواج تھا ، غالبا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہاں دوسرے ملکوں کی طرح غلاموں کی تجارت نہیں تھی ، وہ گھر میں کام کرنے والوں کو شاید غلام ہی نہیں سمجھتا تھا ، کیونکہ وہ ایسا کام کرتے تھے جو آزاد آدمیوں کے کرنے کا ہوتا تھا ،

میگاستھنیز کے بعض اہم بیانات پر یہ مجمل تبصرہ اس بات کی ضرورت کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے قبول کرنے میں احتیاط برتنی چاہئے ' اس عظیم الشان سلطنت کے پورے حالات کو مرتب کرنے کے لئے یہ باقی ماندہ اجزا کافی نہیں ہیں ' ان سے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی ایک بڑی آبادی زراعت پیشہ تھی ' جن پر ایک مطلق العنان بادشاہ حکومت کرتا تھا ' اس کی ایک باقاعدہ زبردست فوج تھی ' اس کے ساتھ جاسوسی کا وسیع جال پھیلا ہوا تھا ' لوگ سادہ غذا استعمال کرتے تھے ' مگر ان کے کپڑے اور زیور بہت قیمتی ہوتے تھے ' یونانی سفیر کے معیار کے مطابق لوگوں میں سچائی اور دیانت داری تھی ' ذات پات کا نظام قایم تھا ' مگر اس میں اتنی سختی نہیں تھی جتنی کہ اب پائی جاتی ہے ' ہر جگہ برہمنوں کی عزت تھی ' اور وہ دوسرے فرقوں کی طرف سے بھینٹ چڑھانے کی رسم انجام دیتے تھے ' تمام لوگ یا تو شیو کی پرستش کرتے تھے ' یا کرشن کی ' ان کو یونانی ڈیونیسس Dionysus اور ہیراکلیس Heracles کہا کرتے تھے ' فقیروں اور رشیوں کی بڑی اہمیت تھی ' اس سے یہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں ہر جگہ ہندو معاشرت نمایاں تھی ' ان اقتباسات میں ہم کو کوئی ایسی نئی چیز نہیں ملتی جس کا علم ہم کو پہلے سے حاصل نہ ہو ' ان کی حقیقی قدر و قیمت صرف اتنی ہی ہے کہ ہم ان کو پڑھکر اندازہ لگاسکتے ہیں کہ ہندو معاشرت کے مختلف پہلو کم از کم ۳۰۰ ق م سے پہلے ہی نمایاں شکل اختیار کرچکے تھے '

باب ۸

موریہ سلطنت

اشوک

چندرگپت کے بعد اس کا ولی عہد بندوسار تخت نشین ہوا ، جس نے پچیس برس تک حکومت کی ، اس کے متعلق ہم کو کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہیں ، اس کے بعد اس کا فرزند اشوک تخت نشین ہوا ، اس کا عہد ہند کی تاریخ میں بہت مشہور ہے ، اس کی شہرت زیادہ تر بودھ مت کی کتابوں کی وجہ سے ہے ، مگر ان میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ مبالغہ اور رنگ آمیزی سے خالی نہیں ہیں ، اس کی زندگی کے حالات ان کتبوں سے معلوم ہوتے ہیں جن کو اشوک نے ایرانی دستور کی پیروی میں مختلف چٹانوں اور ستونوں پر کندہ کرائے نصب کروایا تھا ، ان میں سے بعض اب تک موجود ہیں ، سادہ مگر موثر پیرایہ میں ایک ہی چیز کو بار بار دھرایا گیا ہے ، اس لئے اشوک کی شخصیت کے پہچاننے میں کسی قسم کی دقت نہیں ہوتی ، ہم اس حد تک تو شبہ کرسکتے ہیں کہ اس کے خیالات پر عمل نہیں ہوسکا ہوگا ، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ سچائی اور راستی کا ایک زبردست پیغامبر تھا ،

اشوک ۲۷۳ ق م کے قریب تخت نشین ہوا ، سنہ کی تعیین قطعی طور پر نہیں کی جاسکتی ، اس نے غالبا ۳۷ برس تک حکومت کی ، ایک چوتھائی مدت تک اس کی حیثیت ایک معمولی بادشاہ کی رہی ، غالبا تخت کے حاصل کرنے کیلئے اس کو دوسروں سے لڑنا پڑا ، اس روایت پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے ۹۹ بھائیوں کو قتل کیا ، بادشاہ بننے کے بعد مہاندی اور گوداوری کے درمیانی علاقۂ کلنگا کو فتح کیا ، اس کے بعد اس کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب ہوا ، اس نے

جنگ کرنے سے توبہ کرلی اور بودھ مت کا پیرو ہوگیا اور باقی زندگی علم اور اخلاق کی تبلیغ اور اصلاحی سر گرمیوں میں گذار دی '

اشوک نے تین نائب مقرر کئے ' ایک کو شمال مغربی حصہ کا والی بنایا ' جس کا صدر مقام ٹیکسلا تھا ' دوسرے کی قیام گاہ مالوہ میں تھی ' جو اجین کا پایہ تخت تھا ' تیسرے کو کلنگا کی نگرانی سپرد کی ' مرکزی صوبہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھی ' یہ معلوم کرنا بہت دشوار ہے کہ کون سے علاقے ان محکوم بادشاہوں کے قبضہ میں تھے ' غالبا اشوک کی سلطنت ایک وفاق کی سی تھی ' اس سلطنت کے جنوبی حدود واضح طور پر معلوم نہیں ہیں ' لیکن موجودہ ریاست میسور کے شمال میں کتبوں کا موجود ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اشوک کی حکومت کا اثر اس علاقہ تک پہنچ چکا تھا ' حکومت کے تمام قوانین مذہبی کتابوں سے لئے گئے تھے ' جن کو ہندو جین اور بودھ مت کے سبھی لوگ مانتے تھے ' اشوک زیادہ تر اہمسا (عدم تشدد) اور میتری (آشتی) پر زور دیتا تھا ' اس کے زمانہ میں سڑکوں پر سایہ اور پانی کا انتظام کیا گیا تھا ' انسانوں اور جانوروں کیلئے طبی امداد بہم پہنچائی جاتی تھی ' جانوروں کے ذبح کرنے پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں ' قیدیوں کے ساتھ منصفانہ اور ہمدردانہ برتاؤ ضروری قرار دیا گیا تھا ' اور بڑے بڑے افسر خیرات بانٹنے ' مظالم دور کرنے اور اخلاقی اصول سکھانے کے لئے مقرر تھے '

اشوک سلطنت کے حدود کو فتوحات کے ذریعہ بڑھانے کا سخت مخالف تھا ' اس کی خواہش تھی کہ آزاد اور غیر مفتوحہ علاقوں کو اس سے خوف کھانا نہیں چاہئے ' ان کو اس پر ہر طرح کا اعتماد رکھنا چاہئے ' اور لوگوں کو اس سے رنجیدہ ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہئے ' اس کو یہ بھی توقع تھی کہ دوسرے اس کے اصول کو مانینگے ' ٹھیک طور پر یہ نہیں معلوم کہ

اس کی توقع کہاں تک پوری ہوی ، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کی سلطنت کی سرحدوں پر امن اور اطمینان قایم ہوگیا تھا ۔

اشوک ایک اخلاقی مصلح تھا ، وہ عمل پر زیادہ زور دیتا تھا ۔ اگر وہ مابعد الطبیعیاتی مسائل پر غور کرنے والا ہوتا تو اس کے کتبوں میں ضرور اس کا کچھ تذکرہ ملتا ، وہ سیدھے سادے فرائض کی تلقین کرتا تھا ، جن سے عام طور پر غفلت برتی جاتی تھی ، جیسے ماں باپ کی اطاعت ، ملازموں ، غلاموں اور جانوروں کے ساتھ حسن سلوک ، پروھتوں اور رشیوں کی عزت اور ان کے ساتھ فیاضی ، رواداری ، آشتی ، خیرات ، سیدھی سادی زندگی اور راستی ، مذھب کے معاملہ میں وہ متعصب نہیں تھا ، اگرچہ وہ چند مشہور رسوم کا قائل نہیں تھا ، پھر بھی برھمنوں کی عزت اور تعظیم ضروری سمجھتا تھا ، اس کو اس بات پر فخر تھا کہ اس نے جنگلی قبایل کو ھندو دیوتاؤں سے آشنا کیا ، اس نے بودھ مت کو بڑی ترقی دی ، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ھندو مت کا بھی مخالف تھا ، اس کے کتبوں سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں دیا جاسکتا کہ وہ کسی خاص مذھب کی سرپرستی کا دعویدار تھا ، اس نے در حقیقت کسی مذھب کی بجاے زندگی کے سچے اصولوں کی تبلیغ کی تھی ۔

اس کا ایک اھم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے بودھ مت کی بہت سی زیارت گاھیں بنوائیں ، اور گوتم بودھ کے پیرووں کے درمیان اتحاد اور اتفاق پیدا کیا ، پٹنہ کے اندر ایک مجلس منعقد کی ، جس میں مختلف نقطۂ خیال کے لوگوں کو جمع کرکے مذھبی قوانین اور احکام کا ایک مستند مجموعہ تیار کیا ، اس کے ایک کتبہ سے ظاھر ہوتا ہے کہ اس نے تفرقہ اندازی کیلئے مختلف سزائیں تجویز کی تھیں ، اس نے اپنی سلطنت کے اندر اور اس کے باہر مذھبی مبلغین روانہ کئے تھے ، اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ شام ، مصر اور یونان جیسے دور افتادہ ملکوں میں اشوک کے مبلغین نے کچھ کامیابی حاصل کی ہو ، مگر اپنے ملک

سے قریب شمال مغربی ہند ' برما ' اور دیگر مقامات میں بودھ مت کو بڑا فروغ ہوا ' سیلون میں تو اس مذہب کو بڑی کامیابی ہوی ' یہاں تک کہ وہ اس کا دوسرا مرکز قرار پایا ' اس جگہ اشوک کی مجلس کا ترتیب دیا ہوا قانون اصلی صورت میں محفوظ رہا ' اور جب ہند سے بودھ مت مٹ گیا تو برما اور سیام کے لوگ سنہالی قانون ہی کو مستند ماننے لگے '

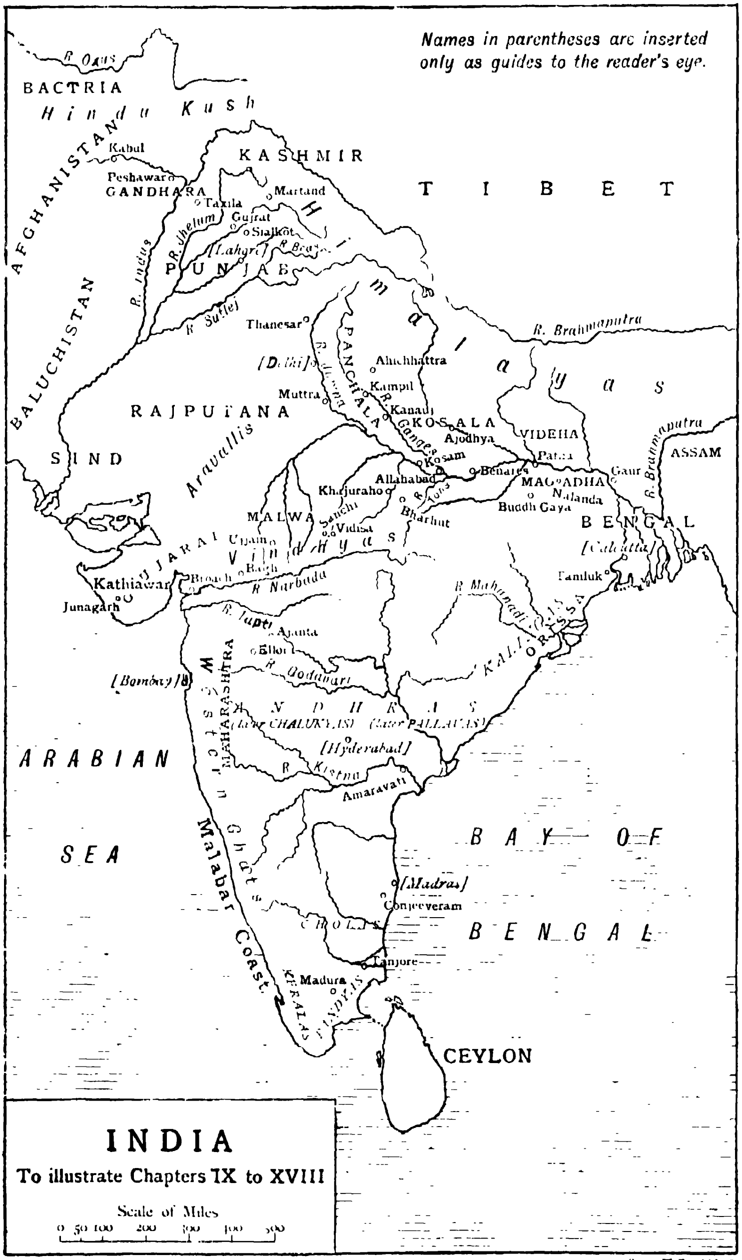
اشوک کی کوششوں کے نتائج کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ' اس کے جانشینوں نے اس کی سی صاف اور واضح پالیسی اختیار نہیں کی ' اسلئے سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ' اس کے کتبے ماضی کی بجاے مستقبل سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں ' اور ہمارے پاس معلومات کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے ' ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے سچائی اور راستی کا بلند نصب العین پیش کیا گیا تھا ' مگر اس پر عمل نہیں ہوسکا ' تاہم یہ کتبے بے اثر نہیں رہے ' کئی نسلوں تک یہ باقی رہے ' لیکن ان کی زبان کا جاننے والا کوئی نہ رہا ' اب برطانوی حکومت کے زمانہ میں ان کو حل کرنے کی طرف توجہ کی جارہی ہے ' روایات میں اشوک کی شہرت کا باقی رہنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کے خیالات لوگوں کے لئے جاذب توجہ ضرور تھے ' لیکن اسوقت اس کے حقیقی کارناموں کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا '

اشوک کے دور حکومت میں فن تعمیر ' بت تراشی اور نقاشی کو بڑی ترقی ہوی ' اس سے پہلے گنگا کے میدانوں میں کٹے ہوے پتھر اور جلی ہوی اینٹوں* کے استعمال کا رواج نہ تھا ' مگاستھنیز کا بیان ہے کہ سیلاب زدہ نشیبی علاقوں میں لکڑی کی عمارتیں بنائی جاتی ہیں اور اونچی زمینوں پر اینٹ اور کیچڑ کا استعمال

* نیپال کی سرحد پر ایک عمارت سے بہت بڑے سائز کی جلی ہوی اینٹیں برآمد ہوی ہیں ' بعض محققوں کا خیال ہے کہ یہ عمارت پانچویں صدی قبل مسیح کی ہے ' مگر جدید خیال یہ ہے کہ یہ موریہ عہد کی ہے ، (دیکھو کیمبرج ہسٹری جلد اول صفحہ ٦٢٣)

کیا جاتا ہے ، یہ اینٹیں دھوپ میں سکھائی ہوئی ہوتی تھیں ، ان کو جلانے کا دستور نہ تھا ، اشوک کی عمارتوں میں جلی ہوئی اینٹیں بھی برآمد ہوئی ہیں ، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بنانے والے کچھ زیادہ تجربہ کار نہ تھے ، البتہ ستونوں پر اعلی درجہ کی نقاشی ہے ۔ ماہرین کا فیصلہ ہے کہ اس میں ایرانی اور یونانی اثرات کی آمیزش ہے ، اور ان کا یہ خیال غالباً غلط نہیں ہے کہ پتھر کے کاریگر باختر سے بلوائے گئے تھے ۔ جہاں ایک زمانہ تک یونانی حکومت قائم تھی ۔ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اینٹ جلانے کا دستور کب سے شروع ہوا ، موہنجودارو کی کھدائی سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے ابتدائی زمانۂ تمدن میں یہ دستور ہر جگہ رائج تھا ، گنگا کے میدانوں میں جو کچھ کھدائی ہوئی ہے اس سے کسی خاص نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے ، موجودہ معلومات کی بنیاد پر یہ قیاس کرنا بیجا نہ ہوگا کہ کم از کم موریہ سلطنت سے پہلے جلی ہوئی اینٹوں کے استعمال کا رواج نہ تھا ، اس دور میں نقاشی کو اس حد تک ترقی ہوئی کہ وہ لوگوں کے جذبات کا بہترین مظہر ہوگئی ، اور اس سے بیرونی اثرات بتدریج دور ہوتے گئے ۔

—



INDIA
To illustrate Chapters IX to XVIII

Emery Walker Ltd. sc.

باب ۹

دوسری صدی قبل مسیح

اشوک کی وفات کے بعد موریہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا ' اور برسوں تک شمالی ہند میں کوئی زبردست سلطنت قایم نہیں ہوسکی ' البتہ وقتاً فوقتاً چھوٹی بڑی ریاستیں ظہور میں آتی رہیں ' اور مختلف خاندان شہنشاہی اقتدار کے حاصل کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے ' مگر اُن کی تاریخ اس وقت محفوظ نہیں ہے ' کتبوں اور سکوں کی مدد سے مختلف خاندانوں کی ایک مجمل تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے ' مگر اس کی حیثیت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ چند ابھرتی اور پھر مٹتی ہوی حکومتوں کا ایک مختصر خاکہ ہے ' چونکہ سکے سیاسی تاریخ کے متعلق اہم معلومات کا ذریعہ ہیں ' اسلئے زر متبادلہ کی مختصر سی تاریخ کا پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے '

اب تک ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے یہ ظاہر ہو کہ سندھ کے ابتدائی زمانۂ تمدن * میں سکوں کا رواج تھا ' رگ وید سے بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا ' اس زمانہ میں گائے زر متبادلہ کا کام دیتی تھی ' بعد کی وید کی کتابوں میں ایک غیر ترقی یافتہ نظام زر کا پتہ چلتا ہے ' وزن کے اندازہ کیلئے گھچیاں استعمال کی جاتی تھیں ' سو گھچیاں ایک سو اسی گرین کے برابر ہوتی تھیں ' ویدوں میں ان کا ذکر ملتا ہے ' اس میں شبہ نہیں کہ تجارت میں گھچیوں کا استعمال ہوتا تھا ' مگر سکوں کی طرح ان پر کوئی مہر یا نشانی نہیں ہوتی تھی ' بودھ مت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دھات کے سکوں کا رواج عام ہوگیا تھا ' چونکہ ان کی تاریخ قطعی طور پر معلوم نہیں ہے ' اس لئے اتناھی کہا جاسکتا ہے کہ اشوک سے پہلے شمالی ہند میں سکوں کا رواج تھا ' لیکن پورے وثوق کے ساتھ یہ بتایا نہیں جاسکتا ' کہ یہ کتنے زمانہ سے رائج تھے .

---

* چند تانبے کے پتر ، جن کو پہلے سکے خیال کیا جاتا تھا ، در حقیقت تعویذ ثابت ہوئے ہیں ۔

شمالی ہند میں جو سکے دستیاب ہوے ہیں ' ان کی شکل مستطیل ہے ' اور وہ دھات کے پتروں سے کاٹ کر بنائے گئے ہیں ' ان کے کناروں کو صاف کیا گیا ہے ، اس کے ایک گوشہ میں اور بعض میں دونوں گوشوں کے اندر سوراخ کیا گیا ہے ، ان پر مختلف نشانات ہیں جن کی توضیح اب تک نہیں ہوسکی ' جب تک ان کو حل نہ کر لیا جائے مورخین ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے ' سکوں کے دونوں رخوں پر مہر لگانے کا دستور ' جواب عام ہو چلا ہے ' بیرونی اثرات کا نتیجہ ہے ' ہند میں جو دورخی سکے ملے ہیں وہ زیادہ تر چاندی کے ہیں ' ان کو پنجاب کے ایک مقامی حکمران نے سکندر کے حملہ کے قریب جاری کیا تھا ' ان سے اس دور کے یونانی سکوں کی نقالی ظاہر ہوتی ہے ' تدریجی طور پر ان کا ملک میں چلن ہوا ہے ' مگر اب تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ کس وقت سے ان کا رواج ہوا ' خیال کیا جاتا ہے کہ پرانے مستطیل سکوں کا رواج عراق سے تجارتی تعلقات پیدا کرنے کی وجہ سے ہوا ' یہاں اس قسم کے سکے پہلے ہی سے رائج تھے ' ہند کے سکوں کو پران کہا جاتا تھا ' مگر یہ خیال بھی ثبوت کا محتاج ہے ' ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ برسوں سے یہ سکے ہند میں رائج تھے ' اور سکندر کے حملہ کے بعد سے ایسے سکوں کا چلن ہوا ' جن کے دونوں طرف مہر لگی ہوی تھی ' ان پر ان کے جاری کرنے والے بادشاہ کا نام * ہوتا تھا ' انھی ناموں اور نقشوں کی وجہ سے دوسری صدی کے سکوں کو تاریخی اھمیت حاصل ہوگئی ہے ' سنہ کو نقش کرنے کا دستور سنہ ۱۰۵ ع کے بعد سے چلا ہے ' نام اور سنہ کے سکے مورخین کیلئے بڑی اھمیت رکھتے ہیں ' سنہ کے بغیر صرف نام کے سکے بھی مختلف خاندان کے بادشاھوں کے ناموں اور مختلف کتابوں کی تلمیحات کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں .

---

* بعض سکے اشوک سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں ، مگر اس کی تمیز نہیں کی جاسکتی کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔

ان سکوں سے تاریخی واقعات کا خلاصہ یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ اشوک کی وفات کے بعد اس کے تین نائبوں میں سے دو آزاد ہوگئے ، شمالی مغربی حصہ میں ٹیکسلا کی ریاست آزاد ہوگئی ، اور جنوب مشرقی حصہ میں کلنگانے اپنی پرانی حیثیت حاصل کرلی اور زبردست قوت پیدا کرلی ، باقی حصہ سلطنت پر موریہ خاندان کے کمزور بادشاہ پچاس سال تک حکومت کرتے رہے ، ان کے بعد ایک نیا خاندان برسر حکومت آیا ، یہ سنگ کا خاندان تھا ، اور اس کے فرمانرواؤں نے ۱۸۴ ق م سے ۷۲ ق م تک حکومت کی ، مگر اس دور میں بہار کی بجائے مالوہ ان کا پایۂ تخت رہا ، معلوم ہوتا ہے کہ دوسری ریاستوں نے مرکزی حکومت سے بڑھکر بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی ، اس لئے ضروری ہے کہ ہر ایک ریاست کی ایک علحدہ تاریخ بیان کی جائے .

گنگاڈی میدانوں کے مشرقی کناروں پر بنگال کی حیثیت واضح نہیں ہے ، حال کے بعض تازہ اکتشافات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم اس کا شمالی حصہ موریہ سلطنت میں شامل تھا ، اور سنگ خاندان کے زمانہ حکومت میں بھی اس سلطنت کا جز بنا ہوا تھا ، بنگال کے مغرب میں دریاے گنگا سے جنوب کی سر زمین پر چار اور شمال کے علاقہ میں تین ریاستیں تھیں ، گنگا کے جنوب میں جو چار ریاستیں تھیں ان کے نام یہ ہیں ، مگدھ ، کاشی (جس کو اب بنارس کہا جاتا ہے) کوسامبی اور متھرا ، کوسامبی کے پاے تخت کے متعلق بڑا سخت اختلاف ہے ، موجودہ آثار قدیمہ سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے ، کہ اس کا پاے تخت کوسام تھا ، جو اب الہ آباد کے مغرب میں تیس میل کے فاصلہ پر دریاے جمنا کے کنارے ایک چھوٹاسا قریہ ہے ، متھرا آگرہ کے شمال مغرب میں دریاے جمنا کے کنارے اب ایک اہم شہر ہے ، اور کرشن کی پرستش کا ایک زبردست مرکز ہے , اس سلطنت کے شمالی حدود واضح نہیں ہیں ، گنگا کے شمالی علاقہ میں ودیھا (شمالی بہار) کوسل (اودھ) اور پنچالا کی تین ریاستیں تھیں ، ابتدائی

دو کا ذکر پچھلے ابواب میں آچکا ہے ' پنچالا کا پایۂ تخت اہیچھتر تھا جو اب روھیلکھنڈ میں بریلی کے قریب ایک ویرانہ ہے ' اس سلطنت کے حدود گنگا سے بھی آگے پھیلے ہوئے تھے ' اس کا دوسرا پایۂ تخت کمپیل تھا ' ان سلطنتوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی ,

وسط ہند کی سلطنتوں کے حالات معلوم کرنے سے پہلے اس کا جغرافیہ سمجھ لینا چاہئے ' آگرہ سے الہ‌آباد تک کی ناہموار زمین نشیبی ہے ' آگے جنوب میں نربدا کے قریب پہاڑیوں کا زبردست سلسلہ ہے , جس کی وجہ سے تمام معاون دریا شمال کی طرف بہتے ہیں , اور جمنا سے جاملتے ہیں ' نربدا میں کوئی اہم معاون دریا آنہیں ملتا جو جہاز رانی کے قابل بھی ہو ' پرانے زمانہ میں ان پہاڑوں کی وادیوں میں سے گھوم کر جنوبی ہند کو راستہ جاتا تھا ' اس لئے نربدا کے پاس کی سلطنت کا تعلق جنوبی ہند کی سلطنتوں کی بہ نسبت شمالی ہند کی سلطنتوں سے زیادہ تھا .

پٹنہ سے اجین تک جانے کیلئے پہلے کوسامبی تک جمنا ملتا ہے ' اس کے بعد ٹونس کی وادی میں سے ہوکر بھارھوت تک تقریباً اسی میل کا راستہ جاتا ہے ' اس زمانہ میں بھارھوت ایک اہم سلطنت کا پایۂ تخت تھا ' مگر اب وہ ایک ویرانہ ہے ' اس کے جنوب مغرب میں ایک سو اسی میل کے فاصلہ پر ودیسا کی سلطنت تھی اور اس سے آگے ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر اجین کی ریاست تھی ' یہ دونوں مقام مشرقی اور مغربی مالوہ کے پایۂ تخت تھے ' اجین کا علاقہ بہت زرخیز ہے ' اسی وجہ سے اجین ایک اہم تجارتی شہر بن گیا ہے ' ودیسا بھیلسہ سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے ' اس کا موجودہ نام بسناگر ہے ' یہ بھی بھارھوت کی طرح ایک ویرانہ ہے ' گنگائی میدانوں سے باہر بھارھوت ' ودیسا اور اجین کی یہی تین ریاستیں تھیں جن پر موریہ خاندان کے آخری فرمانرواؤں کا تسلط تھا ' ان کے علاوہ اور بھی سلطنتیں رہی ہونگی جن کا نام ہمیں معلوم نہیں ہے .

نا کافی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سنگ فرمانروا در حقیقت ودیسا کے بادشاہ تھے ' جو پہلے موریہ خاندان کے ماتحت تھے ' ۱۸۴ ق م کے قریب اس خاندان کا ایک فرد پشی متر جو موریہ فوج کا سپہ سالار تھا ' موریہ خاندان کا مخالف ہوگیا ' اور اس کے فرمانروا کو قتل کرکے مگدھ کی ریاست پر قبضہ کرلیا ' اس کا خاندان سو سال سے زیادہ کی مدت تک حکومت کرتا رہا ' پٹنہ کی بجاے ودیسا پاے تخت قرار پایا ' بہار کئی صدیوں تک گمنامی کی حالت میں رہا ' اور مالوہ سیاسی دلچسپیوں کا مرکز ہوگیا ' موریہ خاندان کے حکمران بودھ مت کے پیرو تھے ' مگر سنگ خاندان کے فرمانروا ہندو تھے ' ان کے زمانہ میں بہت سے برھمن وزیر تھے ' ۷۲ ق م کے قریب ایک برھمن وزیر نے اس خاندان کے آخری فرمانروا کا خاتمہ کیا ' قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کوسامبی ' متھرا اور پنچالا پر سنگ حکمرانوں کا اقتدار تھا ' وسط ہند کی ریاستوں میں بھی ان کا رسوخ تھا ' یہ نہیں معلوم کہ مشرق میں کن کن ریاستوں پر ان کا اقتدار قایم ہوگیا تھا.

سنگ خاندان کے زمانہ حکومت میں آندھرا سلطنت کو بڑا فروغ ہوا ' یہ کلنگا کے مشرق میں واقع تھی ' اور بمبی سے اوپر کی پہاڑیوں میں جو کتبے ملے ہیں ان سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اشوک کے بعد پورے جنوبی ہند پر اس کا اقتدار قایم ہوگیا تھا ' قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سنگ خاندان کے پہلے بادشاہ کے زمانہ میں آندھرا کی فوج شمال کی جانب بڑھی اور اس نے اجین پر قبضہ کرلیا ' اب صرف مالوہ کا ایک حصہ سنگ حکمرانوں کے ہاتھوں میں رہا ' آندھرا سلطنت غالبا چند برسوں تک اجین پر قابض رہی مگر بعد میں وہ اس کے قبضہ سے نکل گیا ' اس بناء پر دونوں حکومتوں میں اجین کے لینے کیلئے لڑائیاں ہوتی رہیں ' دوسری صدی میں کلنگا کی ریاست نے بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی ' اور کتبوں سے

ظاہر ہوتاہے کہ اکثر آندھرا اور بہار کی سلطنتوں سے اس کی جھڑپ ہوتی رہتی تھی ، مگر یہ پتہ نہیں کہ ان کا کیا نتیجہ رہا .

پہلی صدی قبل مسیح کی ابتدا میں ہند کی سیاسی صورت حال یہ تھی ، وسط ہند اور غالبا گنگائی میدانوں کے مغربی حصہ پر سنگ حکمران قابض تھے ، جزیرہ نما کے شمالی حصہ میں آندھرا سلطنت تھی ، اور اس کے حدود مالوہ تک پھیلے ہوے تھے ، مشرقی ساحل پر کلنگا کی ریاست مستحکم ہوگئی تھی ، بنگال اور بہار کے متعلق صریح حالات کا پتہ نہیں ملتا ، آندھرا کے جنوب میں تین تامل ریاستیں تھیں یعنی مشرقی حصہ میں چولا ، جنوب مغربی علاقہ میں کیرلا اور جنوب مشرقی حصہ میں پانڈیہ ، ان سلطنتوں کو ابھی تک فروغ نہیں ہوا تھا ، اس لئے ان کو چھوڑکر ہم وادی سندھ کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں .

باب ۱۰

پنجاب میں یونانیوں کا داخلہ

یہ کچھ نہیں معلوم کہ کن سیاسی حالات اور وجوہ کی بناء پر ٹیکسلا کی ماتحت حکومت موریہ سلطنت سے الگ ہونے پر مجبور ہوی ، مگر یہ حکومت مضبوط اور طاقتور نہیں تھی ۔ کیونکہ اشوک کے انتقال کے بعد پچاس برس کے اندر باختر کے یونانیوں نے بتدریج پنجاب پر قبضہ کرلیا تھا اور اس کو اپنی سلطنت کا جز بنالیا تھا ' یہ یاد ہوگا کہ سلوکس اول نے ہندوکش سے جنوب میں افغانستان کا علاقہ چندرگپت کے حوالے کردیا تھا ' اور اپنے قبضہ میں باختر کا علاقہ رکھ لیا تھا ۔ لیکن پچاس سال کے بعد یہ علاقہ بھی آزاد ہوگیا ' اور اس کے حدود اور وسیع ہوگئے اور روز بروز اس کی قوت اور طاقت بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ ۲۰۰ ق م کے بعد ھی باختر کے یونانی پورے افغانستان اور پنجاب کے ایک بڑے حصہ کے مالک بن گئے ' اور کچھ زمانہ کے بعد جبکہ یونانی بادشاہ دیمترس ہند میں مصروف کارزار تھا ' باختر میں ایوکرٹائڈس نامی ایک شخص نے بغاوت کی اور ۱۷۵ ق م کے قریب پورے باختر پر اپنا تسلط قائم کرلیا ' اور پھر پنجاب کی طرف بڑھنا شروع کیا ' اس طرح پنجاب میں دو یونانی ریاستیں قائم ہوگئیں جن کے درمیان دریاے جھیلم حد فاصل بنا ہوا تھا ۔ دریا سے مشرق کے علاقہ میں دیمترس خاندان کی حکومت تھی اور اس کے مغرب میں ایوکرٹائڈس خاندان سلطنت کر رہا تھا ' پہلے کا پاے تخت ساکلہ یا سیالکوٹ اور دوسرے کا گندھارا تھا ، موخرالذکر سلطنت کے حدود جھیلم سے لیکر افغانستان تک پھیلے ہوے تھے ' یہ دونوں سلطنتیں ایک صدی تک باقی رھیں ' اس کے بعد خانہ بدوش حملہ آوروں نے ہند سے یونانی اقتدار کا خاتمہ کردیا ساکلہ اور گندھارا کی جنوبی سرحدیں واضح نہیں ہیں ' یونانی مورخین کا بیان ھے

کہ سندھ بلکہ کاٹھیاواڑ بھی ان سلطنتوں میں شامل تھا ' غالباً ایک بڑی مدت تک کیلئے ان پر یونانیوں کا تسلط نہیں رہا ہوگا ' اور ان کی حکومت صرف پنجاب تک محدود رہی ہوگی '

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ دنیا کی تاریخ میں ایک زبردست انقلاب ہو رہا تھا ' ایشیا کی بلند سرزمینوں سے خانہ بدوش قبایل کا سیلاب آگے بڑھنے لگا ' اور انہوں نے آگے چلکر پورے یوروپ کی تاریخ بدل دی ' یہ لوگ ایک طرف هندوکش کے شمال میں مغرب کی طرف بڑھتے گئے اور دوسری طرف باختر میں گھس آئے ' اس کی وجہ سے یونانیوں کو جنوب کی طرف ھٹنا پڑا ' جب یونانی پہلے پہل کابل کی طرف بڑھے ہیں تو غالباً شمال اور مشرق کی جانب سے ان قبایل کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا ' مغرب کی طرفسے پارتھیوں کا اور شمال کی جانب سے سکیوں * کا اتنا دباؤ پڑا کہ باختر کا ایوکرٹاڈس بھاگ نکلا ' چین کی بچی کچھی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۵ ق م میں ھون مشرق کی طرف سے اٹھے اور ایک دوسرے چینی قبیلے یوچی پر حملہ آور ہوے ' انہوں نے ایک دوسرے قبیلے یعنے سکیوں کو باختر کی طرف جانے پر مجبور کیا ' اور چونکہ یونانیوں میں سکیوں اور پارتھیوں کے مقابلے کی تاب نہ تھی ' اسلئے وہ مجبوراً هندوکش کے جنوب کی طرف ھٹ آئے .

پنجاب کے یونانی حکمرانوں کی ایک تفصیلی تاریخ سکوں کی مدد سے مرتب کی گئی ہے ' جن میں سے بعض سکے فنکاری اور مصوری کا نادر نمونہ ہیں ' ایک کے سوا باقی حکمرانوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنی کوئی یادگار نہیں چھوڑی ' جہاں تک جنگ اور سیاسی چالبازیوں کا تعلق ہے وہ هندی بادشاہ معلوم

---

* بسا اوقات سکیوں کو سیتھیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے ، مگر یہ نام گنجلک ہے اور یہ لفظ یوروپ اور ایشیا کے مختلف خانہ بدوش قوموں کیلئے بولا جاتا ہے ، اسلئے اس قوم کو سک کہنا ہی بہتر ہے جس کا ذکر اکثر هند کی کتابوں میں آتا ہے

ہوتے ہیں ' ساحلی علاقوں پر ان کے حملوں کا ذکر اوپر ہوچکا ہے ' ایک روایت میں ہے کہ وہ گنگاٹی میدانوں کو فتح کرتے ہوے پٹنہ تک پہنچ گئے تھے ' مگر صدر مقام پر خطرات لاحق ہونے کی وجہ سے ان کو فوراً لوٹ جانا پڑا ۰ اس دور کی ایک واضح یادگار پتھر کا ایک ستون ہے جس کو انٹیلسیڈس بادشاہ کے سفیر ہیلیوڈورس نے کرشن کی یادگار میں بسنگر کے قریب نصب کیا تھا ' ۱۰۰ ق م کے قریب اس بادشاہ کی حکومت تھی ' اور یہ سفیر اس وقت ٹیکسلا میں رہتا تھا ' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنگ خاندان کے ساتھ یونانی حکمرانوں کے سیاسی تعلقات قائم تھے ' ایک یونانی حکمران کا خود کو وشنو کا پیرو بتانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یونانی ہندومت میں جذب ہوتے جارہے تھے ' مگر اس کا صحیح علم نہیں کہ اس کے اسباب کیا تھے .

یونانی بادشاہ جس نے ہند کی تاریخ میں اپنا نام چھوڑا ' منانڈر ہے جس کو بودھمت کی کتابوں میں ملندا لکھا جاتا ہے ' یہ سیالکوٹ کا بادشاہ تھا ' ' ملندا کے سوالات ' نام کی ایک کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبردست مناظر بھی تھا ' اس نے بودھمت کے ایک مبلغ پر سخت تنقیدی اعتراضات کئے تھے اور آخر میں اس نے اس مذہب کو قبول کرلیا تھا ' ذیل کے موثر لفظوں میں اس کی تصویریوں کھینچی گئی ہے . *

" پورے ہند میں عقل ' جسمانی قوت ' تیزی اور بہادری میں ملندا کی برابری کرنے والا کوئی نہیں تھا ۰ وہ بہت زیادہ مالدار تھا ۰ اس کے پاس دولت اور فراغت کی فراوانی تھی ' اس کی فوج کی کوئی حد نہ تھی "

اس قسم کی مبالغہ آمیز باتیں قابل قبول نہیں ہوسکتیں تاہم اس سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ منانڈر اگر بودھمت

* ملنداپنہا مترجمہ ـ ٹی ڈبلیو ـ رڈس ـ ڈیوڈس ـ دیکھو سیکرڈ بکس الف دی ایسٹ جلد ۳۵ صفحہ ٦ اور ۷ .

کا قائل نہیں تھا تو کم از کم اس کی طرف میلان ضرور رکھتا تھا ، اور مالوہ کے سفیر کی طرح وہ ہندی تعلیمات سے بہت متاثر تھا ۔

موریہ اور سنگ خاند: ان کے عہد حکومت میں یونانی ریاستوں کے ساتھ انکے تعلقات قایم تھے ، اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ھے کہ اس سے ہند کو کیا فائدہ پہنچا ، اوپر لکھا جاچکا ھے کہ سکوں کے ڈھالنے اور نقاشی و بت تراشی میں یونانیوں کی تقلید کی گئی تھی ، دوسری اور پہلی صدی ق م کی یادگاروں سے پتہ چلتا ھے کہ ایرانی اور یونانی اثرات مشرق میں بہت دور تک پہنچ چکے تھے ، جن کے آثار اب بھی بھارھوت ، بودھ گیا (بہار) ، سانچی (موجودہ بھوپال کے قریب) اور دیگر مقامات میں پائے جاتے ہیں ، ایک زمانہ گزرنے کے بعد بھی کاریگری اور فن کاری کا کمال باقی رہا ، مگر غیر ملکی شکلیں بدل گئیں اور سرجان مارشل کے الفاظ میں مختلف عناصر سے ترکیب پاکر ایک ایسا قومی آرٹ بن گیا جو قومی عقاید و خیالات اور مظاہر پرستی کا ایک بہترین مظہر تھا * ۔

آرٹ کے علاوہ سائنس میں بھی ہند والوں نے یونانیوں سے بہت کچھ سیکھا ھے ، مگر ادب † سیاست اور مذہب پر ان کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا ، طب ، نجوم اور رمل کے متعلق ہند میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ یونانی اثر پذیری کی کھلی ہوی شہادت دے رہی ہیں ، خاصکر قیافہ شناسی اور خطوط خوانی کا علم جس کا وجود اب تک پایا جاتا ھے ، یونانی خصوصیات کا حامل ھے ، اس میں یونانی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ھے ، چونکہ ان کتابوں کی تاریخ تصنیف قطعی طور پر معلوم

* کیمبرج ہسٹری جلد اول صفحہ ۶۲۴

† بعض محققین کا خیال ھے کہ ہندی ناٹک یونانی اثرات کا نتیجہ ھے ، مگر اس پر بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں ، ڈاکٹر اے اے میکڈونل نے انڈیاز پاسٹ میں اس پر بڑی بحث کی ھے ، دیکھو صفحہ ۹۸

نہیں ہے ' اسلئے صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے کہ یونانی اثرات کی کس دور سے ابتدا ہوی' ممکن ہے کہ بعد میں اسکندریہ سے تعلقات قایم ہوجانے کی وجہ سے یہ اثرات ہوے ہوں ' لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس دور میں دونوں کے درمیان تعلقات قایم تھے .

هندی اور یونانی مفکرین کے فلسفیانہ افکار میں بڑی ایک قسم کی مشابہت پائی جاتی ہے ' جس کی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک نے دوسرے سے لیا ' مگر اس پر کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا ' یہ فرض کرنا بھی ممکن ہے کہ دونوں نے ساتھ ساتھ ترقی کی ہو ' دونوں ایسے مسائل پر غور و فکر کرنے لگے جو عام طور پر مفکرین کے سامنے آتے ہیں ' اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ هندی اور یونانی مفکرین کے افکار کا نتیجہ ایک هی رها ' هم اس امکان کو بھی خارج از قیاس نہیں سمجھ سکتے کہ مشرق یا مغرب کا رهنے والا کوئی مفکر دوسرے ملک میں پہنچ کر اپنے فلسفیانہ افکار کی تبلیغ کی ہو اور سازگار طبیعتوں نے ان افکار کو قبول کرلیا ہو ' لیکن یہ فرض کرنا دشوار ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے سے باقاعدہ استفادہ کیا ہو ' کیونکہ زبانوں کے اختلاف کے مد نظر اس قسم کی کوشش ناممکن ہے ' اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ یونانیوں نے چند تاریخی واقعات اور افسانوی حکایات کے سوا جن کو یونانی مورخین نے اپنی کتابوں میں محفوظ کردیا ہے ' هند والوں سے کچھ اور بھی سیکھا ہوگا '

باب ۱۱

سک اور پہلوا خاندان

گذشتہ باب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ سکیوں نے یونانیوں کو باختر سے نکال کر اس پر قبضہ کرلیا تھا ' مگر زیادہ دنوں تک وہ اس پر قابض نہ رہ سکے کیونکہ مشرق کی طرف سے یوچی قبایل کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا ' یہاں تک کہ ۱۲۵ ق م کے بعد انہوں نے باختر پر قبضہ کرلیا ' قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سکیوں نے پہلے پہل مغرب کی طرف بڑھنے کی کوشش کی ' مگر جب پارتھی ان کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے تو وہ افغانستان اور بلوچستان سے ہوکر ہند کے اندر داخل ہوے ' پارتھیوں کی حکومت پہلے پہل تیسری صدی میں خراسان کے اندر قایم ہوی ' اس وقت شمال مشرقی حصۂ ایران میں سلوکس کے جانشینوں کی قوت گھٹ رہی تھی ' متھریڈیٹس اول (۱۷۰ - ۱۳۷ ق م) نے زبردست فتوحات حاصل کرکے پارتھیوں کی معمولی بادشاہت کو ایک زبردست سلطنت میں بدل دیا ' سکیوں کے جنوب کی طرف بڑھنے کے متعلق کوئی واضح یادداشت موجود نہیں ہے ' ظن غالب یہ ہے کہ جب متھریڈیٹس دوم (۱۲۳ - ۸۸ ق م) نے سکیوں کو آخری بار خراسان سے مار بھگایا تو وہ مغربی افغانستان کو پار کرتے ہوے بلوچستان میں داخل ہوے اور اس علاقہ کے پارتھیوں کو ساتھ لیکر جنوب کی طرف بڑھے اور کوئٹہ کے قریب کے دروں سے سندھ میں داخل ہوے ' ہند میں پہنچ کر ایک طرف انہوں نے جنوبی علاقوں کو گجرات تک فتح کرلیا اور دوسری طرف پورے پنجاب کے مالک بن گئے .

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی سرحد پر پارتھیوں کی سلطنت کمزور ہوگئی تھی ' کیونکہ پہلی صدی قبل مسیح میں مشرقی ایران اور نیز پنجاب کے ایک خاندان کے سکوں پر " شہنشاہ " کا لفظ ملتا ہے جو آزاد اور مقتدر بادشاہوں کیلئے استعمال کیا جاتا تھا ' ان خاندانوں کو سک یا پارتھی سمجھنا ممکن نہیں ہے ' آسانی اسی میں ہے کہ ہم ان کو سک اور پہلوا خاندان خیال کریں ' پہلوا در حقیقت بلوچستان کے پارتھی تھے ' جن کو مغرب کے اصل پارتھیوں سے تمیز کرنے کیلئے یہ نیا نام دیا گیا ہے ۔

پنجاب کو دو مرتبہ فتح کرنے کی کوشش کی گئی ' پہلی مرتبہ سک اور پہلوا خاندان کے بادشاہ مویس (Maues) نے ۷۵ ق م کے قریب مغربی سلطنت گندھارا کو فتح کیا ' اس بادشاہ کے متعلق صرف ایک یادداشت باقی رہ گئی ہے ' تقریبا بیس سال بعد اس کے جانشین ازیس (Azes) اول نے مشرقی سلطنت سیالکوٹ پر قبضہ کیا ' اس خاندان کی حکومت سنہ ۵۰ع تک قایم رہی ' اس کے بعد کشان ان پر غالب آگئے ' اس کے متعلق آئندہ کسی باب میں بحث کی جائیگی ' البتہ یقین ہے کہ متھرا سک اور پہلوا خاندان کے حدود سلطنت میں شامل تھا ' مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ متھرا سے آگے انہوں نے کوئی کامیابی حاصل کی ' اور جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے ہندی تمدن پر اس خاندان کا کوئی اثر نہیں پڑا * ۔

جنوب میں البتہ ان کی پیش قدمی سے بہت سے پایدار نتیجے نکلے ' گجرات کے مغربی حصہ یعنے کاٹھیاواڑ میں سک ریاست برسوں قایم رہی ' گجرات سے ملا ہوا مالوہ ہے ' اور اب ہم اس علاقہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کو ہم نویں باب میں بیان کرچکے ہیں ' اس علاقہ کے مشرقی حصہ پر سنگ خاندان کی اور اس کے مغربی حصہ پر آندھراؤں کی حکومت

* ہندی تمدن پر پہلوا خاندان کے اثرات کے متعلق دیکھو ڈاکٹر ارگل کی کتاب ریریلنگ انڈیا ز پاسٹ (مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۹) صفحہ ۱۲۵ اور نیز صفحہ ۸۲ کا حاشیہ ۔

تھی ، ۲۷ ق م کے قریب سنگ خاندان کا خاتمہ ھوگیا ، اور ان کی مملکت پر آندھراؤن کا قبضہ ھوگیا ، اور جب پورے مالوہ پر ان کی حکومت قایم ھوگئی تو ساک خاندان سے انھون نے لڑائی مول لی اور کئی سال تک اس کا سلسلہ جاری رہا ۔ سنہ ۱۰۰ ع سے پہلے ان لڑائیون کے متعلق کوئی کھلی شہادت نہیں ملتی ، تاھم اس دور کے قصص کا بالکلیہ انکار نہیں کیا جاسکتا ، ان میں وکرمادتیہ (بکرماجیت - شمس الدولہ) کا نام آتا ھے ، جو ھندی روایات میں اھم شخصیت کا مالک ھے ۔ ایک قصہ میں ھے کہ اجین کے لوگون نے گجرات کے ساک خاندان سے آندھراؤن کے خلاف مدد مانگی ، سکیون نے ان کو شکست دیکر خود ھی اجین پر قبضہ کرلیا ۔ آندھرا حکمران کے بیٹے وکرمادتیہ نے ایک زبردست فوج تیار کی اور سکیون کو مار بھگایا ، یہ واقعات ۵۸ ق م کے قریب ھوے تھے کیونکہ اس سے وکرم سنہ کی ابتدا ھوتی ھے ، اس کے ساتھ اس کو بھی تسلیم کرنا ھوگا کہ بہت سے بادشاھون نے اپنا لقب وکرمادتیہ رکھا تھا ، جن میں سے ایک گپت خاندان کا ایک بادشاہ بھی ھے ، جس نے چار صدیون کے بعد سکیون کے اقتدار کا خاتمہ کیا تھا ، ان تمام بادشاھون کی تاریخ کہانیون میں گم ھوگئی ھے ، اور ممکن ھے کہ اوپر کا واقعہ گپت بادشاہ ھی کے کارنامون کی صداے باز گشت ھو ، اور بنیادی واقعہ صرف ایک ھو ، اس لحاظ سے آندھراؤن اور سکیون کے درمیان کشمکش پہلی صدی قبل مسیح میں شروع ھوتی ھے ۔

باب ۱۲

عہد اول کے سمندری راستے

سکیوں کے گجرات میں پہنچنے کے ساتھ ہی ہم کو پہلی مرتبہ ہند کے اس ساحلی علاقہ سے تعلق پیدا ہوتا ہے جو مغرب کا قدرتی دروازہ کہلاتا ہے ' اس جگہ صرف ہمارے نا کافی معلومات کا خلاصہ ہی پیش کرنا بہتر ہوگا جو ہم کو عہد اول کے سمندری راستوں کے متعلق حاصل ہیں ' موہنجودارو کے اکتشافات سے ثابت ہوتا ہے کہ تیسرے ہزار سالہ دور میں یا اس سے کچھ پہلے وادی سندھ اور عراق کے درمیان روابط تھے ' قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان دونوں کے درمیان زمینی راستوں سے تجارتی آمد و رفت رہتی تھی یا سمندری راستوں سے ' بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس زمانہ میں سمندری راستوں ہی سے آمد و رفت ممکن تھی بلکہ ظن غالب یہ ہے کہ انھی راستوں سے سفر کیا جاتا تھا .

رگ وید کے بھجنوں میں ایک سنسکرت لفظ ملتا ہے ' جس کے معنی سمندر کے ہوتے ہیں ' اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آریہ سمندر تک پہنچ چکے تھے بلکہ وہ جہاز رانی بھی کرتے تھے ' دوسروں کا خیال ہے کہ ابتدا میں یہ لفظ دریائے سندھ کیلئے استعمال ہوتا تھا ' بعد میں اس سے سمندر کے معنی لئے جانے لگے ' اگر دوسرا نظریہ ٹھیک ہو تو بہت ممکن ہے کہ عہد عتیق (Old Testament) کی بعض عبارتوں میں ' جو سلیمان علیہ‌السلام کی تجارتی سرگرمیوں سے متعلق ہیں ' ہند کے ساتھ بحری تعلقات کا تذکرہ ملے ' ان کا زمانہ دسویں صدی قبل مسیح کا ہے ' لیکن عہد عتیق کے انگریزی ترجمہ سے ان تعلقات کا احساس نہیں ہوتا ' اس جگہ چند لفظوں میں ان دلیلوں کا پیش کرنا نا ممکن ہے جن کی وجہ سے بعض لوگ یہ استدلال کرنے لگے ہیں ' کہ اس زمانہ میں ہند کے

نوادر جیسے مور اور بندر اور خام اشیا جیسے سونا ، ہاتھی دانت اور صندل کی لکڑی فینقی اور اسرائیلی جہازوں میں بحر احمر سے آگے جاتی تھی ، اگر ان قیاسی نتیجوں کو مان لیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہند کے اندر جہاز موجود تھے ، اور اس کا جواب اسی وقت ممکن ہے جبکہ عفیر کے جائے وقوع کا تعین ہو جائے ، یہ مقام جنوب میں فینقی بیڑے کی آخری منزل تھا ، اب تک اس سوال کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جاسکا ، اگر عفیر سندھ کے دھانہ پر واقع تھا جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے تو یہ استدلال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ ہند میں جہازوں کا وجود تھا ، اور اگر وہ عربستان کے جنوب مشرقی ساحل پر واقع تھا تو یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ عرب و ہند کے درمیان تجارتی تعلقات قایم تھے ۔

ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح سے ہند اور خلیج فارس کے درمیان بحری آمد و رفت کی کچھ بہتر شہادتیں ملتی ہیں ، یہ معلوم ہے کہ اشور کے سیناچریب (۷۰۰ ق م) نے خلیج فارس میں ایک بیڑا تیار کیا تھا ، اس کے بنانے والے فینقی تھے جو سواحل بحر روم سے بلوائے گئے تھے ، چند دنوں کے بعد فرات سے لیکر چین تک بحری آمد و رفت جاری ہوگئی ، اس لئے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ جہاز ہند کے ساحل پر ضرور لنگر انداز ہوتے رہے ہونگے ، چھٹی صدی کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہند کے مغربی ساحل اور بابل کے درمیان جو اس زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی تجارتی منڈی تھا ، جہاز رانی بڑی ترقی کر چکی تھی ، مگر اب تک جو کچھ شہادتیں مل سکی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہاز ہند کے نہیں بلکہ بابل کی ملکیت تھے ۔

دارا اول کے زمانہ سے بابل کا زوال شروع ہوا ، اور اس کے بعد غالبا ہندی تجارت بحر احمر کے راستے سے ہونے لگی ، مگر اب تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ کچھ مال ہندی

جہازوں میں جاتا تھا ' کیونکہ ممکن ہے کہ اس وقت بڑی بعد کی طرح موچا اور عدن کے تاجر ہند سے مال لانے کیلئے اپنے جہاز روانہ کرتے تھے ' در حقیقت پہلے جہاز جو ہند سے روانہ ہوئے وہ دارا اول کے تھے اس نے یہ جہاز ۵۱۰ ق م میں دریائے سندھ کے دریافت کرنے کیلئے بھیجے تھے ' یہ بیڑا پشاور کے قریب کسی جگہ سے روانہ ہوا اور آخرکار مصر پہنچا ' مگر اس سفر کی کوئی روداد باقی نہیں رہی اور ہم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آیا یہ جہاز ہندیوں کےبنائے ہوئے تھے ' یا ایران اور مغربی علاقہ کے بدیسی کاریگروں نے دریائے سندھ کے کنارے ان کو تیار کیا تھا ' اس لئے یہ بتانا بھی ناممکن ہے کہ ہند کے مغربی ساحل پر کب سے جہاز تیار ہونے لگے ' بودھ مت کی ابتدائی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہند میں جہازوں کے بنانے کا دستور تھا ' لیکن اس کی تاریخ کا تعین بہت مشکل ہے ' یہ کتابیں یقینی طور پر ۵۰۰ ق م کے بعد کی ہیں ' ان میں بعض پرانی کہانیاں بھی پائی جاتی ہیں ' اور جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ گوتم بودھ کے زمانہ سے لیکر سنہ عیسوی کی ابتدا تک بحری سفر کا رواج تھا ' اور لوگ ساحل سے لگے ہوئے سیلون تک جہازوں میں سفر کرتے تھے ' اس کے متعلق کوئی واضح شہادت نہیں ہے کہ وہ کھلے سمندروں میں بھی سفر کیا کرتے تھے ' تاہم یہ معلوم ہے کہ سکندر کے زمانہ میں دریائے سندھ کے کنارے جہاز تیار کئے جاتے تھے ' کیونکہ اس نے اپنی فوج کو فرات تک لے جانے کیلئے جہازوں کی ایک بڑی تعداد فراہم کی تھی ۔

تیسری صدی قبل مسیح کے بعد سے مصر کی نئی بندرگاہوں کے ساتھ بحر احمر کی تجارت باقاعدہ ہوگئی تھی اور ہند کا مال اس راستہ سے بحر روم کے مختلف مقامات تک پہنچتا تھا ' لیکن اب بھی براہ راست جہاز رانی نہیں ہوتی تھی ' سارا مال موچا یا عدن یا آبنائے باب المندب کی دوسری جگہوں پر پہنچتا تھا

اور یہ نہیں معلوم کہ وہ کیونکر ان بندرگاہوں تک لایا جاتا تھا، غالبا اس وقت تک بحرعرب میں ہندی جہاز باقاعدہ چلنے لگے تھے، اس قسم کی تجارت کے متعلق ہماری واضح معلومات کی ابتدا ولادت مسیح سے کچھ پہلے سے ہوتی ہے پہلا رومی بادشاہ اگسٹس بحراحمر کی تجارت کو ترقی دینے کا بڑا خواہاں تھا، اور روم میں ہندی چیزوں کی مانگ بڑھ گئی تھی، اسطرح اسکندریہ مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا اہم مرکز بن گیا تھا، ہم جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہندی جہاز خلیج فارس اور آبنائے باب المندب تک باقاعدہ آنے جانے لگے تھے، مگر مقامی مالکوں کی طرفسے بحراحمر میں ہندی جہازوں کو داخل ہونے نہیں دیا جاتا تھا، کیونکہ وہ اس سمندر پر اپنا حق سمجھتے تھے، اگسٹس کے زمانہ میں مصری جہازوں نے اس اجارہ داری کو توڑا، ان جہازوں کے ملاح یونانی تھے، اور یہ بحراحمر سے ہوکر ہند کے ساحل تک پہنچتے تھے، اس کے بعد پہلی صدی عیسوی کے وسط میں ان لوگوں نے موسمی ہواؤں کا راز معلوم کرلیا اور ان کے جہاز آبنائے باب المندب سے براہ راست دریائے سندھ* کے دہانہ تک پہنچتے تھے، بلکہ اس سے آگے بڑھکر نربدا کی بندرگاہ بروچ پر سے ہوتے ہوے مالابار کی بندرگاہوں تک جاتے تھے اور وہاں سے ہند کی مشرقی ساحل کی بندرگاہوں تک گھوم آتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہند کی تجارت سترہویں صدی عیسوی کی تجارت کے برابر ترقی کرگئی تھی، سارا مال بدیسی جہازوں کے ذریعہ لیجایا جاتا تھا، ہند سے موتی ہیرے اور

* دہانہ کی قدرتی تبدیلیوں کی بناء پر مختلف اوقات میں مختلف بندرگاہیں وجود میں آتی رہیں، جن کی تاریخ محفوظ نہیں ہے، سکندراعظم نے پٹالہ کے نام سے ایک بندرگاہ بنائی تھی، رومیوں کے زمانہ میں اس کا نام باربورکان تھا، مسلمانوں نے دیبل بادیول، لاہری بندر اور شاہ بندر کے نام دئے ہیں، اٹھارویں صدی میں کراچی کی بندرگاہ وجود میں آئی، چونکہ یہ دریاے سندھ کے دہانہ پر واقع نہیں ہے اسلئے اس میں کچھ زیادہ تغیرات نہ ہوسکے۔

جواهرات ' کالی مرچ ' اور دوسرے گرم مسالے دوائیں ' هاتهی دانت اور ساگوان کے سامان ' عمدہ بانات اور دوسری تعیش کی چیزیں برآمد کی جاتی تهیں ' اور غیر ملکوں سے کچی دهاتیں اور سیپی وغیرہ جیسی دوسری چیزوں کی درآمد کی جاتی تهی ' تمام لین دین سونا چاندی کے ذریعہ هوتا تها ' جس کی وجہ سے سونا چاندی مشرق کی طرف کهنچ کر چلی آرهی تهی ' روم کے ساهوکار بہت پریشان رهتے تهے ' هند کے ساتھ براہ راست تجارت تقریبا دو سو سال تک جاری رهی ' اس کے بعد مصری کوشش ناکام رهی اور زوال پذیر تجارت قدیم راستوں سے هونے لگی یعنی یہ کہ هند کے لوگ بحراحمر کے دهانہ تک سامان لاکر عربوں کے هاتھ فروخت کردیتے تهے ' اور وہ آگے شمال کے علاقوں میں اس کو لے جاکر بیچتے تهے * .

هند کے مشرقی ساحل کی جہازرانی کے متعلق هم کو بہت کم معلومات هیں ' مغربی مصنفین کی تحریروں سے معلوم هوتا هے کہ جب مصری جہاز پہلے پہل راس کامران سے آگے بڑهے هیں تو اس وقت سیلون سے لیکر گنگا تک تجارتی جہازوں کی آمد و رفت قائم تهی ' نیز هند کے چهوٹے بڑے جہاز خلیج بنگال سے هوکر سماترا اور ملایا تک جاتے تهے ' لیکن اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں هے کہ کتنے دنوں سے ان کی آمد و رفت تهی ' اور تجارت کی کون سی چیزیں لیجائی جاتی تهیں ' پورے وثوق کے ساتھ اتنا هی کہا جاسکتا هے کہ هند کے اندر بنے هوے جہاز حضرت مسیح کی ولادت سے پہلے ان سمندروں میں چکر لگاتے تهے .

---

* رومی تجارت کی تفصیل ای - ایچ وارمنگٹن کی کتاب دی کامرس بٹوین دی رومن ایمپائر اینڈ انڈیا (مطبوعہ کیمبرج سنہ ۱۹۲۸) میں ملیگی .

باب ۱۳

کشان سلطنت

حضرت مسیح کی ولادت سے لیکر تین سو سال بعد تک ہماری معلومات تمام تر ہند کے مغربی حصہ سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ اس کی تاریخ کچھ زیادہ وضاحت کے ساتھ ملتی ہے ، مشرقی حصہ کی سلطنتوں کی تاریخ بھی نئے نئے مواد کی فراہمی کے ساتھ روشن تر ہوتی جا رہی ہے ' اسطرح کہ پورے شمالی ہند کی ایک مجمل تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے ' جنوبی ہند کے متعلق ہم کو صرف مختصر معلومات ہیں جو عام طور پر بیتل * یا کسی دوسری دھات کے پتروں پر لکھے ہوے کتبوں سے حاصل کی گئی ہیں ' اور جن کے لکھنے کا یہاں دستور تھا ' ان میں سے بہت سے کتبے اور یادداشتیں اب تک باقی رہ گئی ہیں ' جیسے جیسے یہ کتبے ملتے اور حل ہوتے جائینگے ' جنوبی ہند کے حکمرانوں کی فہرست اور ان کے آپس کے تعلقات کی تاریخ کا ترتیب دینا زیادہ آسان ہوتا جائیگا ' یہاں کی تین تامل ریاستیں یعنی چولا ' پانڈیہ اور کیرلا اس وقت موجود تھیں ' ان کی ایک دوسرے سے لڑائیاں جاری تھیں ' اور ان کے حدود گھٹتے بڑھتے رہتے تھے ' تاہم ان کی انفرادیت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ' ان سب کے شمال میں آندھرا سلطنت تھی ' جس کے حدود ہند کے مشرقی ساحل سے لیکر اجین تک پھیلے ہوے تھے ' گجرات کے سکیوں سے اس سلطنت کی کشمکش جاری تھی کہ شمال مغربی جانب سے کشان قوم کی یورش شروع ہوی ' جس کو تفصیل کے ساتھ اس باب میں بیان کیا جائیگا .

---

* پیتل کا سب سے قدیم پتر سنہ ۳۳۲ع کا پایا جاتاہے ، دیکھو آر سیول (R.Sowell) کی کتاب دی ہسٹاریکل انسکرپشنز آف سدرن انڈیا ' مطبوعہ یس کرشنا سوامی اینگار (مدراس ۱۹۳۲)

یہ یاد ہوگا کہ ۱۰۰ ق م سے کچھ پہلے یوچی کے خانہ بدوشوں نے سکیوں کو باختر سے نکال دیا تھا ' یہ خانہ بدوش پانچ قبیلوں پر مشتمل تھے ' جن میں سے ایک کشان کہلاتا تھا ' کچھ زمانہ کے بعد یہ قبیلہ سب پر اسطرح غالب آگیا کہ یوچی کا نام ہی مٹ گیا ' اور وہ باختر پر قابض ہوگئے ' بعض کا خیال یہ ہے کہ کشان در حقیقت سک ہی تھے ' جنھوں نے یوچی فاتحین سے لڑ بھڑکر اپنی جگہ پیدا کی ' کشان قوم کی اصلیت کچھ بھی ہو مگر وہ بھی اپنے پیشرووں کی طرح بڑی تیزی کے ساتھ جنوب کی طرف بڑھنے لگے ' تقریبا سنہ ۵۰ ع میں ایک کشان بادشاہ کابل کی وادی پر قابض ہوگیا تھا ' اور پھر چند سالوں کے اندر یہ لوگ پنجاب پر حاوی ہوگئے اور آگے سندھ اور گجرات بلکہ گنگائی میدانوں کی طرف بھی بڑھنے لگے ۔

اس خاندان کے ابتدائی حکمران بڑے طاقت ور اور کامیاب فاتح تھے ' روایات میں اب تک کنشک کا نام زندہ ہے جو اس خاندان کا تیسرا فرمانروا تھا ' نہ صرف ہند بلکہ مرکزی ایشیا اور چین کے دور افتادہ علاقوں میں اس کی شہرت تھی اس کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات ہیں ' بودھ مت کی روایات میں اس کو اس مذہب کا سب سے بڑا سر پرست بتایا جاتا ہے ' مگر اس کے متعلق جو قصے بیان کیے جاتے ہیں وہ در حقیقت اشوک کے کارناموں کی صدائے باز گشت معلوم ہوتے ہیں ' ان روایات سے تاریخی نتائج کا نکالنا بہت مشکل ہے ' خاص کر یہ بات کہ تبدیل مذہب کے پہلے وہ تمام برائیوں کا مجموعہ تھا ' کبھی قابل قبول نہیں ہوسکتی کیونکہ شخصیت پرستی میں اس قسم کی روایات اکثر گھڑلی جاتی ہیں ' اس لئے ہم کو صرف سکوں اور کتبوں پر اعتماد کرنا چاہئے جو معلومات کا معتبر ذریعہ ہیں ۔

اس خاندان کی سنہ وار تاریخ کا مرتب کرنا بہت دشوار ہے ' کہا جاتا ہے کہ کنشک سنہ ۷۸ ع میں تخت پر بیٹھا ' بعض

لوگ اس کا زمانہ پچاس سال بعد بتاتے ہیں ، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کا دور بہت شاندار تھا ، اس کی سلطنت کے حدود کا تعین کرنا مشکل ہے ، اس کا پایہ تخت پشاور تھا ، جو افغانستان اور وادی سندھ کے راستہ پر واقع تھا ، اس لئے کنشک کو ہندی حکمران سمجھنا بالکل ٹھیک ہے ، لیکن اس کے ساتھ باختر اور اس کے شمال مشرقی علاقے اس کی سلطنت میں شامل تھے ۔ ہند کے حدود سلطنت کا تعین کرنا مشکل ہے ، مگر اتنا معلوم ہے کہ پنجاب سندھ ، کشمیر ، مالوہ اور گجرات کے وہ علاقے جو سک اور پہلوا خاندان کے قبضے میں تھے ، اس کی سلطنت میں شامل تھے ، اور نیز گنگا کی میدانوں کے مغرب میں متھرا اور ایک روایت کے مطابق پٹنہ بھی اس کے حدود سلطنت میں داخل تھا ، بہار ، بنگال اور اوریسہ کے مختلف مقامات پر کنشک کے جو سکے ملے ہیں ان سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اگر کنشک کے زمانہ میں نہیں تو کم از کم اس کے فوری جانشینوں کے عہد میں یہ تمام مقامات کشان سلطنت کا جز بن گئے تھے ، مگر اس کے حدود کہاں تک تھے اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا جاسکتا ، اس عظیم الشان سلطنت کے نظام حکومت کے متعلق بھی کچھ ٹھیک معلومات حاصل نہیں ہیں ، کہیں کہیں بڑے بڑے افسروں کا ایک دھندلا خاکہ ملتا ہے جن کو وائسرائے یا نائب سمجھا جاسکتا ہے ، یہ نائب متھرا اور اجین میں رہتے تھے ، لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ ان کا نظام حکومت کیسا تھا اور اپنی رعایا کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے تھے ۔

خود کنشک کے متعلق بھی ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ جنگ میں وہ ہمیشہ کامیاب رہتا تھا ، وہ بودھ مت کا بہت بڑا سر پرست تھا ، اس کا سب سے بڑا فوجی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مرکزی ایشیا کے بہت سے علاقوں کو فتح کیا اور اپنے لوگوں کو چین کی غلامی سے آزاد کیا ، اس کے تمام پیشرو چین کے باجگزار تھے اور اس کو برابر خراج دیتے آرہے تھے ،

مگر هند میں اس نے کوئی نئی فتوحات نہیں کیں ، بودھ مت کے متعلق اس کی حیثیت صاف اور واضح نہیں ہے ، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس مذہب کا مربی تھا اور اس نے بہت سی عمارتیں بنوائی تھیں اور جاگیریں عنایت کی تھیں ، غالبا اس نے ایک مجلس منعقد کی تھی تاکہ بودھ مت کا ایک مستند قانون تیار کیا جائے ، چین اور تبت کے افسانوں میں اس کو اس مذہب کا زبردست حامی اور طرفدار بتایا گیا ہے مگر اس کے سکوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی ، کیونکہ ان میں گوتم بودھ کے علاوہ ہندی یونانی اور ایرانی دیویوں کی تصویریں ملتی ہیں ، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ متعصب نہیں تھا ، ممکن ہے کہ اس نے ذاتی طور پر بودھ مت اختیار کرلیا ہو ، لیکن اس کے سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس نے پوری سلطنت میں جبری طور پر اس مذہب کے منوانے کی کوشش کی ۔

اس نے اپنے زمانہ حکومت میں بودھ مت کی ایک مجلس منعقد کی تھی جو اس قسم کی چوتھی اور آخری مجلس تھی ، اس کی روئداد اب تک موجود ہے ، پرانی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے اشارہ سے یہ مجلس منعقد کی گئی تھی ، اپنے مطالعہ کے دوران میں جب اس نے مذہبی عقاید و خیالات کے اندر تضاد پایا تو صحیح عقائد و خیالات کی چھان بین کرنے کا فیصلہ کرلیا ، اور پانچ سو مذہبی عالموں کی ایک جماعت اس کام پر مقرر کی ، اس وقت اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس جماعت کے ارکان کون تھے اور انہوں نے کن عقاید و خیالات کی تائید کی ۔

اس مجلس کا نتیجہ کچھ بھی رہا ہو ، لیکن یہ تو قطعی ہے کہ کنشک کی سر پرستی میں مرتب کیا ہوا قانون گوتم بودھ کی اصل تعلیمات سے بالکل مختلف تھا ، نئے جنم اور نروانا کے ذریعہ برائیوں سے بچنے کا عقیدہ اب بھی باقی تھا ، مگر اس

کے ساتھ وسیع تصوریہ پیدا ہوگیا تھا کہ ایک انسان ترقی کرکے دنیا کا نجات دھندہ بن سکتا ھے ' اور دوسرے تمام انسانوں کو نروتا حاصل کرنے کی قوت عطا کرسکتا ھے ' اس تصور نے تدریجی طور پر ترقی کی اور مہایان (دور کبری) اور هنایان (دور صغری) کے نام سے دو ضابطے بنائے گئے ' بعض لوگوں کا خیال ھے کہ ان کے نمایاں اصول بعد میں بنائے گئے ' اور بہت ممکن ھے کہ کنشک کی مذھبی مجلس سے ان کے بنانے میں بڑی مدد ملی ھو ' مگر سنہ ۳۰۰ ع کے بعد سے لیکر یہ دونوں مسلک ساتھ ساتھ چلتے رہے .

پرستش کے طریقہ میں جو نمایاں تغیر ھوا وہ بادی النظر میں واقعی حیرت انگیز ھے ' گوتم بودھ کی ابتدائی تعلیم کافرانہ اور ملحدانہ تھی ' اور اب اس کو ایسی شکل میں پیش کیا گیا کہ گوتم بودھ کو خدا سے فرق کرنا ناممکن ھوگیا ' اس کی حیثیت ایک آسمانی خدا کی تھی جس کو ھر طرف سے فرمانبردار فرشتے گھیرے ھوے رہتے تھے ' اور جس کی بیش بہا مندروں میں لمبی چوڑی رسموں کے ساتھ پرستش کی جاتی تھی ' اور جس کے الفاظ اس زمین پر الہامی حیثیت رکھتے تھے ' اور جس کے آثار کی شاندار زیارتگاھوں میں حفاظت کی جاتی تھی ' اور جن کی زیارت کا شرف عام لوگوں کو وقتاً فوقتاً حاصل ھوتا رھتا تھا ' بودھ مت کی یہ ترقی یافتہ شکل ھند میں کسی جگہ بھی نہیں پائی جاتی البتہ وسطی ایشیا کے غیر مسلم باشندوں کا اب تک اسی پر اعتقاد ھے ' پشاور کے اطراف و اکناف میں بت تراشی اور نقاشی کے جو نمونے دستیاب ھوے ھیں ' ان سے انھی عقاید و خیالات کا اظہار ھوتا ھے .

اس ملک کے مختلف نمونوں کو جو پشاور اور اس کے اطراف میں ملے ھیں یونانی اور بودھی ' یا ھندی اور یونانی وغیرہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ھے ' مگر ان کو حقیقت میں گندھاری کہنا زیادہ بہتر ھوگا ' کیونکہ یہ سب گندھارا کے علاقہ سے تعلق

رکھتے ہیں جس کا صدر مقام پشاور تھا ' ان نمونوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں یونانی ترکیب اور صنعت استعمال کی گئی ہے ' لیکن بنیادی تخیل خالص ہندی ہے اور بودھمت کے نئے عقاید و خیالات سے ماخوذ ہے ' بھارھوت اور سانچی وغیرہ میں سنگ تراشی اور نقاشی کے جو نمونے ملے ہیں ان پر ایسے مناظر کی تصویریں ہیں جو گوتم بودھ کی تعلیمات اور روایات سے تعلق رکھتے ہیں ' مگر کسی ایک میں بھی گوتم بودھ کی تصویر نہیں ہے ' اس کے برخلاف گندھاری نمونوں میں اسی کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے ' اور ہر ایک میں اسی کی پرستش کو اصل مقصد ظاہر کیا گیا ہے ' پہلے پہل فنکار اپنے اپنے نقطۂ خیال کے مطابق خاص مقصد کو مدنظر رکھ کر سنگ تراشی اور نقاشی کرتے تھے ' مگر بعد میں چلکر اس کی ایک عام روایاتی شکل بن گئی ' جس کا نمونہ ان تمام بودھی ملکوں میں پایا جاتا ہے جو ہند کے شمال اور مشرق میں واقع ہیں ' اس حیثیت سے اس نقطۂ خیال کے سنگتراشوں نے دنیا کے ایک بڑے حصہ کے مذہبی تصورات پر دیرپا اثر ڈالا ' مگر ہند میں ان کے آرٹ کو کوئی فروغ نہیں ہوسکا ' اس قسم کا آرٹ یہاں صرف چند دنوں تک زندہ رہا اور اس کے بعد دھیرے دھیرے بیرونی اثرات دور ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ وہ خالص ہندی ہوگیا ' ہند کے دوسرے مقامات میں اس آرٹ کا کیا اثر پڑا ؟ اس کے متعلق ناقدین کی رائے مختلف ہے ' بعض کا خیال ہے کہ ملک بھر میں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں ' بعض کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک محدود رقبہ میں رہا اور نتائج کے لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی ۔

اگر اس دور کی خالص ہندی سنگتراشی اور نقاشی کے نمونے دیکھنا ہو تو ان کو گندھارا میں نہیں بلکہ امراوتی کی بودھی زیارتگاہ میں تلاش کرنا چاہئے ' جہاں خالص ہندی آرٹ

کے نمونے اب تک باقی رہ گئے ہیں ' اس زیارتگاہ کے نام سے ہر وہ شخص مانوس ہے جس نے برطانوی عجائب خانہ کی ایک مرتبہ سیر کرلی ہو ' امراؤتی مشرقی ساحل سمندر سے اسی ۸۰ میل کے فاصلہ پر دریاے کرشنا کے کنارے واقع ہے ' اور اس زمانہ میں وہ آندھرا سلطنت کا ایک جز تھا ' اس قدیم زیارتگاہ میں سنہ ۱۵۰ع اور سنہ ۲۵۰ع کے درمیان ایک خوبصورت سنگمرمر کا کٹھہرا تیار کیا گیا اور ان میں عمدہ نقش و نگار بنائے گئے ' آگے چلکر جب یہ زیارتگاہ ٹوٹ پھوٹ گئی تو آس پاس کے رھنے والوں نے اس کے ٹکڑے لیجا کر ان کو اپنے مکانوں میں استعمال کرلیا ' جو کچھ ٹکڑے ان کی دست برد سے بچ گئے وہ آج لندن اور مدراس کے عجائب خانوں کی زینت بنے ہوے ہیں ۔ سنگ تراشی اور نقاشی کا یہ طرز در حقیقت بھارھوت اور سانچی کے یادگاروں کی ترقی یافتہ شکل ہے اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ فن کار گندھاری طرز سنگتراشی سے براہ راست واقف تھے ' مگر گوتم بودھ کا ہردلعزیز معبود بن جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بودھمت کے نئے معتقدات اور خیالات مشرقی ساحل سمندر اور ان سے آگے شمال کے علاقوں میں ہر جگہ پھیل گئے تھے .

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کنشک کی مدت حکومت صحیح طور پر معلوم نہیں ہے ' اس کے بعد اس کا بیٹا ہوشک بادشاہ ہوا تو اس نے سلطنت کو اور ترقی دی ' مگر چند دنوں کے اندر زوال کے آثار شروع ہوگئے ' اور تیسری صدی عیسوی کے ختم ہونے سے پہلے ہی کشان سلطنت گھٹ کر پنجاب ' افغانستان اور اس سے آگے کے چند علاقوں پر محدود ہوگئی ' اس فوری زوال کے اسباب کا کچھ علم نہیں ہے ' اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس خاندان کے آخری زمانہ کے سِکّوں پر ایرانی اقتدار کی علامات پائی جاتی ہیں ' اس سے مسلمان مورخین کی اس روایت

کی تصدیق ہوتی ہے کہ تیسری صدی عیسوی کی ابتدا میں ایران کے ایک ساسانی فرمانروانے پنجاب پر حملہ کیا اور وہاں کے حکمران سے خراج وصول کیا .

ہند کے مغربی حصہ کی سیاسی صورت حالات کا پورے طور پر علم نہیں ہے ' اس علاقہ پر تقریبا چوتھی صدی عیسوی کے اختتام تک سک خاندان کی حکومت رہی ' ان حکمرانوں کو سترپ کہا جاتا تھا جس کے معنی نایب کے ہوتے ہیں ' یہ لقب اس وقت موزوں تھا جب کہ یہ کشان بادشاہوں کے ماتحت رہے ' لیکن جب ان کی سلطنت کمزور ہو گئی تو سک فرمانروا آزاد ہوگئے ' ہم گیارھویں باب میں پڑھ چکے ہیں کہ سکیوں اور آندھراؤں کے درمیان حضرت مسیح کی ولادت سے بہت پہلے اختلافات شروع ہوگئے تھے ' پہلی صدی عیسوی میں نربدا کے جنوبی علاقہ مہاراشٹر پر ایک سک فرمانروا کی حکومت تھی ' جس کو آندھراوں نے سنہ ۱۲۰ع کے قریب ھڑپ کرلیا ' اس طرح سک نظامت کا خاتمہ ہوگیا ؛ لیکن بہت جلد اجین کے سک ناظم ردردامن اول نے اس شکست کا سخت انتقام لیا اور اس دریا سے اس پارسک خاندان کی دوبارہ سلطنت قایم ہوگئی ' اس وقت سے لیکر اجین مغربی ہند کی سک ریاست کا پاے تخت بنا رہا ' سندھ سے لیکر مہاراشٹر تک اس ریاست کے حدود پھیلے ہوے تھے ' سنہ ۴۰۰ع سے کچھ پہلے گپت خاندان کے ایک فرمانروانے اس ریاست کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا .

گذشتہ صدی میں کاٹھیاواڑ سے ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس سے ردردامن کے ایک کارنامہ کے دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں ' یہ جوناگڈھ کتبہ کے نام سے مشہور ہے ' یہ کتبہ ایک ایسی چٹان پر کھدا ہوا ہے ' جس پر پہلے ہی سے اشوک کی تحریریں تھیں ' اس میں ایک تالاب کے بنانے کی تاریخ درج کی گئی ہے ' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موریہ خاندان کے مشہور

بادشاہ چندرگپت نے اس تالاب کے بنوانے کی بتدا کی اور اس کے بعد اشوک نے اس کو پورا کیا ' لیکن سنہ ۱۵۰ ع کے قریب اس کا بند ٹوٹ گیا جس کی دوبارہ تعمیر رودرامن کے ہاتھوں ہوی ' یہ بند پہلے سے تین اتنا مضبوط تھا ' اس کے بعد گپت خاندان کے زمانہ میں اس کی دوبارہ مرمت ہوی اور کچھ زمانہ بعد ایک زبردست جنگل اگ آیا جس نے تالاب اور اس سے سیراب ہونے والی زمینوں کو گھیر لیا ' اس قسم کے کتبے نادر ہیں ' تاہم اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں آب رسانی کے ذرایع کس طرح پیدا کئے جاتے تھے ' جہاں کہیں کوئی نہر یا پانی بہنے کی جگہ ہوتی تو ہر طرف سے بند باندھ کر پانی کو جمع کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ' اور جب سیلاب میں یہ بند بہ جاتے تو دوبارہ ان کی مرمت کی کوشش کی جاتی اور جب ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہوتا تو یہ مصنوعی تالاب جنگل ہوجاتے ' اس میں شبہ نہیں کہ پرانے زمانہ میں بر وقت مرمت نہ ہونے کی وجہ سے بڑی بربادی ہوتی تھی ' موجودہ زمانہ میں سائنس کی ترقی کی بنا پر دیرپابند کا باندھنا بہت آسان ہوگیا ہے ' پرانے زمانہ میں ایسی چیزوں پر کافی روپیہ اور محنت صرف ہوتی تھی ' جس کا اندازہ مختلف کھنڈروں سے کیا جاسکتا ہے ' مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب بھی اس قسم کا کوئی بند بنایا جاتا تو کم از کم چار سو سال تک کام دیتا ' اس لحاظ سے جو رقم اور محنت خرچ ہوتی ' وہ اس طویل مدت کا خیال کرتے حق بجانب سمجھی جاسکتی ہے .

سک خاندان کی حکومت ابھی تک قایم تھی کہ آندھرا سلطنت پر زوال آگیا ' ٹھیک طور پر یہ نہیں معلوم کہ اس زوال کی کیا صورت ہوی ' مگر دوسری صدی عیسوی کے قریب مغربی ہند پر سے اس کا اقتدار ختم ہوگیا اور وہ صرف تلگو بولنے والے علاقوں پر محدود ہوگئی ' یہاں تک کہ پلوا خاندان

کے ایک باغی حاکم نے اس کا خاتمہ کردیا اور اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اس وقت آندھرا سلطنت کا نام تاریخ سے مٹ گیا ، پلوا * خاندان چھ سو سال تک جنوبی ہند پر حکومت کرتا رہا ، اور اس کی ایک شاندار تاریخ تھی

اس کی تصدیق مشکل ہے کہ سک یا کشان بادشاہوں کا اپنی محکوم قوموں کے تمدن پر کچھ پایدار اثر پڑا ، البتہ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وسطی ایشیا کے خانہ بدوش زمانہ کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کی اہلیت رکھتے تھے ، چنانچہ جب وہ سکونت پذیر ہوئے تو نئے ماحول کو اپنے لئے سازگار بنالیا اور مقامی تہذیب و تمدن سے بخوبی فائدہ اٹھایا اور اس کو اپنا لیا ، اس قسم کی باتوں کیلئے کوئی واضح یادداشت نہیں مل سکتی ، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خانہ بدوش ہند والوں سے گھل مل جارہے تھے ، یہانتک کہ ان میں سے بعض کے نام خالص ہندی تھے ، سک خاندان کے فرمانرواوں میں ردردامن اور ستیاسنہا خالص ہندی نام ہیں اسی طرح کشان فرمانرواوں میں واسودیو کا خالص ہندی نام ملتا ہے ، کنشک اور ہوشک بودھ مت کے سرپرست تھے ، ان کے زمانہ میں ملک کا مقبول عام مذہب بودھ مت ہوگیا

* پلوا خاندان کی اصلیت ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہے ، بعض لوگ ان کو پہلوا خاندان کی شاخ تصور کرتے ہیں ، اور بعض ان کو جنوبی ہند یا سیلون کے باشندے سمجھتے ہیں ، پی ۔ ڈی سرینواس اینگار نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی ٹاملس (مطبوعہ مدراس سنہ ۱۹۲۹ ع) کے صفحہ ۳۲۹ پر اور جے ایلن اپنی کتاب کیمبرج شارٹر ہسٹری آف انڈیا (مطبوعہ کیمبرج سنہ ۱۹۳۴) کے صفحہ ٦ ۔ ۱۹۵ پر پہلے نظریہ کی تائید کی ہے ، اور وی ۔ اے ۔ اسمتھ اپنی کتاب ارلی ہسٹری آف انڈیا (مطبوعہ آکسفورڈ سنہ ۱۹۲۴ ع) صفحہ ۴۹۰ میں دوسرے خیال کی تائید کرتے ہیں ، لیکن حال میں کے پی جیسوال کی تحقیق یہ ہے کہ بندھیاچل کے ایک خاندان سے ان کا تعلق تھا ، دیکھو جرنل آف دی بہار اینڈ اوریسہ ریسرچ سوسائٹی سنہ ۱۹۳۳ ع ، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ کسی قوم کا نام نہیں بلکہ ایک خاندان کا نام ہے .

تھا ' واسودیو کے سکوں پر ہندو دیوتا شیو کی تصویر ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عملا ہندو مذہب کا پیرو تھا .

اس سے اس کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ بودھ مت اور جین مت کے عروج کے زمانہ میں بھی ہندومت زندہ رہا ' مگر اس کے متعلق پہلے دو کی طرح یادداشتیں نہیں ملتیں ' ان دونوں کی معلومات کا ایک ذریعہ سنگتراشی و نقاشی کی پرانی یادگاریں ہیں ' لیکن ہندومت کی کوئی یادگار باقی نہ رہی ' اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عمارت بنانے کی پایدار چیزیں ہندوؤں کے ہاں نہ تھیں ' اس زمانہ کی کتابوں سے بھی کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ ہندو کیا کررہے تھے ' اور ان کا میلان کس جانب تھا ' البتہ یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کو مطالعہ کتب اور درس و تدریس کا بڑا شوق تھا ' اور انہوں نے سنسکرت زبان میں بہت سی کتابیں لکھیں ' اور سنسکرت ادب کو ترقی کے انتہائی مدارج پر لانے کیلئے بڑی کوششیں کیں .

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں ہندومت کو فروغ ہو رہا تھا ' اگرچہ اس کا غلبہ چند صدیوں کے بعد ہوا ' ابتدا میں یہاں کے دراوڑی ان روحوں کی پوجا کرتے تھے جن کو وہ درختوں یا دوسری چیزوں میں چھپی ہوی خیال کرتے تھے ' ان میں سے بعض روحیں بہت خطرناک اور نقصان رساں سمجھی جاتی تھیں ' تیسری صدی ق م کے بعد بودھ مت اور جین مت کا اثر پڑنے لگا ' اور یہاں کے مختلف دیوتا ہندومت میں جذب ہونے لگے ' تفصیلات کا ہمیں علم نہیں ہے ' لیکن یہ دور جنوبی ہند کے اندر مختلف مذاہب کی ترقی کا زمانہ ہے ' جس میں ہر مذہب کے لوگ اپنی تعلیمات کو مقبول عام بنانے کی کوششوں میں لگے ہوے تھے .

ان مذاهب کے علاوہ دین عیسوی کو بھی یہاں فروغ ہورہا تھا ' * ایک پرانی روایت میں ہے کہ پادری تھامس نے سب سے پہلے هند میں انجیل کی تبلیغ کی ' عہد وکٹوریہ کے ناقدین نے اس روایت کو غیر معتبر اور غیر مستند قرار دیا تھا ' لیکن موجودہ دور کے ناقدین اس روایت کی تائید کرتے ہیں ' اور مختلف دلائل سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ' یہ روایت معتبر ہو یا نہ ہو لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تیسری صدی عیسوی سے پہلے هند کے جنوب مغربی ساحل پر عیسائی مبلغین بس گئے تھے ' چونکہ وہ عراقی کلیسا کے عقاید کے پیرو تھے اس لئے سولھویں صدی میں گوآکے پرتگالی عیسائی ان کو ملحد اور کافر سمجھنے لگے ' اور ان پرتگالیوں نے اپنے عقیدہ کے مطابق دین کی تبلیغ شروع کی .

یہ سمجھنا کہ ان عیسائیوں کے آنے سے پہلے جنوبی هند کی تمام قومیں وحشی تھیں بالکل غلط ہے ' کیونکہ تامل ادب اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ جنوبی هند میں ایک خاص قسم کا تمدن تھا ' یہاں سے کالی مرچ اور ہیرے جواہرات کی برآمد ہوتی تھی ' دولت کی فراوانی کے باعث یہاں کے باشندے عیش و عشرت کی زندگی گذارتے تھے ' شاہی دربار آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے ' ادب ' موسیقی اور ناٹکوں کی سر پرستی کی جاتی تھی ' ان کا ایک خاص نظام حکومت بھی تھا ' بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا ' اس کے ما تحت پانچ مجلسیں تھیں جن کا اثر بادشاہ پر ضرور پڑتا ہوگا ' مگر ان مجلسوں کی ساخت اور ان کے فرائض و اختیارات کے متعلق تفصیل معلوم نہیں ہے ' ہر جگہ پنچایتیں بھی تھیں جن میں دیہات کے نمائندے شریک رہتے تھے ' اور اپنے مقامی امور کے سر انجام دینے میں آزاد تھے .

* وی اے اسمتھ نے اپنی کتاب ارلی ہسٹری آف انڈیا (طبع چہارم) صفحہ ۲۰۲-۲۶۰ پر مختلف حوالوں سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے ، اس کے علاوہ بلٹن آف دی جان رئلنڈس (Rylands) لائبریری سنہ ۱۹۲۶ اور سنہ ۱۹۲۰ میں ڈاکٹر جے . این فارقہر اور ڈاکٹر اے منگنا (Mingana) نے اپنے اپنے مقالات شایع کئے ہیں .

پرانے تامل ادب سے واقعات کے اخذ کرنے میں پوری احتیاط برتنی چاھئے ' کیونکہ ان کی توثیق و تصدیق کے دوسرے ذرایع ھمارے پاس نہیں ھیں ' تامل ادب میں خیال آرائی زیادہ پائی جاتی ھے ' تاھم اس سے اندازہ کیا جاسکتا ھے کہ جنوبی ھند کے کاشتکار خاموش اور محنتی ھوتے تھے ' ان میں انتہائی غربت تھی ' مگر عام طور پر ان کو اتنا مل جاتا تھا جس سے ان کی ضروریات زندگی پوری ھوجاتی تھیں ' نئے نئے مذاھب سے وہ ابھی تک روشناس نہیں ھوے تھے ' وہ آبائی پوجا کے عادی تھے ' ان کا کام ھل جوتنا ' بیج بونا ' پانی پہنچانا اور پھر فصل کاٹنا ھوتا تھا ' بعض نظموں میں ان کی ایک دلکش تصویر کھینچی گئی ھے ' اس کے علاوہ وہ شکار کھیلنے کے بھی عادی تھے ' ساحلی علاقوں میں لوگ مچھلی پکڑ کر زندگی بسر کرتے تھے .

شہری زندگی سادہ نہیں تھی ' لوگ خوشگوار متاھلانہ زندگی گذارنے کے عادی تھے ' دربار میں گانے بجانے اور ناچنے والوں کی مانگ تھی ' اس وجہ سے بہت سے لوگ متاھلانہ زندگی کو چھوڑکر اس کی طرف مائل ھو رھے تھے ' تمام شہر لوگوں سے آباد تھے ' اور تمام دکانیں دیسی اور بدیسی مال سے بھری ھوی رھتی تھیں ' شاھی دربار میں نئے مذاھب کے نمائندے بھی موجود تھے ' پانڈیہ سلطنت کا صدر مقام مدورا تامل زبان کی سرگرمیوں کا ایک اھم مرکز تھا ' ایک روایت میں ھے کہ یہاں ایک ادبی مجلس تھی ' جس کے سامنے شعرا اپنی نظموں کو منظوری کیلئے پیش کرتے تھے ' اس روایت پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا * تامل زبان میں بہت سے سنسکرت

---

* اس روایت پر پی-ٹی سرینواس اینگار نے بڑی سخت تنقید کی ھے ' اور اس دور کی شاعری کے مختلف اقتباسات کا انگریزی میں ترجمہ پیش کیا ھے ' اس دور کے متعلق مزید معلومات پروفیسر نیلکانت شاستری کی کتاب دی چولاس جلد اول (مطبوعہ مدراس سنہ ۱۹۳۵ع) سے حاصل ھوتی ھیں .

لفظ ملتے ہیں ' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے لوگوں کے ساتھ جنوبی ہند کے لوگوں کے تعلقات تھے ' اسطرح سنسکرت کا اثر تامل زبان پر بھی ہوا .

تامل تہذیب و تمدن کا دوسرا مرکز کنچی پورم ہے جو شہر مدراس کے جنوب مغرب میں تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے ' اس کو اب کنجی ورم کہا جاتا ہے ' پرانے زمانہ میں یہ شہر تامل ریاست کے شمالی سرحد پر تھا ' اور آگے چلکر تیسری صدی میں پلوا خاندان کا پاے تخت بنا ' تہذیب و تمدن کے لحاظ سے یہاں تامل سے زیادہ سنسکرت غالب ہے ' اس سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ یہ مقام جنوبی ہند میں ہندومت کا سرحدی مقام تھا ' جہاں سے اس کا اثر بتدریج آگے بڑھتا گیا .

تامل ادبیات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ کم از کم شہری باشندے اس حد تک ترقی کرچکے تھے کہ پرانے ادیان سے ان کی تشفی نہیں ہوسکتی تھی ' اس لئے نئے مذاہب کے معتقدین کو اپنے خیالات کی تبلیغ کے لئے ایک بہترین میدان ہاتھ آیا .

باب ۱۴

گپت خاندان کی سلطنت

کشان سلطنت کے خاتمہ کے بعد چوتھی صدی کے آغاز تک شمالی ہند کی ایک معتبر اور مرتب تاریخ پیش نہیں کی جاسکتی ' کیونکہ بکھرے ہوے واقعات کو ایک سلسلہ میں جوڑنا بہت ہی مشکل ہے۔* چوتھی صدی عیسوی سے اس کی تاریخ متعین طور پر شروع ہوتی ہے جبکہ بہار کے ایک فاتح خاندان نے شمالی ہند کے ایک بڑے حصہ پر اپنی حکومت قایم کرلی۔ جس کا اثر جنوبی ہند تک محسوس کیا جانے لگا۔ اس خاندان کو گپت خاندان کہا جاتا ہے ' کیونکہ اس کے فرمانرواؤں نے گپت کے لفظ کو اپنے نام کا جز قرار دے لیا تھا ' اس خاندان کا پہلا فرمانروا اور بانی موریہ خاندان کے بانی چندرگپت کا ہمنام تھا۔ اور اسی سے اس خاندان کی بنیاد پڑی۔

اس خاندان کا بانی چندرگپت اول بہار کا ایک معمولی راجہ تھا اور جب اس نے مگدھ کی شاہزادی سے شادی کرلی تو پوری ریاست پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ اس نے اودھ کے مشرقی کنارے تک اور ادھر بنگال کے ایک حصہ پر اپنا تسلط جمالیا ' سنہ ۳۲۰ع کے قریب اس نے راجہ مہاراجگان کا لقب اختیار کیا اور اسی سال سے ایک نئے سنہ کی ابتدا کی۔ اس کے بعد سمدر گپت تخت پر بیٹھا جس نے تقریبا سنہ ۳۳۰ع سے سنہ ۳۷۵ع تک حکومت کی ' اس کا زمانہ زیادہ تر لڑائیوں میں گزرا ' اس کے جنگی کارناموں کے متعلق ایک قصیدہ ہے جس کو اس نے اشوک کے ایک پتھر کے ستون پر کندہ کردیا تھا۔ یہ پتھر اب

* کے پی جیسوال نے ہسٹری آف انڈیا کے نام سے بہار اور اوریسہ ریسرچ سوسائٹی کے رسالہ میں ایک مضمون سنہ ۱۹۳۳ع میں شائع کیا ہے ، جس میں سنہ ۱۵۰ع سے سنہ ۳۵۰ع تک کی شمالی ہند کی سیاسی تاریخ مرتب کی ہے ، مگر اس کے متعلق محققین نے ابھی تک اپنا کوئی فیصلہ نہیں دیا ہے ۔

تک الہ آباد کے قلعہ میں لگا ہوا ہے ' اس نے شمالی ہند کی مختلف ریاستوں کو فتح کرلیا تھا ' اور بعض سے خراج ادا کرنے کا وعدہ لیا تھا ' جنوبی ہند پر بھی اس نے کئی حملے کیے تھے ' مگر اس کا مقصد کسی علاقہ کو فتح کرنا نہیں تھا ' بلکہ دشمن کی طاقت کو توڑنا اور اپنے نام کو روشن کرنا ہوتا تھا .

مشرق میں اس کی سلطنت برھمپترا تک تھی ' بنگال کا ایک بڑا حصہ اس کی سلطنت میں شامل تھا ' بنگال اور آسام کی بعض ریاستیں اس کی باجگزار تھیں ' مغرب میں اس کی سلطنت جمنا تک پہنچ گئی تھی . جنوب مغرب میں نربدا تک سلطنت کا دائرہ وسیع ہوگیا تھا ' اس طرف مغربی ستربوں کی وجہ سے ساحل سمندر تک اس کی سلطنت نہیں پھیل سکی تھی . جمنا سے آگے پنجاب اور راجپوتانہ کی بعض ریاستوں سے خراج وصول کیا تھا ' اس لحاظ سے صحیح معنی میں وہ راجہ مہاراجگان تھا .

سمدر گپت کی جنوبی ہند پر تاخت اس مبالغہ کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اس کو پڑھکر واقعی حیرت ہوتی ہے ' بعض کا خیال ہے کہ اس نے جنوبی ہند میں کئی فتوحات حاصل کیں ' لیکن اتنا یقینی ہے کہ وہ ایک عظیم‌الشان فوج لیکر جنوبی ہند کی طرف روانہ ہوا ' جنگلوں اور پہاڑوں میں مختلف قبیلوں سے جنگ کی ' کلنگا کے متعدد فرمانرواؤں نے اس سے مقابلہ کیا اور شکست کھائی ' یہ نہیں معلوم کہ وہ دریائے کرشنا سے کبھی آگے بڑھ سکا ' کیونکہ یہاں پلوؤں نے اس سے سخت مقابلہ کیا ' اس کے بعد وہ شمال کی طرف پلٹا اور نربدا کی سرحد تک جا پہنچا ' اور جب وہاں سے اپنے پاے تخت کو لوٹا تو جنوبی ہند کے خزانوں سے اتنا سونا لوٹ کر لے آیا تھا کہ اس نے فورا سونے کا سکہ جاری کردیا . اس نے پاے تخت سے آٹھ سومیل تک کا سفر کیا تھا ' اور اس زمانہ میں اتنا لمبا سفر کرنا اس کی غیر معمولی قابلیت کا پتہ دیتا

ہے ' اس کے بعد اس جیسا جانباز صرف علاءالدین خلجی تھا ' جس نے ایک ہزار سال بعد اسی قسم کے بہادرانہ کارنامے انجام دئے تھے .

سمدر گپت کے بعد اس کا بیٹا چندر گپت دوم جانشین ہوا جس نے اپنے لئے بکرماجیت کا شاندار لقب اختیار کیا ' اور سنہ ۴۱۳ع تک حکومت کی ' اس نے مغربی سترپوں کا خاتمہ کیا اور ان کی مملکت کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا ' اس کی وجہ سے بحر عرب کی بندرگاہیں اس کے قبضہ میں آگئیں ' اس کے بعد اس کے جانشینوں نے کوئی فتوحات نہیں کیں ' وہ زیادہ تر صلح و آشتی کی زندگی بسر کرتے رہے ' یہاں تک کہ گورے ہونوں نے اس عظیم الشان سلطنت کو اتنا کمزور کردیا کہ سنہ ۵۰۰ع کے قریب اس کی حیثیت ایک مقامی ریاست کی ہوگئی ' *

اس عظیم الشان سلطنت کے طریقہ حکومت کا تھوڑا خاکہ ان کتبات سے ملتا ہے جن کا حال ہی میں انکشاف ہوا ہے ' اور جو زیادہ تر بنگال سے تعلق رکھتے ہیں ' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری سلطنت مختلف بھکتیوں (صوبوں) میں تقسیم کی گئی تھی ' اور ہر ایک بھکتی کا ایک حاکم مقرر کیا گیا تھا ' ہر ایک بھکتی ضلعوں اور تعلقوں پر منقسم تھی ' ہر ضلع کے حاکم کے ساتھ ایک مجلس مشاورت بھی ہوتی تھی ' جس میں ساہوکاروں ' تاجروں اور کاریگروں کے نمائندے شریک رہتے تھے ' ٹھیک طور پرپہ نہیں معلوم کہ ان کی حیثیت محض ایک مشیر کی سی تھی ' یا ان کے کچھ فرائض و اختیارات بھی ہوتے تھے ' بہت سے محرر بھی تھے ' جن کا کام زیادہ تر زمینوں کی تفصیلات کا حساب رکھنا ہوتا تھا ' ان کتبوں سے مختلف عہدہداروں کے طریقۂ کار کا

* ڈاکٹر بسک (Basak) کا خیال ہے کہ چھٹی صدی عیسوی تک اس سلطنت کی شاندار حیثیت قایم رہی ' اس پر انہوں نے بہت سی دلیلیں بھی دئے ہیں ' دیکھو ان کی کتاب ہسٹری اف نارتھ ایسٹرن انڈیا باب چہارم .

پتہ چلتا ہے ' مثلاً اگر کسی کو کوئی زمین مذہبی کاموں کے لئے وقف کرنی ہوتی تو وہ زمین کی خریداری کیلئے ضلع کے حاکم اور اس کی مجلس کے سامنے ایک درخواست پیش کرتا ' محرر اس پر اپنی رائے لکھ بھیجتے ' ان کی رائے پر حاکم مقامی عہدہ داروں کو حکم دیتا کہ اس زمین کو ناپ کر اور اس کی حد بندی کرکے خریدار کے حوالہ کردیں ' ان کو ہدایت دی جاتی تھی کہ خریدار سے مزید رقم وصول نہ کریں ' یہ ایک دفتری نظام تھا ' جو ہند کے دوسرے علاقوں میں بھی مروج تھا .

عام لوگوں پر اس نظام کا کیا اثر پڑا اس کے متعلق یادداشتیں کچھ نہیں بتاتیں ' البتہ چینی یاتری فاہیان کے سفرنامہ * سے کچھ اخذ کیا جاسکتا ہے ' فاہیان بودھ مت کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے اور مذہبی کتابوں کے معتبر نسخوں کو حاصل کرنے کی غرض سے چندر گپت دوم کے زمانہ میں سنہ ۳۹۹ع اور سنہ ۴۱۲ع کے درمیان چین سے زمینی راستہ طے کرکے ہند آیا تھا ' وہ پشاور کے راستہ سے ہند میں داخل ہوا ' اور اصل راستہ سے ہٹ کر شمال اور مغرب کی گھاٹیوں میں گھومتا ہوا بنوں کے راستہ سے سندھ کی وادی میں پہنچا اور پھر پنجاب کو پار کرکے متھرا ' قنوج ' اور اجودھیا کی سیر کی ' اس کے بعد بہار کے مقدس مقامات کی زیارت کرتا ہوا پٹنہ پہنچا ' یہاں اس کو مقدس کتابوں کے چند نسخے ملے ' زبان کے سیکھنے اور مقدس کتابوں کے نقل کرنے میں تین سال لگ گئے ' اس کے بعد تملوک (تامرلپٹی) کی طرف روانہ ہوا جودریائے ہگلی کے دہانہ پر واقع ہے ' یہاں دو برس تک مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتا اور انکی نقل لیتا رہا ' پھر یہاں سے وہ سیلون ہوتا ہوا اپنے وطن کو واپس چلا گیا ' شمالی ہند کے

* اس کے مختلف ترجمے شایع کیے گئے ہیں ' مگر ہمارے سامنے ایچ - اے گائلز کا ترجمہ ہے جو دی ٹراولس آف فاہیان کے نام سے سنہ ۱۹۲۳ع میں کیمبرج سے شایع کیا گیا ہے .

حالات کے معائنہ کرنے کا اسے بہت کافی موقعہ ملا تھا ، مگر وہ اپنے مقصد کے حصول میں اتنا مستغرق رہا کہ اس کو ہند کے معاشرتی حالات پر توجہ کرنے کی فرصت ھی نہ ملی ، اس کا سفرنامہ ان حالات سے بالکل خالی ھے جن کے جاننے کی ھم آرزو رکھتے ھیں ، مگر اس کے مشاہدات سے اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ چندر گپت دوم کے زمانہ میں لوگ خوش حال تھے ، اور حکومت با قاعدہ تھی .

ملک کے بعض حصے غیر آباد تھے ، شمالی بہار کے مقدس مقامات میں آبادی زیادہ نہ تھی ، یہاں صرف چند خاندان اور چند پروہت رہتے تھے ، فاھیان نے سنا تھا کہ جنوب کے علاقے ویران پڑے ھوے ھیں ، مگر ان کے دیکھنے کا اس کو موقعہ نہیں ملا ، متھرا سے لیکر قنوج ، بنارس اور پھر پٹنہ تک کے علاقے بہت آباد تھے اور روز بروز ان کی ترقی ھو رھی تھی ، رعایا پر اس قسم کی دفتری پابندیاں نہیں تھیں جن سے چینی یاتری آشنا تھا ، زمین کا لگان ادا کرنا ھوتا تھا ، مگر اس کی وصولی میں زیادہ سختی نہیں برتی جاتی تھی ، جو لوگ کہیں چلے جانا چاھتے تو آزادی کے ساتھ جاسکتے تھے ، ان پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں تھی ، چینی معیار کے مقابلہ میں یہاں کا قانون تعزیرات بہت نرم تھا ، جرائم کی سزا عام طور پر جرمانہ تھی ، دوسری مرتبہ بغاوت کرنے پر بھی صرف داھنا ھاتھ کاٹ دیا جاتا تھا ، لوگوں کی غذا عام طور پر روکھی سوکھی ھوتی تھی ، اور لوگ زیادہ تر سبزی خور تھے ، سور اور مرغ پالنے کے عادی نہ تھے ، بازاروں میں گاے بیل یا گوشت کا بیوپار نہیں ھوتا تھا ، شراب کی دکانیں نہیں تھیں ، اچھوت قومیں شکار کرکے گوشت کھاتی تھیں ، ان سے اونچی ذات کے لوگ الگ تھلگ رہتے تھے ، اور جب کبھی اچھوت شہروں میں آتے تو لکڑی کے ٹکڑے کو بجاتے تھے ، اس سے دوسروں کو معلوم ھوجاتا تھا کہ وہ اچھوت ھیں اور پھر ان سے بچنے کی کوشش کی جاتی تھی ،

یہ صرف ایک دھندلا خاکہ ہے مگر اس سے اس زمانہ کے سیاسی اور معاشرتی حالات کا صرف ایک اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

اس زمانہ کی مذہبی حالت کے متعلق وضاحت کے ساتھ کچھ لکھنا مشکل ہے ' اس میں شبہ نہیں کہ اس خاندان کے راجہ یقینی طور پر ہندو تھے ' ان میں تعصب نہیں تھا ' کسی جگہ بھی مذہبی عقائد کی بناء پر اذیت نہیں دی جاتی تھی ' ان میں سے بعض تو ایسے تھے جو بودھ مت کی سرپرستی کرتے تھے ' بعض کا خیال ہے کہ اس دور میں بودھ مت کو زوال آگیا تھا ' اور ہندومت کو ترقی ملی تھی ' مگر اس سلسلہ میں جتنی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں ' وہ ناکافی اور غیر معتبر ہیں ' ان سے اس قسم کا کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا ' بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تغیر صرف بادشاہت میں ہوا تھا ' مذہبی رواداری میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوی تھی ' چند مضبوط شہادتیں اس بات کی ملتی ہیں کہ بودھ مت کو شاہی سرپرستی حاصل تھی ' ان کی موجودگی میں کسی دوسری شہادت کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی ۔

بودھ مت کی وسعت کا اندازہ فاھیان کے سفر نامہ سے لگایا جاسکتا ہے ' یہ یاد رھے کہ اس نے ایک خاص مقصد کیلئے اتنا بڑا لمبا سفر کیا تھا ' اس نے ان مقامات کی زیارت کی جہاں اس کو مذہبی کتابوں کے ملنے کی امید تھی ' وہ ان جگھوں پر نہیں گیا جہاں اس مذہب کے پیرو موجود نہ تھے ' اسکے سفر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب میں اس مذہب کو فروغ ہو رہا تھا ' متھرا کے اطراف و جوانب میں یہ مذہب عام قبولیت حاصل کرچکا تھا ' بنگال میں بھی دریائے ھگلی کے دھانہ پر اس مذہب کو بڑی ترقی ہو رہی تھی ' متھرا اور ھگلی کے درمیان کے وسیع علاقہ کے متعلق اس نے کسی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا ہے ' اس سے یہ قیاس نہیں کرنا چاھئے کہ یہاں بودھ مت کے پیرووں کا وجود نہیں تھا ' جمنا کے کنارے اور متھرا کے قریب بیس خانقاھیں

تھیں ، بہار کے ویرانوں میں چند خانقاہیں موجود تھیں ، اسی طرح قنوج میں دو ، کوسامبی میں ایک ، بنارس میں دو اور پٹنہ میں دو خانقاہیں تھیں ، اجودھیا میں اس قسم کی کوئی خانقاہ نہ تھی ، ممکن ہے کہ اس علاقہ میں اور بھی خانقاہیں رہی ہوں اور فاهیان کے علم میں نہ آئی ہوں ، لیکن اس کے بیانات کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خانقاہ اس کی فہرست سے نہیں چھوٹی ، متھرا کے متعلق اس کا یہ کہنا کہ یہاں اس مذہب کو قبولیت عام حاصل ہوگئی ہے ، کم از کم اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس علاقہ میں بودھمت غالب نہیں تھا .

دوسرے ذرایع سے جب فاهیان کے بیانات کی تائید ہوتی ہے تو یہ خیال کرنا غلط نہ ہوگا کہ ہندومت ، بودھمت اور جینمت تینوں ترقی کررہے تھے ، ان کے آپس میں کوئی حقیقی آویزش نہیں تھی ، اس دور کے متعلق باہمی فرقہ آرائی کا خیال کرنا صحیح نہ ہوگا ، اس دور میں تقریبا وہی حالت تھی جو اس دور کے آخر میں انگلستان کی تھی ، ان دنوں کلیسا میں ایک قسم کا جمود پیدا ہوگیا تھا ، عیسوی غیر مقلدین بہت زوروں پر تھے ، متعصب لوگ ایک دوسرے کے خلاف کبھی کبھی ہنگامہ مچاتے تھے ، مگر انگلستان کا کلیسا خاموشی کے ساتھ ان کی حرکتوں کو دیکھتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کا نتیجہ اچھا ہی ہوگا ، اس لئے ان میں سے کسی کے ساتھ الجھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا ، گپت خاندان کے دور حکومت میں ہندومت کے پیرووں کا طرز عمل بھی کچھ اسی قسم کا تھا .

یہ دور مذہبی ادب کی ترقی کے لحاظ سے بہت اہم ہے ، کیونکہ اسی زمانہ میں پران کی تمام کتابیں مدون ہوئیں ، ان میں جو تاریخی واقعات بکھرے پڑے ہیں ، ان کا ذکر چوتھے باب میں آچکا ہے ، اس دور میں اصل عقاید و خیالات کی طول طویل تشریحات لکھی گئیں ، اور کئی اخلاقی اور دینی کتابیں تیار کی

گئیں ان میں کسی ایک دیوتا کو بڑھا چڑھاکر دکھایا گیا ہے ، کسی میں شیو کی اور کسی میں وشنو کی تعریف ہے ۔ پرانوں میں اصنام پرستی کے عقیدہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی ہے ، ان کا اثر عملا بہت اچھا رہا ، ان میں پندو موعظت اور اخلاق کی اتنی زبردست تعلیمات ہیں کہ موجودہ ہندی اخلاق کے ڈھالنے میں ان سے بڑی مدد ملی ہے ۔

پرانوں کے علاوہ فنون لطیفہ اور علم ادب کو بڑی ترقی ہوی ، مغربی مصنفین اس دور کو پیرکلیس یا شکسپیر کے دور سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ ادب میں کالیداس کو بڑی شہرت ملی ، مغرب اور مشرق کے تمام مصنفین اس کو ہند کا سب سے بڑا اور دنیا کا ایک ممتاز شاعر قرار دیتے ہیں ، اس نے رزم ، بزم اور ناٹک پر بہت کچھ لکھا ، مگر اس کی شہرت زیادہ تر شکنتلا کی وجہ سے ہے جو ہندی ناٹکوں میں سب سے زیادہ مقبول ہے ، کالیداس ہی ایک شاعر نہیں تھا ۔ بلکہ اس دور میں بہت سے شعرا پیدا ہوے ، جن کی زبان تصنع اور بناوٹ سے مُبرّا تھی ۔

اس زمانہ کی ادبی زبان سنسکرت تھی ، دنیا دار اور مذہبی دونوں قسم کے لوگ اس زبان کو بولتے اور لکھتے تھے ، ابتدا میں یہ آریہ قوم کی زبان تھی ، رگ وید اسی زبان میں لکھی گئی ، چوتھی یا پانچویں صدی قبل مسیح سے یہ ادبی زبان بنی ، پہلے پہل برہمن اس زبان کو بولتے اور لکھتے تھے ، بودھمت اور جین‌مت کی ابتدائی کتابیں پراکرت میں لکھی گئی تھیں ، جو اس زمانہ کی عام زبان تھی ، * اشوک نے بھی پراکرت ہی میں اپنے تمام کتبے لکھوائے مگر جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا پہلے بودھمت کے لوگوں نے اور پھر جین‌مت کے پیرووں نے سنسکرت میں اپنی کتابیں لکھنی شروع کیں ، اور تقریبا سنہ ۱۵۰ع سے

* پالی زبان ، جس میں بودھمت کا قانون سیلون کے اندر تیار کیا گیا ، در حقیقت ہند کی پراکرت کی ایک شاخ ہے ، ادبی حیثیت سے اس کی کچھ ترقی ہوگئی تھی ۔

غیر مذہبی کتبے بھی اس زبان میں لکھے جانے لگے، گپت خاندان کے دور میں عام طور پر ادبی کتابیں اسی زبان میں لکھی جانے لگیں، اور پھر اس کے بعد کئی صدیوں تک سنسکرت ہی ہند کی ادبی زبان بنی رہی، یہاں تک کہ مادری زبانوں میں کتابیں لکھنے کا دستور شروع ہوا، جو مقابلۃً جدید زمانہ کی یادگار ہے، ایک روایت میں ہے کہ ناٹکوں میں دو زبانیں استعمال کی جاتی تھیں بادشاہوں اور اونچی حیثیت کے لوگوں کے منہ سے جو الفاظ نکلتے ان کو سنسکرت میں ادا کیا جاتا اور عورتوں اور غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ آدمیوں کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوتے ان کو پراکرت میں لکھا جاتا تھا.

چند الفاظ میں یہاں اس بحث کی توضیح کی جاسکتی ہے کہ آیا ہند کا تمثیلی ادب یونانی تمثیلی ادب سے ماخوذ ہے یا نہیں، بعض محققین کا خیال ہے کہ ہند میں رگوید کے زمانہ ہی سے تمثیلی ادب کی ابتدا ہوگئی تھی، اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی ابتدا سکندر اعظم کے عہد سے ہوی، جس کے سامنے یونانی اداکار اپنی اداکاری کے جوہر دکھاتے تھے، ان دونوں نظریوں کے متعلق کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے، تمثیلی ادب کے بعض پہلوؤں کی مشابہت کی وجہ سے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم ہند کے تمثیلی ادب کو بالکلیہ یونانیوں سے ماخوذ تسلیم کریں، ممکن ہے کہ ہند کے تمثیلی ادب نے خود بخود ترقی کی ہو، البتہ بعض جزئیات میں اس نے یونانیوں کی پیروی کی ہو. *

اس خیال کی تائید میں بہت سے عمدہ وجوہ ہیں کہ گپت خاندان کے دور میں فن تعمیر کو بڑی ترقی ہوئی تھی، مگر اس زمانہ کی یادگاریں اتنی کم رہ گئی ہیں کہ اس موضوع پر پورے وثوق کے ساتھ کچھ لکھنا مشکل ہے، یادگاروں کے باقی نہ رہنے کے مختلف اسباب بتائے جاتے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ

---

* اس بحث کے متعلق مختلف حوالوں کے لئے دیکھو انڈیا وپاسٹ صفحہ ۹۸ اور صفحہ ۱۱۲

باد و باراں اور گرمی و رطوبت کی وجہ سے عمارتوں پر بہت جلد زوال طاری ہو جاتا تھا ' دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں جو عمارتیں بوسیدہ ہوکر گرپڑتی تھیں ان کی حفاظت نہیں کی جاتی تھی ' بلکہ ان ٹوٹے ہوے ٹکڑوں کو دوسری عمارتوں میں لگا دیا جاتا تھا ' آثار قدیمہ کی حفاظت کا خیال جدید زمانہ کی پیداوار ہے ' اس زمانہ میں اس قسم کا کوئی خیال ہی نہیں تھا ' تیسرے یہ کہ مسلمان پر جوش بت شکن تھے ' کسی قسم کا بت بھی ان کی دست برد سے نہیں بچ سکتا تھا ' اس کے علاوہ عام خیال یہ تھا کہ مندروں کے اندر دولت چھپا کر رکھی جاتی ہے ' اس کو لوٹنے کے خیال سے مندروں ہی کو اکھیڑ کر پھینکدیتے تھے ' جو مندر ایک مرتبہ ڈھا دیا جاتا ہندو نقطہ نظر کے مطابق ناپاک ہوجاتا تھا اس لئے دوبارہ اس کی تعمیر اور مرمت نہیں کی جاسکتی تھی ' اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض حملہ آوروں نے وہ تمام مندر ڈھا دئے جو ان کے راستہ میں ملتے تھے ' اور جو مندر بچ گئے وہ وہی تھے جو کسی غیر آباد مقام میں واقع تھے ' اور وہ حملہ آور وہاں تک پہنچ نہیں سکتے تھے ' اسلئے مورخین کو ایسے ہی مندروں سے اپنی معلومات کو اخذ کرنا ہے جو ان حملہ آوروں کے ہاتھوں سے تباہ ہونے سے بچ گئے .

اسوقت ہمارے پاس جو یادگاریں رہ گئی ہیں وہ تمام تر مذہبی ہیں ' عام مکانوں ' شاہی محلوں یا دوسری عمارتوں کا کوئی نشان نہیں ملتا ' مگر ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارتوں میں زیادہ تر لکڑی استعمال کی جاتی تھی ' پتھر یا جلی ہوی اینٹوں سے صرف مذہبی عمارتیں بنائی جاتی تھیں ' باقی ماندہ یادگاروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں ہندو مضبوط اور پختہ عمارتیں بنانے لگے تھے ' جن کی ابتدا بودھمت کے پیروؤں نے کی تھی ' یہ عمارتیں دو طرح کی ہوتی ہتیں ' ایک مندر تھا جس کے اوپر چھت ہوتی تھی اور دوسری

خانقاہ تھی جو ایک چو گوشیہ احاطے کے اطراف مختلف تکیوں پر مشتمل تھی ' پہلے پہل مندر کے اندر صرف مذہبی تبرکات رکھے جاتے تھے ' مگر بعد میں دیویوں کے مجسمے بھی کھڑے کئے جانے لگے ' گپت خاندان کے زمانہ میں مندروں کی چھتیں تعویذنما ہوتی تھیں ' لیکن بعد میں بلند چھتیں بنائی جانے لگیں جو آج ملک کے مندروں کی ایک عام خصوصیت ہے ' آگے چل کر برساتی اور دوسرے احاطے ملحق کئے گئے ' خانقاہوں میں مختلف مذہب کے مقدس لوگ آرام کرتے تھے ' جنوبی ہند میں اس قسم کی خانقاہیں مندروں کی شکل میں تبدیل کردی گئیں

بودھمت کی زیارتگاہیں یا خانقاہیں عام قسم کی عمارتیں نہیں ہوتی تھیں ' بلکہ ایک بڑی چٹان کو کاٹ کر اور کرید کر بنائی جاتی تھیں ' اس لحاظ سے ان کو چٹانوں کا مندر کہنا بجا ہوگا ' یہ ہندی فن تعمیر کا ایک شاندار نمونہ ہیں ' ان میں سب سے زیادہ قدیم مندر حضرت مسیح کی ولادت سے پہلے کے ہیں ' اور ان میں سب سے مشہور اجنتا کے غارہیں جو ریاست حیدرآباد کے انتہائی شمال مغرب میں واقع ہیں ' اس کے مختلف حصے پہلی صدی عیسوی سے لیکر چھٹی صدی عیسوی تک کے بنے ہوے ہیں ' دوسرا قابل ذکر نمونہ ایلورا کے غاروں کا ہے ' جو اجنتا سے پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہیں ' یا وہ نمونے ہیں جو گوالیار کے جنوب میں باغ نامی ایک مقام میں پائے جاتے ہیں ' ان غاروں سے ہندی رنگ ریزی اور مصوری کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں ' ان کی دیواروں پر رنگ سے مصوری کی گئی ہے ' اور نقاشی کا بہترین کام ہوا ہے جس کو آج بھی ہم دیکھ سکتے ہیں ' اس جگہ کی مصوری اور نقاشی نے دنیا بھر سے خراج تحسین وصول کیا ہے ان کے علاوہ حال میں بہت سے مجسمے ملے ہیں جن کو غالباً بت شکنوں نے اپنی جگہ سے اکھیڑکر اپنی عمارتوں کی بنیادوں میں لگا دیا تھا ' حال

کے ماہرین آثار قدیمہ نے ان کو دوبارہ کھود کر نکالا ہے اور محفوظ کرلیا ہے ۔

ان مختلف نمونوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس دور میں ہندو فنون لطیفہ بودھ مت کے فنون لطیفہ سے کچھ الگ نہیں تھے ، دونوں ایک ہی قسم کے تھے ، سب سے پہلے بودھ مت اور جین مت کے پیرووں نے اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے ان کو استعمال کیا ، اس کے بعد ہندووں نے بھی ان کی طرف توجہ کی ، فنون لطیفہ کا موضوع بدلتا رہا مگر کاریگری یا جذبات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوی ؛ آئندہ چلکر دھیرے دھیرے ہندو عقاید و خیالات کا اثر کاریگروں پر بھی پڑا اور انھوں نے بذات خود اپنے فن میں مختلف شکلیں پیدا کیں ، جن کو بعد کے زمانہ میں خالص ہندوانہ خیال کیا جانے لگا ، اس لحاظ کے دور کو ایک عبوری دور کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس دور میں کاریگر چند مخصوص موضوع سے دوسرے موضوعوں کی طرف متوجہ ہو رہے تھے ، چونکہ یہ تمام یادگارین غیر مکمل ہیں اور ابھی بہت سی یادگاروں کو کھود کر نکالنا ہے اسلیے ہند کے فنون لطیفہ کے مختلف رجحانات کا پورے وثوق کے ساتھ شمار کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہے ۔

اس دور کی ادبی اور فنی یادگاروں سے بعض محققین نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ مشرق میں چین سے اور مغرب میں روم یا اسکندریہ سے ہند کے تعلقات تھے اور ان کا ہند پر اثر پڑا ہے ، اگرچہ چندرگپت اول کے برسر حکومت آنے سے ایک صدی پہلے ہی مصر اور ہند کے درمیان براہ راست تجارت بند ہوچکی تھی ، تاہم یہ ممکن ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا ہو مگر یہ ثابت کرنا کہ ہند پر بیرونی ممالک کا اثر پڑا ، بہت مشکل ہے ، بلکہ اس میں بھی شبہ ہے کہ آیا واقعات اس قسم کے نظریہ کے مقتضی ہیں ، اس خاندان کے کم از کم چند بادشاہ

بہت مہذب اور تعلیم یافتہ تھے ، زبردست فاتح سمدر گپت شاعر ، موسیقی داں اور مذہبی عالم تھا ، اس کا دربار دولتمند امیروں ، دانشمندوں ، عالموں اور قابل لوگوں سے بھرا ہوا تھا ، اور اس نے ان کی قابلیت اور لیاقت سے پورا فائدہ اٹھانے اور ان کے ذاتی جوہروں کو چمکانے کی پوری کوشش کی ، اگر حالات ناسازگار ہوتے تو یقیناً ان کے ذاتی جوہر یونہی دفن ہوجاتے اور ان کا کوئی نتیجہ نہیں رہتا .

ہم نے چوتھی اور پانچویں صدی کو گپت دور سے تعبیر کیا ہے ، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ان کے علاوہ ہند میں کسی اور کی سلطنت نہیں تھی ، در حقیقت گپت سلطنت اور جنوبی ہند کی ریاستوں کے درمیان ایک اہم سلطنت واکاٹک کا پتہ چلتا ہے ، اس خاندان کے فرمانرواؤں کے نام ہمیں معلوم ہیں ، ان میں سے بعض نے فتوحات بھی کی تھیں ، غالباً ان کا تمدن بھی گپت خاندان کے تمدن سے مشابہ تھا ، مگر ہمیں ان لوگوں کی زندگی کے حالات کا کوئی علم نہیں ہے جو ان فرمانرواؤں کے محکوم تھے .

باب ۱۵

گورے هون

هم دسویں باب میں بتا چکے هیں کہ دوسری صدی قبل مسیح میں جب یوچی قبیلہ نے سکیوں کو باختر سے نکالا تو گورے هون بھی ان کے پیچھے پیچھے آرھے تھے ، اس زمانہ سے لیکر ان کے ریلے برابر مغرب کی طرف بڑھتے رھے یہاں تک کہ وہ پورے یوروپ پر چھاگئے ، یہ اپنی خون ریزی اور سفاکی کیلئے اب تک مشہور هیں ، اسوقت جبکہ گپت خاندان هند میں حکومت کر رها تھا ، هونوں کا ایک قبیلہ ماوراءالنہر میں بس گیا تھا ، اس کا کچھ پتہ نہیں کہ اصل هونوں سے گورے هونوں کا کیا رشتہ تھا ۔ سنسکرت کتابوں اور کتبوں میں ان کا نام هون ظاهر کیا گیا هے ، ان کا اصل نام کچھ بھی رها هو مگر جب وہ هند میں پہنچے تو هون هی کے نام سے پکارے جاتے تھے ، یہ لوگ ماوراءالنہر سے جنوب کی طرف بڑھے اور افغانستان کو پار کرکے هند میں داخل هونے کی انہوں نے کوشش کی ، پانچویں صدی کے وسط کے بعد سکندگپت نے انہیں زبردست شکست دی اور ایک ستون پر کتبہ لکھ کر اس کو بطور یادگار نصب کرایا ۔ اس لڑائی کا مقام معلوم نہیں هے ، یہ ستون بنارس کے مشرق میں کچھ فاصلہ پر واقع هے ، اس سے اندازہ هوتا هے کہ گورے هون یہاں تک پہنچ گئے تھے ۔

موجودہ تحقیقات سے پتہ چلتا هے کہ گورے هون گنگائی میدانوں کے مستقل مالک کبھی نہیں بن سکے تھے ۔ انہوں نے سنہ ۴٦۵ع کے بعد تورمان کی قیادت میں هند کے شمال مغربی علاقوں میں لوٹ مار شروع کی اور اس صدی کے آخر میں تورمان پنجاب کا مالک هوگیا ۔ اور مالوہ تک اس کی سلطنت قایم هوگئی ، اس نے مہاراجہ کا لقب بھی اختیار کیا تھا ، اس کے بعد اس کا بیٹا مہرگل تخت نشین هوا ۔ اس کا پائے تخت سیالکوٹ تھا ، بہار اور شمالی بنگال کے علاقہ پر گپت فرمانروا

اب بهی حکومت کر رهے تهے ، مگر شمالی هند سے ان کی شہنشاهی ختم هوچکی تهی ، مهرگل کے کارناموں کے متعلق همارے پاس کوئی قطعی شہادت نہیں هے ، همعصر شہادتوں سے معلوم هوتا هے کہ وہ بے رحم ، سفاک اور ظالم تها ، اگرچہ یہ شہادتیں مبالغہ سے بهری هوی هیں تاهم اصلیت سے خالی نہیں هیں ، مهرگل کا زوال کیونکر هوا اس پر تاریکی کا پردہ پڑا هوا هے ، اس کے متعلق جو کچھ روایتیں بیان کی جاتی هیں ان کے تسلیم کرنے میں احتیاط کی بہت ضرورت هے .

ایسا معلوم هوتا هے کہ چهٹی صدی عیسوی کے وسط میں ترکوں نے وسطی ایشیا کے گورے هونوں کا خاتمہ کردیا ، اس لئے هند کے گورے هونوں کو بیرونی امداد نہیں مل سکتی تهی ، انہوں نے مجبوراً اپنے هی ذرایع پر ٹیکا لگایا ، مهرگل کے انجام کے متعلق هماری معلومات کا واحد ذریعہ هیون سانگ کا سفرنامہ هے جس پر تفصیلی تبصرہ آئندہ باب میں کیا جائیگا ، اس چینی یاتری کا بیان هے کہ مهرگل نے بودهمت کو ختم کرنے کا تہیہ کرلیا ، اور اس مقصد سے اس نے گپت فرمانروا بالادت پر حملہ کیا جو بودهمت کا پر جوش حامی تها ، مگر اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں هوی ، وہ الٹا قید هوگیا ، اور جب اس کو قید سے رهائی ملی تو اس کی حکومت پر دوسروں کا قبضہ هوچکا تها ، اس نے لاچار هوکر کشمیر میں پناہ لی اور چنددنوں کے بعد کشمیر هی پر قبضہ کرلیا ، اور بودهمت کے پیرووں کو پهر سے ستانا شروع کیا مگر ایک بلاے ناگہانی سے اس کا اچانک انتقال هوگیا .

ایک بودھ مت کے پر جوش پیرو کی اس روایت میں جو اصل واقعہ کے ایک صدی بعد لکهی گئی هے ، سنین اور دیگر جزئیات کے لحاظ سے بہت سی دشواریاں پیش آرهی هیں ، اس لئے مالوہ کے دو کتبوں کے انکشاف کے بعد محققین نے عام طور پر اس روایت کو مسترد کردیا هے ، ان کتبوں میں یہ ذکر کیا

گیا ھے کہ سنہ ۵۳۰ ع کے قریب یسودھرمن نے گورے ھونوں کو شکست فاش دی اور ایک سمندر سے لیکر دوسرے سمندر تک پورے شمالی ھند کا مالک بن گیا ' یہ نہیں معلوم کہ اس سے پہلے اس فاتح کی کیا حیثیت تھی ' مگر کتبہ کے ایک فقرہ سے پتہ چلتا ھے کہ وہ مالوہ کا رھنے والا نہ تھا ؛ اس کا اصلی وطن تھانیسر تھا جو دھلی کے شمال میں تقریبا ایک سو میل کے فاصلہ پر پنجاب کا ایک مشہور شہر ھے ۔

ان دونوں روایتوں کے درمیان ایک طرح کا تطابق پیدا کیا جاسکتا ھے ' وہ اسطرح کہ جس وقت گورے ھون ھند کے شمال مغربی حصوں پر قابض ھو رھے تھے یسودھرمن نے اپنی سلطنت قایم کرلی اور چند دن کے بعد ان مشرقی علاقوں پر بھی جو درحقیقت گپت سلطنت میں شامل تھے ' اپنا تسلط جمالیا ' اور بالادت یسودھرمن کا باجگزار ھوگیا ' پھر اس نے بالادت کی مدد سے گورے ھونوں کو جنوب اور مغرب کی طرف بھگادیا ' اور ان کو پنجاب اور مالوہ سے نکال کر وھاں اپنی حکومت قایم کی ' اسطرح وہ پورے شمالی ھند کا بادشاہ تسلیم کرلیا گیا ' اور جب ایک صدی بعد ھیون سانگ یہاں آیا تو اس کو بودھ مت کے پیرووں سے یہ روایت بگڑی ھوی صورت میں ملی ' جس کی بناء پر اس نے یسودھرمن کی طرف اس کے کارنامہ کو منسوب کرنے کی بجائے بالادت کی طرف منسوب کردیا جو درحقیقت یسودھرمن کا ماتحت اور محکوم تھا ' ھیون سانگ کا یہ بیان کہ مہرگل نے کشمیر میں پناہ لی صحیح ھوسکتا ھے مگر ھمعصر شہادتوں سے اب تک اس کی تصدیق نہ ھوسکی ؛ یہ مفروضہ روایت ان واقعات کے مطابق ھے جو اب تک ھمارے علم میں آچکے ھیں ' مگر اس کو ثابت شدہ نہیں خیال کیا جاسکتا ' ممکن ھے کہ نئے انکشافات کے بعد اس پر نظر ثانی کرنی پڑے ' فی الحال پورے وثوق کے ساتھ اتنا ھی کہا جاسکتا ھے کہ یسودھرمن نے گورے

ھونوں کو شکست دی اور شمالی ھند میں اپنی حکومت قایم کی۔ *

اتنی بات یقینی معلوم ھوتی ھے کہ یسودھرمن کی سلطنت بہت دنوں تک قایم نہیں رھی، اس صدی کے وسط میں دو خاندان عروج پر آئے، ایک موکھری خاندان ھے جس کی حکومت اس علاقہ پر، جس کو آجکل اترپردیش کہا جاتا ھے، قایم ھوی، چند دنوں کے بعد تھانیسر میں ایک خاندان کو عروج حاصل ھوا، جس کے فرمانرواوں کا نام وردھن کے لفظ پر ختم ھوتا تھا، اس خاندان نے ھند کے شمال مغربی علاقوں پر اپنا تسلط قایم کیا، اب یہ نہیں معلوم کہ اس خاندان کا یسودھرمن سے کیا رشتہ تھا، عام طور پر چھٹی صدی عیسوی کی تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا ھوا ھے، لیکن اتنی بات یقینی ھے کہ وردھن خاندان کے فرمانرواوں نے تھانیسر کی معمولی ریاست کو بڑی ترقی دی اور وھی آگے چلکر قنوج کی عظیم الشان سلطنت بن گئی، اس کا ذکر دوسرے باب میں کیا جائیگا۔

ترکوں نے گورے ھونوں کے فوراً ھی بعد ھند پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ پانچ سو سال کے بعد ھند میں داخل ھوے، اس درمیان میں کسی ایسی قوم کا سراغ نہیں ملتا جو باھر سے ھند میں آئی ھو، جب ترک یہاں آئے تو نہ سک تھے اور نہ کشان اور نہ گورے ھون، اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ھوتا ھے کہ ان بیرونی حملہ آوروں کی اولاد کا کیا حشر ھوا؟ اس وقت اس سوال کا ایک ھی جواب دیا

---

* جنوری سنہ ۱۹۲۹ع کے اپیگرافیا انڈیکا میں صفحہ ۳۲ پر ایک کتبہ شایع ھوا ھے جس میں بالادت کو یسودھرمن کا باجگذار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ھے، مگر اس کے کتبہ کی جو تعبیر کی جاتی ھے وہ اب تک تسلیم نہیں کی گئی ھے۔ اس کے برخلاف کے - پی جیسوال نے اپنی کتاب امپیریل ھسٹری آف انڈیا (مطبوعہ لاھور ۱۹۳۴) میں صفحہ ۳۵ پر مختلف واقعات سے مذکورہ بالا نظریہ کی تردید کی ھے۔

جاسکتا ہے وہ یہ کہ سب کے سب غالباً ہندومت میں جذب ہوگئے یہی نظریہ زیادہ قابل قبول ہے، زبردستی ان کا خاتمہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ ہندوؤں کی ایک ذات یا فرقہ ہوگئے، اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ ہندو ہوگئے تو کس ذات میں شامل کیے گیے اور موجودہ ہندوؤں میں سے کون سا گروہ ان کی اولاد سے ہے۔

سب سے زیادہ قابل قبول توجیہ یہ ہے کہ موجودہ گوجر قوم ان ہی پردیسیوں کی نسل سے ہے، سنسکرت کتابوں اور کتبوں میں گوجر کے نام سے ایک قوم کا ذکر ملتا ہے، ان کو گورے ھونوں کے ساتھ اس طرح ملایا گیا ہے کہ اگر ان کو گورے ھونوں کی نسل سے نہ مانا جائے تو بھی یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ وہ غیر ملکی ہے، اور نئے نئے ہند میں داخل ہوے تھے، ان لوگوں نے آگے چلکر ہند کے شمال اور مغرب میں کئی ریاستیں قائم کرلی تھیں، اسی علاقہ کو گجرات کا نام دیا گیا جو اب پنجاب اور بمبئی کا ایک حصہ ہے، ان دونوں صوبوں میں گوجروں کی قوم آج بھی پائی جاتی ہے، یہ تمام ہندی نسل سے ہیں، مگر ان میں سے بعض ہندو ہیں اور بعض مسلمان ہوگئے ہیں، ان میں چند خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو ان کو عام ہندوؤں سے ممتاز کرتی ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس قوم کے آباء و اجداد پانچویں صدی میں حملہ آوروں کی حیثیت سے ہند میں داخل ہوے تھے، اور چند دنوں تک حکومت کی، اور جب حکومت ہاتھ سے جاتی رہی تو وہ بھی ہندو بن گئے، اس قسم کے قیاسی نتیجہ کیلئے کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے کیونکہ ابھی تک اس کو ثابت نہیں کیا جاسکا کہ گوجر غیر ملکی ہیں۔

اسی طرح دوسرے نظریے بھی بالکل غیر قطعی ہیں، خاصکر یہ نظریہ کہ مرھٹے سک قوم کی نسل سے ہیں، جیسا کہ امپیریل گزٹیر آف انڈیا میں ظاہر کیا گیا ہے، اب تک قبول عام نہیں حاصل کرسکا، سب سے زیادہ دلچسپ مسئلہ راجپوت یا چھتری قوم

کی اصلیت کا ھے ' راجپوت در حقیقت بادشاھون کی نسل سے ھیں ' اور چھتری ایک جنگجو قوم ھے ' راجپوتون کا تو یہ دعوی ھے کہ وہ چھتریون کی نسل سے ھیں ' ان میں سے بعض نام آور تو اپنا ایک تفصیلی شجرہ بھی رکھتے ھیں ' جن کا مورث اعلی سورج چاند یا آگ جیسی چیزوں کو قرار دیا جاتا ھے ' غیر راجپوتون کا یہ نظریہ ھے کہ یہ قوم مختلف عناصر سے مرکب ھے ' اور یہی نظریہ زیادہ مقبولیت حاصل کر رھا ھے ' راجپوتون کے مختلف گروہ مختلف قبایل کی نمائندگی کر رھے ھیں جن میں بعض ھندی ھیں اور بعض پردیسی ' ان لوگون نے کسی زمانہ میں سلطنت حاصل کی ' اور اس طرح راجپوت قرار دیدئے گئے ' اور درباری شاعرون نے بھی ان کا نسب نامہ گھڑکر پیش کردیا ' اس قسم کی باتون کے متعلق کوئی واضح شہادت نہیں مل سکتی ' اور نہ اس مختصر کتاب میں مسئلہ کی تمام جزئیات کا استقصا کیا جاسکتا ھے ' مگر ایک بات کی جو ھم کو مطالعہ کے دوران میں حاصل ھوی ' توضیح کی جاسکتی ھے ' اور وہ یہ کہ چھٹی صدی عیسوی سے پہلے راجپوتون کے متعلق کوئی روایتیں نہیں ملتی ھیں ' ساتوین صدی سے ان کا تفصیلی ذکر روایات میں آتا ھے ' اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ھے گورے ھونون کے سیلاب نے پرانی روایات کے تمام نقوش مٹادیے تھے اور نئی روایات کا سلسلہ شروع ھوا ' جن کی پورے طور پر حفاظت کی گئی .

اب ھم کو جنوبی ھند کی طرف توجہ کرنی ھے ' اور یہ دیکھنا ھے کہ ان تین صدیوں میں جبکہ شمالی ھند میں گپت فرمانروا ' گورے ھون اور ان کے جانشین حکومت کر رھے تھے ' جنوبی ھند میں کیا ھو رھا تھا ' اس سلسلہ میں ھماری معلومات بالکل نا کافی ھیں ' اور اس تاریخ کے صرف چند اجزا ملتے ھیں جن سے جنوبی ھند کی تاریخ کا ایک مجمل خاکہ پیش کیا جاسکتا ھے ' یہ تو معلوم ھے کہ جنوبی ھند میں بہت سے آزاد قبیلے

رہتے تھے جو آپس ہی میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے ' اور جب ان میں سے کوئی قبیلہ طاقتور ہوجاتا تو خود ہی ایک سلطنت بنالیتا یا کسی ہمسایہ سلطنت کا دوست یا دشمن ہو جاتا ' ان کی تفصیلی تاریخ کا مرتب کرنا جنوبی ہند کے مورخین کا کام ہے ' مگر جہانتک ہند کی عام تاریخ کا تعلق ہے ان آزاد قبیلوں کی تاریخ کو نظر انداز کرنا پڑیگا ' ان کے علاوہ جنوبی ہند میں تین تامل ریاستیں اس دور میں برابر باقی رہیں ؛ اگرچہ ان کے آپس میں اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں تاہم ان کی انفرادیت اپنی جگہ پر تھی ' ان ریاستوں کے شمال میں پلووں کی حکومت تھی جن کا صدر مقام کنجی ورم تھا ' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چولا ریاست کے حدود اس مقام سے آگے ملک کے اندرونی حصہ میں کہیں رہے ہونگے ' چولا اور پلوا آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے ' پلوا ریاست کے شمال میں کلنگا کی ریاست تھی ، جس کے حالات کا اس دور میں کچھ پتہ نہیں چلتا

آندھراؤں کی پسپائی کے بعد سک فرمانروا کچھ زمانہ تک جنوبی ہند کے شمال مغربی حصہ پر حکومت کرتے رہے ' جن کی تفصیلی تاریخ کا کچھ علم نہیں ہے ' اس کے صرف چند اجزا ملتے ہیں ' بمبئی کے قریب چوتھی صدی میں ابھیراؤں (گلہ گاؤ) کی حکومت کا پتہ چلتا ہے ' دوسرے مقامات پر مختلف ریاستیں موجود تھیں ' جن میں سب سے اہم راشٹرکوٹوں کی ریاست تھی ' راشٹرکوٹوں نے آگے چلکر بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی ' اور پانچویں صدی میں ان کی حیثیت محض خیالی تصویروں کی سی ہے ' صرف چھٹی صدی کے وسط میں چالوکیہ خاندان عروج پر آتا ہے اور وسط ہند میں ایک زبردست سلطنت قایم کرلیتا ہے .

چالوکیہ راجپوت تھے ' ان کا سلسلہ نسب اجودھیا کے راجپوتوں سے ملایا جاتا ہے ' مگر پہلے پہل ان کا عروج جنوبی ہند کے مرکزی حصہ سے ہوا جہاں انھوں نے راشٹرکوٹوں اور

دوسرے قبیلوں پر فتح پائی ' ان کا سب سے بڑا فرمانروا پلیکیسن دوم ہے جو سنہ ۶۰۸ع میں تخت پر بیٹھا ' اس کی سلطنت ساحل کونکن سے لیکر گوداوری کے دھانہ تک پھیلی ہوی تھی ' اس کی فوجیں ایک طرف تو مالوہ تک اور دوسری طرف جنوبی ہند کی تامل ریاستوں تک پہنچ گئی تھیں ' جیسا کہ ہم آئندہ باب میں پڑھینگے اسی ریاست چالوکیہ کی وجہ سے قنوج کا راجہ ہرش جنوبی ہند میں کوئی فتوحات حاصل نہیں کرسکا تھا .

یہ تو جنوبی ہند کی سیاسی حالت کا ایک عام خاکہ ہے ' مگر یہاں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا ' لیکن دوسرے دور کی یادداشتوں سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس دور میں ہندومت کو فروغ حاصل ہو رہا تھا ؛ تمام قبیلوں کے دیوتا ہندومت میں جذب ہو رہے تھے ' بودھمت اور جین‌مت بھی ترقی کر رہے تھے ' ہم یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پلووں کی حکومت کے زمانہ میں کنجی ورم ہندومت کا ایک اہم مرکز ہوگیا تھا . اور کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ چوتھی صدی میں وید اور سنسکرت علوم کو زندہ کرنے کیلئے یہاں ایک ادارہ بھی قایم ہوگیا تھا ' بعض محققین تامل علاقوں میں ہندومت کے پھیلنے کا یہ سبب قرار دیتے ہیں کہ سنہ ۴۰۰ع کے قریب کنجی ورم چولا خاندان کے قبضہ میں آگیا اور کچھ دنوں تک اس پر ان کی حکومت رہی ' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تامل کے دوسرے علاقوں میں بھی ہندومت پھیل گیا ' لیکن اس زمانہ میں سیاسی سرحدیں مذہب کے پھیلنے میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنتی تھیں . اس لئے کسی واضح شہادت کے نہ ہونے کی بناء پر ہم کو اسی خیال پر اکتفا کرلینا ہے کہ ان علاقوں میں بھی ہندومت پھیلا ؛ مگر اس کے پھیلنے کے مختلف مدارج اور مرحلوں کی تاریخ نہیں بتائی جاسکتی .

باب ۱۶

راجہ ہرش

اگر ہماری موجودہ معلومات کا خیال کیا جائے تو قنوج کی تاریخ ایک وقتی کہانی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ ریاست پچاس سال سے بھی کم زندہ رہی اور پھر اس کا شیرازہ بکھر گیا، اس کی تاریخ کے متعلق ہمارے پاس صرف دو ذریعے ہیں، ایک تو ہند کے مشہور شاعربان کی لکھی ہوی تاریخی نظم ہرش چرت ہے، جس میں قنوج کے راجہ ہرش کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں، دوسرا ایک چینی یا تری یون چوانگ یا ہیون سانگ کا سفرنامہ ہے، ہرش چرت کو کسی زمانہ میں تاریخی افسانہ کہا جاتا تھا، مگر اس کی مبالغہ آمیز تعریفیں اور اس نظم کا بے جوڑ اور بے ربط خاتمہ راجہ ہرش کی مکمل سوانح عمری کے مرتب کرنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتا، البتہ اس میں بعض بنیادی واقعات ایسے ہیں جن کی دوسرے ذریعوں سے تصدیق کی جاسکتی ہے، ہیون سانگ نے اپنے سفرنامہ میں بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ چینی یاتری مقدس مقامات کی زیارت کرنے اور مقدس کتابوں کے معتبر نسخوں کو حاصل کرنے کیلئے ہند آیا تھا، اور سنہ ۶۳۰ ع سے لیکر سنہ ۶۴۴ ع تک وہ یہاں مقیم رہا، فاہیان کی طرح اس کی دلچسپی بھی مذہبی باتوں تک محدود رہی، اس لئے اس کے سفرنامہ سے ان حالات کا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا جن کے جاننے کی ہم خواہش رکھتے ہیں، اس نے جغرافیائی مقامات کا نقشہ اتنا دھندلا کھینچا ہے کہ اس سے کسی مقام کا پتہ لگانا مشکل ہے، تاہم سکوں اور کتبوں کی مدد سے ساتویں صدی کے پہلے نصف کی شمالی ہند کی تاریخ کا ایک عام نقشہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔

تھانیسر، قنوج اور مالوہ کی تینوں ریاستوں کے ملنے کے بعد ہرش کی سلطنت بنی، ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مشرقی

پنجاب میں تھانیسر ایک ترقی پذیر ریاست کا صدر مقام تھا ' قنوج کانپور کے شمال مغرب میں پچاس میل کے فاصلہ پر دریاے گنگا کے کنارے واقع تھا ' اور غالبا موکھری خاندان کا پاے تخت تھا ' ان کی حکومت اودھ اور شمالی بہار سے لیکر بنگال کی مغربی سرحد تک قایم تھی ' مالوہ کی جاے وقوع کے متعلق اب تک کوئی صاف اور واضح یادداشت نہیں مل سکی ' مگر اتنا یقین ھے کہ یہ موجودہ مالوہ نہیں تھا جس کا پاے تخت اجین تھا ' بلکہ اور آگے مغرب میں غالبا گجرات یا راجپوتانہ کے کسی علاقہ میں واقع تھا ' ان تینوں ریاستوں کے حدود تخمینی طور پر بھی متعین نہیں کیے جاسکتے ' قرائن سے معلوم ھوتا ھے کہ ھر ایک کی سرحد دوسرے سے ملتی جلتی تھی ۔

تھانیسر کے راجہ پربھاکروردھن کا سنہ ۶۰۵ ع میں انتقال ھوگیا اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی کا نام تاریخ میں اتا ھے ' اس کا بڑا لڑکا راجوردھن تخت پر بیٹھا مگر اسی وقت اس کو یہ خبر ملی کہ اس کی بہن راجیسری آفت میں ھے جس کی شادی بارہ تیرہ سال کی عمر میں قنوج کے راجہ سے ھوی تھی ' مالوہ کے راجہ نے قنوج پر چڑھائی کی اور راجیسری کے شوھر کو قتل کردیا ' اور راجیسری کو قید کرلیا ' اور اس سے بد سلوکی کرنے لگا ' جب راجوردھن کو یہ خبر معلوم ھوی تو وہ فورا ایک زبردست فوج لیکر قنوج کی طرف بڑھا اور مالوہ کے راجہ کو شکست دی مگر راجوردھن کو دھوکہ سے قتل کردیا گیا ' یہ سنکر اس کا چھوٹا بھائی ھرش وردھن تخت پر بیٹھا ' اس وقت اس کی عمر صرف سولہ سال کی تھی ' یہ بھی ایک فوج لیکر قنوج کی طرف روانہ ھوا ' تاکہ اپنی بہن کو چھڑا لائے اور اپنے بھائی کے قاتلوں سے سخت انتقام لے ' وہ ابھی راستہ ھی میں تھا کہ اس کو بھائی کی فوج ملی ' جو بہت سا مال غنیمت لیکر واپس آرھی تھی ' اس سے یہ بھی معلوم ھوا کہ راجیسری قید سے نکل بھاگی ھے اور جمنا کے اس پار جنگلوں میں

کہیں چھپ گئی ہے ' ہرش نے فوراً ادھر کا رخ کیا اور بہن کو ڈھونڈھ نکالا ' اس وقت بہن بالکل نا امید ہوکر ستی پر آمادہ ہوگئی تھی ' ہرش اس کو سمجھا بجھاکر ساتھ لے آیا اور اس کی اپنی حکومت تک اپنے ساتھ ہی رکھا ۔

اس کے بعد ہرش نے فتوحات کی طرف توجہ کی ' اور اس کو ایک بڑی حدتک کامیابی ہوی ' اس کے جنگی کارناموں کی تفصیل معلوم نہیں ہے ' البتہ اس کے حدود سلطنت کو بیان کیا جاسکتا ہے ' شمال میں کوہہاے ہمالیہ تک ' شمال مغرب میں بیاس اور ستلج تک جنوب مغرب میں گجرات تک اس کی حکومت تھی ' آگے جنوب میں نربدا کا دریا حد فاصل تھا ' اسی جگہ ہرش نے چالوکیہ فرمانروا پلیکیسن دوم کے ہاتھوں سخت شکست کھائی ' اور پھر اس نے دوبارہ جنوبی ہند پر پیش قدمی کرنے کی جرات نہ کی ' شمال مشرق میں برھمپترا تک اس کی سلطنت قایم ہوگئی تھی ' یہاں کامروپ (اسام) کے راجہ نے اس کی اطاعت اور دوستی قبول کرلی ' اور آگے مشرق میں خلیج بنگال تک اس کا اقتدار قایم ہوگیا تھا ۔ *

آخر عمر میں ملک گیری کا جذبہ سرد پڑگیا تھا اور راجہ ہرش نے فتوحات کی بجاے سلطنت کے نظم و نسق کی طرف توجہ کی ' اس نے مذہب اور علوم و ادب کو بڑی ترقی دی ' اس کی سر پرستی میں بہت سے ناٹک اور نظمیں لکھی گئیں ' اس نے سنہ ۶۴۷ ع کے قریب انتقال کیا اور اس کی وفات سے اس کی سلطنت بھی ختم ہوگئی جیسا کہ آگے چلکر بیان کیا جاٸیگا ۔

* بنگال کی ریاست کرن کی حیثیت واضح نہیں ہے ، اس صدی کی ابتدا میں سسنک اس ریاست کا راجہ تھا ، وہ مالوہ کے راجہ کا حلیف تھا اور قنوج کی لڑائی میں شریک تھا ، راج وردھن کے قتل کا وہی ذمہ دار تھا ، سسنک کے زمانہ میں یا اس کے بعد اس ریاست کی آزادی چھن گئی ، لیکن یہ نہیں معلوم کہ آیا یہ ہرش کی محکوم تھی یا اسام کے راجہ کے ما تحت تھی ۔

ھرش کے ماتحت مختلف ریاستیں تھیں جن کے راجہ کبھی کبھی شاھی دربار میں حاضر ھوا کرتے تھے ' اس کے پاس ایک مستقل فوج تھی ' اس کا پاے تخت عام طور پر قنوج تھا ' مگر جب کبھی وہ میدان جنگ پر ھوتا تو وھی اس کا پاے تخت بن جاتا تھا کیونکہ اس کے ساتھ حکومت کے تمام دفاتر موجود رھتے تھے ' بعض عہدوں کی تفصیل ملتی ھے ' مگر ان کے فرائض و اختیارات کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا ' اس میں شبہ نہیں کہ ھرش کی حکومت بہت منظم تھی ' چینیوں سے بڑھکر اس کی رعایا کو شخصی آزادی حاصل تھی ' سلطنت میں زبردست جرائم کا بھی ارتکاب کیا جاتا تھا چنانچہ ھیون سانگ نے اپنا ایک ناخوشگوار واقعہ لکھا ھے کہ دریائی قزاقوں نے اس پر حملہ کیا تھا ' مگر جرائم پیشہ لوگ اکثر ایسے علاقوں میں آباد تھے جو ھرش کے حدود سلطنت میں شامل نہیں تھے ' خطرناک ڈاکو اور چور جنوبی ھند کے شمال مغربی جنگلوں میں چھپے ھوے تھے ' اور مسافروں اور قریب کی آبادیوں کو لوٹتے رھتے تھے ' خود ھیون سانگ کا بیان ھے کہ ھرش کی سلطنت میں اس قسم کے لوگوں کی تعداد زیادہ نہ تھی ' جھوٹ اور سچ کا امتحان جسمانی اذیت دیکر لیا جاتا تھا ' اگرچہ گپت دور کی بہ نسبت جرائم کی سزا سخت تھی تاھم چینی معیار سے ذرا نرم ھی تھی ' رعایا سے زیادہ محصول نہیں لیا جاتا تھا بیگاروں سے جبری طور پر کام لینے کا دستور کہیں پایا جاتا تھا ' پیداوار کا چھٹا حصہ بطور مالگزاری کے ادا کرنا ھوتا تھا ' مگر ھم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا ھیون سانگ نے لوگوں سے سن کر یہ بات لکھی ھے یا واقعتاً اس پر عمل بھی ھو رھا تھا ۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ تجارتی چیزوں کے لیجانے پر محصول عاید کیا جاتا تھا ' جس کا اس سے پہلے دستور نہیں تھا ھیون سانگ کا بیان ھے کہ یہ محصول غیر معمولی نہیں تھا .

معاشرتی حالات کے متعلق ہیون سانگ لکھتا ہے کہ اونچی ذات کے لوگ بہت سادہ اور کفایت شعار تھے ، ان کا لباس بہت ہی صاف اور ستھرا ہوتا تھا ، البتہ وہ زیورات سے لدے رہتے تھے ، قصاب مچھیارے ، گانے بجانے اور ناچنے والے ، جلاد اور حلال‌خور اونچی ذات سے الگ تھلگ شہر کے باہر رہتے تھے ، شہروں کی فصیلیں اینٹوں سے بنائی جاتی تھیں ، مکانات عام طور پر لکڑی یا مٹی کے ہوتے تھے ، جس کی چھت کھپرے یا پھوس کی ہوتی تھی ، چینی یاتری کے سفرنامہ سے فنون لطیفہ کی کوئی تفصیل نہیں ملتی ، مگر اس زمانہ کے تمثیلی ادب سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاہی دربار آراستہ و پیراستہ ہوتا تھا ، خوش دل اور ظریف مزاج لوگوں کی مانگ رہتی تھی ، بعض اوقات لہو و لعب اور عیاشی کے مظاہرے بھی ہوتے تھے ، اس قسم کی رنگ رلیوں کے منانے میں شاہی رنڈیاں زیادہ حصہ لیا کرتی تھیں ، معمولی اوقات میں شاہی دربار بہت مہذب ہوتا تھا ، گانے بجانے اور ناچنے والی عورتیں بھی اس میں شریک رہتی تھیں ، ان کو مہمات ملکی سے بھی خاصی دلچسپی تھی .

بادشاہ کا مذہب صلح کل تھا ، شاہی خاندان کے افراد آبائی طور پر شیو کے پرستار تھے ، ہرش نے بودھمت اختیار کیا ، اس کے ساتھ ساتھ اس نے برہمنوں کی سر پرستی بھی جاری رکھی ، پہلے وہ ہنایان مسلک کا معتقد تھا مگر بعد میں ہیون سانگ کے اثر سے مہایان مسلک اختیار کرلیا ، اور مذہبی بحث و مباحثہ کیلئے سنہ ۶۴۳ ع میں قنوج کے اندر ایک بڑی مجلس منعقد کی ، اور ہیون سانگ کو اس کا پورا اختیار تھا کہ وہ اپنی سمجھ کے مطابق مذہبی عقاید کی تشکیل کرے ، ہرش کے صلح کل رویہ کا ثبوت اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ وہ اس مذہبی مجلس سے سیدھے الہ‌آباد روانہ ہوا اور وہاں کے پنج سالہ جشن میں شریک ہوا ، اس نے ہر مذہب کے علما اور فقرا کو دل کھول کر دان

دیا اور کئی ہفتوں تک ہر مذہب و ملت کے مسکینوں اور یتیموں کو خیرات تقسیم کرتا رہا یہاں تک کہ ہرش کا تمام خزانہ خالی ہوگیا ، اس نے اپنے زیور اور کپڑے بھی محتاجوں کو دیدئیے ' اور آخر اپنی بہن سے ایک پرانا جوڑا لیکر پہنا ' فوج کی ضروریات کے علاوہ کوئی چیز باقی نہ رہی ' اور آخر میں پوجا کی ' اس روایت میں یہ بھی ہے کہ دس دن کے اندر اندر خالی تجوریاں پھر سے بھرگئیں .

اگرچہ اس دور میں مہایان مسلک کو نمایاں ترجیح دی جاتی تھی تاهم تمام مذهبوں کے ساتھ بادشاہ کا سلوک اچھا تھا ، لوگوں کی اکثریت هندومت کی پیرو تھی - پنجاب ' قنوج ' بہار ' بنگال ' مہاراشٹر اور گجرات میں بودھ مت کو بھی مقبولیت حاصل تھی ' البتہ پنجاب ، راجپوتانہ ' الہ آباد اور مالوہ میں اس کے ماننے والے دن بہ دن کم ہوتے جا رہے تھے ' جنوبی هند کے علاقہ پلوا میں اس مذہب کا جوش ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا ، مختلف مذہبوں اور عقیدوں کے پیرووں کے درمیان رواداری اور هم آهنگی تھی ' کبھی کبھی بودھ مت کے پیرو اختلاف مسلک کی بناء پر لڑ پڑتے تھے ، اور مذھبی مناظروں میں مارپیٹ کی نوبت پہنچ جاتی تھی ، برهمن بادشاہ کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے ' کیونکہ وہ بودھ مت کے پیرووں کو هندووں پر ترجیح دے رہا تھا ، قنوج کی مجلس میں اکثر گڑ بڑ ہوجاتی تھی ' چونکہ هیون سانگ مہایان مسلک کا حامی اور طرفدار تھا اس لئے هنایان مسلک کے بعض پیرووں نے اس کو قتل کرنے کی کوشش کی 'بعض برهمنوں نے بادشاہ کو قتل کرنے کی سازش کی ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات مذھبی عناد بہت زور پکڑ جاتا تھا .

اس دور میں مذھبی ایذارسانی کی دو مستند مثالیں ملتی هیں ، مگر یہ دونوں واقعے ہرش کی سلطنت سے باہر پیش آئے تھے ؛ مغربی بنگال میں ریاست گوڑ کا حکمران سسنک شیوکا پرجوش پجاری تھا ، اس نے اپنی ریاست سے بودھ مت کو مٹانے

کی کوشش کی ، چنانچہ اس نے بہت سے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی ، بودھ خانقاهوں کو تباہ و تاراج کیا ، اور ان کے راهبوں کو جلا وطن کردیا ، دوسری مثال جین مت کے پیرووں کی هے ، جو جنوبی هند کی پانڈیہ ریاست میں مقیم تھے ، اس خاندان کا ایک بادشاہ جین مت کا پیروتھا ، مگر آگے چلکر هندو بن گیا ، اور شیو کی پوجا شروع کی ، اس نے تمام جینیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی طرح شیو کی پوجا کریں ، مگر جب ان لوگوں نے نہیں مانا تو هزاروں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ، یہ روایت عام طور پر قبول نہیں کی جاتی هے ، ممکن هے کہ اس قسم کے دوسرے واقعات بھی هوے هوں اور چینی یاتری کے علم میں نہ آئے هوں ، ان سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اس قسم کے واقعات عام تھے ، اتنا کہا جاسکتا هے کہ ساتویں صدی کی تاریخ انتہائی تعصب کی مثالوں سے خالی نہیں هے .

اس دور کی مستند روایات سے معلوم هوتا هے کہ بودھ مت کے عام پیرووں اور تعلیمافتہ لوگوں میں ایک نمایاں فرق تھا ، عام لوگ منتر کے طلسمی اثر کے قایل تھے ، اور وہ بھی هندووں کی طرح مظاهر کی پرستش کرتے تھے ، مگر تعلیمیافتہ لوگوں کو ان ظاهری باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی ، وہ خانقاهوں میں بیٹھ کر مذهب و فلسفہ کے عمیق پہلووں پر غور و فکر کرنے میں لگے هوے تھے ، ملک کی عام تہذیب و تمدن پر ان کا ضرور اثر پڑا هوگا ان کے غور و فکر کا اهم مرکز نالندہ تھا جو پٹنہ کے جنوب میں تھوڑے فاصلہ پر واقع هے ، یہاں کئی خانقاهیں تھیں ۔ جہاں بودھ مت کے هزاروں پیرو مذهب اور فلسفہ کے مطالعہ اور مباحثہ میں مصروف تھے ، پردیسی طالب علموں کو بھی داخلہ کے امتحان کے بعد شریک کرلیا جاتا تھا ، یہاں ایک هی مسلک یا فرقہ کے آدمی نہیں تھے ، بودھ مت کی کتابوں کے ساتھ وید کی بھی تعلیم هوتی تھی ، منطق ، صرف و نحو ، طب اور

دوسرے علوم و فنون سنسکرت میں پڑھائے جاتے تھے ، اس قسم کے مدرسے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں بہت ہی موثر ثابت ہوے ہونگے ۔

ہرش کی تاریخ کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے ، اس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے کہ ہرش کے زمانہ میں تہذیب و تمدن کو بڑی ترقی ہوی ، جیسا کہ دو صدی پہلے گپت خاندان کے زمانہ میں ہوی تھی ، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ واقعی اسکے زمانہ میں کوئی غیر معمولی ترقی ہوی ، ہم کو اسکی تفصیلات کا کچھ علم نہیں ہے ، مگر جو کچھ ہم جانتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک ہندو راجہ کے زمانہ میں علم و فن کی ترقی ہوتی رہی ، اگرچہ ہر ایک راجہ کا ابتدائی مقصد ملک گیری ہوتا تھا اور اسکی وجہ سے وہ بسا اوقات رعایا کی حفاظت کے اہم فریضہ کو بھی نظر انداز کردیتا تھا ، تاہم ہر ایک کے زمانہ میں علم و فنون کو ترقی دینے کے کافی مواقع مل جاتے تھے ، اس لحاظ سے اگر سب کے سب نہیں تو کم از کم ان میں سے اکثر علوم و فنون کے بڑے سرپرست تھے اور بڑی فیاضی اور دریادلی کے ساتھ ان کی ترقی کے لئے کوشاں تھے ، اسلئے ہرش یا چندرگپت کے درمیان نوعیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ مقدار کے لحاظ سے فرق کیا جاسکتا ہے پس ہر ایک کے سامنے ایک عمدہ ہندو حکمران کی اسطرح تصویر کھینچی جاسکتی ہے کہ وہ ایک ثابت قدم اور جفاکش بادشاہ ، تجربہ‌کار اور بہادر سپاہی ، اپنے مذہب کا سچا اور دوسرے مذہبوں کے ساتھ رواداری برتنے والا ، ورزشی جسم رکھنے والا اور آجکل کی اصطلاح کے مطابق ایک شایستہ شریف اور مہذب انسان ہوتا تھا ۔

شمالی ہند میں اس قسم کے بادشاہ عموما راجپوت ہوتے تھے ، بادشاہت کسی ایک ذات کی ملکیت نہیں تھی ، تاریخ میں برھمن خاندانوں کی مثالیں ملتی ہیں ، جنہوں نے وزارت کے

درجہ سے بادشاہت پر قبضہ کرلیا تھا ' ہرش ویش خاندان کا تھا جو ذات پات کے لحاظ سے تیسرا گروہ ہے ' شودر خاندان کے بادشاہ بھی ہو گذرے ہیں ' جنوبی ہند کے شمالی علاقہ میں راجپوتوں کی حکومت تھی ' تامل ریاستوں کے راجہ کاشتکاروں کی نسل سے تھے ' اس لئے عام طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بادشاہت پر راجپوتوں ہی کا اجارہ نہ تھا ' ہر ایک راجہ چاہے وہ کسی ذات یا کسی طبقہ کا ہو بادشاہت کے فرائض کی انجام دہی کو اپنا نصب العین قرار دیتا تھا .

ہرش کی سلطنت کے خاتمہ کے متعلق تفصیلات کا علم نہیں ہے ' البتہ سنہ ٦۴٦ ع یا سنہ ٦۴۷ ع میں ہرش کا انتقال ہوگیا ' اس کی کوئی اولاد نہیں تھی ' اس کے ایک وزیر نے سلطنت پر قبضہ کرلیا ' اور چینی سفارت خانہ پر حملہ کیا جو ان ہی دنوں میں وہاں پہنچا تھا ' اب یہ نہیں معلوم کہ اس حملہ کی وجہ کیا تھی ' اس سفارت خانہ کا سردار کسی طرح بچ نکلا اور تبت کی ریاست میں پناہ لی ' اور وہاں سے ایک بڑی فوج لیکر بہار پر حملہ کیا اور غاصب کو شکست دی اور اس کو قید کرکے چین لے گیا ' اس کی وجہ سے ہرش کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا ' اور یہ بات کچھ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ بہار کا شمالی حصہ کچھ مدت کیلئے تبت کے ماتحت ہوگیا تھا .

باب ١٧

ہرش سے محمود تک

اس جیسی مختصر کتاب میں ان تمام سیاسی واقعات کا لکھنا نا ممکن ہے جو ہرش کی موت سے لیکر ترکی حملوں تک کی ساڑھے تین سو سال کی مدت میں پیش آتے رہے ، کیونکہ ان کی تفصیلات بہت زیادہ ہیں ، اور ان تمام واقعات کو ایک سلسلہ کے ساتھ پیش کرنا بہت دشوار ہے ، شمالی ہند میں بہت سی ریاستیں وجود میں آئیں اور ختم ہوگئیں ، جنوبی ہند کا بھی تقریبا یہی حال تھا ، ہم صرف اتنا ہی کرسکتے ہیں کہ مختلف ریاستوں کا ایک مجمل خاکہ پیش کردیں ۔

سب سے پہلے وادی سندھ کا کچھ حال لکھنا ہے ، ہیون سانگ نے سندھ اور بلوچستان میں ایک وسیع سلطنت کا ذکر کیا ہے ، جس پر ایک شودر خاندان حکومت کر رہا تھا مگر اس نے کہیں یہ نہیں لکھا اور غالبا اس کو معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ ریاست عربوں کے نرغہ میں تھی ، حضرت محمد رسول اللہ (٥٦٩-٦٣٢م) کی تعلیمات کی بدولت ان کے پیرووں نے جوغیر معمولی طاقت و قوت کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ عالم کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے ، محمد صلعم کے بعض مٹھی بھر پیرووں نے سنہ ٦٥٠ م کے قریب بلوچستان کو فتح کرلیا ، اور ساٹھ سال بعد اس ریاست کے باقی حصوں پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا ، اس وقت اس ریاست پر ایک برہمن خاندان حکومت کررہا تھا ، جو شودر خاندان کو ہٹاکر ریاست پر قابض ہوگیا تھا ، سنہ ٧١٢ م کے بعد سے سندھ اور اس سے ملے ہوے پنجاب کے کچھ علاقے مسلمانوں کے قبضے میں چلے گئے ، کچھ دنوں تک سندھ خلافت بغداد کا ایک صوبہ بنا رہا ، مگر بعد میں چلکر یہاں دو آزاد ریاستیں قایم ہوگئیں ، اس کے بعد عربوں میں اس طرف ملک گیری کا جذبہ جاتا رہا ، شمالی ہند میں انھوں نے کوئی بڑی

فتوحات نہیں کیں ' اور سندھ سے آگے اسلام کا کوئی اثر نہیں پڑا ' شمالی ھند میں اسلام کی ترقی عربوں کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ایک زمانہ کے بعد ترکوں نے یہاں اسلام کو پھیلایا تھا .

سندھ کی تاریخ کو چھوڑ کر شمالی ھند کی چار مخالف ریاستوں کا ذکر کرنا ھے جو شہنشاھی اقتدار کیلئے ایک دوسرے سے لڑ رھی تھیں ' یعنی کشمیر ' بنگال کی پال ریاست ' راجپوتانہ کے گوجروں اور جنوبی ھند کے راشٹرکوٹوں کی ریاستیں ' آٹھویں صدی کی ابتدا میں کشمیر کو دوسروں پر اقتدار حاصل رھا ' کشمیر ھی ھند کا وہ حصہ ھے جس کے متعلق مسلم فتوحات سے پہلے کی لکھی ھوی ایک تاریخ ملتی ھے ' اس میں جو واقعات بیان کیے گئے ھیں وہ تاریخی خیال کیے جاتے ھیں ' حقیقی معنی میں کشمیر سے مراد دریاے جھیلم سے اوپر کی وادی ھے جو ھر طرف بلند پہاڑوں سے گھری ھوی ھے ' ساتویں صدی میں کشمیر کے راجہ نے پنجاب کے ایک حصہ پر قبضہ کرلیا تھا اور آٹھویں صدی میں دوسروں پر اقتدار پانے کی کوشش کی گئی ' یہ بات قابل توجہ ھے کہ اس زمانہ میں کشمیر کے سیاسی تعلقات ھند کی بجاے چین کے ساتھ قائم تھے ' وسط ایشیا کی تاریخ ھمارے موضوع سے باھر ھے ' تاھم اتنا کہا جاسکتا ھے کہ اسوقت چین کی حکومت کشمیر کے شمال اور بعض وقت ماوراء النھر سے بھی آگے پھیلی ھوی تھی ' اور کہا جاتا ھے کہ سنہ ۷۲۰ء اور سنہ ۷۳۳ء کے درمیان کشمیر کے دو بادشاہ چین کے ماتحت تھے ' اور اس سے انھوں نے اپنی حکومت کی سند حاصل کی تھی ' مگر بہت دنوں تک یہ حالت نہیں رھی ' چینی سلطنت کا زور بہت جلد ٹوٹ گیا ' اور کشمیر سیاسی حیثیت سے ھند کا ایک حصہ قرار پایا ' سنہ ۷۴۰ء میں کشمیر کے راجہ نے قنوج کے راجہ پر جو بنگال پر حملے کرکے ابھی واپس آیا تھا ' فتح پائی ' ایک مشکوک روایت میں

ہے کہ اس نے مشرق کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تھی ۔ مگر گنگاڈی میدانوں میں کسی کارنامہ کا ذکر نہیں ملتا ۔ اس لئے ہم کشمیر کو چھوڑ کر بنگال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔

اس بات پر مورخین کا اتفاق ہے کہ آٹھویں صدی کے پہلے نصف میں بنگال اور بہار کے اندر بہت بڑا خلفشار رہا ۔ بار بار کے بیرونی حملوں کی وجہ سے ملک میں آفت برپا تھی ۔ یہاں تک کہ پال خاندان کو بنگال میں عروج حاصل ہوا ۔ اس خاندان کا نام پال اس لئے ہوا کہ ہر ایک فرمانروا نے اس لفظ کو اپنے نام کا دوسرا جز قرار دے لیا تھا ۔ پال کے حقیقی معنی محافظ یا نگہبان کے ہوتے ہیں ۔ اس خاندان کی اصل اور تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا ۔ اتنا معلوم ہے کہ اس کا پہلا فرمانروا گوپال تھا ۔ جس نے آٹھویں صدی کے وسط میں اپنی حکومت قایم کرلی تھی ۔ مختلف شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اس کو بادشاہت کیلئے منتخب کیا تھا ۔ اس کے حسب نسب کا بھی کچھ پتہ نہیں ۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ وہ برہمن یا چھتری نہیں تھا ۔ اس کی اولاد نے چھتری خاندان کی لڑکیوں سے شادی کرلی تھی ۔ اس خاندان نے چار سو برس تک بنگال پر حکومت کی ۔ ان کے دور حکومت کو بنگال کا سنہرا دور کہا جاتا ہے ۔ اس خاندان کے تمام فرمانروا عام طور پر شایستہ تھے اور علوم و فنون کے دلدادہ اور سر پرست تھے ۔ سب سے بڑھکر یہ کہ وہ بودھمت کے پر جوش پیرو تھے ۔ انہوں نے شمالی ہند کی کشمکش میں صرف نویں صدی سے حصہ لینا شروع کیا تھا مگر انکی یہ شرکت زیادہ دنوں تک قایم نہیں رہی ۔

اس خاندان کے دوسرے فرمانروا دھرمپال نے استقلال حاصل کرلینے کے بعد مغرب کی طرف توجہ کی ۔ اور قنوج کو فتح کیا اور اس کے تخت پر اپنے ایک نامزد کو بٹھادیا ۔ لیکن راجپوتانہ کے گوجروں اور جنوبی ہند کے راشٹرکوٹوں کے سخت مقابلہ کی وجہ سے وہ اور آگے نہیں بڑھ سکا ۔ اس کے بعد

جوحالات ہوے ان کا ہمیں کچھ علم نہیں ہے ، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ چند سال بعد گوجروں نے قنوج پر قبضہ کرلیا تھا ، دھرمپال کا جانشین دیو پال ان سے کچھ دنوں تک لڑتا رہا ، مگر اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی ، کیونکہ تقریباً سنہ ۸۲۰ع کے بعد سے گوجروں کو قنوج پر کامل اقتدار حاصل ہوگیا تھا ، اور پال صرف مشرقی علاقوں پر قابض رہے ، اس سے آگے ان کی حکومت نہیں پھیل سکی ۔

گوجروں کی حکومت کا ذکر سب سے پہلے راجپوتانہ کے جنوب میں ملتا ہے ، ٹھیک طور پر یہ نہیں معلوم کہ کن اسباب کی بنا پر وہ گنگائی میدانوں پر قابض ہوے ، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قنوج کی فتح کے بعد ان کی قوت بہت بڑھ گئی تھی ، چنانچہ اس خاندان کے دو راجہ مہیر بھوج اور مہندر پال اول ، جنہوں نے سنہ ۸۴۰ع سے سنہ ۹۱۰ع تک حکومت کی ، شمالی ہند کے مہاراجہ تسلیم کیے گیے ، سندھ اور بنگال کی ریاست پال کے علاوہ پورے شمالی ہند پر ان کی حکومت تھی ، ان کی تاریخ کے متعلق ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ سرحدوں پر اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں ، کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس سے ان کی ذاتی خصوصیات یا ان کی حکومت کے نظم و نسق پر کچھ روشنی پڑ سکے ، دسویں صدی میں ان کی طاقت پر زوال آگیا ، سنہ ۹۱۶ع میں راٹھوروں نے قنوج پر قبضہ کرلیا مگر آپس کی خاندانی کشمکش کی وجہ سے زیادہ دنوں تک اس پر قابض نہ رہ سکے ، کیونکہ گوجروں نے پھر سے قنوج کو فتح کرلیا ، لیکن اس سے ان کا ٹوٹا ہوا وقار واپس نہیں آسکا ، اور سنہ ۹۵۰ع کے قریب ان کا شاہی اقتدار بالکل ختم ہوگیا ، اور اس صدی کے آخر میں ان کی جگہ مختلف ریاستیں قایم

چوتھی ریاست جنوبی ہند کے راشٹر کوٹوں کی تھی جن کو راٹھور بھی کہا جاتا ہے ، پندرھویں باب میں ہم جنوبی ہند

کی اہم ریاستوں کا ذکر کرچکے ہیں ، شمال میں چالوکیہ اور مشرق میں پلوا ریاست تھی ، ان دونوں کے جنوب میں تین تامل ریاستیں تھیں ، چند برسوں کے بعد چالوکیہ کی دو شاخیں ہوگئیں ، ایک گوداوری کے دہانہ پر بس گئی تھی ، اور گیارھویں صدی تک باقی رہی ، اس نے اقتدار کی کشمکش میں کوئی حصہ نہیں لیا ، البتہ دوسری شاخ نے ڈیڑھ سو سال تک پلوؤں سے لڑائیاں لڑیں ، اور جنوبی ہند کی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور ریاست اسی کی شاخ تھی ، لیکن سنہ ۷۵۰ع کے قریب راٹھوروں کے ایک سردار نے ان کا خاتمہ کردیا ۔

راٹھور کوئی نئی قوم نہیں تھے بلکہ چالوکیوں کے عروج میں آنے سے پہلے بڑی طاقتور قوم بن گئے تھے ، دو سو سال سے زیادہ ان کی قوت قایم رہی ، اس مدت میں وہ عام طور پر پلووں سے ٹکر لیتے رہے ، وہ شمال میں قوت پیدا کرنے کے آرزومند تھے ، چنانچہ اس قوم کی ایک شاخ نے گجرات میں کامیابی حاصل کی اور مالوہ کو فتح کرلیا ، بنگال کے پال اور راجپوتانہ کے گوجران سے مقابلہ کرتے رہے ، اور ایک موقعہ پر راٹھوروں نے قنوج پر قبضہ کرلیا تھا جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے ، راٹھور گوجروں کو اپنا بڑا دشمن تصور کرتے تھے ، اسی لئے انھوں نے سندھ کے عربوں سے محض سیاسی ضرورت کی بناء پر دوستی کی جن کے زبردست دشمن گوجر تھے ، راٹھوروں نے عرب تاجروں کو اپنے ملک میں جگہ دی ، اس وقت عربی ادب میں اس ملک کا ذکر آتا ہے ، اور عرب تاجر اور سیاح اپنے سفرنامہ میں اس قوم کی تعریفیں کرتے لگتے ہیں ، عربی کتابوں میں ان کو بلہارا کے نام سے یاد کیا گیا ہے جو ان کا خاندانی نام تھا ، ایک عرب تاجر سلیمان نے نویں صدی کے وسط میں ایک کتاب لکھی ہے ، جس میں بلہارا کو بغداد ، چین اور قسطنطنیہ کے بعد دنیا کی سب سے بڑی چوتھی سلطنت قرار دیا ہے ، دسویں صدی میں راٹھور قوم کمزور پڑگئی ، اور ان

کی سلطنت کے شمال مشرقی حصہ پر چالوکیہ کے ایک نئے خاندان کا قبضہ ہوگیا۔

ساتویں صدی میں جنوبی ہند کی سب سے زیادہ طاقتور ریاست پلووں کی تھی، چونکہ ایک طرف چالوکیوں اور راٹھوروں سے اور دوسری طرف تامل ریاستوں سے ان کی لڑائی رہتی تھی، اس لئے بہت جلد ان کی ریاست پر بھی زوال آگیا، اور سنہ ۹۰۰ع کے قریب اس پر چولا خاندان کا قبضہ ہوگیا۔

جنوبی ہند کی تین تامل ریاستوں میں کیرلا دسویں صدی کے خاتمہ تک باقی رہی، اس کے بعد چولا خاندان نے اس پر قبضہ کرلیا، آگے جنوب میں پانڈیہ کی ریاست ساتویں صدی سے لیکر نویں صدی تک بہت مستحکم رہی، ان کی لڑائیاں اکثر پلوا، کیرلا اور سیلون کی ریاستوں سے ہوا کرتی تھیں، اس دور میں چولا ریاست کو بڑا عروج حاصل ہوا، ایک زمانہ تک وہ پلووں اور پانڈیوں کے نرغہ میں تھی، مگر نویں صدی سے لیکر ان کی طاقت بڑھنے لگی، ان میں راج راجہ شاہی ایک زبردست فاتح پیدا ہوا، جس نے یکے بعد دیگرے کیرلا، پانڈیہ اور مشرقی چالوکیہ کو نیچا دکھایا، اندرون ملک کے مختلف قبائل کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا اور کلنگا اور سیلون کی ریاستوں کو کچل کر رکھدیا، اسطرح گیارھویں صدی میں چولا خاندان کی معمولی ریاست ایک زبردست سلطنت بن گئی تھی، اس کا اقتدار پورے جنوبی ہند پر قائم ہوگیا تھا، جہاں تک ہم جانتے ہیں، اس سے پہلے کسی کو جنوبی میں اتنی قوت نہیں حاصل ہوی تھی۔

اس مختصر تشریح سے واضح ہوگیا ہوگا کہ دسویں صدی کے خاتمہ پر شمالی ہند میں کوئی ایسی طاقتور سلطنت نہ تھی جو شمال مغربی حملہ آوروں کو روک سکے، صرف جنوبی ہند کی چولا ریاست ان کا مقابلہ کرسکتی تھی، مگر وہ خطرہ کی جگہ سے بہت دور واقع ہوی تھی، اس کے علاوہ اس

کو شمالی هند کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی ' تیرہ سو سال پہلے موریہ خاندان کے بانی چندر گپت نے بہار سے نکل کر کامیابی کے ساتھ سلوکس اول کا مقابلہ کیا تھا ' اب شمالی هند میں اس قسم کا کوئی طاقت ور بادشاہ نہ تھا ' صرف چند آزاد ریاستیں تھیں جن کے درمیان آپس میں سخت اختلاف تھا ' ان میں سے کسی میں اتنی اهلیت نہیں تھی کہ اس اختلاف کو پاٹ کر عام دشمن کے خلاف تمام ریاستوں کو ایک مرکز پر جمع کرسکے ' بس پھر کیا تھا هند کے دروازے بیرونی حملہ آوروں کیلئے کھلے پڑے تھے .

بڑی نا انصافی هوگی اگر هم اس باب کو ان محققین کی تعریف کے بغیر ختم کردیں جن کی انتھک کوششوں نے هم کو اس درجہ قابل بنایا کہ اس دور کی مجمل تاریخ مرتب کرسکیں ' ورنہ اس سے پہلے اور راجہ هرش کے بعد کی تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا هوا تھا ' ان محققین نے مختلف کتبوں کو حل کیے اور هر ایک کی تشریح کی ' جس سے اس دور کی تاریخ کے مرتب کرنے میں بڑی آسانی پیدا هوگئی ' ظاهر هے کہ کتبوں کا پڑھنا اور ان کا حل کرنا کچھ آسان نہیں هے ' کیونکہ انکے معنے کتبوں پر لکھے هوے نہیں هوتے ' برسوں محنت کرنی پڑی هے جب جاکر انکو حل کیا گیا هے ' بسا اوقات اگلے محققین کی تعبیروں کو غلط قرار دینا پڑا ' نئے اکتشافات کی روشنی میں هند کے محقق تمام کتبوں کو نئے سرے سے جانچنے لگے هیں ' اگرچہ یہ کام تکمیل کو نہیں پہنچا ' تاهم ملک کے اهم حصوں کی تاریخ روشن اور واضح هوگئی هے ' اس مختصر کتاب میں اس پر تفصیلی بحث نہیں کی جاسکتی ' همارا فرض هے کہ هم ان نئے اکتشافات کی قدر و قیمت کو تسلیم کریں .

باب ۱۸

دسویں صدی میں ہند کی حالت

گذشتہ باب میں ہم نے دسویں صدی کے آخر تک کی ہند کی سیاسی حالت پر ایک عام تبصرہ کیا ہے، اس باب میں ہم اس دور کے تمدن کا ایک خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں، اس زمانہ کی کتابوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ گپت خاندان کے بعد سے ہندی دماغ نے کوئی تخلیقی کارنامہ نہیں پیش کیا، اس دور میں نئے خیالات یا نئے نظریات کا وجود نہیں ملتا، پرانے خیالات و نظریات ہی کی مزید توضیح و تشریح اور تقسیم و ترتیب کی گئی ہے، زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق تفصیلی قوانین مرتب کیے گئے ہیں، اس میں شک نہیں کہ عام لوگ ان کو قبول کرنے کی طرف ضرور مائل تھے، مگر یہ سوال اب بھی باقی رہ جاتا ہے کہ آیا ان پر کبھی عمل بھی ہوسکا، ممکن ہے کہ بعض نظریات کی تشریح ایسے لوگوں نے کی ہو جن کا خود اس پر عمل نہیں تھا، اس لئے جہاں تک ممکن ہو دوسرے ذرایع سے ان کی جانچ پڑتال کرلینی چاہئے.

سیاسی حیثیت سے بادشاہ کا درجہ سب سے اونچا تھا، پہاڑوں اور جنگلوں میں بہت سے آزاد قبیلے رہا کرتے تھے، جن کا کوئی اثر ملک کی عام زندگی پر نہیں پڑسکا، بادشاہت موروثی خیال کی جاتی تھی، اور عام طور پر سب سے بڑا بیٹا باپ کا جانشین ہوتا تھا مگر یہ دعوی کرنا قبل از وقت ہوگا کہ بڑے بیٹے کی ولی عہدی کے اصول کو ہر جگہ مان لیا گیا تھا، بہت سے بادشاہوں نے اپنی زندگی میں ولی عہد کو نامزد کردیا تھا، کتابوں میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ایک ولی عہد نابالغ یا ناقابل ہونے کی وجہ سے بادشاہ نہیں بنایا گیا اور ایک

قابل ترین شخص اس کی جگہ پر بادشاہ بنا زیادہ امکانی نظریہ یہ ہے کہ جانشینی کا کوئی غیر متبدل اصول اب تک نہیں بن سکا تھا ۔

لوگوں میں عام تخیل یہ تھا کہ ایک سلطنت ایسی ہونی چاہئے جو پورے ہند کو گھیرے ہوئے ہو اور اس کے ماتحت مختلف ریاستیں ہوں ' اس زمانہ میں صلح و آشتی کے حصول کا کوئی طریقہ کار نہیں تھا ' کسی ایسی شہادت کا پیش کرنا مشکل ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ مختلف ریستوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنا اس دور کے لوگوں کا نصب العین تھا ۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بادشاہ اپنے ہمسایہ کا دشمن اور اجنبیوں کا حلیف ہوتا ہے ' اس کی وجہ سے سیاسی چالبازیوں کو بڑا فروغ ہوا ' اور اس سلسلہ میں اخلاقی اصول کی بھی کوئی پروا نہیں کی گئی ' مگر اس کے متعلق ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم اس نظریہ کی جانچ پرتال کرسکیں ۔

اس زمانہ کے فنون جنگ کے متعلق خوش قسمتی سے ہمارے پاس ان لڑائیوں کی رودادیں ہیں جو آٹھویں صدی میں عربوں کے ساتھ اور گیارھویں صدی میں ترکوں کے ساتھ لڑی گئیں ' ان سے شمالی ہند کے طریقہ جنگ کا اندازہ ہوتا ہے ' ہندی لشکر میں سب سے پہلے ہاتھیوں کی صف ہوتی تھی ' جن کے پیچھے پیادہ ہوتے تھے ' تیر اندازوں کی جماعت ان دونوں کے بیچ میں ہوتی تھی ' دونوں بازووں پر سوار رہتے تھے جن کے ساتھ رتھ بھی لگے رہتے تھے ' اس قسم کی صف بندی عربوں اور ترکوں کیلئے بڑے ہی اضطراب کا باعث ہوتی تھی ' ان لڑائیوں میں جنگی رتھوں یا گاڑیوں کا ذکر نہیں ملتا ' حقیقت میں یہ آریہ قوم کا ایک جنگی ہتھیار تھا جواب متروک ہوچکا تھا ' ہندی جنگجوئی کی ایک نمایاں خصوصیت ہاتھیوں کا وجود ہے ' یہ مضبوط متحرک مورچے تھے جن کی آڑ میں تیر انداز اور

گولنداز دشمن پر تیروں اور گولوں کی بارش برساتے تھے ۔ مگر ان ہاتھیوں کے ثبات قدم کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔ اور جب کبھی دشمن کی مار سے مجبور ہوکر پلٹ پڑتے تو بسا اوقات ان کے پیچھے رہنے والے پیادے پامال ہوجاتے تھے ۔ اور جب ایک مرتبہ یہ مضبوط صف ٹوٹ جاتی تو دشمن اپنی پوری قوت اور تیزی کے ساتھ ہندی فوجوں پر ٹوٹ پڑتا تھا ۔ ہر ایک عرب اور ترک سپہ سالار کا اولین حربہ ان ہاتھیوں کو خوفزدہ کرکے بھگانا ہوتا تھا ۔ گولہ بارود کی ایجاد تک ہندی جنگجوئی کا تقریبا یہی طریقہ رہا ۔ اس نئی ایجاد نے ہاتھیوں کی طاقت کو بیکار کردیا ۔ منفردانہ لڑائیوں کا دستور بھی تھا ۔ جب کوئی بادشاہ میدان جنگ میں قتل ہو جاتا یا غایب ہوجاتا تو اسکی فوج بھاگ کھڑی ہوتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ سنہ ۷۱۲ع میں سندھ کی لڑائی میں راجہ داھر کے قتل سے اس کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی ۔ اسی طرح سنہ ۱۰۰۱ع میں جب محمود غزنوی کے دشمن کا ہاتھی بھاگ نکلا تو اس کو مسلمانوں کی فتح سمجھ لی گئی ۔ اس لئے ہر ایک لڑائی میں جنگ جیتنے کیلئے سب سے پہلے دشمن کے بادشاہ یا سپہ سالار کو قتل کرنے یا میدان جنگ سے اس کو بھگانے کی کوشش کی جاتی تھی ۔

ہندو راجاؤں کے پاس عام طور پر مستقل فوج ہوتی تھی ۔ امن کے زمانہ میں بھی فوج کو تربیت دی جاتی تھی اور ان کو تنخواہیں ملتی تھیں ۔ جنگ کے زمانہ میں اپنی رعایا سے یا وحشی قبیلوں سے مزید فوج کی بھرتی کی جاتی تھی ۔ ظن غالب یہ ہے کہ راجپوت راجہ اپنی ہی قوم کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرتے تھے ۔ کیونکہ نسلی تعلقات کی بناء پر ان سے وفاداری کی امید کی جاسکتی تھی ۔ دوسری ریاستوں میں غیر قوم کے افراد بھی فوج میں لے لیے جاتے تھے یہ واقعہ ہے کہ ابتدائی ترک حملہ آوروں کی فوج میں ہندی سپاہی بھی شامل تھے ۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ بعض جنگجو

قوموں نے لڑائی کو اپنا ایک مستقل پیشہ بنالیا تھا ، پورے اسلامی دور میں ایسے ہی پیشہور فوجی لوگ مسلمان بادشاہوں کا دست و بازو بنے ہوے تھے .

اس زمانہ میں قانون سازی کا رواج نہ تھا ، تمام قانونی ضابطے مذہبی کتابوں پر مبنی تھے ، یہ در حقیقت ان کتابوں کے شروح تھے ، آجکل کی طرح یہ بادشاہ یا وزیر یا مجلس قانون ساز کے بنائے ہوے نہیں تھے ، مذہبی کتابوں کے شارحین کا اولین مقصد یہ ہوتا تھا کہ وقت کے عام دستوروں کے متعلق ایک ضابطہ تیار کیا جائے ، اور ان کو شاہی یا پروہتی احکام کے ساتھ تطبیق دی جائے ، ظاہر ہے کہ ماحول کے اثر سے ان کے نظریوں میں اختلاف کا پیدا ہونا لازمی تھا ، ان ضابطوں کی مقبولیت ہرجگہ مختلف رہی ، نجی حقوق اور فرائض کے متعلق بہت زیادہ اختلافات تھے ، لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان ضابطوں کی عزت اور قدر لوگوں کے دلوں میں بڑھتی گئی ، مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ کسی ظالم راجہ کے زمانہ میں لوگ اس کے احکام کو ٹھکراکر ان ہی ضابطوں پر عمل کرتے رہے .

شمالی اور جنوبی ہند دونوں جگہ پر حکومت کا باقاعدہ نظام تھا ، دارالسلطنت میں رہکر وزیر بادشاہوں سے احکام لیتے تھے اور مختلف ضلعوں اور تعلقوں کے حکام کے ذریعے دیہات کے لوگوں تک ان احکام کو پہنچاتے تھے ، بہت سی شہادتوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ جنوبی ہند کی تامل ریاستوں کے ہر ایک دیہات میں پنچایت تھی جس میں دیہات کے مرد لوگ جمع ہوتے تھے ، اور مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ذریعہ زراعتی زمینوں کی آب پاشی اور مقامی سڑکوں کی اصلاح کا انتظام کرتے تھے ، نیز پولیس کی رہنمائی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ ان ہی کے ذمہ تھا ، اور بادشاہ سے اجازت لیکر وہ سخت قسم کی سزائیں کے جاری کرنے کے بھی مجاز تھے ، کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیہات کے حکام اور پنچایتوں میں پورا اتحاد

اور اتفاق تھا ' بلکہ ان کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکام کی مداخلت کے بغیر دیہاتی لوگ اپنے کام خودھی انجام دے لیا کرتے تھے . *

ہمارے پاس کوئی واضح شہادت اس بات کی نہیں ہے کہ شمالی ھند میں بھی پنچایتوں کا دستور تھا ' قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سرکاری حکام دیہات کے چودھریوں اور مقدموں کے ذریعہ تمام امور کا انتظام کرتے تھے ' یہ نہیں معلوم کہ چودھریوں کے انتخاب کا کیا طریقہ تھا ' ظن غالب یہ ہے کہ کاشتکار اپنی برادری میں سے کسی ایک کو اپنا بڑا تسلیم کرلیتے تھے : اسکے بعد اسکی اولاد بھی چودھری کہلاتی تھی ' اسکا کچھ پتہ نہیں ہے کہ مقامی امور یا مقدمات جرائم کے فیصلہ کرنے میں چودھری کے کیا اختیارات تھے ' غالب گمان یہ ہے کہ چودھری اور اسکی پوری برادری کو وسیع اختیارات حاصل تھے ' تا وقتیکہ شاہی احکام سے انکی خلاف ورزی یا سرتابی ثابت نہ ہو ' مگر ابھی اس نظریہ کے ثبوت کیلئے کافی شہادتوں کی ضرورت ہے .

دسویں صدی کے آخر میں پورے ھند کے اندر ھندومت غالب تھا ' اسکے علاوہ مظاہر پرستوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی ' جین مت اور بودھمت بھی اپنی اپنی جگہ پر باقی تھا ' بہت سے عیسائی مسلمان ' یہودی اور پارسی بھی آکر بس گئے تھے ' وحشی قبائل آجکل کی طرح بلاشبہ مظاہر پرست تھے ' مگر ھند کے تمدن پر انکا کوئی اثر نہیں پڑا ' عیسائیوں کی تعداد بہت کم تھی ' یہ تمام تر جنوبی ھند کے مغربی ساحل پر آباد تھے ' مسلمان صرف سندھ میں تھے ' مختلف بندرگاہوں میں مسلمان تاجروں

---

* عام طور پر یہی تسلیم کیا جاتا ہے ، لیکن ڈاکٹر اے ۔ اپادرے نے حال میں اپنی کتاب اکنامک کنڈیشنز ان سدرن انڈیا (مطبوعہ مدراس ۱۹۳٦) میں صفحہ ۱۳۵ پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ پنچایتیں ہر ایک دیہات میں نہیں تھیں ، بلکہ بعض دیہات میں پائی جاتی تھیں ، اور یہاں بھی شمالی ھند کے طریقہ پر حکومت کی جاتی تھی ، اس مسئلہ کا تصفیہ کرنے کیلئے پہلے سے کتبوں کو پڑھنے اور حل کرنے کی ضرورت ہے .

کی ایک مختصر تعداد تھی ' مگر تمدنی لحاظ سے انکا وجود بالکل غیر اہم تھا ' پارسی مغربی ساحل پر بس گئے تھے ' انکے متعلق دوسرے باب میں بحث کی جاڈیگی ' یہودی چند صدیوں سے مالابار میں مقیم ہوگئے تھے ' جین مت کے پیرو زیادہ تر وسط ہند میں آباد تھے ' اور بودھ مت کے پیرووں کی ایک بڑی تعداد بہار اور بنگال میں موجود تھی ۔

بعض پرانی کتابوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ بودھ مت کے پیرووں کو بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ ختم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اسکے متعلق کوئی قطعی ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا اس سلسلہ میں ہماری معلومات غیر مکمل ہیں ۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض بعض جگہوں پر خاص مذہبی عقاید و خیالات کی بناء پر ظلم و ستم کیا جاتا تھا مگر اس سے عام نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ بودھمت کو باقاعدہ ختم کرنیکی کوشش کی گئی تھی ۔ اسکے بر خلاف شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ بودھمت کے پیرو ہندو ہوگئے تھے ' پہلے بتایا جاچکا ہے کہ بودھمت کی ابتدائی تعلیمات میں دیوتاؤں اور پروہتوں کا مطلق انکار کیا گیا تھا ۔ مگر چند صدیوں کے بعد گوتم بودھ کو خدا مان لیا گیا جسکو اسمانی فرشتے ہر طرفسے گھیرے رہتے ہیں ' اور پوجا کے لئے پروہتوں اور راہبوں کا وجود بھی لازمی قرار دیا گیا تھا ' اس درمیان میں ہندومت میں ایک خداے اکبر کا تصور ترقی کرتا گیا اب لوگوں کے سامنے بودھ مت ' شیو اور وشنو کے تین راستے تھے ' ان میں سے جس کسی کی چاہے وہ پیروی کرسکتے تھے ' مگر تینوں میں پوجا کے رسوم ایک ہی قسم کے تھے ' بودھمت کے پیرووں کے سامنے گوتم بودھ کا مجسمہ تھا جس کے اطراف فرشتوں کی مورتیاں تھیں ' لیکن ایک عام آدمی ان کو شیو یا وشنو اور دوسرے دیوتاؤں سے تمیز نہیں کر سکتا تھا ۔ وہ بسا اوقات گوتم بودھ کو بھی شیو یا وشنو کا اوتار سمجھتا تھا ' اس لحاظ سے گوتم بودھ کی حیثیت رام یا کرشن کی سی ہوگئی تھی ۔

یہ تینوں مذہب حقیقت کے لحاظ سے ایک تھے ، ہر ایک مذہب سے عوام کے مذہبی جذبہ کی تسکین ہو جاتی تھی ، اب ہر ایک کی ترقی کا دار مدار زیادہ تر زمانہ کے مذاق اور لوگوں کی سر پرستی پر تھا ، ابتدا میں شمالی اور جنوبی ہند دونوں جگہوں پر بودھ مت کو بہت سے طاقتور حکمرانوں کی سر پرستی نصیب تھی ، اور ہم جانتے ہیں کہ ہرش کے زمانہ حکومت میں بودھ راہبوں کی ایک بڑی تعداد آکر قنوج میں آباد ہوگئی تھی ، ہرش کے بعد پال خاندان کے سوا کسی نے بودھ مت کی سر پرستی نہیں کی ، اس لئے بودھ مت کے راہبوں نے اور مقامات کو چھوڑ کر بنگال اور بہار ہی کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا کیونکہ یہاں پال خاندان کی سر پرستی حاصل تھی ، ملک کے بقیہ حصوں میں راجپوتوں کا راج تھا جو ہندومت کے پیرو تھے ، ان کے اثر اور رسوخ کی وجہ سے ملک کے تمام حصوں میں ہندومت غالب ہوگیا ۔

اس دور کی کتابوں میں ایک عام رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ بادشاہوں کے اقتدار کو خدائی اقتدار کا درجہ دیا جائے ، وہ انسانی شکل میں زبردست دیوتا تھے ، ان کا نسب نامہ بڑے بڑے دیوتاؤں سے ملایا جاتا تھا ، ان کے برھمن وزیر بھی اپنی قوت اور طاقت کے بڑھانے کیلئے دیوتاؤں سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے تھے ، اس قسم کے نظریوں کی بودھ مت سے زیادہ ہندومت میں کھپت تھی ، اس لئے وہ بادشاہ اور وزیر جو اپنے اقتدار کو بڑھانا چاہتے تھے ، قدرتی طور پر بودھ مت کی بجائے ہندومت کی سر پرستی کرتے تھے ۔

بودھ مت کے زوال کا ایک اور سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے معتقد اور پیرو اپنی بلند ترین اخلاقی صفات کھوچکے تھے ، ابتدا ہی سے مردوں کے ساتھ عورتیں بھی راہب بن گئی تھیں ، ایک عورت کیلئے یہ آسان ہے کہ گرھستی کی پابندیوں کو توڑکر آزادانہ زندگی بسر کرے ، مگر اس کی وجہ

سے سماجی زندگی میں بڑی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں ، ممکن ہے کہ اس دستور کی وجہ سے بدی جس کی بودھمت نے اجازت دی تھی ، لوگ اس کے مخالف ہوتے چلے گئے ہوں ۔

اس زمانہ کے حالات کا بھی تقاضا یہی تھا کہ عام لوگوں میں بودھمت کی بجائے ہندومت کو فروغ حاصل ہو ، عوام صرف چند مذہبی رسوم کے پابند تھے ، اور یہ رسوم دونوں مذہبوں میں پائے جاتے تھے اس لئے ان کے لئے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا ، عالی دماغ اور تعلیم یافتہ لوگ مادہ اور شخصیت جیسے عالمگیر مسایل کی تحقیق و تدقیق میں لگے ہوے تھے ، ان کے پاس مذاہب کے فروعی اختلافات کی کوئی اہمیت نہیں تھی ، البتہ بعض لوگ عوام کی روز مرہ ضروریات زندگی کا احساس رکھتے تھے ، اور ان کی مشکلات کے حل کرنے میں اپنی پوری طاقت اور قوت صرف کررہے تھے ، چنانچہ نویں صدی میں شنکر آچاریہ نے ہندووں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ، وہ مسئلۂ وحدۃ الوجود کا زبردست حامی اور طرفدار تھا ، اس نے ہندومت ہی کے اصول پر عملی زندگی کا ڈھانچہ تیار کیا اور آگے چلکر ایک نئے فرقہ کا بانی بن بیٹھا ، اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت ہندووں میں عالی دماغوں کی کثرت تھی ، جن کا عوام پر اثر پڑنا لازمی تھا ۔

ان تمام وجوہ کی بناء پر بنگال اور بہار کے علاوہ باقی تمام جگہوں میں ہندومت پھیل گیا ، اس میں ایک شخصی خدا کا تخیل بھی ترقی کرگیا تھا ، جس کا تعلق براہ راست انسان کی ذات سے ہوتا ہے ، اس تعلق کی نوعیت کو اس زمانہ کے بعض بہترین مفکرین نے مسئلۂ بھکتی کی شکل میں سمجھانے کی کوشش کی ہے ، ہماری اصطلاح میں اس کو لطف و محبت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ، اس مسئلہ کا پہلا علمبردار رامانج تھا جو تامل دیس کا رہنے والا تھا ، وہ بارھویں صدی کا ایک زبردست مفکر تھا ، بعض کا خیال ہے کہ اس نے جنوب مغربی

ساحل کے عیسائیوں سے اس مسئلہ کی تعلیم حاصل کی تھی ' لیکن بنیادی تصور اُن سے بھی بہت پہلے کا ہے ' کیونکہ مہابھارت کے مشہور حصہ بھگوت گیتا میں اس کا ذکر آتا ہے ' گپت خاندان کے دور میں یہ مسئلہ موجود تھا ' اور حضرت عیسی کی پیدائش سے پیشتر کی کتابوں میں اس کی پرچھائیاں پائی جاتی ہیں ' اور بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ رگ وید میں اس مسئلہ کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں ' اس کے علاوہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ رامانج عیسائیوں کے ساتھ شخصی میل جول رکھتا تھا ' البتہ ہم یہ قیاس کرسکتے ہیں کہ اس زمانہ کے عیسائیوں سے وہ کبھی کبھی ملتا رہا ہوگا ' اور ان سے ملنے کے بعد اُس کے خیالات میں ترقی ہوی ہوگی ' مگر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بنیادی خیال کی ابتدا اور نشو و نما ہند ہی میں ہوی تھی ' اس مسئلہ کی ترقی یافتہ صورت کا ذکر آئندہ بابوں میں ہوگا ' اس وقت اس مسئلہ کی وہ شکل پیش کرنی ہے جس کی تبلیغ خود رامانج کرتا تھا ' اس مسئلہ کے تین پہلو ہیں ' سب سے پہلے یہ کہ ایک ازلی و ابدی ہستی موجود ہے جو اپنی عمدہ صفات میں غیر محدود واقع ہوی ہے ' دوسرا یہ ہے کہ اس کو اپنی مخلوق کے ساتھ اتنی محبت ہے کہ لوگوں کو گناہ اور دکھ درد سے بچانے کے لئے مختلف مقدس شکلوں میں مجسم ہوکر ان کے سامنے آتی ہے ' اور اُن کو اپنی ہستی کے ساتھ ضم ہوجانے کی دعوت دیتی ہے ' تیسرا یہ کہ ہر ایک ملتجی اور متضرع چاہے وہ کسی نسل یا پیشہ کا ہو خدا تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ بے خود ہوکر پوری محبت کے ساتھ خدا کی عبادت کرے * ' یہ در حقیقت لطف و محبت کا زبردست مظاہرہ ہے ' خدا اپنے بندوں سے لطف و کرم کی صورت میں اظہار محبت کرتا ہے اور بندے عبادت کے ذریعے خدا سے اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہیں ۔

---

* دیکھو ڈاکٹر ایل ۔ ڈی برنٹ کی کتاب دی ہارٹ آف انڈیا (مطبوعہ لندن ۱۹۱۳) صفحہ ۲۲ اور ۸۰ ۔

یہ ازلی وابدی ہستی رامانج کے نزدیک وشنو تھی ، بعد میں شیو کو بھی ازلی وابدی قرار دیا گیا ، شیو کے پرستاروں کا خیال تھا کہ ہر ایک انسانی روح تین آفتوں میں گرفتار رہتی ہے ، یعنی جہالت ، مایا اور کرما ، لیکن خدا اپنے لطف و کرم سے یہ چاہتا ہے کہ انسانی روح کو نجات ملے اور وہ ہمیشہ اس کی معیت میں رہے ، چنانچہ وہ انسانوں کے جسم میں اس روح کو پھونکتا ہے اور اسکو مختلف آزمائشوں میں ڈالتا ہے تاکہ اس روح کی اچھی تربیت ہو ، اور اس کو نجات مل سکے ، اور جب بھلائیاں اور برائیاں برابر ہوجاتی ہیں تو مایا اور کرما دور ہو جاتے ہیں ، اور انسانی روح مادی جسم سے نکل کر خدا کی ذات میں جذب ہو جاتی ہے ، اس دور میں ہندوؤں کے خیالات اسی قسم کے ڈھرے پر ترقی کرتے ہوئے جارہے تھے ۔

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ اس دور کے تمام ہندو بھکتی کے عقیدے کو عام طور پر مان چکے تھے ، یہ عقیدہ تو قایم ہوچکا تھا ، مگر وسیع پیمانہ پر اس کی زور دار تبلیغ نہیں ہوتی تھی ، عام لوگ زیادہ تر بھینٹ چڑھاکر دیوتاؤں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ ان کا اعتماد پروہتوں کے طلسماتی منتروں پر تھا ، مگر کچھ لوگ اس سے بہتر حالت کے متلاشی تھے ، چند صدیوں کے بعد جب اس مسئلہ کی پر زور تبلیغ کی گئی تو لوگوں کی ایک حد تک تشفی ہوگئی ۔

اس دور کا ادب تخلیقی نہیں بلکہ انضباطی تھا ، سنسکرت زبان میں بہترین کتابیں لکھی گئیں مگر ان کے طرز ادا اور اسلوب میں بناوٹ ، تقلید ، لفاظی اور اپچ زیادہ تھی ، مادری زبانوں میں مختلف کتابیں لکھی جارہی تھیں ، لیکن چونکہ ان کا بہت کم حصہ اب باقی رہ گیا ہے ، اس لئے ان کے متعلق کوئی رائے قایم نہیں کی جاسکتی ، اس دور کی مصوری کے نمونے دستیاب نہیں ہوتے ، اس لئے ان کے متعلق بھی کوئی واضح بیان نہیں دیا

جاسکتا ، تاهم یه یقین هے که مصوری بهی نقاشی اور سنگ تراشی کے برابر ترقی کررهی تهی ، اس دور کی نقاشی میں ایک اهم فرق پیدا هوگیا تها ، دور اول کی نقاشی میں بقول سرجان مارشل * تصنع اور عینیت نہیں تهی ، بودهمت اور جین مت کے مختلف پہلووں کو ساده مگر پر اثر طریقه پر نمایاں کیا جاتا تها مگر گپت دور کے بعد مذهبی عقاید و خیالات کو نقاشی کے ذریعه مجسم کرنے کی کوشش کی گئی ، اس کے جمالیاتی فائده کے متعلق لوگوں کا اختلاف هے ، بعض ناقدین اس کو فن نقاشی کی ترقی قرار دیتے هیں ، اور بعض کا یه خیال هے که اس میں سادگی اور حقیقت کو قربان کردیا گیا هے ، ان دونوں نظریوں کے درمیان فیصله کرنا همارا کام نہیں هے .

اس دور میں فن تعمیر نے اتنی بڑی ترقی کی که اگر اس کو مندروں کی تعمیر کا شاندار دور کہا جائے تو کچھ بے جانه هوگا ، ان میں زیب و زینت اور نقش و نگار زیاده هے ، اس کی وجه سے بعض مغربی ناقدین نے اس کی افادیت سے انکار کیا هے ، ان کا کہنا یه هے که غیر معمولی نقش و نگار کی وجه سے بنیادی خوبیاں گم هوگئی هیں ، تاهم اس بات پر سب کا اتفاق هے که صفائی اور مضبوطی میں اس دور کے مندروں کو دوسروں پر فضیلت حاصل هے ، یه مندر زیاده تر ان جگهوں پر واقع هیں جو بت شکن مسلمانوں کی پہنچ سے بہت دور تهے ، انتهائی شمال میں مرتنڈ کا مندر آٹهویں صدی کے کشمیری راجاؤں کی یاد تازه کرتا هے ، کهجوراهو کے مندر دسویں اور گیارهویں صدی میں بندیلکهنڈ کے چنڈل راجاؤں نے بنائے تهے ، جنوبی هند میں ایلورا کا کیلاس مندر راٹهور حکومت کی یادگار هے ، کنجی ورم کے مندر

---

* کیمبرج هسٹری جلد اول صفحه ٦٤٢ - برطانوی عجائب خانه کی سیڑهیوں پر دوسری اور تیسری صدی کے امراوتی کے نمونوں کی نمائش کی گئی هے ، اور اندر دو کمروں میں هندومت اور بوده مت کے نمونے رکهے گئے هیں ، ان دونوں کا موازنه کرنے سے دور اول کی نقاشی کا دوسرے دور سے فرق بالکل نمایاں هوجاتا هے .

پلوا خاندان کی عظمت و جبروت کی یاد دلاتے ہیں ' اور تنجاور کے مندر چولا خاندان کے شاندار دور کی تاریخ پیش کر رہے ہیں ' زمانہ اور انسان کی تباہ کاریوں کے بعد بھی ان مندروں کا اس وقت باقی رہ جانا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس زمانہ میں ہندوؤں کے پاس نہ صرف دولت تھی بلکہ بہترین مذاق اور کامل مہارت کے بھی وہ مالک تھے .

اس دور کے معاشرتی حالات کے متعلق ہماری معلومات ابھی ناکافی ہیں ' تاہم یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ذات پات کی بندھنیں پہلے سے زیادہ مضبوط ہوگئی تھیں ' اس کی ایک وجہ بودھمت کا زوال اور ہندومت کی ترقی ہے ' بودھمت ذات پات کی بندھنوں کو توڑنا چاہتا تھا مگر اس میں اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوی ' اس دور کی زندگی کے متعلق ہماری معلومات کا ذریعہ سنسکرت کی ایک کتاب کتھاسرت ساگر * (کہانیوں کا سمندر) ہے جو گیارھویں صدی میں کشمیر میں تصنیف کی گئی تھی ' اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ ذات پات کی بندھنیں سخت ہو چلی تھیں تاہم بعد کے زمانوں کی طرح کی شدت نہیں برتی جاتی تھی ' اس زمانہ میں آجکل کی طرح ایک خاندان کی مختلف شاخوں کے درمیان شادی بیاہ ممنوع نہیں تھا ' لوگ بعض وقت ایک نیچ طبقہ کی لڑکی سے شادی کرلیتے تھے ' برھمن مختلف پیشے اختیار کرسکتے تھے ' تاجر سمندر کا سفر کرتے تھے ' جس کا آج سے ایک سو سال پہلے خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا .

اس زمانہ کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں ' تاہم اونچی ذات کی عورتیں گوشہ تنہائی میں رہنے کی عادی تھیں ' بعض لوگوں کے ہاں پردہ کا رواج تھا ' کیونکہ ایک روایت میں اس کا مذاق اڑایا گیا ہے ' کثرت ازدواج کو اصولا مان لیا گیا تھا '

* اس کا ترجمہ سی . ایچ ٹانی نے کیا ہے ' جس کو این ایم پنزر نے ۲۸ - ۱۹۲۴ء میں لندن سے شایع کیا ہے ؛

زیادہ تر شاہی خاندان کے لوگ ایک سے زیادہ شادیاں کرتے تھے ' عوام خرچ و اخراجات کی زیادتی کی بناء پر عموما ایک ہی شادی پر اکتفا کرتے تھے ' بچپن کی شادیوں کا رواج تھا ' اور بعض اوقات اس کی ترغیب بھی دلائی جاتی تھی ' مگر اس پر کبھی عمل نہیں کیا گیا ' ستی کی رسم بھی جاری تھی مگر عورت کو مجبور نہیں کیا جاتا تھا ' بیواؤں کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت تھی ' گانا بجانا اور ناچنا عورتوں کا محبوب تفریحی مشغلہ تھا ' شاہی محلوں میں تصویر گھر یا نگارخانے ہوتے تھے ' لوگ شایستہ زندگی کے گذارنے کے عادی تھے۔

شمالی ہند کے لوگ زیادہ تر سبزی خور تھے ' بعض گوشت بھی کھایا کرتے تھے ' مگر گائے کا گوشت کوئی بھی نہیں کھاتا تھا ' شراب بھی استعمال کی جاتی تھی ' کہانیوں میں بد مست شرابیوں کا ذکر آتا ہے ' پان کھانے کا بھی رواج تھا ' افیم یا نشہ والی چیزوں کے استعمال کی عادت نہیں تھی ' یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہند میں ان کا رواج کب سے ہوا ' تمباکو نوشی کا بھی کہیں ذکر نہیں ملتا ' غالبا تمباکو کی دریافت کے بعد سولہویں صدی سے اس کی ابتدا ہوی ہے۔

ملک کی اقتصادی حالت کےمتعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں ' مگر یہ ظاہر ہے کہ ملک کی آمدنی کا انحصار یہاں کے کاشت کاروں پر تھا ' عموما چاول ' گیہوں ' جو ' باجرا ' دال ' تیل کے بیج ' گنے ' روئی اور چھال کے درختوں کی کاشت ہوتی تھی ' یہ نہیں معلوم کہ اس زمانے میں کاشتکاروں کی حالت بہتر تھی ' یا بدتر ' کاشتکاروں کی سب سے بڑی دشمن خشک سالی تھی ' کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ قحط ہوتا تھا ' جنوبی ہند کی طرح شمالی ہند میں بھی آب رسانی اور آب پاشی کے ذریعوں کو پیدا کرنا بڑے ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا ' کاشتکاروں کی حیثیت انکی مالگذاری کے مقدار سے لگائی جاتی تھی ' ہم کو یہ نہیں معلوم کہ پیداوار کا کتنا حصہ بطور مالگذاری کے ادا کیا جاتا تھا ' عام روایت کے

مطابق مالگذاری کی شرح پیداوار کا چھٹا حصہ ہوتی تھی ، مگر ضرورت کے وقت اس شرح کو بڑھا دیا جاتا تھا ، اور اس بات کی شہادت موجود ہے کہ مالگذاری کے علاوہ دوسرے قسم کے محصول بھی عاید کیے جاتے تھے ، جنوبی ہند کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مالگذاری کی شرح معمول سے بھی کچھ زیادہ ہوتی تھی ، لیکن اس قسم کے عام نتائج نکالنے کے لئے ہمارے پاس کافی شہادتیں موجود نہیں ہیں ، شمالی ہند کے متعلق تو اور بھی کم معلومات ہیں ، مسلمان فاتحین کے بیانات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیداوار کا ایک تہائی بلکہ بعض صورتوں میں آدھا حصہ وصول کیا جاتا تھا ، ان حالات میں یہ خیال کرنا ٹھیک نہ ہوگا کہ اس دور میں مالگذاری کی شرح وہی معمولی چھٹا حصہ ہوتی تھی ،

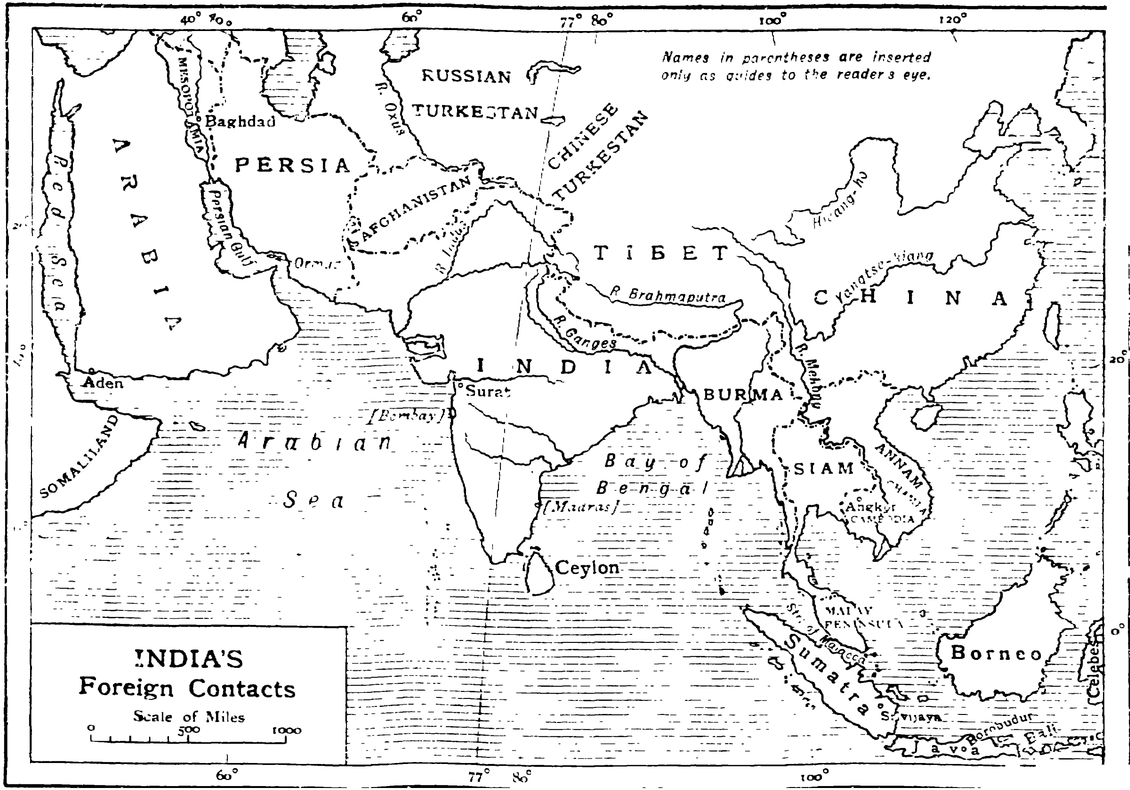
ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا کاشتکار اپنی مالگذاری جنس کی صورت میں ادا کرتے تھے ، یا پیداوار کے ایک حصہ کو فروخت کر کے پیسہ دیدیا کرتے تھے ، اس سوال کا اب تک کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا جاسکا ، یہ تو سب جانتے ہیں کہ کئی صدیوں سے ہند میں سکہ کا رواج تھا ، مگر یہ پتہ نہیں کہ شہروں سے باہر دیہات میں بھی اس کا چلن تھا ، جنوبی ہند کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مالگذاری جنس اور سکے دونوں شکل میں ادا کی جاتی تھی ، شمالی ہند میں بھی قریب قریب یہی طریقہ مروج تھا ، ان کتبوں میں جو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ان کا حل کرنا بہت دشوار ہے ، اس کے متعلق کسی رائے کے پیش کرنے کے لئے شہادتیں کافی نہیں ہیں ، ظن غالب یہ ہے کہ اس دور میں روپیہ پیسہ کے ذریعہ خرید و فروخت کی جانے لگی تھی ، مگر ہر جگہ کا دستور الگ الگ تھا ، ترقی یافتہ علاقوں میں کاشتکار اپنی پیداوار کا ایک حصہ فروخت کرکے سرکاری مالگذاری ادا کرتے تھے ، اس کی وجہ سے ان کو بسا اوقات نقصان ہوتا تھا ، کیونکہ فصل کاٹنے کے زمانہ

میں چیزوں کی قیمتیں عموما گری ہوی رہتی تھیں ' کیونکہ ہر ایک اسی زمانہ میں اپنی پیداوار کو بیچنے کیلئے باہر نکلتا تھا.

دیہاتی مزدوروں کی حالت کا ہمیں کچھ پتہ نہیں ہے ' اس دور کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کا وجود تھا ' گھریلو کام کے لئے غلام رکھے جاتے تھے ' اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ دیہاتی مزدور حقیقی معنوں میں غلام تھے ' کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری حکام دیہاتیوں سے جبری طور پر کام لیتے تھے ' ہمالیہ کی پہاڑی زمینوں میں ذرا سختی برتی جاتی تھی ' کیونکہ یہاں سامانوں کو لے جانے کیلئے جانوروں کی بجاے آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی ' صنعت و حرفت کے متعلق بھی ہم کو زیادہ معلومات نہیں ہیں ' تاہم اتنا معلوم ہے کہ سوتی کپڑے اور روئی کی دوسری چیزوں کا عام استعمال تھا ' قدیم کتابوں سے کاریگروں کی اقتصادی حالت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ' تاجر آزادی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاسکتے تھے مگر ان کی خرید و فروخت اور تجارت کے متعلق کوئی یقینی معلومات حاصل نہیں ہیں ' تجارتی اشیاء کی در آمد اور بر آمد پر محصول لگانے کا طریقہ بھی رائج تھا ' عبوری محصول بھی عائد کیا جاتا تھا ' غیر ملکی تجارت کے متعلق دوسرے باب میں بحث کی جائیگی .

آخر میں چند الفاظ مقامات مقدسہ کی زیارت کے متعلق کہنے ہیں جس کی اگرچہ ایک مذہبی حیثیت تھی ' تاہم ملک کی سماجی اور اقتصادی زندگی پر اس کا بہت زیادہ اثر پڑا ' ہندو مت کے ابتدائی دور میں مقامات مقدسہ کی زیارت کا کہیں ذکر نہیں آتا ' اور بظاہر اس کی ابتدا بودھمت اور جین مت کے زمانہ سے ہوی جبکہ ان مذہبوں کے پیرو بانیان مذہب کی یادگار جگہوں کی زیارت کرنے لگے ' اس کے بعد ہندوؤں نے بھی ان کی پیروی کی ' گپت دور کے سب سے بڑے شاعر کالیداس کی کتابوں میں مقامات مقدسہ کی زیارت کا ذکر

آیا ہے ' کتھاسرت ساگر میں ان مقامات کا تذکرہ ہے جہاں آج کل لوگ جمع ہوا کرتے ہیں' دسویں صدی میں لوگ دور دراز مقامات* سے مقدس جگہوں کی زیارت کیلئے آتے تھے ' راستوں میں اور زیارتگاہوں پر ایک دوسرے سے ملاقات کرنے اور تبادلہ خیال کرنے کا کافی موقعہ ملتا تھا ' وہ شاعروں ' قصہ گویوں اور پرچاریوں کی باتوں کو سنتے تھے ' اس کی وجہ سے ان کے دل و دماغ میں بڑی وسعت پیدا ہو رہی تھی ' اگرچہ ایک ہندو یاتری کا مقصد مذہبی مراسم کو خلوص کے ساتھ ادا کرنا ہوتا تھا اور وہ اس میں ہمیشہ منہمک رہتا تھا ' تاہم اس کو مختلف لوگوں سے ملنے جلنے اور مختلف مقامات کے دیکھنے کا کافی موقعہ مل جاتا تھا ' اس لحاظ سے سفر تعلیم و تربیت کا ایک اہم ذریعہ تھا ' اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہندومت کے اتحاد کا ایک بڑا سبب مقامات مقدسہ کی زیارت کرنا بھی ہے '



INDIA'S
Foreign Contacts
Scale of Miles
0
500
1000
Names in parentheses are inserted only as guides to the reader's eye.
ARABIA
Red Sea
Aden
SOMALILAND
MESOPOTAMIA
Baghdad
PERSIA
Persian Gulf
Ormuz
AFGHANISTAN
R. Oxus
RUSSIAN TURKESTAN
CHINESE TURKESTAN
R. Indus
TIBET
R. Brahmaputra
R. Ganges
INDIA
Surat
[Bombay]
[Madras]
Ceylon
Arabian Sea
Bay of Bengal
BURMA
R. Mekong
SIAM
ANNAM
Angkor
CAMBODIA
CHINA
Hwang-ho
Yangtse-kiang
MALAY PENINSULA
Str. of Malacca
Sumatra
Borneo
Celebes
Java
Bali
Borobudur
40°
60°
77°
80°
100°
120°
0°
20°

باب ۱۹

غیر ملکی تعلقات

اس وقت ہم کو ان تعلقات کا تذکرہ کرنا ہے جو دسویں صدی کے آخر میں ہند اور دوسرے ملکوں کے درمیان قایم تھے ' ان تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور چونکہ سنین کا پتہ نہیں ہے اسلئے واقعات کو سنہ وار بیان کرنا بہت دشوار ہے ' ہم کو چاہئے کہ آگے پیچھے کے واقعات کواپنی نظر کے سامنے رکھیں تاکہ ان تعلقات کی حقیقی شکل صاف نظر آنے لگے ' اس کی نوعیت کو بہتر طریقہ پر سمجھنے کیلئے ہند کے نقشہ پر شمال سے جنوب کی طرف ایک خط کھینچا جائے جو دہلی پر سے ہوکر گزرے ' اس کا طول البلد ۷۷ ہوتا ہے ' اس خط کے مغرب میں جو ممالک واقع ہیں ' ان سے ہند کا تعلق محض تجارتی تھا ' اس کے بر خلاف اس خط کے مشرق میں جو ممالک تھے ان سے ہند کا تمدنی رشتہ تھا ' مشرقی ایشیا اور چین کے تمام جنوبی علاقوں میں ہندی تہذیب و تمدن کا پرچار ہوا '

ہند کی شمالی سرحد پر چینی اور اسلامی تہذیب و تمدن کے ڈانڈے مل رہے تھے ' پچھلے باب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ ایک زمانہ میں ماوراءالنہر تک چین کی حکومت تھی ' مگر بعد میں اسلام کو بڑا فروغ حاصل ہوا ' اور ساتویں صدی میں عربوں نے سارا ایران فتح کرلیا اور افغانستان اور روسی ترکستان تک ان کی حکومت قایم ہوگئی ' ہم کو معلوم نہیں کہ پنجاب پر ترک حملوں سے پہلے روسی ترکستان سے ہند کے کیا تعلقات تھے ' اتنا ہم جانتے ہیں کہ دسویں صدی کے خاتمہ تک ایک ہندو خاندان افغانستان کے مشرقی حصہ میں حکومت کرتا رہا ' اس لیے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مغرب میں عربوں کی اور شمال میں ترکوں کی سرحد تک ہند کے تہذیب و تمدن کا اثر غالب تھا .

فی‌الحال ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں؟ ہے جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ عربوں اور ترکوں پر ہندی تہذیب و تمدن کا کیا اثر پڑا ، البتہ یہ معلوم ہے کہ سندھ کی فتح کے بعد بغداد کے ساتھ ہند کا تعلق قایم ہوگیا تھا ، ابوجعفر منصور (۷۵۳ - ۷۷۴م) اور ہارون‌الرشید (۷۸۶ - ۸۰۸ ع) کے زمانہ میں ہند سے بہت سے ہندو فاضل بلائے گئے تھے ، اور ان کی مدد سے علم ہیئت ، طب اور فلسفہ کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تھا ، اس طرح ہندی علوم و فنون کا ایک حصہ بغداد کے نئے علوم و فنون کا ایک جز بن گیا ، لیکن چند دنوں کے بعد عربوں کی تمام تر توجہ یونانی علوم و فنون کی طرف مبذول ہوگئی .

ہند اور خلیج فارس اور بحر احمر کے درمیان سمندری راستے اب بھی کھلے ہوے تھے ، مگر صاف طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ اس دور میں تجارت کی کیا حالت تھی ، لیکن آمدورفت برابر جاری تھی ، چنانچہ پارسی اور عرب ان ہی راستوں سے ہند میں وارد ہوے ، پارسی پرانے زردشتی مذہب کے پیرو تھے اور آگ کی پوجا کرتے تھے ، اور جب آٹھویں صدی میں مسلمان ایران پر چھاگئے تو یہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کر سورت اور بمبئی کے درمیان کے ساحلی علاقہ پر بس گئے ، یہاں انکو ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل تھی ، وہ امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے ، تجارت مالیات ، اور صنعت و حرفت میں انکی اہمیت بمبئی کے ترقی کرنے کے بعد سے ہوی ہے .

عربوں کی نو آبادیات پر کچھ گفتگو کرنے سے پہلے بہتر ہوگا اگر ہم چین سے لیکر خلیج فارس اور بحراحمر تک کے سمندری راستوں کا ایک جایزہ لیں ، ان راستوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ، ایک چین کے ساحل سے لیکر جزیرہ نماے سماترا اور ملایا تک ، دوسرا سماترا سے ہند کے مغربی ساحل تک ، تیسرا ہند سے لیکر خلیج فارس اور بحراحمر تک ، پرانے زمانہ میں

چین سے لیکر خلیج فارس یا بحراحمر تک ایک ہی جہاز سے سفر کرنا بہت ہی خطرناک تھا ' اس کے علاوہ اس زمانہ کے جہاز موسمی ہواؤں کے ذریعہ چلتے تھے ' اور جہاں کہیں موسمی ہوا مخالف ہوتی تو موافق موسم کے شروع ہونے تک جہازوں کو روک لینا پڑتا تھا ' اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ جہاز کے پہنچنے سے پہلے ہوا کا رخ بدل جاتا تھا ' اس کی وجہ سے مسلسل سفر میں بڑی تاخیر ہوجاتی تھی ' اس بناء پر یہ طریقہ متروک ہوگیا ' پانچویں اور ساتویں صدی کے درمیان مسلسل سفر کی عادت تھی ' چنانچہ چینی کشتیاں خلیج فارس اور عدن کی بندرگاہوں میں دکھائی دیتی تھیں ' سنہ ۲۵۰ع کے قریب چین کے ساحل پر عربوں کی تجارتی ایجنسیاں تھیں مگر اس کے بعد چین کے جہاز ہند کے مغربی ساحل پر مال اتار دینے لگے ' یہاں کے عرب اس مال کو دوسرے جہازوں سے خلیج فارس اور بحراحمر کی بندرگاہوں کو بھیجدیتے تھے ' اس طرح سنہ ۹۰۰ع کے قریب یا اس سے پہلے عرب ہند کے مغربی ساحل پر بسنے لگے ' ان کا خالص مقصد تجارتی مال کی خرید و فروخت کرنا تھا ' ان کے ذہن میں فتوحات کا ذرہ بھر خیال نہیں تھا ' وہ اپنے دین کی تبلیغ کیلئے بھی یہاں نہیں آئے تھے مگر جب یہاں تجارت کرنے لگے تو یہاں کی لڑکیوں سے شادی کرلی ' اور آج انہی کی اولاد ماپلا کے نام سے پکاری جاتی ہے .

آفریقہ کے ساتھ عربوں کی تجارت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا ' تاہم ابتدائی دور میں عربوں کے جہاز سومالی لینڈ سے آگے نہیں بڑھتے تھے ' مگر اسی زمانہ میں عرب زنجبار اور موزنبیق میں آباد ہونے لگے تھے ' غالبا اسی دور سے ہند اور آفریقہ کے درمیان براہ راست تجارت شروع ہوی ' جس نے بعد میں چلکر بڑی اہمیت اختیار کرلی تھی ' مدغاسکر کے جزیرہ میں ہندی تمدن کے آثار ملتے ہیں ' مگر ان کا زمانہ متعین نہیں کیا جاسکتا ' بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس زمانہ میں

ہند کی بجائے جاوا سے آفریقہ کے تجارتی تعلقات تھے ' لیکن ہنوز اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا ' جنوبی آفریقہ کے ساتھ ہند کے تعلقات تین سو سال بعد پرتگالیوں کے آنے کے بعد سے قائم ہوے ہیں .

ولندیزی مشرقی جزائر میں بھی ہندی تہذیب و تمدن کے آثار ملتے ہیں ' مگر ان کی تاریخ اس وقت تک مرتب نہیں کی جاسکتی جب تک کہ تمام واقعات سامنے نہ آجائیں ' ہند کی کتابوں میں ان جزائر کا کہیں ذکر نہیں ملتا ' البتہ چینی ذرایع سے کچھ معلومات فراہم ہوتی ہیں ' ولندیزی محقق چند دنوں سے بڑی سر گرمی کے ساتھ یہاں کے آثار قدیمہ کی تحقیقات میں لگے ہوے ہیں ' ان کی بدولت مشرقی جزائر کی ایک مرتب تاریخ وجود میں آرہی ہے ' ان سے پتہ چلتا ہے بودھ مت اور ہندومت کو یہاں اچھی طرح فروغ ہو رہا تھا ' اور ہندی تمدن کے اثرات ہرجگہ نمایاں تھے ' یہاں تک کہ پندرھویں صدی میں مسلمان آئے اور انہوں نے اپنا اثر پھیلانا شروع کیا ' یہ نہیں معلوم کہ ان جزائر میں ہندی تمدن کب سے پھیلنا شروع ہوا اور کس جگہ اس کی بنیاد رکھی گئی ۔ سماترا کے شمال مشرقی حصہ میں اور جاوا اور بعض مشرقی جزائر میں اور بورنیو کے ساحل پر اور سلیبس کے جزیرہ میں اس کے پایدار نشانات ملتے ہیں ' ممکن ہے کہ دوسری جگہوں میں بھی ہندی تمدن پھیلا ہو ' سنسکرت کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۴۰۰ع کے قریب بورنیو کے مشرقی ساحل پر ایک ہندو ریاست قایم تھی ' اور برھمن بھینٹ کی رسم ادا کرتے تھے ' لیکن یہ نہیں معلوم کہ یہ ریاست کس طرح قایم ہوی اور برھمن ہند کے کس حصہ اور کس راستہ سے یہاں آئے تھے ' اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں یا اس کے بعد ہی ہندوانہ عقاید و خیالات مغربی جاوا میں عام ہوگئے تھے ' ساتویں صدی میں سماترا کے مشرقی ساحل پر پالم بنگ کے قریب سری وجیا بودھ مت کا ایک بڑا مرکز تھا '

جہاں چینی یاتری ای تسنگ نے سنسکرت زبان سیکھی تھی ' ان اثرات کی ابتدا کب سے ہوی اس کے متعلق محض قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں ۔

آٹھویں صدی کے خاتمہ کے قریب سیلندر نامی ایک بحری ریاست کا وجود ملتا ہے ' جس کا سماترا کے تنگ نامے آب پر سنہ ۱۲۵۰ء تک تسلط قایم تھا ' اس ریاست کی تاریخ مرتب کی جارہی ہے ' چند دن پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ سماترا کی ریاست سری وجیا کی کوئی شاخ ہے ' لیکن غالب نظریہ * یہ ہے کہ پہلے پہل ملایا کے ساحل پر یہ ریاست قایم ہوی اور اس کے بعد جنوبی جزائر پر بھی اس کا تسلط ہوگیا ' اس خاندان کی اصل کا پتہ نہیں لگتا ' مگر عقاید و خیالات کے لحاظ سے وہ ہندی تھا ' اس کے حکمران بودھ مت کے پیرو تھے اور مہایان مسلک کی سرپرستی کرتے تھے ' مادر ہند سے اس ریاست کے تعلقات کا ثبوت ان کتبوں سے ملتا ہے جو ہند کی سر زمین میں دستیاب ہوے ہیں ' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سیلندر کے ایک ابتدائی حکمران نے نالندہ کے اندر ایک خانقاہ بنوائی تھی ' کچھ دنوں کے بعد ایک دوسرے حکمران نے جنوبی ہند کی چولا ریاست میں ایک خانقاہ تیار کی تھی ' وسط جاوا میں بوروبدور کی زبردست زیارتگاہ کے بنانے کا فخر اسی خاندان کو حاصل ہے ' اس جزیرہ میں صرف بودھ مت ہی کے مندر نہیں پائے جاتے بلکہ اس کے تمام گوشوں میں ہندو مندر بھی پاے جاتے ہیں ۔

گیارھویں صدی میں مشرقی جاوا کے اندر بہت سی نئی ریاستوں کا وجود ملتا ہے ' مرکزی جاوا اور سماترا کی یادگاریں ہندی طرز کی ہیں ' مگر مشرقی جاوا میں ہندی اور اسلامی تمدن کی آمیزش سے ایک نیا تمدن پایا جاتا ہے ' اگرچہ مذہب اسلام پندرھویں صدی میں تمام جزیروں کے اندر پھیل گیا تھا ' تاہم ہندی تمدن

---

* دیکھو ڈاکٹر آر ۔ سی ۔ مجمدار اور ڈاکٹر جی کرڈس وغیرہ کے مضامین جو سنہ ۱۹۳۴ اور سنہ ۱۹۳۵ کے گزٹیر انڈیا سوسائٹی کے رسالوں میں شایع ہوے ہیں ۔

کے آثار کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی ، جاوا اور سماترا میں آج بھی هندی تمدن کے نشانات پائے جاتے هیں ، مشرقی جاوا کے ایک چھوٹے سے جزیرہ بالی میں اسلام کو فروغ نہیں هوسکا ، یہاں اب بھی هندووں کی تعداد زیادہ هے .

ان جزیروں کو چھوڑکر اگر براعظم پر غور کیا جاے تو معلوم هوگا کہ یہاں بھی اسی قسم کے اثرات مرتب هو رهے تھے ، جن کا ذکر اوپر هوچکا ، برما ، سیام ، کیمبوڈیا ، انام اور ملایا میں هندو تہذیب و تمدن کا بڑا اثر تھا ، مگر ان کی تاریخ تفصیلی طور پر پیش نہیں کی جاسکتی ، آثار قدیمہ کے ماهرین کی کوششوں سے اس تاریخ کی مختلف کڑیاں دھیرے دھیرے ملتی جا رهی هیں ، اور آگے چلکر اس کا ایک سلسلہ وجود میں آئیگا ، فی‌الحال اتنا بتانا کافی هے کہ جنوبی انام کے ساحل پر چمپا کی ریاست کا وجود ملتا هے ، اس کا ذکر سنسکرت کے ایک قدیم کتبہ میں هے جس کو چوتھی یاکہ دوسری صدی کا بتایا جاتا هے ، بعد کے کتبوں سے معلوم هوتا هے کہ کئی صدیوں تک چمپا کی هندو ریاست زوردار اور طاقت ور رهی آثار قدیمہ کے فرانسیسی ماهرین اس کی تاریخ کے مرتب کرنے میں لگے هوے هیں ، آج چمپا میں زیادہ تر مسلمان هیں ، لیکن بعض شیو کے پرستار بھی هیں .

چین کے تاریخی اسناد سے پتہ چلتا هے کہ اسی زمانہ میں موجودہ کیمبوڈیا کے اس علاقہ میں جو چمپا کے جنوب اور مغرب میں واقع تھا ، ایک هندو ریاست قایم تھی ، کہا جاتا هے کہ اس کی ابتدا پہلی صدی میں هوی جب کہ ایک برهمن نے اس علاقہ کو فتح کیا اور وهاں کی رانی سے شادی کرلی ، چند تاریخی اشارات سے معلوم هوتا هے کہ بعد میں هند سے لوگ آکر یہاں بس گئے تھے ، بہت سے کتبوں میں ، جن میں سے بعض سنسکرت زبان میں هیں ، کھمیر ریاست کا ذکر آتا هے ، ڈھانچہ اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے یہ ریاست هندی تھی ، اور کئی صدیوں تک

قایم رہی ، مرکزی کیمبوڈیا میں انگکور کے مندر اسی ریاست کی یادگار ہیں .

چند سال سے سیام کے آثار قدیمہ کی تحقیقات ہو رہی ہے ، ابھی بہت سی چیزیں حل کرنی ہیں ، موجودہ سلطنت سے پہلے یہاں مختلف ریاستیں قایم تھیں ، اور ہر ایک پر ہندی تمدن چھایا ہوا تھا ، ان کی اصل کا کچھ پتہ نہیں ملتا اور اب تک ان کی تاریخ لکھی نہیں جاسکی ، برما کی بھی تقریباً یہی حالت ہے ، یہاں بھی آثار قدیمہ کی تحقیق نہیں ہوسکی ، تاہم یہ بات قطعی ہے کہ برما پر ہندی تمدن غالب تھا ، ملایا میں ہندو تمدن کے اثرات ملتے ہیں ، جو دوسری صدی سے تعلق رکھتے ہیں ، بعد میں سیلندر کی ریاست قایم ہوی ، جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے ، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دسویں صدی کے قریب پورے جنوب مشرقی ایشیا میں ہندی تمدن پھیل چکا تھا .

کچھ زمانہ کے بعد یہاں ایک انقلاب رونما ہوا ، ملایا اور چمپا کے باشندوں نے اسلام قبول کرلیا ، برما ، سیام ، انام ، اور کیمبوڈیا میں چین کا اثر بڑھنے لگا ، اسطرح کہ دسویں صدی میں ہند کے شمال اور شمال مغرب پر اسلامی تمدن اور اسکے شمال مشرق میں چینی تمدن اپنا اثر ڈال رہا تھا ، مشرق میں ہندی تمدن کا کوئی حریف نہ تھا ، اس کے بعد پانچ سو سال کے اندر زبردست انقلابات ہوے ، ایک طرف سے اسلامی تمدن اور دوسری طرف سے چینی تمدن بڑھتا جا رہا تھا ، قریب تھا کہ ہندی تمدن ان دونوں کے درمیان گھر کرمٹ جاتے ، مگر سولھویں صدی میں پرتگالیوں کا ظہور ہوا ، اور ہند سے ان کے نئے تعلقات قایم ہوے ، اور اس کے بعد مغربی قوموں اے درمیان اقتدار کی کشمکش شروع ہوی ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہند پر غیر ملکیوں کا قبضہ ہوگیا ، اور آج اس حالت کو خود ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں .

ھند اور چین کے درمیان دو لمبے دشوار گذار اور خطرناک راستے تھے ' پہلا بحری راستہ تھا جس کا ذکر اوپر ھوچکا ھے دوسرا زمینی راستہ تھا جو چین کے مغربی صوبوں سے ترکستان میں ھوتا ھوا ماوراءالنہر تک جاتا تھا اور وھاں سے جنوب کی طرف مڑکر ھندو کش سے ھوتا ھوا کابل اور پشاور تک پہنچتا تھا ' یہ بہت ھی پھیر کا راستہ تھا ' مگر چینی فرمانروا اس کو بڑی اھمیت دیتے تھے کیونکہ ریشم کا مال اسی راستے سے روم کے بازاروں تک پہنچتا تھا ' چنانچہ راستہ کی حفاظت کیلئے ماوراءالنہر تک پولیس کی چوکیاں بٹھائی گئی تھیں ' ایک مسافر سلامتی کے ساتھ ماوراءالنہر تک پہنچتا تھا ' اور وھاں سے جنوب کی طرف مڑکر ھندوکش کے دروں میں سے ھوتا ھوا ھند میں داخل ھوتا تھا ' مختلف اکتشافات * سے پتہ چلتا ھے کہ ھندی اور چینی تمدن کے ڈانڈے چینی ترکستان میں ملتے تھے ' نویں صدی تک اس راستہ سے باقاعدہ آمد و رفت جاری تھی ' اس کے بعد اس راستہ کی اھمیت گھٹ گئی .

اس وقت ھمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ھے کہ اس راستہ سے تجارتی سامان ھند پہنچتا تھا ' اس کی اھمیت صرف اس وجہ سے ھے کہ پہلی صدی میں اسی راستہ سے چین میں بودھمت کے متعلق خبریں پھیلیں ' اور جب اس مذھب کو کچھ مقبولیت حاصل ھوی تو بہت سے یاتری ھند آئے تاکہ بودھ مقامات مقدسہ کی زیارت کریں اور مذھبی کتابوں کے معتبر اور مستند نسخے لیکر جائیں ' یہ مذھب چین سے کوریا اور وھاں سے جاپان میں پھیلا ' اس طرح جو بیج کہ تقریبا بیس صدی پہلے وسط ایشیا کے بیابانوں میں سے ھوکر چین پہنچا وہ پھول کر ایک زبردست اور تناور درخت بن گیا ' تبت میں بھی بودھمت کو فروغ ھوا ' مگر وسط ایشیا کی اصل تحریک

---

* سر ارل اسٹائن نے اپنی کتاب آن اینشینٹ سنٹرل ایشین ٹراکس (مطبوعہ لندن ۱۹۳۳) میں اس راستہ کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ھے .

سے تبت کو کوئی تعلق نہیں تھا ، کیونکہ ساتویں صدی سے پہلے یہاں بودھمت کے نشانات نہیں ملتے ، جب شمالی ہند کے پال خاندان سے تبت کے تعلقات قایم ہوے تو بودھمت بھی تبت میں پھیلنا شروع ہوا ، سنسکرت زبان کی بعض مشہور کتابیں ہند میں نہیں پائی جاتی ہیں ، مگر ان کے نسخے تبت میں ملتے ہیں ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں میں زبردست ثقافتی تعلقات قایم تھے .

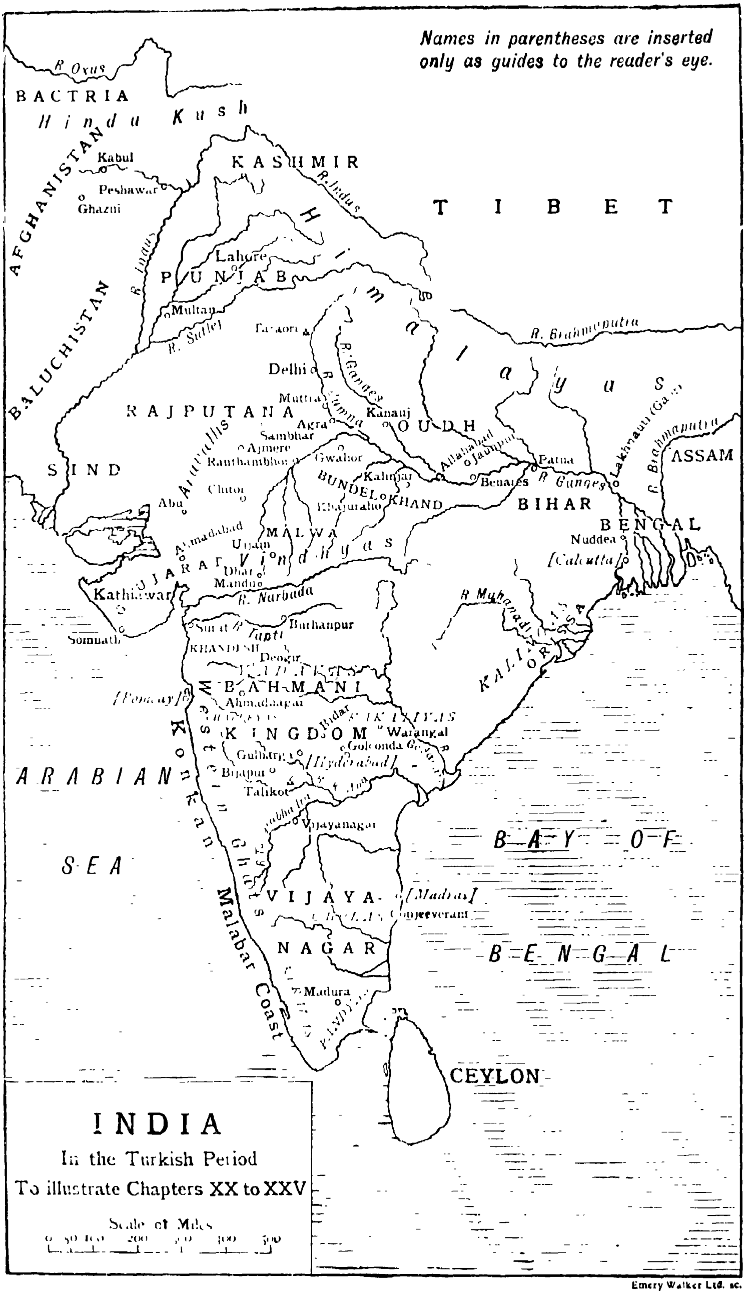
ہند اور مشرق اقصیٰ کے درمیان تجارتی تعلقات کے متعلق کوئی یادداشت موجود نہیں ہے ، البتہ ایک بات کا یہاں ذکر کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ سولھویں صدی میں دونوں ملکوں کے درمیان سوتی کپڑوں کی تجارت بہت زوروں پر تھی ، انڈو چینا میں جتنے سوتی کپڑے استعمال کیے جاتے تھے وہ سب ہند کے بنے ہوے ہوتے تھے ، ہند کے مشرقی ساحل پر اور گجرات میں جولاہوں ، رنگ ریزوں ، اور کپڑا چھاپنے والوں کی ایک بڑی آبادی تھی ، یہ لوگ مختلف منڈیوں کے مذاق کا کپڑا تیار کرتے تھے ، ملاکا کے جزیروں کی طرح جہاں سکہ کا رواج نہ تھا کپڑا مبادلہ زر کا کام دیتا تھا ، جو لوگ لونگ یا سپیاری یا گوند یا منقیٰ یا کوئی دوسری چیز خریدنا چاہتے کپڑا دیکر خرید لیا کرتے تھے ، ظاھر ہے کہ اس قسم کا مبادلہ بتدریج ہی ترقی کرسکتا تھا ، اس لیے ہم قیاس کرسکتے ہیں کہ اس کی ابتدا اس زمانہ سے ہوی ہوگی جبکہ ہندی تاجر سمندروں کو پار کرکے ان مقامات کو پہنچتے تھے ، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دسویں صدی یا اس سے پہلے اس قسم کا مبادلہ زر رائج ہوچکا تھا .

باب ۲۰

ترکون کا ظہور

اب یہان سے مسلم اقتدار کا دور شروع ہوتا ہے ' سب سے پہلے ان واقعات کا ایک خلاصہ پیش کرنا ہے جو اس دور سے متعلق ہیں ' گیارھوین اور بارھوین صدی میں ترک اپنے پائے تخت افغانستان میں رہ کر شمالی ہند کے مغربی حصہ پر حکومت کررہے تھے ' تیرھوین صدی میں دہلی کے اندر ترک سلطنت قایم ہوگئی ' جس کے قبضہ میں شمالی ہند کا ایک بڑا حصہ تھا ' چودھوین صدی میں جنوبی ہند کے ایک بڑے حصہ پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا ' پندرھوین صدی میں خانہ جنگی ہوی اور افغانون کی ایک نئی سلطنت وجود میں آئی ' سولھوین صدی میں مغل حملہ آورون نے شمالی ہند پر قبضہ کرلیا ' سترھوین صدی میں پورے ہند پر مغل راج قایم ہوگیا ' مغلیہ کے زوال کے بعد ایک سو سال تک کشمکش ہوتی رہی ' یہان تک کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہند پر اپنا تسلط قایم کرلیا .

ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ جب ہون مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے تو ترک بھی ان کے پیچھے پیچھے آرہے تھے ' ماوراءالنہر میں انہون نے ایک زبردست سلطنت قایم کرلی ' آگے چل کر یہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ' اور کئی آزاد ریاستیں قایم ہوگئیں ' ان میں سے ایک ریاست غزنی کی تھی ' جس کی بنیاد سنہ ۹۳۳ع میں پڑی ' یہ شہر کابل کے جنوب میں تقریبا اسی میل کے فاصلہ پر واقع ہے ' اس سے لگی ہوی ساھی خاندان کی ہندو ریاست تھی پنجاب کا ایک بڑا حصہ اور افغانستان کا ایک حصہ اس کے ماتحت تھا ' ۹۷۳ع میں ساھی خاندان کے راجہ جیپال نے غزنی پر چڑھائی کی ' مگر نا کام ہوکر لوٹا ' چار سال بعد غزنی کے تخت پر سبکتگین بیٹھا جس نے شمال اور مغرب میں بہت سی



INDIA

In the Turkish Period

To illustrate Chapters XX to XXV

Scale of Miles

Emery Walker Ltd. sc.

فتوحات حاصل کیں اور ایک وسیع اور زبردست سلطنت کا مالک بن گیا ' اس نے راجہ جیپال سے کئی مرتبہ جنگ کی ' اور دریاے سندھ تک کے علاقہ کو فتح کرلیا ' مگر ھند پر قبضہ کرنے کا کبھی ارادہ نہیں تھا ' اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمود سنہ ۹۹۷ء میں تخت پر بیٹھا ' اس کے بعد سے ھند میں اسلام کی قوت بڑھنے لگی ۔

ھند کو فتح کرنے والے ترک وحشی نہیں تھے ' انھوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کو اختیار کرلیا تھا ' انکا دربار بہت شاندار ھوتا تھا ' اور انکی حکومت بہت منظم تھی ' سرکاری زبان فارسی تھی ' اکثر بادشاہ علوم و فنون کے زبردست سرپرست تھے ' وہ صاحب مذاق تھے ' ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ھے کہ وہ اپنے ساتھ کاغذ لائے اور وقایع نویسی کی بنیاد ڈالی ' ان ھی کے زمانہ سے ھند کی تاریخ صاف اور واضح ھوجاتی ھے ۔

ھندومت کی طرح اسلام بھی زندگی کا ایک مکمل لائحہ عمل رکھتا ھے ' اسکا بھی ایک مقدس قانون ھے جس کو شریعت کہا جاتا ھے ' اور جسکی پابندی کرنا ھر ایک پر فرض ھے ' اسلامی شریعت کا مبدا قرآن مجید ھے ' جس میں وہ تمام آیات موجود ھیں جو وحی کے ذریعہ آنحضرت صلعم پر نازل ھوئیں ' قرآن کے بعد آنحضرت صلعم کے افعال و اقوال کا درجہ ھے جنکو سنن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ھے ' یہ اگرچہ ٹکڑوں کی شکل میں ھیں ' تاھم محدثین نے ان کو ایک سلسلہ میں جوڑ دیا ھے ' اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید الہی ھے ' قادر مطلق کو مرکب قرار دینے والا سب سے بڑا ملحد سمجھا جاتا ھے ' خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا بہت بڑا گناہ ھے ' ھر ایک کے ساتھ اس کی تقدیر ھوتی ھے ' جسکے خلاف ناک بھوں چڑھانا بے دینی سمجھا جاتا ھے ' ھند اور دوسرے ملکوں میں تقدیر کا عقیدہ مصیبت کے وقت صبر کا جذبہ پیدا کرتا ھے لیکن ایک فاتح کی جولانی کو روک نہیں سکتا ۔

اسلامی سیاست کی بنیاد مساوات پر ہے ' تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں ' اور خلیفہ کے ماتحت دنیا بھر کے خلاف وہ محاذ قایم کرسکتے ہیں ' ان پر چند پابندیاں ہیں جن میں سب سے مشہور نشہ والی چیزوں کے استعمال کی ممانعت ہے ' معاشرتی زندگی میں ہر ایک مسلمان آزاد ہے ' مگر اس کا فرض ہے کہ خلیفہ کی دعوت پر جہاد کیلئے تیار ہوجائے ' فتح کے بعد مال غنیمت تمام سپاہیوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوجاتا ہے ' مفتوح کیلئے تین صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کرنی ہے یا تو اسلام قبول کرے ' یا قتل ہونے کیلئے تیار ہوجائے یا غلام بن کر رہے ' اسلام قبول کرنے کیلئے صرف کلمۂ طیبہ کا پڑھنا کافی تھا ' اور اس کے بعد ختنہ کی رسم ادا کی جاتی تھی ' اگر اسلام قبول کرنے سے کوئی انکار کرتا تو تمام بالغ مرد قتل کردئے جاتے تھے اور عورتیں اور بچے غلام بنالئے جاتے تھے .

محمود غزنوی کے زمانہ تک اسلامی عقاید و خیالات میں ترمیمیں ہوچکی تھیں ' خلیفہ کا اقتدار کم ہوچکا تھا ' اور مختلف آزاد ریاستیں قایم ہوگئی تھیں ، فقیہ مسلمان سلاطین کو خلیفہ کا نائب سمجھتے تھے ' ہر ایک سلطان کو ضروری تھا کہ خلیفہ سے نیابت کی سند حاصل کرے ' لیکن سلاطین عملا آزاد تھے ' ہر ' ایک سلطان اپنی حکومت کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوشش کرتا تھا ' وہ اسلامی اصول کی حرف بحرف پابندی نہیں کرتا تھا ' اس زمانہ میں شخصی اور عمومی قانون کے درمیان فرق پیدا ہوگیا تھا ' مسلمان فقیہوں کے مرتب کئے ہوے قوانین کو نافذ کیا گیا تھا ' لیکن ریاست کے بعض خاص معاملات میں بادشاہ اپنی راے پر عمل کرتے تھے ' مسلمان فقیہوں نے ایک طرف تو اسلامی قانون کی پابندی ہر ایک کیلئے ضروری قراردی اور دوسری طرف اگر کوئی بادشاہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کو معزول کرنے کی اجازت نہیں دی ' بلکہ اس کی سزا آخرت میں مقررکی ' اور جیسا کہ ہم آئندہ پڑھینگے ' بعض مسلمان بادشاہ آخرت کی سزا کو بھی بھگتنے کیلئے تیار ہوگئے تھے .

ایک دوسری ترمیم مفتوح کے ساتھ سلوک کرنے کے بارے میں تھی ' پہلے اسلام یا موت کے سخت قانون سے صرف اهل کتاب یعنی یہودی اور نصرانی مستثنی تھے ' ان کو ہر قسم کی آزادی تھی بشرطیکہ وہ جزیہ دیکر ذمی ہوجائیں ' بعد میں اور دوسرے لوگ بھی مستثنی کرلئے گئے ' چنانچہ جب محمد بن قاسم نے پہلے پہل سندھ کو فتح کیا تو اس نے ہندوؤں کے ساتھ یہودیوں اور نصرانیوں کا سا سلوک کیا ' آٹھویں صدی کے فقیہوں اور مفتیوں نے فیصلہ دیا کہ ہر امیر کو حق حاصل ہے کہ جزیہ اور خراج لیکر مفتوحہ زمینیں محکوم قوم کے حوالے کردے .

ہند کی فتوحات میں اس طرح کی بہت سی آسانیاں پیدا کی گئیں ' ابتدائی قانون کے مطابق ہندوؤں کو ختم کردیا جاسکتا تھا ' اور ان کی زمینیں فاتح قوم کے سپاہیوں کے درمیان تقسیم کردی جاسکتی تھیں ' حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات سے مقامی آبادیوں کو کسی قسم کی پریشانی لاحق نہیں ہوی ' کاشتکار پہلے کی طرح بیج بوتے اور فصل کاٹتے تھے ' فرق اتنا تھا کہ وہ اپنی مالگذاری کسی ہندو بادشاہ کو دینے کے بجاے مسلمان حاکموں کو دیتے تھے ' بعض اوقات اس سے بھی زیادہ آسان طریقہ اختیار کیا گیا ' وہ یہ ہے کہ جب کوئی ہندو حکمران اطاعت کرلیتا اور اپنی ریاست کے لوگوں کی مجموعی مالگذاری کے برابر خراج ادا کردیتا تو ریاست اسی کے حوالے کردی جاتی تھی ' اس لحاظ سے ابتدائی مسلمانوں کی سلطنتیں در حقیقت ایک ہندو شہنشاہی تھی جس کا حکمران اعلی ایک ہندو ہونے کی بجاے مسلمان ہوتا تھا .

فتوحات کے بعد نہایت آسانی کے ساتھ حکومت کا انتظام ہوجاتا تھا ' البتہ سماجی اور مذهبی امور میں ہندوؤں سے ٹکر ہوتی تھی ' اس زمانہ کے مسلمانوں کے نزدیک ہندو مندر یا زیارتگاہ سب سے زیادہ قابل نفرت چیز تھی ' جب کبھی موقع

ملتا اس کو ناپاک اور برباد کرنے میں کبھی تذبذب نہیں کرتے تھے ' اور جب ہندو ان کو روک نہیں سکتے تو لا محالہ خاموشی کے ساتھ ان کی بربادی کو دیکھتے رہتے تھے ' اس کے علاوہ مسلمانوں کی فوج تمام تر سواروں پر مشتمل تھی ' اور ان کی زندگی اس ملک کے ذرایع پر منحصر تھی ' فوجیوں کیلئے غذا اور گھوڑوں کیلئے چارہ لازمی تھا ' اور چونکہ ترک زیادہ گوشت کہانے کے عادی تھے ' اس لئے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہر سال گاے اور بیل کی ایک بڑی تعداد ذبح ہوجاتی ہوگی ' اگر چہ اس کے متعلق کوئی تاریخی شہادت نہیں ہے تاہم یہ ماننا پڑیگا کہ ایسا ہونا لازمی تھا ' اور اس کی وجہ سے ہندووں اور مسلمانوں میں بد مزگی پیدا ہوتی ہوگی ' جو آئندہ مزید اختلافات کا باعث تھی اور جس کو مٹانے اور دور کرنے کی ملک کے سیاست داں ہمیشہ کوشش کرتے رہے ہیں .

اس عام تبصرہ کے بعد ہم اب محمود غزنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ' اس کے کردار کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے ' کیونکہ اس کی زندگی متضاد روایات میں گھر گئی ہے ' کسی غیر جانبدارانہ یاد داشتوں کے نہ ہونے کی صورت میں اس کی ذات کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا تاہم وہ ایک زبردست بہادر سپاہی تھا ' اور ظلم و ستم بے رحمی و سفاکی اور حرص و آز کا پتلا تھا ' ابتدا میں اس کا خیال زیادہ‌تر ایران اور ترکستان میں اپنی سلطنت کے حدود کو وسیع کرنے کا تھا ' لیکن ہند پر مختلف حملوں کے بعد اس کی ہمت اور بڑھ گئی ' سنہ ۱۰۰۰ع اور سنہ ۱۰۲٦ع کے درمیان جب کبھی اس کو موقعہ ملا اس نے ہند پر حملہ کیا اور شاندار فتوحات حاصل کیں ' اس نے پورے پنجاب پر قبضہ کرلیا ' اور قنوج سے آگے مشرقی علاقوں پر کئی حملے کئے اور ادھر جنوب میں کاٹھیاواڑ تک پہنچ گیا تھا .

محمود غزنوی کے ہندی صوبہ کے حدود یہ تھے ' مغرب میں دریاے سندھ ' مشرق میں جمنا ' اس میں دہلی شامل نہیں

تھا ، شمال میں ھمالیہ اور جنوب میں پنجاب کے پانچ دریاؤں کے سنگم سے کچھ آگے ، اس صوبہ میں ھندو ساھی خاندان کے علاقے بھی تھے جن کو آخرکار سنہ ۱۰۲۱ء میں شامل کرلیا گیا تھا ، اس کے علاوہ محمود نے ملتان کی مسلم ریاست کو بھی فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا ' نشیبی سندھ کو اگرچہ محمود نے فتح کیا مگر فورا ھی اس کو مقامی فرمانرواؤں کے حوالہ کردیا ' ھندی صوبہ کی حکومت کیلئے اس نے ایک نائب مقرر کیا جس کا پایہ تخت لاھور تھا ۔

محمود غزنوی کے تمام حملوں میں دو حملے بہت مشہور و معروف ھیں ' سنہ ۱۰۱۸ء میں ایک لاکھ سے زیادہ فوج لیکر غزنی سے روانہ ھوا ' پنجاب کو عبور کرکے جمنا کی طرف بڑھا ' متھرا کو فتح کیا اور مندروں کو تباہ و تاراج کیا ' اس کے بعد مشرق کی طرف رخ کیا اور قنوج پر حملہ کیا ' جس کے راجہ نے فوراً ھتھیار ڈالدئے اور اطاعت قبول کرلی ' یہ پتہ نہیں کہ محمود اس سے آگے بڑھا یا نہیں ' بعض کہتے ھیں کہ اس نے جونپور تک فوج کشی کی تھی ' مگر غالب نظریہ یہی ھے کہ وہ قنوج سے آگے نہیں بڑھ سکا ' اور جب وھاں سے پلٹا تو راستہ میں لڑتا بھڑتا بہت سا مال غنیمت اور غلام اور لونڈی لیکر غزنی واپس ھوا ' ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ایران اور ترکستان کے اندر ھر گھر میں ھندی غلام اور لونڈی نظر آنے لگے تھے' اس حملہ میں جوھر کی رسم کا ذکر آتا ھے ' ایک قلعہ کے محصورین جب غنیم کا مقابلہ نہیں کرسکے تو انہوں نے اپنی بیوی بچوں کو اپنے ھاتھوں سے قتل کیا اور قلعہ سے باھر آئے اور لڑکر اپنی جانیں دیں ' بعد کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر آتاھے ' اس کا کچھ پتہ نہیں ھے کہ کب سے اور کہاں اس رسم کی ابتدا ھوی ' اس کا مقصد صرف عورتوں کی عزت کو بچانا ھوتا تھا ' ھون اور دوسرے شمالی حملہ آوروں کے ھاں بلاشبہ یہ رسم پائی جاتی ھے ' ھند کی تاریخی کتابوں میں عام طور پر جنگی کارناموں کو جگہ دی جاتی تھی ' اس قسم کے واقعات کو منظر عام پر لانے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی ۔

چھ سال بعد محمود نے سومنات پر زبردست حملہ کیا ، یہ کاٹھیا واڑ کے ساحل پر ھند کا سب سے مشہور اور سب سے زیادہ قیمتی مندر تھا ، محمود گجرات کی طرف بڑھا اور ان تمام فوجوں کو شکست دی جو اس کے مقابلہ میں آئیں ، اور آخرکار سومنات کے مندر کو اجاڑا اور سب سے بڑے بت کے ٹکڑے ٹکڑے کردئے ، اس حملہ کی شہرت کا اندازہ ان افسانوں سے ہوتا ہے جو جابجا پھیلے ہوئے ہیں اور غالبا اسی وجہ سے ابتدائی دور میں ھند کے دور افتادہ مقامات میں بھی اسلام بت شکنی کے مرادف قرار دیا جانے لگا تھا .

سنہ ۱۰۳۰ع میں محمود کا انتقال ہوا ، اس کے جانشینوں نے اس کی فتوحات کا ایک بڑا حصہ بہت جلد کھودیا ، تاہم ایک سو سے زیادہ سال تک وہ غزنی اور ھندی صوبے کے مالک بنے رہے سنہ ۱۱۵۸ع میں غزنی برباد کیا گیا ، اور اس خاندان کے آخری فرمانرواوں کے قبضہ میں بیرون ھند کا کوئی علاقہ نہ رہا ، اس زمانہ میں ھندووں اور مسلمانوں کے آپس کے تعلقات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی جنوب میں غزنوی سلطنت راجپوتانہ تک پھیلی ہوی تھی ، مشرقی سرحد پر کبھی کبھی لڑائیوں کی وجہ سے چند قلعے ادھر یا اودھر ہوجاتے تھے سنہ ۱۰۳۳ع میں بنارس پر حملہ کیا گیا اور سنہ ۱۱۰۰ع میں اس قسم کا ایک دوسرا حملہ ہوا ، اور ممکن ہے کہ وقتاً فوقتاً اس قسم کے حملے ہوتے رہے ہوں ، اب ھند کے لوگوں کو شمال مغربی جانب سے ایک زبردست سیاسی اور مذہبی خطرہ کا اچھی طرح احساس ہوگیا ہوگا اسی اثناء میں ترکستان کے اندر ایک دوسری ریاست وجود میں آئی جس کے فرمانروا غوری خاندان سے تعلق رکھتے تھے ، بارھویں صدی کے آخر میں غوری ھند میں داخل ہوے اور غزنویوں کے کھوئے ہوے مقبوضات کو دوبارہ حاصل کیا ، اور شمالی ھند میں اسلام پھیلانے کی کوشش کی ، ان کے کارناموں کو بیان کرنے سے پہلے ہم کو بقیہ ھند کے سیاسی حالات کا بھی ایک جائزہ لے لینا چاہئے .

سترھویں باب میں بتایا جاچکا ہے کہ جنوبی ہند کے ایک بڑے حصہ پر چولا خاندان کی بادشاہت تھی ' دو سو برس تک ان کی سلطنت جاری رہی ' اور ایک زمانہ میں تو وہ سمندر پار اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے کیونکہ سنہ ۱۰۲۵ع کے قریب وہ سماترا اور ملایا میں لڑتے ہوے نظر آتے ہیں * ' تاہم یہاں ان کی فتوحات دیرپا نہیں تھیں ' سیلون بھی بہت جلد ان کے ہاتھوں سے نکل گیا ' اب ان کا وقت زیادہ‌تر چالوکیہ فرمانرواوں سے لڑنے میں صرف ہو رہا تھا ' جو جنوبی ہند کے شمال مغربی حصہ پر رانھور کی ریاست کے مالک بنے ہوے تھے ' ان لڑائیوں میں اکثر چالوکیہ ہی کو فتح ہوتی تھی ' مگر آگے چلکر ان کے علاقہ کے اندر تین نئی ریاستیں وجود میں آئیں ' جنوب کی طرف موجودہ علاقہ میسور میں ہائسل خاندان اور شمال میں یادوا اور مشرق میں کاکتیا کی حکومتیں قایم ہوئیں ابتدا میں ہائسل خاندان کے فرمانروا معمولی سردار تھے پھر وہ ایک مدت تک چالوکیہ فرمانرواوں کی طرف سے نیابت کے فرایض انجام دیتے رہے اور جب چالوکیہ سلطنت کمزور ہوگئی تو یہ آزاد ہوگئے ' اور پھر جب چالوکیوں کا خاتمہ ہوگیا تو ان تینوں ریاستوں نے اصل ریاست کو آپس میں بانٹ لیا ' لیکن یادوا اور کاکتیا کی ریاستیں بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکیں کیونکہ مسلمانوں نے ان کو فتح کرلیا ' ہائسل خاندان کی ایک شاخ نے وجیانگر کی زبردست سلطنت قایم کی جو چودھویں صدی سے لیکر سولھویں صدی تک سب سے زیادہ طاقت‌ور ہندو سلطنت تھی ۔

بنگال اور بہار میں پال خاندان گیارھویں صدی تک حکومت کرتا رہا ' بارھویں صدی کے وسط میں اسکی اہمیت گھٹ گئی اور بنگال کے ایک بڑے حصہ پر سین خاندان کا قبضہ ہوگیا ' یہانتک کہ ترکوں نے اس علاقہ کو انکے ہاتھ سے چھین لیا ' اسی

* بہت سے محققوں کا اب اس پر اتفاق ہے کہ جنوبی برما کے چولا خاندان کے فتح کرنے کا واقعہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا

زمانہ میں بنارس کے گھارواروں نے بہار پر اپنا تسلط قایم کرلیا تھا ' اسطرح بودھمت کا آخری مرکز ھندوؤں کے قبضہ میں چلاگیا ' کہا جاتا ھے کہ سین خاندان کے فرمانرواوں نے ذات پات کی بندھنوں کو مضبوط اور مستحکم کردیا تھا ' اسکا کوئی ثبوت نہیں ھے کہ بودھمت کے پیرووں کو مذھبی عقاید کی بناء پر سخت تکلیفیں دی جاتی تھیں ' لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں ھندومت کو زبردست ترقی ھوی.

بہار کے مغربی علاقہ میں کسی کو سیاسی استقلال حاصل نہیں تھا ' یہ علاقہ مختلف راجپوت خاندانوں میں بٹا ھوا تھا ' جو آئے دن ابھرتے اور پھر ختم ھوجاتے تھے ' ان کی تاریخ ھند کی اصل تاریخ پر اثر انداز نہیں ھوتی اسلئے ھم صرف ان چار ریاستوں کا ذکر کرتے ھیں ' جن سے ترکوں کی مٹھ بھیڑ ھوی ' یہ قنوج ' بندیلکھنڈ ' مالوہ اور سمبھر کی ریاستیں تھیں ' ھم پہلے پڑھ چکے ھیں کہ دسویں صدی میں قنوج کے گوجروں کا زور گھٹ گیا تھا ' اور سنہ ۱۰۱۹ع میں قنوج کے راجہ نے محمود کی اطاعت کرلی تھی ' گوجروں کے آخری فرمانروا بالکل غیر اھم تھے ' اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سنہ ۱۰۹۰ع میں بنارس کے گھارواروں نے ان کی مملکت پر قبضہ کرلیا تھا ' بہار پر بھی ان کا تسلط ھوگیا تھا جیسا کہ اوپر ذکر ھوچکا ' اسطرح گھارواروں کا اقتدار بڑھ گیا مگر ان کی کوئی نمایاں یادگار باقی نہیں رھی ' سنہ ۱۱۹۳ع میں ترک اس ریاست کے ایک بڑے حصہ پر حاوی ھوگئے تھے.

اس ریاست کے جنوب مغرب میں موجودہ بندیلکھنڈ کے علاقہ پر چندل خاندان کی حکومت تھی ' دسویں صدی سے لیکر بارھویں صدی کے خاتمہ تک وہ طاقتور اور زوردار رھے ' اس کے فرمانرواوں نے بڑی بڑی عمارتیں اور زبردست تالاب بنوائے تھے ' خجوراھو کے مندر اسی خاندان کی یادگار ھیں ' ان کے مصنوعی تالاب اب تک آب پاشی کا ایک اھم ذریعہ ھیں '

سنہ ۱۱۸۲ م میں چوہان فرمانرواوں کے ہاتھوں ان کو شکست فاش ہوی' اور آخر سنہ ۱۲۰۳ء میں ترکوں نے اس خاندان کا خاتمہ کردیا' اور ان کے پاے تخت کالنجر پر قبضہ کرلیا' اور اس کی دولت لوٹ لی' اس کے باشندوں کو غلام بنالیا' اور اس کے مندروں کو توڑ کر مسجدیں بنا ڈالیں.

آگے جنوب مغرب میں مالوہ کی ریاست تھی' جس کے فرمانروا پوار خاندان سے تعلق رکھتے تھے' دسویں اور گیارھویں صدی میں ان کا بڑا زور تھا' اجین کی بجاے دھار ان کا پاے تخت تھا' یہ اجین کے جنوب میں پچاس میل کے فاصلہ پر واقع تھا' چنڈل فرمانرواوں کی طرح اس خاندان کے حکمرانوں نے بہت بڑے تالاب بنواڈے تھے' ان میں سے بعض بہت بڑے ادیب تھے اور علم و ادب کی سرپرستی کرتے تھے' راجہ بھوج (۱۰۱۸ - ۱۰۶۰) اس خاندان کا مشہور راجہ تھا. لیکن آخر عمر میں اس نے دشمن کے ہاتھوں زبردست شکست کھاڈی جس کے بعد اس خاندان کو زوال آگیا.

سمبھر ریاست کے فرمانروا چوہان خاندان سے تعلق رکھتے تھے' یہ ریاست راجپوتانہ میں واقع تھی' ہند کا مشہور بہادر پرتھوی راج اسی خاندان کا ایک راجہ تھا' موجودہ داستانوں میں اس کی حیثیت ایک دلیر عاشق کی ہے مگر عام تاریخوں میں اس کو ایک قابل سپہ سالار بتایا گیا ہے اس نے چنڈل کی فوجوں کو کچل کر رکھدیا تھا' اور سنہ ۱۱۹۱ ع میں ترک حملہ آوروں کو زبردست شکست دی تھی' مگر ایک سال بعد ایک فیصلہ کن لڑاڈی میں ترکوں کے مقابلہ میں شکست کھاڈی' اور پھر قید کرکے قتل کردیا گیا.

گیارھویں اور بارھویں صدی میں ہند کی عام حالت یہ تھی جس کا اوپر بیان ہوا' مختلف خاندان گمنامی سے روشنی میں آتے مگر چند سال کے اندر ہمسایہ سلطنتوں سے لڑبھڑ کر ختم ہوجاتے' لیکن کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان سب نے ملکر بیرونی حملہ آوروں کے مقابلہ میں متحدہ محاذ قایم کرنے کی کبھی کوشش کی ہو.

باب ۲۱

دھلی میں ترکوں کی حکومت

غوری ترکوں کی ایک شاخ تھے ' انہوں نے معمولی حیثیت سے ترقی کرکے ایک شاندار سلطنت کی بنیاد ڈالی ۔ ابتدا میں وہ غزنویوں کے محکوم تھے ' سنہ ۱۱۷۳ ع میں انہوں نے غزنی پر قبضہ کیا ' سنہ ۱۱۷۵ ع میں ملتان اور سنہ ۱۱۸۶ ع میں لاہور کو فتح کیا ' اسی سال غزنوی خاندان کا بھی خاتمہ ہوگیا ' سنہ ۱۱۹۱ ع میں غوریوں نے دریاے سندھ اور گنگا کے درمیان تراوری * کے میدان میں پرتھوی راج اور اس کے ساتھیوں کے مقابلہ میں زبردست شکست کھائی ' لیکن دوسرے ھی سال ان کو اسی میدان میں کچل ڈالا ' سنہ ۱۱۹۳ ع میں دھلی کو فتح کرکے اس کو اپنا صدر مقام بنایا ' اور گنگا کے اس پار اودھ تک اپنی حکومت قایم کرلی ۔ پھر بہار پر حملہ کیا ' سنہ ۱۱۹۴ ع میں بنارس کے گھارواروں کو شکست دی اور شہر کو خوب لوٹا ' سنہ ۱۲۰۲ ع میں بنگال سے سین خاندان کو بھگاکر ان کی مملکت پر قبضہ کیا ' اس سے اندازہ ہوگا کہ صرف تیس برس کے عرصہ میں غزنی سے لیکر خلیج بنگال تک ان کا قبضہ ہوگیا ' ادھر راجپوتانہ کی ریاست سمبھر کو فتح کیا ' گجرات کو لوٹا ' گوالیار پر قبضہ کیا ' چنڈل ریاست کے صدر مقام کالنجر کو فتح کیا ' اس طرح شمالی ہند کے ایک بڑے حصہ پر مسلمانوں کا اقتدار قایم ہوگیا ۔

غوری ہند کے باہر علاقۂ افغانستان کے بھی مالک تھے ' جب وہاں محمد غوری † کو شکست ہوی ' تو پنجاب میں بھی اس کے خلاف بغاوت ہوگئی ' چنانچہ اسکو سرکشوں کی تادیب کیلئے

* اس مقام کا نام مختلف طور پر لیا گیا ہے ' اس کو تراوری ' ترائوری ، تلاوری اور ترائن کہا گیا ہے ۔

† اس کا پورا نام معزالدین محمد بن سام ہے ، بعض مورخین اس کو صرف محمد بن سام لکھتے ہیں اور بعض محمد غوری یا معزالدین کے نام سے یادکرتے ہیں ۔

ھند آنا پڑا ' اس نے باغیوں کو شکست تو دی لیکن مارچ سنہ ۱۲۰۶ع میں اس کو دریائے سندھ کے کنارے دھوکہ سے قتل کردیا گیا ' اسی کے ساتھ غوری خاندان کا بھی خاتمہ ھوگیا ' ھند میں اس کا جانشین قطب الدین ایبک قرار پایا ' بنگال سے لیکر ملتان تک کے تمام مسلم فرمانرواؤں نے اس کی اطاعت کرلی اس طرح سلطنت دھلی کی بنیاد پڑی ' اس کی عام تاریخ کے لکھنے سے پہلے ھم ضروری سمجھتے ھیں کہ اس کے عام نظم و نسق کا ایک خاکہ پیش کیا جائے .

بادشاہ ایک مطلق العنان فرمانروا تھا ' وہ شرعی احکام کی اسی حدتک پابندی کرتا تھا جو اس کی مرضی کے مطابق ھوتے تھے ' حکومت کو مختلف صیغوں میں تقسیم کیا گیا تھا ' اور ھر ایک صیغہ ایک وزیر کے ماتحت ھوتا تھا ' مالیات کا صیغہ عموما وزیراعظم کے ھاتھ میں ھوتا تھا ' سلطنت کی مضبوطی شاھی فوج اور صوبائی حاکموں کی وفاداری پر موقوف تھی ' ھر ایک صوبہ میں حاکم کی ایک علحدہ فوج ھوتی تھی ' شاھی فوج ابتدا میں صرف سواروں پر مشتمل تھی ' بعد میں ھاتھیوں کا اضافہ ھوا ' پیادوں پر بھروسہ نہیں کیا جاتا تھا ' تیرھویں صدی میں فوجیوں کو نقد تنخواھیں نہیں دی جاتی تھیں ' ھر ایک فوجی سردار کو جاگیر مل جاتی تھی ' جس کی آمدنی سے وہ سپاھیوں کی ایک مقررہ تعداد کو جمع کرکے رکھتا تھا ' چونکہ یہ سردار دیہات میں رھتے تھے ' اور ان کے جمع کرنے میں کافی مدت لگ جاتی تھی اسلئے اس طریقہ کو چھوڑکر چودھویں صدی سے مستقل طریقہ شروع کیا گیا ' یہ فوج دھلی میں رھتی اور سرکاری خزانہ سے نقد تنخواہ پاتی تھی .

پوری سلطنت کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا ' جن کو عرف عام کے مطابق صوبہ کہا جاسکتا ھے ' تمام صوبے ایک سائز کے نہ تھے ' ان کا نظم ونسق بھی یکساں نہ تھا ' مقامی حالات کے مطابق صوبوں کی تشکیل ھوتی تھی ' صوبہ کے حاکم کو

سارے اختیارات ہوتے تھے ' وہ ہمیشہ صوبہ کے صدر مقام میں رہتا تھا اور اسی مقام کے نام سے صوبہ کو موسوم کیا جاتا تھا ، حاکم کا اہم فرض بغاوت کو فرو کرنا اور لگان کا وصول کرنا ہوتا تھا ، اسی لئے اس کو اپنے فرایض کی انجام دہی کیلئے فوج کے رکھنے کی اجازت تھی ' اس کی کامیابی زیادہ تر اس کے ذاتی اوصاف و کمالات کی وجہ سے ہوتی تھی ' ایک نہ ایک جگہ بغاوت ہوتی ہی رہتی تھی ' اور باغیوں کو فوری طور پر کچلنے کیلئے قابل سپہ سالاروں اور تربیت یافتہ سپاہیوں کی ضرورت ہوتی تھی ' عموماً بغاوت صوبہ کے ذی اثر لوگوں کی حمایت کی وجہ سے ہوتی تھی ' آمدنی کا ایک بڑا حصہ فوج اور دیگر اخراجات کیلئے رکھ لیا جاتا تھا ' اور باقی شاہی خزانہ کو بھیج دیا جاتا تھا ' عموماً یہ رقم مقررہ ہوتی تھی اس لئے ہر ایک حاکم اپنے خرچ و اخراجات کے مطابق لگان کی شرح متعین کرتا اور آمدنی کے مختلف ذرایع تلاش کرتا تھا .

یہ ظاہر ہے کہ سلطنت کا استقلال طاقتور اور وفادار صوبائی حاکموں پر منحصر تھا ' مگر ہر ایک حاکم سے وفاداری کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی ' اگر حاکم کمزور ہوتا تو خود اس کے صوبہ میں بغاوت ہوجاتی تھی ' اور لگان وصول نہیں ہوتا تھا ' ایک زبردست حاکم خود کو بادشاہ کا حریف سمجھتا تھا کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بادشاہ اسی شخص کو [صوبہ کا حاکم بناتا جو زیادہ سے زیادہ رقم اس کو دے سکتا تھا ' لیکن عام طور پر بادشاہ اسی کو اس عہدے کیلئے منتخب کرتا تھا جس میں حکمرانی کی قابلیتیں ہوتی تھیں ' حاکموں کا انتخاب کسی شریف قوم سے ہونا لازمی نہیں تھا ، ابتدا میں بادشاہ اپنے ہی غلاموں کو اس جلیل القدر منصب کیلئے منتخب کرتے تھے .

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی وجہ سے ترکوں کی حکومت کا وقار گھٹ گیا تھا ، کیونکہ غلامی ایک معیوب چیز نہیں تھی ' غلاموں کا بھی ایک درجہ تھا ' اس زمانہ میں

مسلمان اور غیر مسلم دونوں غلام هوتے تھے ' اگر جنگ میں کسی بادشاہ کا لڑکا قید هوکر آتا تو اس کو بھی غلام بنالیا جاسکتا تھا ، بعض اوقات یہی غلام ترقی کرکے بادشاہ بن جاتے تھے ' محمود غزنوی کا باپ سبکتگین ایک غلام تھا ' دھلی کا پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک بھی ایک غلام تھا ، اس کے بعد کے کئی جانشین غلام تھے ' پوری ایک صدی تک غلاموں کا خاندان حکومت کرتا رہا * هر ایک بادشاہ کے پاس غلاموں کی ایک کثیر تعداد هوتی تھی ' جن میں سے کسی ایک کو صوبہ کی حکومت کیلئے منتخب کرلیا جاتا تھا ' بعد میں شریف قوم سے ان کا انتخاب کیا جانے لگا ' اور غالباً یہ شریف بھی ان هی غلاموں کی نسل سے تھے .

اس زمانہ کے شاهی محل ایک حیثیت سے حکمرانی کی تعلیم اور حوصلوں کی ترقی کا مدرسہ تھے ' اس میں کام کرنے والے لڑکوں کی ایک کثیر تعداد هوتی تھی ' جن میں سے بعض هندی اور بعض سمرقند اور بغداد وغیرہ سے لائے گئے تھے ' ان پر بادشاہ کی خاص توجہ رهتی تھی ابتدا میں ان سے محل کے چھوٹے بڑے کام لیے جاتے تھے ' پھر وہ شاهی توشے خانہ یا اصطبل کے داروغہ هوجاتے تھے ' پھر ان کی قابلیت کے مطابق ان کو مزید ترقی ملتی تھی ' ان میں سے بعض کو صوبہ کی حکومت یا فوج کی قیادت جیسے اهم کاموں کیلئے منتخب کرلیا جاتا تھا ' ان لڑکوں کی بڑی سختی کے ساتھ تربیت کی جاتی تھی ' بسا اوقات معمولی غلطیوں کیلئے ان کو سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی ' ان میں سے هر ایک لڑکا یہی سمجھتا تھا کہ وہ بام ترقی کے پہلے زینہ پر کھڑا هوا هے ' اور اپنی ذاتی قابلیت یا بادشاہ کی عنایت یا دونوں کے ذریعہ وہ ترقی کے بام پر پہنچ

---

* ایک روایت کے مطابق تغلق خاندان کا بانی ایک غلام کا بیٹا تھا ، اگر یہ صحیح هو تو تمام ترک بادشاہ غلام خاندان کی نسل قرار پاتے هیں ، اس طرح غلاموں کا دور حکومت دو صدیوں سے بھی زیادہ هوجاتا هے .

سکتا ہے، چونکہ بادشاہ عموماً ہر ایک کے کردار سے واقف ہوتا تھا اسلئے ایسے ہی آدمیوں کا انتخاب عمل میں آتا تھا جو وفادار ہونے کے علاوہ قابل بھی ہوتے تھے، اس زمانہ کے حالات کے مدنظر کوئی دوسرا طریقۂ انتخاب موزوں نہیں ہوسکتا تھا ۔

شاہی محل کا ایک دوسرا پہلو بہت ہی ناخوشگوار ہے، مگر اس کے متعلق بھی چند الفاظ کہنے پڑینگے وہ یہ ہے کہ ترک اگرچہ سچے مسلمان ہونے کا دعوی کرتے تھے تاہم وہ اسلام کے تمام اخلاقی اصول کے پورے پابند نہ تھے، وہ شراب پی کر بدمست ہوجاتے تھے، اور لواطت جیسے برے فعل کے مرتکب ہوتے تھے، شاہی محل کے اکثر چھوکرے حسین و جمیل ہوتے تھے اور محض اپنے حسن و جمال کی وجہ سے وہ شاہی عنایات کے مورد بن جاتے تھے، اور بعض وقت ان کو ایسے عہدوں کیلئے منتخب کیا جاتا جن کے وہ اہل نہیں ہوتے تھے، اور اسی وجہ سے اکثر گڑ بڑ پیدا ہوتی تھی اس کے باوجود بعض میں غیر معمولی قابلیت کے جوہر ہوتے تھے، وہ شخص جس نے نربدا سے لیکر مدراس کے اس پار تک اسلام کا جھنڈا لہرایا وہ ایک مابون خواجہ سرا تھا جس کو بڑے داموں پر خریدا گیا تھا، اس زمانہ میں اس قسم کی چند اور مثالیں ملتی ہیں، کسی شخص کو ترقی دینا یا نہ دینا بادشاہ کے دست قدرت میں تھا ۔

اس نظام کی ایک خامی یہ تھی کہ ترقی یافتہ غلاموں کی وفاداری صرف اپنے آقا کی ذات تک ہوتی تھی، اس کے ولی عہد یا جانشین کے ساتھ وفاداری کرنا لازمی نہیں تھا، جب کوئی بادشاہ اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین بناتا تھا تو بعض اوقات وزیر اور درباری کسی اور کو منتخب کرلیتے تھے ایک کمزور بادشاہ اپنی حیثیت کو زیادہ دنوں تک قایم نہیں رکھ سکتا تھا، سلطنت کے اندر بسا اوقات ان ہی غلاموں کی فرقہ بندیوں سے فسادات کھڑے ہوجایا کرتے تھے، اور وہ اپنے آدمی کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کرتے تھے، اس طرح نئے بادشاہ کیلئے غلاموں کا وجود بڑے خطرہ کا باعث ہوتا تھا ۔

سلطنت کا عام نظم و نسق اسی قسم کا تھا ، ہندو رعایا کے ساتھ سلوک کرنے کا جہاں تک تعلق ہے ہم کو شہروں اور دیہات کے اندر فرق کرنا پڑیگا ۔ شہروں میں بلا شبہ ترک فاتح قوم کا سا سلوک کر رہے تھے لیکن اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ شہریوں پر با قاعدہ مظالم کیے جا رہے تھے ، اور قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ برہمن ایک زمانہ تک جزیہ سے مستثنی تھے ، حالانکہ دوسرے ہندووں سے با قاعدہ جزیہ وصول کیا جا رہا تھا ۔ فتوحات کے زمانہ میں تو مسلمان بتوں کو توڑنے سے کبھی نہیں رکتے تھے ، مگر جب حکومت قایم ہوجاتی تھی تو کوئی بھی انکو ہاتھ نہیں لگاتا تھا ، ہندو تاجروں کی عام طور پر قدر کی جاتی تھی ، کبھی کبھی ان پر مظالم بھی کیے جاتے تھے ، قصبوں اور شہروں میں عام طور پر امن ہوتا تھا ، نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت کچھ بدامنی پھیلتی تھی ، ضلعوں کے حکام دیہات کا انتظام کچھ تو براہ راست اور کچھ با اثر ہندوون کے ذریعہ کرتے تھے ، کاشتکاروں پر لگان مقرر کرنا اور اس کو وصول کرنا اور زراعت کیلئے پر امن مواقع کا فراہم کرنا انھی کا فرض ہوتا تھا ، کاشتکارون کی اہمیت کے متعلق ترکون کا خیال اس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سپاہی اور کاشتکار سلطنت کے دو بازو ہیں چونکہ سلطنت کی آمدنی کاشتکاروں ہی کی مالگذاری پر منحصر تھی ، اس لیے ان کی حالت بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل ہو سکے ، نئی زمینوں کی کاشت کیلئے کاشتکارون کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی ، تاکہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرکے سلطنت کی آمدنی کو بڑھائیں ، تاریخوں میں ایسے واقعات ملتے ہیں ، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی کبھی کاشتکارون پر ظلم ہوتا تھا ، لیکن عام طور پر کاشتکارون سے معمولی لگان وصول کیا جاتا تھا ، مگر اس کی شرح شریعت اسلامیہ کے مطابق نہیں ہوتی تھی ۔

سلطنت کے اکثر حصوں میں کاشتکاروں کے ساتھ حکام کا براہ راست تعلق نہیں ہوتا تھا ، بلکہ وہ ہندو امیروں اور سرداروں سے مقررہ رقم بطور خراج وصول کیا کرتے تھے ' ان میں سے بعض ریاستوں کے راجہ ہوتے تھے اور بعض صرف چند قریوں کے مالک اور سردار ہوتے تھے ، ترک ان سب کو ایک ہی طبقہ میں شمار کرتے تھے ' اور انہی کو بعد میں زمیندار کہا جانے لگا ' آجکل یہ اصطلاح کچھ مبہم سی ہوگئی ہے ' اس زمانہ کے لحاظ سے زمیندار کے معنی سردار کے لینا زیادہ مناسب ہوگا ' ہندو سردار سلطنت کیلئے ایک بڑا خطرہ خیال کیے جاتے تھے ' کیونکہ ان کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا اور اس کیلئے وجوہ بھی تھے کہ جب کبھی ان کو موقعہ ملیگا وہ بغاوت کر بیٹھینگے اس لئے ان کے متعلق دو نظریے تھے ' ایک یہ کہ ان کی طاقت کو بالکل توڑ دیا جائے ' دوسرا یہ کہ جب تک وہ سلطنت کے وفادار رہیں اور مقررہ خراج ادا کرتے رہیں ان کو اپنے حال پر باقی رکھا جائے ' ان ایک دوسرے کے مخالف نظریوں کی وجہ سے ہندووں پر کبھی کبھی مظالم ڈھائے جاتے تھے ' تاہم ایک عارضی مدت کے سوا تمام زمانوں میں زمینیں ان ہندو مالکوں کے قبضے ہی میں رہیں اور اسطرح سلطنت کے ایک بڑے حصہ کا انتظام ہندووں کے ذریعہ کیا جاتا رہا ۔

ملک کے تمام لوگ ترکوں کے مطیع اور فرمانبردار نہیں تھے بعض راجپوتوں نے ایسے علاقوں میں جہاں ترک نہیں پہنچ سکتے تھے اور آسانی کے ساتھ مورچے قایم کیے جاسکتے تھے نئی ریاستیں بنالی تھیں' راجپوتانہ اور ہمالیہ کی اکثر ریاستیں اسی زمانہ کی یادگارھیں' اودھ اور بہار میں بھی چند راجپوت جاگیردار آزاد تھے ' اور بعض مسلمانوں کے ماتحت رہ کر بھی آزادی کی زندگی بسر کرتے تھے ' یہ آزاد جاگیرداریاں آج تک پائی جاتی ہیں .

ترکوں کی خارجی حکمت عملی یہ تھی کہ فتوحات کے ذریعہ اپنی سلطنت کو وسیع کریں ' مگر شمال مغربی جانب سے ایک زبردست خطرہ پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے ترک نئی فتوحات کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتے تھے ' یہ خطرہ تاتاریوں کی طرفسے تھا جنہوں نے

چنگیز خاں (۱۱۵۵ - ۱۲۲۷) کے ماتحت ایک زبردست سلطنت بنالی تھی ' اگرچہ چنگیز خاں خود ہند نہیں آیا ' مگر اس کی قوم کے لوگ سنہ ۱۲۲۰ع سے لیکر پنجاب کی طرف بڑھنے لگے تھے ' اور دریائے سندھ تک پھیل گئے تھے ' ان کی وجہ سے دھلی کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہوگیا تھا ' تاتاریوں کی آمد کے بعد ہند کے ترکوں کا سلسلہ افغانستان کے اس پار کے ترکوں سے منقطع ہوگیا تھا ' دھلی کے بادشاہ ہمیشہ اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح ہند کو تاتاریوں کے حملوں سے بچائیں ' چنانچہ تیرھویں صدی میں سلطنت کو وسیع کرنے کی بجائے اس کے استحکام کی طرف توجہ کی گئی ' نئی فتوحات کا سلسلہ چودھویں صدی سے شروع ہوا جب کہ ترکوں نے سرحد کو مضبوط کرلینے کے بعد مالوہ اور گجرات کو فتح کیا ' اور ادھر جنوبی ہند کے شہر مدورا تک ان کی فوجیں پہنچ گئیں ' جنوبی ہند کی فتوحات ایک حد تک عارضی تھیں ' مگر دریائے کرشنا تک ان کا تسلط ہوگیا تھا .

اس جگہ ان راستوں کے متعلق کچھ لکھنا ضروری ہے جو دھلی سے جنوبی ہند کی طرف جاتے تھے ' کیونکہ جنوبی ہند کی جنگی مہموں کا سمجھنا بہت کچھ ان راستوں کے سمجھنے پر موقوف ہے ' اراولی کا سلسلۂ کوہ راجپوتانہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ' اسکا شمالی سرا دھلی تک پہنچ گیا ہے ' اس سلسلہ کے مغرب میں زمین چٹیل اور بیابان ہے ' جس کی وجہ سے کوئی جنگی مہم اس سر زمین میں کامیاب نہیں ہوسکتی ' اس سلسلہ کے مشرق میں تین راستے اجمیر ' رتلام اور جھانسی سے ہوکر گجرات تک آئے ہیں ' اب ان تینوں راستوں پر ریلیں نکال دی گئی ہیں ' پرانے زمانہ میں ان راستوں کی حفاظت کے تین زبردست مورچے اجمیر ' رنتھمبور (سیوائی اور مادھوپور جنگشن کے قریب) اور گوالیار تھے ' اور جب ان پر ترکوں کا قبضہ رھتا تو مالوہ اور گجرات تک وہ آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے تھے ' اور جب ان پر دشمنوں کا قبضہ ہوجاتا تو کسی ایک راستہ سے گزرنا بہت مشکل ہوجاتا . جنوبی علاقوں پر قبضہ پانے کیلئے

ضروری تھا کہ ان مورچوں کے ھندو راجاؤں کو یا تو شکست دی جائے یا ان سے صلح کرلی جائے چنانچہ ان پر کبھی تو ترکوں کا اور کبھی ھندو راجاؤں کا قبضہ رھتا تھا، جب دھلی کے تخت پر کوئی زبردست بادشاہ ھوتا تو ان مورچوں پر قبضہ حاصل کرلیتا تھا اور جب مرکزی حکومت کمزور ھوجاتی تو ھندو راجہ ان پر اپنا تسلط قایم کرلیتے تھے۔ اس زمانہ کی تاریخ میں یہ مورچے بار بار ایک دوسرےکے ھاتھ بدلتے رھتے تھے.

آخر میں چند الفاظ دھلی کی تعمیر کے متعلق لکھنے ھیں، مہابھارت کی اکثر لڑائیاں اسی شہر کے قریب پیش آئی تھیں، اور اس رزمیہ داستان میں جس شہر کا ذکر ھوا ھے وہ غالبا دھلی ھی کے قریب کوئی شہر تھا۔ ھمارے پاس پرانی کوئی یادداشت موجود نہیں ھے، البتہ اتنا کہا جاسکتا ھے کہ گیارھویں صدی سے پہلے اس شہر کی کوئی خاص اھمیت نہیں تھی، یہانتک کہ اس صدی کے وسط میں ایک راجپوت حکمران نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا، سب سے پہلے ترکوں نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اور بعد کے فرمانرواؤں نے یکے بعد دیگرے اس شہر کے اطراف وجوانب میں بہت سے نئے شہر آباد کئے، سولھویں صدی عیسوی میں سکندر لودھی نے دھلی کو چھوڑکر آگرہ کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا، اس کے بعد مغل شہنشاہ شاھجہاں نے اپنے نام سے اس شہر کے قریب ایک دوسرا شہر آباد کیا اور اس کو اپنا پایۂ تخت بنایا، سنہ ۱۸۵۷ع تک یہ مغل فرمانرواؤں کا پایۂ تخت رھا، اس کے بعد ۵۴ چون سال تک شہر دھلی سلطنت کا صدر مقام نہیں رھا، یہانتک کہ سنہ ۱۹۱۱ع میں انگریزوں نے اس کو اپنا صدر مقام بنایا اور پرانی دھلی سے قریب ایک نئی دھلی آباد کی.

باب ۲۲

ترک بادشاہ

تخت دہلی پر چھبیس ترک بادشاہ یکے بعد دیگرے بیٹھے ' مگر ان میں چند ہی قابل تھے ' دوسرے صرف نام کے بادشاہ تھے ' اور اتنے کمزور تھے کہ ان کا خود کو سنبھالنا بہت دشوار تھا ' ان کی حیثیت محض کٹ پتلیوں کی تھی ' اور وہ درباریوں کے اشاروں پر ناچتے تھے ' اور آئے دن معزول ہوتے رہتے تھے ' پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک تھا ' اس نے سنہ ۱۲۱۰ء میں پولو میں گرکر وفات پائی ' ایک سال بعد اس کا غلام اور داماد التتمش * تخت پر بیٹھا ' اس کا سب سے پہلا کام اپنی سلطنت کو دوبارہ منظم کرنا تھا کیونکہ بنگال ' ملتان اور راجپوتانہ کے چند علاقے پہلے ہی سے آزاد ہوچکے تھے ' بیس سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد اس نے ان سب کو نیچا دکھایا ' اور پھر نئی فتوحات کی طرف متوجہ ہوا لیکن موت نے اسے مہلت نہیں دی ' اور وہ سنہ ۱۲۳۶ء میں انتقال کرگیا ' اس کے بعد پانچ فرمانروا یکے بعد دیگرے تخت پر آئے ' جن کی کل مدت حکومت دس سال تھی ' ان میں صرف رضیہ مشہور تھی ' ہند کے مسلم فرمانرواؤں میں صرف یہی ایک عورت تھی جس نے بادشاہت پائی ' اس دس سال کے عرصہ میں اندرونی سازشیں ' صوبائی بغاوتیں اور تاتاریوں کے حملے ہوتے رہے ان کے بعد نصیرالدین محمود تخت پر بیٹھا اور سنہ ۱۲۴۶ء سے سنہ ۱۲۶۶ء تک حکومت کی ' یہ بہت ہی نیک اور روادار بادشاہ تھا ' اسے علم کا بڑا ذوق تھا تاہم اس کی حکومت کو جو استقلال نصیب ہوا وہ اس کی ذاتی قابلیت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ایک ترکی غلام بلبن کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا ' التتمش نے اس کو خریدا تھا اور اس

---

* بکسر الف و میم و ضم تائے اول و سکون لام و تائے ثانی و شین پرانی کتابوں میں التمش بفتح الف لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے ۔

کی تربیت کی تھی ' اور بہت جلد وہ بڑے درجہ پر پہنچ گیا تھا ' ابتداء میں دو سال تک بلبن کے دشمن اس پر غالب رہے ' اس کے بعد اس کو جو اقتدار حاصل ہوا تو وہ نصیرالدین محمود کے اوپر بھی حاوی ہوگیا ' اس کے زمانہ سلطنت میں بلبن ہی حقیقی بادشاہ تھا ' اس کے بعد اسی کو بادشاہت ملی ' اور اس طرح سنہ ۱۲۶۶ء سے سنہ ۱۲۸۷ء تک بلا شرکت غیرے وہ ہند کا مالک بنا رہا ' اس نے سنہ ۱۲۸۷ء میں وفات پائی ۔

بلبن بہت ہی قابل اور اولوالعزم بادشاہ تھا ' اس نے سب سے پہلے اپنی اور اپنے خاندان کی سلطنت کو مستحکم بنانے کی کوشش کی ' تخت پر آنے کے بعد وہ مذہب کا بڑا پابند ہوگیا تھا ' مگر سلطنت کے معاملات میں وہ اسی قانون کی پیروی کرتا تھا جس کو وہ سلطنت کے استحکام کیلئے مفید سمجھتا تھا ؛ وہ انصاف کو بڑی سختی سے قایم کرتا تھا اور ایسی سزاؤں کے جاری کرنے سے بھی پرھیز نہیں کرتا تھا جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا تھا ' اپنی حکومت کی ابتدا میں وہ مخالفین کے ساتھ لڑتا رہا اور جب مختلف شورشوں اور بغاوتوں کے فرو کرنے سے کچھ فرصت ملی تو اس نے تاتاریوں کے حملوں کی مدافعت کا با قاعدہ انتظام کیا ' اس کے آخری عمر میں بنگال کے حاکم نے بغاوت کی ' اس لئے اس نے اس کے خلاف دو مرتبہ فوج روانہ کی ' دونوں مرتبہ شاہی فوج کو شکست ہوی ' اس لئے بلبن خود فوج لیکر چلا ' باغی کو شکست دی اور پھر اس کو قتل کردیا ' اور اس کے خاندان اور طرفداروں کو قید کرکے لکھنوتی * کے شہر میں سب کو دار پر چڑھا دیا ' اور اپنے چھوٹے بیٹے بغراخان کو بنگال کا ناظم بناکر واپس دھلی پہنچا ۔

بلبن کا بڑا لڑکا محمد ملتان کا ناظم تھا ' اس نے بڑی قابلیت کے ساتھ سرحد کی حفاظت کی ' تاریخوں میں اس کو ترک

---

* مین خاندان کے زمانہ میں اس شہر کا نام گور تھا ، بعد کو لکھنوتی قرار پایا ، اس وقت یہ عظیم الشان شہر ایک کھنڈر ہے اور بیس مربع میل سے زیادہ اس کا رقبہ ہے ۔

خاندان کا بہترین فرمانروا بتایا جاتا ہے ، وہ ایک تجربہ کار بہادر اور مدبر سپاہی تھا ، علم کا بہترین ذوق رکھتا تھا ، اس کے علاوہ وہ مہذب اور وفادار تھا اور اس کی زندگی صاف ستھری تھی سنہ ۱۲۸۵ع میں محمد تا تاریوں کے ساتھ ایک لڑائی میں مارا گیا جس کی وجہ سے بلبن کا دل ٹوٹ گیا ، اور اسی غم میں وہ دو سال بعد انتقال کر گیا ، وزیروں اور درباریوں نے بغرا خان کے لڑکے کیقباد کو تخت پر بٹھایا ، اس وقت اس کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی ، اس نے سنہ ۱۲۸۷ع سے لیکر سنہ ۱۲۹۰ع تک حکومت کی ، اگرچہ اس کی تعلیم و تربیت بہت اچھی تھی تاہم تخت پر آنے کے بعد وہ سب پابندیوں کو بھلا بیٹھا اور انتہا درجہ کا عیاش ثابت ہوا ، آخر اس پر فالج کا حملہ ہوا ، اور جلال الدین خلجی نامی ایک باغی کے ایک آدمی نے اس کا کام تمام کردیا ، اس طرح بلبن کے اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا ، جسکے مستحکم کردے کا وہ اتنا آرزومند تھا ، اب اس کی نسل ایک محکوم کی حیثیت سے پچاس سال تک بنگال پر حکومت کرتی رہی ۔

باغی جلال الدین ترکوں کی ایک شاخ خلجی خاندان سے تھا جو ایک زمانہ سے افغانستان میں آباد ہوگیا تھا ، ترک عموما خلجیوں کو پسند نہیں کرتے تھے ، اس کے باوجود بہت سے خلجی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے ، جلال الدین نے سنہ ۱۲۹۰ع سے سنہ ۱۲۹٦ع تک حکومت کی ، وہ کافی بوڑھا ہوچکا تھا ، اس کا دور حکومت علاء الدین خلجی کی وجہ سے ممتاز ہے جو اس کا بھتیجا اور داماد تھا ، اس نے جنوبی ہند میں بڑی زبردست کامیابیں حاصل کیں ، علاء الدین انتہائی اولوالعزم ، غیر مخلص ، بے رحم ، مکار اور عیاش تھا ، ہند کی تاریخ میں سب سے گھناؤنا کردار اسی کا نظر آتا ہے ، مگر طاقت اور قوت میں اس کا کوئی نظیر نہیں تھا ، وہ جدھر بھی جاتا فتح اس کے قدم چومتی تھی ، وہ دوسروں کیلئے دہشت بنا ہوا تھا ، بلبن کی طرح وہ اسی قانون کو تسلیم کرتا تھا جو حکومت کیلئے مفید ثابت ہو ، اسی لئے وہ سخت سے

سخت سزائیں جاری کرتا تھا ، اس کی خوفناک سزاؤں کی کوئی خاص توجیہ نہیں پیش کی جاسکتی .

جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں علاءالدین کو فروغ حاصل ہوا ، وہ پہلے پہل ایک صوبہ کا ناظم بنایا گیا پھر دوسرا صوبہ بھی اس کے حوالہ کردیا گیا ، مگر اس کی اولوالعزمی نے اسے چین لینے نہیں دیا ، خانگی پریشانیوں کی وجہ سے وہ صوبیداری کو چھوڑ کر میدان جنگ پر چلا گیا ؛ اس نے مالوہ پر فوج کشی کی ، اس کے بعد سنہ ۱۲۹۴ع میں آٹھ ہزار سواروں کو لیکر جنوب کی طرف بڑھا اور یادوا ریاست کے پایہ تخت دیوگیر پر زبردست حملہ کیا ، اور وہاں سے سونا چاندی ، سلک ، موتی اور دوسرے جواہرات کی صورت میں بہت سا مال غنیمت لیکر واپس ہوا ، وہ بہت دنوں تک شاہی خزانہ میں اس مال غنیمت کو داخل کرنے سے گریز کرتا رہا ، آخرکار چچا اور بھتیجے میں مفاہمت کی کوشش کی گئی ، اور علاءالدین نے گنگا کے کنارے بادشاہ سے ملنے کی خواہش کی ، اپنے خیر خواہوں کے مشورہ کے خلاف جلال الدین اپنے بھتیجے سے ملنے کیلئے گیا جہاں دھوکہ سے اس کو قتل کردیا گیا ، یہ ایسا کھلا ہوا ظلم تھا کہ ترک علاءالدین سے متنفر ہوگئے ، مگر وہ فورا دھلی کی طرف بڑھا اور رشوت سے سب کا منہ بند کردیا اور پھر ان کی مدد سے اکتوبر سنہ ۱۲۹۶ع میں تخت نشیں ہوا .

علاءالدین کیلئے ابتدا میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ، اس کا کوئی هم خیال نہیں تھا ، اس کے چند یار باش تھے جنھوں نے جلال الدین خلجی کے قتل کرنے میں اس کا ہاتھ بٹایا تھا ، مگر ان پر وہ اعتماد نہیں کرسکتا تھا ، ترک عام طور پر اس سے بیزار تھے ، تمام سردار شورش پسند تھے ، پنجاب کی سرحد پر تاتاریوں کی وجہ سے ہمیشہ خطرہ لگا ہوا تھا ، مگر علاءالدین نے ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے اس کی مشکلات خود بخود حل ہوتی چلی گئیں ، اور شاندار فتوحات کو حاصل کرنے

کا اچھی طرح موقعہ ملا ، سب سے بڑا خطرہ ان ترکوں کی طرف سے لگا ہوا تھا ، جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے ، اور جن کو کوئی عہدہ نہیں ملتا تھا وہ حکومت کی طرفسے مفت تنخواہیں پا رہے تھے ، یا ان کو مخصوص علاقوں کی آمدنی بطور عطیہ کے دیدی جاتی تھی ، علاءالدین نے تمام وظیفے اور عطیے یک لخت بند کردئے ، ذریعۂ معاش کے چھن جانے کے بعد ترکوں کیلئے اس کے سوائے کوئی اور صورت نہیں تھی کہ اس ملک سے نکل جائیں یا علاءالدین کے رحم و کرم پر زندگی گزاریں ، مالی مجبوریوں کی بناء پر سب نے وفاداری اختیار کی ، علاءالدین نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ شراب کو کلی طور پر ممنوع قرار دیا ، کیونکہ مختلف سردار شراب کی مجلسوں کو اہم سازشوں کا ذریعہ بنائے ہوے تھے ، اس نے شراب پینے کی سخت سزا تجویز کی اور سارے ملک میں جاسوسی کا ایک زبردست جال پھیلا دیا ، تاکہ لوگ بھولے سے بھی زبان پر بغاوت کا لفظ نہ لاسکیں ، ہر ایک پر ایک قسم کا خوف و ہراس طاری ہوگیا تھا ، لوگوں کے چہروں پر بشاشت کی بجائے مردنی چھاگئی تھی ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زمانہ تک ہر قسم کی سازش بند ہوگئی .

ہندو سرداروں کے خلاف اقتصادی دباو کا ہتھیار استعمال کیا گیا ، اس زمانہ کے زمیندارانہ نظام کی تفصیلات کا ہمیں علم نہیں ہے ، تاہم اتنا معلوم ہے کہ وہ اپنی جائداد کی مستقل آمدنی کے حقدار تھے ، اس کے علاوہ ہر ایک کے پاس چھپی ہوی دولت تھی ، وہ خراج کی رقم سے کہیں بڑھ چڑھکر اپنے کاشتکاروں سے لگان وصول کرتے تھے ، اس کے علاوہ تحفوں اور نذرانوں کی صورت میں بہت سا مال حاصل کیا جاتا تھا ، بعض اوقات لگان کی شرح سرکاری لگان کی شرح سے بھی زیادہ ہوتی تھی ، طاقتور کمزور کو پیس دیتا تھا ، علاءالدین اور اس کے مشیروں کو اس کا یقین تھا کہ یہ سردار اپنی دولت سے

ان باغیوں کی سرپرستی کرتے رہتے ہیں ' جو ہر وقت حکومت سے لڑنے کیلئے آمادہ ہوجاتے تھے اور اس زمانہ کے حالات سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے ' ان کے خیال میں اس کا بہترین علاج یہی تھا کہ ان سرداروں کو مفلس اور قلاش بنادیا جائے چنانچہ اس نے تمام جاگیریں ضبط کرلیں ' اور ان سرداروں کے پاس ان کی خاص زمینوں کے سوا کوئی اور زمین نہیں چھوڑی پھر سرکاری عہدہداروں کے ذریعہ تمام زمینوں کی پیمائش کرائی اور پیداوار کا آدھا حصہ مالگذاری کی شرح قرار دیا ' اس وقت ہمارے پاس لوگوں کی اقتصادی مشکلات کے اندازہ لگانے کا کوئی مستند ذریعہ نہیں ہے ۔ تاہم اتنا کہا جاسکتا ہے کہ آدھی پیداوار تقریباً اس پوری آمدنی کے برابر ہوتی تھی جو لوگوں کی ضروریات زندگی کے بعد بچ رہتی تھی ' اس لحاظ سے سرکشی یا عیاشی کیلئے کوئی دولت باقی نہیں رہ سکتی تھی ' مورخین عام طور پر اس شرح کے متعلق اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں ' لیکن اس میں شبہ نہیں کہ علاءالدین کی یہ حکمت عملی بہت کامیاب رہی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے زمانۂ حکومت میں کوئی بڑی بغاوت نہیں ہوسکی * ۔

شمالی سرحد پر تاتاریوں کا زبردست خطرہ موجود تھا ' علاءالدین نے پہلے پہل جنوبی ہند کے راستوں کے بنانے کی طرف توجہ کی مگر بہت جلد اس کو محسوس ہوگیا کہ شمالی سرحد سے غفلت برتنا بہت ہی خطرناک ہے ' تاتاری اس سرحد پر برابر حملے کرتے رہتے تھے ' اور ایک مرتبہ تو ان کا ایک

---

* وقایع نویس کی عبارتوں سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام ہندوؤں کے خلاف یہ تدبیریں اختیار کی گئی تھیں ' مگر حالنچ پرکال کے بعد واضح ہوجاتا ہے کہ علاءالدین نے ہندو کے لفظ کو ایک خاص معنے میں استعمال کیا ہے ۔ اس کی مراد سرداروں سے تھی ' چھوٹے بڑے سرداروں کے درمیان مساوات برقرار دینا بھی اسی مقصد کو ظاہر کرتا ہے ' تاکہ طاقت ور کمزور کو کچل نہ سکے ۔

جرار لشکر دھلی کے قریب پہنچ چکا تھا ' جس کی تعداد ایک لاکھ بیس ھزار بتائی جاتی ھے ' ایک دفعہ بادشاہ خود محصور ھوگیا تھا ' مگر کسی طرح وہ بچ نکلا ' ان حملہ آوروں نے سارا ملک تباہ و تاراج کیا اور قریب تھا کہ دھلی پر بھی ان کا قبضہ ھوجائے ' لیکن معلوم نہیں کیا بات تھی کہ حملہ آور اپنے وطن کی طرف واپس چلے گئے ۔

علاءالدین نے سرحدی دفاعات کی نئے سرے سے تنظیم کی ' اور ملک تغلق جیسے قابل سپہ سالار کو ایک بڑی فوج کے ساتھ سرحدی دفاع کیلئے متعین کیا ' یہ سپہ سالار تقریبا پچیس سال تک تاتاریوں کا کامیاب مقابلہ کرتا رھا ' اس کے علاوہ مکمل امن و امان قایم کرنے کی غرض سے علاءالدین نے دھلی کے قریب ایک مستقل فوج تیار کی جس کو شاھی خزانے سے نقد تنخواھیں دی جانے لگیں ' اس کی وجہ سے علاءالدین کو بہت سی مالی مشکلات پیش آئیں ' ان سے اس زمانہ کے اقتصادی حالات کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ھے ۔

دھلی کے اندر قیمتی دھاتوں اور جواھرات کی بڑی مانگ رھتی تھی ' کیونکہ سکوں کے بنانے کیلئے حکومت کو اس کی ضرورت تھی ' اور لوگ زیور بنانے ' تحفے تحائف پیش کرنے اور دولت جمع کرکے رکھنے کیلئے ان ھی کو طلب کرتے تھے ' مقامی طور پر ان کی کوئی پیداوار نہیں تھی ' بلکہ یہ چیزیں تجارت یا خراج کے ذریعہ حاصل ھوتی تھیں ' دور افتادہ بندرگاھوں میں سونا چاندی زر مبادلہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا ' لیکن تیرھویں صدی میں یہاں سے کوئی رسد شمالی ھند کو نہیں آتی تھی ' اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ سکوں کی قلت ھوگئی اور چیزوں کی قیمت کم ھوگئی ' لوگ عام طور پر فارغ البالی کے ساتھ زندگی گذارنے لگے ' لیکن جب علاءالدین نے دیوگیر کی ساری دولت دھلی کے درباریوں پر لٹادی تو بازاروں میں سونے چاندی اور جواھرات کی افراط کی وجہ سے چیزوں کے

دام بڑھ گئے ، اور فوجیوں کا خرچ بہت بڑھ گیا ، علاءالدین نے جبری طور پر چیزوں کا بھاو بہت کم کردیا ، اور اس میں اس کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوی ۔

علاءالدین کے تمام طریقے حقیقت میں جنچے تلے ہوتے تھے ، سامان رسد کے بہم پہنچانے ، اسباب حمل و نقل کے فراہم کرنے باربرداری اور راتب بندی کو کامیابی کے ساتھ چلانے میں اسکو کمال حاصل تھا ۔ لگان کا ایک حصہ جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا ، اور اس کو شاھی ذخیروں میں جمع کردیا جاتا تھا ، کاشتکاروں کو حکم تھا کہ وہ اپنی زائداز ضروریات پیداوار کو ان ھی تاجروں کے حوالے کریں جو چیزوں کو مقررہ قیمت پر بیچنے اور پورے مال کو سرکاری گوداموں میں منتقل کرنے کا حکومت سے عہد کرچکے ہوتے ہیں ، خردہ فروش بیوپاری ان گوداموں سے مال لیکر عوام کو مقررہ قیمت پر بیچتے تھے ، بیوپاریوں کو اپنے قابو میں رکھنا بہت آسان تھا ، کیونکہ ان کو اپنی بیوی اور بچوں کی ضمانت پر یہ عہد کرنا ہوتا تھا کہ وہ شاھی احکام کی خلاف ورزی نہ کرینگے ، اور ان سے عہد لینے کیلئے دھلی کے قریب ناظر اور نگران مقرر تھے ، کاشتکاروں کی نگرانی بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں تھی ، سرکاری عہدہ دارھی ان کی نگرانی کے لئے کافی تھے ، البتہ شہر کے دکانداروں اور سٹہ بازوں پر قابو پانا ذرا مشکل تھا ، مگر علاءالدین نے جاسوسی کا جو وسیع جال پھیلا رکھا تھا اس سے ان لوگوں کو شاھی احکام کی خلاف ورزی کی ذرا بھی ہمت نہیں ہوتی تھی ، مختلف مقامات میں جاسوسوں کی کئی جماعتیں تھیں جن کا کام ایک دوسرے کی حرکات و سکنات کی نگرانی کرنا ہوتا تھا ، یہ سب ملکر عوام کی جاسوسی کرتے تھے ، اس پر مزید یہ کہ خود بادشاہ کبھی کبھی اپنے معتبر آدمیوں کو بازار کی عام حالت معلوم کرنے کے لئے بھیجتا تھا ، اگر کوئی دکاندار ناپ تول میں جان بوجھ کر کمی کرتا تو اتنا حصہ اس کے بدن سے کاٹ لیا جاتا تھا ، اس سزا کی نوعیت ھی کچھ ایسی تھی کہ کوئی بھی ناپ تول میں کمی کرنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا ، بعض اوقات اس نظام کے عمل

در آمد ہونے میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی تھیں ' مگر بادشاہ کا عزم سب پر غالب آجاتا تھا .

ایک طرف حکومت کے قوانین مرتب ہوتے جا رہے تھے تو دوسری طرف فتوحات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جا رہا تھا ' جنوبی ہند کی سڑکوں کی تعمیر کے بعد مالوہ اور گجرات کو فتح کیا گیا جنوبی ہند کی طرف تین مہمیں سنہ ۱۳۰٦ع اور سنہ ۱۳۰۱۱ع کے درمیان بھیجی گئیں ' ان کی تفصیل آئندہ باب میں آئیگی ' یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس مرتبہ علاءالدین نے بذات خود فوجوں کی قیادت نہیں کی بلکہ وہ پائے تخت میں رہکر اپنے ایک منظور نظر غلام ملک کافور کو روانہ کیا ' جو گجرات کی لڑائی میں قید ہوکر آیا تھا اور اپنی ذاتی قابلیتوں کی بناء پر بادشاہ کے پاس بڑا تقرب حاصل کرلیا تھا ' یہ ہند کا سب سے بڑا سپہ سالار تھا .

علاءالدین کے آخری ایام بڑی پریشانی کے ساتھ گذرے ' غیر معمولی محنت کی وجہ سے اس کی صحت جواب دے چکی تھی ' اس کی قوت فیصلہ کمزور ہوگئی ' اور اسکا عزم بھی ڈھیلا ہوگیا ' محل میں سازشوں کی بھرمار ہوگئی ' ہر طرف بغاوت کے آثار نمایاں تھے ' ظن غالب یہ ہے کہ تخت لینے کی ہوس میں ملک کافور نے اپنے آقا کو قتل کردیا ' ایک مہینے بعد وہ بھی مارا گیا ' علاءالدین کا ایک بیٹا قطب الدین مبارک شاہ تخت پر بیٹھا ' وہ بھی چار سال تک عیاشی کرنے کے بعد اپنے ایک منظور نظر غلام کے ہاتھوں مارا گیا ' اس غلام نے سلطنت پر اپنا قبضہ جمالیا لیکن چند ہی دنوں کے اندر ملک تغلق کے ہاتھوں شکست کھائی اور پھر مارا گیا ' اور جب تخت کا کوئی حقیقی وارث نہ رہا تو لوگوں نے ملک تغلق ہی کو بادشاہت کیلئے منتخب کرلیا .

تمام ترک بادشاہوں میں ملک تغلق بہت ہی نیک خصال بادشاہ تھا ' وہ ایک تجربہ کار سپاہی اور مدبر حکمران تھا ' اس نے سنہ ۱۳۲۰ع سے سنہ ۱۳۲۵ع تک حکومت کی ' وہ سب سے پہلے فوج کی اور پھر کاشتکاروں کی بھلائی کا آرزومند تھا ' اس نے

سلطنت کی نئے سرے سے تنظیم کی، علاءالدین کے سخت قوانین کو منسوخ کیا، صوبوں کی حکومت کیلئے دیانتدار ناظم مقرر کئے، مالگذاری کی شرح کم کی، اور سرکاری کارندوں کو کاشتکاروں اور رعایا سے جبری حصول زر سے روکا تمام سرداروں کی جاگیریں لوٹا دیں؛ اور ایسی موثر اصلاحات نافذ کیں جو ملک کی رعایا کیلئے بہت مفید تھیں، دور افتادہ علاقوں کی شورشوں کو مناسب طور پر دبانے کی کوشش کی۔ ملک تغلق نے اپنے بیٹے محمد کو جنوبی ہند کی شورش کے دفع کرنے کیلئے بھیجا، چند سال بعد بنگال کی بغاوت کو فرو کرنے کیلئے خود ہی فوج لیکر گیا، مگر جب وہ دہلی واپس آرہا تھا تو وہ اور اس کا منجھلا بیٹا محمود ایک عمارت کے گرنے کی وجہ سے جہاں ان دونوں نے عارضی طور پر قیام کیا تھا دب کر مرگئے، معتبر شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حادثہ اتفاقی نہیں تھا بلکہ اس کے بیٹے محمد تغلق نے اپنے باپ کو سلطنت حاصل کرنے کی غرض سے مروا دینے کی ایک سازش کی تھی۔

محمد تغلق اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اس کے کردار کو واضح شکل میں پیش کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ اس کی شخصیت کے متعلق بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں، موجودہ زمانہ کے بعض مورخ اس کے عالی دماغ ہونے کی شہادت دیتے ہیں، اور بعض اس کو پاگل قرار دیتے ہیں، اس کے ہم عصر اس کی شخصیت کو سمجھ سے بالا تر بتاتے ہیں، مگر تاریخی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک بے چین ہمہ گیر قابلیتوں والا انسان تھا، اس کے دماغ میں مختلف منصوبے تھے جن میں سے بعض بالکل ہی عجیب و غریب تھے، بعض سے اس کا سیاسی تدبرظاہر ہوتا ہے، لیکن محض بے استقلالی بد مزاجی اور عدم بصیرت کی وجہ سے ان کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا، وہ زبردست فتوحات کے خواب دیکھا کرتا تھا، اس نے ایران کو فتح کرنے کی غرض سے ایک بڑی فوج تیار کی، مگر تنخواہوں کے نہ ملنے کی وجہ سے تمام فوجی تتر بتر ہوگئے، دوسری فوج ہمالیہ کی ایک

پہاڑی ریاست کو فتح کرنے کیلئے بھیجی ' لیکن بدنظمی کی وجہ سے تمام فوج برباد ہوگئی ' بنگال آزاد ہوگیا ' نربدا سے جنوب کا پورا علاقہ اس کے قبضہ سے نکل گیا ' شمالی ہند میں ہر طرف بغاوت ہونے لگی ' سلطنت کے اندرونی معاملات میں بھی وہ مستقل مزاج نہیں تھا ' ملکی نظم و نسق کی اصلاح کے متعلق اس کے تجربے ناکام رہے ' اس نے ایک انوکھا علامتی سکہ جاری کیا ' جس سے سرکاری خزانہ کو بڑا سخت نقصان پہنچا ' اس نے دارالسلطنت کو بدلنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ مضحکہ خیز ثابت ہوا ' ان سب باتوں کی تفصیل کے پیش کرنے کی بجائے اس کی آخری کوشش کو بیان کردینا کافی ہے جس سے اس دور کی زندگی کا ایک عام نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ۔

محمد تغلق کا ایک منصوبہ یہ تھا کہ دیوگیر کو اپنا پایہ تخت بنائے ' اس کا نام اس نے دولت آباد رکھا تھا ' اس کا یہ منصوبہ غالبا درست تھا کیونکہ یہ مقام مرکزی حصہ ملک میں ہونے کی وجہ سے تاتاریوں کے حملوں سے بہت دور تھا ' جو آئے دن دھلی پر حملہ کرنے کی کوشش کرتے تھے ' پہلے پہل پایۂتخت کی تبدیلی کی جو صورت اختیار کی گئی وہ معقول تھی ' مگر دھلی کے باشندے دولت آباد جانے پر رضامند نہ ہوے ' اس کی وجہ سے محمد تغلق کو غصہ آگیا ' اس نے حکم دیا کہ دھلی کی پوری آبادی دیوگیر جاکر بسے' چنانچہ بڑی سختی کے ساتھ اس حکم پر عمل کیا گیا ' اور چند دنوں میں دھلی بالکل خالی ہوگئی ' سات سو میل کا لمبا اور دشوار گذار سفر تھا ' بہت سے تو راستہ ھی میں ختم ہوگئے اور جو چند لوگ وھاں پہنچے بھی تو ان کو دیوگیر کی آب و ہوا راس نہیں آئی ' چند سال کے بعد بادشاہ کی طرفسے پھر دھلی واپس چلنے کا حکم ملا ' چنانچہ لوگ جب دھلی واپس پہنچے تو ان کے کھانے پینے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی ' مجبوراً سب کو قنوج کے کنارے آباد کیا گیا جہاں گنگا کے اس پار سے کچھ سامان رسد مل سکتا تھا ' اور جب دھلی میں ضرورت کا سارا سامانِ مہیا ہوگیا تو لوگ پھر دھلی آکر آباد ہوگئے ۔

دھلی میں خوراک نہ ھونے کے دو سبب تھے ، پہلا سبب تو یہ تھا کہ بارش کے نہ ھونے کی وجہ سے ھر طرف قحط کے آثار نمایاں تھے ، اور دوسرا یہ کہ دو آب کا علاقہ بالکل ویران ھوگیا تھا ، جس سے دھلی کو سامان رسد ملتا تھا ، یہ علاقہ گنگا اور جمنا کے درمیان واقع تھا ، یہاں کے کاشتکار اپنی پیداوار دھلی لیجاکر بڑی قیمتوں پر بیچتے تھے ، جب محمد تغلق نے ان پر لگان کی شرح زیادہ کردی تو بہت سے کاشتکاروں نے زراعت کا پیشہ چھوڑکر چوری اور ڈاکہ زنی اختیار کرلی ، بعض نے قیمتوں کو بڑھانے کی غرض سے اپنے اناج کے ذخیرے جلا دئے ، اور جب کاشت کم ھوگئی تو پیداوار بھی گھٹ گئی ، ھر موسم میں بادشاہ کے کارندے کھیتوں میں پہنچتے تھے اور لگان مقرر کرتے تھے ، اس کی وجہ سے کاشتکاروں میں بغاوت کے جذبات بھڑکنے لگے ، محمد تغلق نے ان سب کو باغی قرار دیا اور ان کے خلاف ایک فوج روانہ کی ، بہت سے کاشتکار جانوروں کی طرح ذبح کردئے گئے اور ان کی زمینوں کو اجاڑکر رکھ دیا گیا ، اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ پیداوار بالکل نہ ھوسکی ، اور جب دھلی دوبارہ آباد ھوی تو محمد تغلق نے بہت سا روپیہ زراعت کی ترقی کیلئے عنایت کیا مگر سرکاری عہدہ داروں نے اس کا ایک بڑا حصہ ھضم کرلیا ، جس کی وجہ سے زراعت کو کچھ نمایاں ترقی نہیں ھوسکی جب محمد تغلق کے بعد فیروز تغلق تخت پر بیٹھا ، تو اس نے پھر سے دو آب کو ترقی دی .

یہ مختصر سا خاکہ محمد تغلق کے منصوبوں اور اس کے نتائج کو سمجھنے کیلئے کافی ھے ، اس کے آخری زمانۂ حکومت میں ھر طرف بغاوتیں ھونے لگیں جن کو اس نے بے دردی کے ساتھ کچلنا شروع کیا ، دنیا کا مشہور سیاح ابن بطوطہ اسی کے زمانہ میں آیا تھا اور اس کے دربار میں کئی سال تک رھا ، وہ بادشاہ کی بے رحمی اور سفاکی پر بہت نالاں نظر آتا ھے اس کی سختی بغاوت کی باعث اور بغاوت اس کی سختی کا نتیجہ ھوتی تھی ، مسلسل

ناکامیوں کی وجہ سے بادشاہ کے مزاج میں تندی اور سختی پیدا ہوگئی تھی ، سلطنت کے تمام معاملات درہم برہم ہو رہے تھے ۔ اس کی سلطنت تباہ ہونے سے محض اس لئے بچ گئی کہ سرحد پر تاتاریوں کا زیادہ دباؤ نہیں تھا ، کیونکہ سنہ ۱۳۳۰ء کے بعد سے کسی حملہ کا ذکر نہیں آتا ، چند سال بعد محمد تغلق نے روپیہ دیکر ان تاتاریوں کو ہند میں بس جانے کی ترغیب دی ، جس کی وجہ سے یہاں ایک حد تک امن قایم ہوگیا تھا ، لیکن دوسری جگہوں میں بغاوتیں کھڑی ہوگئیں ، سنہ ۱۳۴۵ء میں جنوبی ہند کی بڑھتی ہوی شورش کو دفع کرنے کیلئے بادشاہ بذات خود فوج لیکر پہنچا ، اور اس مہم کو ابھی پورا نہیں کیا تھا کہ دو سال بعد گجرات کی بغاوت کو دفع کرنے کیلئے گیا ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی ہند کے تمام مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل گئے ، جب گجرات کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو نشیبی سندھ کے ایک حکمران کو سزا دینے کیلئے گیا جس نے چند باغیوں کو اپنے ہاں جگہ دے رکھی تھی ، یہاں آکر وہ بیمار پڑا اور سنہ ۱۳۵۱ء میں اس دنیاے فانی سے چل بسا ، اس کو لوگوں سے اور لوگوں کو اس سے نجات مل گئی ، اس کی فوج نے بادشاہت کیلئے اس کے بھتیجے فیروز تغلق کو منتخب کیا ، وہ اسکی فوج کو لیکر دھلی پہنچا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کیا ۔

فیروز تغلق (۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸) ادھیڑ عمر کا تھا ، مگر ذہین ، فیاض اور بردبار تھا ، وہ کمزور بھی تھا ، اس کی ماں ایک شریف ہندو خاندان سے تھی ، اس کے باوجود وہ شریعت اسلامیہ کا بڑا احترام کرتا تھا ، اور عام طور پر خود بھی اس کا پابند تھا ، اس کی حکومت کا آدھا دور لائق اور وفادار نومسلم برھمن وزیر مقبول کی وجہ سے کامیاب رہا ، جس نے بیس سال سے زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کیا ، فیروز نے سندھ اور بنگال میں فتوحات حاصل کرنے کی بے فائدہ کوشش کی مگر دس سال کے تجربہ کے بعد اس نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ

کوئی جارحانہ پیش قدمی نہیں کریگا ' چونکہ شمالی سرحد پر تاتاریوں کے حملے دھیمے پڑ چکے تھے اسلئے ایک مدت تک ملک میں امن و امان قایم ہوگیا ' اس کے علاوہ مقبول کی انصاف پسند اور مدبرانہ حکمت عملی کی وجہ سے ہر جگہ خوشحالی اور فارغ البالی کے آثار نمایاں تھے ' حقیقت میں اس کی حکمت عملی ملک تغلق کی سی حکمت عملی تھی ' اس نے صوبوں کی حکومت کیلئے ایسے ناظم منتخب کئے جو کاشتکاروں کی پوری حفاظت کرسکتے تھے اور ان سے جایز لگان وصول کرتے تھے محض قیاس اور گمان پر کام کرنے والوں کی اس کے پاس کوئی قدر نہیں تھی ' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے فسادات بہت جلد بند ہوگئے ' ویران زمینیں پھر سے آباد ہوگئیں دھلی میں ہر چیز سستی ہوگئی ' اور بادشاہ کو اس بات کا موقعہ ملا کہ اطمینان کے ساتھ تعمیری کاموں کی طرف توجہ کرے اس نے بہت سے نئے شہر اور قصبے آباد کئے ' بے شمار مسجدیں ' محل اور مقبرے بنوائے ' پلوں کی تعمیر کی ' یادگار ستون کھڑے کئے ' آب پاشی کیلئے بہت سی نہریں کھدوائیں ' غرضکہ شمالی ھند کے بعض قریوں میں اب تک اس سنہرے مگر مختصر دور کی یاد تازہ ہے .

بیس سال تک ملک کی حالت بہت بہتر رہی ' مگر جب سنہ ۱۳۷۲ع میں وزیر مقبول کا انتقال ہوگیا تو حالات میں ابتری پیدا ہوگئی ' دو سال بعد فیروز کا ایک عزیز لڑکا مرگیا جس کی وجہ سے بادشاہ کا دل ٹوٹ گیا ' اس کی صحت روز بروز گرنے لگی ' اور اس کی قوت فیصلہ کمزور ہوگئی ' اس میں بدمزاجی پیدا ہوگئی ' معمولی بغاوت پر وہ سخت سے سخت سزائیں دینے لگا ' پایہ تخت کے اندر فرقہ بندیاں شروع ہوگئیں ' سارے وزراء اس سے منحرف ہوگئے ' اور جب اس بوڑھے بادشاہ کا انتقال ہوا تو اس کی سلطنت کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا ' اس کے بعد چھ بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر آئے ' مگر ملک کی بدنظمی میں برابر اضافہ ہوتا ہی رہا ' مختلف

صوبے خود مختار ہوگئے ' اور جب ایک نیا دشمن دھلی کے قریب پہنچا تو کسی میں اس کے روکنے کی اھلیت نہیں تھی ۔

چنگیز خان نے جس شاندار سلطنت کی بنیاد ڈالی وہ بہت دنوں تک قایم نہ رہ سکی ' چودھویں صدی سے پہلے تاتاری مسلمان ہوچکے تھے ' انھوں نے مختلف آزاد ریاستیں قایم کرلی تھیں ' ان میں سے ایک ماوراءالنہر کی ریاست تھی ' جس کو تیمور لنگ نے عروج پر پہنچایا ' یہ شخص سنہ ۱۳۶۹ع میں تخت نشین ہوا ' اس نے ساری دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور خراسان ' ایران ' چینی ترکستان اور روس کے ایک بڑے حصہ کو فتح کرتا ہوا ہند پہنچا ' دسمبر سنہ ۱۳۹۸ع میں معمولی لڑائی کے بعد دھلی کے اندر داخل ہوا اور کئی دن تک اھل شہر کو لوٹتا اور تباہ و تاراج کرتا رہا ' ہزارھا آدمی مقتول ہوگئے ' بہت سے غلام بنالیے گئے ' دھلی سے وہ مشرق کی طرف بڑھا ' ہر جگہ لوٹ مار کی ' اس کے بعد چونکہ مغربی ایشیا میں اس کی بہت ضرورت تھی اسلئے وہ شمالی راستہ سے واپس ہوگیا ' اور چھ سال بعد چین کی سڑک پر اس کا انتقال ہوگیا ' ہند میں اس کا قیام صرف چھ مہینے رہا ' اس کی نیت ہند کو فتح کرنے کی نہ تھی ' اس کے حملے نے ترکوں کی رھی سہی قوت کا بھی خاتمہ کردیا ' اگرچہ پندرہ سال تک ترک ھی حکومت کرتے رھے مگر ان کی حکومت میں کوئی جان باقی نہیں رھی تھی ۔

باب ۲۳

جنوبی ہند میں اسلام کی اشاعت

تیرھویں صدی میں جنوبی ہند کی سیاسی حالت میں ایک اہم انقلاب پیدا ہوا ' چولا ریاست کمزور ہوگئی اور تامل علاقوں پر پانڈیہ کا قبضہ ہوگیا تھا جس کا صدر مقام مدورا تھا ' اب صرف چار ریاستیں باقی رہ گئی تھیں ' یعنی یادوا ' کاکٹیا ' ہائسل ' اور پانڈیہ ' ان کے درمیان آپس کی کشمکش برابر جاری تھی ' ان میں اتنا اتفاق نہیں تھا کہ کسی شمالی حملہ آور کے مقابلہ میں کوئی متحدہ محاذ قایم کرسکیں ' جنوبی ہند پر ترکوں کا سب سے پہلا حملہ دیوگیر پر تھا جبکہ علاءالدین نے یادوا ریاست کے پایہ تخت پر اچانک فوج کشی کی ' اس نے راجہ سے عہد لیا کہ وہ ہر سال خراج ادا کریگا اس کی مقدار ایک صوبہ کی آمدنی کے برابر تھی ' راجہ نے کماحقہ اس عہد کی پابندی نہیں کی ' جس کی بناء پر علاءالدین نے سنہ ۱۳۰۶م میں ملک کافور کو روانہ کیا ' اس نے دیوگیر پر فوج کشی کی ' راجہ نے فوراً ہی اطاعت قبول کرلی ' اور وہ دھلی کے دربار میں حاضر ہوا ' علاءالدین نے اس کو اپنی ریاست پر بحال کردیا ' سنہ ۱۳۰۸م میں ملک کافور نے کاکٹیا ریاست کے صدر مقام ورنگل پر حملہ کیا ' یہاں کے حکمران نے بھی اطاعت کرلی اور زر کثیر بطور فدیہ ادا کیا اور نیز مقررہ خراج کے ادا کرنے کا وعدہ کیا .

اب جنوبی ہند کے ساتھ دھلی کا براہ راست تعلق قائم ہوگیا ' راجاؤں اور مندروں کی دولت کے قصے ہر جگہ مشہور ہوگئے تھے ' ان کے حصول کی خواهش نے علاءالدین کو اس بات پر مجبور کیا کہ جنوبی ہند کی طرف ایک تیسری مہم روانہ کرے ' چنانچہ اس کے حکم سے ملک کافور نے سنہ ۱۳۱۰م میں ہائسل ریاست پر حملہ کیا اور اس کے صدر مقام

کو خوب لوٹا ' اس کے بعد وہ مدورا کی طرف بڑھا ' اس کے پہنچنے سے پہلے ہی سارا شہر خالی ہوگیا تھا ' اس نے اس شہر کو بھی خوب لوٹا اور سیلون کی سرحد تک جاپہنچا ' ملک کافور کو زر و جواہرات کی صورت میں بے انتہا دولت ملی جو علاءالدینؒ کی دیوگیر سے حاصل کی ہوی دولت سے کئی گنی بڑھی ہوی تھی ' لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ اس لوٹ کھسوٹ سے جنوبی ہند کی اقتصادی حالت برباد ہوگئی تھی ' کیونکہ یہ وہ دولت تھی جس کو ملک کی اقتصادی ترقی کیلئے استعمال نہیں کیا جاتا تھا ' یہ مندروں کے اندر جمع کی ہوی دولت تھی جس کو لوگ بطور نذرانہ پیش کرتے تھے ' راجاؤں کی دولت بھی خزانوں میں بند کرکے رکھی جاتی تھی' دستور یہ تھا کہ ہر بادشاہ اپنے پیشرو کی جمع کی ہوی دولت کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا ' اور اپنے زمانہ میں بھی دولت جمع کرنے کی بذات خود کوشش کرتا تھا ' اس طرح یکے بعد دیگرے دولت جمع ہوتی چلی جاتی تھی ' اس کی لوٹ کھسوٹ سے ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا ' البتہ دیہاتیوں کو کچھ نقصان ہوا ہوگا ' کیونکہ وقت پڑنے پر ان کو مندروں سے قرض مل جاتا تھا ' اور وہ ہر وقت ان کی امداد کے متوقع رہتے تھے ' مندروں کی جاگیریں اب بھی باقی تھیں ' دیہاتیوں کو ان سے مدد مل سکتی تھی ' کافور نے ریاستوں کے اندرونی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی ' ان کو اپنے پرانے حکمرانوں کے ماتحت ہی رہنے دیا ' مگر کم از کم چار میں سے دو ریاستوں پر ہر سال باقاعدہ خراج دینے کی پابندیاں عاید کیں ۔

یہ انتظام بہت دنوں تک جاری نہ رہ سکا کیونکہ ان ریاستوں سے سالانہ خراج سال بسال وصول نہیں ہوتا تھا ' اس لئے سنہ ۱۳۱۵ ع میں دیوگیر کے یادوا خاندان کو ہٹاکر اس کی مملکت پر قبضہ کرلیا گیا ' سنہ ۱۳۲۳م میں کاکتیا ریاست

کے صدر مقام ورنگل پر بھی براہ راست دھلی کا تسلط ہوگیا مدورا کیلئے ایک مسلمان حاکم مقرر ہوا ' اب صرف ہاڈسل کی ایک ریاست باقی رہ گئی تھی ' مدورا سے کچھ آگے پانڈیہ ابھی تک حکومت کررہے تھے ' اس کے بعد دھلی کی سلطنت کے خلاف بغاوتیں شروع ہوگئیں سنہ ۱۳۳۴ء میں مدورا کے حاکم نے بغاوت کی اور ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی جو پچاس برس تک قائم رہی ' سنہ ۱۳۴۷ء میں دیوگیر کے مسلمان فرمانروانے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا ' کاکتیا کی ایک شاخ نے ورنگل کو پھر سے فتح کرلیا تھا ' اس طرح اس صدی کے وسط میں جنوبی ہند کے اندر دو خود مختار مسلم ریاستیں قائم ہوگئی تھیں .

آگے چلکر جنوبی ہند میں صرف دو آزاد ریاستیں باقی رہیں جن کے درمیان دریاے کرشنا اور اس کا معاون تنگ بھدرا حد فاصل تھا ' یہ بھمنی اور وجیانگر کی دو ریاستیں تھیں ' پہلی کا بانی حسن گنگو بھمنی تھا جس نے سنہ ۱۳۴۷ء میں علاءالدین بھمن شاہ کے لقب سے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا ' اور سنہ ۱۳۵۸ء تک حکومت کی ' ایک طرف اس کے حدود سلطنت مغربی ساحل سمندر تک پہنچ چکے تھے اور دوسری طرف ورنگل تک اس کا قبضہ ہوگیا تھا ' اس نے اس ریاست کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا تھا ' اور دیوگیر کی بجاے گلبرگہ کو اپنا پاے تخت قرار دیا ' مرنے سے پہلے اس کی سلطنت مضبوط ہوچکی تھی ' فیروز تغلق نے مجبورا اس کی خود مختاری مان لی ' اور خلیفہ مصر نے بھی اس کی بادشاہت کو تسلیم کرلیا تھا * .

* بھمنی ریاست کو حکومت دکن بھی کہا جاتا ہے ، مگر اس لفظ سے غلط فہمی ہوسکتی ہے ، کیونکہ دکن سے پورا جنوبی ہند مراد لیا جاتا ہے ، حالانکہ پورا جنوبی ہند بھمنی ریاست میں شامل نہیں تھا ، چونکہ یہ سلطنت دھلی کی مرکزی حکومت کے جنوب میں واقع تھی اسلئے ترک اپنا اعتبار کرکے بھمنی ریاست کو حکومت دکن سے تعبیر کرنے لگے تھے .

تنگ بھدرا کے جنوب میں وجیانگر کی ہندو ریاست تھی ' اس کا پاے تخت وجیانگر اس دریا کے شمالی کنارے پر واقع تھا ' سنہ ۱۳۳٦ع کے قریب یہ شہر ھاڈسل خاندان کا صدر مقام تھا ' اور جب اس خاندان کا خاتمہ ہوا تو حکومت کے عہدہ دار ریاست کا انتظام کرتے رہے ' یہانتک کہ وجیانگر کا ایک خاندان برسر عروج آیا ' اور اس نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں ملی ' پہلے پہل یہ ریاست دو مسلم ریاستوں کے درمیان گھری ہوی تھی ' اس کے شمال میں بہمنی حکومت تھی اور جنوب میں مدورا کی مسلم ریاست تھی ' سنہ ۱۳۷۸ع میں وجیانگر نے مدورا کی سلطنت کا خاتمہ کیا ' اور تامل علاقوں پر اپنا تسلط قایم کرلیا ' اس کے بعد سے جنوبی ہند کی ان تین تامل ریاستوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا ' جو صدیوں سے چلی آرہی تھیں ' چولا خاندان ختم ہوچکا تھا ' سترھویں صدی میں پانڈیہ ریاست وجیانگر کی باجگذار ہوگئی تھی ' کیرلا ریاست بھی اس کے ماتحت ہوگئی تھی ' اگرچہ اس کی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں ہے ' تاہم وہ ایک زمانہ تک قایم رہی ' اور اب ترا ونکور اور کوچین کی جو ریاستیں پائی جاتی ہیں وہ غالباً اسی کیرلا ریاست کی یادگار ہیں ۔

بہمنی اور وجیانگر کی ریاستوں کے درمیان پہلی ٹکر سنہ ۱۳٦۵ع میں ہوی دو سال بعد وجیانگر کو سخت شکست کا منہ دیکھنا پڑا ' سنہ ۱۳۷۷ع اور سنہ ۱۳۹۸ع میں بہمنی فوج نے وجیانگر کی فوج کا اتنا زبردست مقابلہ کیا کہ دونوں مرتبہ اس کو پسپا ہوکر قلعہ بند ہوجانا پڑا ' تاہم بہمنی فوج شہر پر فتح نہ پاسکی ' کئی مرتبہ دونوں کے درمیان جنگ ہوی ' اور اس کا سلسلہ سولھویں صدی کے وسط تک جاری رہا ' آجکل اس طویل سلسلۂ جنگ کو ایک مذہبی جنگ قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے جو حقیقت میں صحیح نہیں ہے ' کیونکہ اس زمانہ کے ہندوؤں میں بھی ترکوں کی طرح ملک گیری کا جذبہ پایا جاتا ہے ۔ اس بات کا

اس وقت اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مذہبی جوش اور جذبہ ملک گیری کی ہوس کے تیز کرنے میں کہانتک مدد و معاون ثابت
واضح ہے کہ یہ کشمکش آئندہ چلکر سیاسی
شکل اختیار کرگئی ' کیونکہ پندرھویں صدی کی ابتدا میں وجیانگر نے گجرات اور مالوہ کی مسلم ریاستوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرلیے تھے اس صدی کے وسط میں وجیانگر کی فوجوں میں مسلم سپاہی بھی شامل نظر آتے ہیں ' غالبا اس وقت تک اس نظریہ کو قبولیت حاصل ہوچکی تھی کہ ہمسایہ ریاستیں دشمن ہوتی ہیں اور ان کے خلاف دور افتادہ ملکوں سے تعلقات کا پیدا کرنا ضروری ہے۔

جنوبی ہند کا طریقہ جنگ جداگانہ تھا ' شمالی ہند کی فوج زیادہ تر مسلح اور تربیت یافتہ سواروں پر مشتمل ہوتی تھی ' ان کے پاس افغانستان اور اس سے آگے کے علاقوں سے لائے ہوئے بہترین گھوڑے ہوتے تھے ' جنوبی ہند میں اگرچہ عربی اور ایرانی گھوڑوں کی تجارت ہوتی تھی ' اور بقول ایک مورخ کے سالانہ دس ہزار گھوڑے یہاں آکر بکتے تھے ' تاہم یہاں کی آب و ہوا گھوڑوں کی پرورش کیلئے سازگار نہیں تھی' اس کے علاوہ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں ہوسکتی تھی ' اس لئے جنوبی ہند کے اندر زیادہ تر پیادوں پر اعتماد کیا جاتا تھا ' وجیانگر کی فوج میں ہاتھیوں کی ایک قلیل تعداد تھی اور کچھ سوار بھی تھے ' مگر اس کا بڑا حصہ پیادوں پر مشتمل تھا ' چنانچہ سنہ ۱۳٦۵م کی جنگ میں وجیانگر کی فوج کے اندر دس ہزار سوار اور دو لاکھ پیادے تھے ' دوسرے ذرایع سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ بعض دفعہ میدان جنگ میں دس لاکھ پیادے پیش کیے گئے تھے ' اتنی بڑی فوج کو باقاعدہ لڑانا کچھ آسان کام نہیں تھا ' اکثر اوقات معمولی سی جھڑپ کے بعد ان پیادوں کے پیر اکھڑ جاتے تھے' اس کے بر خلاف بہمنی فوج ترک فوج کے نہج پر مرتب ہوی تھی ' ان کا اعتماد زیادہ تر سواروں پر تھا ' وہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں

زیادہ قابل جنگجو تھے ' مجموعی طور پر ان کی جنگی تدبیریں موثر اور کارگر ہوتی تھیں ' اسی لیے جب ایک مرتبہ وجیانگر کے پیادوں کی صف ٹوٹ جاتی تو پھر بہمنی سوار تمام صفوں کو الٹ کر رکھدیتے تھے .

بسا اوقات غیر محاربین کو بھی سخت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑتا تھا ' مسلمان مورخین نے ایک واقعہ لکھا ہے جو ہندی روایات کے بالکل مخالف ہے ' یعنی یہ کہ جب وجیانگر کی فوجوں نے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے ایک قلعہ پر فتح پائی تو محافظ دستہ کو ان کے بال بچوں کے ساتھ قتل کردیا ' اس پر بہمنی بادشاہ دوم محمد (۱۳۵۸ - ۱۳۷۵ء) نے قسم کھائی کہ وہ اس کے بدلے ایک لاکھ ہندوؤں کو قتل کرکے رہیگا ؛ چنانچہ سنہ ۱۳۶۷ء کی جنگ کے بعد ہندوؤں کا قتل عام ہوا جن کی کل تعداد چار لاکھ بتائی جاتی ہے ' اسی کے بعد دونوں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہوا کہ آئندہ سے کسی ایک فریق کے بھی غیر محاربین قتل نہیں کیے جائینگے ' لیکن جب ہندوؤں نے اس کی خلاف ورزی کی تو سنہ ۱۴۲۳ء میں بہمنیوں نے اس کا سخت بدلہ لیا ' بہت سے مندر ڈھا دئے اور بہت سی گائیں ذبح کر ڈالیں ' اور ہر وہ فعل کیا جس سے ہندو جذبات کو ٹھیس لگ سکتی تھی ' بہمنیوں کی ہر فتح کے بعد وجیانگر کی رعایا کو اسی قسم کی سزا بھگتنی پڑتی تھی ' سمجھوتہ پر عملدر آمد ہونے کی صورت میں بھی بہت سے غیر محاربین جبراً غلام بنالیے جاتے تھے ' ان کو غلامی سے بچانے کی کسی میں طاقت نہیں تھی ' اس طرح جنوبی ہند ' ہند کی قدیم روایات سے بہت دور جا پڑا تھا کہ جنگ کے اثرات اور اس کے نتائج صرف انھی لوگوں تک محدود ہونا چاہئے جو با قاعدہ لڑائی میں شریک ہوں .

اس دور میں جنوبی ہند کے اندر بہت سے نئے شہر تعمیر ہوے جن کے متعلق کچھ لکھنا ضروری ہے کاکتیا سلطنت کے زمانہ

میں گلبرگہ تھوڑی بہت اہمیت رکھتا تھا، بہمنیوں نے اپنا پایہ تخت بناکر اس کو بڑی ترقی دی، بہمنی بادشاہوں نے ایک شان‌دار مسجد اور کئی مقبرے بنوائے، جن میں سے بہت سے اب تک باقی ہیں اور ان کی یاد تازہ کررہے ہیں، یہ شہر سنہ ۱۳۵۰ء سے سنہ ۱۴۳۰ء تک بہمنی سلطنت کا پایہ تخت رہا، اور جب اس کے بعد بیدر کو صدر مقام بنالیا گیا تو اس کی اہمیت گھٹ گئی، اب یہ ریاست حیدرآباد کا ایک مشہور تجارتی شہر ہے، بیدر گلبرگہ سے شمال مشرق میں ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ہندو دور میں اس کی اہمیت ضرور تھی مگر اس کو بہمنی سلطنت کے زمانہ میں عروج حاصل ہوا جبکہ متعدد مسجدیں، شاہی محل، اور مقبرے تعمیر ہوئے، اب یہاں ایک کالج قایم ہے اور یہ دوسرے درجہ کا تجارتی شہر بن گیا ہے۔

اس کے بر خلاف وجیانگر بالکل ویران ہوگیا ہے، اب یہاں کوئی آبادی نہیں ہے، مگر پندرھویں صدی میں یہ ایک شاندار شہر رہا ہوگا دوسرے ہندو شہروں کی طرح اس کے متعلق بھی کسی ہندی کی لکھی ہوی تاریخ نہیں ملتی، ہمارے پاس جو کچھ تحریریں ہیں وہ سب بدیسیوں کی لکھی ہوی ہیں، ان میں اطالوی تاجر، ایرانی سفیر اور روسی پادری کی کتابیں بہت زیادہ مفید ہیں، ان کے علاوہ سولھویں صدی میں پرتگالیوں نے اس شہر کے جستہ جستہ حالات لکھے ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے اطراف ایک زبردست فصیل تھی جس کے کھنڈر اب تک باقی ہیں، شہر کا رقبہ تقریباً ساٹھ مربع میل تھا، اس میں بہت سے کھیت اور باغات تھے جن کو نہروں کے ذریعہ سیراب کیا جاتا تھا، اس وقت اس زمانہ کی آبادی کا صراحت کے ساتھ کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، تاہم اتنا کہا جاسکتا ہے کہ پندرھویں صدی کے شہروں میں یہ ایک ممتاز شہر تھا، مکانات زیادہ تر چھوٹے اور ایک قسم کے تھے، شاہی محل مندر اور سرکاری مکانات بھی کچھ کم نہ تھے، سڑکیں بہت چوڑی تھیں اور دو طرفہ سایہ دار

درخت لگے ہوے تھے ' بڑے بڑے بازار بھی تھے غرضکہ اس میں ایک شاندار شہر کی تمام خصوصیات موجود تھیں ' بڑی بڑی عمارتیں ہندوانہ طرز کی بنی ہوی تھیں ' ان کے پتھروں پر مختلف قسم کی گلکاریاں کی گئی تھیں ' اس کے کھنڈروں سے گلکاری کے جو نمونے دستیاب ہوے ہیں ان سے ان لوگوں کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے جنھوں نے اس شہر کو عروج کے زمانہ میں دیکھا تھا ' تالی کوٹ کی فیصلہ کن جنگ کے بعد سنہ ۱۵۶۵ع میں یہ شہر ایسا برباد کیا گیا کہ آج تک آباد نہیں ہوسکا .

—

باب ۴۴

پندرھویں صدی

پندرھویں صدی میں پورے ھند کے اندر ایک بڑی کشمکش تھی ۔ اس دور کی تفصیلات کو نظر انداز کرسکتے ھیں کیونکہ ھند کی اصل تاریخ پر ان کا کوئی نمایاں اثر نہیں پڑتا ۔ جنوبی ھند میں وجیانگر اور بہمنی ریاستوں کے درمیان کشمکش جاری تھی ، اوریسہ ، گجرات اور مالوہ کے معاملات بھی پیچیدہ ھوگئے تھے ، شمالی ھند میں مرکزی حکومت کمزور ھوگئی تھی ، جس کی بنا پر کئی خود مختار یا نیم آزاد ریاستیں قایم ھوگئی تھیں ، ان کے درمیان باربار ٹکر ھو رھی تھی ، جنوب کی طرف جانے والی سڑکوں پر ھندو جاگیرداروں کا پھر سے قبضہ ھوگیا تھا ، اس سے فائدہ اٹھاکر مالوہ اور گجرات کے مسلم فرمانرواؤں نے مرکزی حکومت سے اپنا تعلق توڑلیا اور چودھویں صدی کے خاتمہ پر اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا ، دھلی کی سلطنت سے ملی ھوی جونپور کی مسلم سلطنت تھی جس کو سلطنت شرقیہ کہا جاتا تھا دونوں سلطنتوں کے درمیان سرحدیں متعین نہیں تھیں اس لئے اکثر وھاں ایک دوسرے سے جھڑپ ھوتی رھتی تھی ، اس سرحد پر گنگا کے دونوں طرف رھنے والے ھندو زمیندار بھی اپنی طاقت منوانے لگے تھے ، دھلی کے اس پار پنجاب بھی مرکزی حکومت سے الگ ھوچکا تھا ، دھلی کی سلطنت ایک تنگ علاقہ پر محدود ھوکر رہ گئی تھی ۔

تغلق خاندان کے فرمانروا سنہ ۱۴۱۴ء تک اس چھوٹے سے رقبہ پر حکومت کرتے رھے ، یہاں تک کہ خضرخاں نے ان کو ھٹا کر اپنی حکومت قایم کی اور سید* خاندان کی بنیاد ڈالی ،

---

* سید آنحضرت صلعم کی اولاد کو کہتے ھیں ، بہت سے ایسے لوگوں نے سید بننے کی کوشش کی ھے جن کی سیادت کے متعلق کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا ، خضرخاں کی سیادت بھی بالکل مشکوک ھے ۔

چونکہ امیر تیمور نے اس کو دھلی کا حاکم بنایا تھا اس لیے اس کی حیثیت محض ایک نائب کی سی تھی ، آگے چلکر جب تیموری خاندان کے فرمانروا کمزور ہوگئے تو سیدوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور وہ بادشاہ کہلانے لگے ، وہ حکمرانی کے بالکل قابل نہیں تھے ، ان کی حکومت بہت کمزور تھی ، تاھم سنہ ۱۴۴۸ع تک اس خاندان کے افراد حکومت کرتے رہے یہانتک کہ آخری بادشاہ نے حکومت چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلی .

کچھ زمانہ کے بعد دھلی کی سلطنت پر بہلول کا قبضہ ہوگیا جو ذات کا پٹھان اور لودھی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا ، اس نے ۱۴۵۱ع سے لیکر ۱۴۸۹ع تک حکومت کی . بادشاہ بننے سے پہلے وہ پنجاب کا حاکم تھا ؛ کہنے کو تو اس کی حیثیت ایک نائب کی سی تھی مگر عملا وہ خود مختار تھا ، بادشاہ ہونے کے بعد اس نے جونپور کی سلطنت شرقیہ کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا ، چنانچہ وہ تیس برس سے زیادہ مدت اس سلطنت کے ساتھ لڑتا رہا تاآنکہ اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا ، وہ ایک قابل اور مدبر فرمانروا تھا ، اس نے اپنے قبیلوں کی مدد سے جن کو اس نے ھند آنے کی دعوت دی تھی . اپنی سلطنت کو مستحکم اور مضبوط کیا ، اس کے بعد اس کا بیٹا سکندر شاہ سنہ ۱۴۸۹ع میں تخت نشین ہوا ، اور اس نے سندھ سے لیکر بنگال کی مغربی سرحد تک بڑی کامیابی کے ساتھ حکومت کی ، جمنا کے جنوب اور مغرب میں بہت سے سرداروں نے بغاوت کی ، مگر سکندر نے ان کی خاطر خواہ سرکوبی کی ، اس نے اس غرض سے آگرہ کو اپنا پاے تخت بنایا جو اس زمانہ میں ایک معمولی شہر تھا ، اور جس نے آگے چلکر بڑی اھمیت حاصل کرلی ، سکندر نے سنہ ۱۵۱۷ع میں وفات پائی . اس کے بعد اس کا لڑکا ابراھیم لودھی تخت نشیں ہوا ، یہ فطرتاً بہت بدگمان واقع ہوا تھا ، اس نے اپنی سلطنت کے وفادار پٹھان عہدہ داروں پر

سختیاں کرنی شروع کیں ، جس کی وجہ سے یہ سب بغاوت پر آمادہ ہوگئے ، سب سے پہلے بہار میں اس کے خلاف بغاوت ہوی ، اس کے بعد پنجاب کے حاکم نے بھی ابراھیم لودھی سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور کابل کے مغل بادشاہ بابر کو ھند آنے کی دعوت دی جس نے سنہ ۱۵۲٦ء میں اس خاندان کا خاتمہ کیا اور سلطنت دھلی پر اپنا تسلط قایم کیا .

تاریخوں میں جو واقعات بکھرے ہوے ھیں ان سے اس دور کے کاشتکاروں کی حالت کا ایک عام اندازہ لگایا جاسکتا ھے سیدوں کے زمانہ میں حکومت کا نظم و نسق قایم نہیں رھا تھا ، جب کبھی بادشاہ کو روپیہ کی ضرورت ھوتی تھی تو وہ اپنی فوج کو روانہ کرتا تھا ، اور اس کی فوج کاشتکاروں سے وہ سب چھین لاتی تھی جو ھندو زمینداروں اور مسلمان حاکموں کی لوٹ کھسوٹ سے بچ جاتا تھا ، ملک میں پولیس کی چوکیاں بھی نہیں تھیں ، جن سے چوروں کی نگرانی کی جاسکتی تھی ، اس لئے وہ بھی عام طور پر لوٹ مار کرتے تھے ، اور اپنا اپنا حصہ اٹھالے جاتے تھے ، حقیقت تو یہ ھے کہ ڈکیتی ھی ایک ایسا پیشہ رہ گیا تھا جس کے ذریعہ کوئی شخص ترقی کرنے کی امید کرسکتا تھا ، ان حالات میں بہلول لودھی نے سلطنت کو مضبوط اور مستحکم کرنے کی کوشش کی ، اس نے بہت سے وفادار حاکم مقرر کئے جن کے ماتحت پوری سلطنت کا تقریبا چھٹا حصہ تھا ، باقی مملکت کو بطور جاگیر اپنے ھی قبیلہ کے شریف پٹھانوں کے حوالے کردیا تھا ، جن میں سے ھر ایک کے پاس ایک مختصر فوج ہوتی تھی ، جسکے اخراجات وہ خود برداشت کرتا تھا ، اور اس کی مدد سے وہ اپنے علاقہ کا بندوبست کرتا تھا - یہ پٹھان جاگیردار سب کے سب بےوقوف نہیں تھے ، انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی آمدنی کاشتکاروں کی حالت کے بہتر ہونے پر موقوف ھے ، انھوں نے اجڑی ھوی زمینوں کی پھر سے کاشت کروائی اور ویرانوں کو آبادی سے بدل دیا ، وہ فطرتا بہت سخت گیر واقع ہوے

تھے ' فتنہ و فساد اور لغویات کو وہ کبھی گوارا نہیں کرسکتے تھے ' جب کبھی کوئی سردار بغاوت کر بیٹھتا تو وہ اسکا سر کچل کر رکھدیتے تھے ' اور اس کے بال بچوں کو غلام بنا لیتے تھے ' موجودہ زمانہ کے معیار سے یہ انتظام سرسری اور بعض وقت وحشیانہ قرار دیا جائیگا لیکن اگر اس سے پہلے کی طوائف الملوکی کا لحاظ کیا جائے تو یہ انتظام بہت ہی بہتر معلوم ہوگا ۔

شمالی ہند میں بنگال ہی ایک ایسا صوبہ تھا جہاں کسی قسم کی شورش نہیں تھی ' چودھویں صدی کے وسط سے لیکر مغلوں کی پہلی عارضی فتح یعنی سنہ ۱۵۳۸ع تک یہ صوبہ خود مختار رہا ' اس مدت میں ایک دو مرتبہ جونپور کی سلطنت شرقیہ نے بنگال پر حملے کیے تھے ' مگر اس کی سرحدیں کم و بیش وہی رہیں جو پہلے تھیں اکثر لڑائی تخت نشینی کے وقت ہوتی تھی ' اس دور کا ایک اہم واقعہ ایک ہندو سردار راجہ گنیش کا ترقی پر آنا ہے ۔ اس نے پندرھویں صدی کی ابتدا میں بنگال پر قبضہ کرلیا تھا ' وہ اگرچہ ہندو تھا لیکن اس کا بیٹا مسلمان ہوگیا ' چونکہ ان کی تاریخ واضح نہیں ہے اس لئے ان کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے ' اگر مجموعی طور پر بنگال کے متعلق غور کیا جاے تو معلوم ہوگا کہ یہاں کے ایک تہائی بادشاہ یا تو مارے گئے یا معزول کردئے گئے ' دھلی کی طرح یہاں بھی غلام فتنہ و فساد کا باعث ہوتے تھے ' اس صدی کے وسط میں حبشی غلاموں کو فوج میں لینے کا دستور شروع ہوگیا تھا اور اس طرح ان کی ایک بڑی تعداد فوج میں ملازم ہوگئی تھی ' اور شاہی دربار میں ان کو بڑا رسوخ اور اقتدار حاصل ہوگیا تھا ' چنانچہ سنہ ۱۴۸۶ع میں ایک حبشی نے اپنے آقا کو قتل کرکے سلطنت پر قبضہ کرلیا تھا ' اس کے بعد سات سال تک حبشیوں کی حکومت رہی ' وہ اپنی ایک مستقل سلطنت کے بنانے کے آرزومند تھے ' مگر قسمت نے اس کا موقعہ نہیں دیا ' ان میں سے ایک نے رعایا پر ظلم و ستم کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے سید شریف مکی نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور تمام حبشیوں کو ملک سے نکال باہر کیا اور

اپنے خاندان کی بنیاد ڈالی ، مغلوں کے بنگال فتح کرنے تک یہی خاندان حکومت کرتا رہا ۔ سنہ ۱۵۳۸ء میں مغلوں نے اس کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا ۔

دھلی کے مغرب میں اگرچہ پنجاب کچھ دنوں کیلئے آزاد اور خود مختار ھوگیا تھا ، مگر اس سر زمین کا ایک بڑا حصہ دھلی ھی کے ماتحت رھا ملتان اور بالائی سندھ میں ایک خود مختار مسلم ریاست قایم ھوگئی تھی ۔ جس کے فرمانروا سنہ ۱۴۳۸ء سے لیکر سنہ ۱۵۲۰ء تک حکومت کرتے رھے ، سندھ کے نشیبی علاقوں پر ایک نو مسلم راجپوت خاندان کی حکومت تھی ۔ جس نے سلطنت دھلی کی تباھی کے بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا تھا ۔ ان کی حکومت پندرھویں صدی کے خاتمہ تک رھی ، یہاں تک کہ تاتاریوں کے ایک قبیلے نے ان پر قبضہ کرلیا ۔ شمال میں کشمیر کی پہاڑی ریاست تھی جو دھلی کے تابع نہیں تھی ، سنہ ۱۳۴۶ء میں ایک جانباز مسلمان نے اسپر قبضہ کرلیا اور اپنے خاندان کی بنیاد ڈالی اس کی حکومت دو سو برس سے زیادہ کی مدت تک قایم رھی ، جنوب میں ناھموار علاقوں پر ھندو سردار قابض تھے ان سے آگے مالوہ اور گجرات کا علاقہ تھا ۔

اس علاقہ میں اقتدار کے لئے مسلسل کشمکش ھو رھی تھی ۔ چنانچہ پندرھویں صدی کی ابتدا میں مالوہ اور گجرات کے مسلم فرمانرواؤں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا تھا مالوہ کے جنوب میں خاندیس کی مسلم ریاست تھی جس نے دھلی سے نہیں بلکہ بہمنی سلطنت سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا ۔ ان سے آگے جنوب میں بہمنی ریاست تھی اور پھر اس کے بعد وجیانگر کی ریاست تھی ۔ اس علاقہ میں پندرھوین صدی کی تاریخ بہت ھی پیچیدہ اور گنجلک ھوگئی ھے اس لئے ھم اس کی تفصیل پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرینگے ھم صرف بہمنی اور وجیانگر کی دو مقابل ریاستوں کے حالات کا تذکرہ کرینگے ۔

بہمنیوں کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ اصل نسل کا زوال پذیر ہوجانا ہے اسی لئے بہمنی بادشاہوں کو اس کی ضرورت ہوی کہ اپنی فوج میں پردیسی سپاہیوں اور جانبازوں کو بھرتی کریں - یہ لوگ زیادہ تر ایران اور دوسرے ہمسایہ ملکوں سے آئے ہوے تھے ، جنگ میں یہ لوگ یہاں کے اصلی مسلمان باشندوں سے زیادہ اپنی قابلیت کے جوہر دکھاتے تھے اس طرح ان دونوں فریقوں کے درمیان ہمیشہ ایک قسم کی چشمک رہتی تھی ، ان کے علاوہ ایک تیسرا فریق حبشیوں کا تھا جن کو فوج اور حکومت کے دوسرے صیغوں میں اعلی عہدے دئے گئے تھے ، چونکہ ایرانی حبشیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ، اس لئے ایرانیوں اور اصلی باشندوں کے درمیان کشمکش کے وقت وہ اصلی باشندوں ہی کا ساتھ دیتے تھے ، اس کی وجہ سے دربار میں اکثر ایک دوسرے کے خلاف برابر سازشیں ہوتی رہتی تھیں اسی لیے بہمنی بادشاہوں کو اطمینان کے ساتھ حکومت کرنے کا کبھی موقعہ نہیں ملا ، چنانچہ سنہ ۱۴۱۷ع تک جو بارہ بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر آئے ، ان میں سے تین مقتول ہوے ، دو کو معزول اور اندھا کیا گیا ، کسی کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نے اطمینان کے ساتھ سلطنت کی ، باقی بادشاہوں میں سے اکثر شرابی تھے ، بعض تو اتنے عیاش تھے کہ ان کو اپنے حرم سرا کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں تھی ان میں سے ایک نے تو سفاکی و خونریزی اور جبر و استبداد میں وہ نام پیدا کیا کہ اس کے نام ہمایوں کے ساتھ ہمیشہ " ظالم " کا لفظ لکھا جانے لگا .

ان خامیوں کے باوجود بہمنی بادشاہوں نے پوری ایک صدی تک وجیانگر سے خوب مقابلہ کیا ، اس دور کے متعلق ہماری معلومات زیادہ تر مسلمانوں کی لکھی ہوی تاریخوں سے حاصل ہوتی ہیں ، جن کو غیر جانبدارانہ فرض نہیں کیا جاسکتا ، ممکن ہے کہ انھوں نے اپنے بادشاہوں کے کارنامے بہت بڑھا چڑھاکر بیان کیے ہوں ، لیکن ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۴۰۰ع کے بعد

سے لیکر وجیانگر کی ریاست بہمنیوں کی باجگزار ہوگئی تھی اور خراج کے ادا نہ کرنے ہی کی بناء پر اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں ' ہر لڑائی کے بعد نہ صرف خراج ہی وصول کیا جاتا تھا بلکہ طرح طرح کی رسوا کن شرطیں لگائی جاتی تھیں ؛ اس صدی کے وسط میں دونوں ریاستوں کے درمیان کچھ دنوں تک کیلئے لڑائی رک گئی تھی ' کیونکہ بہمنی فرمانروا مالوہ اور گجرات سے لڑنے میں مشغول ہوگئے تھے ' اور اوریسہ کے ایک سردار نے وجیانگر پر جارحانہ حملہ کردیا تھا ' اس کے بعد دونوں ریاستوں کے اندر ایک زبردست انقلاب ہوا ' جس کی وجہ سے دونوں ریاستوں کا سیاسی نقشہ بالکل ہی بدل گیا .

وجیانگر کے اندر ایک ہندو زمیندار نرسمہا * تھا ' اس نے اوریسہ کی لڑائی میں بڑی طاقت حاصل کرلی تھی ' اور بتدریج مدراس تک کے علاقے اپنے قبضہ میں کرلئے تھے ' چونکہ وجیانگر کا راجہ ناقابل اور بہت جابر اور ظالم تھا اس لئے نرسمہا نے سنہ ۱۴۸۶ ع میں اس کو تخت سے اتار دیا اور خود ہی راجہ بن بیٹھا ' بیس سال کے بعد ایک دوسرے خاندان نے اس کی جگہ لی ' اور سنہ ۱۵۰۹ ع میں اس نئے خاندان کا ایک راجہ کرشن دیو تخت پر بیٹھا ' یہ غالبا وجیانگر کے تمام راجاؤں میں سب سے زیادہ زبردست اور طاقت ور راجہ تھا '

اس درمیان میں بہمنی سلطنت کے اندر بھی ایک زبردست انقلاب رو نما ہوا ' اس سلطنت کے چار صوبے تھے جن پر زبردست اور طاقتور حاکم حکومت کررہے تھے ' جب بہمنی بادشاہ کمزور ہوگئے تو تین صوبوں نے سنہ ۱۴۹۰ ع میں اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا ' کچھ دنوں کے بعد چوتھے صوبے نے بھی یہی روش اختیار کی ' اب صرف بیدر بہمنی بادشاہوں کے قبضہ میں رہا ' مگر ان کی حیثیت بالکل گر چکی تھی '

* اس کا مشہور نام نرسنگا ہے ' رنگ پرتگالی جو نرسمہا کے عہد حکومت میں وجیانگر آئے تھے اکثر وجیانگر کو نرسنگا لکھتے ہیں .

ن چار خود مختار ریاستوں میں سے دو یعنی احمدنگر ' اور برار شمال میں اور باقی دو یعنی بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں جنوب میں تھیں ' چونکہ بیجاپور کی سرحد وجیانگر سے ملتی تھی اس لئے دونوں کے درمیان اکثر. جھگڑے ہوتے رہتے تھے '

اس سیاسی انقلاب کے بعد عجیب قسم کی سیاسی چالیں چلی جانے لگیں ' چونکہ چاروں مسلمان ریاستیں ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی تھیں اس لئے ہر ایک دوسرے کے خلاف وجیانگر جیسی طاقت ور ریاست کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی ' وجیانگر کے راجہ کبھی تو بیجاپور کے خلاف لڑتے رہتے تھے اور کبھی دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں شاہان بیجاپور کی تائید کرتے تھے ' وجیانگر کے راجاؤں اور ان کی فوجوں نے طاقت کے گھمنڈ میں مسلمان ریاستوں کے اندر بڑی دست اندازیاں شروع کردی تھیں ' انہوں نے مسجدوں کی بڑی بے حرمتی اور عورتوں کی عزت اور آبرو لوٹنی شروع کی اور ایسے صدہا مظالم ڈھائے جو ایسے موقعوں پر عموماً سرزد ہوتے ہیں ' یہ دیکھ کر چاروں مسلمان ریاستیں آپس میں متحد اور متفق ہوگئیں ' اور ان سب نے ملکر سنہ ۱۵۶۴ع میں وجیانگر سے لڑائی شروع کی ' دوسرے ہی سال یعنی سنہ ۱۵۶۵ع میں تالی کوٹ کی مشہور فیصلہ کن لڑائی پیش آئی ' مسلمانوں نے شہر پر قبضہ کرلیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی ' اور آس پاس کے تمام علاقوں کو اجاڑ کر ویران بنادیا ' اگرچہ وجیانگر کے راجہ جنوب مشرق کی طرف ہٹ گئے تھے اور کچھ زمانہ تک ان کا سلسلہ جاری رہا تاہم اب وہ مسلمانوں کیلئے کسی خطرہ کا باعث نہیں تھے .

پچھلے صفحات میں ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شمالی ہند میں کشمکش کا زمانہ کاشتکاروں کیلئے کس قدر نقصان دہ ہوتا تھا ۔ جنوبی ہند کے کاشتکاروں کی حالت کا اندازہ

لگانے کیلئے ھمارے پاس کوئی معتبر ذریعہ نہیں ھے ' لیکن ھم بیان کرچکے ھیں کہ کبھی کبھی غیر محاربین کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ' مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے فوجی اخراجات کا بار لا محالہ کاشتکاروں ھی پر پڑتا تھا ' اور فوجی نقل و حرکت کی بناء پر کھیتیاں برباد ھوجاتی تھیں ' شاھی درباروں اور امیروں کی فضول خرچیاں اپنی جگہ پر باقی تھیں ' پردیسیوں کی لکھی ھوی تاریخوں میں ھے کہ اس دور میں شہر بہت شاندار اور دولت مند تھے اور دیھاتوں پر افلاس اور غربت چھائی ھوی تھی ' اور یہ لازمی نتیجہ تھا ان حالات کا جن کو ھم نے ابھی بیان کیا ھے ۔ مگر صحت کے ساتھ جزئیات کو پیش کرنے کیلئے ھمارے پاس کوئی شہادت نہیں ھے ۔

ملک میں اب بھی ایسی بے شمار شاندار یادگاریں پائی جاتی ھیں ' جن سے حکمرانوں کی فضول خرچیوں کا ثبوت ملتا ھے ' ھم نے گذشتہ باب میں وجیانگر ' گلبرگہ اور بیدر کی یادگاروں کا تذکرہ کیا ھے ' ان کے ساتھ بیجاپور ' گولکنڈہ ' اور خاندیس کے پایۂ تخت برھانپور اور آگے شمال میں مالوہ کے فوجی قلعہ مانڈو اور گجرات کے اھم شہر احمد آباد کی شاندار عمارتوں کو بھی شامل کرلینا چاھئے جن کے ناموں سے ھندو مسلم فن تعمیر کے طالب علم اچھی طرح واقف ھیں - ھم یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ھیں کہ اس دور میں ان شہروں کے اندر دستی صنعت کاریوں کو بڑی ترقی حاصل ھوی ھوگی - جن کی سرپرستی پچھلے زمانہ میں زیادہ تر بادشاہ اور راجہ کیا کرتے تھے ' اس میں شبہ نہیں کہ دیہات ویران اور تباہ ھوچکے تھے ' مگر شہروں کو بڑی رونق حاصل ھوگئی تھی ۔

باب ۲۵

ترک حکومت کے نتائج

سولھویں صدی اس حیثیت سے بہت ممتاز ہے کہ اس دور میں ہند کے تعلقات ایک طرف شمال مغرب میں مغلوں سے اور دوسری طرف جنوبی ساحل سمندر پر پرتگالیوں سے قایم ہوے، مگر ان کی تاریخ بیان کرنے سے پہلے ترک حکومت کے اثرات کا ایک جایزہ لے لینا چاھتے ' جن کی سیاسی تاریخ گذشتہ ابواب میں بیان کی جاچکی ہے ' ابتدائی خانہ بدوش ترک اپنا کوئی خاص تمدن نہیں رکھتے تھے ، انہوں نے عقیدے کے ساتھ ساتھ اسلامی تمدن کو بھی اختیار کرلیا تھا ' اس کی وجہ سے ہندی تمدن میں وہ جذب نہیں ہو رہے تھے ' دونوں تمدن ساتھ ساتھ چل رہے تھے ' ان کی مثال ایسے دو ممتاز دھاروں کی ہے جو ایک ساتھ بہتے چلے جارہے ہیں ' اور جن کے کنارے اگرچہ ایک دوسرے سے ملتے ہوں لیکن دونوں ملکر ایک نہیں ہوجاتے ہیں -

ترکوں اور ہندوؤں کے درمیان دوستانہ روابط کی ترقی میں بہت سی رکاوٹیں تھیں سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ ہندوؤں کو ترکوں سے ان کے حاکمانہ اقتدار کی بناء پر ایک گونہ نفرت تھی ' دوسرے یہ کہ ترک مسلمانوں کی بیویاں پردہ میں رہتی تھیں جس کی وجہ سے دونوں قوموں کے درمیان سماجی راہ و رسم نہیں پیدا ہوسکتی تھی ' اور یہ ظاہر ہے کہ معاشرتی تعلقات کے بڑھانے میں عورتوں ہی کا زیادہ حصہ ہوتا ہے' اس کے علاوہ ترک گوشت کھاتے تھے ' اور ہندو ذات پات کی سخت ترین پابندیوں کی بناء پر گوشت خور افراد سے معاشرتی تعلقات قایم نہیں کرسکتے تھے' اس پر مزید یہ کہ آپس میں شادی بیاہ کی بھی اجازت نہیں تھی ' کیونکہ کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ کسی ہندو نے کسی ترک مسلمان کی لڑکی سے شادی کی ہو ' اس کے برخلاف تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ ترک امیر اعلی ہندو

خاندان کی لڑکیوں سے شادی کرلیتے تھے ' اور خاص کر مسلم فوج کے وہ سپاہی جنھیں دور دراز مقامات میں جاکر رہنا پڑا ' ہندو عورتوں سے شادی کرنے پر مجبور تھے - چنانچہ دوسری نسل کے بعد سے ترکوں کے جسم میں ہندی خون دوڑنے لگا تھا -

ترک بادشاہوں تک میں ہندی خون موجود تھا ' کیونکہ فیروز تغلق کی ماں ایک ہندو عورت تھی ' ملک تغلق ایک ہندو عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا ' بیجاپور کا دوسرا بادشاہ ایک ہندو عورت کا بیٹا تھا ' اس کی تین بہنیں بیدر ' احمدنگر اور برار کے فرمانرواؤں سے بیاہی گئی تھیں ' گجرات کا پہلا ترک بادشاہ حقیقت میں ایک راجپوت کا بیٹا تھا جس نے اسلام قبول کرلیا تھا ' برار کی سلطنت کا بانی ایک نو مسلم برهمن تھا ' ان شہادتوں کی بناء پر یہ متعین کرنا دشوار ہے کہ کون کون خالص النسل ترک ہیں اور کون کون نہیں ہیں -

سماجی مساوات کا پرانا اسلامی نظریہ اب ختم ہوچکا تھا ' عملا ہند کے تمام مسلمان بھائی بھائی نہیں تھے کیونکہ بہت سے سماجی امتیازات قائم ہوچکے تھے ؛ لیکن تاریخوں میں جو واقعات مذکور ہیں ان سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ نو مسلموں کے ساتھ نسلیت کی بناء پر کوئی برا سلوک نہیں کیا جاتا تھا ' وہ بھی اعلی سے اعلی سلطنت کے عہدوں کے مستحق تھے - ٹھیک طور پر یہ نہیں معلوم ہے کہ غیر مسلموں اور ہندووں کو حکومت کے صدر مقاموں میں کس قسم کے عہدے دئے جاتے تھے ' مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دیہاتوں میں گاؤں کے چودھری اور مکھیا پٹواری اور منیب سبھی ہندو ہوتے تھے ' اس لحاظ سے دونوں کے درمیان گھرے تعلقات رہے ہونگے ' شمالی ہند میں ترکوں کی حیثیت ایک حاکم قوم کی تھی ' جنوبی ہند میں بھی ان کا یہی حال تھا یہانتک کہ باہر سے دوسرے لوگ آکر بسنے لگے ' اور ترک ان کے محکوم ہوتے چلے گئے .

اس دور میں ایک مشترکہ زبان وجود میں آئی ' جس کو انگریز ہندوستانی کہا کرتے ہیں ' یہ زبان ہندی ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے جو دہلی اور اس کے اطراف و اکناف میں بولی جاتی تھی ' اس میں فارسی الفاظ اور محاورے زیادہ استعمال کیے جانے لگے تھے ' جہانتک ہمکو معلوم ہے اس دور میں یہ زبان ادبی اظہار خیال کا ذریعہ نہیں تھی پہلے پہل یہ صرف آپس کی گفتگو کے لیے استعمال کی جاتی تھی ' اور وقت کی ضروریات کے مطابق اسکے اندر کانٹ چھانٹ ہوتی رہی ' جب ترکوں نے جنوبی ہند کو فتح کیا تو یہ مشترکہ زبان یہاں بھی فروغ پانے لگی تھی .

پورے ہند میں بنگال ہی ایک ایسا علاقہ تھا جہاں اس مشترکہ زبان کو قبولیت حاصل نہیں ہوسکی تھی ' کیونکہ یہاں ترکوں کی تعداد زیادہ نہ تھی ' اگرچہ بنگال کی ایک بڑی آبادی مسلمان ہوگئی تھی ' لیکن یہاں کے حکمرانوں کو ہر معاملہ میں اصلی باشندوں سے مدد لینی پڑتی تھی ' قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صوبوں کی بہ نسبت بنگال میں زیادہ ہندو حکومت کے عہدوں پر فایز تھے ' اس لیے یہاں فارسی یا ہندوستانی کو فروغ نہیں ہوسکا ' جو انکو شمال مغربی علاقہ ہند میں حاصل ہوا تھا اور بعض حکمرانوں نے تو بنگالی زبان کی سرپرستی کی تھی اوو ان کے زمانہ میں بہت سی ادبی کتابیں اس زبان میں لکھی گئی تھیں ' عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں حالات کچھ اسطرح کے تھے کہ حاکم اور محکوم ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوگئے ' اور تمام ترک علاقوں میں بنگال ہی ایک ایسا علاقہ تھا جہاں پراثرطریقہ پر ایک مخلوط تمدن ترقی کرنے لگا تھا .

ہندوؤں میں اب بھی قانون ' فلسفہ اور دوسرے متعلقہ مضامین کا مطالعہ جاری تھا ' لوگ حسب دستور کتابیں لکھتے چلے جارہے تھے ' لیکن ان میں سنہ تصنیف اور مقام تصنیف کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا ' اس لئے ان کے متعلق تصریحی طور

پر کچھ کہنا بہت دشوار ہے ' ہم یہ قیاس کرسکتے ہیں کہ ترکوں کے زمانے میں سنسکرت کی تعلیم کے اہم مرکز وہی رہے ہونگے جو انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت تک باقی تھے جیسے ہوگلی کے قریب ندیہ اور گنگا کے کنارے بنارس جہاں برہمن مندروں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر پورے اطمینان کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے ' ان کی فراغت اور آسودگی میں اسی وقت خلل پڑتا تھا جب کہ بت شکن مسلمان ان شہروں میں گھس آتے تھے ان برہمنوں نے نئے خیالات کا کوئی پرچار نہیں کیا ' بلکہ وہ پرانی کتابوں ہی کی تفسیر و تشریح کرتے رہے ' اس سے زیادہ ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے .

سنسکرت کا خیالی ادب ختم ہو رہا تھا یا مرچکا تھا ' کیونکہ شاعری اور ناٹک کی ترقی ایک بڑی حد تک شایستہ دولتمند اور ہندو راجاؤں اور درباریوں کی سرپرستی پر منحصر تھی اور ظاہر ہے کہ شمالی ہند کے سیاسی انقلاب کی وجہ سے سنسکرت ادب کا زوال لازمی تھا ' اب صرف وجیانگر کی ہندو ریاست سے سنسکرت کی ترقی کی توقع کی جاسکتی تھی ' مگر تاریخ میں یہاں کسی نظم یا ناٹک کے لکھنے کا کوئی ذکر نہیں ملتا ' بندیلکھنڈ راجپوتانہ اور اوریسہ کی چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستوں میں بھی سنسکرت کی کوئی اہم تصنیف نہیں پائی جاتی البتہ ہر جگہ مادری زبانوں کو بڑی ترقی ہو رہی تھی ' چونکہ بنگال کے علاوہ کسی اور جگہ شاہانہ سرپرستی حاصل نہیں تھی ' اسلیے ابتدا میں صرف مذہبی کتابیں لکھی گئیں ' اس دور میں چند تاریخی مثنویاں بھی ملتی ہیں ' جن میں راجپوت بہادروں کے کارناموں کو بیان کیا گیا ہے ' درباری شاعروں نے ان راجپوتوں کو زندہ جاوید بنانے کی کوشش کی ہے جنہوں نے ترکوں کا کامیاب مقابلہ کیا تھا ' موجودہ راجپوت روایات کا ماخذ یہی تاریخی مثنویاں ہیں ' یہ اب تک راجپوتوں

کے دلوں کو گرما رھی ھیں اور ان میں قومی جوش اور ولولہ پیدا کر رھی ھیں۔

وجیانگر کی ریاست میں راگ ، باجہ اور ناچ کو بڑی ترقی ہوی تھی ، ترک بھی اسکا اچھا خاصہ ذوق رکھتے تھے ، اس کا ثبوت بہمنیوں کی ایک شرط سے ملتا ھے جو انھوں نے وجیانگر پر لگائی تھی وہ یہ کہ ھندو دارالسلطنت کے دو ھزار گویے اور ناچنے والے بہمنی سلطنت کے حوالے کئے جائینگے ، ھندو راجہ اور درباری امیر مصوری سے بھی بہت دلچسپی رکھتے تھے ، مگر اس کی نمایاں ترقی بعد کے دور میں ھوی ، وجیانگر کے کھنڈروں یا اس زمانہ کے اوریسہ کے اندر مونٹ آبو وغیرہ میں بنائے ھوے یا مرمت کئے ھوے مندروں کے دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ نقاشی اور سنگ تراشی بھی متعین صورتوں پر ترقی کر رھی تھی ۔ اس بات کا ثبوت پیش کرنا مشکل ھے کہ ھندو ادب اور فنون لطیفہ کی ترقی ترکوں سے میل جول کا نتیجہ ھے ۔

ترک فاتحوں نے انھی علوم وفنون کی سر پرستی کی جن کی تشکیل بغداد میں ھوی تھی ، ھم پہلے بیان کرچکے ھیں کہ ان میں ھندی علوم کا بھی کچھ حصہ تھا معقولات کے علوم میں یونانیوں کا اثر غالب تھا ، ان علوم وفنون کی تحصیل و اشاعت میں ترکوں نے بذات خود کوئی حصہ نہیں لیا ، بلکہ انھوں نے ایران اور دوسری جگہ کے عالموں کو یہاں آنے کی دعوت دی ، اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان کیلئے سرکاری خزانے سے گرانقدر وظیفے مقررکئے ، ادب اور انشاء میں ایران ھی کو معیار بنایا گیا ۔ اور یہاں اشعار اور کتابیں ایران کی فارسی کے طرز و اسلوب پر لکھی جانے لگی تھیں ۔ اس دور کی فارسی تاریخوں میں بعض ایرانی شعرا کا ذکر ھے ، جنھوں نے عالمگیر شہرت حاصل کی تھی ، بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد نے سعدی شیرازی کو ھند آنے کی دعوت دی تھی ، مگر انھوں نے یہاں آنے سے انکار کردیا تھا ، شہزادہ محمد اسوقت ملتان کا حاکم تھا ،

اسی طرح بہمنیوں کی دعوت پر حافظ شیرازی اپنے وطن سے نکلے تھے مگر سفر کی تکلیفات سے گھبراکر واپس ہوگئے ، اور ایک قصیدہ بطور معذرت روانہ کیا ، امیر خسرو سنہ (۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ع) اور ہند کے دوسرے شعرانے ایرانی شعرا کی پوری تقلید کی ، ہند کی فارسی کتابوں میں جابجا ایرانی فارسی ادب کے فقرے اور کہاوتیں استعمال کی جانے لگیں ، اور کچھ زمانہ پہلے تک ہند کے تعلیم یافتہ مسلمان فارسی زبان ہی کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنائے ہوے تھے .

ترکوں نے اپنی شاندار عمارتوں کو مجسموں یا بتوں کی بجائے محض بیل بوٹوں سے سجایا کیونکہ اسلام میں مجسموں یا بتوں کے بنانے کی اجازت نہیں تھی - ان عمارتوں کے نمونے آج بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ، ترکوں میں فن تعمیر کا ذوق پہلے سے موجود تھا ، انھوں نے کئی شاندار مسجدیں اور مقبرے تعمیر کئے جن کے بنانے کا رواج پہلے سے یہاں موجود نہ تھا ، سب سے پہلے انھیں نے سمنٹ اور گارے کے استعمال کا طریقہ بتایا ، ان سے پہلے ہند کے باشندے ان دونوں چیزوں سے واقف نہیں تھے ، ان سے گنبدوں کے وسیع اور مضبوط کرنے اور کمانوں کے بنانے میں بڑی مدد ملتی تھی ، گنبد ، کمان اور منارے مسلم فن تعمیر کی اہم خصوصیات سے ہیں ، ان میں بدیسی اثر نہیں پایا جاتا ، آگے چلکر ہندی فن تعمیر کی خصوصیات کی آمیزش اور امتزاج سے ایک نیا اور ممتاز فن تعمیر پیدا ہوا جس کو ہندی عربی فن تعمیر کہا جاتا ہے ، ہمارے خیال میں اس کو ہندی اسلامی فن تعمیر کہنا زیادہ موزوں ہوگا ، مسلم تعمیرات میں ہندو تعمیرات کی مضبوطی اور نفاست دونوں پائی جاتی ہے ، جہاں کہیں بھی مسلمانوں کی سلطنت قایم ہری ان کے فن تعمیر پر ہندو فن تعمیر کا اثر پڑا ہے ، اور اب مسلمانوں کی تمام عمارتوں میں چاہے وہ شہروں میں ہوں ، یا قصبوں میں ہر جگہ مقامی اثر نمایاں ہے ، غفلت اور لاپروائی

کی وجہ سے بہت سی پرانی عمارتیں برباد ہوگئی ہیں' اور بعض کی بھونڈے طریقہ پر مرمت کی گئی ہے' تاہم آج بھی مسجدوں' مقبروں اور کمانوں' مناروں اور گنبدوں کے ساتھ ساتھ ہر جگہ مندروں کی ایک کثیر تعداد بھی نظر آرہی ہے کیونکہ ابتدائی دور کی طرح اس دورمیں مندر اتنے زیادہ نہیں ڈھائے گئے تھے' اور ایک مغربی سیاح اپنے دل و دماغ کو ان مندروں کے نقوش سے خالی نہیں پاتا ہے -

اس دور کی مذہبی حالت پر کچھ لکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم تبدیل مذہب کے متعلق کچھ بحث کریں' اس بات کا کہیں سے کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ترکوں نے انفرادی یا اجتماعی طریقہ پر ہندو مذہب کو قبول کیا ہو' یا ان کے بعض قبیلے اور خاندان ہندو بن کر کسی ذات میں شامل ہوگئے ہوں' مگر یہ یقینی ہے کہ بہت سے ہندوؤں نے اپنے فاتحین کے لائے ہوئے مذہب کو قبول کرلیا تھا' کہیں کہیں جبراً مسلمان بنانے کے واقعات مذکور ہیں - مگر اس قسم کے واقعات شاذ اور نادر ہوئے ہیں - کشمیر کے اندر جبکہ وہاں کی ایک بڑی آبادی مسلمان ہوچکی تھی' سکندر (۱۳۹۰ - ۱۴۱۴ع) نے جو آگے چلکر بت شکن کے نام سے مشہور ہوا باقی آبادی کو بھی اس پر مجبور کیا کہ وہ بھی مسلمان ہوجائیں' ورنہ موت کے لئے تیار ہوجائیں' ان ہی دنوں میں بنگال کے اندر بھی مذہب کی بناء پر سختی کی جانے لگی تھی' اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بنگال کے اندر اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے ایک صدی بعد سکندر لودھی نے بھی اپنی سلطنت میں جبری طور پر مذہب اسلام کو فروغ دینے کی کوشش کی' ان اکے دکے واقعات کے سوا اسلامی تاریخوں میں کچھ مزید واقعات کی تصریح نہیں ملتی' اگر جبراً مسلمان بنانے کی عام طور پر کوشش کی جاتی تو مسلمان مورخین اور وقایع نویس ضرور ان باتوں کو اپنی

کتابوں میں نقل کرتے ' اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ہند کے باشندوں نے اکثر برضاو رغبت اسلام قبول کیا تھا ، سرکار کی طرف سے کسی پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا تھا .

اس دور میں اسلام کی اشاعت کا اندازہ ہند کی موجودہ صورت حال سے کیا جاسکتا ہے ' ہند کے شمال مغربی خطہ ' یعنی کشمیر ' مغربی پنجاب ' سرحد اور سندھ میں تین چوتھائی سے زیادہ آبادی مسلمان ہوگئی ہے ' اسی طرح بنگال میں آدھے سے زیادہ لوگ مسلمان ہیں ' اس کے شمالی اور مشرقی اضلاع میں یہ تناسب کچھ اور بڑھا ہوا ہے ' باقی صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ' یہاں دس میں ایک یا اس سے بھی کم تعداد میں مسلمان ہیں ' ان کی ایک بڑی تعداد شہروں اور قصبوں میں رہتی ہے ' ہند کے شمال مغربی حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ یہ ہوی کہ مغرب کی طرف کے بہت سے مسلمان یہاں آکر بس گئے تھے اور مقامی باشندوں نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا ، مگر بنگال کی یہ شکل نہ تھی ' یہاں صرف مقامی باشندوں نے اسلام کو اختیار کرلیا تھا ' اس بات کی پوری تحقیق نہیں ہوسکی کہ بنگال میں اسلام کے پھیلنے کے کیا اسباب تھے ' یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ ہے کہ اس مختصرسی کتاب میں اسپر تفصیلی بحث کرنے کی گنجایش نہیں ہے ' ظن غالب یہ ہے کہ ہندومت کی پابندیوں نے بنگال کی نیچ ذاتوں کو اس نئے مذہب کے قبول کرنے پر آمادہ کردیا تھا ' یہ یاد ہوگا کہ آٹھویں صدی سے لیکر بارھویں صدی تک بنگال پر پال خاندان کی حکومت تھی جو بودھ مت کا پیرو تھا ' ان کے زمانہ میں نیچ ذاتوں کو بڑی آزادی حاصل تھی ' اور جب سین خاندان کے لوگ جنوب کی طرف سے بنگال میں داخل ہوے تو وہ اپنے ساتھ ہندومت ور اس کی تمام معاشرتی پابندیاں بھی لے آئے ' جن سے نیچ ذاتوں کے جذبات کو ہمیشہ ٹھیس لگتی تھی ' اور جب بارھویں صدی میں اسلام آزادی اور مساوات کا ڈنکا بجاتا ہوا بنگال میں پہنچا تو عوام کی طبیعتیں خودبخود اس کی طرف مائل

ہوگئیں ' اور لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے چلے گئے ' یہ ایک ایسا بڑا سبب ہے کہ اس کے ہوتے کسی دوسرے سبب کے تلاش کی حاجت نہیں ہے ۔

دوسرے صوبوں میں لوگ فرداً فرداً مسلمان ہوتے جارہے تھے ' ان میں سے اکثر تو صدق دل سے اسلام قبول کرتے تھے اور بعض سماجی اور اقتصادی مراعات کی بناء پر اس نئے مذہب کو قبول کررہے تھے ' مثلاً ہم یہ جانتے ہیں کہ دہلی کے اطراف و اکناف کے چند ہندو خاندانوں نے محض اس بناء پر اسلام قبول کرلیا تھا کہ ترک بادشاہوں نے سرکاری عہدوں پر ان کو فایز کیا تھا ۔ اسکے علاوہ بہت سے دوسرے اسباب بھی ہونگے جن کی تصریح تاریخوں میں نہیں ملتی ۔

بسا اوقات ایک ذات سے تعلق رکھنے والے خاندان کے خاندان اور گروہ کے گروہ بیک وقت مسلمان ہوجاتے تھے ' اوراسلام قبول کرلینے کے بعد بھی انکی معاشرت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا تھا ' وہ پرانی رسموں اور پرانے خیالات کے اب بھی عادی ہوتے تھے ' شادی بیاہ کے ہندوانہ رسوم اور ذات پات کی پابندیاں ابتک انکی اولاد میں جاری ہیں ' انکی وجہ سے اسلام اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہا ' ایک عالمگیر برادری کی بجاے کئی برادریاں وجود میں آئیں ' جن میں باہم کلی مساوات کا اصول نہیں برتا جاتا ' عقیدے کے لحاظ سے سب ایک ہیں ' مگر بعض سماجی پہلوؤں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی جاتی ہے ۔

ہندی اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت پیر پرستی ہے ، جو اگرچہ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے ' لیکن وہ کسی شرعی اصول پر مبنی نہیں ہے ' اولیاء ہند کی کرامتوں کے قصے اتنے مشہور ہوگئے ہیں کہ ان سے حقیقی حالات کا پتہ چلانا بہت ہی مشکل ہے ' مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ ترکوں کی حکومت کے قیام سے پہلے ہی بہت سے بزرگ وادی گنگا کے مختلف مقامات میں پھیل گئے تھے ' ان میں سے بعض کا مقصد

اسلام کی تبلیغ اور اشاعت تھا اور بعض اپنی قسمت آزمائی کیلئے یہاں آئے تھے ، عوام میں ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی ، اور جب ان کی وفات ہوی تو ہر سال شاندار طریقہ پر ان کا عرس منایا جانے لگا تھا ، اور اب بھی منایا جارہا ہے بعد میں آنے والے بہت سے مسلمان مباغین کو بھی مختلف مقامات اور خاص کر بنگال میں بڑا تقدس حاصل ہوگیا تھا ، ان کے مزار آج تک بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے مرجع اور مرکز بنے ہوے ہیں ، ہندو بھی مسلمانوں کی طرح ان سے منتیں اور مرادیں مانگتے اور ان پر نذریں چڑھاتے ہیں ، ہند کے مسلمان عالم بلاشبہ خدا پرستی اور پیر پرستی میں فرق کرتے ہیں ، مگر عوام کے نزدیک اس فرق کی کوئی اہمیت نہیں ہے .

اس زمانہ میں چند ایسے ہندو پیدا ہوے جنہوں نے مذہبی خیالات میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا ، ان کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے بہتر ہے کہ ہندومت کی ترقی کی سرگذشت بیان کی جائے ، گذشتہ کسی باب میں لکھا جاچکا ہے کہ بھکتی کا نظریہ مدتوں سے ہندوؤں کے ہاں موجود تھا اور سب سے پہلے رامانج نے اس کی پر زور تبلیغ کرنی شروع کی تھی ، آگے چلکر یہ نظریہ پورے شمالی ہند میں قبول عام حاصل کرچکا تھا ، اس نظریہ کے پھیلنے کی تفصیلات کا ہمیں علم نہیں ہے ، لیکن پندرھویں صدی میں اس نظریہ کے علمبرداروں نے شاعری کو ابلتے ہوے جذبات سے اتنا پر کردیا کہ ہندی ادب کی تاریخ میں یہ ایک بہترین زمانہ متصور ہونے لگا ، ایک طرف مادری زبانوں میں مختلف ادبی کتابیں لکھی جانے لگیں تو دوسری طرف عام ہندوؤں کے عقاید و خیالات میں ایک نئی روح پیدا ہوگئی ، یہاں ہم ان تمام لوگوں کے نام نہیں لکھ سکتے جنہوں نے نئے خیالات کی اشاعت میں حصہ لیا ، البتہ ہم ان میں سے صرف پانچ کا تذکرہ کرینگے جنہوں نے عوام اور خواص میں مقبولیت اور شہرت حاصل کی یعنی رامانند ، میرا بائی ، نانک ، چیتنیا اور کبیر .

رامانند ایک ایسے خاندان کا فرد تھا جو رامانج کا پیرو تھا، لیکن وہ ان سے الگ ہوکر شمالی ہند چلا گیا اور بنارس میں بیٹھکر بھکتی کے نظریہ کی اس طرح تبلیغ کی کہ وہ خود ایک نئے فرقہ کا بانی بن گیا، اس کے پیرووں نے اس کے نئے خیالات کی اشاعت کی اور ہندی شاعری کو ان سے مالامال کردیا، میرابائی اسی کے ایک پیرو کی شاگرد تھی، اس نے ہندی اور گجراتی میں بہترین گیت لکھے ہیں، وہ ایک راجپوت شہزادی تھی، جو قسمت سے مجبور ہوکر اپنے وطن چتوڑ سے بھاگ نکلی تھی، ایک مدت تک وہ دربدر اور شہر بشہر پھرتی رہی، آخر اس نے رامانند کے ایک شاگرد کا دامن تھاما اور اس کے خیالات کی تبلیغ شروع کی، نانک پنجاب کا رہنے والا تھا، اس نے ہندی اور پنجابی میں بہت سے بھجن لکھے اور پنجاب میں ان کا پرچار کیا، چیتنیا بنگال کا رہنے والا تھا، اس نے بنگالی زبان میں بہت سی کتابیں لکھیں، اور بنگالی ادب پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ کبیر کے متعلق اتنے قصے مشہور ہوگئے ہیں کہ ان سے اس کے حسب نسب کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے، مگر اتنا معلوم ہے کہ وہ بنارس کا ایک جولاہا تھا، اگر وہ مسلمان نہ بھی ہو تو کم از کم اتنا ضرور تھا کہ وہ مسلمانوں سے گہرا میل جول رکھتا تھا، رامانند کی تعلیمات نے اس کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا اور نئے عقیدہ کی بنیاد پر اس نے ہندومت اور اسلام کو ایک دوسرے سے ملانے کی بڑی کوشش کی، ہندی زبان میں کثرت سے اس کے بہترین اشعار موجود ہیں ان کے ساتھ ساتھ سولھویں صدی کے بہترین شاعر تلسی داس کو بھی شامل کرلینا چاہئے جس نے ان نئے عقاید و خیالات کی روشنی میں رام کی کہانی دوبارہ پیش کی تھی۔

ادبی لحاظ سے یہ دور شمالی ہند کا ایک اہم دور تھا، اس دور میں شاعری کا بہترین حصہ وجود میں آیا، جس سے آج بھی قریے اور دیہات کے لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں، مذہبی حیثیت

سے نئے نئے خیالات کا پرچار ہونے لگا تھا ۔ اور مندروں کی قربانی کے مراسم پر ان کا گہرا اثر ہو رہا تھا ۔ پندرہویں اور سولھویں صدی کے ادبی اور مذھبی لٹریچر کو ھم بلاشبہ انگلستان کے اسی دور کے لٹریچر سے تشبیہ دے سکتے ھیں جس میں انجیل گھر گھر پھیل گئی تھی اور سب لوگ اس سے جوش اور جذبہ اور اطمینان حاصل کر رھے تھے ' آج بھی ایک جاھل اس دیوتا یا اس دیوتا کی رسمی طور پر پوجا کرتا ھے ' مگر اس کا دل و دماغ ایک بلند ترین ھستی پرمیشور کی طرف لگا رھتا ھے ' اور ایک خدا کا یہ تخیل در حقیقت اسی دور کے ادب کی پیداوار ھے ۔

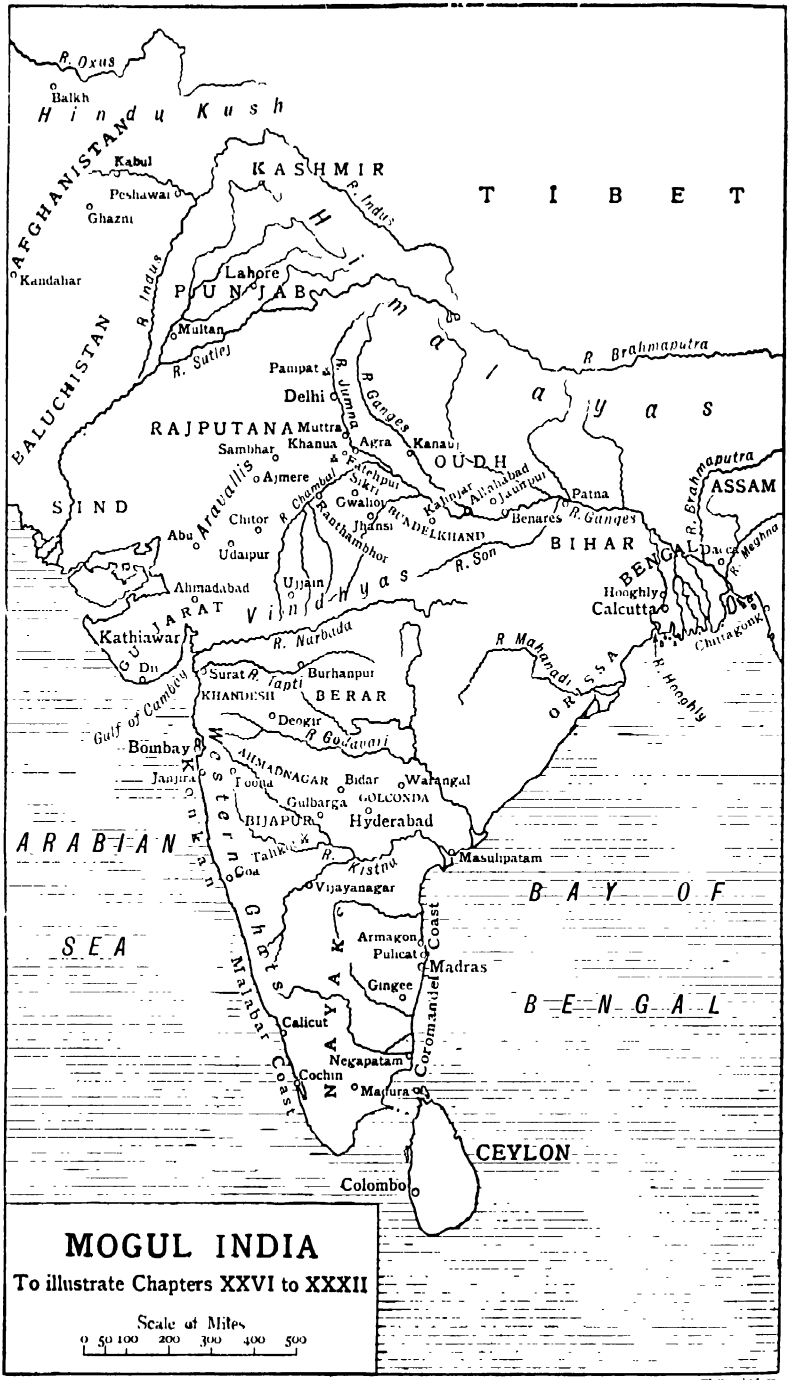
ھم پہلے بیان کرچکے ھیں کہ بھکتی کا عقیدہ شیو یا وشنو پر جاکر ختم ھوتا ھے ' جنوبی ھند میں شیو کو زیادہ مقبولیت حاصل تھی ' شمالی ھند میں اس کی اتنی اھمیت نہیں تھی ۔ بلکہ اس کی بجاے کرشن اور رام کی پوجا ھوتی تھی جو وشنو کے دو بڑے اوتار مانے جاتے ھیں ' ان دونوں کی پرستش میں ایک فرق ھے ' وہ یہ کہ کرشن کے مسلک میں جذبات زیادہ ھیں اس زمانہ کی نظموں میں کرشن کی عاشقانہ زندگی کا مرقع کھینچا گیا ھے ' جو حقیقت میں مجازی ھے ' نفسانی جذبات اور خالص محبت کے درمیان حد فاصل قایم کرنا بہت دشوار ھے ' اس قسم کی شاعری سے بسا اوقات بد اخلاقی کے پھیلنے کا اندیشہ ھوتا ھے ' اس کے بر خلاف رام کی تعلیم روحانیت سے لبریز ھے ' اور سارا ادب اخلاق اور ضبط نفس کے اصولوں سے بھرا ھوا ھے ' شمالی ھند میں صرف ان ھی دو اوتاروں کی پوجا نہیں ھوتی ھے ' کبیر بھینٹ چڑھانے کی رسم کا جتنا مخالف تھا اتنا ھی وہ اوتار کے اصول کا بھی سخت منکر تھا ' اس نے سچی وحدانیت کی تعلیم دی ' اور ایک اعلی ذات کا تصور پیش کیا ' جو اللہ اور رام دونوں کو اپنے اندر شامل کرلیتا ھے ' پنجاب کے اندر نانک نے بھی اسی قسم کی تعلیم دی جو زیادہ تر کبیر ھی کی تعلیمات سے ماخذ تھی ۔

اب اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیا جاسکتا کہ یہ زبردست روحانی تحریک اسلامی اثرات کا نتیجہ ھے ' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کبیر اور اسکے پیرووں کے تعلقات مسلمانوں کے ساتھ بالکل ظاھر تھے ' ھند کے اندر اسلام کوئی پوشیدہ مذھب نہیں تھا ' ھر ایک شہر اور قصبہ میں مسلمان اپنی مسجدوں میں جمع ھوتے تھے اور ان کے مناروں سے ھر روز پانچ دفعہ اللہ اکبر کی صدا بلند ھوتی تھی ' جس کو ھندو اور مسلمان دونوں سنتے تھے ' اور توحید خداوندی کا نقش خود بخود لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ھوتا جارھا تھا ' ابتدا میں ھندووں کو یہ آواز بری لگتی رھی ھوگی ' مگر بعد میں وہ اس سے مانوس ھوگئے ھونگے ' اور ان میں ایک وسیع نقطۂ خیال پیدا ھوگیا ھوگا ' جو یقیناً قدیم برھمنوں کی تعلیم کے خلاف تھا غالباً سیاسی حالات کی تبدیلی نے بھکتی کا پرچار کرنے والوں کیلئے راستہ صاف کردیا ھوگا ' اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا ' ورنہ بھکتی کا عقیدہ یقیناً اسلام سے پہلے کا ھے .

باب ۲۶

پرتگالیوں کی آمد

انیسویں باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ پندرھویں صدی کے خاتمہ پر کس طرح ہندی تمدن اسلامی اور چینی تمدنوں کے درمیان گھر گیا تھا ' اور بعد کے ابواب میں بیان کیا جاچکا ہے کہ کس طرح ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ ہوگیا تھا ' اب یہ بتانا مقصود ہے کہ پرتگالیوں نے کس طرح یہاں اپنے قدم جمائے ' یہ ایک چھوٹی سی قوم تھی مگر اس میں ہمت اور حوصلے بہت زیادہ تھے ' چونکہ زمینی سرحد پر فتوحات حاصل کرنے کی بہت کم گنجایش تھی اسلئے اس قوم نے اپنے موزوں مقام سے فائدہ اٹھاکر بحری طاقت کے بڑھانے کی کوشش کی ' چنانچہ پندرھویں صدی میں پرتگالیوں نے جزائر ہند تک پہنچنے کا ایک نیا راستہ ڈھونڈھ نکالا ' اس سے پہلے یورپ کے لوگ اس راستہ سے واقف نہیں تھے' یہ افریقہ کے مغربی ساحل کا چکر لگاکر ہند کے مغربی ساحل تک پہنچتا تھا ' ان کا مقصد یہ تھا کہ جو تجارتی سامان مصر شام اور ترکی کے راستہ سے یوروپ تک پہنچتا تھا ' اس کو نئے راستہ سے لایا جائے اور خوب نفع کمایا جائے ۔ نفع کمانے کے علاوہ ان کے اور بھی مقاصد تھے پرتگالی اسلام اور مسلمانوں کے زبردست دشمن تھے ' مشرقی حصہ بحر روم کی اسلامی سلطنتیں ان کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھیں ' ان کی وجہ سے دین عیسویت کو زبردست خطرہ پیدا ہوگیا تھا ' ان سلطنتوں کو تجارتی محصول کے ذریعہ بڑی آمدنی ہوجاتی تھی ' اس لیے پرتگالیوں کو خیال ہوا کہ اگر یوروپ تک ہند سے مال لیجانے کا کوئی نیا راستہ نکل آئے تو اسلامی سلطنتوں کو محصول ادا کرنے کی ضرورت نہ ہوگی'



MOGUL INDIA
To illustrate Chapters XXVI to XXXII

Emery Walker Ltd sc.

اس طرح ان کی آمدنی بھی گھٹ جائیگی اور آئندہ یوروپ کی طرف آنکھ اٹھانے کی بھی انہیں ہمت نہیں ہوگی ' اس کے علاوہ پرتگالی دینی حمیت اور مذہبی جوش میں دوسرے عیسائیوں سے بہت بڑھے ہوے تھے ' ان کے خیال میں ہند کے باشندے جہالت کے ذلیل گڑھے میں گرے ہوے تھے اور دین عیسوی کی اشاعت کے ذریعہ ان کی جہالت کو دور کرنا اور برکات عیسوی سے ان کو فیضیاب بنانا چاہتے تھے ' چنانچہ انہوں نے محض تجارتی یا سیاسی اغراض کی بناء پر نیا راستہ نہیں ڈھونڈا بلکہ دینی جوش اور جذبہ ان کو ایک نیا راستہ تلاش کرنے پر مجبور کررہا تھا ' پوری پرتگالی قوم کا یہی مقصد اور نصب العین تھا .

مغربی افریقہ سے چکر کاٹ کر راستہ پیدا کرنے میں ایک زمانہ لگ گیا ' اور جب راس امید کا پتہ لگ گیا تو ایک شاہی بیڑا واسکوڈ گاما کی سر کردگی میں سنہ ۱۴۹۸ ء میں مالابار کے ساحل تک پہنچ گیا ' اس نئی دریافت کے نتائج کو بہتر طریقہ پر سمجھنے کیلئے ہمیں جنوبی ایشیا کے مشہور تجارتی راستہ کا پھر سے ایک جائزہ لے لینا چاہئے ' ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مسلسل سفر کا طریقہ متروک ہوگیا تھا ' تجارتی سامانوں کو پہلے آبنائے ملایا پر اور پھر ہند کے مغربی ساحل پر بدلانے کا انتظام کیا گیا تھا ' پندرھویں صدی کی ابتدا میں ملاکا تجارتی سامانوں کی کثرت کی بناء پر ایک اہم تجارتی شہر بن گیا تھا ' ہند کے جہاز سوتی کپڑوں کو لیکر یہاں پہنچتے تھے اور سلک ' گرم مسالہ اور دواؤں وغیرہ کو لیکر واپس ہوجاتے تھے ' ان میں سے بعض چیزیں اندرون ملک میں فروخت کرنے کیلئے ہند کے مشرقی ساحل پر اتار لی جاتی تھیں ' اور باقی لیکر جہاز گجرات پہنچتے تھے جہاں سامانوں کا ایک حصہ مقامی ضروریات کیلئے رکھ لیا جاتا تھا اور باقی کو دوسرے جہازوں میں لاد کر بحر احمر اور خلیج فارس کی مختلف بندرگاہوں تک پہنچایا جاتا تھا ' مگر جو چیزیں

مالابار کے ساحل پر اتاری جاتی تھیں وہ مقامی ضروریات کیلئے نہیں ہوتی تھیں، بلکہ دوسرے جہازوں میں لادکر آگے روانہ کردی جاتی تھیں۔ مالابار کے ساحل پر عرب اور مصری تاجروں کے کارندے رہتے تھے، جو ان چیزوں کو اپنے اپنے جہازوں میں لادکر بحراحمر کی بندرگاہوں کو روانہ کر دیتے تھے یہ کارندے عموماً مقامی ریاستوں کی رعایا نہیں ہوتے تھے، بلکہ وہ بدیسیوں کی حیثیت سے رہتے تھے، ان کو حکومت کی طرف سے بہت سے حقوق اور مراعات حاصل تھے، ان کے قبضہ میں کئی بندرگاہیں ہوتی تھیں جن کے انتظام کے وہی ذمہ دار تھے، ریاستوں کے اندر ان کا بہت زیادہ رسوخ اور اقتدار تھا، اور ہر جگہ ان ہی کی بات چلتی تھی، اس لئے وہ بسا اوقات ہند کے درآمد کرنے والے بیوپاریوں کو بھی اپنی من مانی شرطوں کے قبول کرنے پر مجبور کردیتے تھے۔

مالابار کی بندرگاہیں اس زمانہ میں بڑی اہمیت رکھتی تھیں، کیونکہ یہ ایک موزوں مقام پر واقع ہوی تھیں۔ اس کے علاوہ یہاں سے کالی مرچ کی برآمد ہوتی تھی، جس کی شمالی یوروپ میں بڑی مانگ تھی، یہاں سے کثیر مقدار میں کالی مرچ بحراحمر کےجہازوں میں بھیجی جاتی تھی، آجکل کی طرح اس کی کاشت مغربی گھاٹ کے ڈھلانوں پر ہوتی تھی، اور اسی کی تجارت پر یہاں کے باشندوں کی زندگی قایم تھی۔ اگر عرب اور مصری تاجر کالی مرچ کی تجارت چھوڑدیں تو مالابار کے باشندوں کی تباہی لازمی تھی۔ سیاسی حیثیت سے اگرچہ یہاں کی مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجیانگر کے ماتحت تھیں۔ مگر تجارتی حکمت عملی کے اختیار کرنے میں وہ خود مختار تھیں، اور وہ ایک دوسرے سے تجارتی سمجھوتے بھی کرسکتی تھیں، اور جب کبھی ان کے درمیان لڑائی ہوتی تھی تو وجیانگر کی طرفسے کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔

ان حالات میں پرتگالیوں کی آمد سے ایک نئی کشمکش پیدا ہوگئی اور یہ کشمکش عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں تھی جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، بلکہ یہ درآمد اور برآمد کرنے والے بیوپاریوں کے درمیان ایک جنگ تھی، ہند کے درآمدی بیوپاریوں نے، جن میں زیادہ‌تر مسلمان تھے، نئے گاھکوں یعنی پرتگالیوں کی بڑی آؤ بھگت کی جس کی بناء پر عرب اور مصر کے برآمد کرنے والے تاجر پرتگالیوں سے بگڑ بیٹھے، کیونکہ ان کی وجہ سے ان کی اجارہ‌داری پر بڑی زد پڑ رھی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک دوسرے کو اکھیڑنے کی فکر میں لگ گیا۔ اسی اثنا میں کالیکٹ کے راجہ سے پرتگالیوں کی ان بن ہوگئی مگر انہوں نے نہایت پھرتی اور مستعدی کے ساتھ کوچین وغیرہ کے راجہ سے دوستانہ تعلقات قایم کرلئے، کیونکہ یہاں سے ان کو کافی مقدار میں کالی مرچ مل سکتی تھی، اس طرح ہر سال پرتگالی بیڑے تجارتی مال یوروپ لے جاکر بیچتے اور خوب نفع کماتے رہے۔

تجارت کے ایک حصہ پر قابو پالینے کے بعد بھی پرتگالیوں کی تشفی نہیں ہوسکی، ان کا ارادہ تھا کہ پوری تجارت پر قبضہ کرلیا جائے ابتدائی تجربوں سے ان کو معلوم ہوگیا تھا کہ ایسا کرنا ناممکن نہیں ہے، اس کیلئے ملک گیری کی بھی ضرورت نہیں تھی، اتنا کافی تھا کہ وہ بحری طاقت کے ذریعہ سمندروں پر حاوی ہوجائیں، انہوں نے مغربی ساحل پر چند مضبوط قلعے تعمیر کیے، جہاں سے وہ آسانی کے ساتھ بحری کارروائیاں کرسکیں، ان کو کسی بڑے بحری بیڑے کی بھی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ ان کے مقابلہ میں کوئی اور قوت نہیں تھی، ان کو صرف مصری بیڑے کا ڈر لگا ہوا تھا، مگر سنہ ۱۵۰۹ع میں اس کو بالکل تباہ کردیا گیا تھا، اس کے بعد سے وہ عملاً تمام مشرقی سمندروں کے مالک بن گئے تھے۔

پرتگالیوں کی بحری طاقت اور قوت کو مضبوط کرنے والا الفانسوڈی البوقرق ہے جو سنہ ۱۵۰۹ع سے لیکر اپنی وفات سنہ ۱۵۱۵ع تک مشرقی مقبوضات کا گورنر اور حاکم رہا ' ہند کے مغربی حکام میں اسکی حیثیت بہت ہی ممتاز ہے ' زمانہ حال کے ایک مصنف * نے اسکی تعریف یوں کی ہے کہ '' وہ بڑا ہی رعب دار اور اولوالعزم تھا ' اس کے ساتھ وہ بڑا دوربین آدمی بھی تھا ' کسی اور میں ان صفات کا جمع ہونا بہت مشکل ہے ' اس میں جس طرح حکومت کرنے کی اہلیت تھی اسی طرح فوجوں کی قیادت کی قابلیت بھی تھی ' سیاسی چالبازیوں میں وہ اپنے ہمعصر مشرقی مخالفین کے تمام ہتھیاروں کا تابڑ توڑ جواب دے سکتا تھا " سنہ ۱۵۰۹ع میں اس نے ارموز فتح کیا ' اسکے بعد سے پرتگالی جہاز خلیج فارس میں داخل ہوسکتے تھے ' سنہ ۱۵۱۰ع میں بیجاپور سے گوا کا شہر چھین لیا اور اسکو مشرقی مقبوضات کا پایہ تخت قرار دیا ' سنہ ۱۵۱۱ع میں ایک زبردست جنگ کے بعد ملاکا پر قابض ہوگیا ' جسکی وجہ سے ساری آبنائےملایا پر پرتگالیوں کا تسلط ہوگیا ' اسکے بعد اس نے عدن کو فتح کرنے کی کوشش کی ' مگر اس مہم میں وہ ناکام رہا ' اسکی بجائے ڈیو پر اس کا قبضہ ہوگیا ' جو خلیج کیمبے کے دہانہ پر واقع تھا ' اسکے بعد سے پرتگالی جہاز بلا روک ٹوک سارے سمندر میں چل سکتے تھے ' اور حقیقت تو یہ ہے کہ عربی جہازوں کے کارندوں کو مجبوراً ہند چھوڑنا پڑا ۔

تجارت کو اپنے قبضہ میں رکھنے کیلئے پرتگالیوں نے کئی طریقے اختیار کیے ' انھوں نے چند تجارتی راستوں اور سامانوں کو سلطنت پرتگالی کیلئے خاص کرلیا تھا ' ہند کے دوسرے تاجر اجازت ناموں کے بغیر کوئی لین دین نہیں کرسکتے تھے ' ایک معقول رقم کے ادا کرنے پر ان کو یہ اجازت نامے ملتے تھے ' اگر کوئی اس کے بغیر تجارت کرنے کی کوشش کرتا تو اس

* الفانسوڈی البوقرق از ای پرسٹیج (مطبوعہ وہائٹ فرڈ سنہ ۱۹۲۹ع صفحہ ۸۳ ۔

کا جہاز مع سامان چھین لیا جاتا تھا ، ان کی نگرانی کیلئے کئی جنگی کشتیاں سمندر میں تیرتی پھرتی تھیں ، جو آسانی کے ساتھ سرکش تاجروں کا قلع قمع کرسکتی تھیں ، ان طریقوں سے پرتگالی پوری ایک صدی تک سمندری تجارت پر حاوی رہے ، اس کے باوجود بعض رشوت خور پرتگالی عہدہدار روپیہ لیکر دیسی تاجروں کے مال کو زمینی راستہ سے یوروپ جانے کی اجازت دے دیتے تھے .

هند کے مغربی ساحل پر جتنے پرتگالی مقبوضات تھے ان کا الحاق مرکزی حکومت پرتگالی سے ہوگیا تھا اور یہاں باقاعدہ حکومت قایم ہوگئی تھی . مگر جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا ہند کے مشرقی ساحل پر بھی پرتگالیوں کی نوآبادیاں قایم ہونے لگی تھیں ، بنگال اور کارومنڈل کے ساحلی مقامات پر مقامی راجاؤں کی اجازت سے پرتگالی تاجر بس جاتے تھے ، اور اس کے بعد دھیرے دھیرے مضبوط قلعے بناکر خود مختار ہوجاتے تھے ، یہ لوگ نیم آزاد ہوگئے تھے ، اور بسا اوقات حاکم گوا کے احکام کو بھی نہیں مانتے تھے ، مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر وہ سرکش اور باغی ہوگئے تھے ، انہوں نے سمندری قزاقوں کو پناہ دے رکھی تھی ، جو خلیج بنگال کے تجارتی جہازوں کو لوٹتے تھے ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی تجارت کو ایک حد تک نقصان پہنچا .

ہند کی عام سیاست پر پرتگالیوں کی آمد کا کوئی فوری اثر نہیں پڑا ، البتہ گوا کو فتح کرلینے کی وجہ سے انہوں نے بیجاپور سے دشمنی مول لے لی تھی ، مگر وجیانگر کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات قایم رہے ، انہوں نے گھوڑوں کی تجارت بھی شروع کی تھی ، لیکن وجیانگر کی لڑائیوں میں اس تجارت سے ہندو ریاست کو کوئی خاص تائید نہیں ملی . ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق پرتگالیوں کے آنے سے یہاں کی سیاسی الجھنیں اور

بڑھ گئی تھیں، وہ بلاشبہ توپ * اور بندوق کے استعمال میں ہندوالوں سے زیادہ ماہر تھے، اس کے ساتھ ان کی بہادری نے ان کو ناقابل تسخیر بنادیا تھا اور یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب ہے۔

نئے راستہ کے نکل آنے سے ہند کی برآمدی تجارت کو کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوی تھی، البتہ پہلے سے کچھ زیادہ مقدار میں کالی‌مرچ یوروپ جانے لگی تھی، مگر اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مغربی افریقہ اور برازل میں ہند کے سوتی کپڑوں کیلئے نئی منڈیاں کھل گئیں، پرتگالیوں کے آنے کے بعد ہند کی در آمدی تجارت کو بھی کچھ زیادہ فروغ نہیں ہوا، کیونکہ وہ زیادہ تر یوروپ کی آرایشی چیزیں اور نوادر فروخت کرتے تھے، جن کے بدلہ ان کو چاندی ملتی تھی، ان کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ انہوں نے تجارت کے ساحلی راستوں کا پورا بندوبست کیا، مالابار کے ساحل پر بہت سے بحری قزاق رہتے تھے جو گجرات، سیلون، مدراس اور بنگال کی طرف جانے والے جہازوں پر چھاپہ مارتے تھے، پرتگالیوں نے تجارتی جہازوں کے ساتھ جنگی کشتیوں کا بڑا انتظام کیا جس کی وجہ سے تمام اہم بحری راستے ایک حد تک محفوظ ہوگئے، اس خدمت کا کافی صلہ چنگی کے محصول کی صورت میں مل جاتا تھا جو دیسی اور بدیسی جہازوں کی تجارتی اشیاء پر عاید کیا جاتا تھا، اس کی وجہ سے ہند کے تاجروں کی مالی حالت دن بدن کمزور ہوتی گئی اور ان کے بحری حوصلے بالکل پست ہوگئے۔

پرتگالی دین عیسوی کے زبردست حامی تھے، انہوں نے ہر جگہ اس دین کی تبلیغ شروع کردی تھی، اور گرجاؤں اور خانقاہوں کو بڑی بڑی جاگیریں دی تھیں، ہند، چین اور جاپان

---

* قطعی طور پر یہ نہیں معلوم ہے کہ جنوبی ہند میں توپ کا استعمال کب سے ہونے لگا تھا، البتہ اتنا ثابت ہے کہ پرتگالیوں کی آمد سے کئی سال پہلے سے یہاں بندوق کا رواج ہوچکا تھا۔

میں سینکڑوں مبلغین تبلیغ دین پر مامور تھے ' عقاید کی حفاظت کیلئے گوا میں ایک محکمہ احتساب قائم تھا ' حاکم گوا کے بعد لاٹ پادری ھی کا درجہ تھا ' ھند کے باشندوں کے ساتھ پرتگالی پادریوں کا طرز عمل کچھ عجیب ذھنیت کا پتہ دیتا ھے ' ان کے نزدیک مسلمان مردود اور ملعون تھے ' کیونکہ انھوں نے جان بوجھ کر ازلی و ابدی سچائی کا انکار کیا تھا ' ھندو کافر تھے ' جن کو ضلالت اور گمراھی سے نکالنا ھر ایک پرتگالی کا فرض سمجھا جاتا تھا ' مگر ان کی لڑائی مالابار کے نسطوری عیسائیوں سے تھی ' جن کو وہ بدترین ملحد خیال کرتے تھے ' انھوں نے آخر نسطوری عیسائیوں کو کیتھولک عقیدہ کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا .

وہ پرتگالی جو پہلے پہل ھند میں وارد ھوے ' بڑے دلیر اور بہادر تھے ' ان میں ملک گیری کا بڑا جوش اور جذبہ تھا ' اپنی ذات اور اپنی قوم پر ان کو بڑا ناز تھا ' ان میں سے اکثر بڑے بے رحم ' سنگدل اور جابر تھے ' ان کی ابتدائی کامیابیوں کی وجہ سے ان کا فطری گھمنڈ اور زیادہ ھوگیا تھا ' وہ ایشیا کے تمام باشندوں کو اپنا غلام سمجھنے لگے تھے ' جب وہ یہاں آئے تو ان کے ساتھ بہت کم عورتیں تھیں ' اس لیے مجبوراً ھند کی لڑکیوں سے شادی کرنی پڑی ' غالباً یہ خیال تھا کہ ملک گیری کیلئے یہیں سے سپاھی اور جہازران مل جائینگے چنانچہ وہ شادیاں کرکے مختلف مقامات پر بس گئے ' ان کی اولاد میں وہ فطری بہادری نہیں تھی جو اصل پرتگالیوں میں پائی جاتی تھی ' فخر و غرور ' حرص و آز ' بد اطواری و بد اخلاقی میں وہ اپنے آباء واجداد سے بہت بڑھ چڑھکر تھے ' لیکن دلیری و بہادری کے اوصاف ان سے غائب ھوچکے تھے ' دغا بازی اور غارت گری ان کا پیشہ تھا ' اور آخر وہ نوبت پہنچی کہ لوگ پرتگالیوں سے ڈرتے تو تھے مگر کسی کو ان کی بات پر اعتبار نہیں ھوتا تھا ' انکی عزت اور قدر لوگوں کی نظروں سے گرگئی ' اور جب وہ انگریزوں اور ولندیزیوں

سے دو چار ہوے تو پرتگالیوں کی حمایت اور تائید کرنے والا کوئی نہیں رہا ، یہانتک کہ پچاس سال کے اندر ان کا اثر اور رسوخ بالکل گھٹ گیا ، اور وہ آج ہر جگہ بدنام ہوگئے ہیں ، مگر اس کی وجہ سے ان کے ابتدائی کارناموں پر پانی نہیں پھیرا جاسکتا ، دلیری اور قوت برداشت کے متعلق ان کے کارنامے اس وقت تک زندہ رہینگے جب تک کہ جواؤ ڈی باروس João do Barros کی تاریخ ' ایشیا ' اور کموئنز Camoens کی نظم ' لوسیڈ ' Lusiad باقی رہیگی ۔

باب ۲۷

مغل فتوحات

جنوبی ہند میں پرتگالیوں کے قدم ابھی جمنے بھی نہیں پائے تھے کہ مغلوں* نے شمالی ہند پر قبضہ کرلیا ، اس خاندان کا پہلا بادشاہ بابر امیر تیمور کی اولاد سے تھا ، اس کی ماں چنگیز خاں کی نسل سے تھی ، اس طرح ترکوں اور مغلوں کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا ، بابر ابھی کم سن ہی تھا کہ ترکستان کی ایک چھوٹی سی ریاست باپ سے ورثہ میں ملی ، لیکن ایک مدت تک اس کو زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ، کبھی تو وہ تخت کا مالک ہوتا اور کبھی پہاڑیوں میں بھٹکتا پھرتا تھا یہاں تک کہ اکیس سال کی عمر میں کابل کو فتح کیا جو اس زمانہ میں مشرقی افغانستان کا ایک مشہور فوجی قلعہ تھا ، اس کی خود نوشتہ سوانح حیات تزوک بابری دنیا کی تمام سوانح عمریوں میں سب سے بلند درجہ رکھتی ہے ، اس سے اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے ، دنیا کے آرام و آسایش اور رنج و تکلیف دونوں وقتوں پر اس کے مردانہ جوہر کھلتے تھے ، اگر ایک طرف اس کو دلکش مناظر ، پر لطف باغات ، شراب نوشی اور عمدہ عمارتوں کے بنانے سے دلچسپی تھی تو دوسری طرف وہ میدان جنگ میں سخت ترین معرکوں کا شیدائی تھا ، دوستی اور دشمنی ، سیاسی چالبازی اور خوش مزاجی میں اس کا کوئی نظیر نہیں تھا ، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عزم اور ارادہ کا بڑا پکا تھا .

---

* اشتقاقی حیثیت سے منگول اور مغل ایک ہی لفظ ہیں ، مگر اصطلاحا پہلا لفظ چنگیز خاں اور اس کی قوم کیلئے استعمال ہوتا ہے دوسرا لفظ بابر اور اس کی قوم کیلئے بولا جاتا ہے جنہوں نے ہند میں آکر بود و باش اختیار کرلی تھی ، بعض لوگ اصل لفظ منگول کو مغل اور بعض مغول لکھا کرتے ہیں .

ایسی طبیعت کے انسان کو کابل کا تنگ میدان کافی نہیں تھا ' وہ کم از کم پنجاب پر قابض ہوجانا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس کو اپنے جدامجد امیر تیمور کی میراث خیال کرتا تھا ' مگر اس پر قبضہ کرنے کیلئے اس کے پاس کافی فوج اور سامان نہیں تھا ' اس کو ابھی تک کابل ہی کے اندر استقلال حاصل نہیں ہوا تھا ' تاہم وہ دھیرے دھیرے اپنے منصوبوں کو آگے بڑھاتا اور ہند کی سرحد پر مختلف حملے کرتا رہا تاکہ لڑائی کا تجربہ حاصل ہو یہاں تک کہ لاہور کا حاکم دہلی کے بادشاہ ابراہیم لودھی سے برگشتہ ہوگیا ' اور اس نے بابر کو دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت دی ' اس کیلئے اس سے بہتر کوئی اور موقعہ نہیں ہوسکتا تھا ' اس لئے وہ فوراً اپنی فوج کو لیکر آگے بڑھا اور سنہ ۱۵۲۶ع میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو زبردست شکست دی اور اس کو قتل کرکے سلطنت دہلی کا مالک بن گیا .

پانی پت کی یہ جنگ کئی لحاظ سے اہم تھی ' ابراہیم لودھی کی کل فوج تقریبا پچاس ہزار تھی ' اس کے ساتھ ایک ہزار ہاتھی بھی تھے ' اس کے بر خلاف بابر کی فوج صرف آٹھ ہزار تھی ' مگر وہ ترکی سے توپ خانہ خرید کر ساتھ لے آیا تھا ' جس سے ابراہیم لودھی بالکل محروم تھا ' بابر نے پکا ارادہ کرلیا کہ اس توپ خانہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاے چنانچہ اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کو ابراہیم لودھی کی فوج کے سامنے مرتب کیا اور دونوں بازووں پر اپنے سوار متعین کردئے ' اور جب حملہ شروع ہوا تو لودھی فوج تین طرف سے دشمن کی زد میں تھی ' بابر نے وہ گولے برسائے کہ چند ہی گھنٹوں میں لودھی فوج کا صفایا ہوگیا ' خود بادشاہ بھی مارا گیا ' اور جو کچھ فوج بچی وہ بھاگ نکلی ' بابر نے آگے بڑھکر فوراً دہلی پر قبضہ کرلیا اور پھر آگرے کو فتح کرکے وہ سلطنت کی تنظیم کی طرف متوجہ ہوا .

اس فتح کے بعد بھی بابر کے سامنے دو زبردست روڑے تھے بہت سے افغانی امیروں اور راجپوت سرداروں نے اس کی بادشاہت تسلیم کرنے سے انکار کردیا ' ہم پہلے بتاچکے ہیں کہ لودھیوں کے زمانہ میں افغانی امیر بہت طاقت ور ہوچکے تھے ' اور بڑی بڑی جاگیروں کے مالک ہوگئے تھے ' ملک میں ان کا اقتدار بڑھ گیا تھا ' سبھوں نے بابر کی مخالفت پر کمر باندھ لی تھی بعض نے لودھی خاندان سے تخت کے ایک دعویدار کو کھڑا کیا اور اس کی حمایت اور تائید کرنی شروع کی ' اور بعض نے اپنی اپنی جگہ خود مختاری کا اعلان کردیا ' بابر میں اب بھی اتنی ہمت تھی کہ ایک ایک کرکے ان سب کا خاتمہ کرے ' چنانچہ اس نے سب سے پہلے تخت کے دعویدار اور اس کے حامیوں کو شکست دی اور پھر خود مختار افغانیوں کو ایک ایک کرکے ختم کیا ' ان میں سے بعض بنگال کی طرف بھاگ گئے ' وہاں ان کی بڑی آو بھگت ہوی ' ان کو بڑے بڑے عہدے دئے گئے ' اور جاگیریں عطا کی گئیں ' بابر ابھی ان افغانیوں سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ راجپوت سرداروں نے سر اٹھانا شروع کردیا ۔

یہ یاد ہوگا کہ ترکوں کے زمانہ میں راجپوت گنگا کے میدانوں کو چھوڑکر اس علاقہ میں جابسے تھے جس کو اب راجپوتانہ کہا جاتا ہے - یہاں انہوں نے چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قایم کرلی تھیں ' مگر ان کے درمیان اتفاق نہیں تھا ' وہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے ' یہاں تک کہ ابراھیم لودھی کے زمانہ میں میواڑ * کے رانا سنگ رام سنگھ نے تمام راجپوتوں کو سلطنت دھلی کے خلاف متحد کیا ' اور وہ ابراھیم لودھی سے لڑنے کی تیاریاں کر ھی رہا تھا کہ اس کو بابر کے ارادوں کی خبر ملی ' اس نے سیاسی مصلحت کی بناء پر

* میواڑ کو کبھی چتوڑ اور کبھی اودے پور کہا جاتا ھے ، یہ دونوں یکے بعد دیگرے میواڑ کی ریاست کے پاے تخت رہ چکے تھے

بابر سے دوستی کرلی اور وقت پر اس کی امداد کرنے کا وعدہ بھی کیا ، مگر اس کا یہ وعدہ کبھی پورا نہ ہوسکا ، اور جب بابر نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرلیا تو راجپوتوں کا یہ جتھا اس کا مخالف ہوگیا ، اور وہ شمال کی جانب آگرہ کی طرف بڑھنے لگا ۔ دوسرے ہی سال یعنی مارچ سنہ ۱۵۲۷ء میں بابر اپنی فوج لیکر آگرہ سے نکلا اور اس کے مغربی جانب چالیس میل کے فاصلہ پر کانوہ کے میدان میں راجپوتوں کے خلاف صف آرا ہوا ۔ اگرچہ اس کے دشمنوں کی تعداد سات یا آٹھ گنی زیادہ تھی تاہم بابر اسی توپ خانہ کی مدد سے اس مہم میں بھی کامیاب رہا ، بہت سے راجپوت مارے گئے ، سنگ رام سنگھ سخت زخمی ہوا ، اور یہ سارا جتھا تتربتر ہوگیا ۔ اس کے بعد راجپوتوں کی جانب سے بابر کو کسی بڑی بغاوت کا سامنا کرنا نہ پڑا ۔

بابر نے اپنی باقی زندگی سلطنت کے استحکام میں گذاری ، اس نے اپنے راستہ کے تمام کانٹوں کو ایک ایک کرکے صاف کیا اس درمیان میں اس کی صحت بہت خراب ہوچکی تھی ، اور آخرکار سنہ ۱۵۳۰ء میں اس کا انتقال ہوگیا ، اس وقت اس کی عمر صرف سینتالیس سال کی تھی ، اس کی موت کا واقعہ بھی بالکل عجیب ہے ، کہا جاتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا لڑکا ہمایوں بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا تھا ، بابر کو خیال ہوا کہ کوئی عزیز ترین چیز صدقہ دیکر ہمایوں کی جان بچالے ، اپنی جان سے زیادہ اس کیلئے کوئی عزیز ترین چیز نہیں تھی ، چنانچہ اس نے اسی کا صدقہ پیش کیا ۔ ہمایوں میں فوراً صحت کے آثار نمایاں ہونے لگے ، اس کی کامل تندرستی پر چند دن بھی نہیں گذرے تھے کہ بابر کا انتقال ہوگیا ، ہمایوں اگرچہ بہت شایستہ اور قابل تھا مگر وہ فطری طور پر بہت کم زور تھا اس کو افیم کھانے کی عادت تھی ، اس کے ابتدائی چند سال سلطنت کی تنظیم اور توسیع پر صرف ہوے ، سنہ ۱۵۳۵ء میں اس نے مالوہ

اور گجرات کے بادشاھوں سے کامیاب جنگ کی ' مگر دوسرے ھی سال شیر خاں کی خطرناک بغاوت کی وجہ سے اسے فوراً دھلی واپس آنا پڑا .

شیر خاں ابراھیم لودھی کے دربار کا ایک افغانی امیر تھا ' پانی پت کی لڑائی کے بعد وہ بابر کا ملازم ھوگیا ' مگر جب مغل بادشاہ اس سے کچھ بد گمان ھوگیا تو وھاں سے بھاگ کر اس نے بہار میں پناہ لی اور وھاں بڑی چالبازی اور کشمکش کے بعد گنگا اور اس کے معاون دریاے سون کے درمیانی علاقہ پر قابض ھوگیا ' اس کے بعد وہ بنگال کی طرف بڑھا اور لکھنوتی کا محاصرہ کیا ' بہت دنوں تک مذبذب رھنے کے بعد ھمایوں بذات خود شیرخاں کی سرکوبی کیلئے روانہ ھوا ' اس میں اب بھی ھمایوں کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی ' اس لئے وہ لکھنوتی کے بیش بہا خزانہ کو لیکر ایک دوسرے راستہ سے چھوٹا ناگپور ھوتا ھوا اپنے اصلی مورچہ رھتاس پر پہنچ گیا ' ھمایوں نے اپنے تین قیمتی مہینے لکھنوتی میں بیکار گذارے ' بیماریوں کے پھیلنے کی وجہ سے اس کی فوج میں ابتری پیدا ھوگئی ' اس درمیان میں اس کو دھلی کی ایک بغاوت کی اطلاع ملی ' اس کو فرو کرنے کی غرض سے وہ لکھنوتی سے چل پڑا ' شیر خاں کی فوج اس کے راستہ میں حائل تھی ' ھمایوں مغربی جانب سے اپنا راستہ نکالنا چاھتا تھا ' لیکن شیر خاں نے نہایت ھوشیاری اور مکاری سے ھمایوں کی فوج کو دو مرتبہ سخت شکست دی ' اور اس کو عملا نیست و نابود کردیا اور آخر سنہ ۱۵۴۰ع میں ھمایوں کو جان بچانے کیلئے مغرب کی طرف فرار ھوجانا پڑا ' اس نے راجپوتانہ اور سندھ سے امداد حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی آخر چالیس ساتھیوں کے ساتھ وہ ایران چلا گیا ' اب شیر خاں شیر شاہ کے نام سے ھند کا بادشاہ بن گیا اور بنگال سے لیکر پنجاب تک اس کی حکومت قایم ھوگئی .

شیرشاہ میں بادشاہ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں ' وہ ایک تجربہ کار اور آزمودہ سپاہی تھا ۔ اس نے اپنی فوج کی زبردست تنظیم کی ' اور سپاہیوں میں جنگ کی مہارت پیدا کی ' سیاسی جوڑ توڑ میں اس کا کوئی نظیر نہیں تھا ' حکومت کے نظم و نسق کا اس کو خوب تجربہ تھا ' سلطنت کے امور سے اس کو کافی دلچسپی تھی اور وہ اپنی ذہانت کو استعمال کرتا تھا ۔ وہ بڑا ہی مردم شناس تھا ' بڑے سے بڑے سرکش لوگ اس کے سامنے جھک جاتے تھے ' سلطنت کو بڑھانا اور اس کو مستحکم کرنا اس کا حقیقی نصب العین تھا ' اس نے گوالیار کے اہم قلعوں پر قبضہ کرلیا ' اور مالوہ کی طاقت کو توڑ کر رکھدیا اور پھر جنوب کی طرف بڑھنے کی تیاریاں کیں ' لیکن راستوں کی درستی تک اس مہم کو ملتوی کرنا پڑا ' تاہم رنتھمبور اور اجمیر کے قلعوں پر اس کا قبضہ ہوگیا تھا ' صرف کالنجر ہی ایک ایسا قلعہ تھا جس کو فتح کرنے کی ضرورت تھی ' یہاں ایک ہندو راجہ کی حکومت تھی ' یہ جھانسی سے مشرق میں ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا ' سنہ ۱۵۴۵ ع میں شیر شاہ نے اس قلعہ کا محاصرہ کیا ' اتفاق سے بارود میں آگ لگ گئی ' اور شیر شاہ بیحد زخمی ہوا ' اور آخر اسی کے صدمہ سے وفات پائی ۔ اس نے پانچ برس سے کچھ کم دنوں تک حکومت کی ۔

شیرشاہ کی فتوحات عارضی تھیں ' مگر تاریخ میں اس کی اہمیت اس کے ملکی اصلاحات کی وجہ سے ہے ' بابر اور ہمایوں لودھیوں کے نظم و نسق کو ذرا بھی ترقی نہیں دے سکے تھے ' انہوں نے صرف افغانی امیروں کو معزول کرکے اپنے آدمی مقرر کردئے تھے ' اس کے برخلاف شیرشاہ نے ایک وسیع پیمانہ پر ملک کی تنظیم کی ' ہر ایک پرگنہ پر جس کو آج ضلع کہا جاسکتا ہے ' ایک عہدہ دار مقرر کیا جو براہ راست بادشاہ سے احکام لیتا تھا اور اپنے ضلع کے اندر اس کو نافذ کرتا تھا '

لگان کی شرح کو مقرر کرنا اور اس کا وصول کرنا اسی عہدہ دار کا کام ہوتا تھا ۔ شیرشاہ کے زمانہ میں عام طور پر لگان کی شرح پیداوار کا ایک تہائی حصہ ہوتی تھی ، اس نے ایسے طریقے مقرر کیے جن سے لگان آسانی کے ساتھ وصول ہوجاتا تھا ، عہدہ داروں کو پیداوار کی مقدار کے اندازہ کرنے یا ناپنے تولنے کی حاجت نہیں ہوتی تھی ، ہم نہیں جانتے کہ اس زمانہ میں یہ طریقے کہانتک کامیاب رہے ، مگر اسی زمانہ سے زرعی نظام کی ابتدا ہوی ، جس کو اکبر نے تکمیل تک پہنچایا ۔

شیرشاہ نے تمام خطرناک جگہوں پر فوجی دستے متعین کردیے تھے ، جس کی وجہ سے ساری سلطنت میں امن و امان قایم ہوگیا تھا ۔ اگر کسی قریہ میں ڈاکہ زنی ہوتی تو چودھری کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا کیونکہ یہ خیال تھا کہ چودھری کو تمام جرائم پیشہ آدمیوں کی ضرور اطلاع ہوتی ہے ، بڑی بڑی شاہراہوں پر تاجروں اور مسافروں کیلئے مضبوط سرائیں بنوائی گئیں ، پانی پینے کیلئے چشمے اور کنوئیں کھدوائے گئے تاکہ راستہ چلنے والوں کو پیاس کی تکلیف نہ ہو ، لودھیوں کے زمانہ میں رفاہ عام کے کام افغانی جاگیردار انجام دیتے تھے ، مگر شیرشاہ نے یہ فرض اپنے ذمہ لیا ، اور مرکزی حکومت ان باتوں کا انتظام کرنے لگی ، اس قسم کے نظام پر آج سخت نکتہ چینی کی جاسکتی ہے کہ اس کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے عہدہ داروں پر بڑی سختی ہوتی ہوگی ، لیکن شخصی حکومت میں ایسا ہونا ایک فطری بات ہے ، شیرشاہ غضب کا محنتی تھا ، تھکنے کا نام نہیں لیتا تھا ، سب کی فریادوں کو خود ہی سنتا تھا ، اور فیصلے صادر کرتا تھا ، وہ بہت ہی منصف مزاج تھا ، اور جرائم کی سخت سے سخت سزا دیتا تھا ، ظالم اس کے غضب سے ڈرکر جرائم سے باز آجاتے تھے ، اس کی حکومت سے مجموعی طور پر عوام کو بہت فایدہ ہوا ، اس کے بعد اس کا کوئی زبردست جانشین نہیں ہوا جو اس کی روایات کو زندہ اور قایم رکھ سکتا تھا ۔

اس کے جانشینوں کے متعلق کچھ لکھنے کی حاجت نہیں ہے شیرشاہ کے بعد بمشکل دس سال گذرے تھے کہ مغربی ہند پر ہمایوں کا پھر سے قبضہ ہوگیا اور اس کے ساتھ بنگال بھی مرکزی حکومت سے الگ ہوگیا جہاں افغانیوں نے خود مختار ریاست قایم کرلی تھی ' ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ہمایوں نے ایران میں پناہ لی تھی ' اور وہاں کے بادشاہ کی امداد سے پہلے کابل پر قبضہ کیا ' اسکے بعد وہ ہند پر حملہ کرنے کی تاک میں تھا کہ یہاں تخت کیلئے جھگڑے کھڑے ہوے اس نے سنہ ۱۵۵۵ع میں پنجاب کو پار کیا اور دشمن کو شکست دیکر اپنی کھوئی ہوی سلطنت کو پندرہ سال بعد واپس لیا ' لیکن چند ہی دنوں کے اندر وہ سیڑھیوں سے گرکر مرگیا ' اسکے بعد اسکا بیٹا اکبر جانشین ہوا جسکی عمر اس وقت صرف تیرہ سال کی تھی ' کابل پر اسکے چھوٹے بھائی محمد حکیم کا قبضہ ہوگیا تھا .

باب ۲۸

اکبر

اکبر سنہ ۱۵۵۶ء میں تخت پر بیٹھا اور سنہ ۱۶۰۵ء تک حکومت کی ' اس کے بعد تین زبردست بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوے یعنی جہانگیر (۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ء) ' شاہجہاں (۱۶۲۷ء - ۱۶۵۸) اور اورنگ زیب (۱۶۵۸ - ۱۷۰۷ء) اکبر ' جہانگیر اور شاہجہاں مطلق العنان اور خود راے بادشاہ تھے ' اورنگ زیب خود کو شریعت اسلامیہ کا پابند بتاتا تھا ' اور اس نے اسلامی قوانین نافذ کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خاندان کو زبردست نقصان پہنچا .

بادشاہ اپنے جانشین کو خود ہی نامزد کرتا تھا ' اس کی وجہ سے خاندانی جھگڑے پیدا ہوتے تھے جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے ' ہر ایک شخص بادشاہ کے نزدیک اپنا تقرب بڑھانے اور اپنے رقیب کو اس کی نظر سے گراکر ولیعہدی کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا ' اس قسم کی سازشوں میں شاہی محل کی عورتیں زیادہ حصہ لیا کرتی تھیں ' ہم خیال کرسکتے ہیں کہ ان سازشوں کی وجہ سے بادشاہ کی نجی زندگی کس طرح رہی ہوگی مگر سلطنت کے معاملات میں ان سازشوں کا نتیجہ عموماً بغاوت اور پھر بے رحمانہ قتل پر ہوتا تھا ' چنانچہ جہانگیر نے اکبر کے خلاف بغاوت کی ' شاہجہاں نے جہانگیر کے خلاف تلوار اٹھائی ' اورنگ زیب نے اپنے باپ شاہجہاں کو تخت سے اتارا اور آگرہ کے قلعہ میں اس کو نظر بند کردیا ' شہزادہ اکبر نے اپنے باپ اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کی ' جہانگیر نے اکبر کے معتمد وزیر ابوالفضل کو مروایا جو اس کی تخت نشینی کا مخالف تھا ' اس کے متعلق یہ بھی گمان کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے باپ اکبر کو زہر دلوایا تھا ' یہ تو قطعی ہے کہ شاہجہاں نے اپنے بھائی شہزادہ خسرو کو جو اس کے سایہ عاطفت

میں پل رہا تھا ' جان سے مارنے کا حکم دیا ' بادشاہ بننے کے بعد اس نے تخت کے تمام دعویداروں کو مروایا ' اورنگ زیب نے اپنے دونوں بھائیوں کو قتل کیا ' تیسرے بھائی کا بھی یہی حشر ہوتا اگر وہ برما کو فرار نہ ہوگیا ہوتا ' جہاں اس نے بے سرو سامانی کے عالم میں وفات پائی -

ایسے واقعات کچھ غیر معمولی نہیں تھے ' شاہی خاندان کے اکثر افراد ' جو قتل ہونے سے بچ جاتے تھے' شراب نوشی سے فوت پاتے تھے ' مغل عام طور پر شراب کے عادی ہوگئے تھے ' ان سے پہلے ترک بڑی شراب پیا کرتے تھے مگر وہ ایران کی ہلکی شراب ہوتی تھی' اس کے برخلاف مغل تند و تیز شراب کے عادی ہوگئے تھے جس میں اکثر نشہ آور دوائیں ملائی جاتی تھیں ' تاریخ میں ایسے شہزادوں کا ذکر آتا ہے جو ہر وقت شراب پی‌کر بدمست رہتے تھے ' اور اسی میں ان کی حسرتناک موت ہوتی تھی -

شاہی محل کی عورتیں پردہ میں رہا کرتی تھیں ' اس سے یہ نہیں خیال کرنا چاہئے کہ ان کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں تھی ' بعض عورتیں تو بڑی اولوالعزم تھیں ' سلطنت کے معاملات پر ان کا بڑا اثر تھا ' اکثر بہت ہی سلیقہ شعار ہوتی تھیں ' پردہ کی وجہ سے انکو بیرونی دلچسپیوں میں حصہ لینے کی ممانعت نہیں تھی ' جہانگیر خود لکھتا ہے کہ اس کی بیوی کو شیر کے شکار کا بڑا شوق تھا ' بعض انگریز تاجروں کو جدید طرز کی زنانہ ٹوپیاں اور دستانے پیش کرنے کا حکم دیا گیا تھا ' یہ ٹوپیاں اور دستانے سواری کے وقت استعمال کیے جاتے تھے ' ہمعصر تاریخوں سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ پردہ کے پیچھے کیا ہو رہا تھا ' اسوقت ٹھیک طور پر اندازہ لگانا مشکل ہے کہ بادشاہ اور شہزادوں پر شاہی محل کی عورتوں کا کیا اثر پڑرہا تھا ' مگر اتنی بات یقینی ہے کہ ان عورتوں کو بڑا اقتدار اور رسوخ حاصل تھا .

امارت اور شرافت کوئی خاندانی چیز نہیں تھی ' ہر ایک صاحب حیثیت شاہی وظیفوں اور جاگیروں پر اپنی زندگی بسر کرتا تھا ' بادشاہ کو حق تھا کہ جب کبھی چاہے ان جاگیروں کو ضبط کرلے ' کیونکہ امیروں کی ذاتی ملکیت کا حقیقی وارث بادشاہ خیال کیا جاتا تھا ' اس نظریہ کی بناء پر ہر نئی نسل کو خاندانی جاگیر پر قبضہ حاصل کرنے کیلئے بادشاہ کی منظوری لینی پڑتی تھی ' مگر عملا بہت سے شریف خاندان کئی نسلوں تک قایم رھے عام طور پر ایک امیر کے مرنے کے بعد اسکی اولاد کو جاگیر دے دی جاتی تھی ' اگر ان میں سے کوئی بادشاہ کے پاس تقرب حاصل کرلیتا تو وہ مزید عنایات شاہی کا موجب قرار پاتا تھا ' ہر ایک معاملہ بادشاہ کی رضامندی پر منحصر تھا ' جو کوئی بھی اس کی رضامندی حاصل کرنے میں ناکام رھتا وہ اس ریاست کو چھوڑکر دوسری ریاست میں چلے جانے کی کوشش کرتا تھا ' ھندو جاگیردار اس اصول سے مستثنی تھے ' کیونکہ انکی جاگیریں انھی کی اولاد کو مل جاتی تھیں ' بادشاہ سے رسمی طور پر رضامندی اور منظوری حاصل کرنے کی ضرورت ھوتی تھی ' جسکے عطا کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا جاتا تھا

اس عام تبصرہ کے بعد اب ھم اکبر کے دور حکومت کی طرف متوجہ ھوتے ھیں ' وہ صرف پنجاب کے مالک کی حیثیت سے تخت پر بیٹھا مگر جب پچاس سال بعد اس کی وفات ھوی تو سارا ھند اس کے زیرنگیں تھا ' اس نے جنوبی ھند میں بھی زبردست فتوحات حاصل کی تھیں ' اتنی بڑی سلطنت کا قیام در حقیقت اس کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھا ' کیونکہ چھ سال کے دور اتالیقی کے بعد جب اس نے حکومت کی باگ اپنے ھاتھ میں لی تو سلطنت کے تمام معاملات کا انتظام خود ھی انجام دینے لگا تھا ' وہ اپنی ھی رائے سے عہدہداروں کا انتخاب کرتا تھا ' اور ھر ایک عہدہدار اسی کی بتائی ھوی حکمت عملی پر عمل کرتا تھا ' اس کے کردار اور کارناموں کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی

گئی ھیں ، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں داخل ھیں ، سرکاری تاریخوں میں ابوالفضل کا اکبرنامہ بہت مشہور ہے ، یہ اکبری دور کا ایک بہترین مرقع ھے ، چونکہ ابوالفضل اکبر کا پر جوش مداح تھا ، اس لئے اس نے اپنی کتاب میں اکبر کے صرف مناقب بیان کیے ھیں اور اس کے معائب کو نہیں گنایا ھے اسی بنا پر یوروپ کے بعض قارئین اس کی مداحی کو چاپلوسی اور خوشامد پر محمول کرینگے - ایسے لوگوں نے بھی اکبر کی تاریخ لکھی ھے جو کسی سرکاری عہدے کے مالک نہیں تھے ، انھی میں سے ایک تاریخ ایک پر جوش مسلمان کی لکھی ھوی ھے جو اکبر کا سخت ترین مخالف تھا ، اس نے زیادہ تر اکبر کے معائب بیان کیے ھیں ، ان کے علاوہ پردیسیوں کی لکھی ھوی یادداشتیں بھی ھیں جن میں سب سے مشہور وہ رودادیں ھیں جو گوا کے یسوعی پادریوں نے اس کے متعلق لکھی ھیں یہ لوگ ایک زمانہ تک اکبر کے دربار میں تھے اور انھوں نے بہت نزدیک سے اکبر کی شخصیت کا مطالعہ کیا تھا .

جسمانی حیثیت سے اکبر بہت ھی قوی ، متحمل اور بردبار تھا ، اور اپنے منصب بادشاھت کے لئے بالکل موزوں تھا اگرچہ وہ کبھی کبھی حد سے زیادہ شراب پی لیتا تھا تاھم وہ دوسروں کی طرح بد مست نہیں ھوتا تھا اور اس کے حواس مختل نہیں ھوتے تھے ، جسمانی ورزش کی وجہ سے اس کی صحت اچھی تھی ، وہ گھوڑے کی سواری ، سیر و تفریح اور شکار کا بڑا شوقین تھا ، میدان جنگ میں بھی وہ چست و چالاک اور دلیر اور بہادر تھا ، کبھی کبھی وہ جلد بازی پر اتر آتا تھا ، تاھم عملاً وہ بہت محتاط اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے والا اور موقعہ شناس آدمی تھا .

بچپن میں اس کو پڑھائی سے زیادہ کھیل کا شوق تھا ، اس نے لکھنے پڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ وہ اس کی ضرورت کا قایل تھا کیونکہ بیسیوں آدمی اس کو پڑھ کر سنانے کیلئے موجود تھے ، وہ تمام احکام زبانی لکھواتا تھا ، اس

کی وجہ سے اس کے ذاتی جوہر نکھر گئے ، اور اس کا دماغ سلجھ گیا ، اس کا حافظہ بہت مضبوط ہوگیا ؛ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کی تہ تک فوری طور پر پہنچ سکتا تھا اور اس کا فوری حل دریافت کرلیتا تھا .

ہمارے لئے اکبر کے اعمال و افعال سے زیادہ اس کے عقاید و خیالات کا سمجھنا بہت مشکل ہے ، خود یسوعی پادریوں کو اعتراف ہے کہ وہ بادشاہ کے خیالات کی گہرائی کو نہیں پہنچ سکے ' تاہم اس کی زندگی کے دو اہم مقصد تھے ، ایک ملک گیری دوسرا تجسس و تفحص ان دونوں کے حاصل کرنے میں وہ ایک حد تک کامیاب رہا ، کیونکہ اگر اس نے ایک طرف عظیم الشان فتوحات حاصل کیں تو دوسری طرف اس کو ہر علم و فن سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی ، ادب ' کھیل تماشے ' میکانکس ' الہیات ' معدنیات ' طبیعی تاریخ غرضکہ اس زمانہ کا کوئی علم و فن ایسا نہیں تھا جس سے اس کو دلچسپی نہ ہو ' اگر کسی معاملہ میں پیچیدگی پیدا ہو جائے تو اس کو فوری طور پر حل کرلینے کی اس میں قابلیت تھی .

اس جگہ اکبر کے مذہب کے متعلق بھی کچھ لکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کی زندگی پر اس کا زبردست اثر پڑا ' اس کو ہمیشہ تصوف سے بڑی دلچسپی تھی ' وہ خدا سے براہ راست تعلق پیدا کرنا چاہتا تھا ' اس پر کبھی کبھی وجد بھی طاری ہوتا تھا ، ابتدا میں وہ اسی مذہب کا پیرو تھا جس کی فضا میں اس نے تربیت پائی تھی اور جب ۳۳ سال کا ہوا تو اس پر شکوک و شبہات غالب ہوگئے ، اس نے حقیقت کی دریافت کیلئے مباحثوں اور مناظروں کی مسلسل مجلسیں منعقد کیں ' پہلے پہل ان میں صرف اسلامی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ' لیکن جب ہندو ، جین اور پارسی بھی ان میں شریک ہونے لگے تو ان مسائل کا دائرہ وسیع ہوگیا ' سنہ ۱۵۸۰ ع میں اکبر کی دعوت پر گوا کے یسوعی پادری بھی چلے آئے ' اور انہوں نے

مباحثوں اور مناظروں میں زبردست حصہ لینا شروع کیا ' اکبر کی غیر معمولی دلچسپی کا خیال کرکے ان پادریوں کو یقین ہوگیا تھا کہ اکبر ضرور عیسائی بن جائیگا ' مگر بعد میں ان کو معلوم ہوگیا کہ اکبر کا مقصد صرف ہر مسئلہ کی علمی حیثیت سے چھان بین ہے ' اور وہ کسی ایسے عقیدے کو قبول نہیں کرسکتا جو اس کے عقلی معیار پر اتر نہ سکے ' وہ اگرچہ مذہب اسلام سے بہت دور ہو چکا تھا تاہم وہ دین عیسوی کو بھی قبول نہیں کرسکتا تھا ' اس لیے اس مذہب کے مبلغ اس کا دربار چھوڑ کر واپس چلے گئے ۔

ان مباحثوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اکبر نے سنہ ۱۵۸۲ء میں دین الٰہی کے نام سے ایک نئے دین کی تبلیغ شروع کی ' جس کے اصول اور قوانین کو خود اسی نے مرتب کیا تھا ' اس کے مذہبی اصول کچھ اسطرح کے تھے کہ پکے مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اکبر خدائی کے دعوے کر رہا ہے ' ٹھیک طور پر یہ نہیں معلوم ہے کہ اس قسم کا دین جاری کرنے سے اس کا مقصد کیا تھا ' البتہ اتنی بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ وہ روحانی تسکین کا متلاشی تھا ' اور شاید یہ خیال تھا کہ اس کی سلطنت میں رہنے والے مختلف مذاہب کے لوگ ایک مرکز پر جمع ہوجائینگے ' لیکن یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکا ' کیونکہ چند درباریوں کے سوا کسی نے اس کے مذہب کو نہیں مانا ' اور اس کی زندگی کے بعد یہ دین قایم نہ رہ سکا ' اس کا بھی کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے کہ اس دین سے خود اکبر کی تشفی اور تسلی ہوگئی تھی ' اکبر نے یسوعی پادریوں کو دوبارہ بلوایا تھا اور اکبر کے آخری دس سال تک وہ اس کے ساتھ رہے ' مگر ان کو بھی کچھ اندازہ نہیں ہوسکا کہ اکبر کیا چاہتا ہے ' اس کی وفات کے متعلق لوگوں کا سخت اختلاف ہے ' مگر یہاں اتناہی یاد رکھنا چاہئے کہ اکبر اپنے دوسرے نصف زمانہ حکومت میں دیندار اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے درمیان بہت ہی غیر مقبول ہوگیا تھا ۔

سیاسی حیثیت سے اکبر بہت کامیاب رہا ، اس نے ایک چھوٹی سی ریاست کو چند دنوں کے اندر ایک عظیم الشان سلطنت بنادیا ، تخت نشینی کے فوراً ہی بعد اکبر کو ہیمو بقال سے جنگ کرنی پڑی جو افغانی دعویدار سلطنت کا وزیراعظم اور اس کی فوج کا سپہ سالار تھا ، ہمایوں کی وفات کی خبر سنکر اس نے فوراً ہی مغلوں پر حملہ کیا اور دہلی پر قبضہ کرلیا اور خود ہی بادشاہ بن بیٹھا ۔ تمام مغل ایک جگہ جمع ہوے اور اس کے بعد نومبر سنہ ۱۵۵٦ء میں پانی پت کے میدان میں ہیمو کی فوج سے زبردست جنگ کی ، طاقت اور قوت کے لحاظ سے ہیمو کی فوج بہت مضبوط تھی ، پہلے پہل اسی کا پلہ بھاری رہا ، مگر اس کے زخمی ہوتے ہی اس کی فوج بھاگ کھڑی ہوی ، اور وہ خود گرفتار ہوگیا اور بعد میں قتل کردیا گیا ، ایک سال کے اندر تخت کے کئی افغانی دعویدار کھڑے ہوے ، اور ان سب کو آسانی کے ساتھ ختم کردیا گیا ، اس کے بعد فتوحات کی طرف توجہ کی گئی ، اکبر کے دور اتالیقی کے ختم ہونے سے پہلے ادھر مشرق میں جونپور تک اور اودھر جنوب میں گوالیار تک اس کی سلطنت وسیع ہوگئی تھی ۔

اکبر کی فتوحات کے سلسلہ میں چند باتیں عرض کردینی ہیں ، ایک یہ کہ کسی سے جنگ چھیڑنے کیلئے اس کو وجہ جواز کے تلاش کرنے کی حاجت نہیں تھی ، کیونکہ ملک گیری اس کی زندگی کا نصب العین تھا ، دوسرے یہ کہ وہ مسلمان بادشاہوں اور ہندو راجاؤں کے درمیان ایک فرق کرتا تھا ، وہ عام طورپر مسلمان بادشاہوں سے ریاست چھین لیتا تھا اور اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیتا تھا ، مگر ہندو راجاؤں کو اطاعت کرلینے کے بعد بڑے بڑے عہدوں سے سرفراز کرتا تھا ، اور بسااوقات ان کو اپنی ریاست پر بحال کردیتا تھا ، تیسرے یہ کہ اس کی فتوحات عارضی ہوتی تھیں ، کیونکہ اکثر شکست خوردہ خاندان پھر سے اپنی ریاست کو حاصل کرلیتا تھا ، اور مغل فوج کو اس سے بار بار لڑنے کی ضرورت

پڑتی تھی ‘ جس کی وجہ سے ایک ہی ریاست کے خلاف لڑائی کا سلسلہ مدتوں جاری رہتا تھا ‘ اکبر کی فتوحات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ‘ جنوبی ‘ مشرقی ‘ شمال مغربی اور مغربی ‘ اور پھر جنوبی .

جنوب میں گوالیار پر قبضہ پالینے کے بعد مالوہ کی تاخت و تاراج آسان بات تھی ‘ چنانچہ سنہ ۱۵۶۱ء میں مالوہ کو فتح کرلیا گیا ‘ اس کے بعد دس سال تک راجپوتانہ کو فتح کرنے کی کوشش ہوتی رہی ‘ بعض راجپوت سرداروں نے خودھی اطاعت کرلی ‘ اور بعض مقابلہ پر اتر آئے اور مارے گئے ‘ سنہ ۱۵۶۹ء میں رنتھمبور فتح ہوا ‘ اور سنہ ۱۵۷۰ء تک پورا راجپوتانہ سلطنت مغلیہ کے قبضہ اقتدار میں آگیا ‘ تاھم اس کے بعض حصوں میں اب بھی شورش جاری رہی ‘ اس کے بعد گجرات کی طرف توجہ کی گئی ‘ سنہ ۱۵۷۲ء میں سمندر تک کا علاقہ اکبر کے قبضہ میں آگیا ‘ تاھم چند سال تک یہاں مختلف بغاوتوں کو فرو کیا جاتا رہا ‘ اور ساتھ ھی مشرقی علاقوں کو فتح کرنے کی کوشش کی گئی ‘ سنہ ۱۵۷۴ء میں اکبر خود ایک فوج لیکر بہار کی طرف بڑھا اور اس پر قبضہ کرلیا ‘ اس کے بعد بنگال کی طرف ایک فوج روانہ کی جو بد انتظامی کی وجہ سے نا کام رھی لیکن سنہ ۱۵۷۶ء میں بنگال پر حملہ کیا گیا ‘ اور وہاں کے افغانی بادشاہ کو شکست دیکر اور قتل کرکے اس کے پورے علاقہ پر قبضہ کرلیا گیا ‘ کچھ دنوں تک یہاں کے افغانی شورش کرتے رہے ‘ مگر ایک ایک کرکے ان سب کو ختم کردیا گیا ‘ میغنہ سے مشرقی جانب کا علاقہ جس پر اراکان کا حال ھی میں قبضہ ہوا تھا ۔ سترھویں صدی کے وسط تک آزاد اور خود مختار رہا .

بنگال سے فارغ ہونے کے بعد اکبر نے شمال مغربی علاقوں کی طرف توجہ کی ‘ گذشتہ باب میں گذر چکا ہے کہ ھمایون کی وفات کے وقت کابل اکبر کے بھائی محمد حکیم کے حوالہ ہوچکا تھا ‘ اور وہ وھاں خود مختارانہ حکومت کررہا تھا وہ ھند کی

دولت سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا ' اس لئے سنہ ١٠٦٦ء میں اس نے پنجاب پر حملہ کیا ' مگر بہت جلد اس کو پسپا ہونا پڑا ' سنہ ۱۰۸۰ء میں بنگال اور بہار کے اکابر دولت اکبر کے مذہبی الحاد سے ناخوش ہوکر محمد حکیم کو شہنشاہ بنانے پر آمادہ ہوگئے تھے ' شاہی دربار کے بہت سے افراد کا رجحان بھی اسی کی طرف تھا ' چنانچہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاکر دوسرے سال محمد حکیم نے پنجاب پر حملہ کیا مگر بزدلی ' دوں ہمتی اور بدمستی کے باعث میدان جنگ میں اکبر کی زبردست فوج کا مقابلہ نہیں کرسکا ' اس نے شکست کھائی اور اکبر نے آگے بڑھکر پورے کابل پر قبضہ کرلیا ' محمد حکیم کو شہر میں رہنے کی اجازت دیدی جہاں سنہ ۱۰۸۵ء میں اس کا انتقال ہوگیا ' اس کے بعد سے کابل اکبر کی سلطنت کا ایک جز بن گیا تھا ' دوسرے سال کشمیر پر قبضہ کیا گیا ' سنہ ۱۰۹۱ء میں سندھ کا نشیبی علاقہ اور سنہ ۱۰۹۰ء میں مشرقی بلوچستان فتح ہوا ' اسی سال قندھار کے ایرانی حاکم نے لڑے بھڑے بغیر شہر کو اکبر کے حوالے کردیا .

پورا شمالی ہند اب اکبر کے ماتحت تھا ' کیونکہ سنہ ۱۰۹۳ء میں بنگال کے ناظم نے اوریسہ کو فتح کرکے اکبر کی سلطنت میں شامل کرلیا تھا ' اس کے بعد اکبر نے جنوبی ہند کی طرف توجہ کی سنہ ۱۰۹٦ء میں برار اور سنہ ١٦٠٠ء میں خاندیس اور احمدنگر فتح ہوا احمدنگر کا ایک بڑا علاقہ اب بھی اس کے حدود سلطنت سے باہر تھا ' اکبر بیجاپور ' گولکنڈہ اور ان سے آگے کے علاقوں کو فتح کرکے پرتگالیوں کو ہند سے بھگا دینے اور وسط ایشیا میں اپنا اقتدار بڑھانے کی فکر میں لگا ہوا تھا کہ حالات نے ایک زبردست کروٹ لی ' خود اس کا بیٹا جہانگیر اس سے باغی ہوگیا ' اور اکبر کی ساری توجہ اس کی طرف منعطف ہوگئی .

اکبر نے اپنی وسیع سلطنت کے استحکام کیلئے مختلف تدبیریں اختیار کیں ' اس جگہ ھمارا مقصد اس کے زمانہ کے ملکی نظم و نسق کو بیان کرنا نہیں ھے ' اس کو ھم نے دوسرے باب کیلئے اٹھا رکھا ھے' ھم صرف ان اصولوں کو بیان کرنا چاھتے ھیں جن پر عمل کرکے اکبر نے اپنی سلطنت کو مستحکم کیا ' ابتدا ھی سے اس کو اچھی طرح محسوس ھوگیا تھا کہ اتنی بڑی سلطنت کا انتظام مغل ' ترک یا افغانی سرداروں کے بل بوتہ پر نہیں ھوسکتا ' جو کامیابی کے وقت وفادار اور ناکامی کے وقت باغی بن جاتے تھے' اس نے عام ھندووں کی ھمدردی اور راجپوت سرداروں کی سرگرم امداد حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب رھا .

اوپر بیان کیا جاچکا ھے کہ بابر کے خلاف تمام راجپوت سردار متحد ھوگئے تھے ' اکبر کو بھی یہی ڈر لگا ھوا تھا کہ کہیں اسکے خلاف بھی یہ لوگ متحد نہ ھوجائیں ' اسے معلوم تھا کہ راجپوت ھند کے بہترین لڑنے والے سپاھیوں کو ھزارھا کی تعداد میں میدان جنگ میں لاکر کھڑا کرسکتے ھیں ' اس لیے انکو مخالف بنانے کی بجاے اپنا طرفدار بنالینا بہت بہتر اور مفید ھوگا ' اکبر نے انکو اپنی طرف کھینچنے کے آسان ترین ذرایع اختیار کئے ' اس نے جہانتک ھوسکے لڑائی کے بغیر راجپوت سرداروں کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش کی ' اور جب کوئی سردار مطیع اور فرمانبردار ھوجاتا تو اکبر شاھی دربار میں اس کو معزز جگہ دیتا تھا ' اور ھر طرح سے اسکی عزت اور دلجوئی کرتا تھا ' اس سے خراج کا بھی مطالبہ نہیں کرتا تھا ' وہ صرف ان نذرانوں اور تحفوں کو قبول کرلیتا تھا جن کو یہ سردار اپنی خوشی سے پیش کرتے تھے ' وہ انکی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی کچھ دخل نہیں دیتا تھا ' اکبر نے راجپوت سرداروں کی لڑکیوں سے شادی کی ' جہانگیر ایک راجپوت عورت کا بیٹا تھا؟ اکبر نے جہانگیر کی پہلی شادی ھندوانہ رسم کے مطابق ایک راجپوت عورت سے ھی کی تھی .

اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجپوتانہ کے تمام سرداروں نے اکبر کی اطاعت کرلی ' اور انکے تقریباً بچاس ہزار سوار اکبر کی مرضی پر تھے ' صرف میواڑ کے رانا نے اس کی اطاعت نہیں کی ' سنہ ۱۵٦۷ع میں اکبر نے اسکے پاے تخت چتوڑ پر حملہ کیا ' وہاں کی تمام عورتیں جوہر کی رسم کے مطابق آگ میں زندہ جل کر مرگئیں ' شکست خوردہ مرد پہاڑیوں میں بھاگ گئے ' سنہ ۱۵٧٦ع میں اکبر نے رانا پر دوسرا حملہ کیا جو ناکام رہا رانا پرتاب سنگھ اپنی وفات سنہ ۱۵۹٧ع تک اکبر کی برابر مخالفت اور مدافعت کرتا رہا ' دوسری مصروفیات کی بناء پر اکبر اسکے خلاف کوئی فیصلہ کن اقدام نہیں کرسکا تھا۔

عام ہندوؤں کے ساتھ انصاف اور رواداری اکبر کی حکمت عملی کے دو اہم جز تھے ' خود مختار ہونے کے بعد اکبر نے سب سے پہلے اس محصول کو منسوخ کیا جو ہندو یاتریوں سے وصول کیا جاتا تھا ' اور پھر دوسرے سال ہندووں سے جزیہ لینے کی بھی ممانعت کردی ' دوسرے بدیسی حکمرانوں کی طرح وہ بھی ستی کی رسم کا مخالف تھا ' اور ایک موقعہ پر اس نے بذات خود اس کو روکنے کی کوشش بھی کی لیکن سرکاری حیثیت سے ان بیواؤں کو کوئی ممانعت نہیں تھی جو اپنی مرضی سے ستی ہوجانا چاہتی تھیں ' اکبر نے ہندووں کو خوش کرنے کیلئے گاؤکشی بھی بند کرادی تھی ' اور اس کے اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں ' اکبری قوانین اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے ' اس کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی ' اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس کے زمانہ میں پورا امن و امان ہوگیا تھا ' اگر کبھی کوئی بغاوت ہوتی بھی تو وہ مفتوح مسلمان حکمرانوں کی طرف سے ہوتی تھی یا ان چند عہدیداروں کی طرفسے جو اپنے ذاتی اغراض کی بناء پر اکبر سے ناخوش تھے ' عوام نے کبھی بغاوت

نہیں کی ' برطانوی دور تک اکبری عہد کی یاد کا تازہ رہنا اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ شمالی ہند کے ہر ایک قریہ میں اکبر ہر دلعزیز ہوگیا تھا .

اکبر کی دلچسپیوں کی وسعت کا اندازہ ان تحریروں سے ملتا ہے جو اس کے اور اس کے دربار کے متعلق لکھی گئی ہیں ' اس کا دربار بہت شاندار اور پر تکلف ہوتا تھا مگر ایشیائی معیار سے جانچتے ہوے اسکو مسرفانہ نہیں کہا جاسکتا ' لوگوں پر فارسی تہذیب اور تمدن غالب تھا ' مختلف ملکوں کے مصنف اور ادیب اس کے دربار میں جمع تھے ' اور شاہانہ عطیات سے فیض اٹھاتے تھے ' اکبر کے زبردست کتب خانہ میں اور کتابوں کے علاوہ سنسکرت سے ترجمہ کی ہوی کتابیں بھی تھیں ' اس نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کروایا تھا ' اور ہر روز اس کا ایک حصہ سنتا تھا ' اور اس سے لطف اٹھاتا تھا ' اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے ہند کی کسی موجودہ زبان کی بڑی سرپرستی کی ہو ' لیکن اس نے بہترین ہندو گویے اور مصور ہند کی مختلف ریاستوں سے بلائے تھے ' تصویریں ایرانی طرز کی ہوتی تھیں ' مگر مصور اپنی خداداد قابلیت اور ذہانت کو بڑی استعمال کرتا تھا ' جس کی وجہ سے آگے چلکر تمام بیرونی اثرات دور ہوتے گئے ' یہاں تک کہ ایک نیا آرٹ پیدا ہوا جس کو مغل آرٹ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے .

اکبر تعمیرات کا بہت دلدادہ تھا ' مگر یہ عمارتیں کسی شان و شکوہ کے ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ استعمال کرنے کی غرض سے بنائی جاتی تھیں ' کیونکہ وہ پیسے کو اسی جگہ خرچ کرنا چاہتا تھا جس سے بہترین فواید حاصل ہوسکیں ' اس نے آگرہ اور الہ آباد میں وزنی پتھروں کے قلعے تعمیر کئے جس سے اس کی صلاحیت کار کا پتہ چلتا ہے ' اس کی سب سے بڑی یادگار فتح پورسیکری کا شہر ہے جو آگرہ کے مغرب میں بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور اب ایک کھنڈر بنا ہوا ہے ' لودھیوں نے اپنے زمانہ میں آگرہ کو اپنی سلطنت کا پائے تخت قرار دیا

تھا، انہوں نے اس کو ذرا بھی ترقی نہیں دی تھی، سنہ ۱۵۶۹ء میں اکبر نے سیکری کے قریہ کو، جہاں اسوقت ایک بزرگ تشریف فرما تھے اور جن کی دعاؤں سے اکبر کو دو بیٹے پیدا ہوے، پاے تخت بنانے کا فیصلہ کیا، چنانچہ اس نے اپنی خاص نگرانی میں دس برس کے عرصہ میں بھربھرے سرخ پتھروں کی کئی عمارتیں تیار کروائیں، جن میں ہندو اور مسلم فن کاری کی آمیزش پائی جاتی ہے، یہاں کی عمارتیں اپنا ایک خاص طرز رکھتی ہیں، ان کا نمونہ کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا.

دوسرے بہت سے بادشاہوں کی طرح اکبر کے زمانہ میں بھی حکومت کا پاے تخت وہی ہوتا تھا جہاں وہ مقیم رہتا تھا، کیونکہ جب کبھی وہ میدان جنگ یا سفر پر جاتا تو حکومت کے تمام شعبے اور عملے اس کے ساتھ ہوتے تھے، سنہ ۱۵۸۵ء میں وہ فتح پور سیکری سے نکلا اور جنگی مہموں کے سلسلہ میں وہ تقریباً بارہ سال تک ہند کے شمال مغربی علاقوں میں رہا، اور جب وہاں سے لوٹا تو اس نے فتح پور سیکری کی بجاے آگرہ میں قیام کیا، اس کی وجہ سے فتح پور سیکری پر زوال کے آثار طاری ہوگئے، ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہے کہ اس شہر کے قیام کے ترک کرنے کے کیا اسباب تھے، ممکن ہے کہ یہ ایک مطلق العنان فرمانروا اپنی مرضی ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حفظان صحت کی خرابیوں کی بناء پر اکبر کو اپنا پاے تخت چھوڑکر آگرہ میں قیام کرنا پڑا ہو.*

اکبر کے زمانہ میں بہت سے مندر بھی تعمیر ہوے، ان کے بعض بہترین نمونے متھرا کے اطراف و اکناف میں پائے جاتے ہیں، جو کرشن کے پجاریوں کا مرکز تھا، فتحپور سیکری کی

ام

کر چھوڑنے کا اصلی سبب پانی کی قلت تھی، دیکھو ارلی ٹراولس ان انڈیا شائع کردہ ڈبلیو فاسٹر (مطبوعہ لنڈن سنہ ۱۹۲۱) صفحہ ۱۵۰ .

طرح یہاں کی تعمیرات میں بھی مختلف عناصر کی آمیزش اور ان کا امتزاج پایا جاتا ہے، خالص ہندو فن تعمیر میں آہستہ آہستہ گنبد اور کمان کا رواج ہو چلا تھا، جن کی ابتدا سب سے پہلے مسلمانوں نے کی تھی۔

باب ۲۹

اکبر کے زمانہ میں ملکی نظم و نسق

اب ہم اکبری دور کے ملکی نظم و نسق کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں، جس کے ذریعہ اکبر نے بڑی کامیابی کے ساتھ حکومت کی، ملکی نظم و نسق کے آئین و ضوابط کے مرتب کرنے میں اس کی حیثیت شیرشاہ سے کسی طرح کم نہ تھی، فرق اتنا ہے کہ شیرشاہ نے اپنی خودی سے آئین اور قوانین بنائے، اس کے سامنے پہلے سے کوئی نمونہ موجود نہیں تھا، اکبر کے سامنے شیرشاہ کے آئین موجود تھے، جس میں اس نے حسب ضرورت اصلاح اور ترمیم کرکے ایک وسیع تر اور مکمل نظام آئین مرتب کیا، اس جگہ اس کی اصلاح و ترمیم کی تفصیلی اور دلچسپ روداد کا پیش کرنا بہت مشکل ہے البتہ اس نظام سلطنت کا ایک خاکہ پیش کیا جاسکتا ہے جو اکبر کے آخری دور حکومت میں مروج تھا، اس نظام سلطنت کی بہت سی جزئیات برطانوی دور کے اندر بھی قایم اور جاری رہیں ملکی آئین و قوانین کے متعلق ہمارا سب سے بڑا ماخذ ابوالفضل کی آئین اکبری ہے جو در حقیقت اکبر نامہ کا تتمہ ہے، اس میں اکبری دور کے مختلف صیغہاے حکومت کے آئین و قوانین کی تفصیل دی گئی ہے۔

سرکاری ملازمت کے ضابطوں کی تدوین ہر حکومت کا اولیں فرض ہوتا ہے، اکبر نے مختلف منصب داروں کے مدارج فوجی مراتب کے مطابق مقرر کیے تھے، ہر ایک کی حیثیت کا اندازہ اس فوجی جمعیت سے کیا جاتا تھا جو اس کے ماتحت ہوتی تھی، چنگیز خاں نے اپنی پوری فوج کو ہزار ہزار سو سو اور دس دس کی تعداد میں تقسیم اور مرتب کیا تھا اور ہر ایک رسالہ کا ایک سردار مقرر کیا تھا جو تعداد سپاہ کی نسبت سے

موسوم کیا جاتا تھا ؛ اکبر کے زمانہ تک یہی طریقہ جاری رہا ' اکبر نے اس نظریہ کو ترقی دیکر مختلف عہدے بنالئے تھے اور پنجہزاری ' یا ھزاری ' پنجصدی یا اس سے کم دس تک کی تعداد کے منصب قرار دے لئے تھے ۔ اس کے زمانہ میں فوجی مراتب کی تقسیم محض رسمی ھوچکی تھی ' یعنی ھر ایک سردار قانونی طور پر اپنے منصب کے مطابق سپاھیوں کی تعداد کو جمع کرکے رکھنے کا ذمہ دار ھوتا تھا ' مگر عملی طور پر اس قانون کی سختی سے کوئی پابندی نہیں کی جاتی تھی ۔

ھر ایک منصب دار کو سرکاری خزانہ سے ایک مدت تک نقد تنخواہ دی جاتی تھی مگر جب وہ اپنی فوجی جمعیت کو معاینہ کیلئے پیش کرکے منظوری حاصل کرلیتا تو اس کے نام کوئی جاگیر لکھدی جاتی تھی ' اس وقت ان منصب داروں کی تنخواھوں کا ٹھیک اندازہ لگانا مشکل ھے ' تاھم اتنا کہا جاسکتا ھے کہ بڑے درجہ کے منصب داروں کی تنخواھیں معقول تھیں ' اگر اس زمانہ کے روپیہ کی قدر و قیمت سے اندازہ کیا جائے تو معلوم ھوگا کہ اس زمانہ کی تنخواہ آجکل کی تنخواہ سے پنچ گنی بلکہ دس گنی زیادہ ھوتی تھی ' سرکاری ملازمتوں کو کسی خاص طریقہ پر تشکیل نہیں دیا گیا تھا ' اگر کسی شخص کو کوئی خاص منصب نہیں ملتا تو وہ بادشاہ کے دربار میں ھمیشہ حاضر رھتا تھا ' اور بادشاہ اس سے مختلف کام لیا کرتا تھا ' اکبر بہت ھی مردم شناس تھا ' اس کی نظر ھمیشہ منصبداروں کے اخلاق و عادات پر رھتی تھی ' یہی وجہ ھے کہ وہ حکومت کرنے میں کامیاب رھا ' مگر وہ معصوم نہیں تھا ' کبھی کبھی اس سے غلطیاں بھی سرزد ھوتی تھیں ' جن کی وجہ سے بعض وقت بڑے خطرناک نتائج پیدا ھوتے تھے ' لیکن ان پر بھی جلد قابو پالینے کی اس میں بڑی قدرت اور صلاحیت تھی ' جو ایک مدبر حکمران کا خاص وصف ھوتا ھے ۔

ملکی آئین کو تین بڑے عنوانات میں تقسیم کیا گیا تھا، یعنی آئین منزل، آئین سپاہ اور آئین ملک، لیکن ان اصطلاحوں سے ان کے لغوی معنی مراد نہیں لینے چاہئے کیونکہ ان کے ماتحت دوسرے متعلقہ امور کے قوانین بھی شامل تھے، مثلاً آئین منزل کے ماتحت دارالضرب، توپ خانہ، شاہی حرم سرا کی فوج اور نیز صیغۂ تعمیرات وغیرہ کے آئین بھی داخل تھے، آئین منزل کے تمام صیغوں کی نگرانی اکبر بذات خود کرتا تھا، ہر ایک صیغہ کے متعلق اس نے تفصیلی قوانین مرتب کئے تھے، تاکہ امانت میں خیانت اور پیسہ کا خوردبرد نہ ہو، اگرچہ وہ ایک جز رس بادشاہ نہیں تھا تاہم وہ پیسہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

فوج کا سپہ سالار اعظم ہر حال میں اکبر ہی ہوتا تھا، اور جب وہ خود کسی لڑائی میں شریک نہیں ہوتا تو وہ دوسرے شخص کو اپنی جگہ پر سپہ سالار مقرر کرکے بھیجتا تھا۔ فوج کی نگرانی کیلئے سپہ سالار سے الگ ایک دوسرا بڑا عہدہ دار ہوتا تھا جس کو میربخشی کہا جاتا تھا اور اس کا کام یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ آیا ہر ایک رسالدار اپنے منصب کی تعداد کے مطابق سپاہی تیار رکھتا ہے یا نہیں، اکثر اس معاملہ میں دھوکہ دیا جاتا تھا، اور مقررہ تعداد سے کم سپاہی رکھ کر روپیہ بچانے کی کوشش کی جاتی تھی، اور جب شاہی معاینہ کا وقت آتا تو بطور عاریت کہیں سے گھوڑے لے لئے جاتے تھے اور کرایہ پر سپاہی حاصل کرلئے جاتے تھے، اس قسم کی دھوکہ بازی کے خلاف اکبر نے بڑے سخت قوانین جاری کئے تھے، اگرچہ دھوکہ بازی کی پوری روک تھام نہیں ہوسکی تھی تاہم دوسرے بادشاہوں کی بہ نسبت اس کے زمانہ میں رسالدار زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوج رکھنے لگے تھے اکبر کی فوج کا بڑا حصہ اب بھی سواروں پر مشتمل تھا، پیادوں کی اہمیت زیادہ نہیں تھی، اس کی فوج میں بارہ ہزار بندوقچی بھی تھے، اس بات کا صحیح اندازہ نہیں

لگایا جاسکتا کہ اکبر کی باقاعدہ فوج کتنی تھی ، اگر شاہی حرم سرا کی فوج اور مختلف سرداروں اور منصبداروں کی فوجوں کو ملاکر دیکھا جائے تو ان سب کی تعداد کہیں ڈھائی لاکھ کے قریب ہوتی ہے ، چونکہ سرحدوں کی حفاظت اور اندرونی انتظامات کیلئے بھی فوج درکار تھی اس لیے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ میدان جنگ میں باقاعدہ لڑنے والوں کی تعداد مذکورۂ بالا عدد سے بہت کم ہی رہی ہوگی ۔

اکبر نے اپنے زمانہ میں سلطنت کے امور عامہ کو مالگذاری سے بالکل الگ کردیا تھا - اور یہ تفریق اب تک چلی جارہی ہے اس کے دور میں امور عامہ کی نگرانی وزیراعظم کے ذمہ تھی ، اور مالگذاری کا انتظام ایک وزیر مال یا دیوان انجام دیتا تھا ، جو براہ راست بادشاہ سے احکام لیتا تھا ، عام طور پر سلطنت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا ، اور ہر ایک صوبہ کا حاکم سپہ سالار یا صوبیدار کہلاتا تھا ، اس کا تقرر بادشاہ کی طرف سے ہوتا تھا اور وہ اسی سے براہ راست احکام وصول کرتا تھا انتظام مالگذاری کے سوا باقی تمام محکموں میں وہ بادشاہ کا نائب خیال کیا جاتا تھا ، خاص خاص مرکزوں پر فوجداروں کو متعین کیا جاتا تھا جن کے ذمہ بغاوت کا فرو کرنا سڑکوں کی حفاظت کرنا اور جرائم کا روکنا ہوتا تھا ہر ایک بڑے شہر میں ایک کوتوال ہوتا تھا اگرچہ وہ افسر بالا کا ماتحت ہوتا تھا مگر شہر کے اندرونی معاملات کے متعلق وہ خود مختار اور آزاد ہوتا تھا ، وہ لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا ، جرائم کی تفتیش کرتا تھا اور شہر اور اہل شہر کی دیکھ بھال اور ان کی حفاظت کرتا تھا ، چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی ایک حاکم ہوتا تھا جس کا ابتدائی فرض مالگذاری کا بندوبست کرنا ہوتا تھا سلطنت کے عام امور کا انجام دینا بھی اسی کے ذمہ تھا عوام کا سارا کاروبار اسی حاکم کے ذریعہ انجام پاتا تھا اور وہی ان کے معاملات کو صوبیدار کے پاس بھی پیش کرتا تھا ۔

ہر ایک اہم مقام پر ایک قاضی ہوتا تھا جو لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا ، مگر اس کو پوری آزادی نہیں دیگئی تھی ، آخری فیصلہ اکبر کے ہاتھ میں تھا ، قاضی اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے دیا کرتے تھے ، لیکن مسلمانوں کے شخصی اور ذاتی معاملات کا جہانتک تعلق ہوتا تھا ، ان کے فیصلے قطعی ہوتے تھے یا کم از کم ان کی بہت اہمیت ہوتی تھی ، مگر دیوانی اور فوجداری مقدمات میں قاضی صوبیدار یا حاکم یا کوتوال کے ساتھ بیٹھکر اور ان کی رائے لیکر اپنا فیصلہ دیتا تھا ، اس لحاظ سے اس کا یہ فیصلہ انفرادی نہیں بلکہ ایک پنچایت کا فیصلہ ہوتا تھا ۔

صیغۂ مالگذاری کا ابتدائی کام زمینوں کی پیمائش کرنا اور لگان کی شرح کا مقرر کرنا اور اس کا وصول کرنا ہوتا تھا اور اگر تمام صوبوں میں نہیں تو کم از کم بعض صوبوں میں چنگی اور نمک وغیرہ کے محصول کا وصول کرنا بھی اسی کے ذمہ تھا لگان کا ایک بڑا حصہ سرکاری منصبداروں کو بطور جاگیر دیدیا جاتا تھا ، اور بعض خاص زمینوں کا لگان براہ راست شاہی خزانہ کو جاتا تھا اس لحاظ سے وزارت مالیات کے دو کام تھے ، یعنی خاص زمینوں کا بندوبست کرنا اور منصبداروں کے نام جاگیروں کا عطا کرنا ، خاص زمینوں کے انتظام کیلئے وزیر مال ہر ایک صوبہ میں ایک دیوان مقرر کرتا تھا ، جو اس سے براہ راست احکام لیتا تھا ، صوبیدار کو اس دیوان پر کوئی اختیارات نہیں ہوتے تھے ، ہر دیوان کے ماتحت عمل گذار یا کروری ہوتے تھے ، جو اپنے اپنے علاقہ کی زمینوں کی پیمائش اور ان کا لگان وصول کرتے تھے ، وہ بسا اوقات ایک حاکم کے فرائض بھی انجام دیتے تھے ، جاگیروں کا عطا کرنا صدر مقام کے وزیر مال کا اختیار تھا ، مقامی حکام یا عمل گذار کسی کو جاگیر دینے کا کوئی حق نہیں رکھتے تھے ، ہر ایک منصب دار کی حیثیت اپنے اپنے علاقہ میں ایک عمل گذار یا عامل کی تھی ، مگر عام طور پر وہ کسی کو اپنا نائب مقرر کرتا تھا جو بحیثیت حاکم اس کے علاقہ کا انتظام کرتا تھا ۔

ان کے علاوہ تمام پرگنوں، قصبوں اور دیہاتوں میں چودھری، قانون گو، مقدم اور پٹواری ہوتے تھے، یہ لوگ سرکاری ملازم نہیں تھے، یہ درحقیقت کاشتکاروں کے نمائندے ہوتے تھے اور حاکم اور کسانوں کے درمیان واسطہ بنتے تھے، اور کاشتکاروں کی امداد کا باعث ہوتے تھے -

ہر ایک موسم میں کھیت کھیت پھرکر پیداوار کا اندازہ کرکے لگان کی شرح کو مقرر کرنا عملاً آسان نہیں تھا، اسی لیے ہندو عہد میں بھی آسان طریقوں کے اختیار کرنے کی کوشش کی گئی تھی - ترکوں کے زمانہ سے لیکر اس کے متعلق دو نقطہ‌ہائے خیال ہوگئے تھے، ایک کا طریقہ یہ تھا کہ ہر ایک کسان سے مجموعی لگان وصول کیا جائے دوسرے کا طریقہ یہ تھا کہ ہر ایک قریہ پر مجموعی لگان کی ادائیگی مقرر کی جائے اور لگان کی تقسیم کو کاشتکاروں کی اپنی مرضی پر چھوڑدیا جائے، لیکن اس میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کاشتکار آپس میں انصاف نہیں کرسکتے تھے، طاقتور کمزور کو دبانے اور پیسنے کی کوشش کرتا تھا، اکبر نے اس خرابی کو محسوس کیا اور ہر ایک کاشتکار پر علحدہ علحدہ لگان کی رقم مقرر کی، ابتدا میں اس نے شیرشاہ کے طریقہ کو جاری کیا جو بظاہر اسی نقطۂ خیال کا حامی تھا، چند دنوں کے بعد یہ طریقہ کامیاب نہ ہو سکا، مختلف تجربوں کے بعد ایک نیا طریقہ جاری کیا گیا، جہاں تک ہم جانتے ہیں یہ طریقہ بہت ہی منصفانہ اور عمل کے قابل تھا، اگرچہ کاشتکاروں پر لگان کی شرح کچھ زیادہ تھی تاہم اکبر سختی برتنے کا عادی نہ تھا، وہ مقامی حالات کے مطابق قوانین کو بدلنے کے لئے ہروقت تیار رہتا تھا، پہاڑی علاقوں میں اور نشیبی سندھ، بنگال اور نربدا کے اس پار وہ پرانے طریقۂ لگان ہی کو جاری رہنے دیا اور نیا طریقۂ لگان بنگال کے علاوہ پورے شمالی ہند میں جاری رہا ۔

لگان کی تشخیص کے متعلق اکبر کا طریقۂ کار یہ تھا کہ پہلے ہر ایک خاص رقبہ کی کاشت کی ہوی زمین کی پیداوار

کا اندازہ لگالیا جاتا تھا ، اور اس پر اتنا محصول عاید کیا جاتا تھا جو کل پیداوار کے ایک تہائی حصہ کے برابر ہوتا تھا ، جاگیرداریوں اور خاص زمینوں کے متعلق بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا تھا ، ہر ایک کاشتکار کی بونے کے وقت ہی اس کا اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کو کتنی رقم ادا کرنی ہوگی ، جب فصل پک جاتی تو لگان تشخیص کرنے والے عمل گذار کی نگرانی میں ہر ایک کاشتکار کی بوئی ہوی زمینوں کی پیمائش کرکے اس کی پیداوار کا اندازہ لگاتے تھے اور محصول مقرر کرتے تھے ، فصل کاٹنے کے بعد یہ محصول وصول کرلیا جاتا تھا ، ان مزروعہ زمینوں کا کوئی حساب نہیں کیا جاتا تھا جن میں پیکھ اچھی نہیں ہوتی تھی .

اس طریقہ کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کاشتکار کو اپنی پیداوار کی قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا تھا ، کیونکہ چیزوں کی قیمتیں وقتا فوقتا بدلتی رہتی تھیں اور جگہ جگہ مختلف ہوجاتی تھیں ، اگرچہ اس کو اس کا صحیح اندازہ رہتا تھا کہ اس کو کتنا محصول ادا کرنا ہے مگر وہ اپنی کل پیداوار کی قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا ، زراعت نہ ہونے کی صورت میں کاشتکار کو کچھ نقصان نہیں ہوتا تھا ، کیونکہ اس صورت میں اس سے کوئی لگان نہیں لیا جاتا تھا ، لیکن جب مقامی بازاروں میں ہر طرفسے مال آکر بھر جاتا تو اس کی پیداوار کا خریدنے والا کوئی نہ ہوتا تھا ، چنانچہ سنہ ١٥٨٥ع اور سنہ ١٥٩٠ع کے درمیان یہی دشواری پیش آئی تھی اور متواتر لگان کو معاف کرنا پڑا تھا ، کیونکہ دھلی سے لیکر الہ آباد تک اچھی پیکھ ہونے کی وجہ سے بازاروں میں اناج بھر گیا تھا اور کاشتکار اپنی پیداوار کو فروخت کرکے روپیہ نہیں بناسکے تھے .

مالگذاری کی تشخیص کا یہ طریقہ اکبر کی زندگی کے بعد جاری نہ رہ سکا ، ٹھیک طور پر یہ نہیں معلوم ہے کہ کب اس طریقہ میں تبدیلی کی گئی لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اکبر کی وفات پر ابھی پچاس برس بھی نہیں گزرے تھے کہ

ہر قریہ پر سالانہ مالگذاری کی تشخیص کا طریقہ عام ہوگیا تھا ' قریہ کا چودھری یا مقدم اس کی ادائیگی کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا ۔

مالگذاری کی تشخیص اور وصولی کے علاوہ ہر عمل گذار کا یہ فرض ہوتا تھا کہ زراعت کو ترقی دینے اور پیداوار کی مقدار کو بڑھانے کی کوشش کرے ' عمل گذار اور دیوان کو حسب ضرورت نظام مالگذاری کے بدلنے کا پورا اختیار تھا ' تاکہ بنجر زمینوں کی کاشت ہو اور قیمتی پیداوار کے رقبہ میں اضافہ ہو ان مقاصد کی تکمیل کیلئے وہ لگان کی معمولی شرح کو کم کردے کے بھی مجاز تھے ' اور اس غرض سے کبھی کبھی وہ امدادی رقم بھی دے سکتے تھے ' اگر اس زمانہ کے عہدداروں کو امانت دار اور قابل فرض کیا جائے تو اس آئین سے ملک کی اقتصادی حالت کو ضرور فائدہ پہنچا ہوگا ' یہ بتانا مشکل ہے کہ اس مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوی مگر کاشتکاروں کے اندر بے چینی کا نہ ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ عام طور پر مطمئن تھے ' اور اس زمانہ کے حالات کے مطابق اطمینان کا لازمی نتیجہ ترقی ہوتا تھا ۔

اس زرعی نظام کا کوئی ایک شخص بانی اور موجد نہیں قرار دیا جاسکتا ' کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں اس نظام کی تدریجی ترقی ہوی ہے ' اس کے بعض حصے اکبر کے دماغ کی پیداوار تھے اور بعض کی تشکیل ہندو راجہ ٹوڈرمل نے کی جو ذات کا بنیہ تھا ' اور معمولی محرر سے ترقی کرکے وزیر مال اور پھر وزیر اعظم بن گیا تھا ' اکبر نے بعض موقعوں پر راجہ ٹوڈرمل کو فوج کا سپہ سالار بناکر میدان جنگ پر روانہ کیا ' اور ان مہموں میں اس کی کامیابی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ وہ اکبری دور کا ایک زبردست اور قابل سپہ سالار بھی تھا ' جنگ کے ختم ہونے کے بعد وہ اپنے پرانے عہدہ پر لوٹ آتا اور صیغہ مال کی نگرانی کے فرایض انجام دیتا تھا ۔ اس کی شہرت

روز بروز بڑھتی رہی ، یہانتک کہ ہر ایک قریہ میں وہ مشہور ہوگیا تھا ، برطانوی دور حکومت میں صیغہ مال کے عہدہداروں کیلئے اسی کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے ، اس میں چند خامیاں بھی تھیں ، وہ بڑا ضدی ، بدخو اور کینہ پرور تھا ، اور اس قسم کے آدمی کے ساتھ اکبر کا بہترین سلوک اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں انتظامی قابلیت اعلی درجہ کی تھی ، اکبر اس کی خداداد ذہانت اور قابلیت سے بے نیاز نہیں ہوسکتا تھا ، اس کی خامیوں کو نظر انداز کیا جاسکتا تھا ، یا ان کی اصلاح کی جاسکتی تھی ، وہ صرف وزیر ہی نہیں تھا بلکہ ایک ندیم کی حیثیت رکھتا تھا ، وہ ہمیشہ کٹر ہندو رہا ، اور اپنے بڑھاپے کے زمانہ میں اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ گنگا کے کنارے جان دے چنانچہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہوکر چلا گیا تھا ، مگر اکبر نے اس کو پھر بلالیا اور اس نے آخر تک اکبر کی خدمت کی .

سلطنت کی آسودگی اور فارغ‌البالی کاشتکاروں پر منحصر ہوتی ہے ، لیکن کاریگروں کا جہانتک تعلق ہے ۔ اکبر کے زمانہ میں یہ کاریگر دو قسم کے تھے ایک تو وہ لوگ تھے جو کاشتکاروں کیلئے موٹے دھاگے کپڑے اور بھدی چیزیں تیار کرتے تھے ، اور دوسرے چند چیدہ اشخاص تھے جو نفیس ترین اور قیمتی چیزیں تیار کرکے بادشاہ اور امیروں کے سامنے پیش کرتے تھے ، پہلی قسم کے کاریگروں کا کچھ بھی حال معلوم نہیں ہے ، غالباً وہ بھی کاشتکاروں کی سی معمولی زندگی گذارتے تھے ، دوسری قسم کے کاریگروں کو بادشاہ اور امیروں کی سرپرستی حاصل تھی ، شاہی کارخانوں کیلئے ان میں سے بہترین کاریگر چن لئے جاتے تھے ، اور ان کو ضرورت کا سارا ساز و سامان دیدیا جاتا تھا ، یہ لوگ مختلف نمونوں کو سامنے رکھ کر نئی نئی وضع اور قطع کی چیزیں تیار کرتے تھے ، اکبر براہ راست ان کی مصنوعات سے دلچسپی لیتا تھا ، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس کے زمانہ میں صنعت و حرفت کو فنی اور صنعتی دونوں حیثیتوں سے بڑی ترقی ہوی ہوگی .

شیرشاہ کی طرح اکبر نے بھی پختہ سڑکیں بنوائیں اور ان کی حفاظت کا سامان کیا تاکہ ملک کی تجارت کو ترقی ہو ' اس نے بہت سے چھوٹے موٹے تجارتی محصولوں کو بھی منسوخ کردیا تھا جو ہندو عہد سے لیکر اکبر کے زمانہ تک رائج تھے ' اس کے جاری کئے ہوے سکے اگرچہ عمدہ نہیں تھے تاھم وہ استعمال کے قابل تھے ' یہ یاد ہوگا کہ علاءالدین خلجی کے زمانہ میں دیوگیر کی دولت سے شمالی ہند میں چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئی تھیں چودھویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے یہ ساری دولت ہضم ہوچکی تھی ' اور سونے چاندی کی ہر جگہ قلت ہوگئی تھی ' تانبے کے سکوں کا ہر جگہ چلن تھا ؛ شیرشاہ نے چاندی کا سکہ جاری کیا جس کو روپیہ کہا جاتا تھا اور یہ روپیہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اب تک رائج ہے ' اکبر کے زمانہ میں روپیہ معیاری سکہ بنا رہا ' لیکن اس کے ساتھ اس نے چاندی اور تانبے کے کئی سکے جاری کیے ' سونے کا سکہ بھی چلانے کی کوشش کی ' مگر چاندی کے سکوں کی طرح یہ سکہ عام نہ ہوسکا کیونکہ لوگ اس کو اپنے خزانوں میں بند کرکے رکھنے لگے تھے ' سکوں پر نقش و نگار بہت خوب ہوتا تھا ' لیکن ان کے ڈھالنے میں پوری مہارت نہیں پائی جاتی تھی ' ان کے وزن کو گھٹانا آسان تھا مختلف دھاتوں کے سکوں کے تبادلہ کا تناسب ہر وقت بدلتا رہتا تھا ' اسی وجہ سے تاجر اپنے تمام تجارتی لین دین میں پرانے صرافوں سے مدد لیتے تھے ' اگرچہ اکبر کا ملکی نظم و نسق عام طور پر کامیاب تھا ' تاھم وہ خامیوں سے بالکل خالی نہیں تھا ' اکثر اوقات اکبر کو اپنے عہدہداروں کی زبردست خیانتوں کی طرف توجہ کرنی پڑتی تھی ' شخصی حکومت میں بادشاہ کی شخصیت بہت مہتم بالشان ہوتی ہے - اپنی قوم کے دوسرے افراد کی طرح اکبر کبھی کبھی غیر معمولی طور پر غضبناک ہوجاتا تھا اور سیاسی معاملات میں وہ بڑی بے اصولیاں کر بیٹھتا تھا ' مگر عام حالات میں وہ بہت ہی منصف مزاج واقع ہوا تھا ' وہ کام

کرنے سے کبھی نہیں تھکتا تھا ' اور تمام فریادوں کو خود ہی سنتا تھا اور فیصلے دیتا تھا ۔ پوری سلطنت کے اندر اس نے جاسوسی کا ایک وسیع جال بچھا رکھا تھا ' اس لحاظ سے غالباً اس کے عہد میں تمام عہدہ داروں کا چال چلن بڑی حد تک درست تھا ' اگر وہ پورے طور پر کامیاب نہیں رہا تو بھی کم از کم اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنے جانشینوں سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی ' اس زمانہ کے معیار کے مطابق ریاست کی مالی حالت بہت اچھی تھی ' اور اس کا دور بہت شاندار تھا ' کیونکہ فتوحات کے ساتھ ساتھ مال کی بڑی بچت ہوگئی تھی ' اور تمام سرکاری خزانے دولت سے بھر گئے تھے ' اور جب وہ مرا ہے تو وہ دنیا کا سب سے بڑا دولت مند بادشاہ خیال کیا جانے لگا تھا ۔

باب ۳۰

جہانگیر

اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشین ہوا ، اس وقت اس کی عمر چھتیس سال کی تھی ، اس کو حکومت کا کافی تجربہ حاصل تھا ، ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ اس پر باپ کو زہر دینے کا شبہ کیا جاتا تھا ، لیکن اس کے متعلق کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا ، اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہت کے حصول کیلئے ماں باپ کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا ، اس کی شخصیت کے متعلق ہم کو کافی معلومات ہیں کیونکہ اس نے اپنے قلم سے اپنی تزک لکھی ہے ، اس کے علاوہ یسوعی پادریوں اور ولندیزی اور انگریزی سیاحوں نے اس کے زمانہ حکومت کے متعلق بہت سی یادداشتیں چھوڑی ہیں .

جہانگیر میں اکبر کی بہت سی خصوصیات پائی جاتی تھیں ، اکبر کی طرح وہ بھی اولوالعزم اور حقیقت کا متلاشی تھا ، کبھی کبھی وہ انتہائی غضبناک ہوجاتا تھا ، مگر عام طور پر وہ منصف مزاج اور غور و فکر کا عادی تھا ، سنجیدہ اور متین اور قابل حکمران تھا ، اس کو ورزش اور شکار کا بڑا شوق تھا ، لیکن اکبر کی طرح وہ محنتی نہیں تھا ، بلکہ کاہل اور تن پرور تھا ، اس میں پختہ ارادہ کی کمی تھی اس کی اولوالعزمی صرف ایک جذبہ کی حد تک رہی ، اس نے کوئی واضح حکمت عملی اختیار نہیں کی وہ ہمیشہ ایک نئی چیز کی حقیقت کے معلوم کرنے کی فکر میں رہتا تھا ۔ مگر اس کی یہ دلچسپی صرف ظاہری ہوتی تھی وہ اکثر سر میں مدھوش رہتا تھا ، وہ اتنی زیادہ تند اور تیز شراب پینے لگا تھا کہ اس کے قوی آخر میں زائل ہوگئے ، اور قریب تھا کہ اس کا خاتمہ ہوجائے ، اسی لئے اس نے شراب کی ایک مقدار مقرر کرلی تھی ، تاہم وہ بھی اتنی ہوتی تھی کہ جب شام کو

پی لیتا تھا تو وہ اپنے بستر تک چلکر نہیں جاسکتا تھا ، وہ حکمرانی کی مشقتوں سے بیزار ہوگیا تھا ، اس لئے اس نے ساری حکومت اپنی بیوی نور جہاں کے حوالہ کردی تھی جو ایک قابل اور اولوالعزم ایرانی عورت تھی ، اس کے بعد سے ملک کی حقیقی حکمران وہ تھی یا اس کا باپ اور بھائی تھا ۔ جو اس وقت جہانگیر کا وزیر اعظم بنا ہوا تھا ۔ مذہب کے ساتھ اس کا طرز عمل اس کے کردار کے مطابق تھا ، و اپنے کو کم از کم پیغمبر اسلام کے برابر سمجھتا تھا یہ ھندو رشیوں اور یسوعی پادریوں سے طویل مباحثے کرتا تھا ، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ھے کہ واقعۃ اس کو ان سے دلچسپی بھی تھی ، یسوعی پادریوں کی یہ امید کہ وہ عیسوی مذہب کو اختیار کرلیگا در حقیقت جہانگیر کے حسن اخلاق اور پادریوں کے مذہبی جوش اور جذبہ کا نتیجہ تھا ۔

اس قسم کے حکمران کے ماتحت سلطنت کے حدود میں قدرتی طور پر کوئی توسیع نہیں ھوسکتی تھی احمد نگر کے اندر اکبر نے جو کچھ کامیابیاں حاصل کی تھیں وہ بھی ختم ھوگئیں ، اسکے پورے زمانۂ سلطنت میں احمد نگر کے ساتھ بے قاعدہ جنگ جاری رھی لیکن اسکا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ھوا ، قندھار پر ایرانیوں کا دوبارہ قبضہ ھوگیا ، جہانگیر نے کم از کم قلعہ کو بچالینے کی کوشش کی ، مگر شہزادہ خرم کی بغاوت کی بناء پر اسکو اسکا خیال چھوڑ دینا پڑا ، البتہ میواڑ کے رانا کے خلاف اسکی مہم بہت کامیاب رھی اور جب رانا نے اطاعت کرلی تو سلطنت میں اسکو ایک باعزت جگہ مل گئی ۔

سلطنت کے داخلی معاملات کا جہانتک تعلق ھے جہانگیر اکبر ھی کی حکمت عملی پر کاربند تھا ، اسنے راجپوت سرداروں کو اپنا وفادار اور ھندو رعایا کو مطمئن بنائے رکھا ، اور جب زمام سلطنت نورجہاں کے ھاتھ میں چلی گئی تو سارے معاملات درھم برھم ھونے لگے ، نورجہاں اور اسکے خاندان کے لوگ سلطنت کو مضبوط اور مستحکم

کرنے کی بجائے اپنے شخصی اقتدار کو بڑھانا اور دولت کو حاصل کرنا چاہتے تھے ادھر سرکاری ملازمین پریشان تھے کہ کس کی اطاعت کریں اور کس کی نہ کریں، آئے دن ایک شخص کو فوری ترقی ملتی تھی تو دوسرے کو اچانک معزول کردیا جاتا تھا، اس لئے ہر ایک اپنی ملازمت کے زمانہ میں زیادہ سے زیادہ کمالینے کی کوشش کرتا تھا سنگین جرائم بہت زیادہ ہوگئے تھے، اور سڑکوں پر لوٹ مار ہونے لگی تھی، صوبہ اور ضلع کے حکام جرائم پیشہ آدمیوں کے طرفدار بن گئے تھے کیونکہ انکو مال غنیمت کا ایک حصہ ملتا تھا، دولت کی فراوانی کی وجہ سے یہ حکام عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں پڑگئے تھے، اور اسطرح ہر ایک صاحب اقتدار چھین جھپٹ میں مشغول ہوگیا تھا آئے دن جاگیریں ضبط ہوتی تھیں اور دوسروں کے نام لکھدی جاتی تھیں، ہر ایک جاگیردار اپنے کاشتکاروں سے جتنا بھی روپیہ ممکن ہوسکتا تھا لوٹ لینے کی کوشش کرتا تھا، اسکے علاوہ رشوتوں کے ذریعہ نئی جاگیریں حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، حکومت کی مالی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی تھی آمدنی کم اور اخراجات بہت بڑھ گئے تھے ہر سال حکومت کی آمدنی میں خسارہ ہی خسارہ ہوتا تھا جس کو اکبر کے جمع کردہ خزانے سے پورا کیا جاتا تھا، یہ ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہے کہ آیا جہانگیر کو ان خرابیوں کا احساس تھا کہ نہیں، اگر اس کو احساس تھا بھی تو اس کے خلاف اس نے کوئی مفید کارروائی نہیں کی۔ تاہم اس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ ہر روز معمول کے مطابق سیر کو نکلتا تھا اور شام میں ملاقاتیوں سے ملتا تھا، اور اخیر زمانہ میں تو وہ گرمی کا موسم کشمیر میں گذارنے لگا تھا جہاں حکومت کی دردسری نہیں ہوتی تھی

جہانگیر کے دور حکومت کا ایک اہم واقعہ ولندیزیوں اور انگریزوں کا ہند کے ساحل پر آکر بسنا ہے، اس وقت ان مغربی قوموں کی ہند میں کوئی اہمیت نہیں تھی، ان کی آمد کے اسباب سولھویں صدی عیسوی کے مغربی یوروپ کی تاریخ

سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ولندیزیوں نے سنہ ۱۵۹۶ ع سے جاوا اور سماترا میں تجارتی منڈیاں قائم کرلی تھیں، انہوں نے سنہ ۱۶۰۲ ع میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی کمپنی قائم کی، سنہ ۱۶۰۰ ع کے خاتمہ پر ملکہ ایلزبتھ کی طرف سے انگریزوں کو ایک تجارتی کمپنی کے قایم کرنے کی اجازت ملی، ولندیزیوں کی کمپنی مشترک قومی سرمایہ سے چلتی تھی، ان کو ولندیزی حکومت کی طرف سے وسیع اختیارات حاصل تھے، انہوں نے ابتدا ھی سے پرتگالیوں کی بحری طاقت کو توڑنے کی کوشش کی، اور آخرکار اس میں وہ کامیاب بھی ہوگئے، مشرقی ایشیا کی بحری تجارت پر ان کا قبضہ ہوگیا، اس کے بر خلاف انگریز محض تجارت کی غرض سے یہاں آئے تھے، ہند کے سیاسی معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ مشرق کی تجارت میں سے کچھ حصہ ان کو بھی مل جائے، مگر دوسری قوموں نے ان سے رقابت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہانگیر کے زمانہ میں انگریزوں کو ہند کے اندر بڑی مراعات حاصل ہوگئیں، ولندیزی بٹاویہ سے مشرق کی بحری تجارت پر حاوی ہوگئے تھے، اور انہوں نے جاوا کے اندر بٹاویہ کو اپنا صدر مقام بنایا بٹاویہ سے مغرب کے علاقوں میں دونوں کمپنیاں ایک زمانہ تک تجارت کرتی تھیں جن کے درمیان بڑی زبردست رقابت چل رہی تھی

ایشیا میں کمپنیوں کی تجارتی ترقی کو تین لفظوں میں ادا کیا جاسکتا ہے، بحری سفر، کارخانہ اور قلعہ، ابتدا میں بحری جہاز براہ راست مشرقی بندرگاہوں تک پہنچتے تھے اور اپنی چیزوں کو بیچ کر گرم مسالہ، سلک اور دوائیں لیکر جتنا بھی جلد ممکن ہو اپنے وطن کو لوٹنے کی کوشش کرتے تھے، وقت کا بچاؤ بہت ضروری تھا کیونکہ تاخیر نہ صرف منافع کے نقصان کا موجب ہوتی تھی، بلکہ غیر معمولی تاخیر کی صورت میں جہازوں کو نقصان پہنچنے اور ملاحوں کی صحت

کے بگڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا ، اور جب جاوا میں بنتام اور سماٹرا میں اشن Achin کے تاجر ان پردیسیوں کو جلد واپس ہونے کی فکر میں لگے ہوئے دیکھتے تھے تو چیزوں کی قیمتیں بڑھا دیتے تھے ، فائدہمند تجارت کیلئے یہ ضروری تھا کہ پردیسی ان جگہوں پر اپنی ایجنسیاں اور منڈیاں قائم کریں تاکہ فرصت کے وقت سستا مال خرید کر جہازوں میں بھرتی کیلئے تیار رکھیں ، اس زمانہ میں یوروپ اور ایشیا کے اندر منڈیوں کے قایم کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا ، یعنی مقامی حکومتوں سے چند شروط اور مراعات پر ساحلی مقامات میں منڈیوں کے لئے جگہیں حاصل کریں ، جہاں وہ کسی بیرونی مداخلت کے بغیر تجارتی لین دین کرسکیں ، چنانچہ ولندیزی اور انگریز اسی طریقہ کے مطابق بنتام اور دوسری جگہوں پر منڈیاں قایم کرنے لگے تھے .

ہر ایک منڈی میں رہنے سہنے کیلئے مکانات ، دفاتر اور گودام ہوتے تھے ، جن کی حفاظت مقامی حکومت کے ذمہ ہوتی تھی ، اگر یہ قابل اور ہمدرد ہو تو منڈیوں کو مزید حفاظتی تدابیر کے اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی ، لیکن اکثر حکومتوں میں اتنی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان بدیسیوں کی کماحقہ حفاظت کرسکیں ، چنانچہ ان بدیسیوں کو قلعہ بند ہونے اور اپنی آپ حفاظت کرنے کی اجازت دے دی گئی ، اور تجربہ سے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اس قسم کے قلعے نہ صرف فتنہ و فساداور مقامی عہدہداروں سے حفاظت کیلئے مفید تھے بلکہ آئندہ ملک گیری کے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے بے کار آمدڑ تھے ، جہانگیر کے زمانہ میں اس قسم کے قلعوں کے بنانے کا ابھی دستور نہیں شروع ہوا تھا ، صرف ولندیزیوں نے جنوبی ہند کی ایک ہندو ریاست کے اندر اس قسم کا ایک قلعہ تعمیر کیا تھا ، اور اسی سے قریب انگریزوں نے ایک دوسرا قلعہ بنایا تھا ، اور ایک قلعہ ڈنمارک والوں نے تیار کیا تھا ،

جنھوں نے حال ھی میں مشرقی تجارت کے اندر حصہ لینا شروع کیا تھا ' مگر ھند کی تجارت میں ان سب کی اس وقت کوئی اھمیت نہیں تھی .

ولندیزیوں کے سر زمین ھند پر آنے کی غرض محض تجارت تھی ' کیونکہ مشرقی جزایر میں یوروپ کی چیزوں کی کوئی مانگ نہیں تھی ' چاندی کا بھی وھاں کوئی طلب گار نہیں تھا ' بعض دور افتادہ مقامات میں تو چاندی کی ذرا بھی قدر و قیمت نہیں تھی ' اس کے بر خلاف مشرقی جزایر کے ھر ایک بازار میں ھندی کپڑے کی بڑی مانگ تھی ' اور زیادہ نفع اسی صورت میں ھوسکتا تھا کہ براہ راست ھند سے کپڑا خریدا جائے ' جہاں وہ تیار ھوتا تھا اور جہاں چاندی کی ھمیشہ مانگ رھتی تھی ' چنانچہ ھم دیکھتے ھیں کہ سنہ ۱۶۰۲ع میں ولندیزی تاجر کپڑا خریدنے کیلئے اشن سے گجرات آنے لگے تھے ' غالبا سنہ ۱۶۰۳ع میں وہ کارومنڈل کے ساحلی مقامات کا بھی چکر کاٹنے لگے تھے ' پہلے پہل گجرات میں ان کو کوئی کامیابی نہیں ھوی ' مگر ایک زمانہ کے بعد انہوں نے سورت میں ایک منڈی قایم کی ' سنہ ۱۶۲۰ع سے لیکر سنہ ۱۶۲۹ع تک پیٹر فان ڈین بروئکے Pieter van den Broeke اس منڈی کا نگران کار رھا ' اس کے زمانہ میں ولندیزیوں نے مغربی ھند کی تجارت میں بڑی اھمیت حاصل کرلی تھی ' کارومنڈل کے ساحل پر بھی انہیں کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا ' اس لئے سنہ ۱۶۰۶ع میں انہوں نے مچھلی پٹن میں ایک منڈی قایم کی ' جو اس زمانہ میں ریاست گولکنڈہ کا تجارتی بندرگاہ تھا ' سنہ ۱۶۱۰ع میں مدراس سے شمال میں بیس میل کے فاصلہ پر پلی کٹ کے اندر ایک دوسری منڈی قایم کی ' یہاں مشرقی جزایر کے مذاق کے مطابق کپڑا تیار ھوتا تھا .

چند سال کے بعد پلی کٹ کے منڈی کے اطراف ایک زبردست فصیل بنادی گئی تھی ' اس کی صورت یہ ھوی کہ جب پہلے پہل وجیانگر کی ریاست نے پلی کٹ کو ولندیزیوں کے حوالے کیا تو

ان کو اجازت دی کہ اس کے اطراف فصیل بنالیں تاکہ ان کی پوری حفاظت ہوجائے ، مگر ولندیزی سفیر نے جواب دیا کہ انہیں صرف ریاست کی حمایت کافی ہے ، اور جب اس جگہ منڈی قایم ہوچکی توسین تھوم * کے نیم آزاد پرتگالیوں نے اس پر اچانک حملہ کیا اور اس کو جلاکر راکھ بنادیا ، وجیانگر کے راجہ نے ولندیزیوں کی حفاظت کا ذمہ تولے لیا تھا مگر اس میں ان کی حفاظت کرنے کی طاقت نہیں تھی ، اس لیے اس نے مجبوراً وعدہ کیا کہ وہ خود اس کے اطراف ایک فصیل بناکر دیگا ، جہاں اس کی اور ولندیزیوں کی فوجیں مقیم رہینگی ، یہ کام شروع ہی ہوا تھا کہ اس میں رکاوٹ پیدا ہوگئی پرتگالیوں کی طرف سے اس پر دوسرے حملے کا خطرہ لگا ہوا تھا ۔ آخر ولندیزی منڈیوں کے صدر نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور تکمیل تک پہنچایا چند دن تک راجہ اور ولندیزیوں کی فوجیں اس جگہ مقیم رہیں اور جب دونوں میں کچھ جھڑپ ہوگئی تو راجہ نے اپنی فوج واپس بلالی ، اور ولندیزی اس قلعہ کے مالک ہوگئے تھے ، اس طرح جہانگیر کے زمانہ میں ولندیزی سورت ، مچھلی پٹن اور پلی کٹ کے تین قلعوں کے مالک ہوگئے تھے ، ان کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی عارضی منڈیاں قایم ہوتی تھیں اور کام ختم ہونے کے بعد اٹھادی جاتی تھیں ، ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر آگرہ میں حالات نے ایک نئی کروٹ لی جس کی وجہ سے پایہ تخت مغلیہ میں انگریزوں کا رسوخ بڑھتا چلا گیا ۔

انگریزوں کے ہند میں آنے کی غرض بھی محض تجارت ہی تھی ، مگر ان کا مقصد ولندیزیوں سے کچھ مختلف تھا ، اس صدی کی ابتدا میں جب انگریزوں نے دیکھا کہ گرم مسالے کی تجارت بہت زوروں پر ہے تو انہوں نے نئے بازار اور نئی منڈیاں قایم کرنے کی ضرورت محسوس کی ، چنانچہ سنہ ۱۶۰۸ع میں کپتان ولیم ہاکنس ہکٹر جہاز سے سورت کے قریب ایک مقام پر پہنچا

* سین تھوم اب شہر مدراس کا ایک حصہ بن گیا ہے

اور وہاں سے سیدھے آگرہ گیا پہلے پہل اس کو جہانگیر کے دربار میں باریابی حاصل ہوی جہاں پہلے ہی سے پرتگال کے یسوعی پادری اپنا رسوخ جمائے ہوے تھے، سیاسی جوڑ توڑ میں ولیم ھکنس ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے اس کو آخر میں اپنے مقصد کے اندر ناکامی ہوی - اس درمیان میں انگریزی جہاز بھی ہند کے مغربی ساحل کی مشہور بندرگاہ سورت پر پہنچ گئے تھے اور مغلوں اور پرتگالیوں کے درمیان ایک زبردست جھڑپ ہوجانے کی وجہ سے انگریزوں کی آوبھگت زیادہ ہونے لگی تھی چنانچہ سنہ ۱۶۱۳ع میں ان کو ایک منڈی کے قایم کرنے کی اجازت ملی، مگر معاہدہ کے شرایط کچھ زیادہ مفید نہیں تھے، اس لئے جیمس اول بادشاہ انگلستان نے سر تھامس رو کو اپنا سفیر بناکر جہانگیر کے دربار میں روانہ کیا، وہ سنہ ۱۶۱۵ع سے لیکر سنہ ۱۶۱۹ع تک ہند میں مقیم رہا، مگر ایک رسمی معاہدہ کے حاصل کرنے میں وہ بھی کامیاب نہیں ہوسکا، البتہ پہلے سے کچھ بہتر شرطوں پر ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے سورت میں ایک منڈی قایم کرنے کی اجازت ملی، اس کے بعد مختلف جگہوں پر اس کی شاخیں قایم ہوییں، انگریزوں کے جہاز کارومنڈل کے ساحل پر بھی آنے لگے، سنہ ۱۶۱۶ع میں مچھلی پٹن اور دس سال بعد ارمگاؤں میں، جو پلی کٹ سے شمال میں چند میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا قریہ تھا، منڈیاں بنائیں اور پھر ان کو قلعہ بند ہونے کی بھی اجازت مل گئی ۔

یہاں اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہند میں ولندیزیوں اور انگریزوں کی آؤبھگت کے کیا اسباب تھے، ان کی تجارت ہند والوں کی مرضی اور مذاق کے مطابق تھی، وہ نقد دیکر مال خریدتے تھے، اور یہاں کے مذاق کی چیزیں بیچتے تھے، اور یہ سبب ان کی تجارتی ترقی کیلئے کافی تھا، گجرات میں ان کی مقبولیت کا ایک اور سبب یہ تھا کہ وہ پرتگالیوں کے مد مقابل تھے، جن سے مغلوں کی جھڑپ ہوگئی تھی، مغل اچھی

طرح سمجھتے تھے کہ جب تک ولندیزیوں اور انگریزوں کی آپس کی رقابت باقی رہیگی اور کوئی ایک مغربی طاقت سمندر کی مالک نہ ہوگی۔ اپنی ذات کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

یوں تو مغل اور بدیسی تاجر اپنی اپنی جگہ پر مطمئن تھے، مگر دونوں میں پرخاش کی کئی صورتیں بھی تھیں، مغربی تاجر اپنی منڈیوں کو قایم ہوجانے کے بعد مستقل سمجھتے تھے، اگر کوئی مداخلت کرتا تو اس کو ایک ناجائز فعل تصور کرتے تھے، ادھر ہند کے بادشاہوں کا یہ حال تھا کہ ہر ایک اپنے کو آزاد سمجھتا تھا، اور پیشرووں کے معاہدوں کی پابندی اس کیلئے ضروری نہیں تھی، جب بدیسی تاجروں نے یہ حالت دیکھی تو وہ ہندی جہازوں سے انتقام لینے ان کو لوٹنے اور بندرگاہوں کی ناکہ بندی کرنے لگے یہاں تک کہ حکومت ان سے صلح کرنے پر مجبور ہوجاتی تھی، کسی مقامی ریاست کے پاس اتنی بحری طاقت نہیں تھی، کہ کامیابی کے ساتھ ان مغربی تاجروں کا مقابلہ کرسکے، گجرات اور گولکنڈہ کی سلطنتوں میں بھی کوئی بحری بیڑا نہیں تھا۔ اور نہ ان کے پاس بندرگاہوں کی حفاظت کیلئے جنگی کشتیاں تھیں۔ اسی لئے ان کو جھکانے کیلئے تھوڑی سی بحری طاقت بھی کافی تھی۔

لیکن اس قسم کے واقعات شاذ و نادر ہوتے تھے کیونکہ دونوں فریق دھیرے دھیرے ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے لگے تھے۔ سرکاری عہدہ داروں کو اچھی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ بدیسی تاجروں کو چھیڑنا بہت خطرناک ہے، اور بدیسی تاجر بھی اپنی جگہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ سرکاری عہدہ داروں سے مخالفت مول لینا سخت نقصان دہ ہے، نئے بادشاہ کی تخت نشینی پر کسی کو پاے تخت بھیجکر پرانے معاہدوں کی تجدید کرالینا ان کے لئے بہت آسان تھا، مگر اس صورت میں ان کو پیش قیمت تحفے دینے پڑتے تھے جس کی وجہ سے بہت زیادہ

روپیہ صرف ہوجاتا تھا ، اس لئے بدیسی تاجروں نے یہی مناسب سمجھا کہ سرکاری عہدہ داروں کو کچھ دے دلاکر اپنا کام چلائیں ، و لندیزیوں اور انگریزوں نے ایک زمانہ تک اسی قسم کی حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی ۔

اس سے ہند کی تجارت کو ایک حد تک فائدہ ہوا ، ہند والوں کو جن بدیسی چیزوں کی حاجت تھی وہ فوراً بازار میں مل جاتی تھیں ، اس کے علاوہ ہند کے اندر چاندی بھی کھینچی چلی آرہی تھی، جس کی یہاں بہت زیادہ مانگ تھی، ہند کی برآمدی چیزوں میں سب سے اہم نیل کا رنگ تھا ، اس کے بعد یوروپ اور شمالی امریکہ میں چھینٹ کے کپڑے کی بہت سی منڈیاں قایم ہوئیں ، پھر سوت ، شورہ ، شکر اور دوسری چیزوں کی تجارت ہونے لگی، چیزوں کی اہمیت وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی، پرتگالیوں اور ان سے پہلے کے دیسی تاجروں کے زمانے میں تجارت کی جو حالت تھی ، اس میں اب بہت ترقی ہوچکی تھی ، ولندیزی مشرقی ایشیا میں تجارت کرتے تھے، اس کے ساتھ ہند کا مال بھی یوروپ کے بازاروں میں پہنچاتے تھے لندن کی طرح امسٹرڈم کے تاجر بھی ہمیشہ ہندی بازاروں کے بھاؤ معلوم کرتے رہتے تھے ، اور ان کے کارندے ہند کی منڈیوں کے ساتھ اپنے تعلقات قایم کیے ہوے تھے ، جس کی وجہ سے عوام کی ساری ضروریات کی چیزیں فراہم ہوجاتی تھیں ۔

ہند میں عجائبات اور نوادر کی بڑی مانگ تھی ، صرف جہانگیر ہی کو ان کا ذوق نہیں تھا بلکہ دکن کے ہندو اور مسلمان ایسی چیزوں کے بڑے شایق تھے ، مغربی تاجر ابتدا ہی سے اس قسم کی چیزوں کو فراہم کرنے کی کوشش کرتے تھے ، چنانچہ ہند کے لوگ آئینے , بگھیاں ، شمعیں ، اور شکاری کتے خریدا کرتے تھے، مگر ان کی وسیع پیمانہ پر تجارت نہیں ہوتی تھی ، ان کا مقصد یہ تھا کہ ان چیزوں کے ذریعے سرکاری عہدہ داروں کی ہمدردی حاصل کریں ، مغربی تاجروں کی وجہ سے یہاں کی عیش و عشرت کے ساز و سامان میں کافی اضافہ ہوگیا تھا

برآمدی تجارت سے ہند کو بڑا فائدہ پہنچا ' مگر پورے ہند میں باقاعدہ تجارت نہیں ہوسکی ' منافع کا ایک بڑا حصہ بیوپاریوں اور دلالوں کو جاتا تھا ' اور تھوڑا بطور محصول وصول کرلیا جاتا تھا ' اس میں شک ہے کہ آیا منافع کا معقول حصہ اصل پیدا کرنے والوں ' اور جولاہوں اور نیل کی کاشت کرنے والوں کو ملتا تھا ' جو پوری آبادی کے لحاظ سے بہت ہی کم تعداد میں تھے ۔

یوروپ اور ہند کے درمیان اگرچہ محض تجارتی تعلقات تھے مگر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس کا وسیع اور گہرا اثر پڑا ' ہند والے صرف پرتگالیوں سے آشنا تھے اور یوروپ کے لوگوں کو ان ہی کے معیار پر جانچنے لگے تھے ' مگر ولندیزیوں اور انگریزوں کے آنے کے بعد ان کو محسوس ہوگیا کہ یوروپ میں ایسے بھی لوگ ہیں جن کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ' اور جو مذہب کے پر جوش مبلغ بھی نہیں ہیں بلکہ سنجیدہ ' تیز طبع اور بعض اوقات سخت مزاج واقع ہوے ہیں ' ان میں سے اکثر نہایت شریف اور مہذب تھے ان کا سب سے پہلا کام تجارت کو فروغ دینا تھا ' یوروپ والے بھی ہند کے حالات سے زیادہ واقف ہونے لگے تھے یہاں اگر ایک طرف بادشاہوں اور امیروں کی شان و شوکت اور دولت تھی تو دوسری طرف غریب انتہائی غربت اور افلاس میں ڈوبے ہوئے تھے ' پرچاس ہز پلگرمس Purchas his Pilgrims میں جو سنہ ۱۶۲۵ع میں شایع ہوی ' ان تمام بیانات کی تصدیق مل سکتی ہے جو وقتاً فوقتاً ہند کے معاشرتی حالات کے متعلق لوگوں نے دیے ہیں ' اور شکسپیر کی تلمیحات اور ملٹن کی شاندار تشبیہات سے بھی ہند اور امشرقی جزائر کے معاشرتی حالات کے متعلق یوروپ والوں کی نئی معلومات کا ایک اندازہ ہوتا ہے ۔

باب ۳۱

شاهجہاں

جہانگیر کی وفات کے بعد کچھ دنوں تک تخت نشینی کیلئے جھگڑے ہوتے رہے، مگر آخرکار اس کا لڑکا شاھجہاں کسی خاص دقت کے بغیر تخت نشیں ہوگیا اس کی شخصیت کے متعلق ہماری معلومات ناقص ہیں، کیونکہ اس کے عہد کے سرکاری نوشتہ جات میں صرف سرسری واقعات کا ذکر ہے غیر سرکاری تاریخوں سے اس کے حقیقی کردار پر کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ مغربی سیاحوں سے بھی اس کے گہرے تعلقات نہیں تھے، مگر ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ شہنشاہی شان و شوکت کا بڑا دلدادہ تھا۔ ابتدائے عہد حکومت میں وہ ایک قابل حکمران تھا۔ وہ عام طور پر تیز فہم اور معاملہ شناس تھا، اور ہر ایک امر کے متعلق فوری فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا تھا، اس نے حکومت کے مالی نظام کو بھی مستحکم بنایا، معلوم نہیں کیا اسباب تھے کہ اس کے اخیر زمانۂ حکومت میں اس کی قوت رائے بہت کمزور ہوتی چلی گئی تھی، یہاں تک کہ اس کے آخری ایام نہایت غمناک طریقہ پر گذرے۔

شاھجہاں اپنے باپ کی طرح ایک راجپوت ھندو عورت کا لڑکا تھا، وہ نسلا نیم ھندو تھا، لیکن وہ اس خاندان کا پہلا بادشاہ ہے جس کو ایک دیندار مسلمان سمجھا جاتا ہے، اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ایک باقاعدہ مذہبی ایذارساں بادشاہ تھا بہت بڑی زیادتی ہوگی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے زمانہ میں حکومت کی نظم و نسق پر مذہبی رنگ بہت غالب تھا، اور ہمیشہ اسلام ہی کی بھلائی کو مد نظر رکھا جاتا تھا، ھندوؤں کو نئے مندر تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تھی، کچھ زمانہ کے لئے آگرہ کے یسوعی پادریوں کے ساتھ برا سلوک ہوتا رہا۔ اور تاریخی کتابوں میں مسلمان واضح طور پر حاکمانہ جماعت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

شاہجہاں نے سب سے پہلے جنوبی ہند کی طول طویل جنگ کو ختم کرنے کی کوشش کی ' اس کے عہد میں جیسا کہ آگے چلکر بیان کیا جائیگا احمد نگر فتح ہوا اور اس ریاست کا ایک بڑا حصہ مغلیہ سلطنت میں شامل کرلیا گیا ' چند دن کے بعد بیجاپور اور گولگنڈہ نے بھی مغلیہ سلطنت کے اقتدار کو مان لیا اور ان دونوں ریاستوں کے حکمران اپنی سلطنت پر بحال رکھے گئے ۔ سنہ ۱٦۳۸ ع میں قندھار کے ایرانی صوبیدار نے شاہ ایران سے خوف کھاکر از خود اس شہر کو مغلوں کے حوالے کردیا ' شاہجہاں نے اس کی بڑی عزت کی اور اپنے دربار میں اس کو ایک معزز جگہ عنایت کی ' مگر قندھار پر مغلوں کا مستقل قبضہ نہیں رہ سکا ' کیونکہ گیارہ سال بعد ایرانیوں نے پھر سے اسپر قبضہ کرلیا اس کے بعد سے شاہجہاں نے کئی مرتبہ اس کو واپس لینے کی ناکام کوشش کی ' سنہ ۱٦۴۵ ع میں اس نے شمال مغربی سرحد پر نئی فتوحات حاصل کرنے کوشش کی ' اور بلخ کو فتح کیا جو ہندو کش سے شمال میں واقع ہے اور جس کو پرانے زمانہ میں باختر کہا جاتا تھا ' لیکن اس کا فتح کرنا جتنا آسان تھا اتنا اس پر مستقل قبضہ رکھنا آسان نہیں تھا ' چنانچہ چند سال کی کشمکش کے بعد یہ علاقہ اس کے اصل حکمران کے حوالے کردیا گیا اور اس طرف نئی فتوحات کے حاصل کرنے کا خیال ہمیشہ کیلئے ترک کردیا گیا ' اس طرح شاہجہاں اگرچہ جنوبی ہند کی مہموں میں کامیاب رہا ۔ لیکن شمال مغربی سرحد پر اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی ۔

سلطنت کے داخلی امور کے متعلق ہماری معلومات ناکافی ہیں ' ابتدا میں حکومت کا نظم و نسق بہت مضبوط تھا ' جرائم پیشہ لوگوں کی ایک حد تک سر کوبی کی گئی جنھوں نے جہانگیر کے زمانہ میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی ' لیکن اب بھی بعض مقامات پر شورشیں ہوتی رہیں ' اور بکھری

ہوی یادداشتوں سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ حالات بہتر ہورہے تھے یا بدتر ، سلطنت کی اقتصادی حالت کو بھی پورے وثوق کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا ، کیونکہ چند مخصوص باتوں کے سوا تفصیلی باتوں کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے ، ہم جانتے ہیں کہ سرکاری زمینوں کی آمدنی دگنی سے بھی زیادہ ہوگئی تھی ، اور سرکاری عہدہ داروں کی تنخواہیں کئی گنی بڑھ گئی تھیں اس سے ہم اس بات کا یقین کرسکتے ہیں کہ شاہجہاں کے زمانہ میں اکبر کے زمانہ کی بہ نسبت کاشتکاروں سے بہت زیادہ وصول کیا جاتا رہا ہوگا ، اس میں سرکاری زمینوں اور جاگیروں کے درمیان کوئی خاص تمیز نہیں کی جاتی رہی ہوگی ، ہم کو معلوم نہیں ہے کہ اتنا پیسہ کہاں سے آیا کرتا تھا ، لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس کے عہد کے فوراً بعد ہی کاشتکار اپنے پیشہ کو چھوڑکر دوسرے پیشے اختیار کرتے چلے جارہے تھے ، جس کی وجہ سے سلطنت کی آمدنی دن بہ دن گھٹتی چلی جارہی تھی ، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شاہجہاں نے ہر ممکن ذریعہ سے آمدنی کے حاصل کرنے کے لئے بہت سے عہدہ دار مقرر کئے تھے اور ان کو اس بات کا اختیار دیا تھا کہ کافی زمینوں کی کاشت کرنے سے پہلو بچانے والے کاشتکاروں کو کوڑے لگوائیں ، اس سے اندازہ ہوگا کہ شاہجہاں نے محض شان و شوکت کے حصول کی خاطر کاشتکاروں سے ان کی استطاعت سے بڑھ کر لگان وصول کیا ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو کاشتکاری کے پیشہ ہی سے نفرت ہوگئی اور سلطنت کے مالی نظام کو بڑا دھکا لگا ۔

حکومت کے اقتصادی حالات کچھ بھی رہے ہوں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے دربار کی شان و شوکت دنیا بھر میں مشہور ہوگئی ، شاہجہاں نفیس چیزوں کا دلدادہ اور فنون لطیفہ کا سرپرست تھا ، نہ صرف پایہ تخت کے اندر بلکہ ہر بڑے شہر میں کارخانے قایم کئے جہاں نفیس قسم کی دریاں

شال ' اور تن زیب اور دوسری چیزیں تیار کی جانے لگی تھیں نفاست اور عمدگی میں اس قسم کی چیزیں اس سے پہلے کبھی تیار نہیں ہوتی تھیں ' اور ان پر اتنی غیر معمولی لاگت آتی تھی کہ آج ان پر مبالغہ کا دھوکہ ہوتا ہے - اس قسم کی چیزوں میں سے اس کا وہ تخت طاؤسی بھی تھا جس کو اس نے زرکثیر کے صرف سے تیار کیا تھا - یہ ان گیارہ تختوں میں سے ایک تھا جو اس کے استعمال میں تھے ' اور جن میں ہر قسم کے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے ' اس کی تیاری میں پورے سات برس لگے تھے اور سرکاری طور پر اس کی کل لاگت ایک ملین اسٹرلنگ سے زیادہ بتائی جاتی ہے *

اس قسم کی چیزیں محض نمائشی اور عارضی ہوتی ہیں اور آخر میں کسی غنیم کا مال بنتی ہیں ' اسوقت شاهجہاں کی حقیقی یادگار اسکی وہ شاندار عمارتیں ہیں جو اس نے دھلی اور آگرہ کے اندر بنائیں ' اس نے آگرہ کے شاہی محل کا ایک بڑا حصہ دوبارہ تعمیر کیا اور نیز اس شہر کے اندر ایک عظیم الشان جامع مسجد بنائی ' اور جب اس نے آگرہ کی بجائے دھلی کو اپنا پایۂ تخت بنانے کا فیصلہ کیا تو پرانی دھلی سے متصل شاهجہاں آباد کے نام سے ایک نیا شہر بسایا ' اور جمنا کے کنارے کئی شاہی محل قلعہ کے اندر تعمیر کیے ' دوسرے مقامات میں بھی اس نے بہت سی عمارتیں بنائی تھیں ' لیکن یہ سب تاج محل کے سامنے بالکل ہیچ ہیں ' جسکو اس نے آگرہ میں دریا کےکنارے اپنی بیوی کے مزار کیلئے تیار کیا تھا ' یہ نفیس عمارت ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہے .

* فرانسیسی جوہری ٹیورنیر Tavernier کو اس بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ اس تخت کی تیاری پر بارہ ملین اسٹرلنگ سے زیادہ خرچ ہوا ہے ' دیکھو ٹراولس ان انڈیا مترجمہ وی - بال V. Ball جلد اول صفحہ ۱۸۵ - مگر وہ سرکاری اعداد جو بادشاہ نامہ میں دئے گئے ہیں کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہیں ، دیکھو بادشاہ نامہ طبع ببلیوتھکا انڈیکا جلد اول حصہ دوم صفحہ ۷۹ .

فن تعمیر کے سلسلہ میں ہم نے ابتک معماروں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے کیونکہ ہند کی تاریخوں میں انکے نام دینے کا دستور ہی نہیں تھا ، اس لئے اسوقت اس زمانہ کی ذہنی ترقی کو منظر عام پر لانا بہت مشکل ہے ' اور مغربی فنون لطیفہ کی طرح ہندی فنون لطیفہ کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی ، سرکاری کاغذات میں ان لوگوں کا نام تو ملتا ہے ' جنہوں نے تاج محل کی تعمیر کی نگرانی کی مگر اس کے معماروں کا کچھ پتہ نہیں چلتا ، اب انکی شناخت بہت مشکل ہے ، اور ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ تاج محل کے بنانے والے کون لوگ تھے .

اب ہم جنوبی ہند کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ، جب تالی کوٹ کی جنگ میں وجیانگر کی طاقت پورے طور پر ٹوٹ گئی تو خود مسلم ریاستوں کے درمیان اختلافات کی آگ بھڑکنے لگی ، اور ان کے درباروں میں سیاسی چالیں چلی جانے لگیں ، جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے ' اور جب اکبر نے جنوبی ہند کے فتح کرنے کا ارادہ کیا تو احمدنگر ، بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں آپس میں متحد ہوگئیں ، آخرالذکر دونوں ریاستیں اول‌الذکر ریاست کی امداد اور تائید کرنے لگی تھیں جو مغلیہ سرحد سے قریب تر ہونے کی وجہ سے مغل حملوں کا نشانہ بن گئی تھی ، جہانگیر کے دور حکومت میں ملک عنبر کے حسن انتظام کی بدولت احمد نگر کی ریاست تباہ ہونے سے بچ گئی تھی یہ شخص ابتدا میں ایک حبشی غلام تھا جس نے اپنی قابلیت کی بناء پر معمولی درجہ سے ترقی کرکے وزیر اعظم کا عہدہ حاصل کرلیا تھا . وہ غضب کا مستعد ، منتظم اور دور اندیش سپہ سالار تھا ، قزاقانہ طریقۂ جنگ میں بڑا ماہر تھا ، سن رسیدہ ہونے کے باوجود اس نے مغل فوج کے چھکے چھڑادیے ' جہانگیر کے انتقال سے کچھ پہلے ملک عنبر کا بھی انتقال ہوگیا ، اس وقت اس کی

عمر اسی سال کی تھی ' اس کے بعد احمدنگر میں کوئی ایسا قابل سپہ سالار نہیں تھا جو مغل فوجوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے سکے ' چنانچہ جب شاہجہاں نے بذات خود فوجوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے کسی دقت کے بغیر احمدنگر کا سارا ملک فتح کرلیا ' اس کا ایک بڑا حصہ مغلیہ سلطنت میں شامل کرلیا گیا اور مملکت کا باقی حصہ بیجاپور کے حوالے کردیا گیا ' چند دنوں تک جنوبی ہند کی جنگ رکی رہی ' چند سال بعد شاہجہاں جنوبی ہند آیا اور اس نے بیجاپور کا محاصرہ کیا ' اگرچہ وہ شہر کو فتح نہیں کرسکا تاہم بیجاپور اور گولکنڈہ کے بادشاہوں نے شاہجہاں کی اطاعت قبول کرلی ' ان سے فارغ ہونے کے بعد مغل شہنشاہ وجیانگر کی طرف متوجہ ہوا .

تالی کوٹ کی تباہ کن جنگ کے بعد بھی وجیانگر کی سیاسی حیثیت باقی رہی ' اور پچاس سال تک مختلف ہندو فرمانروا حکومت کرتے رہے ' جب سنہ ۱۶۱۴ع میں وجیانگر کے راجہ کا انتقال ہوگیا تو ہندو امیروں کے درمیان پھوٹ پڑگئی اور ان ہی کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی ' ان امیروں کو نایک کہا جاتا تھا ' وہ جب مناسب معلوم ہوتا ایک حد تک ہندو راجہ کی تابعداری کرلیتے تھے ' ان کے آپس کے اختلاف سے مسلمان ریاستوں کو موقعہ ملا کہ اس طرف فتوحات کرکے اپنے حدود سلطنت وسیع کریں ' انہوں نے کچھ کامیابی بھی حاصل کی مگر سنہ ۱۶۵۶ع میں شہزادہ اورنگ زیب ایک زبردست فوج لیکر دکن کی طرف بڑھا ' بیجاپور اور گولکنڈہ کے بادشاہوں کو مجبوراً مغلوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا ' اسی اثنا میں شاہجہاں بیمار ہوگیا اس لئے اورنگ زیب دکن کی مہم کو نا تمام چھوڑکر دھلی واپس ہوا ' اور اسطرح گولکنڈہ اور بیجاپور کو کچھ دنوں تک ستانے کا موقعہ مل گیا .

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ پندرھویں اور سولھویں صدی میں جنوبی ہند کی سلطنتوں کے اندرونی کے حالات زندگی کے متعلق

ہمیں کوئی متعین معلومات حاصل نہیں ہیں سنہ ۱٦۰۰ء کے بعد کے ولندیزی اور انگریزی ریذیڈنٹوں کے بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ گولکنڈہ میں ایک بہت ہی پرانا ظالمانہ ملکی نظم و نسق قایم تھا، آمدنی کے تقریباً تمام ذریعوں کو ان لوگوں کے ہاتھ فروخت کردیا گیا تھا جو زیادہ سے زیادہ رقم دینے کا وعدہ کرسکیں چونکہ عام طور پر ان کی اجارہداری صرف ایک سال کیلئے ہوتی تھی اس لئے وہ رعایا سے جتنا بھی ہوسکتا تھا وصول کرلینے کی کوشش کرتے تھے۔ کاشتکاروں کو مقررہ رقم باقاعدہ ادا کرنی ہوتی تھی اگر کوئی اس کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتا تو اس کو شکنجہ میں کس کر یا کسی دوسری سزا کے ذریعہ اس سے پورا روپیہ وصول کرلیا جاتا تھا، اس نظام کے ماتحت ہر اس شخص سے روپیہ وصول کرلیا جاتا تھا جو دینے کے قابل ہوتا تھا۔ نئے نئے محصول اور جبری نذرانے لئے جاتے تھے اور جبراً روپیہ بطور قرض مانگا جاتا تھا، حکام اعلی سے ان کی فریاد رسی کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ کیونکہ ان کا مقصد اصلی بھی مال کا حاصل کرنا ہوتا تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور اور جنوب کے بعض نایکوں کے علاقوں میں بھی اسی قسم کا ظالمانہ نظام جاری تھا ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کب سے یہ نظام جاری ہوا اور کیونکر اس کی ترقی ہوی، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کاشتکاروں کاریگروں اور تاجروں پر یکساں اس کا تباہ کن اثر پڑا۔

شاہجہاں کے زمانہ میں ہند کی مغربی قوموں کی حیثیت میں ایک اہم تبدیلی ہوگئی تھی، ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ دوغلی قوم کا اخلاق بالکل گر چکا تھا، وہ اب بھی پرتگالیوں کے نام سے مشہور تھے، مگر بنگال میں ان کو فرنگی کہا جاتا تھا، جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا تھا یہ بدکردار لوگ گوا اور دوسری جگہوں سے جہاں شایستہ حکومتیں قایم تھیں، بھاگ کر خلیج بنگال کے ساحلی مقامات پر بسنے لگے تھے، یہاں انکی بد اخلاقی اور بد کرداری کو روکنے والا کوئی نہیں تھا،

ان میں سے بہت سے لوگ مشرقی بنگال کے ساحل پر بس گئے تھے ' جس کا ایک حصہ اس وقت اراکان کے بادشاہ کے ماتحت تھا وہ ان قزاقوں کو پناہ دینے میں مشہور تھا اور یہ قزاق مال غنیمت کا ایک حصہ اراکان کے بادشاہ کو دے دیتے تھے ' یہ لوگ اراکانی ڈاکووں سے بھی زیادہ پھرتی کے ساتھ پورے مشرقی ساحل اور دہانہ گنگا و برہمپترا کی سر زمینوں پر لوٹ مار کرتے تھے - اور مسافروں اور تجارتی جہازوں کا سامان چھین لیتے تھے - ان کی وجہ سے چٹاگانگ کی بندرگاہ پر ہندی غلاموں کی بڑی تجارت ہونے لگی تھی .

مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں پرتگالیوں کا اہم مرکز ہوگلی تھا ' جہاں کے باشندے مشرقی بنگال کے قزاقوں سے ساز باز رکھتے تھے اور ان کے ذریعہ جبری قیدیوں اور غلاموں کی تجارت بھی کرتے تھے ' ان کے متعلق قسم قسم کی افواہیں پھیلنے لگی تھیں کہ وہ مغل رعایا کو غلام بناکر بیچتے ہیں اور اس قسم کے کئی ایک ناجائز فعل کرتے ہیں ' چنانچہ سنہ ۱۶۳۲ء میں شاہجہاں نے اس نوآبادی ہی کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ' اور اس نے اس کے خلاف ایک زبردست فوج بھیجی پرتگالیوں نے مغل فوج کاڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن آخر میں بڑی شکست کھائی ' بہت سے پرتگالی قید کرلئے گئے اور غلام بناکر آگرہ بھیجدئے گئے .

ہوگلی کی تباہی سے بہت سے اہم تجارتی نتائج پیدا ہوے ' ولندیزی اور انگریز دونوں بنگال کی تجارت سے فائدہ اٹھانے کے ایک مدت سے آرزومند تھے - لیکن وہ اس وقت تک یہاں منڈیوں کے قایم کرنے کی جرات نہیں کرسکتے تھے جب تک کہ ہوگلی کا بندرگاہ پرتگالیوں کے ہاتھ میں تھا اور ان کے ساتھی اور قزاق ساحل پر لوٹ مارکر رہے تھے 'ور جب ہوگلی کے پرتگالیوں کو شکست ہوگئی تو ان دونوں قوموں نے اس کے دہانہ پر اپنی تجارتی منڈیاں قایم کرلیں اور اسطرح بہار کا شورا ' اور بنگال کا سلک اور پھر کچھ دنوں کے بعد ڈھاکہ کا ململ یورپ جانے لگا تھا ,

آگے جنوب میں ارمگاؤں کا موقع اور محل تجارت کے لئے مناسب نہیں تھا ۔ اس لئے انگریزوں نے ایک مقامی نایک سے ماھی گیروں کے ایک چھوٹے سے قریہ میں بسنے کی اجازت حاصل کی ' جہاں اب مدراس کا شہر واقع ھے انہوں نے سنہ ۱۶۴۰ع میں یہاں سینٹ جارج کا قلعہ تعمیر کیا ' اس وقت ملک میں عام بدامنی پھیلی ھوی تھی ' اس کی وجہ سے تاجر اور کاریگر ادھر اودھر سے بھاگ کر مدراس اور ولندیزی قلعہ پلی کٹ میں پناہ لینے لگے اور اس طرح یہ دونوں شہر دن بدن ترقی کرنے لگے یہاں تک کہ انگریزوں اور ولندیزیوں کو شہر کی تنظیم اور حفظان صحت کے امور کی طرف توجہ کرنی پڑی ۔

اس درمیان میں ایشیائی سمندر کے تمام مورچے یکے بعد دیگرے پرتگالیوں کے ھاتھ سے نکلنے لگے ' سنہ ۱۶۲۲ع میں ایرانیوں نے انگریزی کمپنی کی مدد سے ارموز پر قبضہ کرلیا ' ولندیزیوں نے سنہ ۱۶۴۱ع میں ملاکا ' سنہ ۱۶۵۶ع میں کولمبو ' سنہ ۱۶۵۸ع میں ناگپٹن اور سنہ ۱۶۶۲ع میں کوچین اور دوسرے چھوٹے قلعے فتح کرلیے ' مگر گوا کے خلاف ان کی تمام کوششیں ناکام رھیں ' اور آخر وقت تک یہ شہر پرتگالیوں ھی کے قبضہ میں رھا ' سنہ ۱۶۳۵ع میں انگریزوں اور پرتگالیوں کے درمیان دوستی قایم ھوگئی اور جب سے اب تک یہ دوستی برابر جاری ھے ' پرتگالیوں کی تباھی کے بعد اب ولندیزیوں کیلئے اصلی سوال یہ رہ گیا تھا کہ آیاوہ انگریزوں کو بھی مشرقی تجارت سے ھٹاسکتے ھیں یا نہیں اس کا فیصلہ انگریزوں اور ولندیزیوں کی آپس کی جنگ نے کردیا جس کی ابتدا سنہ ۱۶۵۲ع میں ھوی تھی ' اس کے بعد سے انگریزی کمپنی کو بلا شرکت غیرے یہاں تجارت کرنے کا موقعہ مل گیا ۔

مغربی اقوام کی نو آبادیات کے سلسلہ میں جزیرہ بمبئی کا بھی کچھ حال لکھنا ھوگا جس کو پرتگالی بادشاہ نے سنہ ۱۶۶۱ع میں اپنی لڑکی کیتھرائن بریگانزا کے جہیز میں چارلس دوم بادشاہ

انگلستان کے حوالے کردیا تھا ' چھ سال بعد چارلس نے اس کو انگریزی کمپنی کے اجارہ میں دیدیا تھا ' اس سے پہلے ہند کی تاریخ میں بمبئی کی کوئی اہمیت نہیں تھی ' اور اب اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ آخر اس قدرتی بندرگاہ کو اس سے پہلے ترقی دینے کی کیوں کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی اس کا جواب یہ ہے کہ مالابار کے مقامات پیداوار سے بمبئی بہت دور شمال میں واقع تھا ' اس کے علاوہ پہاڑی علاقہ اس کے اور زرخیز زمینوں کے درمیان اسطرح حائل تھا ' کہ شمال اور مشرق کی طرف سے کوئی چیز یہاں پہنچ نہیں سکتی تھی ' یہ جہاز رانی کا ایک اہم مرکز تو ضرور تھا ' مگر یہ نفع بخش تجارت کیلئے کچھ زیادہ مفید نہیں تھا ' اس زمانہ میں جب کہ جزیرہ بمبئی انگریزوں کے حوالے کیا گیا تھا ' اس پر صرف چند مچھیارے رہتے تھے ' اور پرتگالی زمینداروں کے ماتحت چند کسان ان زمینوں کی کاشت کرتے تھے جو کاشت کے قابل تھیں ۔

شاہجہاں کے زمانہ کا ایک اہم واقعہ سنہ ۱٦۳۰ تا ۱٦۳۱م کا مشہور قحط ہے ' ہم پہلے بیان کرچکے ہیں ' کہ خشک سالی لازمی طور پر قحط کا موجب ہوتی تھی ' کیونکہ کھیتیوں کے سر سبز نہ ہونے کی وجہ سے کافی غذا اور اناج نہیں مل سکتا تھا ' اسلامی تاریخوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں قحط ضرور رہتا تھا ' لیکن انھوں نے حالات کے لکھنے میں اکثر مبالغہ سے کام لیا ہے ' مگر اس قحط کے متعلق مغربی لوگوں کے بیانات بھی موجود ہیں ' جن سے حقیقی حالات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے ' سنہ ۱٦۳۰م میں پورے گجرات اور احمدنگر اور نیز بیجاپور اور گولکنڈہ کے ایک بڑے حصہ میں بارش نہیں ہوی تھی سال کے ختم ہونے سے پیشتر اناج کے مقامی ذخیرے ختم ہوچکے تھے ' دوسری جگہوں پر اناج مل رہا تھا مگر قحط زدہ علاقہ تک اس کالے جانا بہت مشکل تھا ' کیونکہ راستہ میں نہ تو جانوروں کیلئے کوئی چارہ تھا اور نہ

پانی ' تمام دریا اور تالاب خشک ہوچکے تھے ' زمین پر ہریالی کا نام و نشان نہیں تھا ' اب لوگوں کے سامنے صرف دو صورتیں تھیں ' یا تو وہاں سے ہجرت کر جائیں یا فاقہ کشی کرکے مرجائیں ' جو لوگ ہجرت کرنے کی طاقت رکھتے تھے ' وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر نکل گئے ' اور اس طرح اکثر قریے اور شہر لوگوں سے خالی ہوگئے ' تاہم لوگوں کی ایک بڑی تعداد قحط زدہ علاقہ میں موجود تھی ' بھوک کے مارے بہت سے لوگوں نے خود کشی کرلی ' اور بعض انسانوں کو قتل کرکے ان کے گوشت سے اپنا پیٹ بھرنے لگے ' سرکاری یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے ہی بچوں کو ذبح کرکے ان کا گوشت کھانے لگے تھے ' قحط زدہ علاقہ کے ایک ولندیزی تاجر کا بیان ہے کہ گلیوں اور کوچوں میں نیم مردہ انسانوں کو ذبح کرکے کھالیا جاتا تھا ' اور مسافروں اور راستہ چلنے والوں کو ہمیشہ اس کا خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں بھوکے لوگ ان کو ذبح کرکے کھا نہ جائیں ' * قحط کے خوفناک اثرات کے متعلق ہندی اور مغربی تاریخوں کے بیانات قریب قریب ایک طرح کے پائے جاتے ہیں ۔

قحط کے وقتی خوفناک اثرات پر غور وفکر کرنا ایک مورخ کا کام نہیں ہے ' اس کی نظر ان کے دیرپا نتائج پر رہتی ہے ' ہم جانتے ہیں کہ احمد نگر کی زمینیں پچیس سال تک غیر آباد پڑی رہیں اور ان کے اندر کسی قسم کی کاشت نہیں ہوسکی ' اس کے بعد باہر سے کاشتکاروں کوبلا کر زمینوں کو سر سبز بنانے کی زبردست کوشش کی گئی ' گجرات کا بھی تقریباً یہی حال تھا ۔ یہاں پارچہ بافی کی صنعت کو بڑا نقصان پہنچا تھا ' کیونکہ تمام جولاہے یا تو مرچکے تھے یا دوسرے مقامات کو ہجرت کرچکے تھے ' سنہ ۱۶۳۰ع میں سورت سے چھینٹ اور نیل

---

* بادشاہنامہ (طبع ببلیوتھکا انڈیکا) جلد اول حصہ اول صفحہ ۳۶۲ اور جے ۔ فان ٹوسٹ J.Van Twist کی کتاب جنریل بشرجوسک فان انڈیین Generale Besehrigvinge van Indien (مطبوعہ امسٹرڈام سنہ ۱۶۴۸ع ، باب ۲ ۔

کا مال یوروپ بھیجا جاتا تھا ' قحط بعد ان چیزوں کی بر آمد بالکل بند ہوگئی ' اس لیے تاجروں کو دوسرے بازار تلاش کرنے پڑے ' جہاں سے چھینٹ کا کپڑا یوروپ روانہ کیا جاسکتا تھا ، اس زمانہ میں کارومنڈل کے ساحل پر بھی یہ کپڑا تیار ہوتا تھا ' چنانچہ اس صدی کے وسط میں مدراس اس کپڑے کی بر آمد کا اہم مرکز ہوگیا تھا ' یوروپ میں ہند کے نیل کی مانگ باقی نہیں رہی تھی کیونکہ جزائر غرب الہند سے زیادہ مقدار میں نیل کا مال آنے لگا تھا ' ان اسباب کی بناء پر ہند کے مغربی بندرگاہوں کی اہمیت بالکل گھٹ گئی تھی ' اور گجرات کی بجاے مدراس اور بنگال ان کے تجارتی مرکز بن گئے تھے ' یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں مغربی تاجروں کی سرگرمیاں زیادہ تر مدراس اور بنگال میں پائی جاتی ہیں .

ہند کی تاریخ میں سنہ ۱٦۳۱ع کا ایک قحط ہی نہ تھا ' بلکہ اس قسم کے قحط ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں ہمیشہ ہوتے رہتے تھے ' چنانچہ سنہ ۱٦۳٦ع ' سنہ ۱٦۴۲ع ' سنہ ۱٦۴۵ع ' سنہ ۱٦۴٦ع ' سنہ ۱٦۴۸ع ' سنہ ۱٦۵۰ع ' سنہ ۱٦۵۹ع ' اور سنہ ۱٦٦۱ع کے قحط بہت مشہور ہیں ' آخری قحط ایک وسیع تر رقبہ پر چھایا ہوا تھا ' ان سب میں شدت اور وسعت کے لحاظ سے سنہ ۱٦۳۱ع کا قحط نمایاں تھا ' قحط کی جو تفصیل اوپر پیش کی گئی ہے اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ یہ غیر معمولی حالات کا نتیجہ تھا ' بلکہ ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں قحط کا ہونا ایک معمولی بات تھی ' در حقیقت کاشتکاروں ' مزدوروں اور کاریگروں کیلئے یہ ایک بھوت بنا ہوا تھا ' اور ان کو ہمیشہ اس کا ڈر لگا ہوا رہتا تھا کہ کہیں کوئی قحط رونما نہ ہو اور ان کی سماجی اور اقتصادی زندگی برباد نہ ہوجائے .

باب ۳۲

اورنگ زیب

گذشتہ باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ اورنگ زیب شاہجہاں کی بیماری کی خبر سنکر جنوبی ہند کی مہم سے واپس چلا آیا تھا ' تاکہ تخت پر اپنا حق جتائے ' دوسرے تین شہزادے بھی تخت کے دعویدار تھے ' اورنگ زیب نے ان تینوں کو جلد ختم کرلیا اور اپنے باپ شاہجہاں کو آگرہ کے قلعہ میں نظر بند کردیا ' اور سنہ ١٦٥٨ ع کے موسم گرما میں اس کی تاجپوشی کی رسم ادا ہوی ' اس وقت اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی ' امن اور لڑائی کے زمانوں کا اس کو خوب تجربہ تھا ' جب پچاس سال بعد اس نے وفات پائی تو اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا ' خزانہ بالکل خالی ہوچکا تھا اور فوج کی ہمت اور اس کے حوصلے پست ہوگئے تھے ' اور حکومت کے نظم و نسق میں خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ' یہ اس کی حکمت عملی کی بنیادی غلطیوں اور ملکی نظم و نسق کے غلط طریقوں کا نتیجہ تھا .

اورنگ زیب میں بہت سے عمدہ اوصاف موجود تھے ' وہ بڑا دلیر اور بہادر تھا ' اس میں سنجیدگی اور متانت زیادہ تھی وہ محنت کرنے سے کبھی جی نہیں چراتا تھا ' مذہب کا اسے بڑا پاس اور لحاظ تھا ' اور نفسانی جذبات پر اس کو زبردست قابو تھا ' مگر یہ تمام اوصاف سیاسی تدبر کی کمی کی وجہ سے کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوسکے ' وہ خود ایک پکا مسلمان تھا ' اور اپنی سلطنت کو اسلامی قوانین کے مطابق چلانا چاہتا تھا ' اس نے سیاسی مصلحتوں کا کچھ خیال کیے بغیر اسلامی قانون کو نافذ کیا ' اس کی یہ حکمت عملی اس کی سلطنت کی تباہی کا باعث ہوی ' اس نے اکبر کی حکمت عملی

کو ترک کردیا جس سے اس کی سلطنت اور کچھ دنوں تک زندہ رہ سکتی تھی ۔

اس حکمت عملی کی پیروی میں اورنگ زیب نے جو اہم تدبیریں اختیار کیں ان کا یوں خلاصہ پیش کیا جاسکتا ہے مالیات کے معاملہ میں اس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان فرق کیا چنگی کے محصول کے معاملہ میں اس نے مسلمانوں کے ساتھ رعایت کی اور کافروں پر پھر سے جزیہ لازمی قرار دیا ' بنارس اور متھرا جیسے مقدس مقامات میں مندروں کے گرانے کی باقاعدہ کوشش کی اس کے زمانہ میں عام طور پر ستی کی ممانعت کردی گئی تھی گاؤ کشی کی ممانعت کا قانون شاھجہاں کے زمانہ ھی میں ختم ھوچکا تھا ' اورنگ زیب کو اس قانون سے مطلق کوئی ھمدردی نہیں تھی ' اس کا ثبوت اس واقعہ سے ھوسکتا ھے کہ اس نے کم از کم ایک مرتبہ ایک مندر کے اندر گائے کو ذبح کیا ' اور اس مندر کی بے حرمتی کی ' ایک مدت تک مالگذاری کا صیغہ ھندوؤں کے لئے بالکل بند کردیا گیا تھا ' مگر جب ان کے بغیر حکومت کا کام چلنا مشکل ھوگیا تو اس قانون میں ترمیم کردی پڑی تاھم اس کے آخری زمانۂ حکومت میں کسی ھندو کو کوئی اعلی ترین عہدہ نہیں ملا ' ھندو اداروں کو دی ھوی پرانی جاگیریں واپس لے لی گئی تھیں ' نو مسلموں کی بڑی عزت کی جانے لگی تھی اور ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا جانے لگا تھا اور ان کو مختلف عہدے دئے جانے لگے تھے ۔ ھندوؤں کے خلاف رسوا کن قوانین کا نفاذ ھوتا تھا اور ان کو مذھبی میلوں میں شریک ھونے کی اجازت نہیں تھی ' اور ان کے تہواروں کو گھٹانے کی کوشش کی جاتی تھی ۔

ان قوانین کا بیک وقت نفاذ نہیں ھوا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً ان کا نفاذ ھو رہا تھا جس کا لازمی نتیجہ غیر مسلموں کی ناراضگی تھی ' ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ حکومت

اب محض مسلمانوں کے فایدہ کیلئے ھے ' اور ھندووں کو اس سے کسی قسم کا فایدہ نہیں ھے چنانچہ مختلف جگہوں پر بغاوت کے آثار پیدا ھوگئے تھے شمالی ھند میں خاص خاص قوموں نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی ادھر آگے جنوب میں ھندو سرداروں نے بغاوت شروع کردی تھی ۔ اور لوگوں کو اپنے اطراف جمع کرلیا تھا ۔ راجپوتانہ میں جیسا کہ آگے چلکر بیان کیا جائیگا باقاعدہ لڑائیاں شروع ھوگئی تھیں جس کی وجہ سے اس علاقہ کے لوگوں کی وفاداری پر اعتبار کرنا بہت مشکل تھا ۔ اس طرح اورنگ زیب نے ان بنیادوں ھی کو ڈھا دیا جن پر اکبر نے اپنی سلطنت کھڑی کی تھی یعنی عوام کی وفاداری اور راجپوتوں کی سر گرم امداد ۔

اورنگ زیب کی ایک دوسری بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے جنوبی سرحد پر اپنی سلطنت کے حدود کو وسیع کرنے کی کوشش کی جہاں کے مقبوضات کا انتظام کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی ' عہدہ داروں کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہیں تھا ' اس کو کسی ایک پر بھی اعتماد نہیں تھا ' اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے عہدہدار بھی اس پر کوئی اعتماد نہیں کرتے تھے اور اس سے بالکل ناخوش تھے ' قابل عہدہداروں کا ھر جگہ کال ھوگیا تھا ' اور خوشامدیوں نے ان کی جگہ لے لی تھی ' جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا ' اورنگزیب ھر ایک کام کو خود ھی انجام دینے لگا تھا ' دور رھنے والے ماتحت عہدہدار بادشاہ کو دھوکہ دیکر دولت جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے ' اس کے فوجی سپہ سالار عموماً دشمنوں سے خفیہ طور پر مل جانے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ ان کی جنگی تدابیر پر بادشاہ کو کوئی اعتماد نہیں تھا اسی لیے ھم دیکھتے ھیں کہ وہ آخری زمانہ میں بھی جب کہ اس کی عمر ۸۰ سے متجاوز ھوچکی تھی ' فوجوں کی خود ھی قیادت کرنے لگا تھا ۔

اقتصادی نقطۂ نظر سے اس کا عہد حکومت بہت زیادہ تباہ کن تھا بہت سا روپیہ اور بے شمار جانیں غیر مفید لڑائیوں

کی نذر ہوگئی تھیں ' کاشت کی زمینیں ویران ہوگئی تھیں لگان کی زیادتی کی وجہ سے لوگ کاشتکاری کو چھوڑ کر چوری اور ڈاکہ زنی پر اتر آئے تھے ' تجارتی قافلوں کی لوٹ مار کی وجہ سے تمام صنعتیں درھم برھم ھوگئی تھیں ' ملک کی پیداوار گھٹ چکی تھی اور چیزوں کی مانگ بڑھ گئی تھی ' شاھی سرپرستی کے نہ ھونے کی بناء پر فنون لطیفہ سے لوگوں کی دلچسپی جاتی رھی ' نفاست اور لطافت کا ذوق کم ھوگیا تھا دربار سے گویے اور سازندے نکال دئے گئے تھے شاھی محل کی دیواروں سے خوبصورت تصویروں کو مٹادیا گیا تھا شعر و شاعری کی ترقی رک گئی تھی اور وقایع نویسی کا دستور بھی کم ھوگیا تھا اس دور کے متعلق ھماری معلومات کا ایک بڑا ذریعہ خود بادشاہ کے ھاتھ کے لکھے ھوے خطوط ھیں ' یا وہ خطوط ھیں جو اس کے اعلی عہدہداروں نے لکھے ھیں ' موجودہ زمانہ کے مورخ سرجادو ناتھ سرکار نے ان خطوط سے بہترین فائدہ اٹھایا ھے ۔

اورنگ زیب کے دور کی سیاسی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ھے ' ایک وہ زمانہ ھے جب کہ وہ شمالی ھند میں مقیم تھا اور جنوبی ھند پر اس کی طرف سے نائب مقرر تھے ' دوسرا وہ زمانہ ھے جب کہ اس نے سنہ ۱٦٨١ء میں نربدا کو پار کرکے دکن کے معاملات کی براہ راست نگرانی شروع کی ' اور شمالی ھند کے حالات میں اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے ابتری پیدا ھوگئی تھی ' اول الذکر زمانہ میں اس کی توجہ زیادہ تر بنگال ' افغانستان اور راجپوتانہ کی طرف منعطف رھی ۔

اورنگ زیب نے بنگال کے ناظم کو اسام پر فوج کشی کرنے کا حکم دیا جہاں تاتاریوں کا ایک خاندان اھوم حکومت کررھا تھا ' بنگال کا یہ ناظم میر جملہ تھا جو ایک قابل حکمران تھا ' وہ نسلاً ایرانی تھا اور پیشہ کے لحاظ سے ایک تاجر تھا ' اسکی بڑھتی ھوی دولت اور طاقت گولکنڈہ کے بادشاہ کی آنکھوں میں بہت کھٹکتی تھی ' اس وقت میر جملہ اسکا وزیر اعظم تھا ' اپنی جان بچانے کیلئے وہ شاھجہاں کے دربار میں حاضر ھوا ۔ اس نے اسکی

بڑی عزت کی اور وزارت کا عہدہ پیش کیا ، اورنگ زیب نے اس کو بنگال کا ناظم بناکر بھیجا جہاں اس نے بڑی قابلیت کے ساتھ اسام سے لڑنے کیلئے ایک زبردست فوج مرتب کی ، میر جملہ کی فوج بڑی تیزی کے ساتھ اندر گھستی ہوی چلی گئی ، لیکن بہت جلد اسکو پیچھے لوٹنا پڑا ، سنہ ۱۶۶۳ع میں اچانک میر جملہ کا بخار کی وجہ سے انتقال ہوگیا ، جس پر اورنگ زیب کو ایک گونہ خوشی اور اطمینان ہوا ، کیونکہ وہ اسکی طرفسے بدگمان ہوگیا تھا ، اسکے بعد بیس سال تک وقتاً فوقتاً اسام پر فوج کشی ہوتی رہی ۔ تاہم اسام خودمختار اور آزاد رہا ۔

میر جملہ کے جانشین کو آگے جنوب میں چٹاگانگ کے اطراف کے علاقہ کا فتح کرنا آسان ہوگیا تھا کیونکہ وہ فرنگی قزاقوں کو اپنی طرف کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جو اراکان کے بادشاہ کی بدسلوکی سے ناراض ہوگئے تھے چنانچہ اس نے ان کی مدد سے سنہ ۱۶۶۶ع میں چٹاگانگ پر قبضہ کرلیا ، اس طرح اس طرف ہند کی سرحد اپنی پرانی حد پر پہنچ گئی تھی اس کے بعد سے بہت سے فرنگی قزاق ڈھاکہ کے اطراف و جوانب میں بس گئے تھے جن کی نسل اب تک وہاں پائی جاتی ہے اب اس علاقہ میں تجارت کو کسی قسم کے قزاقوں کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا ۔

اورنگ زیب کے لئے افغانستان کی شورش بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھی کیونکہ کابل سلطنت مغلیہ کا ایک اہم مورچہ تھا ، یہ وہ مقام تھا جہاں سے بہت سی قومیں ہندوستان پر حملہ آور ہوی تھیں ، ہندوکش سے اس پارکی اکثر لڑائیوں کی ابتدا اسی مقام سے ہوی تھی ، کابل اور دریاے سندھ کے درمیان کے پہاڑی علاقوں میں بہت سے آزاد قبایل بستے تھے ، جن کو زیر کرنا کچھ آسان نہیں تھا ، افغانستان ایک غریب ملک تھا ، اور افغانوں کی زندگی شاہی امداد یا چوری یا استحصال بالجبر پر موقوف تھی ، ان پہاڑی علاقوں کے تنگ راستوں میں مغل سوار اپنی بہادری اور ترکتازی کے جوہر نہیں دکھا سکتے تھے ، کیونکہ

یہ آزاد قبیلے وقتاً فوقتاً دروں کو بند کردیتے تھے ' اور جب تک ان کو مارکر بھگا نہ دیا جائے یا پیسہ دیکر ان کو خرید نہ لیا جاے کسی کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی تھی ' مغلوں کیلئے اطمینان کی ایک بات یہ تھی کہ خود ان آزاد قبیلوں کے درمیان کوئی اتحاد موجود نہیں تھا ' اور جب کوئی سردار مختلف قبائل کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو مغلوں کو ایک خوفناک خطرہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا چنانچہ سنہ ۱۶۷۲ء میں ایک سردار نے افغانی قبیلوں کے اندر اتحاد پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ۔ اس نے مغلوں کو پے در پے کئی شکستیں دیں ۔ دو سال کی مسلسل ناکامیوں کے بعد اورنگ زیب نے فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی ' اور میدان جنگ پر پہنچ کر کچھ تو اپنی فوجی طاقت سے اور کچھ سیاسی چالبازیوں سے افغانوں پر فتح پائی اور ان کے اتحاد کو توڑنے میں کامیاب ہوگیا ' تقریباً تین سال تک وہ اس مہم کے سر کرنے میں اتنا مصروف رہا کہ دکن کی طرف امدادی فوج ور رسد کے بھیجنے کی امید فرصت نہیں ملی ' اس کی وجہ سے دکن کے معاملات ابتر ہونے لگے تھے .

افغانستان سے فارغ ہونے کے بعد اورنگزیب نے راجپوتانہ کی طرف توجہ کی ' اپنی بنیادی حکمت عملی کے مطابق وہ ماروار اور راٹھور کی ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے راجپوتوں کی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا ' چنانچہ سنہ ۱۶۷۸ء میں اسکو اس منصوبہ پر عمل کرنے کا موقعہ مل گیا ' جودھپور کے مہاراجہ کا افغانستان میں انتقال ہوگیا تھا ' اس کی کوئی اولاد نہیں تھی جو اس کے بعد گدی پر بیٹھ سکتی تھی ' تھوڑی مدت کیلئے راٹھور بے یارو مددگار معلوم ہو رہے تھے ' لیکن جب اس کا ایک جائز وارث بچہ نکل آیا تو تمام راجپوت اس نوزائیدہ بچہ کی حمایت پر کمر بستہ ہوگئے ' اور مغلوں کے ساتھ قزاقانہ جنگ شروع کی ' ریاست کے تمام قلعوں پر جہاں مغل آسانی کے

ساتھ پہنچ سکتے تھے ، ان کا قبضہ ہوگیا ' انہوں نے تمام شہروں کو تباہ و تاراج کیا مندروں کی بے حرمتی کی - اور راٹھوروں کو پہاڑوں میں روپوش ہونے پر مجبور کردیا ' اور جب میواڑ کا رانا ان کی امداد کیلئے آیا تو مغل فوج نے اس ریاست کو بھی تاراج کیا اور راجپوتوں نے اراولی کی پہاڑیوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ، مغلوں نے ان کو دونوں طرف سے گھیر لیا تھا .

اس موقعہ پر حالات نے ایک نئی کروٹ لی اورنگزیب کا ایک لڑکا شہزادہ اکبر باغی ہوگیا ' راجپوتانہ کی مہم میں وہ فوج کا سپہ سالار بنایا گیا تھا اپنی نا قابلیت کی وجہ سے اس مہم میں اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوی ' اور بادشاہ کی جانب سے اسپر عتاب ہوا · سنہ ۱۱٦۱ء میں اس نے راجپوتوں سے ساز باز کی ، اور اپنے باپ کی معزولی اور اپنی بادشاہی کا اعلان کیا ' کچھ دنوں کیلئے اورنگ زیب کی حیثیت بالکل نازک ہوگئی تھی ' کیونکہ اس کے پاس کافی فوج نہیں تھی ' اگر شہزادہ اکبر فوری طور پر فوج لیکر اجمیر کی طرف بڑھتا تو بہت ممکن تھا کہ اپنے باپ کو شکست دیکر تخت سلطنت کا حقیقی مالک بن جاتا ' وہ درحقیقت اس کام کے لائق نہیں تھا ' اس نے حملہ کرنے میں غیر معمولی تاخیر کردی ' اور اورنگ زیب کو آگے بڑھکر حملہ کرنے کا موقعہ مل گیا اور جب دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ملیں تو اورنگ زیب جعلی خطوط کے ذریعہ شہزادہ اکبر کی فوج میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا ' راجپوت میدان جنگ سے ہٹ گئے اور مسلمان سپاہی مغلوں سے آملے ' شہزادہ اکبر اپنے چند ساتھیوں کو لیکر فرار ہوگیا ' راجپوتوں نے اس کو چند دن تک اپنے ہاں چھپائے رکھا کیونکہ اس وقت ان کو معلوم ہوگیا تھا کہ اورنگ زیب نے ان کو کس قسم کا دھوکہ دیا ہے - اس کے بعد ان لوگوں نے اس کو مرہٹوں کے پاس دکن بھیجدیا - یہاں چند دن تک رہنے کے بعد وہ ایران کی طرف چلا گیا اور وہیں وفات پائی .

س واقعہ کے فوراً بعد میواڑ کے راجہ نے اورنگ زیب

صلح کرلی ' البتہ مارواڑ میں قزاقانہ جنگ جاری رہی جس کا اختتام

اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے جانشین کے زمانہ میں ہوا ' جبکہ ایک راجپوت سردار کو جو تیس سال پہلے پیدا ہوا تھا ' بادشاہ کی جانب سے راجہ تسلیم کرلیا گیا ' اس لڑائی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ سے راجپوتانہ مغل فوج کی بھرتی کا مرکز نہیں رہا۔ بہت کم راجپوت فوج میں ملازم تھے ' بہت سے سرکشی اختیار کئے ہوئے تھے ' اور بعض موقعہ کی تاک میں تھے ' دکن کی مہم میں راجپوت سپاہیوں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی۔

میواڑ کی صلح کے چند دن بعد اورنگ زیب جنوبی ہند کی طرف چلا آیا ' جہاں صورت حال بہت نازک ہوگئی تھی ' بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں اس کی مخالفت پر کمر بستہ تھیں ' ان کے علاوہ مرہٹے سر اٹھانے لگے تھے ' اور انہوں نے شہزادہ اکبر کو پناہ دے رکھی تھی جو باپ کے خلاف باغی ہوگیا تھا ' سنہ ١٦٨٦ء میں بیجاپور پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا اور دوسرے سال گولکنڈہ بھی دھوکہ سے فتح کرلیا گیا ' اور ان دونوں ریاستوں کو مغلیہ سلطنت میں شامل کرلیا گیا اس طرح مغلیہ حکومت کے حدود مدراس سے بھی آگے جنوب میں قایم ہوگئے تھے اب مرہٹوں کے متعلق کچھ تفصیلی حالات پیش کرنا ہے کیونکہ ان کے عروج کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

مرہٹے * زیادہ تر بمبئی سے مشرق اور جنوب مشرق کی جانب مغربی گھاٹ کی اونچی زمینوں پر رہتے تھے ' جہاں زراعت کے قابل کوئی زمین نہیں تھی ' ان کی زندگی بہت سادہ تھی ' وہ نہایت جفاکش تھے اور جنگجوئی میں مشاق اور ماہر تھے ' دکن کی مسلم ریاستوں میں ان کی بڑی مانگ تھی ' سپہ گری ان کا پیشہ ہوگیا تھا ' سترھویں صدی کے پہلے نصف

* مرہٹہ کی اصطلاح کو بعض وقت گنجلک طور پر استعمال کیا جاتا ہے ' حقیقت میں یہ ایک کاشتکار گروہ کا نام تھا ' آگے چلکر مختلف فرقوں اور بسا اوقات اس علاقہ کی پوری آبادی پر محمول ہونے لگا ' جس کو اب سنسکرت زبان میں مہاراشٹر کہا جاتا ہے۔

میں ان کے ایک سردار شاہ جی بھونسلہ نے نمایاں کام انجام دیا اور اس مدت میں وہ یکے بعد دیگرے احمد نگر ' مغل اور بیجاپور کی فوج میں ملازمت کرتا رہا ' سنہ ۱۶۲۷ ع میں اس کو ایک لڑکا سیواجی پیدا ہوا جس نے مرھٹوں کی ریاست کی بنیاد ڈالی .

ایک مورخ کا فرض ہے کہ سیواجی کے متعلق بہت احتیاط سے کام لے ' کیونکہ اس کے کارناموں پر جہالت اور تعصب کے پردے پڑگئے ہیں ' اس کی وفات کے پچاس برس بعد مرھٹوں نے شمالی ہند کے شہروں میں وہ بے رحمانہ مظالم ڈھائے کہ ان کے نام ہی سے لوگوں کے کان کھڑے ہوجاتے تھے اور ان میں نفرت اور خوف کا جذبہ پیدا ہوجاتا تھا ' مگر اس کے بر خلاف مغربی ہند میں اس کو ایک زبردست ہیرو مانا جاتا ہے ' اس کے کارناموں کے متعلق بے شمار نظمیں اور کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے بعض بالکل جھوٹ ہیں اور بعض مشکوک ہیں ' جدید زمانہ کے محقق اس کو ہندو نشاۃ ثانیہ کا ایک زبردست علمبردار بتاتے ہیں ' اور بعض لوگ اس کو کامیاب لٹیرا ثابت کرتے ہیں ' اور بعض اس کو فوجی اور سیاسی ذہانت کا مالک بتاتے ہیں جس نے لٹیرے پن سے اپنی زندگی کی ابتدا کی اور جو آگے چلکر ایک تجربہ کار سپاہی اور سیاست داں بن گیا ' اس مختصر سی کتاب میں ان مختلف نقطہائے خیال پر تفصیلی بحث کرنے کی گنجایش نہیں ہے ' اس لیے ہم اس کی شخصیت کو چھوڑ کر جس کا مطالعہ اس سے بھی بڑی کتابوں کے ذریعہ ہوسکتا ہے ' ہم صرف اس کے کارناموں کو گنانے کی کوشش کرینگے .

اس نظریہ کے متعلق بھی کچھ لکھنا لازمی ہے کہ پہلے ہی سے مرھٹوں کے اندر آزادی کے جذبات کارفرما تھے ' یہاں تک کہ سیواجی پیدا ہوا اور اس نے اس نئی طاقت کو ایک متعین مقصد کے حصول کے لئے سرگرم بنا دیا اس نظریہ کی تائید

میں کوئی شہادت نہیں پیش کی جاسکتی ' البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ اس علاقہ میں نئے مذہبی خیالات بڑا فروغ پا رہے تھے ' اور سترھویں صدی کے پہلے نصف میں مشہور مرہٹی شاعر تکارام نے اپنی نظموں کے ذریعہ ان خیالات کی خوب تبلیغ کی ' اُس زمانہ میں ہندو عموماً حیات ثانیہ کا خواب دیکھنے لگے تھے ' سیواجی ان مذہبی خیالات کا بڑا احترام کرتا تھا ' تاہم اس کی مختلف سیاسی سرگرمیوں کو تکارام کے خالص پیغام محبت کے خیالات سے نسبت دینا آسان نہیں ہے .

سیواجی کی ماں نے اس کی تربیت کی تھی یہ دونوں اس وقت پونا میں رہتے تھے اور باپ کی جاگیر پر گذارہ کرتے تھے ' اس کا باپ فوج میں ملازم تھا اور پونا سے باہر رہتا تھا ' سیواجی جب بیس سال کا ہوا تو وہ اپنی جاگیر کا انتظام خود ہی کرنے لگا اور اس نے عقیدتمندوں کی ایک بڑی جماعت پیدا کرلی ' اور ان کی مدد سے وہ اپنی چھوٹی سی جاگیر کو وسیع کرنے اور اس کو ایک خود مختار سلطنت بنانے کی فکر کرنے لگا ' چند سال تک اس کی ترقی دھیمی اور محتاط رہی ' لیکن سنہ ۱٦۵۵ع کے بعد اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ' اور اب وہ کبھی تو سلطنت بیجاپور سے اور کبھی مغلوں سے ٹکرلینے لگا تھا چند سال تک غیر مختتم لڑائی کا سلسلہ جاری رہا ' یہاں تک کہ سنہ ۱٦٦۴ع میں اورنگ زیب نے اپنے سب سے بڑے قابل سپہ سالار راجہ جے سنگھ کو سیواجی کی سرکوبی کیلئے روانہ کیا ' اور اس نے اس کو اتنا پریشان کیا کہ آخر سیواجی نے مغل بادشاہ کی اطاعت قبول کرلی اور خراج کے ادا کرنے کا وعدہ کیا .

یہ معاہدہ کچھ زیادہ دنوں تک قایم نہیں رہا ' سیواجی کو آگرہ کے شاہی دربار میں حاضر ہونے کی دعوت دی گئی جہاں اس کا خاطر خواہ استقبال نہیں ہوا ' اس کی وجہ سے اس کا دل مکدر ہوگیا ' اور اس کے چہرے پر غیظ و

کے آثار نمایاں ہوگئے ' اورنگ زیب جو پہلے ہی سے اس سے بدظن تھا فوراً ہی اس کی اندرونی کیفیت کو سمجھ گیا اور اس کو قید کرلیا ' مگر وہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ قید سے فرار ہوگیا ' اور اپنی ریاست میں پہنچکر مغلوں سے مصالحت کرنے کی کوشش کی - سنہ ۱٦۷۰ع میں دونوں کے درمیان پھر اختلافات شروع ہوگئے ' ایک طرف سیواجی متحدہ قوت اور طاقت کا مالک تھا اور دوسری طرف مغل تھے جن کو افغانی مہم کی بناء پر کوئی امداد نہیں پہنچ رہی تھی ' ان کے سرداروں کے درمیان نااتفاقی اور ناچاقی تھی ' اگر ان میں اتحاد ہوتا بھی تو وہ اپنی خود غرضی کی بناء پر اس جنگ کو جلد ختم کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاھتے تھے ' تین سال تک یہ جنگ جاری رہی ' جس میں سیواجی کو اپنی قوت اور اپنے اقتدار کے بڑھانے کا بہت موقعہ مل گیا تھا .

سنہ ۱٦۷۴ع میں سیواجی تاجپوشی کی رسم ادا کرکے ریاست کا باقاعدہ بادشاہ بن جانا چاھتا تھا ' ریاست کے برھمنوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ صرف چھتری خاندان کا فرد بادشاہ بننے کا حق رکھتا ہے ' سیواجی نے اپنا ایک نسب نامہ * پیش کیا جس میں میواڑ کے راجپوتوں سے اپنا سلسلۂ نسب ملانے کی کوشش کی گئی تھی ' بنارس کے گیانیوں نے اس نسب نامہ کی تصدیق کی اور سیواجی کی تاجپوشی کی رسمیں ادا کی گئیں جس میں سارا خزانہ پانی کی طرح بہادیا گیا ' اس کے بعد کئی سال تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا ' سنہ ۱٦۷۷ع میں سیواجی نے صوبہ مدراس کے اندر لوٹ مار کی اور تمام شہروں اور قریوں کو تباہ و تاراج کیا ' تین سال بعد اس کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا سنبھوجی تخت نشیں ہوا .

سیواجی کی ریاست کے حدود کو متعین کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ اس کے حدود بدلتے رہتے تھے ' البتہ اتنا کہا

---

* جدید زمانہ کے بہت سے محقق اس نسب نامہ کو مشکوک بتاتے ہیں .

جاسکتا ھے کہ سنہ ۱۶۷۰ع کے قریب سورت سے لیکر گوا تک کا تنگ ساحلی علاقہ سیواجی کے قبضہ میں تھا ' اس کے علاوہ گوا سے لیکر بمبئی تک کی نشیبی زمینیں بھی اس کے ماتحت تھیں ' اس علاقہ کو عام طور پر کونکن کہا جاتا ھے ' اس کے جنوب مشرقی مقامات میں بہت سے قلعے مرھٹوں کے قبضہ میں تھے ' اسطرح مدراس اور میسور کے ایک بڑے حصہ پر ان کی فوجی حکومت قایم ھوگئی تھی .

جب اورنگ زیب نے گولکنڈہ اور بیجاپور کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تو اب اس کو مغرب اور جنوب میں مرھٹوں کی بڑھتی ھوی طاقت کا سامنا کرنا پڑا جو آئے دن مغلیہ حدود سلطنت پر حملے کرتے رھتے تھے ' اگرچہ سیواجی کی قابل قدر تنظیم سے اس کی ریاست بہت مضبوط ھوچکی تھی تاھم مالی حیثیت سے وہ اب تک کمزور تھی ' مغلیہ جیسی مضبوط سلطنت سے لڑنے کیلئے ان کے پاس کافی روپیہ اور سامان نہیں تھا ، اس کے برخلاف مغلوں کو شمال کے صوبوں کی آمدنی تھی جس سے وہ دکن میں غیر محدود مدت تک نہیں تو بھی کم از کم ایک بڑی مدت تک جنگ کو جاری رکھ سکتے تھے ' سیواجی کے اکثر حملے محض حصول دولت کی خاطر ھوتے تھے ' اس نے مغلوں کی اھم بندرگاہ سورت کو دو مرتبہ لوٹا ' اور خزانہ خالی ھونے کی وجہ سے صوبہ مدراس کے مختلف ضلعوں پر تاخت کی اور مال غنیمت سے خزانہ کی کمی کو پورا کیا ' سب سے پہلے اسی نے چوتھ کی وصولی کا طریقہ جاری کیا ' مغل سلطنت کے مختلف مقامات پر حملے کرکے وھاں کی پوری آمدنی کا ایک چوتھائی حصہ وصول کرلیا جاتا تھا ' اسطرح چوتھ سے تقریباً سیواجی کی ریاست کی کل آمدنی کے برابر روپیہ وصول ھوجاتا تھا .

اورنگ زیب اس قسم کے لٹیرے پڑوسی کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا تھا ' حسن اتفاق سے ریاست کی مسند پر سنبھوجی جیسا عیش پرست اور بالکل ھی نا قابل فرمانروا بیٹھا جو اپنے

باپ کی صحیح جانشینی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ مرہٹہ سرداروں کے درمیان اختلافات شروع ہوگئے تھے ان میں سے اکثر مغلوں سے جاملے تھے' اور جو رہ گئے تھے وہ لوٹ مار میں مشغول ہوگئے تھے حکومت میں قابل عہدہداروں کا کال ہوگیا تھا سنہ ۱۶۸۹ع میں مغل فوجوں نے سنبھوجی کی قیام گاہ پر جہاں وہ عیش و عشرت میں مصروف تھا' اچانک دلیرانہ حملہ کیا اور اس کو گرفتار کرلیا' اور پنے پڑاؤ پر پہنچکر ذلت اور بے رحمی کے ساتھ اس کو قسم قسم کی تکلیف دیکر قتل کردیا' اس کا بیٹا شاہو ایک قیدی کی حیثیت سے مغلوں کے ہاں پرورش پانے لگا۔

تھوڑے دنوں کیلئے ایسا معلوم ہوا کہ مرہٹوں کی طاقت بالکل ٹوٹ چکی' ایسا سمجھنا ایک بڑی غلطی تھی' مغلوں نے مرہٹوں کے پورے طورپر خاتمہ کردینے کا کبھی خیال نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹے سردار خودمختار ہوکر ان کے ساتھ پھر لڑنے لگے اور انہوں نے قزاقانہ جنگ شروع کردی' انہوں نے سنبھوجی کے بھائی راجہ رام کو اپنا بادشاہ بنا لیا' جس نے قلعہ چنجی پر جو مدراس سے جنوب مغرب میں تقریباً اسی میل کے فاصلہ پر واقع ہے' اپنا قبضہ جما لیا تھا۔

اس کے بعد کئی سال تک غیر فیصلہ کن جنگ جاری تھی' سات سال کے تباہ کن محاصرہ کے بعد سنہ ۱۶۹۸ع میں چنجی فتح ہوا' لیکن راجہ رام بچ کر اپنے وطن پہنچ گیا' مشرقی محاذ جنگ سے فارغ ہونے کے بعد اورنگ زیب نے ملک کے مختلف قلعوں کو فتح کرنے کی کوشش کی جن پر مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا تھا' سنہ ۱۶۹۹ع سے لیکر سنہ ۱۷۰۵ع تک اس لڑائی کا سلسلہ جاری رہا' مگر اس کی تمام کوششیں رائیگاں ہوگئیں' کیونکہ جب وہ ایک قلعہ کو فتح کرنے کے بعد دوسرے قلعہ کی طرف متوجہ ہوتا تو پہلا مفتوح قلعہ بھی اس کے ہاتھوں سے نکل جاتا تھا اس مدت میں آٹھ بڑے قلعے اور کئی چھوٹے قلعے فتح

کیے گئے ، مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے مغلوں کے حوصلے پست ہوگئے تھے اور سارا خزانہ خالی ہوگیا تھا ، صرف ایک اورنگ زیب اپنے ارادہ میں پکا رہا ، باقی لوگ ہمت ہار چکے تھے ، آخرکار سنہ ۱۷۰۵ء میں اورنگ زیب بیمار ہوا اور احمد نگر جاکر اٹھاسی برس کی کی عمر میں وفات پائی .

اس درمیان میں سنہ ۱۷۰۰ء میں راجہ رام کا انتقال ہوگیا ، اس کے بعد اس کا ایک نا بالغ لڑکا تخت نشین ہوا ، ریاست کے تمام کام اس کی ماں تارا بائی انجام دینے لگی جو ایک قابل عورت تھی ، اس نے تمام مرہٹوں کے درمیان اتحاد اور اتفاق پیدا کیا ، اور حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی ، اورنگ زیب کے آخری ایام میں مرہٹوں کے خلاف اس کی ناکامیاں در حقیقت اسی عورت کی کوششوں کا نتیجہ تھیں ، اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مرہٹوں پر مغلوں کا دباؤ کم ہوگیا تھا کیونکہ اس کے جانشین تخت حاصل کرنے میں مصروف ہوگئے تھے اور ادھر مرہٹوں نے نا بالغ بچے کو ریاست کی گدی سے اتار کر سنبھوجی کے بیٹے شاھو کو جو مغلوں کے پاس سے بیس سال کی قید کے بعد رہا ہوکر شمالی ہند سے اپنی ریاست کے اندر پہنچ گیا تھا ، بادشاہ بنالیا .

ہم پہلے بتاچکے ہیں کہ اورنگ زیب کی پچیس برس کی غیر موجودگی کی وجہ سے شمالی ہند کا نظم و نسق بگڑ چکا تھا ، شمالی ہند کے اندر مغلیہ سلطنت کے زوال پر یہاں تفصیلی بحث نہیں کی جاسکتی ، البتہ اصل حقیقت یہ تھی کہ مغل عہدہدار نیم آزاد ہونے کی وجہ سے اپنی اپنی قسمتیں بنانے میں لگ گئے تھے ، اور ہر طرف ہندو جاگیردار اپنی طاقت کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں مصروف ہوگئے تھے ، راجپوتانہ میں مارواڑ کے ساتھ جنگ جاری تھی ، اور مالوہ پر راجپوت اور مرہٹے پے در پے حملے کرنے لگے تھے ، پنجاب ، آگرہ ، اودھ ، بنگال بہار اور بندیلکھنڈ میں مقامی سردار سر اٹھانے لگے تھے اور

ان کو بہت کچھ کامیابی بھی ہو رہی تھی ، مرکزی حکومت بہت کمزور ہوچکی تھی ، زراعت کی خرابی کی وجہ سے فوجی جاگیرداروں کی آمدنی گھٹ گئی تھی ، اس بناء پر وہ سپاہیوں کی متعینہ تعداد فراہم نہیں کرسکتے تھے ، حکومت کے ساتھ وفاداری کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا ، اور پر جوش اور ذی اقتدار لوگ آئندہ کا خیال کرکے اپنی حیثیت کو مضبوط بنانے کی کوشش کر رہے تھے ، اگر کوئی مضبوط بادشاہ تخت دھلی پر آجاتا تو شاید ان خرابیوں کا تدارک ہوجاتا ، مگر جیسا کہ ہم آئندہ باب میں پڑھینگے اورنگ زیب کا کوئی جانشین بھی زبردست اور طاقتور نہیں تھا ، اس کا لازمی نتیجہ سلطنت کا بکھر جانا تھا .

اب ہم کو اس سلطنت کی بحری قوت کی تاریخ کی طرف توجہ کرنی ہے ، پندرھویں صدی کی ابتدا میں افریقہ کے سیدی عرب جنجیرہ میں گئے تھے جو بمبئی کے جنوب میں تقریبا پچاس میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے ، آباد ہوے اس جزیرہ کے اطراف ساحل ھند کا ایک بڑا حصہ بھی ان کے قبضہ میں آگیا تھا ، سنہ ۱۶۳۶ع میں یہ حصہ بیجاپور کے ماتحت تھا ، والی ریاست نے سیدی سردار کو اس شرط پر حکومت کا ایک عہدہ دار بنایا کہ وہ بحری جہازوں کی پوری حفاظت کریگا ، چنانچہ اس نے تجارتی جہازوں کی حفاظت کیلئے ایک مختصر بیڑا تیار کیا جس کو عمدہ ھتھیاروں سے آراستہ کیا گیا تھا ، سیدی بہترین ملاح اور بہادر سپاھی تھے ، ان ھی کی وجہ سے سیواجی کو کونکن کے علاقہ کے فتح کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئی تھیں ، سنہ ۱۶۵۹ ع میں اس نے بھی اسی قسم کا ایک زبردست بیڑا تیار کیا ، جس میں مالابار کے قزاقوں کو جگہ دی گئی تھی ، اس کے بعد دس سال تک دونوں بیڑوں میں لڑائی ہوتی رہی ، اس میں زیادہ تر مرھٹوں ھی کو کامیابی ہوتی تھی ، آخرکار جب سیدی سردار نے دیکھا کہ بیجاپور سے

اس کو کوئی خاص مدد نہیں مل رہی ہے تو اس نے اورنگ زیب سے مدد مانگی جس نے اس کو سلطنت مغلیہ کا امیرالبحر مقرر کردیا ۔

اس کے بعد سے اورنگ زیب اور مرھٹوں کے درمیان سمندر میں اور زمین پر لڑائیاں ہوتی رہیں ' جس کی وجہ سے ساحل ہند کے مغربی تاجروں کے ساتھ مختلف قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں ' سیدی عربوں کا معمولی بیڑا ان کے زبردست جنگی جہازوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا ' یہ کمزوری کچھ ایسی تھی کہ یوروپ کے بحری قزاق بڑی دلیری کے ساتھ ہند کے تجارتی جہازوں پر بے دھڑک چھاپے مارنے لگے ' مغلوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ ان کا تدارک کرسکیں ' انہوں نے مغربی تاجروں کو بحری قزاقوں کے تدارک کا ذمہدار قرار دیا ' مگر یہ تدبیر بھی کچھ کارگر نہیں ہوسکی ' کیونکہ ہند کے تجارتی جہازوں پر بحری قزاقوں اور دشمنوں کی طرف سے اب بھی حملے ہو رہے تھے ' جس کی وجہ سے ہند کی تجارت کا بڑا نقصان ہورھا تھا ۔

ان لڑائیوں سے یوروپ کے تاجروں کا کچھ زیادہ نقصان نہیں تھا ' مرھٹوں سے پرتگالیوں کی کبھی کبھی مٹ بھیڑ ہوجاتی تھی ' مگر ہند کی اصل تاریخ سے ان کا کچھ بھی تعلق نہیں تھا ' ولندیزیوں کی بھی یہی حالت تھی ' ہند کے مغربی اور مشرقی ساحل پر سنہ ۱٦٦۴ ع میں فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے کئی منڈیاں قایم ہوگئی تھیں ' لیکن ان کی بھی کچھ اھمیت نہیں تھی ' انگریزوں نے سورت کو چھوڑ کر بمبئی کو اپنی تجارت کا مرکز بنالیا تھا ' چونکہ ہند کی دوسری بندرگاھیں غیر محفوظ تھیں اسلئے ہندی تاجر اور کاریگر ہر جگہ سے اٹھ کر بمبئی میں آکر بسنے لگے تھے اگرچہ یہ مقام آب و ہوا کے لحاظ سے بہت خراب تھا تاھم اس صدی کے اختتام سے پہلے یہاں پچاس ہزار سے زیادہ لوگ آباد ہوگئے تھے ۔

بنگال میں بھی اہم ترین انقلابات ہو رہے تھے ، یہاں انگریزوں کا اصرار تھا کہ تجارتی محصول کے متعلق ان کے ساتھ مستقل رعایت کی جائے ، اور مغل ان کے ساتھ صرف عارضی طور پر رعایت کرنے کیلئے آمادہ تھے ' اور مقامی حکام کے ناجائز حصول زر سے انگریز اس بات پر مجبور ہوگئے تھے کہ مدراس اور بمبئی کی طرح بنگال میں بھی ایک مضبوط قلعہ اپنے تحفظ کیلئے تعمیر کرلیں ' سنہ ۱۶۸۶ع میں ان کو انگلستان کی طرف سے حکم ملا کہ چٹاگانگ کی بندرگاہ پر قبضہ کرلیں ' مگر اس سال اکتوبر میں مغل حاکم نے ہوگلی کے کارخانہ پر حملہ کردیا جس کی وجہ سے سنہ ۱۶۹۰ع تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا ۔ اگرچہ چٹاگانگ پر انگریزوں کا قبضہ نہ ہوسکا ' تاہم تجارتی رکاوٹوں کی بناء پر مغلوں نے انگریزوں کو ہوگلی سے قریب ایک قریہ میں بسنے کی اجازت دے دی جہاں اب کلکتہ کا زبردست شہر قایم ہے ' اس زمانہ میں مغلوں کی طرف سے بنگال پر ایک نرم مزاج مگر نا قابل حکمران حکومت کر رہا تھا ' مختلف سردار شورش پر آمادہ تھے ' چونکہ مغل حاکم انگریزوں ' ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کی حفاظت نہیں کرسکتا تھا اس لیے اس نے ان کو سنہ ۱۶۹۶ع میں قلعے بنالینے کی اجازت دیدی تھی دو سال بعد تین قریے انگریزوں کو اجارہ داری کے طور پر ملے ۔ جن میں سے پہلے کا نام کلی کاٹا تھا ۔ انگریزوں کی یہ نوآبادی پہلے فورٹ ولیم کہلاتی جاتی تھی اور پھر کلکتہ کے نام سے اس کی ترقی ہونے لگی تھی ۔

کمپنیوں کی نشو و نما کی تاریخ میں اجارہ پر زمینوں کا عطا کرنا ایک چوتھا مرحلہ تھا ' اس سے پہلے کے تین مرحلوں یعنی بحری سفر ' کارخانہ اور قلعہ کا ذکر تیسویں باب میں ہوچکا ہے ' اورنگ زیب کے زمانہ میں بد امنی کی بناء پر زیادہ سے زیادہ قلعوں کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی ' مگر حفاظتی فوج کے اخراجات کا تجارت پر بہت بار پڑ رہا تھا ' اسلئے ہر ایک

قلعہ کے ساتھ چند زمینوں کے حاصل کرنے کی بھی کوشش کی گئی جن کی آمدنی سے فوجی اخراجات پورے کیے جاسکتے تھے ' چنانچہ اس صدی کے وسط میں سب سے پہلے ولندیزیوں نے پلی کٹ کے قلعہ کیلئے زمینیں حاصل کیں ' بمبئی کے جزیرہ میں انگریزی فوج کے اخراجات کیلئے کافی زمینیں تھیں ' سنہ ۱٦۰۳ع میں مدراس کے تین قریے حاصل کیے گئے ' اور کچھ دن بعد مزید پانچ قریے ملے ' کلکتہ میں جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں ' تین قریے عطا کئے گئے تھے ' اسطرح یوروپ کے تاجروں کو ملک کے اندرونی نظم ونسق کی دیکھ بھال کرنے کا موقعہ ملا ' کیونکہ کاشتکاروں پر لگان کی شرح کو مقرر کرنا اور ان سے مالگذاری وصول کرنا انھی کا کام ہوتا تھا ' چونکہ یہ قلعے ہر طرح سے مامون اور مصئوں تھے اسلئے ہر جگہ کے تاجر اور کاریگر یہاں آکر بسنے لگے ۔ چنانچہ اسی زمانہ سے مقامی حکومت خود اختیاری (لوکل سیلف گورنمنٹ) کا طریقہ رائج ہوا ' اور سب سے پہلے سنہ ۱٦۸۸ع میں مدراس کے اندر میونسپل کارپوریشن قایم ہوا ' جس میں ہند اور یوروپ کے باشندے کونسلر ہوتے تھے ۔

مختلف قریوں کا بطور عطیہ یا اجارہ کے مل جانا شاہی اقتدار کے مل جانے کے مترادف نہیں تھا ' انگلستان میں سب سے پہلے سر جوسیا چائلڈ Sir Josia child نے شاہی اقتدار کے حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی ' یہ شخص سنہ ۱٦۸۱ع سے لیکر سنہ ۱٦۹۹ع تک کمپنی کا گورنر تھا ' اس نے کہا کہ مدراس اور بمبئی کو اسی طرح ترقی دینی چاہئے جسطرح ولندیزیوں نے بٹاویہ کو ترقی دی ہے ' تاکہ آئندہ ہند میں انگریزی اقتدار کی جڑوں کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا وہ بہترین ذریعہ ثابت ہوسکیں ' * ہند کی بدامنی کی بناء پر وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا ' کیونکہ انگریز مقامی حکومت کی امداد پر ٹیکا لگائے نہیں بیٹھ سکتے تھے '

* کیمبرج ہسٹری جلد پنجم صفحہ ۱۰۲

چونکہ خود کمپنی کی حیثیت مستقل نہیں تھی اس لئے استحکام اقتدار کے جو طریقے اختیار کیے گئے تھے ان کا کوئی فوری نتیجہ نہیں نکل سکا ، سنہ ۱۶۸۹ء سے لیکر پارلیمنٹ کے ساتھ کمپنی کے اختلافات شروع ہوگئے تھے سنہ ۱۶۹۸ء میں ایک نئی کمپنی قایم ہوی جو پہلی کمپنی کے ساتھ مسابقت کرنے لگی ۔ دس سال تک ان کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکا ، آخرکار دونوں کے درمیان اتحاد ہوگیا اور دونوں کو ملاکر ایک متحدہ کمپنی قایم کی گئی ۔ اور ملک میں اس کا اثر اور رسوخ بڑھتا رہا ۔ بمبئی کو چاڈلڈ کی بتائی ہوی حکمت عملی کے مطابق ترقی دینے کی کوشش کی گئی مگر مدراس اورنگ زیب کے ماتحت رہا ، جس کو اس نے گولکنڈہ کے فتح کرنے کے بعد اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا ۔

باب ۳۳

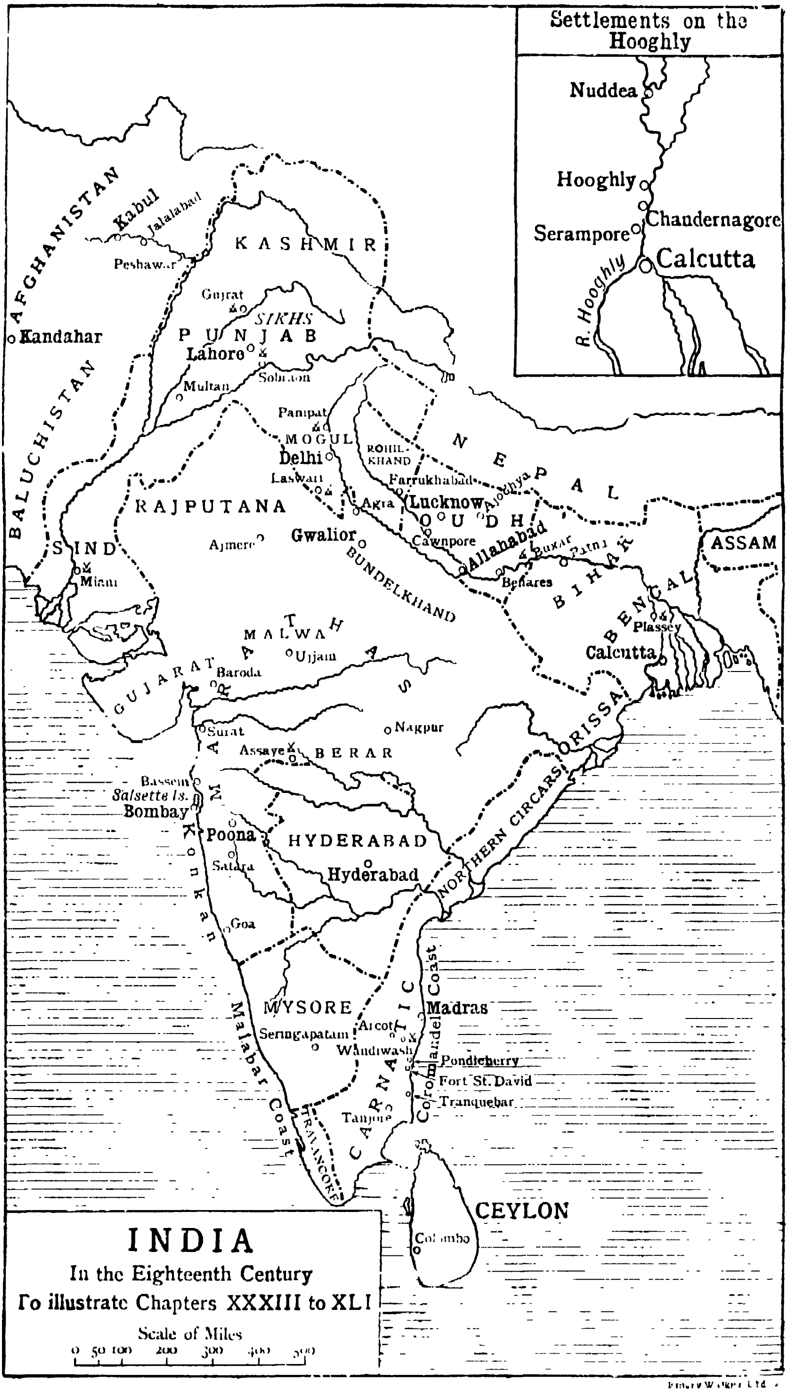
مغلیہ سلطنت کا زوال

اورنگ زیب کی وفات کے بعد پچاس سال کے دوران میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور ہند کا سیاسی نقشہ بدل گیا ' اس سلطنت کا شیرازہ فوری اور شدید طور پر نہیں بکھرا تھا ' بلکہ کچھ تو بیرونی حملہ کی وجہ سے اور کچھ مرھٹوں کی لوٹ مار اور ریاستوں کی آپس کی لڑائی کی بناء پر آھستہ آھستہ یہ سلطنت بکھرنے لگی تھی۔ سب سے پہلے صوبے مرکز سے بالکل الگ ہوگئے تھے ' اور شاھان دھلی میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ صوبوں کے حکمرانوں کو اپنے قابو میں رکھ سکیں ' اس صدی کے وسط میں جنوبی ھند کے اندر کئی خود مختار مسلم ریاستیں قائم ہوگئی تھیں جن کا کوئی تعلق شمالی ھند کے مسلمانوں سے نہیں تھا ' ان دونوں کے درمیان مرھٹوں کی ریاست حائل تھی ' جس کے حدود گجرات سے لیکر اوریسہ تک پھیلے ہوے تھے ' اور ان کا اقتدار دھلی اور آگرہ کے قریب تمام مقامات پر قایم ہوگیا تھا .

جنوبی ھند میں سب سے زبردست مسلمان حکمران حیدر آباد کا نظام تھا ' اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو فتح کرکے پورے جنوبی ھند کو ایک صوبہ قرار دیا تھا اور اس پر نظام اول کو اپنا نائب اور حاکم مقرر کیا تھا آرکاٹ کا نواب * کم و بیش نظام کے ماتحت تھا ' اس کی حکومت جزیرہ نماے ھند کے مشرقی علاقے پر تھی جس کو اس زمانہ میں کرناٹک کہا جاتا تھا ' اس علاقہ کے حدود جنوب میں تنجاور تک پھیلے ہوے تھے ' کرناٹک کے مغرب میں میسور کی ریاست تھی جس پر ایک ھندو خاندان حکومت کر رہا

---

* نواب حقیقت میں بادشاہ کے مترادف نہیں تھا ، یہ بادشاہ کا نائب سمجھا جاتا تھا ؛ مگر آگے چلکر یہی نواب خود مختار ہوکر بادشاہ بن گئے تھے .


INDIA
In the Eighteenth Century
To illustrate Chapters XXXIII to XLI
Scale of Miles
0 50 100 200 300 400 500
Settlements on the Hooghly
Nuddea
Hooghly
Chandernagore
Serampore
Calcutta
R. Hooghly
AFGHANISTAN
Kabul
Jalalabad
Peshawar
Kandahar
BALUCHISTAN
KASHMIR
Gujrat
SIKHS
PUNJAB
Lahore
Sobraon
Multan
SIND
Miani
Panipat
MOGUL
Delhi
Laswari
ROHILKHAND
Farrukhabad
Ayodhya
NEPAL
Agra
Lucknow
OUDH
Allahabad
Cawnpore
Buxar
Patna
Benares
BIHAR
ASSAM
RAJPUTANA
Ajmere
Gwalior
BUNDELKHAND
BENGAL
Plassey
Calcutta
MALWA
MARATHAS
Ujjain
Baroda
GUJARAT
ORISSA
Surat
Nagpur
Assaye
BERAR
Bassein
Salsette Is.
Bombay
Poona
HYDERABAD
Hyderabad
Satara
NORTHERN CIRCARS
Konkan
Goa
MYSORE
Seringapatam
Arcot
Wandiwash
CARNATIC
Madras
Coromandel Coast
Pondicherry
Fort St. David
Tranquebar
Tanjore
Malabar Coast
TRAVANCORE
CEYLON
Colombo

تھا، لیکن آخری زمانہ میں اس پر ایک مسلمان جانباز حیدر علی نے قبضہ کرلیا تھا جس نے جنوبی ہند کی سیاست میں اس صدی کے تیسرے ربع میں بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی۔

شمالی ہند میں بنگال اور بہار کے اندر ایک خود مختار ریاست قائم ہوگئی تھی جس کا حکمران ایک نواب تھا، اس کے مغرب میں اودھ کی وسیع ریاست تھی جس کا حکمران بھی ایک نواب تھا اودھ سے آگے گنگا کے شمال میں روہیلکھنڈ کی ریاست تھی جس کو ایک مسلمان جانباز نے قایم کیا تھا۔ گنگا اور جمنا کے درمیان فرخ آباد کی ایک دوسری مسلم ریاست قایم ہوگئی تھی۔ ان دونوں ریاستوں کے مغرب میں دہلی کی سلطنت تھی جس کا رقبہ اب بھی بہت بڑا تھا یہاں تک کہ سنہ ۳۹-۰ع میں ایرانیوں نے پنجاب، سندھ اور کابل پر قبضہ کرلیا۔ مغل بادشاہوں کے پاس اب بہت چھوٹا علاقہ باقی رہ گیا تھا، دہلی کے جنوب مغرب میں راجپوتانہ کی نیم آزاد ریاستیں تھیں جن پر مغلوں کی بجائے مرہٹوں کا اقتدار اور رسوخ بڑھ چلا تھا اور جو اپنی حدود ریاست سے باہر نکلکر مختلف مورچوں پر حملے کرنے لگے تھے۔

تبہ حال اور تقریباً بے طاقت ہونے کے باوجود اب بھی مغل شہنشاہ کو بڑی سیاسی اہمیت حاصل تھی، اور ہند کے مسلمان ابھی تک اسی کو اپنی ثقافت اور اپنے دین و مذہب کا بچانے والا سمجھتے تھے اور اسی کی طرف اپنی تمام امیدیں لگائے بیٹھے تھے اودھ کا حقیقی بادشاہ سلطنت مغلیہ کا وزیر اعظم بننے اور حیدرآباد کے تخت کا دعویدار مغل شہنشاہ سے اخلاقی امداد کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، اس میں اب بھی اتنی طاقت تھی کہ وہ ان لوگوں کو جو کامیابی کے ساتھ کسی حصۂ سلطنت پر قابض ہوجاتے تھے، خطابات اور عہدے بخش سکتا تھا یا ان سے ایک کثیر رقم لے کر ان کے بادشاہ ہونے کی تصدیق کر دیتا تھا۔ مگر وہ اس کو مستقل قبضہ کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتا تھا۔

اس درمیان میں مرہٹوں کے دستور اساسی میں ایک اہم انقلاب ہوا، سیواجی نے وزیروں کی مجلس کے ذریعہ حکومت کی تھی، اس مجلس میں فوجی سپہ سالار، برہمن اور تعلیم یافتہ لوگ تھے جو ملکی نظم و نسق کے ذمہ دار تھے، کچھ زمانہ کے بعد برہمن وزیر اعظم نے جو اس وقت پیشوا کہلاتا تھا، حکومت کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے، سنہ ۱۷۰۰ع سے پہلے اس کا عہدہ موروثی بن گیا تھا، اس کا صدر مقام پونا تھا، سیواجی کا پوتا شاہو اگرچہ اب بھی بادشاہ مانا جاتا تھا تاہم ریاست کا حقیقی حکمراں پیشوا ہی تھا، اس درمیان میں فوجی سپہ سالاروں نے اپنی اپنی حکومتیں الگ الگ قایم کرلی تھیں، یہ سب پیشوا کے اقتدار کو مانتے تھے مگر اپنی ریاست کے اندرونی معاملات میں وہ خود مختار تھے، اسطرح مرہٹوں کی ایک ریاست ترقی کرکے کئی خودمختار ریاستوں کا ایک وفاق بن گئی تھی گیکواڑ خاندان نے گجرات میں اور بھونسلہ خاندان نے صوبہ متوسط میں اور ھولکر اور سندھیا خاندانوں نے مالوہ میں اپنی اپنی حکومتیں قایم کرلی تھیں، موخرالذکر دونوں خاندانوں نے جمنا تک اپنا تسلط قایم کرلیا تھا، بھونسلہ خاندان نے مشرق کی طرف بڑھنے کی کوشش کی، انہوں نے بنگال پر حملہ کیا اور اوریسہ کو چھین لیا۔

اس دور میں ریاستوں کے حدود کے اندر جو اہم تبدیلیاں ہوئیں ان کا ایک مجمل خاکہ اوپر دیا گیا ہے۔ مگر اقتدار کی کشمکش ایک چھوٹے پیمانہ پر برابر جاری تھی، مختلف سردار، سرکاری عہدہ دار اور جانباز سب کے سب اپنے اقتدار اور رسوخ کے دائرہ کو وسیع کرنے اور ایک چھوٹے یا بڑے علاقہ پر اپنی نیم آزاد یا خودمختار حکومت کو مستحکم کرنے میں لگے ہوئے تھے، قدیم حقوق شاہی کی عملاً کوئی اہمیت نہیں تھی، البتہ بعض اوقات قوت اور طاقت سے حاصل کی ہوئی سلطنت

کو قدیم حقوق کی بناء پر حق بجانب قرار دینے کی کوشش کی جاتی تھی ، وہ زمانہ در حقیقت قوت اور طاقت اور اولوالعزمی کے جوہر دکھانے کا تھا ۔ یہاں اس کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ آجکل کی ہند کی بعض ریاستوں اور بہت سے جگیرداروں کا یہ دعوی کہ ان کو قدیم سے شاہی یا ملکیت کے حقوق حاصل ہیں ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اٹھارویں صدی کے فوری انقلابات کے زمانہ میں ایک آدمی کھڑا ہوجاتا تھا اور محض قسمت سے دولت اور سلطنت یا کسی جاگیر کا مالک بن جاتا تھا ۔

اب ہم دھلی کے مغل بادشاہوں کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ، اورنگ زیب کی وفات (سنہ ۱۷۰۷ع) کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ تخت سلطنت پر آئے جن کی کل مدت حکومت بارہ سال تھی اس مدت میں تین مرتبہ جانشینی کے لئے لڑائیاں ہوئیں اس کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا جس نے سنہ ۱۷۱۹ع سے ۱۷۴۸ع تک حکومت کی ، اس نے اپنی سلطنت کے بکھرنے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ، اس میں اس کے روکنے کی بالکل طاقت نہیں تھی ، اس کا دربار مختلف گروہوں کی سازشوں کا مرکز بن گیا تھا ، سنہ ۱۷۳۹ع میں ایرانی حملہ نے اس کی رهی سہی قوت کا بھی خاتمہ کردیا تھا ایرانی ایک زمانہ سے ہند کے ایک حصہ پر قبضہ حاصل کرنے کے آرزومند تھے ، ان کا ارادہ تھا کہ کم از کم دریائے سندھ تک اپنی سلطنت کے حدود کو بڑھالیں ، اسی وجہ سے انہوں نے قندھار کو اپنے قبضہ میں رکھنے کی بڑی کوشش کی تھی ، کیونکہ وہ ہند کے راستہ پر ایک زبردست مورچہ تھا ، جب سنہ ۱۷۳٦ع میں نادرشاہ ایران کا بادشاہ ہوا تو اس نے ہند کو فتح کرنے کی طرف توجہ کی ، پانچ سال کے بعد وہ قندھار سے روانہ ہوا ، راستہ میں کابل اور لاهور کو فتح کیا اور پانی پت سے کچھ آگے شمال میں کرنال

کے میدان میں محمد شاہ کی فوج کو زبردست شکست دی، دونوں کے درمیان صلح ہوی اور وہ محمد شاہ کو ساتھ لیکر پرامن طریقہ پر دھلی میں داخل ھوا، اھل شہر نے ھنگامہ اور فساد کردیا جس کی وجہ سے بہت سے ایرانی مارے گئے، نادر شاہ نے بڑی بیدردی کے ساتھ شہر کے باشندوں کا بلا تفریق قتل عام کیا، اس کے بعد سلطنت کے تمام خزانوں کو اپنے قبضہ میں لیا، اور اھل شہر سے ایک بہت بڑا تاوان وصول کیا، ایک معاھدہ کے ذریعہ پنجاب سندھ اور کابل نادرشاہ کے حوالہ کردیا گیا اور سارا مال غنیمت لیکر وہ ایران کو واپس چلا گیا۔

اسی سال بعد نادر شاہ مارا گیا، اور ایک افغانی عہدہ دار احمدشاہ درانی عروج پر آیا اس نے تمام افغانی قبایل کو متحد کیا اور ان کی مدد سے قندھار اور کابل پر قبضہ کیا اور افغانستان کی خودمختار سلطنت کی بنیاد ڈالی وہ اپنے کو نادر شاہ کے جانشین کی حیثیت سے پنجاب کا بھی حقدار سمجھتا تھا، وہ ایک زبردست فوج لیکر پنجاب میں داخل ھوا مگر سنہ ۱۷۴۸ع میں شکست کھاکر واپس ھوا۔

محمد شاہ نے اس سنہ میں وفات پائی اس کے بعد کئی بادشاہ تخت دھلی پر آئے لیکن ان میں حکومت کرنے کی کچھ بھی قابلیت نہیں تھی، دربار میں سازشوں کی بھرمار ھوگئی تھی، تخت کے بعض دعوے داروں نے مرھٹوں سے مدد لینے کی کوشش کی، جنہوں نے سارے شمالی ھند کو تباہ و تاراج کرکے رکھدیا۔ دھلی کے سربر آوردہ لوگوں اور اودھ اور روھیلکھنڈ کے سرداروں نے افغانستان سے مدد مانگی، اور سنہ ۱۷۶۱ع میں مغلوں اور افغانیوں نے ملکر پانی پت کے میدان میں مرھٹوں کو زبردست شکست دی، اس کے بعد چند سال تک افغانی نسل کا ایک شخص دھلی کا حقیقی حکمران ھوگیا تھا اور شاہ عالم (سنہ ۱۷۵۹ع تا سنہ ۱۸۰۶ع) نے بہار میں قیام کرنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد انگریزوں کے زیر سایہ الہ‌آباد کے قلعہ میں

اقامت اختیار کی ان حالات کو بہتر طریقہ پر سمجھنے کیلئے ہم کو یوروپ کی کمپنیوں کی تاریخ کی طرف توجہ کرنی پڑیگی ۔

کے مغربی ساحل کا جہاں تک تعلق ہے ' اس دور میں کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا ' بمبئی کے انگریزوں نے مرھٹوں سے دوستانہ تعلقات قایم کرلیے تھے ' اگرچہ کبھی کبھی سرحد پر ہمسایہ ریاستوں سے جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں ' اور ساحلی مقامات پر بحری قزاقوں کا حملہ ہوتا رہتا تھا ' تاہم یہ نوآبادی اپنی جگہ پر بڑی ترقی کر رہی تھی چند ہی دنوں میں اس کی آبادی اور اس کی دولت اور تجارت بہت بڑھ گئی تھی ' بنگال میں مقامی حکام سے اکثر ان کی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں ' اس کے باوجود سنہ ۴۲-۱ع کے بعد سے جبکہ صوبجات متوسط کے مرھٹوں نے بنگال پر حملے کرنے شروع کیے تھے کلکتہ کی آبادی بہت بڑھنے لگی تھی ' یہ حملے چند سال تک پے درپے ہو رہے تھے اور ان کی کہانی بہت ہی درد ناک ہے ہم گذشتہ باب میں بیان کرچکے ہیں کہ سترھویں صدی میں مرھٹوں کی ساری طاقت اور حکومت اسی لوٹ مار پر قایم تھی ' لیکن جب زرخیز زمینوں پر ان کا قبضہ ہوگیا اور مرھٹوں کی کئی ریاستیں قایم ہوگئیں اور ان کو کسی بڑے دشمن کا خطرہ نہیں رہا تو اب ان کے لوٹ مار کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی ' تاہم اس کا سلسلہ برابر جاری رہا ' سیواجی کے زمانہ میں ان کی بڑی روک تھام ہوتی تھی ' اور بڑے سے بڑے حملہ میں بھی ان کو عورتوں پر حملہ کرنے نہیں دیا جاتا تھا ' مگر بنگال کے حملوں میں کسی قسم کی کوئی اخلاقی بندش نہیں تھی ' قتل و خون ' لوٹ مار ' آتش زدگی اور عورتوں کی عصمت دری کے واقعات عام ہوگئے تھے ' اس دور کی ایک تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حاملہ عورتوں اور بچوں کے قتل کرنے سے بھی پرھیز نہیں کرتے تھے ' برھمنوں تک کو جان سے ماردیتے تھے ' لوٹ مار اور سنگین جرائم کا

ارتکاب کرنے میں وہ بڑے مشاق اور دلیر واقع ہوے تھے ' وہ نہتوں ' غریبوں ' عورتوں اور بچوں کو قتل کردیتے تھے انکا تمام مال اور ان کی دولت لوٹ لیتے تھے اور پاکدامن عورتوں کو اٹھا لیجاتے تھے دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کو خراب کرنے کے بعد ان کی ناک اور کان کاٹ لیتے تھے ' اور گھروں اور مندروں کو قصداً آگ لگا دیتے تھے ' بنگال کے لوگوں کے دلوں پر ایک طرح کا خوف اور ہراس طاری ہوگیا تھا اور وہ ہمیشہ دوسرے مقامات کو بھاگنے کی فکر میں رہتے تھے ۔ اس زمانہ میں کلکتہ ان کی حفاظت کا ایک اہم مقام بنا ہوا تھا ۔ *

اس دور میں کارومنڈل کے ساحل پر واقعۃ اہم واقعات ہو رہے تھے ' یہاں مدراس میں انگریز اور پھلچری میں فرانسیسی پرامن اور فائدہ مند تجارت میں مشغول تھے یہاں تک کہ یوروپ میں ان دونوں قوموں کے درمیان جنگ چھڑ گئی ' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۷۴۶ع سے لیکر سنہ ۱۷۴۸ع یعنی دو سال تک ہند کے اندر بھی انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ جاری رہی ' مدراس پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہوگیا تھا اور یوروپ کے صلحنامہ کے بعد انگریزوں کو واپس ملا ' اس وقت تک ان کا صدر مقام آگے جنوب میں فورٹ سینٹ ڈیوڈ ہوگیا تھا ' چونکہ یہ جنگ خاص یوروپ کی جنگ تھی اس لیے ہند پر اس کا کوئی بڑا اثر نہیں ہوا ' البتہ دیسی فوج پر فرانسیسیوں کی فوج کی برتری ظاہر ہوگئی ' جب فرانسیسیوں نے مدراس کا محاصرہ کیا تو انگریزوں نے آرکاٹ کے نواب سے مدد مانگی ' جس نے اپنی استطاعت کے مطابق ایک امدادی فوج روانہ کی ' جو زیادہ تر سواروں پر مشتمل تھی ان کا مقابلہ ان بندوقچیوں سے تھا جن کی تائید توپ خانہ سے ہو رہی تھی '

* دیکھو سرجادوناتھ سرکار کی کتاب بہار اینڈ اوریسہ ڈیورنگ دی فال آف دی مغل ایمپائر (مطبوعہ پٹنہ ۱۹۳۲) صفحہ ۳۶ - ۳۹

ظاہر ہے کہ بندوق اور توپ کے مقابلہ میں گھوڑے اور نہتے سپاہی کچھ کام نہیں دے سکتے تھے، اس لیے جسطرح سمندر پر یوروپ کی قوموں کا غلبہ ہوتا جارہا تھا اسی طرح زمین پر بھی ان ہی کی فوج کو کامیابی حاصل ہوتی جا رہی تھی۔

فرانسیسی فوج میں صرف یوروپین لوگ ہی نہیں تھے بلکہ ہندی فوج کے کئی دستے بھی شامل تھے، جن کی یوروپین افسروں ، بحیثیت پیادوں کے تربیت کی تھی، چنانچہ ہم سب سے پہلے سنہ ۲۰ء۱۷ع سے ساحل ملا بار کی فرانسیسی آبادی میں ہندی ...اہیوں کا وجود پاتے ہیں، ان کے دو دستے پھلچری لائے گئے تھے اور انہوں نے اس مذکورہ بالا جنگ میں حصہ لیا تھا، آخری سال انگریزوں نے بھی فرانسیسیوں کی پیروی کی اور بہت سے ہندی سپاہیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرلیا تھا اس کے بعد سے ہندی سپاہیوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی، اور ان کے دستے مغربی فوجوں کا ایک اہم جز بن گئے تھے۔

انگلستان اور فرانس کے درمیان صلح کی خبر نے جنوبی ہند میں ایک نازک صورت حال پیدا کردی تھی، کیونکہ ہند میں دونوں فریق کے پاس کافی فوج تھی، جن کی ان کو اب کوئی ضرورت نہیں تھی ان کو وطن بھیجنے کیلئے جہاز بھی موجود نہیں تھے، اور ان کو باقی رکھ کر بلا وجہ خرچ و اخراجات کا بار کمپنی پر نہیں ڈالا جاسکتا تھا، چنانچہ مدراس اور پھلچری کے گورنروں نے بذات خود یہ تدبیر اختیار کی کہ انہوں نے اپنی فوج کو ہند کی کسی ایک ریاست کے حوالے کردیا اور اس سے کہا کہ وہ اس کی خدمات سے فائدہ اٹھائے اور اس کے خرچ و اخراجات کا بوجھ اپنے ذمہ لے اس سلسلہ میں انگریزوں کا تجربہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا، مگر فرانسیسی گورنر جوسف ڈیوپلے نے جو طرز عمل اختیار کیا اس کی وجہ سے ہند کی آئندہ تاریخ بدل گئی، یہ شخص ایک مدت تک بنگال میں رہ چکا تھا،

اس کو حکومت کا کافی تجربہ تھا ، اور سنہ ۱۷۴۲ء میں وہ پھلچری کا گورنر ہوکر آیا وہ بہت ھی وسیع معلومات رکھتا تھا اور اس کے عزایم بہت بڑے تھے ، اس کو اچھی طرح محسوس ہوگیا تھا کہ اب جنوبی ہند کی ریاستوں میں بندوق اور توپ کے مقابلہ کی طاقت نہیں ھے ، چنانچہ اس نے تجارت کے ساتھ ساتھ ملک گیری کو بھی اپنے مقصد میں داخل کرلیا تھا ۔

یوروپ اور ہند کے درمیان باقاعدہ طور پر تجارت جاری تھی ، ہند کو چاندی کے سوا یوروپ کی کسی اور چیز کی کوئی ضرورت نہیں تھی ، اور اس کی وجہ سے فرانسیسی ذرایع آمدنی پر بہت بڑا بار پڑ رہا تھا ، اس لیے ڈیوپلے نے یہ خیال کیا کہ اگر کمپنی ہند کے اندر چند ایسے علاقے حاصل کرلے جن سے کافی آمدنی ہوجاے تو اس کو فرانس سے روپیہ منگوانے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ وہ انہی علاقوں کی بچی ہوی آمدنی سے چیزیں خرید کر ان کو یوروپ روانہ کرسکتا ھے اس نے کمپنی کے ارباب اقتدار سے کوئی منظوری لیے بغیر ھی اپنے اس خیال پر عمل کرنا شروع کردیا تھا اس کا ارادہ تھا کہ فتوحات کے حاصل کرلینے کے بعد ان کو اطلاع دے وہ سمجھتا تھا کہ اس ان کو اسپر کوئی اعتراض نہیں ہوگا ۔

ابتدا میں وہ سلطنت کی بجاے محض اقتدار اور رسوخ حاصل کرنا چاھتا تھا چنانچہ سنہ ۱۷۴۹ء میں اس نے حیدرآباد اور کرناٹک کے دو دعویداروں کی طرفداری کی ، حیدر آباد میں اس کو زبردست کامیابی ہوی ، کیونکہ سنہ ۱۷۵۰ء سے لیکر سنہ ۱۷۵۵ء تک اس کا نایب چارلس ڈی بسی اس ریاست کے تمام امور پر حاوی ہوگیا تھا ، اور اس ریاست کے وہ اضلاع جن کو شمالی سرکار * کہا جاتا ھے ، فرانسیسی فوج کے اخراجات کیلئے بطور جاگیر دے دئے گئے تھے ، مگر کرناٹک میں معاملات نے

---

* مغلوں کے نزدیک " سرکار ،، کے لفظ کے قریب قریب وھی معنی تھے جو آج " ضلع ،، کے لفظ کے لئے جاتے ھیں ۔

ایک دوسری شکل اختیار کرلی ' فرانسیسیوں کی ابتدائی کامیابیوں سے مدراس کے گورنر پر یہ واضح ہوگیا تھا کہ اگر انگریزی کمپنی کو اپنی تجارت باقی رکھنا ہے تو اس کو ضرور آرکاٹ کے نواب کی تائید کرنی چاہئے جس کو ہٹانے کا ڈیوپلے ارادہ کر رہا تھا ' چنانچہ اس علاقہ میں یوروپ کے اندر صلح ہونے کے باوجود سنہ ۱۷۵۱ع سے لیکر سنہ ۱۷۵۴ع تک انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ جاری رہی ' ان جنگوں کی تفصیل کے پیش کرنے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے ' مگر مجموعی حیثیت سے انگریزوں ہی کو غلبہ حاصل رہا ' اور فرانسیسیوں کی طرح ان کا فوجی وقار بھی ملک میں قایم ہوگیا ' اس کامیابی کا سہرا زیادہ تر رابرٹ کلائیو کے سر ہے ' جس نے اس جنگ میں بڑا نام کمایا تھا اور بعد کے دور میں اس کی بڑی اہمیت ہوگئی تھی ' سنہ ۱۷۵۴ع میں یہ جنگ ختم ہوی ' فرانسیسی کمپنی نے ڈیوپلے کو واپس بلالیا اور انگریزوں سے صلح کرلی ' اور کرناٹک میں کچھ دنوں تک کیلئے امن قایم ہوگیا تھا .

سنہ ۱۷۵۶ع میں حالات پھر بدل گئے ' یوروپ میں ہفت سالہ جنگ چھڑ گئی ' جس کی وجہ سے جنوبی ہند کے فرانسیسی حوصلوں اور ان کے عزایم کو بڑا زبردست نقصان پہنچا ' اور اسی زمانہ میں بنگال کے فرمانروانے کلکتہ کا شہر پکڑ لیا ' جس کی وجہ سے انگریزوں کو اس علاقہ میں شاہی اقتدار کے حاصل کرنے کے مواقع مل گئے - اس سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے ان کو ہم آئندہ باب میں بیان کرینگے .

باب ۳۴

کلائیو کی کارگذاریاں

جون سنہ ۱۷۵٦ء میں سراج‌الدولہ نے اچانک کلکتہ پر حملہ کیا ، وہ ایک نوجوان آدمی تھا اور صرف دو مہینے پیشتر اپنے نانا کی جگہ پر بنگال کا نواب مقرر ہوا تھا ، یہ نہیں معلوم ہے کہ اس حملہ سے اس کا اصل مقصد کیا تھا ، مگر وہ ایک ایسی طبیعت کا آدمی تھا کہ اس سے غیر معمولی افعال کا سرزد ہونا کچھ ناممکن نہیں تھا ، جنوبی ہند کے اندر جو واقعات ہو رہے تھے اس سے شاید اس کو اس کا اندازہ ہوگیا تھا کہ مغربی قومیں کرناٹک کے بعد بنگال پر بھی حملہ آورہونگی اور اگر وہ پہلے ہی سے اس کا تدارک نہ کرے تو شاید ان کا اقتدار یہاں بھی قایم ہوجائیگا ، اس لئے خود ہی ان کو اپنے ملک سے نکلوا دینا چاھتا تھا ، چنانچہ اس نے ایک ایسے وقت میں کلکتہ پر حملہ کیا جب کہ انگریزوں میں اس کی مدافعت کی بالکل طاقت نہیں تھی ، قلعہ کی فصیل بہت فرسودہ ہوچکی تھی ، اس کے اندر فوج کی تعداد بھی کافی نہیں تھی ، اور کوئی ایسا قابل سپہ‌سالار بھی نہیں تھا جو ایسے موقعہ پر ان کی صحیح رہنمائی کرسکتا ، گورنر اور اس کے بعض مشیر بندرگاہ میں لنگر ڈالے ہوے جہازوں کی طرف فرار ہوگئے ، انگریزی فوج میں دشمن کے مقابلہ کی تاب نہیں تھی ، چنانچہ تھوڑی بہت مدافعت کے بعد سب نے ہتھیار رکھدئے ، سراج الدولہ نے تمام انگریزوں کو رات بھر کے لئے ایک کمرہ میں بند کردیا جو ایک زمانہ سے سرکاری قید خانہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا بہت سے قیدی دم گھٹ کر مرگئے * ، اور جب یہ خبر مدراس پہنچی تو کلائیو فوراً ایک فوج لیکر بنگال پہنچا اور کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کرلیا ،

* تاریخ میں یہ کال کوٹھری (بلیک ہول) کے نام سے مشہور ہے ، موجودہ نظریہ یہ ہے کہ یہ واقعہ من گھڑت ہے ، دیکھو کیمبرج ہسٹری جلد پنجم صفحہ ۱۵٦

اور سراج الدولہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ، اسی اثناء میں یوروپ کے اندر ہفت سالہ جنگ چھڑ گئی ، بنگال کا نواب جو پہلے ہی سے کلکتہ کے کھوجانے کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف خار کھائے بیٹھا تھا ، فرانسیسیوں کی حمایت اور طرفداری پر اتر آیا ، اس نے ابھی پورا فیصلہ بھی نہیں کیا تھا کہ انگریزوں نے آگے بڑھ کر فرانسیسی نوآبادی چندر ناگور پر قبضہ کرلیا ، جس کے بعد سے ان کو کسی سے ڈرنے کی حاجت نہیں تھی ۔

اس درمیان میں ریاست کے دولتمند اور با اثر ہندووں کے ساتھ سراج الدولہ کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے ، اس سے پہلے کا فرمانروا ان کی بڑی عزت کرتا تھا ، اب انکو یہ ڈر ہونے لگا تھا کہ کہیں وہ ان کی دولت پر ہاتھ صاف نہ کرے ، بعض سربرآوردہ ہندو ساھوکاروں کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں ان کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جاے ، تمام افسران فوج سراج الدولہ سے بالکل ناخوش تھے ، اور وہ ہر ایک طبقہ میں غیر مقبول ہوگیا تھا ، ان حالات میں ہندووں نے ریاست کے اندر ایک انقلابی تحریک شروع کی ، اتفاق سے فوج کا ایک افسر میر جعفر اپنی برطرفی اور تذلیل کی وجہ سے نواب کا سخت مخالف ہوگیا تھا اور وہ نواب کی جگہ لینا چاہتا تھا ، انگریزوں کو جب یقین ہوگیا کہ ریاست کی انقلابی تحریک کامیاب ہونے والی ہے تو انہوں نے میر جعفر کی طرفداری کی ، کیونکہ اس نے بہترین اور مفید شرطیں پیش کی تھیں ، کلائیو تین ہزار سپاہیوں کی فوج لیکر نواب کے مقابلے کیلئے آیا اس کے ساتھ زیادہ تر مدراس کے تربیت یافتہ سپاہی تھے ، ۲۳ جون سنہ ۱۷۵۷ع کو پلاسی * کے میدان میں ایک زبردست معرکہ ہوا - جب انگریزوں نے زور و شور کے ساتھ حملہ کیا تو سراج الدولہ بھاگ نکلا ، چند دن بعد کلائیو نے میر جعفر کو بنگال کے تخت پر بٹھایا ، مگر یہ کمزور ، پست ہمت اور

* کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں سراج الدولہ کی فوج پچاس ہزار تھی ، جس میں سے کئی دستے میر جعفر کے ماتحت تھے مگر انہوں نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا ۔

حریص تھا ، اور اس نے بھی اپنے پیشرو کی طرح دولتمند ھندوؤں سے جبری طور پر زر حاصل کرنے کی کوشش کی ، حالانکہ وہ انھی کی مدد سے نواب بنا تھا ۔ کلائیو ان کی حفاظت کا پورا ذمہ لے چکا تھا ، چنانچہ دونوں نے کچھ دنوں تک سیاسی چالیں چلنی شروع کیں اور آخرکار کلائیو ھی کو کامیابی ھوی ، اب اس کی اھمیت بہت بڑھ چکی تھی ، اور وہ دوسرے ھی سال انگریزی مقبوضات کا گورنر ھوگیا ، سنہ ۱۷۵۹ع میں اس کو ولندیزیوں سے مقابلہ کرنا پڑا ، انھوں نے اس وقت تک ھند کی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا ، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ بنگال میں ان کا تجارتی مستقبل تاریک ھوتا جا رھا ھے اور کرناٹک کی طرح یہاں بھی انگریزی کمپنی کا رسوخ اور اقتدار بڑھتا جا رھا ھے تو بٹاویہ سے ان کا ایک بیڑا بنگال پہنچا تاکہ اپنی قوت کے زور سے اپنی تجارت کیلئے راستہ بنائیں ، کلائیو کے اشارہ پر میر جعفر نے انھیں ھوگلی کی بندرگاہ میں داخل ھونے سے روک دیا ، مگر جب انھوں نے بزور و قوت داخل ھونے کی کوشش کی تو ان کے جہازوں پر قبضہ کرلیا گیا ، اور ان کو سخت شکست ھوی اور پھر ان کو دب کر صلح کرنے پر مجبور کیا گیا

جب سنہ ۱۷۶۰ع میں کلائیو انگلستان واپس ھوا تو اس وقت کلکتہ ایک بڑی حد تک یوروپین دشمنوں سے محفوظ اور مصئون ھوگیا تھا ، مگر نواب کے ساتھ انگریزوں کے تعلقات اچھے نہیں تھے ، انگریزی فوج اگرچہ تعداد کے لحاظ سے بالکل کم تھی ، لیکن اس وقت کے حالات کے لحاظ سے اسی کو غلبہ حاصل تھا ، مگر بنگال میں اس کا اقتدار اور غلبہ ان آدمیوں کی وجہ سے نہیں تھا جن کو کلائیو اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا بلکہ وہ کلائیو کی شخصیت ، اس کی غیر معمولی فراست اور فوری تدبیر اور دوسروں پر اپنا حکم چلانے کی قوت کا نتیجہ تھا ۔

سلسلۂ بیان کو آگے بڑھانے سے پہلے ہمیں ان چند اخلاقی اعتراضات کی توضیح کرلینی چاہئے جو عموماً اس کی اس تین سال کی زندگی پر وارد کئے جاتے ہیں ۔

کلائیو نے خود لکھا تھا کہ اس دور کی تاریخ میں " لڑائی جعلسازی ' دھوکہ ' سیاسی چال اور لاٹ صاحب جانتے ہیں کیا کیا نہیں ہوا " * اس کا یہ نظریہ پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کیا جاسکتا ہے ' مگر خاص کر اس کی دو باتوں پر زبردست اعتراض کیا جاتا ہے ایک تو اس کا اور دوسرے افسروں کا میر جعفر سے اس کی تخت نشینی کے وقت گرانبہا رشوت کا قبول کرنا اور دوسری کلائیو کا مصالحت کی پیچیدہ گفتگو کے دوران میں ایک جعلی کاغذ تیار کرنا ' کہا جاتا ہے کہ کلائیو اور اس کے ساتھیوں نے تقریباً پانچ لاکھ اسٹرلنگ بطور رشوت وصول کیا تھا ' جس کے متعلق انگلستان میں بڑے شد و مد کے ساتھ تنقیدیں ہوی تھیں ' اس میں شبہ نہیں کہ اس کے ساتھ اکابر انگلستان کی مخالفت اور عداوت ایک حد تک اخلاص پر مبنی تھی ' لیکن ہم کو اٹھارویں صدی کی کڑی تنقیدوں کے پڑھتے وقت اس بات کو بھولنا نہیں چاہئے کہ اس زمانہ میں حق و صداقت کے پردہ میں شخصی اور سیاسی عداوتوں کو ظاہر کیا جاتا تھا ' اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس دور میں ہند کے اندر اس قسم کے عطیے غیر معمولی سمجھے جاتے تھے ' تمام افسروں کے لئے رشوت یا تحفوں کے ذریعہ ذاتی دولت کا جمع کرنا ایک معمول ہوگیا تھا ۔

دوسرے اعتراض کے متعلق بات صرف اتنی تھی کہ اس انقلابی تحریک کے دوران میں ایک بڑا ہندو ساہوکار جس کا نام اومی چند بتایا جاتا ہے ' محض اپنی ذاتی غرض کی بناء پر ایک منافقانہ روش اختیار کئے ہوے تھا ۔ وہ نواب کے ساتھ

* مورخ اورم Orme کے نام کلائیو کا خط بحوالہ کیمبرج ہسٹری جلد پنجم صفحہ ۱۵۱ ۔

گفت وشنید کرنا چاہتا تھا جس کو کلائیو تخت سے الگ کرکے اسپر میر جعفر کو بٹھانا چاہتا تھا ، اومی چند کو خاموش کرنے کیلئے اس کے سامنے ایک جعلی دستاویز پیش کیا گیا ، جس میں میر جعفر کے ساتھ معاہدہ کے شرایط تھے اس میں ایک شرط اومی چند کے متعلق بھی تھی جو اصل دستاویز میں موجود نہیں تھی ، انگلستان میں بجا طور پر کلائیو کے اس جعلی دستاویز پر بڑی لے دے ہوی تھی ، لیکن اس میں شبہ ہے کہ آیا ہند کے اس عہد کے سیاسی مدبر اس میں کوئی خامی یا غلطی محسوس کر رہے تھے ، کیونکہ ہندو عہد کی ان کتابوں میں جو حکمرانی کے متعلق لکھی گئی ہیں ، سیاسی فریب کو جائز قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کے عہد میں بھی سیاسی فریب کو جائز قرار دیا گیا ہے ، مسلمانوں کے عہد میں سیاسی فریب اور چالبازی ایک باقاعدہ فن بن گئی تھی جس میں اخلاقی اصول کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا ، اس جگہ اس امر کی توضیح کیلئے صرف دو مثالوں کا پیش کرنا کافی ہے ، اورنگ زیب نے جعلی خطوط کے ذریعہ راجپوتوں اور مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی تھی جو شہزادہ اکبر کی طرفداری میں اس کے مقابلہ کیلئے آئے تھے ، اسی طرح سیواجی کے قدیم ہندو سوانح نگار بیان کرتے ہیں کہ وہ سیاسی چالبازیوں کے پردہ میں بڑے بڑے دشمنوں کو قتل کروا دیتا تھا * اب اس بات کے خیال کرنے کیلئے کوئی سبب موجود نہیں ہے کہ اورنگ زیب اور سیواجی کے بعد اور کلائیو سے پہلے اخلاقی اصول کچھ بدل گئے تھے ، بلکہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی اخلاقی

---

* ہنومنت راؤ مور کے قتل کے متعلق سرکار نے اپنی کتاب سیواجی اینڈ ہز ٹائمز (مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۹) کے صفحات ۴۲ تا ۴۵ پر تفصیلی بحث کی ہے ، سری اے ال سری واستوا لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں سیاسی اخلاق بہت گرچکا تھا ، امیروں اور عہدہداروں کی زندگی میں کمینہ سازش ایک عام بات ہوگئی تھی ، اور اٹھارہویں صدی کے پہلے نصف میں ہند کے فرمانروا قول و قرار سے پھر جانا اور امن دیکر پھر قتل کردینا ایک معمولی بات سمجھتے تھے ، ان کے پاس ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی دیکھو دی فسٹ ٹو نوابس آف اودھ (مطبوعہ لکھنو ۱۹۳۳) صفحہ ۲۲۸ اور ۲۲۹ .

اصول کا کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا تھا ، اس سے ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں کلائیو نے در حقیقت ہند کے دستور ہی کی پیروی کی تھی اب یہ بات کہ آیا وہ اس قسم کے طرز عمل کے اختیار کرنے میں حق بجانب تھا ، اس کا فیصلہ کچھ ضمیر کے مطالعہ کرنے والے ہی کرسکتے ہیں .

کلائیو کے کلکتہ سے چلے جانے کے بعد میرجعفر اور انگریزوں کے درمیان ایک نازک صورت حال پیدا ہوگئی تھی کیونکہ وہ ان کے ہاتھ میں ایک کٹ پتلی بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا ، اس نے ولندیزیوں سے ساز باز کر رکھی تھی جو ایک بیڑا لیکر ہوگلی کی بندرگاہ میں آنا چاہتے تھے ، انگریزوں نے پہلے پہل مغل شہنشاہ سے دیوانی بنگال کی سند حاصل کرنے کا خیال کیا تھا لیکن بعد میں اس خیال کو ترک کردیا اور میر جعفر کو تخت سے ہٹا کر میر قاسم کو بٹھانے کا فیصلہ کیا ، چنانچہ انہوں نے جبرا اس کو تخت سے اتار کر میر قاسم کی نوابی کا اعلان کیا ، یہ شخص میر جعفر سے بھی زیادہ سخت اور مضبوط ثابت ہوا ، اس کے ساتھ انگریزوں نے اس قسم کا معاہدہ کیا تھا جس میں بہت سے مشکل مسائل کا تشفی بخش حل نہیں ہوا تھا ، اور جب میر قاسم نے سارے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی تو انگریزوں کے ساتھ اس کے سخت اختلافات شروع ہوگئے ، اس نے انگریزی کمپنی اور اس کے ملازموں کی تجارت میں روڑے ڈالنے شروع کیے یہ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ یہاں اس کے متعلق کچھ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے .

ایک زمانہ سے مغل شہنشاہ کے حکم کے مطابق کمپنی کی ان تجارتی اشیاء پر راہداری کا کوئی عام محصول نہیں لیا جاتا تھا ، جو بنگال میں سے ہوکر گذرتی تھیں - کمپنی کے ملازمین کا بھی یہ دعوی تھا کہ شہنشاہی حکم کے مطابق ان کی خاص تجارتی اشیاء بھی راہداری کے عام محصول سے مستثنی ہونی چاہئیں کمپنی اور نواب دونوں نے ان کے اس دعوی کو تسلیم نہیں

کیا ، پلاسی کی جنگ کے بعد میر جعفر نے احکام جاری کئے کہ اس مال پر جو انگریزی کارخانہ کے ناظم کے پروانہ راھداری کے ساتھ آئے کوئی محصول عائد نہ کیا جائے اس زمانہ میں اس پروانۂ راھداری کو ' دستک ' کہا جاتا تھا ، کمپنی کے ملازمین نے انھی پروانوں کو اپنی تجارتی اشیاء کی محصول کی معافی کے لئے بھی استعمال کرنا شروع کردیا تھا ' آگے چلکر یہ پروانے ھندی تاجروں کو بیچ دئے جاتے تھے اور وہ بھی ان پروانوں سے فائدہ اٹھانے لگے تھے میر قاسم نے ان ناجائز طریقوں کے خلاف سخت اعتراض کیا سمجھوتہ کی تمام کوششیں بیکار ثابت ھوئیں ، سنہ ۱۷۶۳ء میں حالات نے ایک نازک صورت اختیار کرلی جبکہ میر قاسم نے پٹنہ کے انگریزی کارخانے کو برباد کردینے کی دھمکی دی اس کارخانے کے انگریزی سردار نے شہر پر قبضہ کرلیا ، جس کو نواب کی فوج نے پھر سے واپس لیا ، کلکتہ سے ایک انگریزی فوج آئی اور اس نے میرقاسم کی فوج کو شکست دی ، اس نے اودھ کے نواب سے مدد مانگی اور اکتوبر سنہ ۱۷۶۴ء میں بکسر کا معرکہ پیش آیا ، جس میں مغل شہنشاہ شاہ عالم بھی شریک ھوا تھا ، اودھ کی فوج کو بڑی زبردست شکست ھوی ، میر قاسم فرار ھوگیا ، اور شاہ عالم نے انگریز فاتح سپہ سالار کی اطاعت قبول کرلی ۔

ادھر یہ ھو رہا تھا اور ادھر کلکتہ کے انگریزوں نے میر جعفر کو دوبارہ تخت پر بٹھادیا ، اور اسکی وفات سنہ ۱۷۶۵ء کے بعد اسکا بیٹا اسکا جانشیں ھوا ، مگر اسکی حیثیت محض ایک کٹ پتلی کی تھی ، کیونکہ معاھدہ کے مطابق اس کا وزیر اعظم انگریزوں کا نامزد ھوتا تھا ، جسکو انگریزوں کی منظوری کے بغیر معزول نہیں کیا جاسکتا تھا انھی دنوں میں کلائیو دوبارہ گورنر ھوکر کلکتہ آیا ، وہ سنہ ۱۷۶۵ء سے سنہ ۱۷۶۷ء تک یہاں مقیم رہا اس نے بنگال اودھ اور مغل شہنشاہ کے تمام معاملات کو بہتر طریقہ پر سلجھانے کی کوشش کی ، جو بکسر کی لڑائی کی

وجہ سے پیچیدہ ہوگئے تھے ' اگر فتوحات کی بنیاد پر بنگال اور بہار میں کمپنی کی بادشاہت کا اعلان کردیا جاتا تو بھی ہند میں کسی کو اعتراض کی کوئی گنجایش نہیں تھی ' لیکن اس صورت میں لندن کی پارلیمنٹ سے اختلافات پیدا ہوجاتے جو یوروپ کی سیاسی مشکلات کی بناء پر کمپنی کو حصول سلطنت کی اجازت نہیں دے رہی تھی ' اسکے علاوہ فرانسیسی ' ولندیزی اور یوروپ کی دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات کے کشیدہ ہوجانے کا خطرہ تھا ' اسلئے یہاں بادشاہت قایم کرنے کی بجاے ایک دوسرا رویہ اختیار کیا گیا ' انگریزوں نے اودھ کا وہ حصہ جو گنگا کے جنوب میں واقع تھا شاہ عالم کے حوالے کیا اس میں الہ آباد کا شہر بھی شامل تھا ' اور باقی پر اودھ کے نواب کو بحال کردیا گیا ' اب اس کی حیثیت ایک حلیف کی تھی ' اسکے صلہ میں شہنشاہ نے کمپنی کو بنگال اور بہار کا دیوان یعنی ناظم مالگذاری تسلیم کرلیا ' یہ یاد ہوگا کہ اکبر نے صیغۂ مالگذاری کو عام امور سلطنت سے بالکل الگ کردیا تھا ' اگرچہ اسکی باقاعدہ پابندی نہیں ہوتی تھی ' تاہم شاہ عالم کے زمانہ تک کم و بیش یہی دستور جاری رہا ' کمپنی کو دیوان بنا دینے کا یہ مطلب تھا کہ بنگال میں اسکو خصوصی اختیارات حاصل ہوجائیں ' وہ پہلے ہی سے نواب کے ساتھ ملکر امور سلطنت کا عام انتظام کر رہی تھی ' اب بنگال اور بہار کی پوری مالگذاری پر اسکا قبضہ ہوگیا اسکا ایک حصہ البتہ شاہ عالم اور نواب بنگالہ کو ہر سال دینا پڑتا تھا .

سنہ ۱۷٦۷ع میں کلائیو پھر انگلستان واپس ہوگیا اسوقت شمالی ہند کی سیاسی صورت حال وہی رہی جسکا اوپر بیان ہوا اگرچہ بنگال پر انگریزوں کا باقاعدہ قبضہ نہیں تھا تاہم حقیقت میں وہی اسکے مالک تھے ' اسکے مغرب میں شاہ عالم اور نواب اودھ کی دو حلیف ریاستیں تھیں ' ان سے آگے اور ریاستیں بھی

تھیں جن کا ذکر پہلے ہوچکا ہے کچھ دن کیلئے یہ انتظام جاری رہا ، مگر یہ دیرپا نہیں رہا ، اب ہم شمالی ہند کو چھوڑ کر جنوبی ہند کی طرف متوجہ ہوتے ہیں .

ہفت سالہ جنگ کی وجہ سے مدراس میں بڑے تغیرات رونما ہوے پہلے پہل یہاں کوئی جنگ نہیں ہو رہی تھی ، کیونکہ اس وقت فرانسیسی فوجیں حیدرآباد میں پڑی ہوی تھیں ، اور انگریزوں کی فوجیں کلائیو کے ساتھ بنگال چلی گئی تھیں ، جب یوروپ سے دونوں کی امدادی فوجیں پہنچ گئیں تو سنہ ۱۷۵۸ع سے یہاں بھی جنگ کا سلسلہ جاری ہوگیا انگریز سمندر پر حاوی ہوگئے ، اور انہوں نے جنوری سنہ ۱۷٦۰ع میں وندواسی کے میدان میں فرانسیسی فوجوں کو زبردست شکست دی ، دوسرے سال پھلچری بھی فتح ہوگیا ، اس کی وجہ سے کرناٹک میں انگریزوں کا اقتدار قایم ہوگیا ، حیدرآباد سے بھی فرانسیسیوں کا رسوخ جاتا رہا ، اور جب کلائیو نے شاہ عالم سے معاہدہ کیا تو جنوبی ہند پر بھی اس کا اثر پڑا ، کرناٹک حیدرآباد کے قبضہ سے نکال لیا گیا ، اور شمالی سرکار یعنی ساحلی اضلاع جن پر ایک زمانہ تک فرانسیسیوں کا قبضہ تھا ، انگریزوں کے حوالے کردیے گیے ، سنہ ۱۷٦٦ع میں مدراس کے انگریزوں اور حیدرآباد کے نظام کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا جس کے ذریعہ دونوں نے وقت ضرورت ایک دوسرے کی امداد کا پکا وعدہ کیا اور وہ ایک دوسرے کے حلیف قرار پائے ، اس معاہدہ کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ دونوں ملکر میسور کے بڑھتے ہوے خطرہ کا سد باب کریں .

حیدر علی ایک غیر معمولی قابلیت کا جانباز تھا ، اور وہ اس وقت میسور کا حقیقی بادشاہ بن چکا تھا ہندی روایات کے مطابق وہ اپنی سلطنت کو بڑھانے اور وسیع کرنے کا آرزومند تھا ، شمال میں مرہٹے اور نظام اس کے دو بڑے دشمن تھے ، مشرق میں کرناٹک کی ریاست تھی ، جس کا حکمران عملاً انگریزوں کا دست نگر تھا ، اس طرح اس دور میں چار اہم ریاستیں وجود میں

آئی تھیں جو ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہوتی تھیں' ان میں سے ایک یا کئی آپس میں متحد ہوکر دوسروں کے خلاف صف آرا ہونے کی کوشش کرتی تھیں ' اس کی وجہ سے بڑی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہوتی تھیں اور ان کے جوڑ توڑ کیلئے سیاسی چالیں چلی جاتی تھیں سنہ ۱۷٦۷ع کی ابتدا میں انگریزوں نے میسور کے خلاف نظام کی مدد کی ' مگر آگے چلکر وہ لڑائی سے الگ ہوگیا ' اس وجہ سے ان کو تن تنہا حیدر علی کا مقابلہ کرنا پڑا ' آخر میں دو سال بعد میسور کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا جو چند سال تک قایم رہا ' اس کے بعد پھر لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا یہانتک کہ انگریز اخر میں کامیاب ہوے اور سارے کرناٹک پر ان کا قبضہ ہوگیا .

باب ۳۵

اٹھارویں صدی میں ہند کی حالت

جب سنہ ۱۷۶۷ع میں کلائیو ہند سے واپس ہوا تو اس وقت بنگال میں کمپنی کا اقتدار قایم ہوچکا تھا ' اور انگریزوں نے جنوبی ہند کی کشمکش میں حصہ لینا شروع کردیا تھا ' جس کا نتیجہ آگے چلکر پورے ہند کی تسخیر کی صورت میں نمودار ہوا ' اس کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے بہتر ہے کہ اٹھارویں صدی کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاے ' اس دور کی سیاسی زندگی کا ایک نقشہ تو اوپر پیش کیا جاچکا ہے ' ہر جگہ حق کی بجاے طاقت اور قوت ہی کو غلبہ حاصل تھا ' عام معاملات میں اخلاقی اصول کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا ' جنگ کے متعلق یہ بات ثابت ہوچکی تھی کہ یوروپ کے ایک قابل سپہ سالار کے ماتحت مغربی طرز پر تربیت پائی ہوی فوج ہند کی بڑی سے بڑی فوج کو بھی شکست دے سکتی ہے ' ہند کی افواج نے بھی اس سے بہت بڑا سبق حاصل کیا تھا اور اب اس صدی کے آخر میں ان کی تربیت بھی اسی انداز پر کی جانے لگی تھی ' ہند میں سپہ گری کو ایک معزز بلکہ فائدہ مند پیشہ خیال کیا جاتا تھا ' یہاں کے سپاہی محض حب وطن کی خاطر نہیں لڑتے تھے ' اورنگ زیب کی فوج میں مرہٹے سپاہی اور سردار داخل تھے ' مرہٹے اور مغل انگریزوں کی فوجی خدمات حاصل کرتے تھے ' انگریزی کمپنی میں ہندی سپاہیوں کا فوجی خدمات کو قبول کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا ' اس کی حیثیت صرف ایک پیشہ کی ہوگئی تھی ۔

ہند کے اندر سرکاری عہدہ داروں کے ذریعہ حکومت کی جاتی تھی ' بادشاہ اور وزیر اپنے ماتحت عہدہ داروں اور افسروں کے ذریعہ اپنے فرامین جاری اور ان کو نافذ کرتے تھے ' وہ عوام کی بجاے اپنے اعلی حکام کے سامنے ذمہ دار ہوتے تھے ' تاہم

یوروپ کی طرح ان کے اختیارات محدود نہیں تھے ' اگر کوئی افسر بالا کی مرضی حاصل کرلیتا تو اس کو وسیع اختیارات مل جاتے تھے ' تنخواہ سے زیادہ نذرانوں ' تحفوں اور رشوتوں کی آمدنی ہوتی تھی اور اس طرح ایک لائق اور قابل شخص آسانی سے کثیر دولت جمع کرلے سکتا تھا ' کسی عہدہ دار کی مدت ملازمت متعین نہیں تھی ' اگر کوئی شخص بڑے عہدے پر پہنچ جاتا تھا تو وہ اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے اور اپنے رقیبوں کو شکست دینے کیلئے اپنا سارا وقت اور روپیہ صرف کرتا تھا ' اور ساتھ ھی ساتھ اپنی ترقی کی کوشش میں جوڑ توڑ اور ساز باز کرنے میں لگا رھتا تھا ' عوام کی بہبودی اور بھلائی کی بہ نسبت اپنا ذاتی مفاد اس کے پیش نظر رھتا تھا ' سترھویں صدی تک نقد تنخواہ کی بجاے جاگیروں کے دینے کا دستور جاری رھا ' اورنگ زیب کے آخری زمانہ میں یہ طریقہ غیر مقبول ھوگیا تھا ' کیونکہ کسی کو اس کا یقین نہیں تھا کہ کسی جاگیر پر اس کا مستقل قبضہ رھیگا بعد کی مسلمان ریاستوں میں بھی نقد تنخواھوں کے دینے کا دستور جاری ھوگیا تھا صرف مرھٹوں کی ایک ریاست ایسی تھی جس میں جاگیروں کے دینے کا دستور اب بھی جاری رھا ۔

اس زمانہ کے طریقہ حکومت پر یہ مثل صادق آتی تھی ' پہلے لات پیچھے بات ' تمام فیصلے فوری ' مختصر اور سخت ہوتے تھے ' اسی جگہ فیصلوں میں تاخیر کی جاتی تھی جہاں کچھ رقم ملنے کی امید ھوتی تھی ' ایسی حالت میں ایک معمولی معاملہ کئی دن تک کھنچتا ھوا چلا جاتا تھا ' کوڑے کا استعمال عام تھا ' یہ صرف بطور سزا کے استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ جرم کا قبال کرانے کیلئے بھی اس کو کام میں لایا جاتا تھا ' اس کے استعمال میں کوئی حد بندی نہیں تھی ' اس لئے ایک مقامی حکمران بھی اس کے استعمال میں بالکل آزاد ھوتا تھا ۔

بد امنی کی وجہ سے ملک کی اقتصادی حالت بالکل مخدوش ھوچکی تھی ' کیونکہ کہیں بھی جنگ چھڑسکتی تھی ' اور لٹیرے

ہر وقت لوٹ مار کرنے میں مشغول رہتے تھے ' قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اور جگہوں سے زیادہ مرہٹوں کی ریاست میں جان و مال کی بڑی حفاظت تھی ' دوسری جگہوں میں مرہٹے ہی سب سے زیادہ خطرناک لوگ تھے' بنگال کی طرح وہ دوسرے علاقوں میں بھی لوٹ مار اور ہنگامے مچاتے رہتے تھے ' سنہ ۱۷۸۸ع کے قریب لکھی ہوی ایک تاریخ * سے پتہ چلتا ہے کہ مہادجی سندھیا کے عہدہ دار صوبجات متحدہ کے مغربی علاقہ کے قحط زدہ اور غریب کاشتکاروں سے غیر انسانی طریقہ پر روپیہ وصول کرتے تھے چنانچہ ایک لگان وصول کرنے والے نے امیروں اور غریبوں دونوں کو چتھیڑوں میں لپیٹ کر اور ان پر تیل چھڑک کے ان کو آگ لگادی تھی' لوگوں کی مختلف ٹولیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ غذا کی تلاش میں ماری ماری پھرتی تھیں ' قحط اور چوری کے علاوہ ان لٹیروں کی ہنگامہ آرائی نے لوگوں پر ان کی زندگی تنگ کردی تھی ' راجپوتانہ کے سرداروں اور کاشتکاروں کے لئے بھی یہی مرہٹے ایک دہشت بنے ہوے تھے' ان دونوں بہادر قوموں کی آپس کی جنگجوئی نے کمپنی کے لئے اس کے اقتدار کا راستہ صاف کردیا تھا ' اور اس کی وجہ سے پورے ملک کی تسخیر میں آسانی پیدا ہوگئی تھی '

اس زمانہ کے نوشتہ جات سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ کاشتکاروں کی حالت اکبر کے زمانہ سے بلکہ تمام زمانوں سے بھی بدتر ہوگئی تھی ' اکبر کے زمانہ میں کم از کم امن قایم تھا اور لوگ اطمینان کے ساتھ زراعت کی طرف توجہ کرسکتے تھے ' اگرچہ لگان کی شرح بہت زیادہ تھی ' مگر اس کی تشخیص اور اس کے وصول کرنے میں زیادہ سختی نہیں برتی جاتی تھی ' اور ہر جگہ ایک ہی معیار قایم تھا اٹھارویں صدی میں لگان کی شرح اکبر کے زمانہ سے بھی بہت بڑھی ہوی تھی ' قریب

* دیکھو جی - ایس سردیسائی G. S. Sardesai کی کتاب " مین کرنٹس آف مرہٹہ ہسٹری " (مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۳) صفحات ۱۰۸ تا ۱۸۰

قریب پیداوار کا آدھا حصہ بطور لگان وصول کرلیا جاتا تھا ' عملاً کسی خاص شرح کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا ' بلکہ جو کچھ بھی جبری طور پر وصول ہوسکتا تھا وصول کرلیا جاتا تھا ' چند دن کے بعد کسی دوسرے دعویدار سلطنت کے محصل پہنچتے تھے اور وہ بچا کھچا ہوا مال لوٹ لے جاتے تھے ' اس زمانہ میں دولت جمع کرکے رکھنا گویا ان لٹیروں کو دعوت دینا ہوتا تھا ' جانبازوں کیلئے زراعت سے بہتر لوٹ مار کا پیشہ سودمند دکھائی دیتا تھا .

اگرچہ هند کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد نے لڑائی اور ڈاکہ زنی کو اپنا پیشہ بنالیا تھا ' تاهم ملک کی اقتصادی زندگی کاشتکاروں هی پر منحصر تھی اگر هم نے مسلمانوں کی سلطنت کے زمانہ میں زراعت کی ترقی کے متعلق کچھ نہیں لکھا تو اس کا سبب یہ هے کہ کچھ لکھنے کیلئے کوئی اهم بات هی موجود نہیں تھی ' پیداوار اور زراعت کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں هوی تھی ،هر ایک چیز پرانے ڈھرے پر چلی جارهی تھی ' پرتگالیوں نے مکئی ' آلو اور تمباکو کی کاشت کا طریقہ امریکہ سے سیکھ کر هند والوں کو بتادیا تھا ' لگان کی تشخیص اور وصولی کے طریقہ میں البتہ ایک نمایاں تبدیلی هوگئی تھی ' هم پڑھ چکے هیں کہ اکبر کے زمانہ میں مقررہ احکام کے مطابق سرکاری حکام فرداً فرداً هر ایک کاشتکار کے لگان کی تشخیص اور تعیین کرتے تھے ' سترهویں صدی کے وسط میں یہ طریقہ متروک هوگیا تھا اس کی بجاے عام طور پر ایک ایک قریہ پر لگان کی تشخیص اور تعیین کا دستور جاری هوا زرعی سال کی ابتدا میں لگان کی تشخیص کرنے والے هر ایک گاؤں کے چودھری کے پاس پہنچکر لگان کی جملہ رقم متعین کردیتے تھے ' اور چودھری هر ایک کاشتکار سے متعینہ رقم وصول کرلیتا تھا ' اگرچہ هر ایک قریہ میں اس تعیین کا معیار بدلتا رهتا تھا ' تاهم هر ایک کاشتکار کے ساتھ انصاف برتنے کی کوشش کی جاتی تھی .

سترھویں صدی کے آخر میں لگان کی وصولی کے طریقہ میں ایک اور تبدیلی ہوی ' ایک یا ایک سے زیادہ قریوں کی جملہ مالگذاری چند سال کی مدت کیلئے متعین کرلی جاتی تھی ' کسی سرکاری عہدہ دار کی بجائے ایک کاشتکار ہر سال چودھری کے ساتھ ایک سمجھوتہ کرلیتا تھا اور خود ہی پورا لگان ادا کردیتا تھا اٹھارویں صدی میں مختلف تعلقداروں کے آپس میں جو کشمکش جاری تھی اس پر اس تبدیلی کا بڑا اثر پڑا ' ہر ایک اپنے اپنے دائرہ رسوخ کو وسیع کرنے میں مصروف ہوگیا تھا ' چودھری اب تک یہ سمجھتے آئے تھے کہ ان کی مالگذاری کے بدلہ ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی ' اور جب حکومت میں ان کی حفاظت کی طاقت نہیں رہی تو وہ اپنی مالگذاری اس شخص کو دینے کے لئے آمادہ ہوگئے جو ان کی حفاظت کا ذمہ لے سکتا تھا ' اس کی وجہ سے ایک حوصلہ مند جانباز کیلئے راستہ کھل گیا تھا ' بسا اوقات ایک قلعدار اپنے سپاہیوں کی مدد سے ایک قریہ کی حفاظت کرتا تھا اور اس کے صلہ میں وہ اس قریہ کی پوری مالگذاری کا حقداربن جاتا تھا ' اور پھر اس مالگذاری سے وہ اپنی طاقت اور قوت کو بڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہانتک کہ ایک زمانہ ایسا آتا تھا جبکہ وہ اپنی مالگذاری کو روک لیتا تھا اور خود مختار سردار کی حیثیت اختیار کرلیتا تھا۔

اس قسم کا طرز عمل سب سے پہلے ان لوگوں نے اختیار کیا جو پہلے ہی سے چھوٹے بڑے رقبہ کے زمیندار تھے ' ہر ایک زمیندار اپنے اپنے رسوخ کے دائرہ کو وسیع کرنے لگا تھا اور ان قریوں پر بھی قابض ہونے لگا تھا جن کے ساتھ اس کو پہلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا ' اس درمیان میں زمینداریاں بھی موروثی ہوگئی تھیں ' اسطرح کہ کاشتکاروں اور زمینداروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا تھا ' ایک شخص چھوٹے بڑے رقبہ کے کاشتکاروں پر حکومت کرنے لگا تھا ' یہاں اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ

حکومت ان کو کس طرح ملتی تھی ' البتہ یہ بتانا ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر میں زرعی نظام کی چولیں ڈھیلی پڑگئی تھیں ' سارے ملک میں چھوٹے بڑے زمیندار پائے جاتے تھے جن کو اپنے کاشتکاروں پر ایک بادشاہ کے سے تھوڑے بہت اختیارات حاصل تھے ' کبھی تو یہ زمیندار اپنے سے بڑی قوت اور طاقت کے سامنے سر جھکا تے تھے اور کبھی ان کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے تھے ۔ کمپنی کے برسر اقتدار آنے تک ملک کے تمام زمینداروں کی یہی حالت تھی ' اس نے ان میں سے بعض کو ایک ریاست کے راجہ اور بعض کو محض ایک زمیندار اور جاگیردار کی حیثیت دی ' یہ لوگ کمپنی کے ماتحت ہوکر اپنے اپنے علاقہ میں خودمختار ہوگئے تھے ' راجاؤں اور زمینداروں کے درمیان یہ تفریق کسی منطقیانہ اصول پر مبنی ہونے کی بجائے اس زمانہ کے حالات کے مطابق تھی ۔ اور جیسا کہ ہم پچھلے باب میں بیان کرچکے ہیں یہ محض قسمت ہی تھی کہ ان میں سے کوئی راجہ اور بادشاہ ہوکر نکلتا تھا جس کو اپنی ریاست کے اندر کاشتکاروں پر لگان کے مقرر کرنے اور ان سے وصول کرنے کا پورا حق حاصل تھا ۔ اور بعض محض زمیندار تھے جو اپنے علاقے کے کاشتکاروں سے لگان وصول کرتے تھے اور حکومت کو مالگذاری ادا کرتے تھے ۔

مالگذاری کا یہ اصول زیادہ تر ان ریاستوں پر منطبق ہوتا ہے ' جو مغلیہ سلطنت کے جانشیں ہوے مرھٹوں اور جنوبی ہند کی ریاستوں میں اگرچہ وسیع پیمانہ پر کاشت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی تاھم کاشتکاروں کے ساتھ سرکاری حکام کا تعلق بالکلیہ منقطع نہیں ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ انگریزی حکومت کی ابتدا میں زمینداری اور رعیت واری کے دو طریقوں پر عمل ہوتا رہا ۔ شمالی ہند میں عام طور پر زمینداری کا طریقہ تھا جس میں سرکار اور کاشتکاروں کے درمیان

زمیندار واسطہ بنتا تھا، جنوبی ہند میں یہ بات نہیں تھی، یہاں سرکار کا کاشتکاروں کے ساتھ براہ راست تعلق ہوتا تھا، اور سرکاری حکام ہی ہر ایک سے لگان وصول کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی میں معدنیات کی پیداوار بہت گھٹ گئی تھی، پرانی کاریگریوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں سونا اور غالباً چاندی نکلتی تھی۔ لیکن یہ زمانہ ترکوں کی فتوحات سے پہلے ہی کا ہوگا گولکنڈہ میں ہیروں کی وہ کانیں جن سے سترھویں صدی میں کافی پیداوار ہوتی تھی اب بیکار ہوچکی تھیں جواہرات کی پیداوار بھی بہت کم تھی۔ البتہ جنوبی ہند کے آخری حصہ میں سمندر سے موتیوں کا اخراج جاری تھا، راجپوتانہ اور وسط ہند کی کانوں سے شمالی ہند کو کافی مقدار میں تانبا ملتا تھا، مگر سترھویں صدی میں اس کی پیداوار کم ہوگئی تھی، اب یہ دھات زیادہ تر باہر سے ہند کو آنے لگی تھی بہت سے مقامات پر عمدہ لوہے اور فولاد کی کانیں پائی جاتی تھیں، لیکن کوئلے کی کانوں کا اب تک کہیں پتہ نہیں تھا۔ اس لئے لوہے کی صنعت دوسرے ممالک کی طرح کوئلے کی فراہمی پر منحصر تھی لوگ کانوں کے قریب کے جنگلوں کو کاٹ کر لوہے اور فولاد کو پگھلاتے تھے، اور جب یہ جنگل ختم ہوجاتے تو اس جگہ کو چھوڑ دینا پڑتا تھا یہانتک کہ وہاں پھر جنگل اگ آئیں اگرچہ ہند کے اکثر مقامات میں لوہا پایا جاتا تھا لیکن وہ نسبۃً گراں تھا یہی وجہ ہے کہ یہاں کاشت اور صنعت کے اندر اس دھات کو بڑی کفایت شعاری کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا۔ دوسری معدنیات میں نمک اور شورہ زیادہ اہم تھا۔ پنجاب میں نمک کی کانیں تھیں اور دوسری جگہوں پر بھی سمندر کے پانی سے نمک بنایا جاتا تھا ہر جگہ اس پر غیر معمولی محصول لگایا جاتا تھا، بعض جگہوں پر نمک کا اجارہ حکومت ہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا ملک کی اندورنی تجارت میں اس کی

بڑی اہمیت تھی اور سارے ملک میں اس کی تقسیم ہوتی تھی چونکہ شورہ بارود کے بنانے میں کام آتا تھا ، اس لیے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی ، مختلف مقامات میں مٹی کو کیمیائی طریقہ پر چھان کر شورہ حاصل کیا جاتا تھا اس زمانہ میں بہار کا صدر مقام پٹنہ شورہ کی بر آمدی تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا ، یہاں بہت سی کمپنیاں قائم تھیں ' جو مال فراہم کرکے یوروپ بھیجا کرتی تھیں .

بنگال میں تجارتی سامان زیادہ تر کشتیوں کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا تھا ، دوسری جگہوں پر یہ مال سڑکوں کے ذریعہ پہنچتا تھا ' یہ سڑکیں پختہ نہیں ہوتی تھیں بلکہ ایک مسطح راستہ ہوتا تھا جسکے دونوں طرف سایہ دار درخت ہوتے تھے ، اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کنویں اور سرائیں بنوائی گئی تھیں ' مغلوں کے زمانہ کی پولیس کی چوکیوں کا طریقہ درھم برھم ہوچکا تھا ' جہاں کہیں جو چند چوکیاں رہ گئی تھیں ' وہ در حقیقت لوٹ مار کی ایجنسیاں بن گئی تھیں ' بڑے بڑے تاجروں کو اپنے تجارتی قافلہ کے ساتھ محافظ فوج کا ایک دستہ بھی رکھنا پڑتا تھا ، اور جس تاجر کے پاس محافظ فوج کا دستہ نہیں ہوتا وہ چند آدمیوں کو اپنے مال کی حفاظت اور ان لوگوں کے مقابلہ کیلئے جو اپنی حکومت جتاکر عبوری محصول وصول کرتے تھے ' اپنے ساتھ لیجاتا تھا ، بعض جگہ تجارتی سامانوں کے لیجانے کیلئے بیل گاڑیاں استعمال کی جاتی تھیں ' مگر عام طور پر باربرداری کے جانور کام میں لائے جاتے تھے ' اناج اور غلہ کی تجارت بنجاروں کے ہاتھ میں تھی ' جو ایک خانہ بدوش قوم تھی ' اسکے پاس کافی سرمایہ اور باربرداری کے بے شمار جانور ہوتے تھے ' اٹھارویں صدی میں انکی تجارت زیادہ تر ان فوجوں کے ساتھ تھی جو ادھر سے اودھر گھومتی پھرتی تھی' وہ ان فوجوں کو سامان رسد پہنچاتے تھے ' ہند کی برطانوی فوجوں کی تاریخ میں ان بنجاروں کے زبردست قافلے بہت زیادہ مشہور ہیں اور

ابتدا میں سامان رسد کیلئے انکا سب سے بڑا اعتماد ان ہی بنجاروں پر تھا ۔

معمولی دستی صنعت کاریوں کے متعلق ہم کو کچھ بھی اطلاع نہیں ہے ' مگر بجا طور پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ زراعت کی تبہ حالی اور راستہ کے خطرات کی وجہ سے ان پر زوال آگیا تھا ' وہ کاریگر جو پردیس بھیجنے کیلئے مال تیار کرتے رہے ' مغربی نو آبادیوں میں بسنے لگے تھے جہاں انکے مال کی زیادہ کھپت ہوتی تھی اور انکے جان کی نسبتاً زیادہ حفاظت ہوتی تھی ' بد امنی کی وجہ سے ملک کی اندرونی تجارت کی بہ نسبت بر آمدی تجارت کو بہت کم نقصان پہنچا ۔ بر آمدی اشیاء میں کپڑا سب سے زیادہ اہم تھا ' مگر یوروپ کے اندر اس کی مانگ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی ' سترھویں صدی کے وسط میں یوروپ کے اندر سادہ چھینٹ کی زیادہ مانگ تھی ' کیونکہ یوروپ ' امریکہ اور مغربی آفریقہ میں اس سے گھریلو پوشاکیں بنائی جاتی تھیں ' رنگین اور چھپا ہوا کپڑا زیب و زینت اور آرائش کیلئے مستعمل ہوتا تھا ' آگے چلکر انگلستان میں عمدہ ململ اور چھپے ہوے کپڑے کی بڑی مانگ ہوگئی تھی ' اور بہت زیادہ مقدار میں یہ کپڑا وہاں بھیجا جانے لگا تھا ' اسکے ساتھ ساتھ خود انگلستان میں بھی کپڑے کی چھپائی کا کام شروع ہوگیا تھا ' اور سنہ ۱۷۰۰ع میں ہند کے چھینٹ کے چھپے ہوے اور رنگین کپڑے کے استعمال کو قانوناً ممنوع قرار دیا گیا تھا ' تاکہ انگلستان کی ترقی پذیر صنعت کو فروغ ہو اور اس کا تحفظ ہوجائے اس قسم کی حفاظتی تدبیر اس زمانہ کے ماہرین اقتصادیات کی بہ نسبت آجکل کے لوگوں کو ایک قدرتی بات نظر آتی ہے ' لیکن باہر بھیجنے کیلئے مال کے در آمد کرنے کی اب بھی اجازت تھی ' ان حفاظتی تدابیر سے کپڑے کی تجارت کو مجموعی حیثیت سے بہت زیادہ نقصان نہیں پہنچا ' مگر اسکا زمانہ ختم ہونے آرہا تھا کیونکہ بخار کی طاقت سے چلنے والی مشینوں کی ایجاد نے

ہند کی دستی صنعت کاریوں کا خاتمہ کردیا ' اسلئے کہ دستی کاریگر ان مشینوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے ' سوتی کپڑے اور شورہ کے علاوہ ایک اہم تجارت بنگال ملک کی بھی تھی ' انگلستان کی صنعت کو ترقی دینے کیلئے ہند کے ملک کی تجارت پر بھی پابندیاں عائد کردی گئی تھیں ' لیکن خام ملک ابھی تک ہند ہی سے خریدا جاتا تھا .

یوروپین تجارت زیادہ تر کمپنیوں کے جہازوں کے ذریعہ ہوتی تھی ہند کے جہاز حسب دستور ایشیائی سمندروں میں چکر کاٹتے تھے اس بات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ہند والوں کی ملکیت میں کتنے جہاز تھے ' کیونکہ اس دور کے تمام جہازوں کو جو ہند کی مغربی قوموں اور ہندوؤں مسلمانوں اور آرمینیوں کے قبضے میں تھے ' ملکی جہازوں کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا ' ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ جہاز رانی بڑے زوروں پر تھی ' اس صدی کا ایک اہم واقعہ ہند اور چین کے درمیان براہ راست بحری تجارت کا دوبارہ قایم ہونا ہے ' ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ کسطرح براہ راست تجارت کا پرانا طریقہ ختم ہوگیا تھا ' سولھویں صدی میں پرتگالی جہاز ہند اور مکاؤ کے درمیان جو چینی دریاے کینٹن کے دھانہ پر واقع تھا ' آمد و رفت رکھتے تھے ' لیکن ہند کے باشندوں کو بالراست تجارت کرنے کی اجازت نہیں تھی ' پرتگالیوں کی جہاز رانی کے زوال کے بعد براہ راست تجارت کا یہ طریقہ ختم ہوگیا ۔ اور دوسری جگہوں کے ولندیزی بندرگاہوں کے ذریعہ چین کے ساتھ تجارت ہونے لگی تھی ' سترھویں صدی کے خاتمہ پر کینٹن کی بندرگاہ سب کیلئے کھل گئی تھی اور یہاں کمپنیوں کے جہازوں کے علاوہ ملکی جہاز بھی آنے لگے تھے ' یہ ملکی جہاز خاص کر ہند سے افیم لے جاتے تھے ' جس کی چین میں شہنشاہ چین کی ممانعت کے باوجود بہت بڑی مانگ تھی .

اس تجارت کا ایک بڑا حصہ ارمینی تاجروں کے ہاتھ میں تھا ' جو کلکتہ میں بس گئے تھے ' ہم پہلے پہل آرمینیوں کو

شمالی ہند اور مغربی ممالک کے درمیان زمینی راستوں سے تجارت کرتے ہوے دیکھتے ہیں ' ان میں سے بعض مشرقی ساحل پر ولندیزیوں کے آنے سے پہلے بس گئے تھے ' اور بعض نے گجرات کے اندر بود و باش اختیار کرلی تھی ' پھر جب کلکتہ کی نوآبادی بڑھنے لگی تو انہوں نے یہاں آکر تجارت کرنی شروع کی اور چونکہ ان کی حیثیت مغربی اقوام کے برابر تسلیم کرلی گئی تھی ' اس لئے انھوں نے یہاں کی تجارت میں ایک بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی اسی طرح گجرات کے پارسیوں نے بمبئی میں رہ کر تجارت کرنی شروع کی اور یہاں کے کارخانوں کو بڑی ترقی دی۔ کچھ دن کے بعد ساحل مالابار کے یہودی بھی جو صدیوں سے وہاں آباد ہوگئے تھے ' ان نئے سازگار حالات سے فائدہ اٹھانے لگے اور انہوں نے بھی اپنی تجارت کو بڑی ترقی دی۔

ہند کی تجارتی ترقی میں ان قوموں کا اتنا حصہ نہیں تھا جتنا کہ یہاں کے ہندو اور مسلمان تاجروں اور سرمایہ داروں کا تھا کیونکہ ان کی منڈیاں ملک کے ہر ایک حصہ میں قایم ہوگئی تھیں ' اور وہ ہر فائدہ مند تجارت میں حصہ لینے کے کیلئے تیار تھے ' وہ نہ صرف خرید و فروخت کرتے تھے بلکہ ہنڈیوں کے ذریعہ دوسروں کو رقم ادا کرتے تھے تجارتی مال کا بیمہ کراتے تھے۔ اور دوسروں کو بڑے سے بڑا قرض دیتے تھے ' سترھویں صدی کی یوروپین یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے سربر آوردہ ہندی تاجر جو ہلی‌کٹ یا سورت وغیرہ میں رہتے تھے۔ دولت مندی اور قابلیت کے لحاظ سے لندن یا امسٹرڈام کے تاجروں کی ہمسری کرتے تھے ' سورت کا ایک تاجر ویرجی وورا Virgi Vora عموماً دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند تاجر سمجھا جاتا تھا ' اٹھارویں صدی کے سیاسی حالات اس قسم کی منڈیوں کیلئے سازگار نہیں تھے ' اس لیے سرمایہ دار عام طور پر مغربی نوآبادیوں میں بسنے کی طرف مائل تھے ' جہاں ان کا سرمایہ ایک حد تک محفوظ تھا ' لیکن چند اشارات ایسے

بھی پائے جاتے ہیں ' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عام رکاوٹوں کے باوجود ملک کے اندرونی حصوں میں بھی تجارت جاری تھی۔

اس سلسلہ میں یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ اٹھارویں صدی میں قرض عامہ کا رواج ہو چلا تھا ' ہند میں پرانا دستور یہ تھا کہ خزانہ میں جمع شدہ سرمایہ جنگ اور دوسری فوجی ضرورتوں پر صرف کیا جاتا تھا ' مغلوں کے زمانہ میں تخت کا دعویدار سرمایہ داروں سے جبراً روپیہ قرض لیتا تھا ' حقیقی حکمران ان سے کبھی قرض نہیں لیتا تھا ' مگر اٹھارویں صدی میں جبکہ زراعت کے گھٹ جانے کی وجہ سے مالگذاری کم ہوگئی تھی اور خزانہ خالی ہوچکا تھا ' حکمرانوں کا اپنی رعایا سے قرض لینے کا دستور بالکل عام ہوگیا تھا ' چنانچہ اس صدی کے خاتمہ پر اودھ کے نواب بہت مقروض ہوگیا تھا اور سندھیا کے قرضخواہ اس سے قرض کا مطالبہ کرتے تھے اس سے پہلے آرکاٹ کے نواب کی زندگی زیادہ تر قرض ہی پر چلتی تھی یوروپ کی کمپنیاں اپنی تجارت کو فروغ دینے کیلئے ہندی سرمایہ داروں سے قرض لیا کرتی تھیں ' سنہ ۱۷۷۲ع میں بنگال کی انگریزی کمپنی پر اس قسم کا بہت سا قرضہ چڑھا ہوا تھا ' جس کو وارن ہیسٹنگز نے ادا کیا اور اس کے بعد نئے قرضوں سے اس نے حتی الامکان پرھیز کیا اس طرح گو قرض عامہ کا دستور پورے طور پر جاری نہیں ہوا تھا ' البتہ حکومت کا لوگوں سے قرض لینے کا رواج ہو چلا تھا۔

اوپر کے بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ اٹھارویں صدی کے سیاسی حالات ثقافت کی ترقی کیلئے سازگار نہیں تھے ' مرہٹے سردار اور مسلمان نواب چند کے سوا عموماً فنون لطیفہ اور ادب کے سرپرست نہیں تھے ' مرہٹوں نے اپنے اپنے صدر مقام پر چند مندر بنوادئے تھے ' اودھ کے نوابوں نے البتہ لکھنو کو بڑی ترقی دی یہ لوگ ابتدا میں ہندوؤں کے پرانے مقدس شہر اجودھیا کے قریب رہتے تھے جو دریائے گاگرا کے کنارے واقع ہے

اس صدی کے وسط میں انھوں نے لکھنو کو اپنا پایہ تخت قرار دیا ' اور اس زمانہ سے یہاں قابل دید اور شاندار عمارتیں تیار ہونے لگیں اور بہت سے فنون لطیفہ کی ابتدا ہوی ' آگے چلکر یہاں بہت سی حیرت انگیز عمارتیں تیار کی گئیں ۔

مغربی فنون لطیفہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہندی فنون لطیفہ کا ذوق بھی گھٹتا چلا گیا ' سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں امیروں اور رئیسوں کو نوادر اور عجائبات کے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا ' چاھے وہ یوروپ یا چین کسی جگہ سے بھی حاصل ہوں مگر ایک زمانہ کے بعد مغربی چیزوں کا ذوق بڑھتا چلا گیا ' اور یوروپ کی ہر چیز ' چاھے وہ فنی حیثیت سے گھٹیاھی کیوں نہ ہو ' خریدی جانے لگی ' ہند کی چیزوں سے کسی کو دلچسپی نہیں رھی ' یہاں تک کہ انیسویں صدی میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ اچھے سے اچھے ہندی کاریگروں' کی مصنوعات کا کوئی بھی خریدار نہیں رہا تھا ۔

اورنگ زیب کے تقدس اور تشرع سے مصوری کے فن کو بڑا نقصان پہنچا تھا ' اور اس کے بعد تو اس کی حالت ہند کے تمام مقامات میں بد سے بدتر ہوگئی تھی' صرف راجپوتانہ اور دوسری چند پہاڑی ریاستوں کے اندر اس کا تھوڑا بہت ذوق باقی رہ گیا تھا اس دور میں ادب کو کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہوی ' سنسکرت کی تعلیم گو جاری تھی ' مگر اس زمانہ کی تصنیفات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں ' شمالی اور جنوبی ہند دونوں جگہ پر جدید زبانوں میں شعر و شاعری کا سلسلہ جاری تھا عموماً وھی لوگ شاعری کرتے تھے جو بھکتی کے عقیدے کے پیرو تھے مگر ان کے اشعار کیفیت سے خالی تھے' اور اگلے دور میں جو کچھ شعرا گذرے ہیں' ان کے سوا اس دور میں دوسرے کوئی خاص نامور شعرا نہیں ہوے ' لیکن اس قسم کے ادب کے متعلق دو باتیں قابل ذکر ہیں ' ایک تو یہ ہے کہ جدید زبانوں میں اس وقت صرف نظم کا رواج تھا اور نثر در حقیقت انیسویں

صدی کی پیداوار ہے ' دوسرے یہ کہ ابھی تک طباعت کا رواج نہیں ہوا تھا لوگ اپنے علوم کو سینہ بسینہ منتقل کرتے جارہے تھے ۔ اگرچہ سولھویں صدی سے ہی ہند کے مشنری مطبعوں سے کام لینے لگے تھے مگر ان کا رواج ابھی تک عام نہیں ہوا تھا ۔ اس فن کو برطانیہ کے ابتدائی دور میں فروغ حاصل ہوا ۔

اس دور کی ایک نمایاں چیز ہندوستانی زبان کی ترقی ہے ۔ اسی زمانہ میں وہ ایک ادبی زبان بنی ۔ ہم پچھلے ایک باب میں بیان کرچکے ہیں کہ اس مشترکہ زبان کی ابتدا ترک فتوحات کے زمانہ میں ہوی ۔ سنہ ۱۶۰۰ع کے قریب حیدر آباد کے بعض لوگوں نے ہندوستانی زبان کو ادبی اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ' اور سو سال کے اندر اس زبان نے ایک مستقل حیثیت اختیار کرلی اس وقت روز مرہ گفتگو میں فارسی کے اتنے الفاظ استعمال نہیں کئے جاتے تھے جتنے کہ بعد میں استعمال کیے جانے لگے ۔ اٹھارویں صدی میں شمالی ہند اور خاص کر دھلی اور لکھنو میں اردو ایک تحریری زبان بنی اور بہت مقبول ہوی ۔ ان جگھوں پر بہت سے شعرا پیدا ہوے جنھوں نے شاعری کی اور بہت سے دواوین چھوڑے ان کے بعض اشعار اعلی پایہ کے ہیں ' اس صورت میں بھی نظم کو پہلے رواج ہوا اور نثر بعد کو پیدا ہوی ۔

مذہبی ادب میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوی تھی ' مسلمانوں کے اندر دو متضاد رجحانات کام کر رہے تھے ' ایک طرف تو سلطنت مغلیہ کے زوال نے ان میں اتحاد اور اتفاق کا جذبہ پیدا کیا کیونکہ انہیں یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں ان کی تہذیب اور ان کا تمدن اور مذہب برباد نہ ہوجائے ' دوسری طرف حکومت کے حاصل کرنے کی خواہش نے ان کے اندر قومی اور فرقہ وارانہ اختلافات کی خلیج بہت وسیع کردی تھی' اور مسلمانوں کی مختلف سلطنتوں میں فرقہ آرائی کا غلبہ زیادہ ہوگیا تھا ' ہند میں اسلام کے شاندار دن ختم ہوچکے تھے' کیونکہ اب کسی سے بھی

جزیہ نہیں لیا جاتا تھا ' جو اسلام کے اقتدار کی زبردست علامت تھی ' مسلمانوں کو ان کا مستقبل بہت تاریک نظر آرہا تھا ' سچے مسلمان شاہی درباروں کے سیاسی جوڑ توڑ سے الگ ہوکر خدا کی مرضی پر ٹیکا لگائے بیٹھے تھے ' کہ اگر اللہ نے چاہا تو مسلمانوں کے بھلے دن پھر واپس آئینگے .

ہندوؤں میں سیاسی قوت اور طاقت کے پیدا ہونے کے باوجود ان کے مذہبی ادب میں کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہوی ' البتہ اس دور کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ تھی ' کہ شمالی اور مشرقی اقطاع ہند میں تنترہ کو بہت مقبولیت حاصل ہوی ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ شمالی ہند میں وشنو کے ایک نہ ایک اوتار کی پرستش کی جاتی تھی ' اوتاروں کے نظریہ کے ساتھ شکتی کی دیوی کے نظریہ کو بھی ترقی ہوی ' جو دیوتا کے ایک ساتھی کی حیثیت رکھتی تھی ' تنترہ سے پرستش کی وہ خاص شکلیں مراد ہیں جو اس شکتی کی دیوی کے سامنے پیش کی جاتی تھیں ' دیوی کا نظریہ غیر مانوس نہیں تھا ' مگر اس میں کوئی خاص کشش نہیں تھی ' یہ تنتروں اور طلسموں سے بھرا ہوا تھا اور صنفی جذبات کا اس پر زیادہ اثر تھا ' بعض اوقات قوت اور طاقت کو تشدد بلکہ ظلم کی صورت میں ظاہر کیا جاتا تھا ' اٹھارویں صدی کی بعض کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ اس زمانہ میں بد اخلاقی پھیل گئی تھی ' جس کا اس زمانہ میں پایا جانا کچھ بعید از قیاس نہیں تھا .

آخر میں چند الفاظ مغربی اقوام کی معاشرت اور ان کی طرز زندگی کے متعلق لکھنے ہیں ' اس زمانہ میں جبکہ ان کی توجہ صرف تجارت کی طرف لگی ہوی تھی ' ان کی طرز زندگی بالکل مغربی تھی کھانے کیلئے میز کرسیاں استعمال کی جاتی تھیں ' جن پر مختلف قسم کے ہندی کھانے چنے جاتے تھے ' لوگوں میں وہ عام طور پر مغربی پوشاکیں پہن کر نکلتے تھے اور جب گھر پر ہوتے تو ہندی طرز کی پوشاکیں بھی استعمال کرتے تھے ' یوروپین

عورتوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی ' یہی وجہ ہے کہ بعض یوروپین تاجر ہندکی لڑکیوں سے شادی کرنے پر مجبور ہوگئے تھے بعض اوقات زر خرید لونڈیوں سے شادی کی مقصد پورا کیا جاتا تھا ۔ اس قسم کی شادیوں کا نتیجہ قدرتی طور پر ہندی اخلاق و عادات کا اختیار کرنا ثابت ہوا ان کی اولاد بھی ہندی طور طریق کے اختیار کرنے پر مجبور تھی ' جیسا کہ ایک مخلوط نسل کے آدمیوں کا خاصہ ہوتا ہے ہند کے بڑے بڑے بیوپاریوں کے ساتھ یوروپ کے تاجروں کے تجارتی تعلقات تھے ' لیکن کھانے پینے کے معاملہ میں ان کا ہندوؤں سے کوئی میل جول نہیں تھا ' کیونکہ ذات پات کی رکاوٹیں بیچ میں حائل تھیں ' مسلمان تاجروں اور عہدہ‌داروں کے ساتھ یہ رکاوٹیں نہیں تھیں ' مسلمان ان کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی سکتے تھے اور ان کے کھیلوں میں حصہ لے سکتے تھے ' دونوں قوموں کے اشخاص کے درمیان انفرادی دوستی بھی قایم تھی ' مگر مسلمان عہدہ‌دار اپنی عزت اور وقار کھونا نہیں چاہتے تھے ' اور انگریز بھی عام طور پر ان کی کماحقہ عزت کرتے تھے ۔

مختلف نو آبادیوں میں یوروپین فوجی دستوں کے تعینات سے مختلف قسم کی معاشرتی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں ' انگریز تاجر ایک حد تک شایستہ اور تعلیم یافتہ ہوتے تھے ' مگر فوج میں نیچ طبقوں سے بھرتی کی جاتی تھی ' اور ان کی اعلی پیمانہ پر تربیت نہیں ہوتی تھی ' اور جب وہ میدان جنگ پر نہیں ہوتے تو ان کے پاس کافی فرصت کا وقت ہوتا تھا ' ہند کے باشندوں کے ساتھ ان کا میل جول زیادہ تر شراب کی دکانوں اور قحبہ خانوں میں ہوتا تھا ' اس لئے یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس ماحول میں اہل یوروپ اور اہل ہند اپنی بد ترین شکل میں دکھائی دیتے تھے ۔

اس صدی کے وسط میں انگریزوں کی معاشرتی حیثیت میں ایک نمایاں فرق پیدا ہوا ' جبکہ انہوں نے تجارت سے ترقی کرکے

سلطنت حاصل کرلی تھی ' اب یہاں سے ان کے دو طبقے ہوگئے تھے جن کا ہند کے باشندوں پر بڑا گہرا اثر پڑا ایک طبقہ کمپنی کے ملازمین کا تھا جن کی حیثیت اب حکومت کے اعلی عہدہ داروں کی ہوگئی تھی ' یہ اب اپنے کو حاکم اور ہند والوں کو محکوم سمجھتے تھے دوسرا طبقہ فوجیوں اور دوسرے کم تر درجہ کے لوگوں کا تھا ' ان میں بھی پہلے طبقہ کی سی رعونت پائی جاتی تھی ' وہ اپنے کو ہندوالوں سے بہتر اور ممتاز خیال کرتے تھے ' یہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے بالکل الگ اور ممتاز نہیں تھے ' کبھی پہلے طبقہ کے لوگ نیچے اتر آتے تھے اور کبھی دوسرے طبقہ کے لوگ ترقی کرکے اوپر پہنچ جاتے تھے ۔ مگر یہ امتیاز کبھی بھی حقیقی نہیں تھا ' لیکن انیسویں صدی کی معاشرت میں اس کے اثرات بالکل ظاہر ہوگئے تھے ۔

باب ۳۶

وارن هیسٹنگز بحیثیت ایک منتظم کے

وارن هیسٹنگز پندرہ سال تک بنگال میں کمپنی کا ملازم رہ چکا تھا اور اب مدراس کی مجلس کا ایک رکن ہوگیا تھا، کلائیو کے هند سے جانے کے پانچ سال بعد وہ سنہ ۱۷۷۲ء میں بنگال کا گورنر مقرر ہوا، دو سال بعد پارلیمنٹ کے سنہ ۱۷۷۳ء میں منظور کیے ہوے قانون تنظیم (ریگولیٹنگ ایکٹ) کے تحت گورنر جنرل باجلاس کونسل بنایا گیا، مدراس اور بمبئی کے بعض معاملات پر بھی اس کو اختیارات حاصل تھے، وہ سنہ ۱۷۸۵ء تک گورنر جنرل بنا رہا، گورنر کی حیثیت سے اس کو کسی مخالفت کا سامنا کرنا نہ پڑا، لیکن جب گورنر جنرل ہوا تو مجلس کے اکثر ارکان اس کے مخالف ہوگئے، اس کا سب سے بڑا مخالف فلپ فرانسس تھا، چنانچہ وارن هیسٹنگز دو سال تک اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام نہیں کرسکا، سنہ ۱۷۷۶ء کے بعد سے جب کہ مجلس کے اکثر اراکین اس کے همنوا ہوگئے یا اراکین مجلس کے برابر بٹ جانے کی صورت میں اس کو اپنی خصوصی راے کے استعمال کرنے کا موقعہ ملا وہ اپنی بات کو کچھ منوانے لگا تھا.

اس جگہ قانون تنظیم کے متعلق چند تشریحی اشارات ضروری ہیں، سترھویں صدی میں شاهی منشورات کے ذریعے کمپنی کو مشرقی تجارت پر قانونی حق عطا کیا گیا تھا سنہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب کے بعد تمام شاهی اختیارات پارلیمنٹ کے هاتھ میں آگئے تھے، چنانچہ اس نے کمپنی کے متعلق یکے بعد دیگرے مختلف قوانین منظور کیے، ابتدا میں کمپنی کو هند کے سیاسی معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں تھی، لیکن جب کلائیو نے غیر معمولی کامیابیاں حاصل کرلیں تو انگریز مدبر اور سیاست دان هند کے معاملات سے دلچسپی لینے لگے، اب هند سے صرف کمپنی هی کا واسطہ نہیں تھا، بلکہ پوری انگریز قوم کی توجہ اس طرف

منعطف ہوگئی تھی ان حالات میں پارلیمنٹ کا کمپنی کے معاملات میں دخل دینا بہت ضروری ہوگیا تھا' مگر اس سلسلہ میں جو قانون بنایا گیا اس میں بہت سی خامیاں تھیں' سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اگر ایک طرف اس نے کلکتہ کے اندر ایک عدالت عالیہ کے بنانے کا اختیار دیا جس پر کمپنی کا کوئی قابو نہیں تھا تو دوسری طرف اس کے اختیارات کی پورے طور پر توضیح اور تشریح نہیں کی' جس کی وجہ سے بہت سی مشکلات پیش آئیں' عدالت کو قانون کی روسے 'برطانوی رعایا' پر پورا اختیار دیا گیا تھا' مگر اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی تھی کہ آیا اس اصطلاح میں ہند کے باشندے بھی داخل ہیں یا نہیں' دوسرے الفاظ میں اس مسئلہ کا کوئی تصفیہ نہیں کیا گیا تھا کہ پارلیمنٹ کو ہند پر شاہی حقوق حاصل تھے یا نہیں' اٹھارویں صدی کے تمام قوانین میں بھی یہی خامی تھی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۸۱۳ء میں ایک قانون منظور ہوا جس میں پارلیمنٹ نے صریحی طور پر کمپنی کے مقبوضات ہند کے متعلق تاج شاہی کا کلی اختیار تسلیم کرلیا' دوسرے سال فرانس اور ہالینڈ نے بھی تاج شاہی کی اس حیثیت کو ایک معاہدہ کے ذریعہ مان لیا تھا' اسوقت سے لیکر برطانوی حکومت کو ہند پر قانونی اور سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا تھا' یہ اقتدار بمبئی کے جزیرہ پر پہلے ہی سے حاصل تھا مگر اب تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا کہ ہند کے دوسرے حصوں پر کب سے عملاً یہ اقتدار حاصل ہوا۔

ہیسٹنگز کا سب سے اہم کام بنگال کے نظم و نسق کو ٹھیک کرنا تھا جس کی ذمہ داری پارلیمنٹ کی طرفسے نہیں بلکہ کمپنی کی طرف سے اسپر عائد کی گئی تھی۔ اس کو کمپنی کے ملازموں سے حکومت کے اعلی عہدہ داروں کا کام لینا تھا اس کو اگرچہ اس معاملہ میں پورا اختیار دیا گیا تھا لیکن کمپنی کا موجودہ عملہ تاریخی اسباب کی بناء پر اس کام کے

بالکل اهل نهیں تھا ابتدا میں کمپنی سوداگروں اور کارخانه داروں کو ایک مختصر مدت کیلئے اپنی ملازمت میں لیتی تھی ' اس کے بعد کمپنی کے نظماء ایسے لوگوں کو منتخب کرنے لگے جو خاص خاص فرایض کی انجام دهی کی اپنے اندر قابلیت رکھتے تھے ' مقررہ مدت کے گذرنے کے بعد ان کی مدت ملازمت میں توسیع کردی جاتی تھی ' اس طرح چند دن کے اندر تجربه کار تاجروں کی ایک بڑی تعداد تیار هوگئی تھی ' ان کو مدت ملازمت نے لحاظ سے ترقی دی جاتی تھی ' آگے چلکر کمپنی کی ملازمت اتنی مقبول هوی کہ کمپنی کے نظماء کو تقرر کا اختیار اپنے هاتھ میں لینا پڑا ' اب ان کا تقرر نظماء کمپنی کی مرضی پر منحصر تھا ' اس وقت ضروری قابلیت صرف حساب کتاب کے جاننے کی هوتی تھی .

ملازمت کی مقبولیت کچھ اسوجہ سے نہیں تھی کہ ان کو بڑی تنخواهیں ملتی تھیں ' یا ملازمت سے دستبردار هوجانے کے بعد ان کو وظیفہ ملتا تھا ' یا هند میں رهنے سے عیش اور آرام کے مواقع میسر هوتے تھے ' کیونکہ عام طور پر بدامنی هونے کی وجہ سے جانوں کے ضایع هونے کا بڑا خطرہ لگا هوا تھا ' ملازمت کی مقبولیت محض اس وجہ سے تھی کہ یہ لوگ ذاتی طور پر تجارت کرکے خوب روپیہ کما سکتے تھے ' کمپنی کے ملازم اپنے هم وطن دوستوں سے یا هند کے سوداگروں سے قرض لیتے تھے اور اس روپیہ سے کمپنی کی ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خاص تجارت بھی کرتے تھے ' پہلے پہل کمپنی نے ان کو خاص تجارت کرنے سے روکنے کی کوشش کی مگر جب اس میں کامیابی نہیں هوی تو آخرکار چند شرطوں کے ساتھ ان کو تجارت کرنے کی اجازت دیدی ' کمپنی کے ملازم عام طور پر ان شروط کی پابندی کرتے تھے ' اس طرح اکثر ملازم بیک وقت دو کام کرتے تھے ' ایک طرف وہ کمپنی کی خدمات انجام دیتے تھے اور اس کے ساتھ اپنی خاص تجارت بھی کرتے تھے '

اس کی وجہ سے بسا اوقات ان کے اور کمپنی کے مفاد میں ٹکر ہوتی تھی اور بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی تھیں ۔

روپیہ کمانے کے اور بھی بہت سے ذرایع تھے ' ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ ہندی تاجر عبوری محصول سے بچنے کیلئے رشوت یا تحفے دیکر راہداری کے پروانے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے ' اس طرح پورا ماحول رشوت ستانی کی وجہ سے بہت بگڑ گیا تھا ' اور دن بدن رشوت ستانی بڑھتی ہی جا رہی تھی ' اٹھارویں صدی کے وسط میں تو یہ انتہا کو پہنچ گئی تھی کیونکہ کلائیو جیسے بڑے بڑے عہدہ دار بھی اپنے مرتبہ کے مطابق غیر معمولی تحفے قبول کرنے لگے تھے ' اس قسم کے تربیت یافتہ ملازموں سے حکومت کے کام لینا کچھ آسان نہیں تھا ' مگر اس دور کی یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بعض ملازم ایسے بھی تھے ' جنہوں نے اپنے کردار کو بلند کرنے کی کوشش کی تھی ' بہت سے نئے ملازم جو ابھی ابھی چند سال پہلے روپیہ کمانے کی غرض سے یہاں آئے تھے ' پر جوش کارکن ہوگئے اور پرانے ملازموں کو ہند کی رعایا کی فلاح و بہبود کی ضرورت کا احساس دلانے لگے تھے ۔

اب وہ چیز جو آگے چلکر ملازمت دیوانی یعنی سیول سروس کے نام سے مشہور ہوی بہت بعد کو ترقی میں آئی جب کلائیو دوبارہ گورنر ہوکر آیا تو اس نے کمپنی کے ملازمین کو تحفوں کے قبول کرنے سے روکا اور اس نے ان کی تنخواہوں میں معقول اضافہ کرنے کی نا کام کوشش کی ہیسٹنگز نے دستکوں یعنی پروانہ ہاے راہداری کے غلط استعمال کو بند کیا اور حکومت کے فرایض کی انجام دہی کیلئے خاص عہدہ دار مقرر کیے جن کا کوئی تعلق تجارت سے نہیں تھا اس کے جانشین لارڈ کارنوالیس نے ان ہی بنیادوں پر ہند کی حکومت دیوانی کیلئے ایسے ملازموں کا انتخاب کیا جن کو بڑی سے بڑی تنخواہ ملتی تھی اور انہیں دوسرے ذرایع سے روپیہ پیسہ کمانے کی

مطلق اجازت نہیں تھی ' اسطرح بتدریج سیول گورنمنٹ یعنی حکومت دیوانی کی عظیم الشان عمارت تیار ہوی جس کی ابتدا ہیسٹنگز کے عہد ھی میں پڑچکی تھی ۔

ہیسٹنگز کا سب سے بڑا کام ملکی تجارت کو فروغ دینا ' مالگذاری کے نظام کو درست کرنا اور مقامی عدالتوں کا قایم کرنا تھا ' اول الذکر کے متعلق یہ یاد ہوگا کہ قدیم ھندو جاگیردارانہ نظام میں تجارت اور صنعت و حرفت پر مختلف قسم کے محصول عاید کیے گئے تھے ' جن کو اکبر نے منسوخ کردیا تھا ' لیکن اس کا قایم کیا ہوا نظام بھی بہت دنوں تک جاری نہ رہ سکا ' کیونکہ اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے سے پہلے اس قسم کے محصول پھر سے لیے جانے لگے تھے ' اس نے اپنے دور میں ان محصولوں کو منسوخ قرار دیا ' اس کے بعد جب اٹھارویں صدی میں سلطنت مغلیہ پر زوال طاری ہوگیا تو وھی محصول پھر لیے جانے لگے تھے ' نہ صرف وہ حکومتیں ھی ان محصولوں کو لیتی تھیں جن کو ان کے لینے کا قانونا حق حاصل تھا بلکہ مقامی سرداروں اور زمینداروں نے بھی اپنے اپنے علاقوں کی سڑکوں پر چنگی گھر قایم کرلیے تھے ' جہاں ہر اس چیز پر محصول لگایا جاتا تھا جو اس راستہ سے گذرتی تھی ' ان کی کثرت کی وجہ سے ھی ہندی تاجر دستکوں کو پیسہ دیکر خریدنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ وہ ان محصولوں کے ادا کرنے سے بچ جائیں ' نظماء کمپنی کے احکام کے مطابق ہیسٹنگز نے تمام چھوٹے چھوٹے چنگی گھروں کو بند کرادیا اور صرف پانچ بڑے بڑے چنگی گھر رہنے دئے ' جہاں تجارتی چیزوں پر معمولی محصول لیا جاتا تھا ' اس کی وجہ سے بنگال اور بہار کے اندر تجارت کو ایک حد تک فروغ حاصل ہوگیا ۔

ملکی تجارت کے متعلق اصلاحات کو نافذ کرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا کہ مالگذاری کے نظام کی اصلاحات کو جاری کرنا تھا ' کیونکہ اس کی اصلاحات میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں ' بسا اوقات ہیسٹنگز اور اس کے جانشینوں کو بڑی پریشانی

اٹھانی پڑتی تھی ' دیوان ہونے کی حیثیت سے لگان کی تشخیص کرنا اور اس کا وصول کرنا کمپنی کا کام تھا ' لیکن مشکل یہ تھی کہ کمپنی کے ملازمین اس کام سے بالکل واقف نہیں تھے ' اور بنگال میں کوئی شخص بھی سرکاری کاغذات یا اس زمانہ کے دستور سے انہیں واقف کرانے پر آمادہ نہیں تھا ' کلائیو نے ہند کے پورے عملہ کو کمپنی کی ملازمت میں لے لیا تھا ' مگر ان کے اوپر ایسے انگریز نگران کار تھے ' جو نظام مالگذاری سے بالکل نا واقف تھے۔ ایسی حالت میں صیغۂ مالگذاری کا کام ٹھیک طور پر چل نہیں سکتا تھا ' عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہند کے تجربہ کار عہدہ دار اپنے انگریز افسروں کو دھوکہ دیکر بہت سا روپیہ ہضم کر رہے ہیں اور دولت مند ہوجانے کی جلدی میں کاشتکاروں پر ظلم کر رہے ہیں مگر اس بات کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا ' ان احکام کے مطابق جو سنہ ۱۷۷۲ء میں ہند کے اندر شایع ہوے کمپنی نے کھلم کھلا یہ اعلان کیا کہ وہ اپنی حیثیت دیوانی کو برقرار رکھنے کی کوشش کریگی ' اس کے دوسرے معنی یہ تھے کہ وہ لگان کی تشخیص اور اس کی وصولی کیلئے اپنے آدمی مقرر کریگی ۔

اس زمانہ میں بنگال کی حقیقی صورت حال یہ تھی ' سے پہلے کاشتکار تھے جو زمین کی کاشت کرتے تھے اور پیداوار کا ایک حصہ بطور لگان نقد ادا کرتے تھے ' انگریز افسروں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس لگان کی رقم کا کیوں کر حساب لگایا جاتا ہے ' دوسرے وہ زمیندار تھے جو اپنے کاشتکاروں سے اپنا لگان وصول کرتے تھے اور اس کا ایک حصہ کمپنی کو بطور مالگذاری ادا کرتے تھے ' لیکن انگریز عہدہ داروں کو یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ یہ زمیندار اپنے کاشتکاروں! سے کتنا وصول کرتے ہیں اور اس کا کتنا حصہ کمپنی کو ادا کرتے ہیں ' ور زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان حقیقۃً کس قسم کا تعلق ہے بہت سے انگریز ہند کی زمینداری کو انگلستان کی زمینداری

پر قیاس کرنے لگے تھے ، اور اس قسم کا قیاس ان کو بڑی غلط فہمی میں مبتلا کر رہا تھا ۔

بنگال کی زرعی تاریخ کے بہت سے پہلو اب تک تاریکی میں ہیں ، مگر اس کا حسب ذیل خاکہ ایک بڑی حد تک ٹھیک ہے ، اکبر کی فتوحات کے وقت ملک کے ایک بڑے حصہ پر زمینداروں کا قبضہ تھا ، جو ایک مقررہ رقم بطور مالگذاری سرکار کو ادا کرتے تھے ، اور جنھیں اس کا پورا اختیار تھا کہ وہ اپنے کاشتکاروں کے ساتھ جس قسم کا رویہ چاھیں اختیار کریں ، سترھویں صدی کی ابتدا میں اکثر زمینداروں کو بے دخل کردیا گیا تھا ، اور وہ مالگذاری جو ان کو کاشتکاروں سے ملتی تھی بطور تنخواہ کے ان کو دے دی جانے لگی تھی ، اور بعض جگہ سرکاری کارندے کاشتکاروں سے لگان وصول کرکے زمینداروں کو دیتے تھے ، اور اس کا حساب کتاب وزیر مال کو دکھاتے تھے ، تھوڑے زمانہ کے بعد یہی کارندے کسانوں میں تبدیل ھوگئے اور انھوں نے مقررہ سالانہ رقم کی ادائیگی کا اپنے اوپر ذمہ لے لیا تھا اور جب مرکزی حکومت بتدریج کمزور اور ناقابل ھوتی گئی تو یہ کارندے بطور زمیندار کے کاشتکاروں کی زمین کے مالک بن گئے ، اور ان کے بعد یہ زمینداری موروثی ھوگئی تھی ۔

اب تک بنگال میں بھی قریب قریب وھی حالات تھے جو شمالی ھند میں پیش آئے تھے ، البتہ یہاں ایک خاص بات یہ ھوگئی تھی کہ ان کسانوں کی مالگذاری کی مقدار حقیقۃً نہیں بھی تو کم از کم رسماً مقرر ھوگئی تھی ، ان کی اس کی مالگذاری کی مقدار میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی تھی ، البتہ دوسرے محصولوں کی وجہ سے ادائیگی کی جملہ رقم گھٹتی بڑھتی رھتی تھی ، اس طرح حکومت اگرچہ رسمی طور پر پیداوار کے صرف ایک متعین حصہ کی اپنے کو حقدار سمجھتی تھی تاھم وہ حقیقۃً ملک کی پوری پیداوار سے جو سالانہ گھٹتی بڑھتی رھتی تھی اپنا حصہ پالیتی تھی اس زمانہ کے بنگالی زمیندار اور انگریز

زمیندار کے درمیان اہم فرق یہی تھا کہ بنگال میں حکومت کو پورا حق پہنچتا تھا کہ وہ زمین کی پیداوار کے مطابق زمیندار سے اپنا حصہ طلب کرے، مسلمانوں کے زمانہ میں حکومت اپنی مرضی کے مطابق لگان کے طریقوں میں تبدیلی کرنے کا پورا حق رکھتی تھی، ہندی نقطۂ نظر سے حکومت کو اس کا پورا حق تھا کہ زمینداروں کو بیدخل کرکے لگان کی تشخیص اور اس کی وصولی کا کوئی بہتر طریقہ اختیار کرے، مگر انگریز محض دستور وقت کے احترام کی بناء پر اس حد تک قدم نہیں کرسکتے تھے۔

ہیسٹنگز نے در حقیقت زمینداروں کو بے دخل کرکے زمینوں کو ایک ایسے شخص کے حوالے کرنا شروع کیا جو پانچ سال تک کی زیادہ سے زیادہ مالگذاری بیک مشت ادا کرسکتے ہوں یہ لوگ بیدخل کئے ہوئے زمینداروں کو تھوڑا بہت دے دیتے تھے، اس کی وجہ سے ملک کو زبردست نقصان پہنچا، کیونکہ ہر جگہ ظن و تخمین پر کام کرنے والوں کی بھر مار ہوگئی اور ہر ایک نے بڑی بے رحمی کے ساتھ کاشتکاروں کو لوٹنا شروع کردیا، اور بعض اوقات غلط اندازہ کی وجہ سے مالگذاری کی رقم میں جو کمی پڑتی تھی اس کو کاشتکاروں سے حاصل کرکے پوری کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، ہراج کے ذریعہ مالگذاری کی وصولی کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا، کاشتکاروں کی یہ تکلیف اس وقت انتہا کو پہنچ جاتی تھی جبکہ اقتصادی تبہ حالی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی تھی، سنہ ۱۷۶۹ء میں بنگال کے ایک بڑے حصہ میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے زبردست قحط کے آثار نمایاں ہوگئے تھے، اور ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ قحط کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کم از کم ایک نسل تک کیلئے زراعت تباہ ہو جاتی تھی، کیونکہ کاشت کیلئے آدمی اور ہل جوتنے کے لئے جانور نہیں ملتے تھے، چنانچہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس قحط میں کل آبادی کا ایک تہائی حصہ ختم ہوگیا تھا اور اس سے کہیں

زیادہ ہل جوتنے والے جانور تباہ ہوگئے تھے ' اس حالت میں یقیناً مالگذاری کی پچھلی رقم کبھی وصول نہیں ہوسکتی تھی اور کوئی شخص چاہے وہ سرکاری کارندہ ہو یا زمیندار یہ بتا نہیں سکتا تھا کہ بنگال کی پوری آمدنی کیا ہوگی ' پہلے پانچ سال کے اندر حکومت بنگالی زمینداروں سے ' جو اپنی جگہ پر کاشتکاروں کو لوٹنے میں مصروف تھے ' مقررہ مالگذاری کے وصول کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی ' اس مدت کے گذرنے کے بعد هراج کے ذریعہ مالگذاری کے وصول کرنے کا طریقہ ترک کردیا گیا ' اس کی بجائے مختلف تجربے کیے گئے اور آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ زمینداروں کو بے دخل کرنا ایک بہت بڑی غلطی تھی ' اس کے بعد زمینداروں سے جتنا حاصل ہوسکتا تھا اتنا لیا جانے لگا ۔

اب تک انگریز حکمران اس وقت کے زرعی نظام کے مطابق هی کام کرتے ہوے چلے جا رہے تھے ' مگر اس سے انہیں کوئی واقفیت نہیں تھی ' لیکن بحث ومباحثہ کے دوران میں ایک بالکل نیا نظریہ قایم ہوا یعنی یہ کہ زمینداروں پر ہمیشہ کیلئے ایک متعین مالگذاری مقرر کردی جائے ' اس کے بعد سے ان کی حیثیت انگریز زمینداروں کی سی ہوگئی تھی البتہ ان پر ایک ضروری چیز یعنی بدل خدمت یا زر استشناء (quit rent) عائد کیا گیا تھا جو بدلتا نہیں تھا ۔ آگے چلکر یہ نظریہ مقبول ہوا اور سنہ ۱۷۹۳ع سے اس پر عملدرآمد شروع ہوا ۔ لیکن ہیسٹنگز کی گورنری کے زمانہ میں اس مسئلہ پر صرف بحث و تمحیص هی ہوتی رہی ' اور جب وہ هند سے واپس ہوا تو انگریز ابھی تک مالگذاری کے متعلق تجربہ کرنے هی میں لگے ہوے تھے ۔

ہیسٹنگز کا تیسرا اهم کام مقامی عدالتوں کا قایم کرنا تھا ' اس سلسلہ میں کلکتہ ' مدراس اور بمبئی اور هند کے دوسرے مقامات کے درمیان فرق کرنا ہوگا کیونکہ اول الذکر تین بڑے شہروں میں انگریزی نمونہ کی عدالتیں قایم کی گئی تھیں ' جو ایک غیر ملک کی نوآبادیات کے مناسب ہوتی ہیں ' مگر دوسرے

مقامات میں ہند کے باشندوں کی ضروریات کا خیال رکھنے کی کوشش کی گئی تھی ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں قاضی یا منصف حکمرانوں اور حاکموں کے ساتھ بیٹھ کر تمام جھگڑوں کا فیصلہ کرتا تھا ، اس زمانہ میں دیوانی اور فوجداری مقدمات کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں کیا جاتا تھا ، عملا سرکاری عہدہ دار ایسے مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے جو ان کے ذاتی معاملات کے متعلق ہوتے تھے ، اور امن عامہ سے تعلق رکھنے والے معاملات کا وہ لوگ تصفیہ کرتے تھے جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہوتی تھی اور صیغۂ مالگذاری کے عہدہ دار زمینداروں اور کاشتکاروں کے جھگڑے چکاتے تھے ، ہیسٹنگز کے زمانہ میں دیوانی مقدمات کو فوجداری مقدمات سے بالکل الگ کردیا گیا تھا ، اس طرح ہر جگہ دو قسم کی عدالتیں قایم ہوگئی تھیں ، ایک عدالت فوجداری تھی ، جس میں منصف اور قاضی جرائم کے مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے اور دوسری عدالت دیوانی تھی جس میں مالگذاری اور لگان کے مقدموں کے ساتھ ساتھ دو شخصوں کے درمیان کے مالی مقدمات کا فیصلہ بھی کیا جاتا تھا ، ہر ایک کو مقامی عدالتوں سے عدالت ہاے عالیہ کی طرف مرافعہ کا حق حاصل تھا ، مقدمات دیوانی کا حاکم اعلی صدر عدالت دیوانی ہوتا تھا جو عموماً گورنر جنرل باجلاس کونسل ہوتا تھا اور مقدمات فوجداری کا حاکم اعلی مقامی نواب ہوتا تھا ، جو کونسل کی نگرانی میں اپنے فیصلے سناتا تھا .

اگرچہ عدالتوں کا یہ انتظام غیر مکمل تھا تاہم پہلے سے زیادہ بہتر حالت میں تھا عوام میں نئی عدالتوں کو بہت جلد قبولیت حاصل ہوگئی تھی ؛ ابتدا میں یہ عدالتیں پر امن طریقہ پر کام نہیں کرسکیں کیونکہ عدالتی اختیارات کی وسعت کے معاملہ میں ان کا عدالت عالیہ Supreme Court سے جھگڑا ہوگیا تھا جو قانون تنظیم کے تحت سنہ ۱۷۷۳ع میں کلکتہ میں قایم ہوی تھی ، اس عدالت کا پہلا چیف جسٹس سرالیجاہ امپے تھا وہ بلا شبہ ایک فرشتہ خصلت انسان نہیں

تھا مگر وہ ایک بد خصلت آدمی بھی نہیں تھا جیسا کہ اس کو مکالے نے اپنے مقالہ وارن ھیسٹنگز میں ثابت کرنے کی کوشش کی ھے ' وہ ایک قابل قانون داں تھا ' وہ بے حد باریک بیں آدمی تھا اور جزئی باتوں کا حد سے زیادہ خیال رکھتا تھا اور اپنی علمیت اور قابلیت کو جتانا چاھتا تھا ' اور عدالت کے اختیارات کو پورے طور پر استعمال کرنے کی خواھش رکھتا تھا ' لیکن جیسا کہ ھم پہلے بیان کرچکے ھیں قانون تنظیم میں عدالت کے اختیارات کی صاف طور پر توضیح نہیں کی گئی تھی ' امپے کا کہنا یہ تھا کہ عدالت عالیہ کو بنگال کے تمام باشندوں پر پورے اختیارات حاصل ھیں ' لیکن مجلس کی اکثریت اس نظریہ کی حامی نہیں تھی ' چنانچہ سنہ ۱۷۸۰ع کے قریب عدالت کی تمام کارروائیاں معطل ھوگئیں ' ھیسٹنگز نے اس سے پہلے عدالت عالیہ اور صدر دیوانی عدالت کو ملا دینے کی تجویز پیش کی تھی اور جب اس نے امپے کو عدالت عالیہ کا چیف جسٹس ھوتے ھوے صدر دیوانی عدالت مقرر کیا تو یہ تمام مشکلات خود بخود حل ھوگئیں - دونوں عدالتوں کے اتحاد سے پرانا تعطل فوری طور پر دفع ھوگیا ' ایک سال بعد پارلیمنٹ نے ایک ایسے طریقہ پر عدالت عالیہ کے اختیارات کی توضیح کی کہ آئندہ اختلافات کے پیدا ھونے کی کوئی گنجایش ھی باقی نہیں رھی .

عدالتوں کے قیام سے قانون دانی کے پیشہ کو بڑی ترقی ھوی' اور انیسویں صدی میں تو اس پیشہ کو بڑی اھمیت اور مقبولیت حاصل ھوگئی تھی ' اس سے پہلے ھند کی عدالتوں میں پیشہ ور قانون داں نہیں ھوتے تھے ' مقدمہ باز اپنے دلائل خود ھی پیش کرتے تھے ' اگر کسی قسم کی بیرونی امداد کی ضرورت ھوتی تھی تو وہ صرف با اثر اشخاص سے لی جاتی تھی ' جن کو رضامند کرکے یا رشوت دیکر وہ اپنی شہادت کیلئے لاتے تھے اور حاکموں اور قاضیوں پر اثر ڈالتے تھے سب سے پہلے سولھویں صدی میں گوا کے اندر پرتگالی

پیشہور قانون دانوں کا وجود ملتا ہے ' ان کے ساتھ ہند کے قانون دان بطور منشی اور شریک کے کام کیا کرتے تھے ' مگر یہ عدالت ایک خاص علاقہ تک محدود تھی ' ہند کے بڑے بڑے شہروں میں جہاں انگریزی عدالتیں قایم ہوگئی تھیں ابتدا ہی سے وکیل اور مختار اور قانونی مشیر کام کرنے لگے تھے ' عدالت عالیہ کے منشور نے ججوں کو وکیلوں اور قانون دانوں کی خدمات کے حاصل کرنے کی اجازت دی تھی ' چنانچہ بہت سے وکیل اور مختار وکالت کرنے کی غرض سے کلکتہ پہنچ گئے تھے - اسطرح ہند کے باشندے پہلی مرتبہ اس خیال سے آشنا ہوے کہ کسی کو رشوت دیکر یا اس پر اثر ڈالکر کھینچ لانے کی بجاے پیسہ دیکر ایک ماہر قانوندان کی امداد حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے ' ہند کے باشندے ان قانون دانوں سے بخوبی فائدہ اٹھانے لگے ' ابتدا میں یہ قانوندان انگریز ہی ہوتے تھے ' لیکن آگے چلکر ہند کے باشندوں نے بھی اس پیشہ کو اختیار کیا ' ہیسٹنگز کے زمانہ کی ایک دوسری ترقی یوروپین لوگوں کا ہند کی زبانوں سے دلچسپی لینا اور ان کا پڑھنا ہے قانونی ضرورت کی بناء پر انگریزوں کے لئے سنسکرت کا جاننا لازمی ہوگیا تھا ' کیونکہ اس کے بغیر ہندووں کا فیصلہ ان کے قانون کے مطابق نہیں کیا جاسکتا تھا ' کوئی جج بھی سنسکرت سے واقف نہیں تھا ' اس لئے ہیسٹنگز نے ہندو قانون کو انگریزی میں مرتب کرنے کیلئے ہندی عالموں کی ایک مجلس بنائی چونکہ براہ راست سنسکرت سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی کسی میں قابلیت نہیں تھی اس لئے تمام سنسکرت قانون کا پہلے فارسی میں ترجمہ کیا گیا اور پھر اس کو انگریزی کا جامہ پہنایا گیا ' سرولیم جونس پہلا انگریز شخص ہے جس نے سنسکرت کی تعلیم کی طرف توجہ کی ' علم لسانیات کے متعلق اس کی قابلیت کا ذکر دوسرے باب میں ہوچکا ہے ' اس کے ساتھ دوسرے انگریز بھی سنسکرت پڑھنے لگے تھے سنہ ۱۷۸۴ع میں سرولیم جونس نے بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد

ڈالی جو اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھا ' اس میں سنسکرت کتابوں کا ترجمہ کیا گیا اور کلکتہ اور یوروپ کے مطبعوں میں ان کو چھاپ کرشایع کیا گیا ، اس کے بعد سے سنسکرت زبان میں مختلف نصاب اور لغات اور صرف و نحو کی کتابیں شایع کی جانے لگیں اور اسطرح سنسکرت زبان کو بڑی تقویت اور ترقی ملنے لگی .

اس زمانہ میں فارسی تعلیم کو جو بڑی اهمیت حاصل هوی وہ زیادہ تر قانونی ضروریات کی بجاے سیاسی اسباب کی بناء پر تھی ' جب تک کمپنی ایک تجارتی جماعت کی حیثیت سے رهی اس کے ملازم ٹوٹی پھوٹی زبان میں اپنا کاروبار کرلیتے تھے ' لکھنے اور پڑھکر سنانے کیلئے هندی ترجمان مقرر تھے جن کو انگریزی سے زیادہ واقفیت نہیں تھی اور جب انگریزوں نے حکومت اپنے هاتھ میں لی تو سیاسی مسائل پر گفت و شنید کرنے کیلئے ٹوٹی پھوٹی فارسی کام نہیں دے سکتی تھی' هیسٹنگز اور اس کے رفقاے کار نے محسوس کیا کہ سیاسی گفت وشنید کے لئے فارسی کی علمی قابلیت بہت ضروری هے کیونکہ اس زمانہ میں فارسی هند کے ایک بڑے حصہ میں سیاسی اور سفارتی زبان مانی جاتی تھی چنانچہ اس نے اس زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا ' اور اس وقت سے لیکر انگریز بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس زبان کو سیکھنے لگے ' هیسٹنگز کے هند سے جانے سے پہلے بہت سی کتابیں اور ترجمے نکل چکے تھے - ان میں سے بعض محض هیسٹنگز کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھے * اس نے انگلستان میں ایک فارسی مدرسہ قایم کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا تاکہ نوجوان انگریز یہاں تعلیم پاکر کمپنی کی ملازمت کے قابل

* گلاڈون Gladwin کا ترجمہ آئین اکبری (مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۷۸۳ع) هیسٹنگز کے نام سے معنون هوا تھا کیونکہ اس نے اس کی تیاری میں بڑی دلچسپی لی تھی ' نیز انسٹیٹیوٹس ...... آف تیمور (مطبوعہ آکسفورڈ سنہ ۱۷۸۳ع) کا مترجم میجر ڈبلیو ڈیوی هیسٹنگز کا معتمد فارسی تھا ، اس کتاب کے آخر میں جو فارسی خطوط هیں ان سے اندازہ هوتا هے کہ انگریزوں کو فارسی زبان سے کتنی دلچسپی پیدا هوگئی تھی .

بن سکیں، مگر وہ اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ نہیں پہناسکا، تاہم سنہ ۱۸۰۰ع سے جبکہ کلکتہ میں ایک کالج قایم ہوا اس کی بہ قاعدہ تعلیم شروع ہوگئی تھی اور چھ سال بعد سنہ ۱۸۰۶ع میں ہیلی بری Haileybury میں ایسٹ انڈیا کالج کے نام سے ایک دوسرا کالج کھولا گیا۔

ان زبانوں کی تعلیم کا لازمی نتیجہ مطبعوں کی ترقی تھ یوروپ کے لوگ ایک زمانہ سے عربی حروف سے آشنا تھے جو فارسی اور ہندوستانی دونوں زبانوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے تھے، اس لیے انھیں ان زبانوں کے حروف کے ڈھالنے میں کوئی بڑی دقت پیش نہیں آئی، البتہ سنسکرت حروف سے کوئی بھی آشنا نہیں تھا، اس لیے اس کے ڈھالنے میں بہت تاخیر ہوی اور اٹھارویں صدی کے آخر میں اس کے حروف ڈھالے گئے، سنہ ۱۷۷۸ع میں کلکتہ کے لوھاروں نے انگریزوں کی نگرانی میں بنگالی حروف تیار کیے اور جب بنگالی اور ہندوستانی کی کتابیں چھاپی جانے لگیں تو ان زبانوں کی نثر نگاری کے لئے بھی راستہ صاف ہوگیا، کیونکہ علم جب تک کمیاب قلمی نسخوں میں بند رہا، لوگ کتابوں کو زبانی یاد کرلینے کے عادی ہوگئے تھے اور اس کو سینہ بسینہ ایک سے دوسرے کو منتقل کرتے تھے اور چونکہ یاد کرنے کے لئے نثر کی بہ نسبت نظم زیادہ آسان تھی۔ اس لئے لوگوں کی توجہ ایک زمانہ تک نظم ہی کی طرف مائل رہی۔ اب جبکہ مختلف مطبعے ایجاد ہوچکے تھے۔ اور لوگوں کو کتی نسخے گھر بیٹھے حاصل ہوسکتے تھے۔ نظم کی وہ پرانی اہ جاتی رہی اور اب لوگ نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اپنے خیالات ظاہر کرنے لگے تھے۔

یہ تمام ترقیاں ایک بڑی حد تک ہیسٹنگز کی انتظامی کارگزاریوں کا براہ راست نتیجہ نہیں تھیں، بلکہ اس کے حقیقی کارنامے یہ تھے کہ اس نے تجارتی سرکاری عہدہ داروں سے بالکل

الگ ایک ملازمت دیوانی (سیول سروس) کی بنیاد ڈالی، عدالتوں کی تنظیم کی جن کے دروازے ملک کے تمام باشندوں کے لئے یکساں کھلے تھے ملکی تجارت کو مختلف قسم کی پابندیوں اور چنگی گھروں سے آزاد کردیا، لیکن وہ مالگذاری کے ایک قابل عمل نظام کے تیار کرنے میں ناکام رہا، اب آئندہ باب میں اس کی ان سیاسی کارگذاریوں پر بحث کی جائیگی جو کمپنی کے تعلقات و امور خارجہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

باب ۳۷

وارن ہیسٹنگز بحیثیت ایک مدبر کے

کمپنی کے خارجی تعلقات سے متعلق ہیسٹنگز کی کارگذاریوں کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے ہمیں ان مالی مشکلات کا خیال رکھنا چاہئے جو اس کے پورے دور حکومت میں اس کو پیش آتی رہیں۔ کمپنی نے اپنی سالانہ رقم بھیجنی بند کردی تھی جس پر سالہا سال سے بنگال کی تجارت کی ترقی منحصر تھی۔ اب حکومت کے اخراجات اور تجارتی لین دین کیلئے روپیہ بنگال کی مالگذاری ہی سے لینا پڑتا تھا۔ اور ہم بیان کرچکے ہیں کہ قحط سالی اور ملازمین کمپنی کی نا تجربہکاری سے یہ مالگذاری بھی بہت ہی کم ہوگئی تھی، پرانے زمانہ میں ہند کی حکومتیں جنگ اور دوسری ضروریات کیلئے روپیہ اٹھا رکھتی تھیں اور وقت ضرورت اس کو کام میں لاتی تھیں، کمپنی کے پاس اس قسم کا جمع کیا ہوا کوئی سرمایہ نہیں تھا۔ ہند کے باشندوں سے قرض لینا بھی گوارا نہیں تھا، اس دور میں بعض اوقات جو روپیہ بطور قرض لیا گیا وہ محض انتہائی مجبوری کی حالت میں تھا، اس کے علاوہ یہ ماننا پڑیگا کہ ہیسٹنگز ایک قابل ماہر مالیات نہیں تھا، اگر کوئی دوسرا اس کی جگہ ہوتا تو شاید اس سے بہتر روپیہ پیسہ کا انتظام کرسکتا تھا۔

ہیسٹنگز نے جب بنگال کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو پہلے پہل صرف دو طاقتوں سے اس کا سابقہ تھا، یعنی شہنشاہ دھلی اور نواب وزیر والی اودھ؛ لیکن جب وہ گورنر جنرل ہوا تو قانون تنظیم کی روسے مدراس اور بمبئی کی حکومتوں کی نگرانی بھی اس کے ذمہ ہوگئی تھی اس طرح جنوبی اور مغربی ہند کی سیاسی پیچیدگیوں کا سلجھانا بھی اس کا فرض ہوگیا تھا؛ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کو ہند کے تمام انگریزوں پر کامل اختیار حاصل تھا؛ کیونکہ مدراس اور بمبئی

کی حکومتیں اب بھی براہ راست لندن سے احکام لیتی تھیں' اور اپنے معاملات میں کلکتہ کی حکومت کی مداخلت کو گوارا نہیں کرتی تھیں' چنانچہ وہ ہیسٹنگز اور اس کی مجلس کو اپنے خاص خاص معاملات کی اطلاع تک نہیں دیتی تھیں' اور ان کے وہی فیصلے قبول کرتی تھیں جو ان کی مرضی کے مطابق ہوتے تھے' حکومت کا مرکز کلکتہ کی بجاے لندن تھا' اور دو طرفہ سفر میں جو وقت لگتا تھا اس کی وجہ سے لندن کے احکام پر پورا عمل بھی نہیں ہوسکتا تھا' کیونکہ بسااوقات احکام کے پہنچنے سے پہلے مقامی حالات بدل جاتے تھے' اور ان احکام کی بجاے نئے احکام کے جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی' خود ہیسٹنگز اور اس کے رفقاےکار کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کا صحیح مرتبہ اور مقام کیا ہے' اور ہند کی ریاستوں کے لئے کمپنی کے ارباب اقتدار کے بعض افعال بالکل ناقابل فہم رہے ہونگے۔

کلائیو کے ہند سے جانے کے بعد اور ہیسٹنگز کے یہاں آنے سے پہلے شمالی ہند کے سیاسی حالات میں ایک اہم تبدیلی پیدا ہوگئی تھی' مرہٹے پانی پت کی زبردست شکست کے بعد پھر سے سنبھل چکے تھے' اور دہلی پر انہوں نے پھر سے اپنا قبضہ جمالیا تھا' انہوں نے شہنشاہ دہلی کو دہلی واپس آنے کی دعوت دی' ور جب انگریزوں کے مشورہ کے خلاف وہ دہلی پہنچا تو مرہٹوں نے عمر بھر کیلئے اس کو اپنا قیدی بنالیا ہیسٹنگز نے مغل شہنشاہ کی اس حرکت کو اس معاہدہ کی خلاف ورزی قرار دیا' جو اس نے کلائیو کے ساتھ کیا تھا چنانچہ اس نے بنگال کی سالانہ پیشکش بھیجنی بند کردی' اور الہ آباد کا علاقہ بھی شہنشاہ سے چھین کر تھوڑی سی رقم کے معاوضہ میں اس کو والی اودھ کے حوالے کردیا' اس طرح انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان جن کی دشمنی بالکل آشکارا تھی' والی اودھ کی حلیف ریاست حائل ہوگئی' اس سے ہیسٹنگز کا ایک ابتدائی مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں

کو اپنے حدود مملکت سے دور رکھا جائے چنانچہ وہ اس حکمت عملی میں کامیاب ہوگیا.

پھر سنہ ۱۷۷۴ع میں روھیلوں کے ساتھ جو جنگ پیش آئی اس کو اسی حکمت عملی کا ایک لازمی نتیجہ سمجھنا چاھئے ھم پہلے بیان کرچکے ھیں کہ ایک جانباز افغانی نے اودھ کے شمال مشرق میں روھیلکھنڈ کی ایک مضبوط ریاست قایم کرلی تھی ' اس وقت اس پر مختلف سردار حکومت کر رہے تھے ' لیکن ان سب کا سر گروہ ایک ایسا شخص تھا جس نے غاصبانہ طور پر پچھلے بادشاہ کی حکومت پر قبضہ کرلیا تھا ' اس ملک پر مدتوں سے والی اودھ اور مرھٹوں کی آنکھیں لگی ھوی تھیں اور انگریزوں کا فائدہ اسی میں تھا کہ وہ مرھٹوں کی بجاے والی اودھ کی تائید کریں ' چنانچہ ھیسٹنگز نے اپنے سپاھیوں سے اس کی امداد کی ۔ روھیلے بہت بری طرح شکست کھائے اور ان کے ملک کا ایک بڑا حصہ والی اودھ کی سلطنت میں شامل کرلیا گیا ۔

اسی زمانہ میں فرخ آباد کی ریاست جو روھیلکھنڈ کے جنوب میں واقع تھی والی اودھ کی باجگذار بن گئی تھی ۔ اس طرح گنگاتی میدانوں کا ایک بڑا حصہ کمپنی اور اس کے حلیف والی اودھ کے قبضہ میں آگیا تھا ' آگے جنوب اور مغرب میں صرف مرھٹے ان کے سب سے بڑے دشمن رہ گئے تھے ' مغربی ھند میں بمبئی کی چھوٹی سی نوآبادی کا مرھٹوں سے براہ راست تعلق تھا ۔ یہ لوگ جیسا کہ ھم پہلے پڑھ چکے ھیں جنوبی ھند کے سیاسی الجھاؤ میں ایک اھم سبب بنے ھوے تھے ۔ اس طرح مرھٹوں اور انگریزوں کے درمیان پہلی مرتبہ لڑائی کی صورت پیش آگئی تھی مرھٹے ابھی تک اپنی جارحانہ حکمت عملی پر کاربند تھے ' اور انگریز اس وقت جارحانہ اقدام کرنے کی بجاے محض اپنے مقبوضات کو مستحکم کرنے کی فکر میں لگے ھوے تھے .

ھم پہلے لکھ چکے ھیں کہ کس طرح مرھٹوں نے پونا کے پیشوا کے ماتحت اپنی ریاستوں کا ایک وفاق قایم کرلیا تھا '

سنہ ۱۷۷۲ع تک پونا کی گدی پر قابل پیشوا بیٹھتے رہے ' لیکن اس کے بعد سے جانشینی کے جھگڑے کھڑے ہوگئے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہونے لگیں اگرچہ مرهٹی ریاستوں کے حکمرانوں نے پیشوا سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا تھا تاهم عملاً وہ خود مختار تھے اور ہر ایک کو اپنا اقتدار بڑھانے ہی کی فکر لگی ہوی تھی ' ان حالات میں اگر ایک طرف مرهٹوں کا اتحاد ٹوٹ رہا تھا تو دوسری طرف انگریزوں کے اندر عمل کی یگانگت ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوی تھی ۔

انگریزوں کی مرهٹوں سے پہلی ٹکر مغربی هند میں ایک مقامی مسئلے پر ہوی ' بمبئی سے گجرات جانے والی سڑک جزیرۂ سالسٹ میں سے ہوکر گذرتی تھی ' اور تجارتی اور جنگی دونوں حیثیتوں سے اس پر اپنا قبضہ رکھنا انگریزوں کیلئے بہت ضروری تھا ' چنانچہ ان کا دعوی تھا کہ سنہ۱٦٦۱ع کے معاهدہ کی روسے بمبئی کے ساتھ سالسٹ کا جزیرہ بھی انہیں ملنا چاهئے ' مگر پرتگالیوں نے دینے سے سخت انکار کیا ' اور سنہ ۱۷۳۹ع تک اس کے مالک بنے رہے یہاں تک کہ مرهٹوں نے ان کو اس جزیرہ سے مار بھگایا بمبئی کے انگریزوں نے مرهٹوں سے سمجھوتہ کے ذریعہ اس جزیرہ کو حاصل کرنے کی نا کام کوشش کی ' آخر سنہ ۱۷۷۳ع میں اس کے لینے کا ایک بہترین موقع هاتھ آیا ' بعض مرهٹوں نے رگھوناتھ راؤ * کو پیشوا کی گدی سے الگ کرکے اسپر ایک چھوٹے بچے کو بٹھا دیا تھا ' اور اس کی نگرانی مجلس و زراء کے سپرد کردی تھی رگھوناتھ راؤ نے انگریزوں سے امداد طلب کی ' چند دن تک گفت وشنید کرنے کے بعد دونوں کے درمیان سنہ ۱۷۷۵ع میں سورت کا معاهدہ ہوا جس کی ایک شرط یہ تھی کہ انگریزوں کی فوجی امداد کے معاوضہ میں سالسٹ کا جزیرہ ان کے حوالے کیا جائیگا ' بمبئی کی انگریزی فوج نے مرهٹوں پر کامیاب حملہ کیا اور ان کے بحری بیڑے کو تباہ و

* رگھوناتھ راؤ کو رگھوبا بھی کہا جاتا ہے ، وہ دادا صاحب کے نام سے بھی مشہور تھا ۔

تاراج کردیا ' لیکن اس موقعہ پر کلکتہ کی حکومت نے مداخلت کی اور کہا کہ حکومت بمبئی کی مرھٹوں سے جنگ قانون تنظیم کے صریحاً مخالف ھے ' اس لئے اس نے جنگ روک دینے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ھی مارچ سنہ ۱۷۷٦ع میں نانا فدنویس سے صلح کرلی ' جو اس زمانہ میں مرھٹوں کی مجلس وزرا کا ایک قابل اور ذی اثر اور با اقتدار صدر تھا ' تاریخ میں یہ صلحنامۂ پورندھر کے نام سے مشہور ھے ' اس کے ذریعہ سورت کے معاھدہ کو منسوخ قرار دیا گیا ' اور رگھوناتھ راؤ کو وظیفہ دیدیا گیا اور سالسٹ کا جزیرہ انگریزوں کے حوالے ھوگیا اور ان کے ساتھ دوسری مراعات بھی ان کو حاصل ھوگئیں جن کا اس نے وعدہ کیا تھا .

اسکے بعد نئی پیچیدگیاں پیدا ھوگئیں ' لندن سے ایک مراسلہ پہنچا اس میں سورت کے معاھدہ کی تصدیق اور توثیق کی گئی تھی ' جسکو حکومت کلکتہ نے باطل قرار دیا تھا ' اور بمبئی کی حکومت کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ پھر سے اس معاملہ میں رگھوناتھ راؤ سے گفت و شنید کرے ' لیکن چند دن کے بعد ایک دوسرا مراسلہ آیا ' جس میں پہلے مراسلہ پر افسوس ظاھر کیا گیا تھا اور پورندھر کے معاھدہ کی تصدیق اور توثیق کی گئی تھی ' اور یہ بھی ظاھر کیا گیا تھا کہ اگر پونا کی طرفسے اس معاھدہ کی خلاف ورزی ھو تو بمبئی کی حکومت رگھوناتھ راؤ سے گفتگو کرنے کی مختار ھوگی ' اور پونا کی حکومت نے کچھ تو اپنی اندرونی سازشوں کی بنا پر اور کچھ انگریزوں کے حقیقی مقاصد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس معاھدہ پر پوری طرح عمل نہیں کیا ' چنانچہ بمبئی کی حکومت نے رگھوناتھ راؤ کے ساتھ پھر سے معاھدہ کرلیا اور بمبئی کی مجلس عاملہ نے سنہ ۱۷۷۸ع میں اپنے ایک آدمی کو پونا کے نا بالغ پیشوا کا اتالیق مقرر کرنے کا فیصلہ کرلیا .

اس سال نومبر کے مہینہ میں بمبئی کی کمزور فوجیں پونا روانہ ھوئیں فوجی انتظامات کے ٹھیک نہ ھونے کی وجہ سے

انگریز سپہ سالار کو سخت شکست ہوی اور اس نے ایسی شرطوں پر مرھٹوں سے صلح کرلی جنکو بمبئی اور کلکتہ کی دونوں حکومتوں نے تسلیم نہیں کیا ' اس درمیان میں ھیسٹنگز نے بمبئی کی امداد کیلئے جمنا سے ایک فوج روانہ کردی تھی ' جو ٹھیک وقت پر سورت پہنچی' یہاں کرنل گوڈرڈ نے فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی' اور سنہ ۱۷۷۹ع کا بڑا حصہ سیاسی گفت و شنید میں صرف ہوا ' تا آنکہ اس سال کے آخر میں گوڈرڈ کو معلوم ہوا کہ مرھٹے حیدرآباد اور میسور کے ساتھ متحد ہوکر انگریزوں کے تمام مقبوضات ہند پر بیک وقت حملہ آور ہونا چاھتے ھیں ' اس اتحاد کو سمجھنے کیلئے جنوبی ہند کی سیاسی تاریخ پر ایک نظر ڈالنی ہوگی .

مدراس کی مجلس منتظمہ کو بنگال کی مجلس منتظمہ کی طرح حکومت کے اختیارات حاصل نہیں تھے ' سرکاری حیثیت سے اس کا فرض یہی تھا کہ تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کرے - مگر انفرادی طور پر ھر ایک انگریز اپنی قسمت کے بنانے میں مصروف تھا ' حکومت ابھی تک آرکاٹ ھی کے نواب کے ھاتھ میں تھی جو بہت سے انگریزوں کا انفرادی حیثیت سے مقروض تھا ' کہ نوابی شان نہیں تھا ' تاھم وہ اسی کی حمایت پر کمر بستہ تھے ' کیونکہ انہیں ڈر لگا ہوا تھا کہ اگر اس کی حکومت چھن جائے تو قرض دیا ہوا سارا روپیہ یونہی ڈوب جائیگا ' آرکاٹ کا نواب بھی اس موقعہ سے فطری طور پر فائدہ اٹھانا چاھتا تھا ' اس نے تمام اصلاحات سے پہلوتھی کی ' اور وہ انگریزوں کی امداد سے اپنی حکومت کو وسیع کرنے کی کوشش کرتا رھا ' اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ھمسایہ ریاستوں سے جوڑ توڑ اور ساز باز بھی کرتا رھا .

اس درمیان میں حکومت مدراس کی بے موقع حکمت عملی سے میسور اور حیدرآباد انگریزوں کے سخت مخالف ہوگئے اور پھر لندن کے غیر منصفانہ احکام کی وجہ سے معاملات اور پیچیدہ ہوگئے ' یہاں تک کہ سنہ ۱۷۷۸ع میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ

جنوبی ہند میں انگریزوں کا کوئی طرفدار اور حامی نہیں رہا تھا اور جب انگلستان اور فرانس ‘ ریاستہاے متحدہ امریکہ اور ہالینڈ کے درمیان جنگ چھڑگئی تو یہاں کے سیاسی معاملات میں اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ‘ ہند کی ریاستوں کے دربار میں فرانسیسیوں کو بہت زیادہ رسوخ حاصل تھا ‘ اپنی اس حیثیت سے فائدہ اٹھاکر انھوں نے سنہ ۱۷۷۹ع میں حیدرآباد ‘ میسور اور مرھٹوں کو انگریزوں کے خلاف متحد کردیا ‘ اگر ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی غرض کو سامنے نہ رکھتا تو ان کے اس اتحاد سے ضرور فائدہ ہوتا حیدرآباد بہت جلد لڑائی سے الگ ہوگیا ‘ بعض مرھٹے انگریزوں سے جاملے ‘ اور اب صرف میسور اپنی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ انگریزوں کے مقابلہ پر اترآیا ۔

اس زمانہ میں مرھٹوں کی چار ریاستیں قایم تھیں ‘ ان میں سے ناگپور کا بھونسلہ حکمران صاحب عزم و ہمت نہیں تھا ‘ ہیسٹنگز نے آسانی کے ساتھ اس کو اپنا طرفدار کرلیا ‘ گجرات کے اندر گیکواڑ خاندان میں جانشینی کے جھگڑے کھڑے ہوگئے تھے ‘ ان میں سے ایک دعویدار سلطنت کو پہلے ہی سے انگریزوں کی امداد حاصل تھی اور اب ہولکر اور سندھیا کی سخت مخالفت کے باوجود جنرل گوڈرڈ نے سنہ ۱۷۸۰ع کی ابتدا میں اس دعویدار سلطنت کی حمایت کی اور اس کو اپنی طاقت کے زور سے تخت پر بٹھایا باقی دو ریاستوں میں سندھیا کی بڑی اہمیت تھی کیونکہ اس خاندان کا راجہ مہادجی سندھیا ایک زبردست مدبر اور تجربہ کار سپاہی تھا ‘ وہ اگرچہ پیشوا کے حکم کو مانتا تھا ‘ تاہم اپنی طاقت کے بڑھانے کی بھی وہ کوشش کر رہا تھا ‘ اس نے مالوہ میں اپنی ایک مضبوط حکومت قایم کرلی تھی جس کا صدر مقام مشہور تاریخی شہر اجین تھا ‘ گوالیار کا زبردست قلعہ اس کے ہاتھ میں تھا ‘ جہاں سے وہ شمال کی طرف آگرہ اور دھلی جانے والی سڑکوں پر اپنا قبضہ اقتدار قایم رکھ سکتا تھا ‘ بمبئی کی انگریزی فوج میں اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں تھی ان حالات میں ہیسٹنگز نے ایک چالبازی کی ‘ مہادجی کی ترجہ کو بمبئی

سے ہٹانے کے لئے آگسٹ سنہ ۱۷۸۰ع میں اچانک گوالیار کے قلعہ پر رات میں حملہ کیا اور اس کو فتح کرلیا ' یہ سنکر مہاد جی سندھیا شمال کی طرف روانہ ہوا ' اور فروری سنہ ۱۷۸۱ع میں انگریزوں کے مقابلہ میں سخت شکست کھائی ' اب اس کے لئے صلح سے بہتر کوئی شکل نہیں تھی چنانچہ اس سال اکتوبر کے مہینہ میں یہ صلح نامہ مرتب ہوا ' پھر حکومت پونا پر زور ڈالکر مئی سنہ ۱۷۸۲ع میں انگریزوں سے اس کا سمجھوتہ کرادیا جو تاریخ میں عہدنامہ سالبائی کے نام سے مشہور ہے ' اس کے بعد سے انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان عام طور پر امن قایم ہوگیا ۔

ہیسٹنگز کا اس طرح مرہٹوں کی توجہ کو بانٹنا انگریزی فوج کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا کیونکہ جنرل گوڈرڈ پونا اور ہولکر کی مرہٹہ فوج کے خلاف اپنی فوج کو بمشکل سنبھالے ہوے تھا ' اور ادھر مدراس پر میسور کا زبردست دباؤ پڑ رہا تھا ' مدراس کی حکومت ایسے افراد کے ہاتھ میں تھی جو بروقت تنبیہات سے کوئی فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں تھے ' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۷۸۰ع میں حیدرعلی نے کسی مزاحمت کے بغیر پورا کرناٹک روند ڈالا ' اس کے بعد جو لڑائی پیش آئی اس میں انگریزی فوج کے اندر کوئی باقاعدہ انتظام نہیں رہا حکومت مدراس نے کلکتہ سے مدد مانگی اور ہیسٹنگز نے فوراً ایک امدادی فوج روانہ کی ' دو سال تک حیدرعلی اور انگریزوں کے درمیان مختلف معرکے ہوتے رہے اور ابھی ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا کہ سنہ ۱۷۸۲ع کے آخر میں حیدرعلی کا انتقال ہوگیا ' اس کے بعد جب ٹیپو سلطان تخت نشیں ہوے تو سمندر کے راستہ سے فرانسیسیوں کی ایک تازہ دم فوج آ پہنچی ' انگریزوں میں اب بھی میسور کے مقابلہ کی طاقت نہیں تھی ' اور ان کو اس وقت ذرا اطمینان ہوا جب جون سنہ ۱۷۸۳ع میں یہ خبر آئی کہ انگلستان اور فرانس کے

درمیان صلح ہوگئی ' اب فرانسیسی فوج جنگ میں حصہ نہیں لے سکتی تھی ' مگر انگریزوں کے ساتھ ٹیپو سلطان کی جنگ اب بھی جاری تھی ' ہیسٹنگز اور گورنر مدراس کی آپس کی چشمک سے انگریزوں کا پہلو بہت کم زور ہوتا جارہا تھا ' اور مارچ سنہ ۱۷۸۴ع میں گورنر مدراس نے ٹیپو سے ایسی شرطوں پر صلح کی جن کو ہیسٹنگز نے سخت ناپسند کیا ' مگر صلحنامہ کو باطل نہیں ٹھہرایا ' اس طرح انگریزوں کے خلاف سنہ ۱۷۷۹ع کا مختلف قوتوں کا اتحاد قطعی طور پر نا کام رہا ' اور ادھر سنہ ۱۷۸۵ع میں ہیسٹنگز اپنے عہدے سے استعفا دیکر ولایت واپس چلا گیا ۔

ہیسٹنگز کی کارگذاریوں کا بیان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا ' جب تک کہ راجۂ بنارس اور بیگمات اودھ وغیرہ سے جبری طور پر اس کے روپیہ وصول کرنے کی کوششوں کو بھی بیان نہ کردیا جاے ' اس سے اس کے اخلاقی کردار پر اچھی روشنی پڑتی ہے ' اس نے جبری حصول زر کے جو طریقے اختیار کیے وہ بلا شبہ بہت ہی سخت اور پر فریب تھے ' ایک مرتبہ تو اس کو اپنے مقاصد کے حاصل کرنے میں کوئی کامیابی نہیں ہوی ' چنانچہ اسی بناء پر اس کے عام طرز حکومت اور اس کی بد عنوانیوں پر دارالامراء کے سامنے سخت مواخذہ ہوا اور اس پر مختلف الزامات لگائے گئے ' اور سنہ ۱۷۸٦ع سے ۱۷۹۵ع تک یہ مقدمہ چلتا رہا ' جس میں ہر ایک الزام کی تفصیلی تحقیق ہوتی رہی ' آخر میں وہ سارے الزامات سے بری قرار دیا گیا ' مگر پارلیمنٹ کے اراکین کی طرفسے ہیسٹنگز کے خلاف بغض و عداوت اور حسد و عناد کا جو مظاہرہ ہوا اس میں ایک بات صاف طور پر نمایاں ہے ' وہ یہ ہے کہ انگلستان کی سیاسی جماعتوں کے بہترین افراد اس بات کی خواہش رکھتے تھے کہ ہند میں کمپنی کی حکومت ان اعلی مقاصد کے مطابق ہونی چاہئے جس کی حفاظت کا ذمہ پارلیمنٹ نے لیا ہے ' اور وہ اعلی مقاصد عدل و انصاف اور حسن سلوک تھے ۔

آخر میں ہم کو ہند کی فوجوں کی جدید تنظیم کے متعلق بھی کچھ کہنا ہے ، اس دور میں تمام دیسی ریاستوں کے اندر فوج کی تربیت کیلئے مغربی قوموں کے افسر مقرر کیے گئے تھے اور تمام فوجیں جدید آلات حرب سے مسلح ہونے لگی تھیں ' اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم جنوبی ہند کے اندر ٹراونکور کی ریاست نے اٹھایا چنانچہ اس نے اس صدی کے وسط میں فلانڈرس کے ایک سپہ سالار کو اپنی فوج کی تربیت کیلئے مقرر کیا تھا ' جس کی وجہ سے اس ریاست میں اتنی طاقت پیدا ہوگئی تھی کہ حیدر علی کے حملوں کا کامیاب مقابلہ کرسکے ' اس صدی کے آخر میں دوسری ریاستوں نے بھی اس کی پیروی کی ' اور سندھیا ' ہولکر اور حیدرآباد کی ریاستوں نے اپنے ہاں یوروپین فوجی افسر مقرر کئے جن میں زیادہ تر فرانسیسی افسر تھے اب لڑائی کا انداز وہ نہ تھا جو کلائیو کے زمانہ میں تھا اب گویا پرانی اور نئی فوج کا مقابلہ نہیں تھا بلکہ یوروپین افسروں کے ماتحت دو برابر برابر کی فوجوں کے درمیان لڑائی تھی .

باب ۳۸

کارنوالیس سے ولزلی تک

ہیسٹنگز کے آخری دور حکومت میں انگلستان کی مختلف سیاسی جماعتیں ہند کے معاملات سے گہری دلچسپی لینے لگی تھیں، اور کمپنی کے متعلق مختلف قوانین کو نافذ کرنے کی کوششیں کر رہی تھیں، چنانچہ سنہ ۱۷۸۴ع میں پارلیمنٹ نے پٹ کا مرتب کیا ہوا قانون ہند (انڈیا ایکٹ) منظور کیا جس کے ذریعہ قانون تنظیم (ریگولیٹنگ ایکٹ) کی ترمیم کی گئی تھی، اس کے بعد سنہ ۱۷۸۶ع میں دوسری چند اصلاحات اس قانون میں شامل کی گئیں یہی قانون کم وبیش، سنہ ۱۸۵۸ع تک جاری رہا، اس قانون کی روسے کمپنی مجلس نظارت (بورڈ آف کنٹرول) کے ماتحت کردی گئی تھی، جس کا صدر وزارت وقت کا ایک رکن ہوتا تھا، آگے چلکر اس مجلس کے تمام اختیارات اس کے صدر کے ہاتھ میں آگئے تھے، اور اس طرح وزارت کو کمپنی پر پورا اختیار حاصل ہوگیا تھا، مگر عملاً اس مجلس کا صدر تمام معاملات میں نظماء کمپنی (ڈائرکٹرز) سے مشورہ لیتا تھا، اور دونوں کے سمجھوتہ اور اتفاق سے کوئی فیصلہ کیا جاتا تھا، اس قانون کے جاری ہونے کے بعد سے عام طور پر ایسے شخص کو گورنر جنرل بنایا جانے لگا جو پہلے سے کمپنی کا ملازم نہیں ہوتا تھا، ہیسٹنگز کے زمانہ کی بہ نسبت اب گورنر جنرل کے اختیارات بہت وسیع ہوگئے تھے وہ ضرورت کے وقت اپنی مجلس عاملہ کے مشورہ کے خلاف عمل کرسکتا تھا، مدراس اور بمبئی کی حکومتوں پر اس کو کامل اختیار تھا، بعض اوقات وہ فوجوں کی قیادت بھی کرسکتا تھا، الغرض جب تک وزارت کا اس پر اعتماد رہے وہ کمپنی کے تمام مقبوضات ہند میں اپنا حکم جاری کرسکتا تھا.

اس قسم کے وسیع اختیارات سب سے پہلے مارکوئیس کارنوالیس کو حاصل ہوے جو ایک تجربہ کار سپاہی اور دوربیں سیاستدان تھا ' اور بڑے مرتبہ اور اخلاق کا انسان تھا وہ سنہ ۱۷۸٦ع سے سنہ ۹۳-۱۷ع تک هند کا گورنر جنرل رہا ' اگرچہ اس کا کام کمپنی کے مقبوضات کے نظم و نسق کو درست اور ٹھیک کرنا تھا ' تاہم وہ سیاسی لڑائیوں اور چالبازیوں سے اپنا دامن بچا نہیں سکا ' یوروپ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان امن و امان قایم تھا ' مگر هند کے فرانسیسی سیاستدان ابھی تک هند میں اپنی سلطنت کے قایم کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے ' کیونکہ فرانسیسی افسروں نے سندھیا اور حیدرآباد کی فوجوں کی تربیت کی تھی ' هالینڈ پر فرانسیسی سیاستدانوں کا بڑا اثر تھا ' جنوبی هند میں ٹیپو سلطان اب تک انگریزوں کا مخالف تھا ' هند کے سیاسی حالات عام طور پر غیر مطمئن تھے مگر دوسری ریاستوں کے ساتھ کمپنی کے تعلقات دوستانہ بلکہ واجبی تھے ' اسی لیے کارنوالیس کو یوروپ اور هند کے سیاسی حالات پر خاص نظر رکھنی پڑی تھی .

کارنوالیس کی کارگذاریوں کے سلسلہ میں همکو سب سے پہلے بنگال کے نظم و نسق کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے ' هیسٹنگز اگرچہ ایک قابل عمل لائحہ حکومت کے تیار کرنے میں ناکام رہا مگر اسکے زمانہ میں کمپنی کے ملازمین کو حکمرانی کا ایک حد تک تجربہ حاصل ہوتا گیا ' اور انہوں نے اپنے ان تجربات کی بنیاد پر ایک نیا لائحہ عمل تیار کیا جسکو سنہ ۱۷۸٦ع میں کارنوالیس کے آنے سے پہلے هند کے اندر شایع کردیا گیا تھا ' کارنوالیس نے اس لائحہ عمل اور ان هدایات کی بنیاد پر جو اس کو کمپنی کی طرف سے وقتاً فوقتاً ملتے تھے ایک ایسا نظام عمل بنایا جس پر پوری انیسویں صدی کے اندر کم و بیش عملدرآمد ہوتا رہا ' هند کے دوسرے حصوں میں بھی دھیرے دھیرے اسکو نافذ کیا گیا ' اسکا سب سے بڑا ذاتی کارنامہ یہ تھا کہ اس نے

انگلستان کے مسلمہ اخلاقی اصول کے مطابق اپنی حکومت کے تمام عہدہ داروں کی سختی کے ساتھ تنظیم کی ' وہ خود بھی کمپنی کا ایک وفادار نوکر تھا ' اور چاہتا تھا کہ کمپنی کا ہر ایک ملازم اسکی طرح وفادار ثابت ہو ' اس نے ایک ضابطہ قوانین Code of Regulations تیار کیا ' جس میں ہر ایک ملازم کے فرائض کی توضیح اور تشریح کی گئی تھی ' اس ضابطہ کی تکمیل سنہ ۱۷۹۳ع میں ہوی ' اس کی پابندی ہر ایک پر لازم اور ضروری قرار دی گئی تھی ' کسی کو اپنے طبعی میلانات اور رجحانات پر عمل کرنے کی اجازت نہیں تھی ' یہ ضابطہ جو آگے چلکر برطانوی ہند کے ضخیم رجسٹر قوانین Statute book کا پہلا باب بنا کلکتہ اور مدراس کے پست تر معیار عدل و انصاف اور دیانتداری کو مد نظر رکھکر نہیں تیار کیا گیا تھا ' بلکہ انکی بنیاد انگلستان کے اس زمانہ کے بلند معیار عدل و انصاف اور دیانت داری پر رکھی گئی تھی ۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کمپنی کے تجارتی معاملات کو امور سلطنت سے بالکل الگ کردیا گیا تھا ' جب کارنوالیس پہلے پہل کلکتہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مجلس تجارت Board of Trade ' جس کی نگرانی میں کمپنی کا سارا تجارتی کاروبار چل رہا تھا ' براہ راست تجارتی لین دین کرنے کی بجاے اپنے ہی ملازموں کو برآمدی تجارتی سامانوں کی خرید کا سالانہ ٹھیکہ دیدیتی ہے ' ان ٹھیکیداروں کو اس زمانہ میں ریذیڈنٹ * Resident کہا جاتا تھا ان میں سے بعض ریذیڈنٹ ان سالانہ ٹھیکوں سے ذاتی نفع حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور کمپنی کو دھوکہ دیتے تھے ۔ نیز وہ ہند کے باشندوں پر جن سے وہ چیزیں خریدتے تھے ' ناجائز ظلم و ستم کرتے تھے ' کارنوالیس نے اس طریقہ کو بند کیا اور اس کے ساتھ بہت سے بد دیانت اور خائن آدمیوں کو کمپنی

* آجکل ریذیڈنٹ سے مراد وہ نمائندہ ہوتا ہے جو حکومت ہند کی طرف سے کسی ریاست کے اندر مقرر کیا جاتا ہے

کی ملازمت سے بر طرف کردیا ' اس کے بعد سے یہ ریذیڈنٹ ٹھیکہ پر کام کرنے کی بجاے ملازم کی حیثیت سے کام کرنے لگے تھے ' اس صیغہ میں اس کی اصلاحات بہت موثر اور دیرپا تھیں لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا کمپنی کی تجارت کی اهمیت بتدریج کم هوتی چلی گئی یہاں تک کہ سنہ ۱۸۱۳ع کے قانون منشور .Charter Act نے کمپنی کو هند کی تجارتی اجارہ داری سے بالکل محروم کردیا صرف چین کے اندر اس کی اجارہ داری باقی رهی یہاں تک کہ سنہ ۱۸۳۳ع کے منشور کے مطابق اس جگہ کی اجارہ داری بھی ختم کردی گئی اور کمپنی اب ایک تاجروں کی جماعت نہیں رهی ۔

ملکی نظم و نسق کی اصلاح میں تجارت سے بھی بڑھکر بڑی دشواریاں پیش آرهی تھیں ' کارنوالیس بتدریج ان کو حل کرتا جا رها تھا اور بسا اوقات اس کو پیچھے بھی هٹنا پڑتا تھا ' سنہ ۱۷۹۳ع میں جو ضابطہ قوانین Code of Regulations مکمل هوا تھا اس میں ملکی نظم و نسق کی ترتیب یہ تھی ' سب سے پہلے گورنر جنرل باجلاس کونسل تھا جس کے ساتھ ضروری دفتر معتمدی Secretariat بھی تھا ' اس کے بعد دو مجلسیں Boards تھیں ' ایک مجلس تجارت Board of Trade جس کا ذکر اوپر هوچکا ' اور دوسری مجلس مال Board of Revenue ' ان میں سے هر ایک کا صدر مجلس شوری Council هی کا ایک رکن هوتا تھا ' ملکی نظم و نسق کی ترتیب و تنظیم ضلعوں پر رکھی گئی تھی - هر ایک ضلع کے افسروں کے تین اهم فرض تھے ' ایک یہ کہ وہ امن قایم کریں ' دوسرا یہ کہ وہ مالگذاری وصول کریں تیسرا یہ کہ وہ عدل اور انصاف قایم کریں ' هم پہلے بیان کرچکے هیں کہ مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں ابتدائی دو فریضے یعنی امن اور مالگذاری ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے ۔ نوابان بنگال کے دور حکومت میں بھی یہی دستور جاری رها ' اب ملکی نظم و نسق کے نئے نظریہ کے مطابق هر ایک ضلع میں تین حاکموں کی ضرورت تھی ' یعنی میجسٹریٹ ' کلکٹر

اور جج ' کارنوالیس کو کمپنی کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ہند کے اندر نہ صرف عدل اور انصاف کو قایم کرے بلکہ قوت اور طاقت ' سادگی اور کفایت شعاری کا بھی خیال رکھے ' چنانچہ ان تینوں فرایض کی انجام دھی کیلئے چند دن تک ایک ھی حاکم مقرر کیا جاتا رھا ' آگے چلکر اس نے جج کے عہدہ کو الگ کردیا اور ایک ھی شخص کو میجسٹریٹ اور کلکٹر کے فرایض کی انجام دھی کا ذمہ دار قرار دیا مگر اس کی یہ تقسیم عام طور پر قبول نہیں ھوی' اور ایک زمانہ تک ایک ھی شخص جج اور میجسٹریٹ کے فرایض انجام دیتا رھا اور کلکٹر کا عہدہ اس سے بالکل الگ تھ ' لیکن آخرکار کارنوالیس ھی کی تقسیم کو بر قرار رکھا گیا اور آج تک اسی پر عملدرآمد ھو رھا ھے ' کیونکہ آج بھی ھر ضلع کا حاکم کلکٹر ھوتا ھے جس کو میجسٹریٹ کے پورے اختیارات حاصل ھوتے ھیں ' اور ھر ضلع یا کئی اضلاع کیلئے جج یا ججوں کا تقرر الگ سے ھوتا ھے .

کارنوالیس نے موجودہ نظام پولیس کی بھی بنیاد ڈالی ' یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمانوں کے زمانہ میں پولیس کا کوئی باقاعدہ انتظام موجود تھا ' ھر ایک دیہات کا ایک محافظ ھوتا تھا جس کا عہدہ موروثی تھا ' یہ اکثر مجرموں اور جرائم پیشہ آدمیوں کے ساتھ ملا رھتا تھا ' اس لئے ناظم صوبہ یا سپہ سالار کو جرائم کے روکنے کیلئے فوج کے مقرر کرنے کی ضرورت ھوتی تھی ' کیونکہ ان کی ملازمت کی ایک شرط امن و امان کو قایم کرنا ھوتا تھا ھر ایک مقامی حاکم کے بھی ملازم ھوتے تھے جو اس کے علاقہ میں اس کے احکام کو نافذ کرتے تھے . بنگال میں مقامی حکام کی بجاے جاگیردار اور زمیندار جرائم کی روک تھام کے ذمہ دار بنائے گئے تھے ' کارنوالیس نے ان کو اس امن و امان کے قایم کرنے کے فرض سے سبکدوش کردیا ' اور ان کے تمام ملازموں کو بر طرف کردیا ' اور اس کی بجاے ھر ایک ضلع میں پولیس کی چوکیاں قایم کیں جن کی نگرانی کا ذمہ دار میجسٹریٹ کو قرار دیا .

کارنوالیس ھی نے سب سے پہلے انگریزوں کو حکومت کے مختلف عہدوں میں زیادہ تعداد میں بھرتی کرنا شروع کیا تھا۔ ھیسٹنگز کے زمانہ میں عدالت فوجداری کی جیسی اھم خدمات پر ھندی مقرر تھے کارنوالیس نے ھر ایک ذمہ دار عہدہ پر انگریز افسر مقرر کیے اور ھندی محض ان کے محکوموں کی حیثیت سے کام کرنے لگے تھے ' اس تبدیلی کی اس لئے ضرورت تھی کہ کارنوالیس یہاں کے ملکی نظم و نسق کو انگریزی معیار اخلاق پر ڈھالنا چاھتا تھا ' ھند کے لوگ حکومت کا تجربہ رکھنے اور اس کے قابل ھونے کے باوجود انگریزی معیار اخلاق سے بالکل ناواقف تھے اور ھم کو معلوم ھے کہ ملکی نظم و نسق کا ھندی معیار یقیناً اس معیار سے گھٹا ھوا تھا جس کو کارنوالیس قایم کرنا چاھتا تھا ' اس وقت واقعۃ اس تبدیلی کی ضرورت بھی تھی ' اس لیے ھم کارنوالیس کو نشانہ ملامت نہیں بنا سکتے اگر اس کے جانشینوں نے ھند کے اندر حالات کے بدل جانے کے باوجود اس کی حکمت عملی پر سختی کے ساتھ عمل کرنا شروع کیا ۔

اگر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ھوگا کہ کارنوالیس کا ضابطہ قوانین درحقیقت قانونی حکومت (Rule of Law) کا پیش خیمہ تھا۔ انگریزوں کا ایک بڑا احسان یہ ھے کہ انہوں نے ھند والوں کو قانونی حکومت سے آشنا کیا ' لیکن اس زمانہ میں صرف طریقہ کار سے بحث تھی خود قانون کی کوئی تدوین نہیں کی گئی تھی ' مقامی عدالتوں میں اس زمانہ کے ھندو یا مسلم قانون کے مطابق فیصلہ کیا جاتا تھا ' چونکہ انگریز ان دونوں قوموں کے قوانین کے اصل ماخذ سے واقف نہیں تھے اسلیے ابتدا میں ان کو مجبوراً ان لوگوں پر اعتماد کرنا پڑا جو ان قوانین کی تشریح کیلئے مقرر کیے جاتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے ان قوانین کا انگریزی میں ترجمہ ھوتا گیا ' یہ غیر مطمئن حالت بتدریج دور ھوتی گئی ۔ سر ولیم جونس نے سنہ ۱۷۹۴ع میں منو کے قانون کا انگریزی ترجمہ Law book of Manu کے نام سے

شایع کیا، اس کے بعد سے قانونی تعبیرات کے سلسلہ میں بتدریج انگریزی طریقے استعمال کیے گئے اور خاصکر ہندو قانون ایک واضح اور مرتب صورت میں تیار ہوگیا اور پھر اس قانون کو وہ استناد حاصل ہوا جو اس کو پہلے سے حاصل نہیں تھا۔

اس تبدیلی کا ایک عمدہ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہندو رسوم جن کے اندر سماجی ترقیوں کا لحاظ کرتے پہلے رد و بدل اور ترمیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی نکھر کر سامنے آگئے۔ ہندو اہل علم جب اس قسم کی نئی حقیقتوں سے دو چار ہوتے تو وہ پرانی کتابوں کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نئی تعبیر کرکے ان کو قانونی حیثیت دے سکتے تھے۔ لیکن انگریز چونکہ اپنے کو متن کے الفاظ اور قدیم شارحین کی تشریحات کے پابند بنائے ہوے تھے اس لیے پرانے قانون کی کوئی نئی تشریح کرنے سے گھبراتے تھے، اور انگریز قانون ساز ایک ایسے قانون میں دخل نہیں دینا چاہتے تھے جس پر مذہب کا لبادہ چڑھا ہوا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہندو جو سماجی اصلاح کے پر زور حامی تھے، شخصی قانون کی تعبیر کے متعلق انگریزوں کی اس غیر معمولی احتیاط کو اپنے مقاصد کی تکمیل میں ایک زبردست روڑا خیال کرنے لگے تھے۔

کارنوالیس کے زمانہ میں ہند کے مستقل بالذات قوانین میں سب سے مشہور مالگذاری کے دوامی بندوبست کا قانون ہے، جب وہ گورنر جنرل ہوکر آیا تو کمپنی اس نظریہ کو قبول کر چکی تھی کہ مالگذاری کی رقم کو ہمیشہ کے لئے متعین کردینا چاہئے اس سلسلہ میں ہیسٹنگز نے پہلا قدم اٹھایا اور زمینداروں پر پہلے پہل دس سال کا یکمشت لگان مقرر کردینے کا فیصلہ کیا تھا، سنہ ۱۷۹۰ع میں یہ بندوبست مکمل ہوچکا تھا مگر کارنوالیس نے اپنے تجربہ کار مشیروں کی راے سے اختلاف کیا، اور کہا کہ ان اطلاعات کی بناء پر جو اس وقت فراہم ہوچکی ہیں کمپنی بجا طور پر دوامی بندوبست کا فیصلہ کرسکتی ہے انگلستان کے

حکام نے اس کی اس رائے سے اتفاق کیا اور سنہ ۹۳ء۱ع میں بنگال کے اندر دوامی بندوبست کو جاری کیا گیا۔

دوامی بندوبست کے حق میں فیصلہ دینے کیلئے دو خاص وجھیں تھیں، پہلی تو یہ ھے کہ آدم اسمتھ اور دوسرے مصنفین کے زیر اثر امور مملکت میں آسان اور یقینی طریقوں کے اختیار کرنے کے نظریہ کو انگلستان میں قبولیت حاصل ھوتی جارھی تھی، اور کمپنی اور مجلس نظارت (Board of Control) نے اس نظریہ کو قطعی طور پر تسلیم کرلیا تھا اسکے علاوہ مالگذاری کی وقتاً فوقتاً تشخیص بہت سی دشواریوں کا باعث تھی اور ملک کے اقتصادی حالات میں اسکی وجہ سے بڑی بد نظمی پیدا ھوجاتی تھی، کارنوالیس ایک عملی آدمی تھا، وہ چاھتا تھا کہ دوامی بندوبست کرکے سرکاری ملازموں کو دوسرے ضروری کاموں کی طرف توجہ دلائے دوسری وجہ انگریزوں کی یہ امید تھی کہ اگر زمیندار مالگذاری کے اندر اضافہ نہ ھونے کے متعلق همیشہ کے لئے مطمئن ھوجائیں تو وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ زراعت کو فروغ دینے کی کوشش کرینگے، جیسا کہ اسی زمانہ میں انگلستان کے اندر ھوا تھا، لیکن انکی یہ امید پوری نہیں ھوسکی، کیونکہ دوامی بندوبست سے سرکاری آمدنی کا وہ ذریعہ بالکل محدود اور متعین ھوگیا جس سے حکومت کو زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل ھونے کی توقع ھوسکتی تھی، اسکے علاوہ کاشتکاروں کے تحفظات کا کوئی خیال نہیں کیا گیا، اسطرح ایک اور بڑی مصیبت کا بیج بویا گیا جو آبادی کے بڑھنے کے بعد قابل زراعت زمینوں کے حاصل کرنے کی کشمکش کی صورت میں ظہور پذیر ھوئی، زمیندار جانتا تھا کہ اسکو کتنی رقم سرکار کو ادا کرنا ھے، اسلئے وہ کاشتکاروں سے زیادہ سے زیادہ لگان حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس نئے نظام مالگذاری کا دوسرا برا نتیجہ یہ ھوا کہ بہت سے پرانے زمیندار اپنے مالکانہ حقوق سے بالکل بیدخل

کردئے گئے ، کیونکہ جب ان کی طرف سے وقت پر مالگذاری کی رقم ادا نہیں ہوتی تو حکومت آئندہ کسی مہلت یا رعایت کے بغیر ان کی زمینیں ایک ایسے شخص کے حوالے کردیتی تھی جو پہلے سے بھی بڑھکر رقم ادا کرنے پر آمادہ ہوتا تھا اس میں بعض اوقات لوگوں کی خود غرضی اور نفسانیت کام کرتی تھی چنانچہ یہ زمینداریاں رفتہ رفتہ ایسے لوگوں کے قبضہ میں چلی گئیں جن کو کاشتکاروں کے ساتھ کسی قسم کی ذاتی ہمدردی نہیں تھی اور جن کا مقصد لوٹ کھسوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا .

اب ہم بنگال کے نظم و نسق کو چھوڑ کر کارنوالیس کے دور حکومت کے اہم سیاسی واقعات کو بیان کرتے ہیں ، اس دور میں صرف ایک طاقت سے کمپنی کی لڑائی رہی ، اور وہ طاقت ریاست میسور کی تھی ، ٹیپو سلطان سنہ ۱۷۸۴ء کے صلحنامہ سے مطمئن نہیں تھے ، وہ پہلے مرھٹوں اور نظام حیدرآباد کو ختم کرکے پھر جنوبی ہند کے انگریزوں کو تباہ کرنا چاھتے تھے ، چنانچہ سنہ ۱۷۸۶ء میں انھوں نے مرھٹوں اور نظام حیدرآباد سے جنگ کی ، مگر ان کو شکست نہیں دے سکے ، کچھ دن بعد انھوں نے انگریزوں کے خلاف فرانس سے امداد طلب کی ، لیکن حوصلہ افزائی کے سوا کوئی خاص امداد نہیں مل سکی ، سنہ ۱۷۸۹ء میں انھوں نے ٹراونکور کی ریاست پر حملہ کیا ، جسکے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قایم تھے ، اس موقعہ پر کارنوالیس نے مداخلت ضروری سمجھی ، اس نے مرھٹوں اور نظام حیدرآباد سے صلح کرکے ٹیپو سے جنگ شروع کی ، سنہ ۱۷۹۰ء کی پہلی جنگ کا نتیجہ انگریزوں کے حق میں بہت برا رہا ، اس لئے سنہ ۱۷۹۲ء میں کارنوالیس نے بذات خود فوج کی قیادت کی ، اور اس نے ٹیپو کی فوج کو سرنگاپٹم کے قلعہ میں گھیر لیا ، آخر ٹیپو نے مجبوراً اپنی آدھی ریاست کو دشمنوں کے حوالے کرکے اتحادیوں سے صلح کرلی ، جس کو انھوں نے آپس میں بانٹ لیا ،

لیکن یہ فیصلہ آخری اور قطعی نہیں تھا ، چند سال کے بعد ایک دوسری اور فیصلہ کن جنگ ہونی لازمی تھی ۔

اودھ اور کرناٹک کے اندرونی حالات اطمینان بخش نہیں تھے ، یہ دونوں ریاستیں انگریزوں کی حلیف تھیں ، کارنوالیس کے دور حکومت میں ان دونوں ریاستوں کے اندر کوئی قابل ذکر واقعات پیش نہیں آئے ، ہند کے دوسرے حصوں میں سندھیا کا حکمران مہادجی بہت ہی زبردست اور طاقتور ہوگیا تھا ، وہ اپنی ریاست کے حدود کو وسیع کرنا چاہتا تھا ، کچھ دن تک تو اس کو اپنے مقاصد میں کوئی کامیابی نہیں ہوی ، فرانسیسیوں نے اس کی فوج کی تربیت کی تھی ، اور اس کی وجہ سے اس کے فوجی مصارف ناقابل برداشت حد تک بڑھ گئے تھے ۔ اس کے علاوہ راجپوتوں کے مقابلہ میں اس کو بڑی شکست ہوی تھی ادھر سنہ ۸۸ـ۱ع میں ایک پٹھان سردار نے دھلی پر قبضہ کیا ، شاہی محل کو خوب لوٹا اور شہنشاہ کی آنکھیں پھوڑ دیں * دوسرے سال حالات نے پلٹا کھایا ، مہادجی نے دھلی پر قبضہ کرلیا ، اندھے بادشاہ کو تخت پر بٹھایا اور اس کے نام سے خود ہی تمام مملکت کا حقیقی فرمانروا ہوگیا ، اس کے بعد اس نے راجپوتوں کو زبردست شکست دی اور سنہ ۹۲ـ۱ع میں ہولکر کی فوج کو تبہ کیا جو کھلے یا خفیہ طور پر اس کے تمام منصوبوں کی مخالفت کرتے تھے اور مرھٹوں کے اندر سیاسی توازن کے قایم رکھنے کے لئے وزراء پونا سے ساز باز کر رہے تھے ، اس طرح پورے شمالی ہند پر مہاد جی کی دھاک بیٹھ گئی تھی ، اور وہ اپنا رسوخ بڑھانے کے لئے پونا بھی ہو آیا تھا ۔

---

* یہ وحشیانہ فعل اس ایشیائی تصور پر مبنی تھا کہ ایک اندھا شخص بادشاہ نہیں بن سکتا ، ترکوں کے زمانہ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ معزول کیے ہوئے بادشاہوں یا تخت کے دعویداروں کو اندھا کردیا جاتا تھا بعد کے زمانہ میں بھی اس قسم کے واقعات ہوتے رہے ہیں ۔

جب کارنوالیس سنہ ۱۷۹۳ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوا تو ہند کی سیاسی حالت وہ تھی جس کا اوپر ذکر ہوا ، اس کی جگہ سرجان شور (۱۷۹۳ - ۱۷۹۸) گورنر جنرل مقرر ہوا ' وہ پچیس سال سے زیادہ کمپنی کی ملازمت کرچکا تھا ' اور ترقی کرکے مجلس مال (Board of Revenue) کا صدر ہوگیا تھا ' وہ اگرچہ کارنوالیس کے دوامی بندوبست کا سخت مخالف تھا تاہم اس نے اس کے ادھورے کاموں کو بڑی وفاداری کے ساتھ پورا کیا ' اسنے کمپنی کے خارجی امور میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی ' اور ایسے مواقع پر بھی مداخلت کرنے سے انکار کیا جبکہ انگلستان اور ہند دونوں کا اس میں فائدہ ہوسکتا تھا ' اس کے زمانہ میں یوروپ اور ہند کے اندر سیاسی حالات بڑی تیزی کے ساتھ بدلتے گئے یوروپ کے اندر انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی جسکا سلسلہ سنہ ۱۸۱۵ء تک جاری رہا ' اس کے آثار ہند میں بھی ظاہر ہوے ' یہاں بہت سے اہم اشخاص نے وفات پائی ' جس کی وجہ سے یہاں کے سیاسی حالات میں ایک انقلاب برپا ہوگیا ' مرھٹوں کے اندر سنہ ۱۷۹۴ء میں مہادجی سندھیا کا اچانک انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ پر اس کا کمسن بھتیجا دولت راؤ تخت نشیں ہوا ' ایک سال بعد اھلیہ باڈی کا انتقال ہوگیا جس نے مالوہ کے اندر ہولکر کی ریاست کو ترقی دیکر ایک بہت ھی سر سبز و شاداب خطۂ زمین بنا دیا تھا ' اھلیہ باڈی کی وفات کے تھوڑے دن بعد جب اس کے جانشین کا بھی انتقال ہوگیا تو اس کی ریاست میں انتشار پیدا ہوگیا ' سنہ ۱۷۹۵ء میں پونا کے پیشوا نے خود کشی کرلی ' اور اس کی وجہ سے یہاں پھر سے خانہ جنگی شروع ہوگئی' اسی سال آرکاٹ کے نواب نے بھی وفات پائی ' اور دو سال بعد سنہ ۱۷۹۷ء میں اودھ کے نواب کا بھی انتقال ہوگیا ' چنانچہ جب سر جان شور کے بعد لارڈ مارننگٹن ' جو آگے چل کر مارکوئیس ولزلی کے نام سے مشہور ہوا ' ہند کا گورنر جنرل بن کر آیا تو اس وقت ہند کا سیاسی مطلع بہت ھی غبار آلود تھا .

اس درمیان میں یوروپ کی جنگ بہت ترقی کرچکی تھی ' اس سے صاف ظاہر تھا کہ نپولین ایشیا کو فتح کرنے کے منصوبے سونچ رہا ہے ' اس وقت فرانسیسی فوجیں مصر میں اتر چکی تھیں ' ولزلی (سنہ ۱۷۹۸ء - ۱۸۰۵ء) کے نزدیک ہند سے زیادہ یوروپ کی جنگ بڑی اہمیت رکھتی تھی ' وہ ہند کے اندر اپنی تمام قوت کو نپولین کے خلاف لگا دینا چاھتا تھا ' اس لحاظ سے جنوبی ہند میں ایک فوری کارروائی کی ضرورت تھی ' کیونکہ حیدرآباد کی فوج سے جو فرانسیسی افسروں کی زیر تربیت تھی ' انھیں ایک زبردست خطرہ لاحق ہوگیا تھا ' ادھر ٹیپو سلطان نے فرانسیسیوں سے اتحاد کرلیا تھا ' اور جزیرہ ماریشیس سے ایک فرانسیسی دستہ ٹیپو کی مدد کیلئے آچکا تھا ' ولزلی نے حیدرآباد سے ایک معاہدہ کیا اور پھر وہ وہاں سے فرانسیسی فوجوں کے نکلوانے میں کامیاب ہوگیا ' اس کے بعد ٹیپو سے مطالبہ کیا کہ وہ فرانسیسیوں کی دوستی کو ترک کردیں ' کئی دن تک اس معاملہ پر گفت وشنید ہوتی رہی ' ولزلی کی شرایط کچھ ایسی سخت تھیں کہ آخر ٹیپو نے ان کو تسلیم نہیں کیا چنانچہ فروری سنہ ۱۷۹۹ء میں ولزلی نے مدراس کی فوج کو ٹیپو کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیا ' ٹیپو پر انگریزوں کا یہ حملہ بہت کامیاب رہا ' کیونکہ انگریزی فوج نے اپریل کے مہینہ میں ٹیپو کو سرنگاپٹم کے اندر قلعہ بند ہونے پر مجبور کردیا اور مئی کے مہینہ میں اس قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا ' ٹیپو لڑکر شہید ہوگئے اور ان کے لڑکے نے اطاعت کرلی ' اور میسور کی پوری ریاست انگریزوں کے حوالے ہوگئی .

ٹیپو کی شہادت سے ہندو آبادی کو کوئی افسوس اور رنج نہیں ہوا ' کیونکہ ان کی حکومت میں ہندووں کے ساتھ بہت برا سلوک ہوتا تھا ' ریاست کے مغربی ' جنوبی ' اور جنوب مشرقی علاقے صوبہ مدراس میں شامل کرلئے گئے ' مرکزی حصہ پرانے ہندو خاندان کے حوالے کردیا گیا جس نے کمپنی کی

ماتحتی قبول کرلی تھی، موجودہ ریاست میسور در حقیقت کرنل آرتھر ولزلی کے زمانہ میں، جو آگے چلکر ڈیوک آف ولنگٹن کے نام سے مشہور ہوا، وجود میں آئی ہے، اسی نے ریاست کو بحری قزاقوں سے پاک کیا اور اس کی سرحدوں پر امن اور امان قایم کیا۔

اس کے بعد جو حالات پیش آئے ان سے کرناٹک کی ریاست کا بھی خاتمہ ہوگیا، سرنگاپٹم کے کاغذات میں چند ایسے خطوط بھی دستیاب ہوئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ نوابان آرکاٹ کی ٹیپو سے خفیہ مراسلت جاری تھی، ان سے نوابان آرکاٹ کی بد عہدی کا ثبوت ملتا تھا، اس لئے ولزلی نے ریاست کرناٹک کے ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا جس کی ایک مدت سے خواہش کی جاتی تھی، اتفاقاً اسی زمانہ میں نواب عمدۃالامرا کا انتقال ہوگیا، ولزلی نے ان کے لڑکے سے مطالبہ کیا کہ وظیفہ لیکر ریاست سے دستبردار ہوجائے، مگر جب اس نے انکار کیا تو اسی خاندان کے ایک دوسرے فرد کو جس نے ولزلی کی پیش کردہ شرط کو تسلیم کرلیا تھا مسند پر بٹھا دیا۔

چند دن پہلے ریاست تنجاور کے حکمران کے ساتھ بھی اسی قسم کا طرز عمل اختیار کیا گیا تھا، برطانوی فوج کی حفاظت کے معاوضہ میں حیدرآباد سے وہ تمام علاقے واپس لے لئے گئے جو ریست میسور سے لیکر اس کے حوالے کئے گئے تھے، اس طرح سنہ ۱۸۰۰ء کے قریب صوبہ مدراس قریب قریب اپنی موجودہ شکل میں انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تھا، اس میں میسور، ٹراونکور اور دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستیں بحیثیت ایک محکوم کے شامل تھیں، صوبہ مدراس سے شمال مغرب میں مرہٹوں کی اور شمال میں حیدرآباد کی ریاست تھی، شمالی اضلاع سرکار کا تنگ ساحلی علاقہ جس کی سرحد اوریسہ تک پہنچتی تھی، انگریزوں کے قبضہ میں تھا، اس پورے علاقے میں فرانسیسیوں یا ان کے دست نگر حلیف یعنی ولندیزیوں سے کوئی خطرہ

نہیں تھا ، کیونکہ ان دونوں قوموں کے ہندی مقبوضات پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا تھا ، ولندیزی * اصل سر زمین ہند پر پھر سے اپنے قدم نہیں جما سکے تھے البتہ واٹرلو کی جنگ کے بعد جو معاہدات ہوے ان کی روسے فرانسیسیوں کو پھلچری اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مقامات واپس مل گئے ، جن پر ان کا اب تک تسلط قایم ہے ، اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب ڈنمارک پر فرانسیسیوں کا اقتدار قایم ہوگیا تو انگریزوں نے ٹرانکوبار فتح کرلیا ، جنگ کے ختم ہونے کے بعد اگرچہ یہ قلعہ ڈنمارک کو واپس دیدیا گیا تھا مگر سنہ ۱۸۴۵ع میں ہند کے اور ڈینی مقبوضات کے ساتھ اس جزیرہ کو بھی کمپنی نے خرید لیا تھا .

اب شمالی ہند میں ولزلی کو اودھ کے نازک معاملات سے سابقہ پڑا ، یہاں فرانسیسیوں کے اثر اور رسوخ کا کوئی سوال نہیں تھا ، کیونکہ پوری ریاست کی حفاظت برطانوی فوج کر رہی تھی ، جس کے معاوضہ میں والی اودھ کمپنی کو سالانہ نقد روپیہ ادا کرتا تھا ، اس فوج کے ماتحت ریاست کے اندر بد انتظامی ، اور رشوت خواری خوب ترقی کرنے لگی تھی اور اس معاملہ میں انگریز اس کے شریک کاربن گئے تھے ، کمپنی کا بہت سا روپیہ والی اودھ کے ذمے باقی رہ گیا تھا ، ان حالات میں افغانستان کی طرف سے حملہ کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا تھا ۔ حالانکہ والی اودھ ایک مدت سے اس کے خلاف انگریزوں سے امداد طلب کر رہا تھا ، † طویل گفت و شنید کے بعد آخر سنہ ۱۸۰۱ع میں نواب نے انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ، جس کی روسے اس نے اپنی ریاست کے چند مشرقی ، جنوبی اور

* اٹھارویں صدی میں ولندیزی کمپنی بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی تھی یہاں تک کہ سنہ ۱۷۹۵ع میں جمہوریت ہالینڈ (Republic of Holland) نے کمپنی کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے ، چونکہ یہ جمہوریت فرانسیسیوں کے اثر اور رسوخ سے قایم ہوئی تھی اس لئے وہ بھی انگلستان کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئی تھی .

† اس وقت پنجاب کا علاقہ افغانستان کے زیر اثر تھا ، اس طرح وہ اودھ کی شمال مغربی سرحدوں سے بالکل نزدیک ہوگیا تھا اور جب بھی چاہے اس پر حملہ کرسکتا تھا .

مغربی علاقے کمپنی کے حوالے کردئے ، ان کی آمدنی اتنی تھی ، کہ اس سے برطانوی امدادی فوج کے مصارف کی تکمیل ہوسکتی تھی ، اب نواب کے پاس صرف وہ علاقہ رہ گیا تھا جو اب اودھ کے نام سے مشہور ہے - اس کے اطراف کے تمام اضلاع انگریزوں کے ماتحت تھے - نواب نے اس مختصر سے علاقہ میں ملکی انتظام کو درست کرنے کی کوشش کی - اس طرح بنگال کا صوبہ شمال مغربی جانب بہت بڑھ گیا تھا اور اس کی جنوبی سرحدیں مرہٹوں کی ریاستوں سے ملتی تھیں چنانچہ ریاست اودھ کی حیثیت اب ایک فاصل مملکت Buffer State کی نہیں رہی تھی .

اس درمیان میں مرہٹوں کی خانہ جنگیاں انتہا کو پہنچ گئی تھیں سنہ ۱۸۰۰ء میں نانا فدنویس کا انتقال ہوگیا جس نے نام نہاد پیشوا کی جانب سے تقریباً پچاس برس تک پونا پر حکومت کی تھی ، اس کی وفات کے بعد نام نہاد پیشوا باجی راؤ نے پورا اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا اور سندھیا بھی اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہوگیا ، مگر ہولکر نے ان دونوں کی سخت مخالفت کی اور پوری کامیابی کے ساتھ دونوں کو شکست دی ، باجی راؤ نے انگریزوں سے مدد مانگی ، اور انہوں نے سنہ ۱۸۰۳ء میں اس کے ساتھ بسین کا معاهدہ کیا ، جس کی روسے اس نے کمپنی کا اقتدار تسلیم کرلیا اور انگریزوں نے اپنی طاقت کے زور سے اس کو پیشوائی کی گدی پر بٹھا دیا اس کی وجہ سے عام طور پر تمام مرہٹے ناراض ہوگئے ، سندھیا اور بھونسلہ نے اپنی فوجیں پونا کی طرف بڑھائیں ، ولزلی نے ان سے واپس جانے کا مطالبہ کیا ، لیکن جب انہوں نے نہیں مانا تو ان کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا یہ جنگ انگریزی نقطہ نظر سے بڑی کامیاب رہی ، کیونکہ آرتھر ولزلی نے ستمبر سنہ ۱۸۰۳ء کی جنگ اسئی Assaye میں ان دونوں فوجوں کو بڑی زبردست شکست دی ، اور اسی سال دسمبر میں بھونسلہ فوج نے ہتھیار رکھدئے اور کمپنی کا اقتدار تسلیم کرلیا ، اور اس کے حکمران نے اوریسہ کا

اپنا علاقہ انگریزوں کے حوالے کردیا ادھر شمال میں لارڈ لیک نے سندھیا کی ریاست کا وہ حصہ فتح کرلیا جو دریاے جمنا کے شمال اور مشرق میں واقع تھا ، اور نیز لسواری کی جنگ میں سندھیا کی بچی کچھی فوج کو بڑی زبردست شکست دی، آخرکار وہ بھی کمپنی کا اقتدار تسلیم کرنے پر مجبور ہوگیا ۔

دوسری دو مرهٹہ ریاستوں نے اس جنگ میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا تھا ۔ گیکواڑ کا راجہ تو پہلے ہی سے برطانوی فوج کی حفاظت میں تھا ، مگر هولکر ابھی تک آزاد تھا ، اور اس نے انگریزوں کے ساتھ کسی قسم کی صلح کرنے سے انکار کردیا چنانچہ سنہ ۱۸۰۴ع کی ابتدا میں ولزلی نے اس کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا ، کرنل مونسن Monson کے ماتحت جو انگریزی دستہ آگے بڑھ کر گیا تھا بہت ہی ہزیمت کھاکے واپس آیا ، اس کی تباہی کی وجہ سے ان مرهٹوں نے هولکر کی امداد کرنی شروع کردی جو اس سے پہلے برطانوی فوجوں کا ساتھ دے رہے تھے ، لیکن اس سال کے آخر میں هولکر کو یکے بعد دیگرے دو زبردست شکستیں ہوئیں ، اس کے بعد اگر ولزلی کو واپس بلا لیا نہ گیا ہوتا ، تو ان مرهٹوں کا بالکل ہی خاتمہ ہوچکا ہوتا ولزلی کے متعلق انگلستان میں عام طور پر یہ بد ظنی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اپنی حد سے بھی آگے بڑھتا جارہا ہے ، اس کی جگہ لارڈ کارنوالیس دوبارہ گورنر جنرل ہوکر آیا مگر ہند میں آنے کے چند دن بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا ، اب حکومت کا سارا بوجھ سر جارج بارلو کے کندھوں پر پڑا اور وہ دو سال تک گورنر جنرل کے فرایض انجام دیتا رہا ، یہ شخص کمپنی کا ملازم تھا ، اور اس نے پوری وفاداری کے ساتھ افسران بالا کے احکام کی پابندی کی ، اس نے مرهٹوں سے ایک صلح کی جس کی روسے ان کے بہت سے کھوئے ہوے علاقے ان کو واپس دیدئے تاہم اس کی صلح بھی آخری نہیں تھی ، بارلو کی پالیسی کا ایک بد ترین پہلو یہ ہے کہ اس نے راجپوت سرداروں کو ، جو ہمیشہ انگریزوں

سے امداد کے طالب تھے ' هولکر اور سندهیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ' یہ مرهٹے اپنی عادت کے مطابق راجپوتانہ کے مشرقی اضلاع پر حملے کرتے اور وهاں سے زبردستی پیسہ وصول کرتے رهے یہاں تک کہ چند سال کے اندر پورا مشرقی راجپوتانہ ویران هوگیا .

اس معاهدہ کے مطابق جمنا کے شمالی اور مشرقی علاقوں سے مرهٹوں کو نکال دیا گیا اور ان اضلاع پر جو جمنا اور گنگا کے درمیان واقع تھے اور جن پر مرهٹوں کا قبضہ هوگیا تھا پھر سے انگریزوں کا قبضہ هوگیا اس کے ساتھ دهلی اور اس کے مغرب کا تھوڑا علاقہ انگریزوں کے حوالے هوگیا ۔ اسطرح ملکی نظم و نسق کی خاطر بہار سے لیکر دهلی تک کے علاقہ کو ' جس میں بنارس اور اودھ کے وہ علاقے بھی شامل تھے جو والی اودھ کی طرف سے حال هی میں انگریزوں کو ملے تھے ' صوبجات مفوضہ و مفتوحہ (The ceded and conquered Provinces) کا نام دیا گیا ' پھر آگے چلکر چند اور علاقوں کو اس میں شامل کرکے سنہ ۱۸۳۵ع میں صوبجات شمال مغربی (North western Provinces) کا نام دیا گیا ' پھر دهلی کو الگ کرکے اور دوسری جزوی ترمیموں کے ساتھ صوبجات متحدہ United Provinces بنایا گیا ' اس طرح ولزلی کے عهد حکومت میں مدراس کا صوبہ وجود میں آیا ۔ اس وقت اس کی وسعت قریب قریب وهی تھی جو اب پائی جاتی هے ' اور بنگال کا صوبہ وسیع هوا اور اس کی سرحد پنجاب سے مل گئی لیکن اس وقت صوبہ بمبئی کی ابھی تک کوئی تشکیل نہیں هوی تھی .

ان تینوں صوبوں سے باهر سندھ اور پنجاب کو چھوڑ کر هند کی باقی تمام ریاستوں کے ساتھ ولزلی نے مختلف معاهدے کرلئے تھے ' اگرچہ ان کی شرطیں هرجگہ مختلف تھیں تاهم هر ایک میں یہ شرط نمایاں تھی کہ کمپنی کو سب پر اقتدار حاصل هے ' اور یہی شرط آئندہ کی تمام دستوری تبدیلیوں میں ایک

بنیادی حقیقت بنی رہی ' اب اگرچہ ہند کے دو پانچویں حصہ پردیسی راجاؤں کی حکومت ہے تاہم وہ سب تاج برطانیہ کے ماتحت سمجھے جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں ایک راجہ کو اپنی ریاست کے اندر شاہی حقوق حاصل تھے ' اور بعض اوقات ان سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ملک کے اندرونی نظم و نسق کو قایم رکھیں۔ البتہ امور خارجہ اور سیاست اور جنگ کے معاملات میں ان کو کمپنی کا حکم ماننا پڑتا تھا اور گورنر جنرل باجلاس کونسل کو ان سب پر پورا اختیار حاصل ہوگیا تھا ' ولزلی کے زمانہ میں کمپنی نے بعینہ وہی حیثیت حاصل کرلی تھی ' جو موریہ یا گپت خاندان کے شہنشاہوں کو ہند میں حاصل تھی ' یعنی کمپنی کی طرح وہ بھی ہند کے ایک حصہ پر براہ راست حکومت کرتے تھے ' اور باقی حصہ کے راجاؤں اور بادشاہوں پر ان کو شاہی اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔

باب ۳۹

ولزلی سے بنٹنک تک

لارڈ منٹو (۱۸۰۷ - ۱۸۱۳) اور اس کے پیشرو کے عہد حکومت میں یوروپ کے اندر جنگ برابر جاری رہی ' ولزلی نے جو طریقے اختیار کئے تھے وہ اندرون ہند سے فرانسیسی اقتدار کو مٹانے کیلئے کافی تھے ' لیکن نپولین کے ایشیائی منصوبے اب تک قایم تھے ' اور یہ ضروری تھا کہ ہند تک پہنچنے کے تمام راستے بند کردئے جائیں ' انگریز اس وقت سمندروں پر پوری طرح حاوی ہوچکے تھے ' سنہ ۱۷۹۶ع میں سیلون پر کمپنی کا اور سنہ ۱۸۰۵ع میں راس امید کے ولندیزی مورچوں پر انگریزوں کا قبضہ ہوچکا تھا ' لیکن غیر سرکاری فرانسیسی مسلح جہاز اب تک ایشیائی سمندروں میں گھوم رہے تھے ۰ ان کی وجہ سے ہند کی تجارت کو بڑا زبردست نقصان پہنچ رہا تھا ' مگر جب سنہ ۱۸۱۰ع میں ان کے مشہور مورچوں موریشیس اور بوربن پر اور دوسرے سال بٹاویہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو ان کی سر گرمیاں یک دم سے ختم ہوگئیں ' اور مشرقی سمندروں کی تجارت ایک بڑی حد تک محفوظ ہوگئی .

زمینی راستے کے بند کرنے کیلئے لارڈ منٹو کو شمال مغربی ہند کی ریاستوں کے ساتھ تعلقات قایم کرنے پڑے ۰ یہ یاد ہوگا کہ نادرشاہ نے سندھ ' پنجاب اور کشمیر کو ایرانی سلطنت میں شامل کرلیا تھا ' اور تھوڑے زمانہ کے بعد ان علاقوں پر افغانیوں کی حکومت قایم ہوگئی تھی ' آگے چلکر افغانی صرف پشاور کے مالک بنے رہے ' اور پنجاب میں سکھوں کی حکومت قایم ہوگئی تھی ' اور سندھ سنہ ۱۷۸۹ع میں خود مختار ہوگیا تھا ' کچھ دنوں کے بعد رنجیت سنگھ نے پورے پنجاب پر قبضہ کرلیا اور پھر کشمیر کو بھی فتح کرلیا تھا .

سکھوں کی تاریخ کا آغاز پندرھویں صدی سے ہوتا ہے جبکہ گرو نانک نے پنجاب میں اپنی مذہبی تحریک شروع کی ' تھوڑے دنوں میں سوداگروں اور کاشتکاروں کا ایک زبردست گروہ اسکا معتقد ہوگیا ' نانک کے بعد گروؤں کی ایک جماعت نے اسکی تعلیم کو زندہ رکھا ' اسطرح اسکے پیرووں کی جو جماعت بنی وہ سکھ کہلانے لگی جسکے حقیقی معنی چیلے اور شاگرد کے ہوتے ہیں ' سکھ ایک ذات کے نہیں ہیں بلکہ انکے اندر مختلف ذات کے لوگ موجود ہیں ' ان گروں نے ہر جگہ اپنے نائب مقرر کئے وہ نانک کی تعلیمات کو پھیلاتے تھے اور لوگوں سے نذر و نیاز حاصل کرتے تھے ' چند سال کے اندر انکے پاس ایک اچھی خاصی دولت جمع ہوگئی یہانتک کہ سترھویں صدی میں انھوں نے سیاسی اقتدار کے حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی اورنگ زیب نے ان کی طاقت کو تو توڑ دیا مگر اسکے ساتھ اسکا ایک دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ انکے اندر ایک فوجی ولولہ اور جوش پیدا ہوگیا ' اور وہ لڑائی میں مشاق اور ماہر ہوگئے چنانچہ سنہ ۱۷۰۰ع میں وہ دہلی اور لاہور کے درمیانی علاقوں پر چھاپے مارنے لگے اٹھارویں صدی کی ابتدا میں انھوں نے ایک جنگجو قوم کی حیثیت حاصل کرلی تھی پھر اس صدی کے خاتمہ پر جبکہ شاہ افغانستان نے رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر مان لیا ' انکا سیاسی اقتدار بہت بڑھ گیا پھر چند دن کے بعد اس نئے گورنر نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور پنجاب کی آزاد ریاست قایم کرلی ۔

جب جمنا سے آگے دہلی تک کمپنی کا قبضہ ہوگیا تو رنجیت سنگھ سے سیاسی تعلقات کے قایم کرنے کی ضرورت پڑی کیونکہ وہ ستلج سے آگے جنوب کی طرف بڑھنے کی تیاریاں کر رہا تھا ' ستلج اور جمنا کے درمیان بہت سے سرداروں کی حکومت تھی جو عملاً خود مختار تھے لیکن انکے آپس میں کوئی اتفاق نہیں تھا ' سنہ ۱۸۰۹ع میں انگریزوں نے رنجیت سنگھ سے ایک معاہدہ کیا جسکے بعد اس نے اسطرف بڑھنے کا ارادہ ترک کردیا ' ستلج اور

جمنا کے درمیانی علاقہ کے خود مختار سردار برطانوی حفاظت میں آگئے، سکھوں نے دوسری طرف رخ کیا اور ملتان اور پشاور تک اپنی سلطنت قایم کرلی۔ اسی زمانہ میں انگریزوں نے افغانستان سے صلح کرنے کی ایک ناکام کوشش کی، مگر جب انگلستان اور ایران کے درمیان معاہدہ ہوگیا تو یوروپ سے ہند تک پہنچنے کا راستہ خود بخود بند ہوگیا، اور چونکہ افغانستان اور کمپنی کے مقبوضات ہند کے درمیان رنجیت سنگھ کی دوستانہ ریاست حائل ہوگئی تھی اسلئے چند سال تک کیلئے شمال مغربی جانب سے کوئی زبردست خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔

ہند کے دوسرے حصوں میں لارڈ منٹو نے کمپنی کی اختیار کی ہوئی عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کیا، لیکن اس کے جانشین لارڈ موئرا (۱۸۱۳ - ۱۸۲۳) کے زمانہ میں نئے حالات پیش آئے جن کی بناء پر تمام مرھٹوں اور راجپوتوں کو انگریزوں کا ماتحت ہونا پڑا سنہ ۱۸۰۵ع میں مرھٹوں کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا وہ مستقل اور پایدار نہیں تھا، مرھٹوں کی ہوس تاخت و تاراج اور کمپنی کے مستقل امن اور با قاعدہ نظم و نسق کے درمیان کبھی نہ کبھی ٹکر ہونی لازمی تھی، عدم مداخلت کے زمانہ میں تقریباً پورے وسط ہند کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تھے، لوگوں پر حد سے زیادہ ظلم ہونے لگا تھا، اور تلوار کے زور سے لگان وصول کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ پنڈاری اپنی تاخت و تاراج میں مصروف تھے، یہ کوئی مستقل ذات یا قوم نہیں تھی بلکہ مختلف جرائم پیشہ آدمیوں کی ایک جماعت تھی، انہوں نے ابتدا میں بے ضابطہ حیثیت سے مرھٹوں کی فوج میں کام کیا تھا، اور بعد میں با قاعدہ لٹیروں کی اپنی ایک منظم جماعت بنالی تھی، وہ اپنے حدود سے بھی آگے بڑھ کر حملے کرنے لگے تھے، جب تک ان کی لوٹ مار ان علاقوں میں محدود رہی جو کمپنی کے قبضہ میں نہیں تھے عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کرنا ٹھیک تھا، مگر جب انہوں نے سنہ ۱۸۱۲ع

کے قریب بہار میں اور سنہ ۱۸۱۶ء میں شمالی اضلاع سرکار میں قتل و غارتگری اور آگ لگانی شروع کی تو انگلستان کے ارباب حکومت نے ان کو ختم کرنے کا حکم روانہ کیا ۔

اس مقصد سے لارڈ ھوگرا نے سب سے پہلے مرھٹوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی ، پنڈاریوں کے ساتھ جو چند لڑائیاں پیش آئیں ، ان کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا ، کیونکہ بسا اوقات مرھٹے ان کی امداد میں کام کرتے تھے ، پنڈاریوں کی طاقت اور قوت کا صرف اس ایک بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ھے کہ سنہ ۱۸۱۷ء میں انگریزوں کو ان کے مقابلہ کے لئے ایک لاکھ سے زیادہ کی فوج بھیجنی پڑی ، انگریزوں کی یہ مہم بہت کامیاب رھی اور پنڈاریوں کا ھمیشہ کے لئے خاتمہ ھوگیا ، لیکن مرھٹوں نے فوراً ھی ان کی جگہ لے لی ، شاید انہیں خوف تھا کہ پنڈاریوں کے بعد اب ان کی باری آنے والی ھے چنانچہ پونا اور ناگپور میں بیک وقت انگریزوں پر حملہ شروع ھوا ، ھولکر اور سندھیا نے کھلے طور پر مرھٹوں کی اعانت کی ، اور گیکواڑ اپنی جگہ پر تنہا انگریزوں سے لڑتا رھا ۔

مرھٹوں کے ساتھ یہ آخری جنگ بھی بہت جلد ختم ھوگئی ، پیشوا نے کئی شکستیں کھانے کے بعد جون سنہ ۱۸۱۸ء میں اطاعت قبول کرلی ، اس کی گدی کا خاتمہ کردیا گیا اور اس کو وظیفہ دیکر کانپور کے قریب بھیج دیا گیا ، بھونسلہ بھی شکست کھاکر فرار ھوگیا اور اسی حالت میں جان دی ، ھولکر کی فوجوں نے بھی میدان جنگ میں شکست کھائی ، سندھیا نے لڑے بھڑے بغیر ھی اطاعت قبول کرلی ، اس کے بعد مرھٹہ ریاستوں کی جو ترتیب و تنظیم عمل میں آئی اس کا مختصر خاکہ یہ تھا ۔ مالوہ میں ھولکر اور سندھیا اور بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوںکو اپنی قدیم حالت پر بحال رکھا گیا ، بھونسلہ کی گدی پر ایک نا بالغ بچے کو بٹھایا گیا ، گجرات میں ریاست گیکواڑ کا ایک حصہ سیواجی کے خاندان کے ایک فرد کو جو اس وقت ستارا کا راجہ تھا ،

دیدیا گیا باقی پر کمپنی کا قبضہ ہوگیا ۔ اس مقبوضہ کا ایک بڑا حصہ صوبہ بمبئی میں شامل کرلیا گیا ، اسی کے بعد سے بمبئی کی حیثیت ایک صوبہ کی ہوگئی تھی مرھٹوں کے تمام خاندانوں نے انگریزوں کے اس آخری فیصلہ کو تسلیم کرلیا تھا ، اور اب وہ متعین طور پر کمپنی کے ماتحت ہوگئے تھے ۔ اسی زمانہ میں راجپوتانہ کے سرداروں نے بھی انگریزوں سے صلح کرلی - وہ بحیثیت ایک جماعت کے کبھی انگریزوں کے مقابلہ میں نہیں آئے تھے ۔ ان سرداروں کو اب مرھٹوں کی طرف سے بھی پورا اطمینان ہوگیا تھا اس علاقہ میں صرف اجمیر کا ایک ضلع ایسا تھا جس پر کمپنی نے اپنا قبضہ جمایا یہ اس سے پہلے مغلیہ حکومت میں شامل تھا ، ان کے بعد سندھیا نے اس پر قبضہ کیا - اور پھر اس سے یہ انگریزوں کو حاصل ہوا ۔

اس طرح سے وسط ہند کو ہموار کیا گیا ، شمالی ہند میں لارڈ موڈرا نے نیپال سے جنگ شروع کر رکھی تھی ۔ جہاں گورکھا قوم نے بڑی طاقت حاصل کرلی تھی اور کشمیر سے لیکر آسام تک ہمالیہ کی پہاڑیوں پر اپنا تسلط قایم کرلیا تھا ، شمالی ہند کے زر خیز اور سر سبز و شاداب میدان ان گورکھوں کی تاخت و تاراج کے آماجگاہ بن گئے تھے ، وہ سرحدی علاقوں پر چھاپہ مارنے لگے تھے لارڈ موڈرا نے پہلے پہل ان سے گفت و شنید کی لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا ، اس لئے اس نے سنہ ۱۸۱۴م میں ان کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا ، گورکھوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا اور پہلے پہل کامیابی کا سہرا انھی کے سر رہا ، مگر انگریزوں کے مرتب اور منظم طریقہ جنگ کے سامنے ان کی ہمتیں پست ہوگئیں ، اور آخر انھوں نے مجبوراً ان سے صلح کرلی ، ریاست کے مغربی علاقے انگریزوں کے حوالے کردئے گئے ، مشرقی سرحد پر بھی کچھ تبدیلیاں کی گئیں ، اور ان کے پاس وہی تنگ پہاڑی علاقہ باقی رہا ، جو اب ریاست نیپال پر مشتمل ہے اور جس کو تین طرف سے انگریزی

علاقہ گھیرے ہوے ہے ' کچھ زمانہ تک نیپال کمپنی کے ماتحت رھا ۔ اگرچہ اس کی حیثیت ایک ھندی ریاست کی نہیں تھی ۔ مگر بعد میں وہ خود مختار ریاست ہوگئی چنانچہ اب تک لندن میں اس کا سفارت خانہ قایم ہے ۔

لارڈ موڈرا ' جو آگے چلکر مارکوئیس آف ہیسٹنگز کا خطاب پایا ' جب سنہ ۱۸۲۳ع میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوا ہے تو پنجاب ' سندھ ' کشمیر اور آسام کے سوا ہند کے باقی تمام حصوں پر کمپنی کا اقتدار قایم ہوچکا تھا ؛ پہلے تین علاقے ایک زمانہ تک خود مختار رھے ' مگر اسام پر گورنر جنرل لارڈ امھرسٹ (۱۸۲۳ - ۱۸۲۸) کے زمانہ میں انگریزوں کا قبضہ ہوگیا ' ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اورنگ زیب کی تمام کوششوں کے باوجود آسام سنہ ۱۸۱٦ع تک خود مختار رہا یہاں تک کہ اس سنہ میں برما کے بادشاہ نے اس کو فتح کرلیا ' اس کے بعد آٹھ سال تک یہاں کی آبادی پر مختلف قسم کے ظلم و ستم ہوتے رھے کہا جاتا ہے کہ اس مدت میں اس کی آبادی آدھی کے قریب گھٹ گئی تھی اسام کے باشندوں نے کلکتہ کی انگریزی حکومت سے بارھا مدد مانگی ' مگر اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی شاہ برما نے صرف اسام ھی پر قناعت نہیں کیا بلکہ سنہ ۱۸۱۸ع میں اس نے انگریزوں سے بنگال کے چند اضلاع کا مطالبہ کیا جن پر کسی زمانہ میں اراکان کا قبضہ تھا ' اس نے سنہ ۱۸۲۳ع میں ایک زبردست فوج کلکتہ کو لینے کی غرض سے روانہ کی ۔ اس کی یہ حرکت آج ہمارے لئے شاید نا قابل فہم ہو لیکن اس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ برما کے لوگ اس زمانہ کے سیاسی حالات سے کس قدر نا واقف تھے ' برما کی پہلی جنگ سنہ ۱۸۲٦ع میں ختم ہوی ' اور اس کے بعد جو صلح ہوی اس کی روسے اسام اور برما کے چند علاقے کمپنی کے حوالے کردئے گئے ' اسام کے تھوڑے علاقے ہند کی اور دوسری ریاستوں کے نمونہ پر مختلف ریاستوں کے اندر تبدیل کردئے گئے اور باقی علاقوں کو بنگال کے صوبہ میں شامل کرلیا گیا ۔

لارڈ امہرسٹ کے بعد لارڈ ولیم بنٹنک (سنہ ۱۸۲۸ - ۱۸۳۵م) گورنر جنرل ہوا ' اسکے زمانہ میں حالات کچھ ایسے سازگار تھے کہ تمام خارجی معاملات میں وہ بڑی سختی کے ساتھ عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند رہا ۔ بنٹنک ایک تجربہکار اور ہمدرد عوام حکمران تھا اپنے پر امن زمانہ سے فائدہ اٹھاکر اس نے مختلف سماجی اور انتظامی اصلاحات جاری کیں جنکو آئندہ باب میں بیان کیا جائیگا ' وہ اور سر چارلس مٹکاف ' جو سر آکلینڈ کے سنہ ۱۸۳٦ع میں ہند آنے سے پہلے ایک سال تک گورنر جنرل کی حیثیت سے کام کرتا رہا ' اپنی فیاضانہ حکمت عملی کی وجہ سے ہند کی نئی تعلیمیافتہ جماعت میں بہت هی هر دلعزیز اور مقبول ہوگئے تھے ' انکے بعد پھر بیس سال تک سیاسی اور فوجی سرگرمیاں جاری رهیں ' جنکا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کی حکومت کو ہند سے ہمیشہ کیلئے ختم کردیا گیا ان حالات کو بیان کرنے سے پہلے ان اندرونی تبدیلیوں کا ذکر کرنا ضروری ھے جو ان دونوں کے عہد میں پیش آئی تھیں ' اور جنکی وجہ سے بنٹنک کا عہد حکومت کارنوالیس کے عہد حکومت سے بالکل ممتاز قرار پاتا ھے ۔

باب ۴۰

اندرونی تبدیلیاں

سنہ ۱۷۹۳ء تا سنہ ۱۸۲۵ء

گذشتہ ابواب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح مقبوضات کمپنی کے نظم و نسق پر پارلیمنٹ کی نگرانی بڑھتی رہی اور کمپنی کی کارگذاریوں پر انگلستان کی سیاسی جماعتیں بڑی سخت نکتہ چینیاں کرتی رہیں ' وارن ہیسٹنگز کے مقدمہ کے بعد سیاسی فرقوں کے جذبات کچھ ٹھنڈے پڑ چکے تھے ' اور آئندہ پچاس سال تک پارلیمنٹ میں ہند کے معاملات پر جو بحث مباحثے ہوتے رہے ' ان میں در حقیقت ایک قومی خواہش کا اظہار تھا ' کمپنی کا منشور Charter ہر بیس سال کے بعد پارلیمنٹ کے غور و خوض اور اس کی منظوری کیلئے پیش ہوتا تھا ' منظوری سے پہلے کمپنی کے انتظام حکومت کے ہر پہلو پر بڑی تحقیق و تدقیق ہوتی تھی اور ان تحقیقات کے بعد جو منشور مرتب کیا جاتا اس میں آئندہ کی نئی اصلاحات اور ترقیات سے متعلق بہت سے قوانین مندرج ہوتے تھے اس کے علاوہ اہم معاملات کے متعلق وقتاً فوقتاً دوسرے قوانین بنائے جاتے تھے ' اس لئے بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پارلیمنٹ ہند سے باہر رہ کر کمپنی کے ملازموں میں وہ جوش اور جذبہ پیدا کر رہی تھی جس کی اسوقت ایک باضابطہ حکومت کے صحیح طور پر کام کرنے کیلئے بڑی ضرورت تھی ۔

ہند میں کمپنی کے نظم و نسق پر ہیلی بری Haileybury کالج کی تعلیم و تربیت کا بھی ایک حدتک اثر پڑ رہا تھا ' جہاں بہت سے نوجوانوں کو کمپنی کی ملازمت کیلئے تیار کیا جاتا تھا ' اس کالج کی حقیقی تعلیم اتنی اہم نہیں تھی جتنی کہ اس کی تربیت تھی ' اس میں شخصی اخلاق ' آئندہ کی اہم ذمہ داریوں کے احساس اور ہند اور انگلستان دونوں کے ساتھ وفاداری

کے نصب العین پر بڑا زور دیا جاتا تھا ' اگرچہ بعض طالب علم اس معیار پر پورے نہیں اترے تاہم یہ کالج قومی زندگی کے ایک بلند معیار کے پیدا کرنے میں بہت کامیاب رہا ' یہ معیار یقیناً اس معیار سے بہت اونچا تھا جو اٹھارویں صدی کے انگریزوں اور ہندیوں میں پایا جاتا تھا ۔

اس زمانہ کے نظام حکومت کو سمجھنے کے لئے اس انقلاب کا خیال رکھنا ہوگا جو اس دور کے خیالات میں پیدا ہوگیا تھا ۔ اس زمانہ میں عوام کی اصلاح یا آجکل کی اصطلاح کے مطابق قومی تعمیر کا کام حکومت کے ذمہ نہیں تھا ' ہند میں اس وقت نظام تعلیم ' حفظان صحت ' اور اقتصادی ترقی کیلئے خاص خاص محکمے نہیں تھے ' کمپنی صرف اپنے ملازموں کیلئے ڈاکٹر اور پادری مقرر کرتی تھی ' مگر عوام کیلئے اس کا کوئی انتظام نہیں تھا ' تعمیرات عامہ (Public works) کا محکمہ صرف وہی عمارتیں تیار کرتا تھا ' جو حکومت کے کام کی ہوتی تھیں ' کبھی کبھی سڑکوں کی تعمیر اور مرمت بھی کی جاتی تھی ' اور فوج کے انجینیر آب پاشی کے ذرایع مہیا کرتے تھے ' ملکی نظم و نسق (Civil administration) کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ امن عامہ کو بحال رکھے لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کرے اور کاشتکاروں اور زمینداروں سے لگان وصول کرے ' جو اب ایک میجسٹریٹ ' جج اور کلکٹر کا کام ہوتا ہے ۔

مدراس اور بمبئی کے صوبے اب بھی ایک بڑی حد تک خود مختار تھے ' یہاں زراعتی زمینوں کی تنظیم اسی نہج پر ہو رہی تھی ' جس کو کارنوالیس نے بنگال میں قایم کیا تھا ' البتہ مقامی حالات کی بناء پر اس نظام کی جزئیات میں بہت زیادہ فرق ہوتا تھا ' ہر جگہ صوبہ کو ضلعوں پر تقسیم کیا گیا تھا جس کا سب سے بڑا حاکم کلکٹر ہوتا تھا اس کو میجسٹریٹ کے اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے جج کا عہدہ اس سے بالکل الگ ہوتا تھا ' اور یہ بات ذہن نشین ہونی چاھئے کہ اب تک کمپنی

کے پاس کوئی با قاعدہ ہندی فوج نہیں تھی ' ہر ایک صوبے میں اس کے اپنے خاص فوجی ادارے تھے ' مگر ان تینوں صوبوں کی فوجوں کے درمیان کوئی با قاعدہ باہمی تعاون اور اشتراک عمل نہیں تھا۔

تینوں صوبوں کے نظام مالگذاری میں بھی بہت زیادہ اختلاف تھا ' شمالی ہند میں عام طور پر دوامی بندوبست کا نظریہ مقبول ہو رہا تھا ' بنگال ' بہار اور بنارس میں اسی پر عمل ہو رہا تھا صوبجات مفوضہ ومفتوحہ کے افسروں کو اسی نظام پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ مگر یہاں کے حالات کچھ ایسے تھے ' کہ دوامی بندوبست کو جاری کرنا نا ممکن تھا ' کیونکہ طوایف الملوکی کی وجہ سے یہاں کی زراعت بالکل تباہ ہو چکی تھی ' اور کاشت کرنے کیلئے نہ تو کاشتکار اور نہ زمیندار ہی موجود تھے ' اس زمانہ کی تاریخی کتابوں میں اضلاع مفتوحہ یعنی وہ اضلاع جو دہلی سے مشرق اور جنوب مشرق میں واقع تھے۔ ان کے متعلق جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان پر آج یقین کرنا بہت مشکل ہے ' یہ تمام علاقے اکبر کے زمانہ میں بہت ہی سر سبز وشاداب تھے ' مگر اب بالکل ویران ہوگئے تھے ' اور جو چند کاشتکار رہ گئے تھے وہ اپنی بستی سے قریب کی زمینوں کی کاشت کرتے تھے ' اور جب کبھی کاشت کرنے کیلئے گھر سے باہر نکلتے تو اپنے ساتھ ہتھیار بھی لے جاتے تھے تاکہ وقت پر وہ اپنی آپ حفاظت کرسکیں ' ان حالات میں دوامی بندوبست کا طریقہ اختیار کرنا بہت دشوار تھا ' چنانچہ اس وقت جس سے جتنا بھی مل سکا وصول کیا جانے لگا ' اور زمین کے حقیقی مالکوں کا پتہ چلایا جانے لگا۔ زمینداروں کے تلاش کرنے میں ایک زمانہ لگ گیا۔ اور جب یہاں کے افسروں نے بنگال کی طرح یہاں کے حقیقی مالکوں کی ایک فہرست تیار کرنی چاہی تو اس میں بڑی غلطیاں پیش آئیں ' ان کو غیر مکمل شہادتوں پر مختلف دعویداروں کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا انہوں نے کئی جھوٹے

دعویداروں کے حق میں فیصلہ دیدیا تھا پہلے پہل اس معاملہ میں کسی واضح اور متعین اصول کی پیروی نہیں کی گئی تھی ، مگر اس افراتفری اور پراگندگی و ابتری میں ایک نیا نظریہ پیدا ہوا جو یادداشت حقوق (Record of Rights) کے نام سے موسوم ہے ' جدید قانونی حکومت میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے .

یادداشت حقوق کا مطلب یہ تھا کہ ایک ایسی یادداشت مرتب کی جائے جس میں ہر ایک قریہ کی زمین اور اس کے مالکوں کی تفصیل درج ہو ' یہ بتایا جائے کہ ہر ایک کاشتکار کتنی زمین کا مالک ہے اور اس کے حقوق ملکیت کیا ہیں' اور وہ کس کو کتنی رقم ادا کرتا ہے' اور اسی قبیل کی دوسری جزئیات درج کی جاتی تھیں ' اور جب یہ تمام یادداشتیں مرتب ہوگئیں تو ان کا فیصلہ کرنا ممکن ہوگیا کہ کس کے ساتھ دوامی بندوبست کرنا چاہئے یا دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ تھے کہ خاص خاص زمینوں کا کس کو مالک قرار دینا چاہئے ' اس طول طویل تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قسم کے مالکان زمین نکل آئے ' ان میں سے بعض تو زمیندار کسان اور جاگیردار تھے ' رف زمین کی مالگذاری کے حقدار تھے' ان کی حیثیت انگریزی اجارہ داروں کی سی تھی ' دوسرے وہ کاشتکار لوگ تھے جو ایک برادری کی حیثیت سے زمینوں کی مجموعی کاشت کرتے تھے ' اور ایک قریہ کا مجموعی لگان ادا کرتے تھے .

مدراس میں حالات بالکل دوسرے تھے' ولزلی نے سنہ ۱۷۹۸ء میں یہاں بھی دوامی بندوبست پر عمل کرنا چاہا اور اس سلسلہ میں کچھ کام بھی کیا گیا مگر مشکل یہ تھی کہ بنگال کی طرح یہاں زمیندار نہیں تھے' بلکہ ہر ایک اپنی زمین کی کاشت خود ہی کر رہا تھا ' اور جب زمینداروں کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس میں بالکل ناکامی ہوی' مقامی عہدہ دار رعیت واری بندوبست کی تائید میں تھے' جس کے تحت ہر

ایک کاشتکار سے علحدہ علحدہ بندوبست کرنا پڑتا تھا ' چنانچہ ان کی سفارش پر پارلیمنٹ کی سیلکٹ کمیٹی نے سنہ ۱۸۱۲ء میں رعیت واری بندوبست کو تسلیم کرلیا اور اس کے بعد سے یہاں اگرچہ چند زمیندار باقی رہے تاہم رعیت واری اصول ہی پر عملدر آمد ہوتا رہا ' چند سال بعد جب صوبہ بمبئی کی تنظیم شروع ہوی تو اسی رعیت واری نظام کو جاری کرنے کی کوشش کی گئی ' اسطرح پورے جنوبی ہند میں رعیت واری نظام قایم ہوگیا اور شمالی ہند میں پرانا زمیندارانہ نظام ہی باقی رہا .

مالکان زمین کیلئے سب سے اہم چیز لگان کی مقدار ہوتی ہے ' کمپنی کے عہدہداروں نے اپنے پیشرووں کی شرح کے مطابق لگان وصول کرنے کی کوشش کی ' کاشتکاروں سے پوری پیداوار کا آدھا اور زمینداروں سے جتنا انہیں کاشتکاروں سے وصول ہوتا تھا اس کا نو دسواں حصہ طلب کیا جانے لگا ' لیکن تجربہ سے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اس شرح کے مطابق لگان وصول کرنے سے ملک کی اقتصادی حالت اچھی نہیں رہ سکتی ' چنانچہ یہ شرح رفتہ رفتہ گھٹتی رہی یہاں تک کہ اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں زمینداروں اور کاشتکاروں دونوں سے پوری پیداوار کی بجاے خالص آمدنی کا آدھا حصہ لیا جانے لگا ' ہر بیس سال یا تیس سال کے بعد خالص آمدنی کا اندازہ کیا جاتا تھا ' ایک بندوبست سے دوسرے بندوبست کے درمیان اگر اس خالص آمدنی میں کوئی اضافہ ہو تو مالکان زمین اس کے حقدار تھے ' حکومت اس میں اپنا حصہ طلب نہیں کرتی تھی ' کئی سال تک دوامی بندوبست کا نظریہ قایم رہا ' مگر جیسے جیسے تجربات بڑھتے گئے اس کی اہمیت گھٹتی گئی اور آخر کار سنہ ۱۸۸۳ء کے قانون کی روسے اس کو منسوخ کردیا گیا .

اس دور میں ایک مستقل بالذات ضابطہ قوانین کے تیار کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ' تینوں صوبوں کی مجلسیں وقتاً فوقتاً آئین بنایا کرتی تھیں ' مگر سنہ ۱۸۳۳ء کے

منشور کی روسے ایک نیا نظام عمل میں آیا ' مدراس اور بمبئی کی مجلسوں سے قانون سازی کا حق چھین کر گورنر جنرل باجلاس کونسل کو اس کا حق دیا گیا ' اس مقصد کیلئے ولایت سے ایک قانون داں کو مجلس کا رکن بناکر بھیجا گیا ' تاکہ قانونی پیچیدگیوں کے متعلق گورنر جنرل کو مشورہ دے سکے ' اس کے بعد سے آئین (Regulations) کی جگہ پر قوانین (Acts) کا اجرا ہونے لگا ' مجلس گورنر جنرل کا پہلا قانونی مشیر مشہور انگریزی انشاپرداز تھامس بابنگٹن مکالے تھا ' اس نے مستقل بالذات قوانین کے جاری کرنے میں بڑی مدد دی ' مگر اس کے ہند سے جانے کے بعد یہ کام مدھم پڑگیا ' اور تقریباً پچیس سال تک مکالے کی کوششوں کا کوئی مفید نتیجہ بر آمد نہیں ہوا '

کوئی مستقل بالذات ضابطہ قوانین کے نہ ہونے کی وجہ سے امن و امان کے قایم ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی' سرکش لوگ دھیرے دھیرے مطیع اور فرمانبردار ہوتے گئے ' اور لوگ آپس ہی میں لڑنے بھڑنے کی بجاے عدالتوں تک اپنے مقدمات لے جانے لگے ' اور یہ خیال جاگزیں ہوتا گیا کہ کسی ایک خاص شخص کی اطاعت کی بجاے ایک ضابطہ قوانین کی پابندی لازمی ہے ' اس طرح قانونی چارہ جوئی کا رواج ہوتا گیا .

اندرون ملک میں امن و امن کا قایم کرنا ایک بہت تکلیف دہ اور دشوار امر تھا ' ہند میں ڈاکوؤں کی کئی ٹولیاں تھیں ' جو ایک وسیع رقبہ پر ڈاکے ڈالا کرتی تھیں ' ملک کی قدیم تاریخ میں ایسے بہت سے ڈاکوؤں کا ذکر ہے اور اب بھی اس قسم کے ڈاکو موجود ہیں' مگر اٹھارویں صدی میں طوائف الملوکی کی وجہ سے ان کی بڑی کثرت ہوگئی تھی ' پنڈاری بھی در حقیقت ڈاکو ہی تھے ' جو بڑے پیمانہ پر ڈاکے ڈالا کرتے تھے' جیسے جیسے حکومت مضبوط اور طاقتور ہوتی گئی ان ڈاکووں کا بھی بتدریج خاتمہ ہوتا گیا ' سب سے زیادہ مشکل کام ٹھگوں کی منظم ٹولیوں کا ختم کرنا تھا ' ان لوگوں نے قتل و خون اور

غارتگری کو ایک بہترین فن بنا لیا تھا ' بڑے بوڑھے لوگ اپنے بچوں کو اس فن کی باقاعدہ تربیت دیتے تھے ' ان کی قتل و غارتگری مذہب میں داخل تھی کیونکہ کسی کے قتل کو وہ دیوی کی بھینٹ سمجھتے تھے جس کی وہ پوجا کرتے تھے ' سنہ ۱۸۳۶ع میں ایک قانون بنایا گیا ' جس کی روسے ہر ایک ٹھگ کو جنم قید کی سزا تجویز کی گئی ' اور جب خاص طریقوں پر اس سخت مگر ضروری قانون کو نافذ کیا گیا تو بتدریج ٹھگوں کی مذہبی روایات ٹوٹیں اور آخرکار اس قسم کے لوگوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا .

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ ابتک مستقل بالذات قوانین کے تیار کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی مگر اس زمانہ کا ایک مہتم بالشان قانون ستی کی ممانعت ہے ' کمپنی کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ملک کے مقررہ رسم و رواج کے اندر جان بوجھکر مداخلت کی گئی ' ہند کے انگریز افسروں اور با اثر عیسائی مبلغوں اور انگلستان کےانسانی ہمدردوں نے اس رسم کے خلاف بارہا احتجاج کیا تھا ' اور خود ہندووں کی ایک جماعت اس رسم کی سخت مخالف تھی ' اس جماعت کا سرگروہ راجہ رام موہن رائے تھا جسکے کارنامے آئندہ بیان کئے جائینگے ' سنہ ۱۸۲۸ع میں کمپنی نے بنٹنک کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت کی ' اور دو سال کے اندر اندر ایک آئین کے ذریعہ تینوں صوبوں میں ستی کی رسم ناجائز قرار پائی ' مخالفین کی ایک زبردست جماعت نے اس آئین کے خلاف پریوی کونسل میں مقدمہ دائر کیا ' مگر اس جماعت کی کوئی بات نہیں سنی گئی ' اور آئندہ چلکر یہ آئین مستقل بالذات ضابطہ قوانین کا ایک اہم جز بن گیا ' اسی طرح غلامی اور دختر کشی کے خلاف ' جسکا بعض طبقوں میں رواج تھا ' زبردست

احتجاجات ہوے ' مگر کچھ زمانہ کے بعد انکے خلاف قوانین بنائے گئے ' اس جگہ غلامی کی تنسیخ کے متعلق کچھ لکھنا زیادہ مناسب ہوگا ۔ *

ہندو اور اسلامی قانون میں غلامی کو جائز قرار دیا گیا ہے ' چنانچہ ہند کے اندر گھریلو کاموں کیلئے غلام رکھے جاتے تھے ' بعض جگہوں پر ان سے کھیتی باڑی کا کام لیا جاتا تھا ' مگر یوروپ کی طرح کارخانوں میں ان سے کوئی محنت نہیں لی جاتی تھی ' ہر ایک غلام کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا تھا ' اور قحط کے زمانہ میں تو ان کی حیثیت آزاد آدمیوں سے بھی کچھ اچھی ہی ہوتی تھی ' کیونکہ غلاموں کے مالک ان کی پرورش کے ذمہدار تھے ' لیکن انگلستان کے انسانی ہمدرد غلامی کے سخت مخالف تھے ' ان کا خیال تھا کہ انسانی حمیت اس رسم کو کبھی گوارا نہیں کرسکتی ' چنانچہ سنہ ۱۸۳۳ء کے قانون منشور (Charter Act) میں کمپنی کو ہدایت کی گئی تھی کہ اس مسئلہ کے متعلق غور و فکر کرے اور اگر ممکن اور قابل عمل ہو تو اس رسم کو ناجائز قرار دینے کی کوشش کرے ' اس کے بعد اس کے متعلق بڑی طویل تحقیقات ہوئیں ' اور سنہ ۱۸۴۳ء میں ایک قانون منظور ہوا جو قانون پنجم کے نام سے مشہور ہے ' اس کی روسے عدالتوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ غلاموں پر کسی کے حق کو تسلیم ہی نہ کریں ' اس حیثیت سے غلامی خلاف قانون قرار پاگئی ' لیکن اس سے غلاموں کو فوری طور پر آزادی نہیں مل سکی ' مگر جب ان پر سے قانونی حق ہی اڑا دیا گیا تو رفتہ

---

* شمالی ہند کی بعض قوموں اور خاصکر بعض راجپوت قبیلوں میں دختر کشی کا رواج تھا ، اس کیلئے کوئی مذہبی جواز موجود نہیں تھا ۔ بلکہ اس خیال کی بناء پر تھا کہ لڑکی کو اپنے سے اونچے خاندانوں میں بیاھنا پڑیگا جو انکے لئے باعث شرم تھا مقامی طور پر انگریز افسروں نے اس رسم کو روکنے کی کوشش کی ' چنانچہ ڈنکن نے بنارس کے اندر سنہ ۱۷۸۹ء میں اور مٹکاف نے دھلی کے اندر سنہ ۱۸۱۰ء کے قریب اس رسم کے روکنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ، انکی انسدادی تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ رسم آگے چلکر ہمیشہ کیلئے مٹ گئی ۔

رفتہ رفتہ غلام خود بخود آزاد ہوگئے ، سنہ ۱۸۶۰ء میں ایک قانون بنا جس کی روسے غلاموں کے مالک کو سزا کا مستوجب قرار دیا گیا۔

ستی کے قانون سے ایک بات صاف ظاہر تھی وہ یہ کہ اب کمپنی پورے ہند پر اپنی عملداری چاہتی ہے ، اسی نظریہ کے ماتحت سکوں کا اجرا بھی عمل میں آیا ، سنہ ۱۸۳۴ء تک مختلف جگہوں پر ذرا سے فرق کے ساتھ روپیے ڈھالے جاتے تھے ، جن پر مغل شہنشاہ کی مہر ہوتی تھی ، مگر سنہ ۱۸۳۵ء میں ۱۸۰ گرین وزن کا روپیہ تینوں صوبوں کے اندر ڈھالا گیا جس پر شہنشاہ دہلی کی بجائے انگلستان کے بادشاہ کی تصویر اور مہر تھی اور یہ اس بات کا پکا ثبوت تھا کہ اب ہند پر مغل بادشاہ کی بجائے انگلستان کے بادشاہ کی عملداری قایم ہوگئی ہے۔

اس دور کے ملکی نظم و نسق کی اہم ترقیاں وہ تھیں جن کا ذکر اوپر ہوچکا اب یہ بیان کرنا ہے کہ ملک کے باشندوں پر ان تبدیلیوں کا کیا اثر پڑا ، سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ ملک میں خوش حالی بڑھ گئی تھی ، امن و امان کے قایم ہوجانے کی وجہ سے زراعت اور تجارت کو بڑی ترقی ہوگئی تھی ، بہت سی بنجر زمینوں کی پھر سے کاشت ہونے لگی ، لیکن ہر جگہ اتنی ویرانی تھی کہ ان کے آباد کرنے میں ایک زمانہ لگ گیا ، اور اسطرح آگے چلکر بہت سے زرعی مسائل پیدا ہوے ، جن کے حل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں صنعت و حرفت کے بارے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ پارچہ بافی کی صنعت پر زوال طاری ہوگیا تھا ، ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں کئی صدیوں سے ہند کے بنے ہوے کپڑے کی بڑی مانگ تھی ، اور مغربی قوموں کی کوششوں سے مغربی افریقہ یوروپ اور امریکہ میں اسی کی نئی منڈیاں کھل گئی تھیں ، مگر اٹھارویں صدی میں انگلستان کی دیسی صنعت کو فروغ دینے کیلئے ہند کا بنا ہوا کپڑا اہل انگلستان کیلئے ممنوع قرار پایا ، لیکن اب بھی ہند کے مال کی نکاسی کے دوسرے ذرایع موجود تھے ، تاہم

اس صدی کے خاتمہ پر بھاپ کی قوت اور کلوں کی ایجاد نے ہند کے کاریگروں کو یوروپ کے مقابلہ میں بالکل بے دست و پا کردیا تھا ، کیونکہ ہند سے باہر کی تمام منڈیوں میں ان کے کپڑے کی کوئی مانگ نہ رہی اور خود ہند کے اندر باہر کا کپڑا بکنے لگا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے کاریگروں نے بڑی تکلیفیں اور مصیبتیں سہنے کے بعد اپنی صنعت کو چھوڑکر زراعت کا پیشہ اختیار کرلیا جو اس زمانہ میں ان روزگار کا ایک واحد ذریعہ تھا .

اس زمانہ کی حکومت اس قسم کی تکلیفوں کو دور کرنے کیلئے کوئی ایسا عملی اقدام نہیں کرسکی ، جس طرح کہ آج ایک حکومت کرسکتی ہے ، اور اس وقت کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ پیشہ کی تبدیلی کیلئے آسانیاں مہیا کرنے کے سوا حکومت اور کوئی قابل قدر انتظام بھی نہیں کرسکتی تھی ، برآمدی تجارت کا جہاں تک تعلق ہے ہند کے کاریگروں کو یوروپ کے مقابلہ میں اسی وقت کامیابی ہوسکتی تھی جبکہ یوروپ کے طریقوں کی نقالی کرکے ان کے جیسا کپڑا تیار کرسکیں ، اسکے لئے ارزاں کوئلہ کا فراہم کرنا بہت ضروری تھا ، اگرچہ بنگال کی کانوں سے کوئلہ نکالا جانے لگا تھا تاہم کارخانوں تک اس کو پہنچانے میں اتنا خرچ لگتا تھا کہ ایک بڑے پیمانہ پر کوئلہ کا استعمال ناممکن تھا ، کلکتہ کے قریب روئی اور کپڑے کے کارخانے قایم ہوگئے تھے ، مگر ان کی اہمیت ریلوں کے وجود میں آنے کے بعد سے ہوی ہے .

ایجادات کی ترقی نے اگر ایک طرف کپڑے کی صنعت کو تباہ کیا تو دوسری طرف بنگال کی ایک بڑی آبادی کیلئے خوش حالی کا سامان مہیا کیا ، بنگال میں ایک زمانہ سے سن کی کاشت کی جاتی تھی ، جس کے ریشہ سے ٹاٹ تیار کیا جاتا تھا ، مگر یہ صنعت صرف مقامی طور پر ترقی کر رہی تھی . اس کی خاص خصوصیات کے مطابق کلوں کا ڈھالنا اور ان کا تیار کرنا بہت مشکل تھا ، لیکن جب سنہ ۱۸۳۲ء میں اس کے متعلق ڈنڈی (Dundee)

میں تجربات کیے گئے تو وہ بالکل کامیاب ثابت ہوے ' اس کے بعد سے بہت بڑی مقدار میں سن کاریشہ باہر بھیجا جانے لگا ' ہند میں سن کے کارخانے ریلوں کے وجود میں آنے کے بعد ہی قایم ہوسکے جن کے ذریعہ آسانی کے ساتھ کوئلہ فراہم ہوسکتا تھا - شمال مشرقی ہند میں دوسری اہم کاشت چاے کی تھی ' بنٹنک کے آخری زمانۂ حکومت میں وسیع پیمانہ پر چاے کی کاشت کا مسئلہ زیر غور تھا .

اگر زندگی کے سماجی اور ثقافتی پہلووں پر غور کیا جاے تو معلوم ہوگا کہ ہند کے وہ لوگ جن کا انگریزوں سے براہ‌راست تعلق تھا ' انگریزی آداب و معاشرت سے متاثر ہو رہے تھے ' اور ایک حد تک محض ان کی نقالی کررہے تھے ' بمبئی میں جہاں پارسی زیادہ اہمیت رکھتے تھے اس معاملہ میں سب سے بڑھکر پیش پیش تھے ' اس کی وجہ سے دونوں کے درمیان گہرے روابط اور تعلقات قایم ہوگئے تھے ' مدراس میں جہاں ہندووں کی اکثریت تھی اور جن کے راستہ میں ذات پات کی پابندیاں حائل تھیں ' اس قسم کی کوئی سماجی ترقی نہیں ہوسکتی تھی - مگر انھوں نے بڑی تیزی کے ساتھ انگریزی سیکھنی شروع کی جو آگے چلکر مدراس کی مشترکہ زبان بن گئی ' شمالی ہند کے مسلمانوں نے انگریزوں سے عدم تعاون اختیار کر رکھا تھا ' بعض مسلمان ایسے بھی تھے جنھوں نے اندھا دھند انگریزوں کی تقلید کی ' اور ان کے اچھے اوصاف کو اختیار کرنے کی بجاے بدترین اوصاف کو اختیار کیا ' جس کی وجہ سے وہ فضول خرچی اور عیاشی کی طرف مائل ہوگئے تھے ' صرف کلکتہ اور اس کے مضافات ہی ایسے مقام تھے ' جہاں ایک عظیم‌الشان انقلاب رونما ہوا ' اس کو بہتر طریقہ پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم تعلیم ' تبلیغ اور صحافت کے تین اہم عنوانات پر بحث کریں .

ہندو اور مسلم عہد حکومت میں ملک کی عام تعلیم کے متعلق ہماری معلومات نا کافی ہیں ، لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ لکھنا پڑھنا عام طور پر زندگی کی اہم ضروریات میں داخل نہیں تھا ، اس سے یا تو محض چند لوگ درجۂ فضیلت حاصل کرتے تھے یا چند خاص خاص پیشوں کے حصول کا وہ ذریعہ تھی جیسے مذہبی پیشوائیت ، تجارت اور دفاتر حکومت کی ملازمت ، ہندو مذہبی پیشواؤں کو سنسکرت کتابوں کا ایک طول طویل نصاب ختم کرنا ہوتا تھا ، دوسرے لوگ گھر ہی پر یا معمولی قسم کے غیر سرکاری مدرسوں میں تعلیم پاتے تھے ، اعلی تعلیم کا انتظام مذہبی قسم کے مدرسوں میں تھا ، اس دور میں ایسے کوئی بڑے مدرسے نہیں تھے جیسے کہ بودھمت کے زمانہ میں پائے جاتے تھے ۔ البتہ بنارس یا ندیہ جیسے مقدس مقامات پر برھمن سنسکرت کے خاص خاص علوم و فنون کی تعلیم و تدریس میں مصروف تھے ، ان کو بادشاہوں اور دولتمندوں کی سرپرستی حاصل تھی اسی طرح بڑی بڑی مسجدوں کے ساتھ اسلامی مدرسے ملحق تھے ، جہاں اسلامی علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی ان کو بھی بادشاہوں اور دولتمندوں کی سرپرستی حاصل تھی ، عام طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس پرانی تعلیم کی ایک خاص خصوصیت استاد اور شاگرد کے درمیان گہرے روابط کا پیدا ہوجانا ہے ، مگر اس کا پوری جماعت پر کوئی گہرا اثر نہیں پڑتا تھا .

جب کمپنی ایک تاجرانہ حیثیت رکھتی تھی تو اس نے صرف مدراس میں اپنے عیسائی ملازموں کے بچوں کے لئے کچھ مدرسے کھول رکھے تھے ، عوام کے بچوں کی تعلیم سے اس کو کوئی واسطہ نہیں تھا ، اور جب کمپنی نے حاکمانہ حیثیت حاصل کرلی تو اس وقت بھی تعلیم عامہ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا , کیونکہ انگریزوں کے نظریہ کے مطابق عوام کی تعلیم کا

بندوبست کرنا حکومت کا فرض نہیں تھا * تعلیمی بندوبست کا مطالبہ سب سے پہلے سرکاری ملازموں ھی نے کیا تھا ، صدیوں پہلے ان لوگوں نے ضرورت کی بناء پر فارسی زبان سیکھی تھی ، اور اب انہیں محسوس ھو چلا تھا کہ اپنی ملازمتوں کے برقرار رکھنے کے لئے انگریزی پڑھنی لازمی ھے ، لیکن ان کے اس مطالبہ کی طرف سب سے پہلے غیر سرکاری جماعتوں نے توجہ کی ، جن میں عیسائی مشنریاں سب سے پیش پیش تھیں ۔

ابتدا میں کمپنی کو عیسائی مشنریوں سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں ان کی وجہ سے کمپنی کے کاموں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ھوجائے ، کمپنی کے علاقے میں پرانے رومی کلیسا کے پیرو موجود تھے ، مدراس میں پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگ رھتے تھے ، مگر کلکتہ میں ان کو مقبولیت حاصل نہیں تھی ، ان کی یہاں سخت مخالفت کی جارھی تھی ، جب اٹھارویں صدی کے آخر میں چند پادری کلکتہ آئے تو یہاں کا قیام انہیں مناسب نہیں معلوم ھوا ، اس لئے وہ سیرامپور میں جاکر بس گئے جو اس وقت ڈنمارک کے قبضہ میں تھا ، اس جگہ انہوں نے اپنا تبلیغی ادارہ قایم کیا ، کئی ایک مدرسے کھولے ، اور ایک مطبع ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ مسیحیت کی تبلیغ شروع کی ، اس درمیان میں کلکتہ کے اندر عیسائی مبلغین کی مخالفت کم ھوتی جارھی تھی اور وھاں بھی مختلف ادارے قایم ھوتے جا رھے تھے ، یہاں تک کہ سنہ ۱۸۲۰ م سے پہلے کلکتہ میں دو کالج قایم ھوگئے ، اسی طرح مدراس ، بمبئی اور آگرہ میں بھی بہت سے اسکول اور کالج قایم ھوگئے تھے ، یہاں نہ صرف فنون کی تعلیم دی جاتی تھی ، بلکہ انگریزی طرز کی عام تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا تھا ۔

ھند میں اخبار نویسی کی ابتدا سب سے پہلے سیرامپور کے عیسائی مبلغوں کی طرف سے ھوی پہلے اخبار جو ھند کے

---

* انگلستان کے موجودہ تعلیمی بورڈ کی ابتدا سنہ ۱۸۳۳ع سے ھوتی ھے جبکہ پارلیمنٹ نے سرکاری امداد کو ٹھیک طور پر تقسیم کرنے اور عام چندوں کے ذریعہ غریبوں کے لئے مدرسے قایم کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی ،

اندر شایع ہوے وہ کلکتہ کے انگریزی خواں لوگوں کے لئے تھے ' ان میں زیادہ تر شخصی معاملات پر بحث اور ایک دوسرے پر شدید نکتہ چینی ہوتی تھی ' اس قسم کے اخبار زیادہ دن تک نہیں چل سکتے تھے ' کیونکہ ولزلی اس قسم کی شدید نکتہ چینیوں کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں تھا ' چنانچہ ان پر سخت قسم کی پابندیاں عاید کرکے ان کو فوراً ختم کردیتا تھا ' اور جب تک ولزلی کے قوانین پر عمل درآمد ہوتا رہا ' ہند کے اخباروں کے پنپنے کی کوئی گنجایش نہیں تھی ' لیکن جب لارڈ موئرا نے یہ پابندیاں اٹھالیں تو پھر ایک قسم کی نئی سرگرمی پیدا ہوگئی ' کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۸۱٦ع میں ایک رسالہ جاری ہوا مگر وہ زیادہ دن تک چل نہیں سکا ' دو سال بعد عیسائی مشنریوں نے بنگالی زبان میں ایک ہفتہوار اخبار جاری کیا اور پھر ایک ماہنامہ نکالا جس میں انگریزی اور بنگالی دونوں زبانوں میں مضامین شایع کیے جاتے تھے ' اس کو دیکھ کر ہند والوں نے بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ اخبار نویسی کے فن کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو بڑی ترقی دی ' سنہ ۱۸۲۳ع میں ایک آئین جاری ہوا جس کی رو سے اخباروں اور رسالوں کی اشاعت کیلئے اجازت ناموں کا لینا لازمی تھا مگر سنہ ۱۸۳۵ع میں مطبعوں پر سے تمام قسم کی پابندیاں اٹھالی گئیں ' ہند کے دوسرے حصوں میں اخبار نویسی کی ابتدائی تاریخ معلوم نہیں ہے ' البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۸۲۲ع سے بمبئی کی مقامی زبان میں ایک اخبار نکلنے لگا تھا .

اس دور کے اندر انگریزی تعلیم ' اخبارات اور عیسائیوں کی تبلیغ کی بدولت ہند میں عام طور پر اور بنگال میں خاصکر ایک ذہنی اور دماغی انقلاب پیدا ہوگیا تھا ' اس کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے ہم کو راجہ رام موہن رائے کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنا ہے ' یہ شخص بنگال کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا تھا ' اس کی تعلیم و تربیت بھکتی کے اصولوں

پر ہوی تھی جن کی چیتنیا نے تین سو سال پہلے تبلیغ کی تھی ، اس نے مذہب اسلام ، دین مسیحی اور غالبا بودھمت کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا ، اس نے تقریباً دس سال تک کمپنی کی ملازمت کی اور اس کے بعد سنہ ۱۸۱۴ء میں کلکتہ کے اندر بود و باش اختیار کرلی تھی ، اس کا نظریہ یہ تھا کہ وید کی کتابیں خالص توحید سکھاتی ہیں ، اور بت پرستوں نے اس توحید کو شرک سے آلودہ کردیا ہے ، اس کا یہ بھی خیال تھا کہ انجیلوں میں بھی خالص توحید ہی کا ذکر ہے ، جن کو بعد میں غیر متعلقہ اور غیر موزون مسائل سے بھر دیا گیا ہے ، اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کے اندر خالص توحید پھیلائے اور ایسے تمام مذہبی اور سماجی رسم و رواج کی سختی سے مخالفت کرے جن کا ذکر وید کی کتابوں میں نہیں ملتا ، سیرامپور کے عیسائی مشنریوں نے اس کی سخت مخالفت کی ، ان کا کہنا یہ تھا کہ راجہ رام موہن رائے نے انجیلوں کی غلط ترجمانی کی ہے ، اسی طرح کلکتہ کے کٹر ہندوؤں نے بھی اس کی سخت مخالفت کی ، مگر وہ اپنا کام برابر کرتا رہا ، اس نے سنہ ۱۸۲۸ء میں برھمو سماج کی بنیاد ڈالی ، اس کا اصول یہ تھا کہ ایک ازلی و ابدی نا قابل دریافت اور غیر متبدل ذات کی پوجا کی جائے اور اس کے گن گائے جائیں ، جو ساری کائنات کا خالق اور محافظ ہے ، اور جس کو کسی مجسمہ یا تصویر کے ذریعہ ظاہر نہیں کیا جاسکتا اور جس کیلئے کسی بھینٹ کی ضرورت نہیں ہے ، * وہ انگریزی تعلیم کا بڑا حامی تھا ، ہندو خاندان کی اصلاح کرنا اور کثرت ازدواج اور ستی کی رسموں کو مٹانا چاہتا تھا ، وہ ذات پات کی تقسیم کو بالکل نا پسند کرتا تھا اگرچہ وہ خود اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا .

* یہ الفاظ برھمو سماج کی عمارت کے وقف نامہ سے لئے گئے ہیں ، ڈاکٹر جے این فارقہر نے اپنی کتاب ماڈرن ریلیجیس موومنٹس ان انڈیا (مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۸ء) کے صفحہ ۳۵ پر ان کو نقل کیا ہے .

راجہ رام موهن رائے انگریزوں کے رسوخ اور اقتدار سے کام لیکر اپنے خیالات کو فروغ دینا چاهتا تھا ' چنانچہ سنہ ۱۸۳۰ع میں اس نے انگلستان کا بحری سفر کیا جو اس زمانہ میں ایک بڑی همت کا کام سمجھا جاتا تھا ' اس کے اس سفر سے انگلستان کے لوگوں کو هند کے مقامی حالات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی ' مگر سنہ ۱۸۳۳ع میں اس کا انتقال هوگیا ' جس کی وجہ سے اس کے مقاصد پورے نہ هوسکے ' کچھ دن تک کیلئے اس کی تحریک کمزور پڑگئی ' مگر آگے چلکر جب نئے رهبر پیدا هوگئے تو اس تحریک میں پھر سے جان آگئی اور هند کی معاشرتی زندگی میں اس مسلک کو بڑی اهمیت حاصل هوگئی ' نہ صرف یہ کہ اس مسلک کے پیرووں کی تعداد میں قابل قدر اضافہ هوا بلکہ اس کی وجہ سے اس نظریہ کو بڑی ترقی ملی کہ هندومت ایک زندہ مذهب هے اور اس میں نشو و نما پانے اور ترقی کرنے کی بڑی گنجایش هے .

هم نے اوپر بیان کیا هے کہ پہلے پہل کمپنی کو عوام کی تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں تھا ' مگر اس نے یہ تسلیم کرلیا کہ تعلیم کا بندوبست کرنا اور علم کی سر پرستی کرنا هر ایک هندی حکمران کا فرض منصبی هے ' چنانچہ اسی نظریہ کی بناء پر وارن هیسٹنگز نے ایک اسلامی مدرسہ کے قایم کرنے میں مالی امداد بهم پہنچائی ' اسی طرح اس کی حوصلہ افزائی سے بنارس میں ایک سنسکرت کالج قایم هوا ' اور پرانے دستور کے مطابق ندیہ اور پونا وغیرہ جیسے اهم مرکزوں پر رهنے والے اهل علم کے لئے وظیفے مقرر هوے ' سنہ ۱۸۱۱ع میں منٹو نے تعلیمی سرگرمیوں کو اور بڑھانے کی کوشش کی ' اور ادهر ولبرفورس Wilberforce کی سرکردگی میں انگلستان کا ایک خاص مسیحی فرقہ * تعلیم عامہ کے انتظام کرنے پر بہت زور دے

---

* اس فرقہ کا یہ عقیدہ تھا کہ نجات کا انحصار اعمال صالحہ اور مراسم مذهبی پر نہیں بلکہ عقیدہ یا ایمان پر هے .

رہا تھا ، چنانچہ سنہ ۱۸۱۳ء کے منشور میں اس مقصد کیلئے بہت سی دفعات منظور کی گئیں ، ہند کی حکومت کو اس کی اجازت دی گئی تھی کہ یہاں کے اہل علم کیلئے وظیفے جاری کرے اور مختلف علوم کی تعلیم کو ترقی دینے کیلئے روپیہ صرف کرے ، لیکن ایک زمانہ تک اس سلسلہ میں کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا ، سنہ ۱۸۲۳ء میں نظامت تعلیم (Public Instruction) کی ایک کمیٹی بنائی گئی تاکہ سرکار سے منظور شدہ رقم کو ٹھیک طور پر تقسیم کرے ابتدا میں اس کی توجہ ہند کی قدیم ادبی زبانوں کی ترقی کی طرف مبذول رہی ، مگر چند لوگ ایسے بھی تھے جو انگریزی تعلیم کے بندوبست کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے ، چنانچہ آگے چلکر اس کمیٹی کے دو فریق ہوگئے ، ایک فریق انگریزی تعلیم کا حامی اور طرفدار تھا ، دوسرا ملک کی قدیم ادبی زبانوں کو ترقی دینا چاہتا تھا ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زمانہ تک اس کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ نہیں کیا جاسکا جب سنہ ۱۸۳۴ء میں کونسل کا نیا قانونی مشیر لارڈ مکالے اس کمیٹی کا صدر بنا تو اس نے سنہ ۱۸۳۵ء کی ابتدا میں اپنی مشہور روداد پیش کی جس میں ہند کے باشندوں کیلئے انگریزی زبان میں اعلی تعلیم کے انتظام کرنے پر پورا زور دیا تھا ، گورنر جنرل کی مجلس نے اس کے اس نظریہ کو قبول کرلیا اور اس طرح اس اہم فیصلہ پر ہمارے اس زیر نظر دور کا خاتمہ ہوگیا ۔

باب ۴۱

سرحد اور پنجاب

۱۸۳۶ تا سنہ ۱۸۵۶

لارڈ آکلینڈ (سنہ ۱۸۳۶ع – ۱۸۴۲ع) اور لارڈ اِلن برو (سنہ ۱۸۴۲ع - ۱۸۴۴ع) کے زمانۂ حکومت میں سرحد پر روسیوں کی طرفسے بڑا خطرہ لگا ہوا تھا' اس سے پہلے جنگ یوروپ کے آخری سالوں میں جب فرانسیسی فوج نے ترکی میں سے ہوکر ہند پہنچنے کی کوشش کی تو ایران انکا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا' اب حالات بالکل بدل چکے تھے' سنہ ۱۸۲۸ع میں روس ایران کو ایک زبردست شکست دے چکا تھا اور اسکی فوجیں بحر خزر (Caspian Sea) کے مشرقی ساحل تک پہنچ گئی تھیں' اور جب آکلینڈ گورنر جنرل ہوکر آیا تو روس اور ایران دونوں ملکر افغانستان میں گھسنے کی تیاریاں کر رہے تھے' یہاں حالات اسوقت بہت ہی نازک اور پیچیدہ ہوگئے تھے' کابل پر دوست محمد خاں کی حکومت تھی' مگر سارے ملک پر اسکا ابھی قبضہ نہیں ہوا تھا' ایرانی ہرات پر' جو افغانستان کا ایک زبردست مغربی مورچہ تھا' قابض ہونے کی کوشش کر رہے تھے' ادھر شاہ شجاع جو افغانستان کا حکمران رہ چکا تھا' ہند کے اندر رہکر انگریزوں سے ساز باز کر رہا تھا تاکہ انکی مدد سے افغانستان کا کھویا ہوا تخت واپس لے' اسطرف رنجیت سنگھ اپنی جگہ افغانستان پر حملہ کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا' اسطرح دوست محمد کو اپنی مشرقی سرحد کی طرف سے بڑا خطرہ پیدا ہوگیا تھا.

آکلینڈ نے انگلستان کی ہدایات کے بموجب دوست محمد خاں سے گفت و شنید شروع کی' کابل میں روسی سفیر پہلے ہی سے سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھا' انگریزی سفیر کو اسکے مقابلہ میں کچھ کامیابی نہیں ہوی اسلئے سنہ ۱۸۳۸ع کے موسم بہار میں اسکو واپس بلا لیا گیا؛ اب روسی سفیر کیلئے میدان بالکل

خالی تھا ' اور دوست محمد کیلئے بھی بڑی مشکلات پیدا ہوگئی تھیں کیونکہ وہ کسی ایک فریق کا بھی ساتھ نہیں دینا چاہتا تھا ' لارڈ آکلینڈ نے جون سنہ ۱۸۳۸ء میں رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع سے ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں Tripartite Treaty (سہ طرفہ عہدنامہ) کے نام سے مشہور ہے ' اس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ شاہ شجاع ہی افغانستان کا حقیقی بادشاہ ہے ' اور کابل کے تخت پر اسی کو بیٹھنا چاہئے ۔

انگریزوں کی یہ مہم ابتدا میں بہت کامیاب رہی دوست محمد کابل چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا ' اور آگست سنہ ۱۸۳۹ء میں شاہ شجاع اپنی فوج کے ساتھ کابل میں داخل ہوا ' مگر اس میں حکومت کرنے کی بالکل ہی قابلیت نہیں تھی ' وہ افغانوں کو اپنی طرف نہیں کرسکا ۔ بلکہ وہ انگریزی فوج کے بل بوتہ پر حکومت کرنے لگا تھا ۔ اور جب اسی سال جون کے مہینہ میں رنجیت سنگھ کا انتقال ہوگیا تو معاملات بہت ہی نازک اور پیچیدہ ہوگئے ' کیونکہ جب تک وہ زندہ رہا ' افغانستان کی مہم میں انگریزوں کو اس سے بڑی مدد مل رہی تھی اور جب اس کا انتقال ہوگیا تو سکھوں کے اندر جانشینی کے جھگڑے کھڑے ہوگئے اور اب انہیں اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ انگریزوں کی کچھ مدد کرسکیں ' اس لیے سہ طرفہ عہد نامہ کے شرایط کو پورا کرنا انگریزوں کے ذمے ہوگیا ' ان مشکلات کے باوجود انگریزوں نے سنہ ۱۸۴۰ء تک افغانستان کے اندر اپنی طاقت اور قوت کے برقرار رکھنے کی کوشش کی ' اس سال کے آخر میں دوست محمد نے اطاعت کرلی ' مگر سنہ ۱۸۴۱ء انگریزوں کے لئے بہت ہی خوفناک ثابت ہوا ' کیونکہ شاہ شجاع کے خلاف پٹھانوں کی شورش کم ہونے کی بجائے برابر بڑھتی ہی رہی ' چنانچہ نومبر سنہ ۱۸۴۱ء میں کابل کے اندر اچانک بغاوت ہوگئی ' مقامی انگریزی فوج اس کا کوئی فوری تدارک نہیں کرسکی ' دیکھتے دیکھتے یہ معمولی بغاوت ا۔ عظیم الشان خطرہ کی شکل اختیار کر گئی ' چنانچہ انگریزوں

نے دسمبر میں اپنی فوجوں کو ہٹا لینے کا فیصلہ کرلیا ، اور دوست محمد کو واپس آنے کی اجازت دیدی مگر مشکل یہ تھی کہ ساری زمین اور راستے برف سے ڈھکے ہوے تھے ، جس کی وجہ سے فوجوں کا ہٹا لیجانا بہت ہی دشوار تھا ، ان حالات میں افغان سواروں نے پہلے تو انگریزی فوج کے عقب پر حملہ کیا اور پھر دونوں بازووں کی طرف سے اس کو گھیر لیا اور اس طرح قتل عام شروع کیا کہ سولہ ہزار کی فوج میں صرف ایک شخص بچ کر جلال آباد پہنچ سکا ، جو کابل اور پشاور کے درمیان واقع تھا اور جہاں انگریزی فوج کا ایک دستہ پہلے ہی سے موجود تھا ۔

فروری سنہ ۱۸۴۲ء میں لارڈ آکلینڈ کی جگہ الن برو گورنر جنرل ہوکر آیا ، اس وقت صورت حال یہ تھی کہ سارا افغانستان انگریزوں کے خلاف متحد ہوچکا تھا ، الن برو نے خیال کیا کہ ملک کو دوبارہ حاصل کرکے اس پر قبضہ رکھنے کی کوشش کرنا بے سود ہوگا ، اس لئے بہتر یہی ہے کہ پھر ایک مرتبہ افغانستان کو فتح کرکے پھر اپنی مرضی سے اس کو خالی کردیا جائے ، اور جب اپریل کے مہینہ میں کابل کے اندر نام نہاد بادشاہ شاہ شجاع کو قتل کردیا گیا تو اس حکمت عملی کے پورا کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی ، چنانچہ جون کے مہینے میں انگریزی فوجیں جلال آباد سے آگے بڑھیں اسی وقت قندھار سے ایک فوجی دستہ ان کی مدد کو آپہنچا ، ستمبر میں کابل پر ان کا قبضہ ہوگیا ، انگریزوں نے شاہ شجاع کے ایک نابالغ بچہ کو تخت پر بٹھایا اور پھر وہ اکتوبر کے مہینے میں وہاں سے واپس ہوگئے ، یہ نابالغ بچہ بھی اپنے باپ کی طرح زیادہ دن تک حکومت نہیں کرسکا ، کیونکہ سنہ ۱۸۴۳ء کی ابتدا میں دوست محمد خاں پھر سے کابل کا بادشاہ ہوگیا ۔

جنگ افغانستان کا ایک ضمنی نتیجہ سندھ کا الحاق ہے ، نظری حیثیت سے سندھ افغانستان کا ایک صوبہ سمجھا جاتا تھا مگر عملاً وہ خود مختار تھا ، سنہ ۱۸۳۷ء میں بلوچستان کے ایک

شخص نے یہاں اپنی حکومت قایم کی تھی ' آگے چلکر اس کی اولاد نے ملک کو آپس میں بانٹ لیا تھا ' ان کو عام طور پر امیران سندھ کہا جاتا تھا ' قندھار کا راستہ ان ھی کے علاقہ میں سے ھوکر گذرتا تھا ' سنہ ۱۸۳۸ع میں انگریزوں نے امیران سندھ کو اس بات پر معاھدہ کرنے کیلئے مجبور کیا کہ وہ کمپنی کی فوجوں کو اپنے علاقہ میں سے ھوکر گذرنے کا راستہ دینگے اور نیز چند اھم مورچے ان کے حوالے کرینگے ' اور جب افغانستان کے حالات انگریزوں کے حق میں ناسازگار ھوگئے تو اس عہد نامہ کی شرطوں پر پورا عمل نہیں کیا گیا ' سنہ ۱۸۴۲ع کے آخر میں الن برو نے امیران سندھ کو ایک نیا معاھدہ کرنے پر مجبور کیا یہ لوگ کئی دن تک ٹال مٹول کرتے رھے اور ساتھ ھی جنگ کی تیاریاں بھی کرنے لگے ' کمپنی کی فوج اس کا جواب دینے کیلئے پوری طرح تیار تھی - چنانچہ جب فروری سنہ ۱۸۴۳ع میں میانی کا معرکہ پیش آیا تو اس میں امیران سندھ کو بڑی زبردست شکست ھوی اور اس کے بعد سندھ کا پورا علاقہ صوبہ بمبئی میں شامل کرلیا گیا .

نظمائے کمپنی کو الن برو کی پالیسی سے اتفاق نہیں تھا اس لئے انھوں نے دوسرے ھی سال اس کو واپس بلا لیا اور اس کی جگہ سر ھنری ھارڈنگ (۱۸۴۴ - ۱۸۴۸) کو گورنر جنرل بناکر بھیجا ' اس نے پنجاب کے نازک حالات کو سلجھانے کی کوشش کی ' جہاں رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد جانشینی کے جھگڑے کھڑے ھوگئے تھے ' سنہ ۱۸۴۵ع تک یہ جھگڑے جاری تھے - اب سکھ فوج کی عملداری ھوگئی تھی ' سکھ اس بات سے ڈر رھے تھے کہ انگریز کہیں سندھ کی طرح پنجاب کو بھی ھڑپ نہ کرلیں ' بعض سکھ سردار جو انگریزی اقتدار کے سخت مخالف تھے ' سکھوں کے جذبات کو بھڑکا رھے تھے ' چنانچہ دسمبر سنہ ۱۸۴۵ع میں سکھ فوج نے ستلج کو پار کرکے کمپنی کے علاقہ پر حملہ کردیا ادھر ھارڈنگ نے بھی سکھوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا '

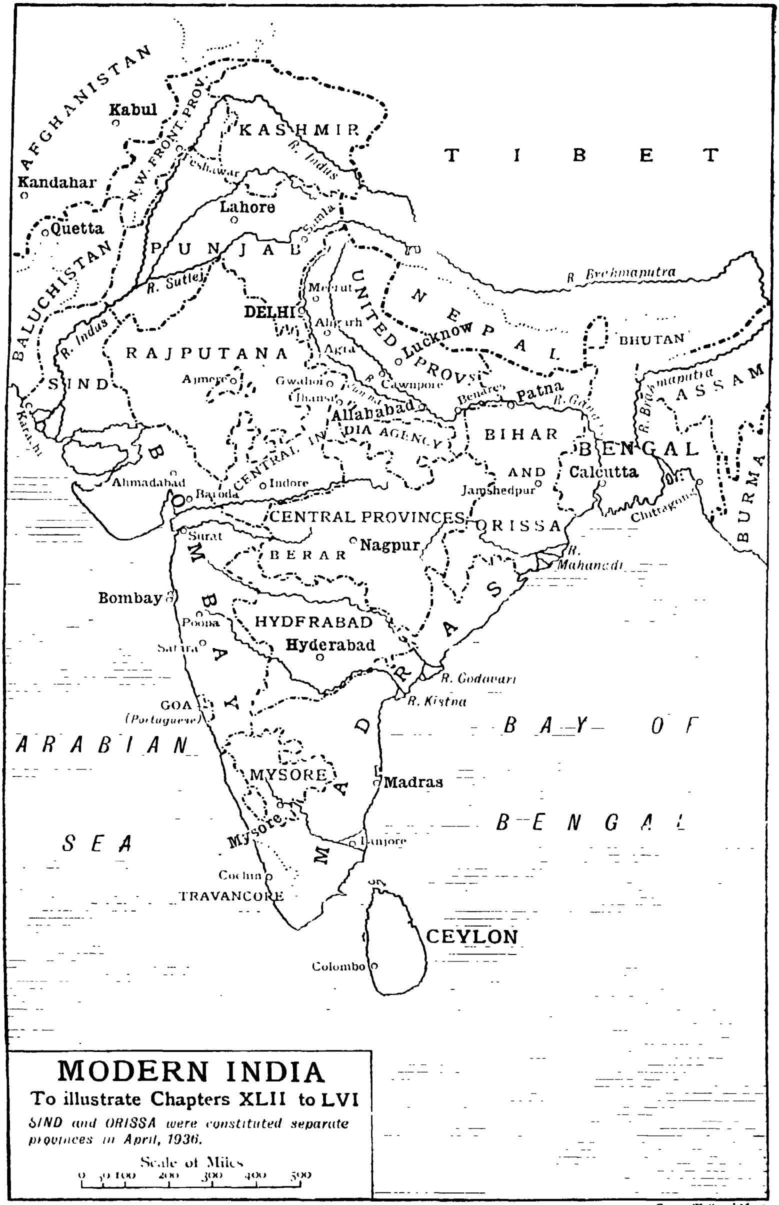
دونوں میں بڑے زبردست اور خوں ریز معرکے پیش آئے ' آخر فروری سنہ ۱۸۴۲ء میں سبراؤں کی مشہور جنگ ہوی جس میں سکھوں کو بڑی زبردست شکست ہوی ' اس کے بعد ان سے ایک معاہدہ ہوا جس کی روسے کشمیر کو پنجاب سے الگ کردیا گیا اور وہاں برطانوی حفاظت میں ایک نئی ریاست قایم ہوی ' پنجاب کا مشرقی حصہ انگریزوں نے لے لیا اور ایک نا بالغ بچہ کو مہاراجہ کا لقب دیکر برطانوی فوج کی مدد سے باقی حصۂ سلطنت کا مالک بنا دیا .

چونکہ اتالیق بذات خود اکیلا ریاست کا انتظام نہیں کرسکتا تھا - اس لئے وزیروں نے معاہدہ کی شرایط کے بدلنے کی درخواست کی اس کی روسے سارے اختیارات برطانوی ریذیڈنٹ کو دیدئے گئے سکھوں نے عام طور پر اس انتظام کو قبول نہیں کیا ' اور سنہ ۱۸۴۸ء میں پے درپے کئی مرتبہ بغاوت کی ' جس سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سکھ جنگ کے لئے آمادہ ہیں' چنانچہ جب لارڈ ہارڈنگ کے بعد لارڈ ڈلہوزی (۱۸۴۸ - ۱۸۵۶) گورنر جنرل ہوکر آیا تو اس نے سکھوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا ' اس کے بعد دوسری مرتبہ کئی خونریز لڑائیاں پیش آئیں ' آخر فروری سنہ ۱۸۴۹ء میں گجرات کی جنگ ہوی جس میں سکھوں کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی ' اور پنجاب پر انگریزوں کا کامل قبضہ ہوگیا ' تاہم سکھوں پر پوری طرح قابو پانا آسان نہیں تھا ' اسی لئے اس صوبہ کا انتظام ایک مجلس کے حوالے کیا گیا جس کے دو اہم رکن دو بھائی هنری اور جان لارنس تھے ان کے ساتھ کام کرنے والے بھی غیر معمولی قابلیت کے لوگ تھے ' چار سال تک اس مجلس کے زیر نگرانی اس صوبہ کی حکومت کی جاتی رہی ' آخر سنہ ۱۸۵۳ء میں اس مجلس کو توڑ کر جان لارنس ہی کو اس صوبہ کا چیف کمشنر بنا دیا گیا ' اسنے ملک میں امن قایم کرنے کی کوشش کی ' لوگوں سے تمام ہتھیار چھین لئے اور ان کو زراعت یا تجارت کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا ' اور قانونی

حکومت بنانے کے لئے بہت سے آئین اور قوانین نافذ کئے ، جو بنگال کے آئین و قوانین سے بھی آسان اور اس وقت کے حالات کے بالکل مطابق تھے ، سرحد کے صوبہ میں سڑکیں تیار کرائیں اور اس صوبہ کی حفاظت کی تمام تدبیریں اختیار کیں ، پھر حقوق ملکیت کی یادداشت Record of Rights مرتب کرائی ، اور ان کاشتکار برادریوں کے ساتھ لگان کا تصفیہ کیا جن کے قبضہ میں زمینیں پائی جاتی تھیں لگان کی شرح سکھوں کے زمانہ حکومت کی شرح سے بھی کم مقرر کی پنجاب میں بڑی تیزی کے ساتھ امن و امان کے قایم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ خالصہ ریاست ابھی ابھی قایم ہوی تھی - ملک کی آبادی زیادہ تر مسلمانوں اور ہندووں پر مشتمل تھی - ان کے لحاظ سے سکھوں کی تعداد بالکل کم تھی ، خود سکھ سردار آپس میں متحد نہیں تھے اور ان میں سے بعض ایسے تھے جو اپنی فوج کی بدعنوانیوں سے بہت نالاں تھے ، وہ کمپنی کی حکومت کو اپنی فوج کی حکومت پر ترجیح دیتے تھے ، اس لئے جب سکھ فوج ہی کا خاتمہ ہوگیا تو اب پنجاب میں انگریزوں کا مد مقابل کوئی اور نہیں رہا .

س میں روس کی طرف سے بھی کوئی خطرہ نہیں تھا؛ کیونکہ سنہ ۱۸۴۴ع میں یوروپ کے اندر امن قایم ہوگیا تھا اور پھر جنگ کریمیا تک کوئی دوسری لڑائی پیش نہیں آئی ، اس کے باوجود ایران افغانستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا ، اس نے ہرات پر کئی حملے بھی کیے تھے اس کی وجہ سے دوست محمد خاں مجبور ہوگیا تھا کہ سنہ ۱۸۵۵ع میں انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قایم کرلے ، اس طرح دوست محمد کی وفات (سنہ ۱۸۶۳ع) تک سرحد پر کسی قسم کی لڑائی پیش نہیں آئی ، دوسری طرف ڈلہوزی کے عہد حکومت میں برما کی دوسری بڑی جنگ سنہ ۱۸۵۲ع میں ہوی جس میں برمیوں کو بڑی زبردست شکست ہوی ، اس کے بعد سے جو کچھ ساحلی علاقہ باقی رہا تھا

وہ انگریزوں کے قبضہ میں آگیا ۔ اس طرح کمپنی کی حکومت آسام سے لیکر اراکان اور پیگو ہوتے ہوے تناسرم تک قایم ہوگئی ۔ اگرچہ بالائی برما اب بھی خود مختارتھا ، مگر سمندر سے اس کا تعلق منقطع ہوگیا ، اب آئندہ باب میں خود ڈلہوزی کی کارگذاریوں کو بیان کیا جاتا ہے .



MODERN INDIA

To illustrate Chapters XLII to LVI

SIND and ORISSA were constituted separate provinces in April, 1936.

Scale of Miles

0 50 100 200 300 400 500

باب ۴۴

ڈلہوزی کا انتظام حکومت

الحاق پنجاب کے علاوہ ڈلہوزی کا عہد حکومت دو باتوں کیلئے بہت مشہور ہے ' ایک تو یہ کہ اس نے بازگشت (Lapse) اور اقتدار اعلی (Paramountcy) کے اصول کی بناء پر بہت سی ریاستوں کو کمپنی کے علاقہ میں شامل کرلیا تھا ' دوسرے یہ کہ اس کے زمانہ میں ہند کو اقتصادی حیثیت سے بڑی ترقی ہوی تھی قانون بازگشت کی اب محض ایک تاریخی حیثیت ہے ' لیکن اقتدار اعلی کی اس وقت بھی بہت بڑی اہمیت ہے ' ڈلہوزی نے ان اصول کی اس لئے پابندی کی کہ ان سے عوام کا فایدہ ہو رہا تھا ' وہ راجاؤں سے زیادہ پرجا کا حامی تھا ' اس کا عقیدہ تھا کہ لوگ دیسی راجاؤں اور سرداروں کی بہ نسبت کمپنی کی حکومت میں زیادہ خوش حال رہ سکتے ہیں ' اسی لئے وہ ریاستوں کے ہر ایک معاملہ میں کمپنی کی حکومت کو ترجیح دیتا تھا .

قانون بازگشت کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی راجہ کا کوئی صحیح وارث نہ ہو تو اس کی ریاست اقتدار اعلی کے نام ضبط کرلی جاے ' اس حالت میں اس راجہ کا لے پالک لڑکا اقتدار اعلی کی اجازت کے بغیر ریاست کی گدی پر نہیں بیٹھ سکتا تھا ' اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ پرانے زمانہ میں بھی اس اصول پر عمل کیا جاتا تھا مگر اس وقت اس کو کوئی قانونی شکل نہیں دی گئی تھی ' ہند کے شہنشاہ دیسی راجاؤں کی جانشینی کے معاملات میں مداخلت کرتے تھے ' اور اپنے آدمی کو ریاست کی گدی پر بٹھانے کی کوشش کرتے تھے ' اگرچہ ان کے زمانہ میں کسی کی ریاست ضبط نہیں کی گئی تاہم وہ نئے جانشین پر سخت قسم کی پابندیاں عاید کرتے تھے ' ڈلہوزی نے اس کو ایک قانون کی شکل دیکر اس کو ریاستوں کے الحاق کا ایک فریعہ

بنالیا تھا ۔ جب کبھی اس کو اس قسم کا موقعہ ملتا تھا تو وہ ریاست کو کمپنی کے علاقہ میں شامل کرلیتا تھا ۔ چنانچہ اس اصول کی بناء پر اس نے ستارا ' ناگپور اور جھانسی کی تین مرہٹی اور دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ضبط کرلیا تھا ' مگر جب چند سال بعد تمام بڑی بڑی ریاستوں کو اس بات کا حق دیدیا گیا کہ وہ لے پالک لڑکے کو اپنا جانشین بنالیں تو اس قسم کا الحاق نا ممکن ہوگیا ۔

اقتدار اعلی کی تاریخ بالکل جداگانہ ہے ' حال میں اس کی معتبر تشریح یوں کی گئی ہے کہ یہ ایک سیاسی برتری ہے جس کی بنیاد صلحناموں معاہدوں اور سندوں کے ساتھ ساتھ دستور اور اطاعت شعاری اور حکومت ہند اور وزیر ہند کے ان فیصلوں پر رکھی جاتی ہے - جو سیاسی دستور کی صورت میں ہوتے ہیں * اسکا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ریاست کا نظم و نسق اس حد تک بگڑ جائے کہ اس میں مداخلت کی ضرورت ہو تو اقتدار اعلی کو اس ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا پورا اختیار حاصل ہے ' اور وہی اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کی ضرورت ہے یا نہیں ' کمپنی نے مختلف موقعوں پر اس اصول کو استعمال کیا تھا ' چنانچہ جب سنہ ۱۸۳۱ء میں میسور کے لوگوں نے خود اپنی حکومت کی بد انتظامی کے خلاف بغاوت کی تو کمپنی نے پوری ریاست کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سنہ ۱۸۸۱ء تک اس کا انتظام کرتی رہی ' اسی طرح مختلف اسباب کی بناء پر آسام اور مدراس کی چند غیر اہم ریاستوں کو ضبط کرلیا گیا تھا اور بعض کو وقتاً فوقتاً تنبیہ کی گئی تھی ' چنانچہ جب اودھ کی ریاست کا نظم ونسق بالکل ہی بگڑ گیا تو سنہ ۱۸۴۷ء

* دیکھو انڈین اسٹیٹس کمیٹی کی رپورٹ (Cmd 3302) پیرگراف ۱۹ - سند سے مراد وہ تحریری منظوری ہے جو اقتدار اعلی کی جانب سے ملتی ہے ' سیاسی ' کے لفظ کو اصطلاحی معنے میں استعمال کیا گیا ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے ۔

میں هارڈنگ نے شخصی طور پر بادشاہ کو تنبیہ کی کہ اگر دو سال کے اندر اندر ریاست کا انتظام ٹھیک نہ ہوجاے تو اس کو ضبط کرلیا جاڈیگا ، اس مدت کے گذرنے کے بعد تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہاں کے معاملات اصلاح پذیر ہونے کی بجاے بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کے احکام کے بموجب سنہ ۱۸۵۶ع میں اودھ کی ریاست کو بھی ضبط کرلیا گیا ۔

ان تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام علاقے جن پر کبھی دیسی راجاؤں کی حکومت تھی ، براہ راست کمپنی کے زیرنگین آگئے ، اور برطانوی ہند کا نقشہ قریب قریب وهی ہوگیا جو آج پایا جاتا ہے ، سنہ ۱۸۵۳ع کے قانون منشور (Charter Act) کے مطابق گورنر جنرل کو بنگال کی بلاواسطہ نگرانی کے فرض سے سبکدوش کردیا گیا ، اور اس ایک وسیع صوبہ کے پانچ صوبے کردئے گئے ، یعنی بنگال ، صوبجات شمال مغربی ، پنجاب * ، اودھ اور صوبجات متوسط ، پہلے دو صوبوں پر لفٹننٹ گورنر اور باقی تین صوبوں پر چیف کمشنر مقرر کیے گئے تھے صوبجات متوسط میں ناگپور کے بھونسلہ خاندان کی ریاست بھی شامل تھی ، اور جب سنہ ۱۸۶۲ع میں برما اور سنہ ۱۸۷۴ع میں اسام کے اندر چیف کمشنریاں قایم کردی گئیں تو بنگال کا رقبہ اور بھی کم ہوگیا ، تاهم بہار ، اوریسہ اور چھوٹا ناگپور اب بھی بنگال هی میں شامل رهے ، دوسرے صوبوں میں کسی قسم کی کانٹ چھانٹ نہیں ہوی ، صوبہ مدراس اپنی صورت پر باقی رہا ، بمبئی میں سندھ شامل تھا ، اسکی حیثیت ایک علحدہ صوبہ کی نہیں تھی بلکہ اس پر ایک کمشنر مقرر کیا گیا تھا ، جسکو بعض غیر معمولی اختیارات حاصل تھے ، ان صوبوں کی سرحدوں

* آگے چلکر پنجاب پر ایک لفٹننٹ گورنر مقرر کیا گیا جس کی ماتحت دھلی کا وہ علاقہ تھا جو جمنا سے مغرب میں واقع ھے اور جو اس سے پہلے صوبجات شمال مغربی کا ایک حصہ تھا ۔

کے تعین میں کسی قومی یا اقتصادی اصول کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا بلکہ تاریخی اور تنظیمی اسباب کی بناء پر ان کی تقسیم کی گئی تھی اور یہ ایک ایسی خامی تھی جسکا اثر آگے چلکر ظاہر ہوا ۔

ڈلہوزی کی ایک اور قابل ذکر تبدیلی یہ تھی کہ اس نے ریاست حیدرآباد سے اس کے چند شمالی اضلاع لے لئے جن کے مجموعے کو آج برار کہا جاتا تھا ، کیونکہ حیدرآباد نے معاهدہ کے مطابق کئی سال سے وہ رقم ادا نہیں کی تھی ، جو برطانوی حفاظتی فوج کے مصارف کیلئے مقرر کی گئی تھی ۔ اس کے بعد سے پچاس برس تک برار ایک الگ صوبہ بنا رہا ۔

ڈلہوزی کے زمانہ کی تبدیلیوں کے عام اثرات کا خلاصہ یہ تھا ۔ شمالی ہند میں گنگا اور دریائے سندھ کے میدانوں پر کمپنی کی حکومت قایم تھی ۔ اس میں کہیں کہیں ایسی ریاستیں بھی شامل تھیں جو ثانوی اہمیت رکھتی تھیں ۔ ہند کا ناهموار مرکزی علاقہ مختلف ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن کے درمیان کمپنی کے علاقے تھے ، جنوبی ہند میں حیدرآباد اور میسور کے سوا سارا علاقہ کمپنی کے ماتحت تھا ۔ نظم و نسق کی ضروریات کی بناء پر وسط ہند کے ایک بڑے حصہ کو دو ایجنسیوں پر تقسیم کیا گیا تھا ایک مغربی ایجنسی تھی جس کو آج راجپوتانہ کہا جاتا ہے ۔ اس میں زیادہ تر راجپوت ریاستیں شامل تھیں ۔ ان ریاستوں کے ساتھ کمپنی کے تعلقات کو مستحکم کرنے کا ذمہ دار گورنر جنرل کا نمائندہ ہوتا تھا جس کو ایجنٹ کہا جاتا تھا ۔ اس کا صدر مقام اجمیر تھا ۔ اس کا تقرر سنہ ۱۸۳۲ع سے ہونے لگا تھا ۔ دوسری ایجنسی وسط ہند کی تھی جس کو ڈلہوزی نے سنہ ۱۸۵۴ع میں قایم کیا تھا ۔ اس کا ایجنٹ اندور میں رہتا تھا ۔ اس ایجنسی میں زیادہ تر مالوہ کی مرہٹی ریاستیں اور بندیلکھنڈ کی راجپوت ریاستیں شامل تھیں ۔ یہ ایجنٹ اور دوسری ریاستوں کے ریذیڈنٹ سیاسی فرایض انجام دیتے تھے ۔ ہند

میں ' سیاسی ' (Political) کا لفظ انگلستان کے معنوں سے مختلف معنی میں استعمال ہوتا ہے - ایک حیثیت سے یہ لوگ مدبرانہ فرایض diplomatic duties انجام دیتے تھے تو دوسری حیثیت سے اقتدار اعلی کے اصول سے کام لینا بھی انہی کے ذمے تھا - اس طرح ایک سیاسی افسر Politial Officer کی حیثیت ایک مدبر diplomat سے بھی بہت اونچی ہوتی تھی - کیونکہ وہ کبھی کبھی ایک ماتحت حکمران تک اقتدار اعلی کے احکام بھی پہنچا سکتا تھا .

یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ اس طرح ریاستوں اور صوبوں میں بٹے ہوے ہند کے لوگوں کے اندر مشترک جذبہ موجود تھا یا نہیں البتہ ڈلہوزی کی اقتصادی حکمت عملی کی اہمیت محض اس لیے ہے کہ اس کے زمانہ میں ذرایع رسل و رسایل کی ترقی کی تدابیر کے اختیار کرنے کی وجہ سے تمام مقامات بڑی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے قریب ہوگئے ' اس صدی کے دوسرے نصف کی ایک بڑی خصوصیت لوگوں کا یہی اتحاد اور ان کی یگانگت ہے ' لیکن ہند میں ان ترقیوں کی تاریخ کے لکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یوروپ کے ساتھ ہند کے تعلقات کی تبدیلیوں پر ایک سرسری نظر ڈالیں ' یوروپ سے ہند تک پہنچنے کا ایک زمینی راستہ سنہ ۱۸۳۸ع میں قایم ہوگیا تھا ' جس سے لوگ چھ ہفتوں کے اندر لندن سے بمبئی تک پہنچ سکتے تھے ' ڈلہوزی کے زمانہ میں اس راستے سے مہینہ میں ایک مرتبہ ڈاک جاتی تھی ' سنہ ۱۸۵۰ع کے بعد سے یہ ہفتہ وار کردی گئی تھی لیکن مصر سے ہوکر گذرنے میں بہت زیادہ خرچ لگتا تھا اور اس راستہ سے معمولی قیمت کا سامان نہیں بھیجا جاسکتا تھا ' اور راس امید سے ہوکر جو بحری راستہ جاتا تھا ' اس میں ہفتوں کی بجاے مہینے لگ جاتے تھے ' اس وقت تک تاربرقی کی ایجاد نہیں ہوی تھی ' اور ہند اور یوروپ کے درمیان تاربرقی کا سلسلہ سنہ ۱۸۶۵ع سے پہلے قایم نہیں ہوسکا تھا .

اندرون ملک کے رسل و رسایل کی ترقی کے سلسلہ میں چند غلط فہمیوں کا دور کرنا ضروری ہے جو بعض مانوس اصطلاحات کی تعبیر کے وقت پیدا ہوتی ہیں ، مغلوں کے زمانہ میں ہرکاروں کے ذریعہ خطوط رسانی کا بہترین انتظام تھا ، یہ ہرکارے ایک دن میں دو سو میل طے کرتے تھے ، مگر اس کو صحیح معنی کرکے ڈاک نہیں کہا جاسکتا ، کیونکہ ان ہرکاروں کے ذریعہ صرف سرکاری خطوط بھیجے جاتے تھے ، لوگ اپنے خطوط اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے بھیجتے تھے جو عام حالات میں روزانہ تقریباً تیس میل طے کرسکتے تھے ، کمپنی کے زمانہ حکومت میں بھی پہلے پہل صرف سرکاری خطوط کے بھیجنے کا انتظام تھا ، مگر بہت جلد عوام کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا گیا ، سب سے پہلے سنہ ۱۸۳۷ع میں ایک عام ڈاکخانہ قایم ہوا ، اور جب اس کا کچھ تجربہ حاصل ہوا تو سنہ ۱۸۵۴ع کے ایک قانون کی روسے ڈاک کا ایک مستقل محکمہ قایم کیا گیا جو Indian Post Office کے نام سے مشہور ہوا اب ایک ہی قیمت پر ہر جگہ خطوط بھیجے جاسکتے تھے ، ان کی شرح بالکل معمولی تھی اور پہلے ہی سے قیمت ادا کرکے ٹکٹ لے کر چسپاں کردینا ہوتا تھا ۔ اس تبدیلی کے اثر کا صرف اس ایک بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو خط سنہ ۱۸۳۷ع میں دو شلنگ میں کلکتہ سے بمبئی پہنچتا تھا ، اب ایک پنی سے بھی کم میں پہنچ سکتا تھا ، ڈاک کا خرچ اتنا کم ہوگیا تھا کہ اب اخبارات بھی بذریعہ ڈاک بھیجے جانے لگے ، اس درمیان میں تاربرقی کے تجربہ میں بھی کامیابی حاصل ہوگئی اور ڈلہوزی نے اس کو جاری کرنے کی منظوری حاصل کرلی ، اور سنہ ۱۸۵۵ع میں کلکتہ ، بمبئی ، مدراس ، آگرہ اور پشاور کے درمیان تار برقی کا سلسلہ قایم ہوگیا ۔

سڑکوں کے متعلق بھی اسی قسم کی غلط فہمی پائی جاتی ہے ، کیونکہ مغلوں کے زمانہ میں پختہ سڑکوں کے بنانے کا رواج نہیں تھا ، کمپنی کے زمانہ میں سڑکیں اس طرح ہموار کردی گئی تھیں

که ان پر پہیه دار گاڑیاں گذرسکتی تھیں - چونکه ابتدا میں فوجوں کے گذرنے کے لئے پخته سڑکوں کی ضرورت تھی اس لئے ان کی تعمیر کا کام بھی فوجی مجالس (Military Boards) کے سپرد کردیا گیا تھا ' مگر مختلف اسباب کی بناء پر ان کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوی ' جب سنه ۱۸۴۹ع میں پنجاب کا الحاق ہوا تو یہاں تعمیرات عامه Public Works کا ایک نیا محکمه قایم کیا گیا اور سنه ۱۸۵۴ع سے پہلے دوسرے صوبوں کے اندر بھی اسی قسم کے محکمے قایم ہوگئے تھے فوجی مجالس کا ایک زبردست کارنامه یه ہے که انہوں نے کلکته سے دہلی تک ایک بہترین سڑک تیار کی جو آج گرانڈٹرنک روڈ کے نام سے مشہور ہے ' اپنی مجبوریوں کے باوجود دوسرے صوبوں میں بھی انہوں نے ایک قابل قدر کام کیا ہے یہاں یه بات خاص طور پر قابل ذکر ہے که انہوں نے بمبئی کے جزیره کو اصل سرزمین ہند سے ملا دیا اور سنه ۱۸۳۰ع میں بمبئی سے پونا تک ایک سڑک بنا ڈالی جو مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں میں سے ہوکر گذرتی ہے .

ڈلہوزی کا نام خاص طور پر ریلوں کی تعمیر کے لئے مشہور ہے ' سب سے پہلے سنه ۱۸۴۳ع میں لندن کی چند سرمایه دار جماعتوں نے ریلوں کی تعمیر کے متعلق کچھ تجویزیں پیش کیں ' ان پر اس زمانه میں جو بحث ہوی تھی اس کو پڑھکر آج کچھ تعجب سا ہوتا ہے ' ان تجویزوں کے مخالفین کا یه کہنا تھا که ہند کے خاص حالات کی بناء پر مستقل سڑکوں کی تعمیر بالکل ناممکن ہے ' اور اگر ناممکن کو ممکن فرض بھی کرلیا جائے اور ریل بنا بھی دی جاے تو ان سے کافی آمدنی نہیں ہوسکتی ' کیونکه ہند کی ایک بڑی آبادی یعنی ہندو چھوت چھات کی وجه سے ریلوں میں نہیں بیٹھینگے اور ان کو استعمال نہیں کرینگے ' لیکن تجربه سے ثابت ہوگیا که ان مخالفین کی قیاس آرائیاں بالکل غلط تھیں ' انجینیروں نے ابتدا میں کچھ غلطیاں ضرور کیں ' لیکن انہوں نے بہت جلد یه معلوم کرلیا که ہند میں

ریلوں کی کس طرح تعمیر کرنی چاهئے ' هندووں نے اپنے تمام دستوروں کو ان نئے حالات کے مطابق غیر محسوس طریقہ پر بدل دیا - مخالفین کی مخالفت کا صرف اتنا هی نتیجہ هوا کہ ان تجویزوں پر عملدرآمد هونے میں کچھ تاخیر هوگئی ' ڈلهوزی نے دو لمبی رودادیں پیش کی تھیں جن میں مخالفین کے تمام شکوک اور شبہات کو ایک ایک کرکے رفع کیا تھا اور ایسے اصول کی پابندی پر اصرار کیا تھا جو اس زمانہ میں عجیب و غریب معلوم هو رهے تھے لیکن آج ان سے سب مانوس هیں - ڈلهوزی کا اصرار تھا کہ حکومت کو ریلوں پر ایک حد تک اپنا قابو رکھنا چاهئے ' اور غیر مرتب اور غیر منظم طریقہ پر ریلوں کی تعمیر کرنے کی بجائے جیسا کہ انگلستان میں هوا - پہلے هی سے پورے هند کے متعلق ایک وسیع نقشہ مرتب هونا چاهئے ' اور اسی کے مطابق دهیرے دهیرے ان کی تعمیر هونی چاهئے ' اس کی مداخلت کا نتیجہ یہ هوا کہ مختلف انگریزی کمپنیوں کے ساتھ ریلوں کی تعمیر کے متعلق معاهدے کئے گئے اور جب ڈلهوزی هند سے واپس هوا هے تو ان کی تعمیر کا کام شروع هوچکا تھا .

ریلوں کے ساتھ ساتھ نہروں کا ذکر کرنا بھی ضروری هے ' یہ یاد رکھنا چاهئے کہ هند کی تمام اهم نہریں محض آب پاشی کی غرض سے کھودی گئی تھیں ' مگر بعض نہروں کے اندر سامان لیجانے والے جهاز اور کشتیاں بھی چلتی تھیں لیکن کسی جگہ بھی بیک وقت دونوں مقصد نہیں حاصل هوسکتے تھے - هند کے اندر آب پاشی کی تاریخ بہت لمبی هے ' هم نے کسی گذشتہ باب میں بیان کیا هے کہ هندو عهد میں بہت سے تالاب بنوائے گئے تھے ' چونکہ شمالی هند میں بڑے بڑے دریا بہتے تھے اسلئے یہاں تالابوں کا بنوانا بہت مشکل تھا ' چنانچہ ان دریاؤں سے مختلف نہریں نکالی گئیں ' تاکہ جب طغیانی کے زمانہ میں ان کا پانی ابلنے لگے تو ان نہروں کے ذریعہ کھیتوں کو سیراب کیا جائے ' جنوبی هند میں آب پاشی کی ترقی یافتہ صورتیں مستعمل تھیں یہاں

کے حکمرانوں نے پتھر کی چٹانوں سے اہم نہروں پر بند باندھ دئے تھے ، تاکہ ان کا پانی جمع ہوکر کھیتوں کی سیرابی کے کام آسکے ، ان کی وجہ سے ان نہروں میں نہ صرف بارش کے موسم میں بلکہ سال بھر پانی رہتا تھا ، مسلمانوں کے زمانہ میں جمنا سے چند نہریں نکالی گئی تھیں ، مگر ان کی ہر وقت صفائی اور نگرانی کے نہ ہونے کی وجہ سے تمام نہریں مٹی سے پٹ گئی تھیں ، جب کمپنی کا زمانہ آیا تو ان میں سے کوئی نہر بھی آب پاشی کے قابل نہیں تھی ، اسی طرح جنوبی ہند کے بند بھی ٹوٹ چکے تھے ، کیونکہ ان کی مرمت کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا .

جب بار بار قحط پڑنے لگا تو کمپنی کو نہروں کی کھدائی اور ان کے صاف کرانے کا خیال آیا ، چنانچہ سنہ ۱۸۲۰ع سے پہلے ان تمام نہروں کو صاف کرلیا گیا جو جمنا سے نکالی گئی تھیں ، اور اس کے ساتھ ساتھ انجینیروں نے ایک وسیع پیمانہ پر گنگا ایک نہر کے نکالنے کا تجربہ کیا جو کامیاب ثابت ہوا ، اس کی مثال انگلستان میں موجود نہیں تھی ، یہ کام سنہ ۱۸۴۰ع میں شروع ہوا اور حکومت کی پالیسی کے بار بار بدلتے رہنے کی وجہ سے اس میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں ، یہاں تک کہ سنہ ۱۸۵۴ع میں یہ نہر جاری کی گئی ، اس نہر سے مختلف شاخیں نکالی گئی تھیں ، جن کا پانی گنگا اور جمنا کے درمیان کی زمینوں کو بٹ کر پہنچتا تھا .

جنوبی ہند میں بھی اسی نمونہ پر کام کیا گیا ، چولا خاندان کے زمانہ میں تنجاور کے قریب کاویری کے دھانہ سے کچھ نہریں نکالی گئی تھیں ، سنہ ۱۸۳٦ع کے بعد ان نہروں کو صاف کیا گیا ، اور گوداوری کے دھانہ سے سنہ ۱۸۴۹ع میں اور کرشنا کے دھانہ سے سنہ ۱۸۵۴ع میں کچھ نہریں نکالی گئیں ، ان کے کھودنے میں جو مہارت صرف کی گئی وہ آجکل کی مہارت سے ، جو ہند میں یا دنیا کے دوسرے حصوں میں پائی جاتی ہے ، کسی طرح کم

نہیں تھی ' کیونکہ دوسرے ملکوں کے انجینیروں نے ہند ہی کے آبپاشی کے تجربوں سے بہت بڑا فایدہ اٹھایا ہے ۔

بعض بڑی نہروں سے حکومت کو کافی آمدنی ہوتی تھی ' مگر ان کے کھدوانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ کاشتکاروں کی تکلیفیں اور قحط سالی کے اثرات دور ہوں اس سلسلہ میں کمپنی کا ابتدائی تجربہ قریب قریب وہی تھا جس کو ہم نے اکتیسویں باب کے خاتمہ میں بیان کیا ہے ' سنہ ۱۸۳۸ع تک ہند کے کسی نہ کسی علاقہ میں چھوٹا یا بڑا قحط رہتا تھا ' اس کے بعد پندرہ سال تک اچھی بارش ہوتی رہی ' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں عام طور پر خوشحالی پیدا ہوگئی ' ابتدا میں قحط سالی کے اثرات کو دور کرنے کی وقتاً فوقتاً مختلف تدبیریں اختیار کی جاتی تھیں ' مگر اس سلسلہ میں کوئی باقاعدہ کارروائی نہیں کی گئی ' اور اس زمانہ کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ کسی باقاعدہ اور موثر کارروائی کا اختیار کرنا ناممکن تھا ' اگر کہیں بڑے پیمانہ پر قحط ہو تو اس وقت صرف امدادی تدبیریں اختیار کی جاسکتی تھیں ' جب ہند میں ریلوں کا ایک جال بچھ گیا تو باقاعدہ انتظام کرنا ممکن ہوگیا ' اور اب ان ریلوں کے ذریعہ غذائی اشیاء کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے میں بڑی آسانی پیدا ہوگئی ' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچاس سال کے اندر اندر قحط کے معنی ہی بالکل بدل گئے ' ڈلہوزی سے پہلے قحط فاقہ کشی اور آبادی کے انتشار کا مترادف تھا ' مگر اب اس کے معنی صرف بے روزگاری کے تھے ' کیونکہ غذا اب بھی ایسے لوگوں کو مل سکتی تھی ' جن کے پاس خریدنے کیلئے پیسہ ہوتا تھا ' آجکل قحط زدوں کی امداد کا صرف اتنا ہی مطلب ہوتا ہے کہ بے کار لوگوں کو ملازمت دلادی جائے ۔ *

---

* سنہ ۱۹۴۳ع میں بنگال اور ہند کے دوسرے علاقوں کے اندر جو قحط پڑا اس کے خاص اسباب تھے ' ان پر آئندہ بحث کی جائیگی ، اس لئے متن میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے اس میں ترمیم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔

ڈلہوزی کے عہد حکومت کا ایک اہم کارنامہ نظامت تعلیم (Public Instruction) کی باقاعدہ تاسیس ہے ، سنہ ۱۸۳۵ع میں انگریزی تعلیم پر زور دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا ، اسکے بعد اس سلسلہ میں مختلف تجربات کیے گئے ، اور ہر ایک صوبے نے تعلیم کا اپنا ایک خاص طریقہ اختیار کیا ، بعض جگہوں پر مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے انتظام کرنے کی کوشش کی گئی تھی ، مگر چونکہ سرکاری خدمات کے انجام دینے کیلئے انگریزی کی ضرورت تھی ، اس لیے اس کے انتظام کرنے کا مطالبہ بھی برابر جاری تھا ، سنہ ۱۸۵۰ع کے قریب بعض جگہ کمپنی کو ضرورت سے زیادہ انگریزی داں میسر آنے لگے تھے ، ڈلہوزی نے عام تعلیمی پالیسی کے متعلق چند تجویزیں مرتب کیں جن پر پارلیمنٹ کی طرفسے غور و خوض کیا گیا ، آخر سنہ ۱۸۵۴ع میں مجلس نظارت (Board of Control) کے صدر سر چارلس وڈ (Wood) کا مشہور مراسلہ آیا جس میں ہر ایک صوبہ کے اندر نظارت تعلیم کے محکمہ (Department of Public Instruction) کے قایم کرنیکی تجویز پیش کی گئی تھی ، اور اسکی ہدایت کی گئی تھی کہ ابتدائی تعلیم کا انتظام مادری زبان میں اور اعلی تعلیم کا انتظام انگریزی زبان میں کیا جاے ، اور نیز ہر جگہ باقاعدہ سرکاری یا امدادی اسکول اور کالج قایم کیے جائیں ، جن کے ممتحن لندن یونیورسٹی کے نمونہ پر باہر کے لوگ ہوں ، لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا جاے ، اور یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جسمیں دخل دینے سے کمپنی محض ہندی رسم و رواج کا خیال کرتے ابتک گریز کر رہی تھی ، اسکے ساتھ ساتھ پیشوں کی تعلیم کی توسیع کی گنجایش پیدا کی گئی تھی ، اس زمانہ میں کلکتہ ، مدراس اور بمبئی کے اندر صرف مڈیکل کالج قایم ہوے تھے ، اور پورے ہند کے اندر انجینیرنگ کے صرف دو ادارے تھے ، آئندہ پچاس سال تک اسی پالیسی پر عمل ہوتا رہا ، جس سے سارے ہند میں ذہنی ترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے . *

* آئندہ ابواب سے ظاہر ہوگا کہ ایک زمانہ تک سماجی رکاوٹوں کی بناء پر ابتدائی تعلیم اور پیشوں اور لڑکیوں کی تعلیم کو کوئی فروغ نہیں ہوسکا تھا اتنے زمانہ کے بعد اب جاکر اسکو ترقی دینے کی کوشش کی جا رہی ہے .

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس دور میں ہند کے اندر مشترک قومی جذبات کا پایا جانا بہت مشکل ہے ' اس وقت اس بات کا بھی قطعی ثبوت پیش کرنا ناممکن ہے کہ لوگ عام طور پر کمپنی کی حکومت سے ناخوش تھے ' البتہ اس کو ابھی تک پورا استقلال نہیں حاصل ہوا تھا ' ہر جگہ کچھ ایسے مقامی یا فرقہ وارانہ اسباب تھے جن کی وجہ سے لوگوں میں ایک قسم کی بے اطمینانی پھیل رہی تھی ۔ اگرچہ عام لوگوں نے مرھٹی ریاستوں کے الحاق کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کی ' تاہم ان کے حکمرانوں کے رشتہ دار اور وزیر اور فوجی جو دولت اور سلطنت سے محروم ہوگئے تھے ' اندر ہی اندر مخالفت کی آگ کو بھڑکا رہے تھے ' اودھ کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی ' یہاں عوام کا ایک طبقہ بھی کمپنی کے اہلکاروں کی بد سلوکی کی وجہ سے ناراض ہوگیا تھا ۔ یہاں بڑے چھوٹے کئی زمیندار تھے ' جن کے حقوق ملکیت ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے ' ان میں سے بعض نے اپنی قوت اور طاقت کے زور پر زمینداریاں قائم کرلی تھیں اور بعض پانچ سو سال سے زمینداری کرتے چلے آئے تھے ' ان کے آباء واجداد راجپوت قوم سے تھے ' جنہوں نے مسلمانوں کے ابتدائی حملوں کے وقت چھوٹی چھوٹی ریاستیں قایم کرلی تھیں ' اور الحاق اودھ کے بعد جب ان کے ساتھ تصفیہ لگان کا موقعہ آیا تو ان میں سے بہت سے زمیندار بے دخل کردئے گئے ' اور ان کی زمینیں کاشتکاروں کے حوالے کردی گئیں ' اس کی وجہ سے نہ صرف زمیندار بلکہ راجپوت قوم بھی کمپنی سے بگڑ بیٹھی ' کیونکہ اب تک ان کے دلوں میں اپنے زمینداروں کی بڑی عزت تھی ' اور وہ اپنی ذات کو ان پر قربان کرنے کیلئے تیار رہتے تھے ' اس کے علاوہ نیچ قوم کے لوگ بھی ' جو اپنے پرانے حکمرانوں کے وفادار تھے ' انگریزوں سے بگڑ بیٹھے ۔ سنہ ۱۸۵٦ع میں سب سے زیادہ خطرناک علاقہ اودھ ہی کا تھا '

یہاں فتنہ و فساد اور شورش اور بغاوت کے بادل منڈلا رہے تھے ' دوسری جگہوں پر بھی بعض ایسے صاحب حیثیت لوگ تھے جو اپنے اعلی عہدوں سے بر طرف کردئے گئے تھے ' یا ان کو کسی دوسرے طریقہ سے کچھ تکلیفیں پہنچی تھیں ' یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ کمپنی کی حکومت ہوجانے کی وجہ سے ان کا بڑا ذاتی نقصان ہوا ہے ان کا خیال تھا کہ اور حکومتوں کی طرح کمپنی کی حکومت بھی عارضی ہے ' اور اس کے اندر بھی ایک تبدیلی پیدا ہوسکتی ہے ۔

شمالی ہند کے مسلمان عام طور پر کمپنی کی حکومت سے نا خوش تھے ' پرانے اسلامی عقیدہ کے مطابق مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے الگ نہیں تھے ' اور جب سلطنت پر کمپنی کا قبضہ ہوگیا تو قدرتی طور پر ان کو یہ خیال ہوگیا کہ اب ان کا مذہب بھی خطرے میں ہے ' اور یہ حقیقت ان کے ذہنوں سے دور نہیں ہوی تھی کہ ابھی کچھ دن پہلے وہ ایک وسیع سلطنت کے مالک تھے ' اور اب شمالی ہند میں اودھ ھی کی ایک اسلامی سلطنت باقی رہ گئی تھی ' اور جب اس پر بھی کمپنی کا قبضہ ہوگیا تو اب حیدرآباد کے سوا کوئی دوسری مسلمان سلطنت نہیں تھی ' مگر وہ شمالی ہند سے بہت دور واقع ہوی تھی ' دیندار مسلمان ایک ایسے مذہب کا غلبہ پسند نہیں کرسکتے تھے جو اگرچہ ان کے خیال کے مطابق ایک الہی دین تھا تاہم محمد صلعم کے دین کے آنے کے بعد وہ منسوخ ہوگیا تھا ۔ اس کے علاوہ وھابی تحریک کے علمبردار کمپنی کی کافرانہ حکومت کے خلاف علانیہ جہاد کی تبلیغ کر رہے تھے ' اور جو مسلمان اعتدال پسند تھے ان کی نظر میں عیسائی مشنریوں کی بعض حرکتیں بہت ھی قابل اعتراض تھیں ' یہ لوگ بحث مباحثہ کے جوش میں عیسوی دین کی حدود سے بھی آگے بڑھ جاتے تھے ' صدیوں سے فارسی زبان سرکاری زبان تھی ' اور جب عدالتوں میں فارسی کی بجائے مادری زبانوں کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی تو

مسلمانوں کے جذبات بھڑکنے لگے ' سرکاری ملازمتوں کیلئے انگریزی دانوں کو ترجیح دی جانے لگی تھی ' اس لئے مسلمان من حیث القوم اس نئی تعلیم سے بالکل الگ رہے ' وہ دیکھتے تھے کہ اب ان کی قدیم عربی زبان کو وہ مقبولیت حاصل نہیں رہی جو اس سے پہلے اس کو حاصل تھی ' اس نئی حکومت سے مسلمانوں کو امن و امان کے سوا کوئی دوسرا فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا ' اس حکومت کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن سے ان کو دلی نفرت تھی ' امن و امان بھی ایک حیثیت سے ان کیلئے نقصان دہ تھا ' کیونکہ زوردار اور طاقتور آدمیوں کو طوائف الملوکی کے زمانہ کی طرح اپنی قسمتوں کے بنانے کا موقعہ نہیں مل سکتا تھا۔

پڑھے لکھے هندو بڑی تیزی کے ساتھ نئی تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے تھے ' اس کی بدولت بہت سے هندووں کو سرکاری ملازمتیں مل گئی تھیں ' لیکن بعض ان کے حاصل کرنے میں ناکام رہے ' بنگال میں ایک نئی تعلیمیافتہ جماعت تیار هو رهی تھی جو کمپنی کی حکومت پر سخت نکتہ چینیاں کرنے لگی تھی هند کے اخباروں کا لب و لہجہ بھی بہت بدل گیا تھا ' اس سے پہلے مشنریوں کے جاری کئے هوے اخبارات میں معلومات کا بیش بہا ذخیرہ هوتا تھا جو متین اور سنجیدہ الفاظ میں پیش کیا جاتا تھا ' اور اب انکی جگہ پر ایسے اخبارات نکلنے لگے تھے ' جنکا لب و لہجہ بہت هی تیز اور تند هوتا تھا ' بعض وقت لچھے دار الفاظ میں مخالفانہ تنقیدیں شایع کی جاتی تھیں ' ان میں حقیقی واقعات کی بجاے زیادہ تر شخصی قیاس آرائیاں هوتی تھیں ' اسطرح مخالفانہ گروہ کا ایک هیولی تیار هو رها تھا۔

وہ هندو جو آبائی رسوم کے مقلد اور پیرو تھے ' اس نئی حکومت سے ایک بڑا خطرہ محسوس کر رہے تھے ' ان پر اس زمانہ میں هر طرفسے حملے هونے لگے تھے ' ایک طرف تو ان هی کی ذات کے هندو تھے۔ جو قدیم هندوانہ رسوم کے خلاف چیخ پکار

کرنے لگے تھے ' اور دوسری طرف عیسائی مشنری تھے جو ان کے دین اور مذہب پر سخت نکتہ‌چینیاں کر رہے تھے - ستی کی ممانعت کا قانون درحقیقت ان کے لئے ایک تنبیہی اشارہ تھا کہ اب ہندوؤں کے مقدس رسوم بھی سرکاری مداخلت سے بچ نہیں سکتے ' ریلیں اور دوسری نئی چیزیں ایجاد ہو رہی تھیں جن کا اثر ہندوؤں کے رسم و رواج پر پڑ رہا تھا - بعض لوگوں کو یہ ڈر ہو رہا تھا کہ کمپنی ان کے مذہب ھی کو بدل دینا چاھتی ھے ' یہ تمام مخالفانہ اسباب ایک وقت میں ظاھر نہیں ھوے ' ہندومت میں اگرچہ بہت بعد کو انقلاب رونما ھوا ' تاھم اس دور میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ہندوانہ رسوم کی تائید میں پر زور دلائل پیش کرنے اور اپنے مخالفین کے ان اصول کی تردید کرنے لگے تھے ' جن پر ان کا اعتماد تھا ' اس تدریجی انقلاب کی خصوصیات کو چند الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل ھے ' مگر یہ کہنا غلط نہ ھوگا کہ اس دور کی ایک اھم خصوصیت تنقیدی جذبہ کی ترقی ھے ' جس کے اظہار میں بڑی دلیری کا ثبوت پیش کیا گیا تھا .

دیہات کے لوگ اگرچہ قانونی حکومت سے آشنا ھوتے جا رھے تھے یا آشنا ھوگئے تھے ' تاھم ان مقامات پر جہاں ابھی ابھی کمپنی کا قبضہ ھوا تھا ' لوگوں کو قانونی حکومت سے کچھ زیادہ دل بستگی نہیں تھی ' ھند کے دیہاتیوں کا حافظہ بہت وسیع ھے وہ مستقل امن و امان کی بجاے صرف انقلابات سے آشنا تھے ' انھوں نے طوائف الملوکی کی بد عنوانیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ' آخری مغلوں کے مظالم ان کی نظروں کے سامنے تھے ' اس سے پہلے اکبر کا سنہرا دور گذر چکا تھا ' اور پھر کئی سو سال آگے تک کے انقلابات ان کے پیش نظر تھے ' ان کو جو نظر آرھا تھا وہ یہ تھا کہ حکمرانوں کا ایک سلسلہ باھر سے آکر ان پر مسلط ھوجاتا ھے اور پھر چند دن کے بعد ایسے اسباب کی بناء پر ' جن کے سمجھنے سے وہ قاصر تھے ' تباہ و برباد ھوجاتا ھے ' ان کی نظر میں کمپنی کی حکومت بھی اس طویل سلسلہ

کی ایک آخری کڑی تھی ، اگرچہ لگان کا بوجھ کم ہوگیا تھا ، تاھم اکثر جگھوں پر کاشتکاروں کے ساتھ سختی برتی جاتی تھی ، اگرچہ اکثر لوگ نئی عدالتوں کے قیام سے خوش تھے ، تاھم ان کو مقبولیت حاصل نہیں ہو رہی تھی ، کیونکہ انکے ذریعہ اگر ایک فریق کا فائدہ ہوتا تھا تو دوسرا فریق نقصان اٹھاتا تھا ' لوگوں نے اسوقت کی حکومت کو کسی جوش اور جذبے کی بجائے محض امن و امان کی خاطر قبول کرلیا تھا .

جب ڈلہوزی هند چھوڑ کر نکلا تو وہ بجا طور پر یہ دعوی کرسکتا تھا کہ اندرونی اور بیرونی لحاظ سے ملک میں پورا امن و امان قایم هوچکا هے ، مگر اسکو ان عناصر کا بھی احساس تھا جو فتنہ و فساد کی آگ کو بھڑکانا چاھتے تھے - اسی لیے وہ اس بات کی کوئی پیشگوئی نہیں کرسکتا تھا کہ کبتک یہ امن قایم رھیگا ' لیکن یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ کمپنی کو ان مفسدانہ عناصر کی طاقت اور قوت کا ٹھیک اندازہ نہیں تھا ' کیونکہ اس وقت قومیں آپس میں بٹ چکی تھیں ' انگریز بھی ایک علحدہ حاکمانہ قوم متصور ہونے لگے تھے ، اسطرح کہ اگر ایک ظاھربین شخص انکو دیکھے توانکوبھی هند کی ایک علحدہ ذات تصور کرسکتا تھا ' یہ سماجی تقسیم آئندہ چلکر بہت برے نتائج کا موجب ہوی ' مگر ایسا ہونا اس زمانہ کے حالات کی بناء پر ایک فطری بات تھی.

انیسویں صدی کی ابتدا میں کوئی ایسی سوسائٹی نہیں تھی جسکو عام معنی کرکے هندی کہا جاسکتا ہو ' یعنی مختلف ذاتوں اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے مہذب اور تعلیم یافتہ مرد اور عورت کسی ایک جگہ جمع ہوکر مذھب ' سیاست ' علوم و فنون اور تفریحی مشاغل کے متعلق تبادلہ خیال کرسکتے ہوں ' اس لحاظ سے مسلمانوں کی ایک خاص سوسائٹی تھی ، جس میں نسلی امتیازات زیادہ کارگر تھے ' ایرانی اور افغانی ایک دوسرے کو اتنی ھی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جتنا کہ ایک خالص پٹھان بنگال کے پٹھانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا ' هندوؤں میں ذات پات کی بناء پر اس قسم کی کوئی سوسائٹی

نہیں بن سکتی تھی ، خاص کر ان جگہوں پر جہاں باہم مل کر کھانے پینے کے مواقع میسر ہوں ، اور یہی چیز معاشرتی میل جول کے بڑھانے کا ایک اہم ذریعہ ہوتی ہے ، ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ چند مسلمانوں نے مغربی اقوام کے افراد سے میل جول پیدا کرلیا تھا ، مگر ان کا حلقہ اتنا مختصر تھا کہ دوسروں پر ان کا اثر نہیں پڑ سکتا تھا ، مغربی اقوام کے مرد اگرچہ مسلمان مردوں سے مل سکتے تھے ، مگر ان کی عورتوں کے ساتھ میل جول نہیں رکھ سکتے تھے ، اور ظاہر ہے کہ یہ چیز سماج کی ترقی میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہوتی ہے .

اگرچہ عام معنی کرکے ہندی سوسائٹی کا کوئی وجود نہیں تھا ، تاہم ہندوؤں کے مختلف گروہوں کے درمیان اور نیز ان کے اور مسلمانوں کے درمیان گہرے روابط تھے ، ان کے مرد دوسری قوم کے مردوں سے اور ان کی عورتیں دوسری قوم کی عورتوں سے ملتی جلتی تھیں ، اور زندگی کے عام مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ، وہ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھاپی نہیں سکتے تھے مگر خوشی اور رنج کی تقریبوں میں وہ ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے ، صاحب حیثیت ہندوؤں اور مسلمانوں کے متعلق یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ وہ ایک دوسرے سے ہر معاملہ میں بالکل الگ تھلگ رہتے تھے ، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے درمیان ذات پات کی زبردست خلیج حائل تھی تاہم ایک دوسرے سے بات چیت اور راہ و رسم رکھنے میں دونوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی .

مسلمان سوسائٹی کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ان مقامات پر جہاں اسلام کو سیاسی غلبہ حاصل تھا ، مسلمان خود کو حاکم اور ہندوؤں کو محکوم سمجھتے تھے ، اگرچہ انفرادی طور پر راجپوت سرداروں اور دولت مند سوداگروں یا دوسری قوم کے افراد کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات قایم تھے تاہم مجموعی طور پر ان کی حیثیت حاکموں کی تھی ، وہ دوسروں کی بہ نسبت اپنے کو بہت بلند تصور کرتے تھے ، اور جب انگریز ان

کی جگہ پر اس ملک کے حاکم بنے تو انہوں نے بھی اس معاملہ میں مسلمانوں کی تقلید کی ' اور وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنا محکوم سمجھنے لگے تھے ان کی یہ ظاہری برتری ہند والوں کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی مگر انگریز ایسا محسوس کرتے تھے کہ گویا ہند کے باشندے ان کے عاجز اور غلام ہیں اور وہ ہر حیثیت سے ان سے ممتاز اور برتر ہیں ان کی یہ امتیازی حیثیت بذات خود کچھ ناخوشگوار چیز نہیں تھی ' سماجی تعلقات کا مسئلہ اور پیچیدہ ہوگیا جبکہ ایسے انگریزوں نے بھی جو کسی سرکاری عہدے کے مالک نہیں تھے ' ہند والوں سے تفوق برتنے کا مطالبہ کرنے لگے ' وہ یہ چاہتے تھے کہ ہند کے باشندے ان سے غلاموں کی طرح جھک کر ملیں ' اس کا مطلب یہ تھا کہ نہ صرف انگریز افسر اپنی بڑائی جتانے لگے تھے بلکہ تمام انگریز بھی اپنے کو برتر حاکم تصور کرنے لگے تھے .

جب ہند کے اندر انگریزوں کی تعداد میں بتدریج کافی اضافہ ہوتا گیا تو اب ان کو غیر قوموں کے افراد سے ملنے جانے کی بھی کوئی حاجت نہیں رہی ' ہند کے باشندوں سے ان کا تعلق بالکل منقطع ہوگیا اور انگریز اپنی ہی قوم کے افراد سے میل جول رکھنے لگے ' کیونکہ ہند کے باشندوں اور انگریزوں کے درمیان تفریحی مشغلوں کے لحاظ سے کوئی چیز بھی مشترک نہیں تھی اس پر مزید یہ ہوا کہ جب اس صدی کے دوسرے نصف میں انگریز عورتیں بھی کافی تعداد میں پہنچ گئیں تو انگریز مرد ہند کے باشندوں سے بالکل الگ ہوگئے اور اپنی عورتوں کے ساتھ علحدہ اور کھلے بنگلوں میں رہنے لگے ' اب ان کو ہند کی عورتوں کے ساتھ تعلقات کے رکھنے کی بھی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی ' یہ تبدیلی اگرچہ قابل افسوس نہیں تھی ' تاہم ہند کی سماجی ترقی کا ایک بہت بڑا ذریعہ جاتا رہا ' کیونکہ اس کے بعد سے انگریز باشندگان ہند کے طرز بود و ماند اور ان کے خیالات سے بالکل بیگانہ ہوتے چلے گئے .

یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس وقت انگلستان میں هندی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے متعلق ایک غلط راے قایم هوگئی تھی ' وہ نوجوان جو نئے نئے یہاں آتے تھے ' اکثر هند کی معاشرت سے ناواقف هوتے تھے ' ان کو هند کے تمدن هی سے نفرت هوتی تھی ' یہ در حقیقت عیسائی مشنریوں اور رفاہ عام کے کارکنوں کے غلط پروپیگنڈے کا نتیجہ تھا ' کیونکہ وہ اپنی تبلیغ اور اصلاح کے جوش میں هندی معاشرت کے برے پہلووں کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے تھے ' سنہ ۱۸۳۰ع تک ستی کی رسم جاری تھی ' سنہ ۱۸۶۲ع تک غلامی قانوناً جائز سمجھی جاتی تھی ' بعض مقامات پر انسانوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا تھا ' یہاں تک کہ کمپنی نے اس کا انسداد کیا ' بعض قبایل میں بچیوں کو جان سے مارنے کا رواج تھا ' بہت سی جگہوں پر ٹھگ اور ڈاکو لوٹ مار اور قتل و غارتگری میں مصروف تھے ' یہ اور اس قسم کی بہت سی برائیاں هندی تہذیب و تمدن پر ایک بہت هی بدنما داغ تھیں ' مگر ان کو کچھ اس طرح پیش کیا جاتا تھا کہ هند کے باشندے ایک جاهل محض متصور هوتے تھے اور عیسائی مشنری تبدیل مذهب کے ذریعہ ان کی اصلاح کرنا چاهتے تھے ' ان کی حقیقت کو سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کی بجاے ان پر افسوس کیا جاتا تھا اور ان کی تحقیر کی جاتی تھی .

ان مختلف اسباب و رجحانات کی اضافی اهمیت کے متعلق اختلاف راے هوسکتا هے ' مگر ان کے اثرات کے متعلق کسی کو اختلاف کرنے کی گنجایش نہیں هوسکتی ' اس کا نتیجہ یہ هوا کہ ایک ایسے دور میں جب کہ جدید هند وجود میں آرها تھا ' حاکم اور محکوم قوم کے آپس کے تعلقات محض رسمی اور سرکاری بن چکے تھے ' روزانہ اخباروں اور ان کے تبصروں کے متعلق دونوں قوموں کے افراد کے درمیان آزادانہ اور کھلا هوا تبادلۂ خیال ' جو ایک رنگ اور ایک قسم کی سوسائٹی میں هوسکتا تھا ' بالکل هی شاذ و نادر هونے لگا تھا .

باب ۴۳

غدر اور اس کے نتائج

لارڈ ڈلہوزی کے بعد لارڈ کیننگ گورنر جنرل ہوا ' اس کے زمانہ حکومت (۱۸۵٦ - ۱۸٦۲) میں غدر کا مشہور عام واقعہ پیش آیا ' اور ہند کے دستور میں اہم تبدیلیاں کی گئیں ' اور بہت سے نئے قانون منظور ہوے جن کو آئندہ ابواب میں بیان کیا جائیگا ' غدر کا ہنگامہ صرف بنگال کی فوجوں کی طرف سے ہوا تھا ' مدراس میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوی تھی اور بمبئی میں کچھ معمولی فساد ہوا تھا ' اور جب غدر کرنے والوں کو پہلے پہل کچھ کامیابی ہوگئی تو ان کے ساتھ ایسے لوگ بھی شریک ہوگئے جن کو انگریزوں سے حقیقی یا فرضی شکایتیں پیدا ہوگئی تھیں ' دیسی راجاؤں نے ان کا کوئی ساتھ نہیں دیا ' اسلئے غدر کو ایک قومی بغاوت کے نام سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ' اگر بعض مسلمانوں نے شہنشاہ مغلیہ کی حکومت کا اعلان کیا یا مرھٹوں نے اپنے لئے ایک نیا پیشوا منتخب کرلیا تو اس سے ان کا مقصد کمپنی کی حکومت کو ہٹاکر محض اٹھارویں صدی کی طوایف الملوکی کو زندہ کرنا تھا ' بیرون ہند سے بھی غدر کرنے والوں کو کوئی امداد نہیں ملی ' کمپنی کے ساتھ افغانستان کے دوستانہ تعلقات برابر قایم رہے ' نیپال نے تو اودھ کے باغیوں کو کچلنے کے لئے ایک امدادی فوج بھی روانہ کی تھی .

غدر کی سرگذشت کے بیان کرنے میں ان حالات کو ' جن کی وجہ سے یہ غدر ممکن ہوا ' ان اسباب سے ' جن کی وجہ سے یہ غدر پیش آیا ' تمیز کرنا بہتر ہے ' ہند میں کرایہ کے سپاہیوں نے اپنے آقاؤں کی وفاداری میں بڑا نام پیدا کیا تھا ' لیکن اس کے باوجود ان میں بغاوت کا جذبہ بالکل ہی مفقود نہیں تھا ' وہ میدان کارزار سے بہترین فایدہ اٹھانا چاھتے تھے ' اسی لیے وہ اس انقلابی دور میں دوسرے کرایہ کے سپاہیوں

کی طرح اپنی شکایات اور مطالبات کی فہرستیں مرتب کرتے رہتے تھے ' اور ہر جگہ اپنی اہمیت کو جتانے کی کوشش کرتے تھے ' ان کی باقاعدہ تنظیم جتنی ضروری تھی اتنی دشوار بھی تھی ' بنگال کی فوج میں اس صوبہ کے علاوہ دور افتادہ مقامات کے سپاہی بھی بھرتی کئے گئے تھے ' پنجاب کی لڑائیوں کے ختم ہونے کے بعد اس فوج کے پاس کوئی کام نہیں رہ گیا تھا ' اس زمانہ میں یوں تو فوجی تنظیم کا معیار بہت ہی گرا ہوا تھا ' اور پنجاب کی فتح کے بعد تو اس کا معیار اور بھی گرگیا تھا ' اس فوج کے ہندی افسر عموماً ناخواندہ ہوتے تھے ' ان کے اختیارات بالکل محدود ہوتے تھے ' ان کو معمولی درجوں سے ترقی ملتی تھی ' ان کے اندر خوف اور تعصب کا جذبہ برابر موجود رہتا تھا ' کوئی ذمہ دار عہدہ ان کے سپرد نہیں کیا جاسکتا تھا ' مگر انگریز افسر اپنے ماتحتوں پر بڑا اعتماد کرتے تھے ' وہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسرے ان کے معاملات میں دخل دیں ' خود لارڈ ڈلہوزی بھی جو ان افسروں اور فوجیوں کی بد انتظامی اور بد عنوانی سے واقف تھا ' ان کی اصلاح نہیں کرسکتا تھا ' ان کی یہی بد انتظامی اور بد عنوانی آگے چلکر غدر کیلئے سازگار بن گئی .

غدر کے حقیقی اسباب کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ سے لوگوں کو تنخواہ اور شروط ملازمت کے متعلق مختلف شکایتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوگیا تھا ' کہ انگریز ان کے مذہب اور ان کی ذات کو خراب کرنا چاہتے ہیں ' ان سپاہیوں میں زیادہ تر برھمن اور راجپوت تھے جو اودھ کے علاقہ سے بھرتی ہوے تھے ' اور جن کو الحاق اودھ کے بعد انگریزوں کے ساتھ ایک قسم کی قومی عداوت پیدا ہوگئی تھی ' اس زمانہ میں برما کیلئے ایک فوج کی ضرورت تھی ' اس لیے ڈلہوزی نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ آئندہ سے تمام سپاہیوں کو اس شرط پر بھرتی کیا جاے کہ وہ

ہند سے باہر بھی فوجی خدمت انجام دینگے ' اس کا یہ غلط مطلب لیا گیا کہ حکومت موجودہ سپاہیوں کو سمندر پار روانہ کرکے ان کا مذہب اور ان کی ذات خراب کرنا چاہتی ہے ' اسی زمانہ میں عیسائی مشنریوں نے ایک اشتہار کے ذریعہ ہند والوں کو عیسائیت کی دعوت دی تھی ' اس کے معنی یہ لئے گئے کہ انگریزی سرکار ہندی سپاہیوں کو بھی عیسائی بنانا چاہتی ہے ' اور کیننگ کے متعلق یہ مشہور ہوگیا تھا کہ وہ انگلستان سے فوج کے سپاہیوں کو عیسائی بنانے کا حکم لیکر آیا ہے ' سنہ ۱۸۵۶ع کے آخر میں ہند کے سپاہی اپنے افسروں سے بالکل بدظن ہوچکے تھے ' اور اپنے مذہب اور اپنی ذات کو بچانے کیلئے بغاوت کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے ۔

اس موقعہ پر انگریز افسروں نے ایک بڑی ہولناک غلطی کی ' اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ بندوق بھرتے وقت کارتوس کا ایک سرا دانت سے کترنا پڑتا تھا ' بعض کارتوسوں پر جانور کی چربی لگائی جاتی تھی ' اور یہی ایک چیز ان کیلئے بغاوت کا ایک ذریعہ بن گئی ' جس کا وہ پہلے ہی سے موقعہ ڈھونڈھ رہے تھے ' ہندو یہ سمجھتے تھے کہ ان کارتوسوں پر گائے کی چربی ہوتی ہے جس کا منہ میں رکھنا ان کے دھرم کو نشٹ کردیتا ہے اور مسلمان یہ خیال کرتے تھے کہ وہ چربی سور کی ہے جس کا چکھنا ان کے لئے ناپاک اور حرام ہے ۔ اس قسم کی غلط فہمی ان سپاہیوں کی وفاداری کو کافور کرنے کے لئے کافی تھی ۔ وہ لوگ بھی جو اس کو محض ایک غلطی سمجھتے تھے اور اس کو فریب یا دھوکہ نہیں خیال کرتے تھے اپنے افسروں سے بدظن ہوگئے ۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو اس عام جذبہ سے متاثر نہیں ہوے تھے ۔ اس طرح محض خوف کے دھندلے جذبات انتہائی نفرت اور حقارت میں بدل گئے ۔

اس جگہ غدر کے تفصیلی واقعات کا بیان کرنا غیر ضروری ہے ' چند دن کیلئے اودھ اور دوسرے علاقے کمپنی کے

نکل گئے ' اور پٹنہ کا مغربی علاقہ شورش کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا ' صرف تین مقامات ایسے تھے جہاں فیصلہ کن لڑائیاں پیش آئیں ' یعنی دھلی ' کانپور اور لکھنو ' ہم صرف ان ہی تین شہروں کے حالات کو بیان کرنے کی کوشش کرینگے مگر ان کو بیان کرنے سے پہلے تمہیدا چند باتوں کا عرض کردینا ضروری ہے ' پہلی بات یہ ہے کہ موجودہ شہادتوں سے اس نظریہ کی کوئی تائید نہیں ہوتی کہ غدر ایک وسیع اور منظم سازش کا نتیجہ تھا ' جب غدر کرنے والے پہلے حلہ میں کامیاب ہوگئے تو ان کی ہمتیں بہت بڑھ گئیں ' اور ان کی دیکھا دیکھی دوسری جگہوں میں بھی فساد پھیلتا چلا گیا ' دوسری بات یہ ہے کہ کمپنی کے افسروں نے اس بغاوت کا بر وقت کوئی تدارک نہیں کیا ' صرف پنجاب میں وہاں کے چیف کمشنر جان لارنس نے فوری کارروائی کی اور سپاھیوں سے ہتھیار چھین لیے ' اور دھلی کی امداد کیلئے ایک فوج تیار کرلی ' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب کی حکومت بالکل مضبوط ہوگئی ' دوسری جگہوں پر تذبذب غالب رہا ' اور انگریز افسر کسی فوری فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے ' اس کی وجہ سے باغی اپنے ہتھیار لیکر نکل کھڑے ہوے ' تیسری بات یہ ہے کہ دونوں طرف بڑی وحشیانہ حرکتیں کی گئیں ' باغیوں نے تمام خزانے حلادئے ' جیل خانے کھول دئے ' جہاں کہیں انگریزوں کو پایا بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کیا ' اور انگریز عورتوں اور بچوں تک کو زندہ نہ چھوڑا ' اور جب ان کی امداد کرنے اور ان کو رھا کرانے کیلئے کمپنی کی فوجیں آگے بڑھیں تو انہوں نے بھی جی کھول کر باغیوں سے انتقام لیا ' مگر دونوں جانب ایسے افراد بھی تھے جن کو ایک دوسرے پر اعتماد تھا ' اور دونوں کے درمیان سچی دوستی اور همدردی تھی ' سب سے آخری بات یہ ہے کہ باغیوں کی صحیح رهنمائی کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا اور ادھر کمپنی کو بہتر سے بہتر سپہ سالاروں کی رھبری اور امداد و اعانت حاصل تھی ۔

دهلی کے اندر مئی سنه ۱۸۵۷ع میں غدر شروع هوا ' اس زمانه میں یہاں سے چالیس میل کے فاصله پر میرٹھ ایک بڑا فوجی مرکز تھا ' یہ ں کے باغی سپاهی دهلی کی طرف بڑھے اور ان لوگوں سے جا ملے جو مغل شہنشاہ کے طرفدار تھے' یه شہنشاه ابھی تک دهلی کے شاهی محل میں کمپنی کے وظیفه خوار کی حیثیت سے زندگی گذار رها تھا ' دهلی کے مسلمان بھی باغیوں کے ساتھ مل گئے ' ان سب نے ملکر اپنی ایک نئی حکومت قایم کرلی ' جس کے جھنڈے کے نیچے تمام شورش پسند افراد جمع هونے لگے تھے سب سے پہلے جان لارنس نے اس خطره کو محسوس کیا ' اور فوراً ایک انگریزی فوج تیار کرکے بھیجی جو میرٹھ کی بغاوت کے ایک مہینه کے اندر اندر دهلی پہنچ گئی ' قلعه کی فصیل اتنی مضبوط تھی که اس کا توڑنا بہت مشکل تھا ' اور محاصره کے لئے بھی انگریزوں کے پاس کافی فوج نہیں تھی ' اس لئے انگریزی فوج نے قریب کے ایک ٹیلے پر مقام کیا جہاں سے شہر دهلی پر گوله باری کی جاسکتی تھی ' مسلسل لڑائی اور گوله باری کے دوران میں مختلف جگہوں داخ کر دهلی میں داخل هوتے رهے ' اور پنجاب سے انگریزوں کی امداد کے لئے یکے بعد دیگرے فوجیں پہنچتی رهیں ' مگر اس کے باوجود کوئی مفید کارروائی نہیں کی جاسکتی تھی ' آخرکار ستمبر کے مہینه میں انگریزوں کے پاس بڑی بڑی توپیں پہنچ گئیں ' جن کی مدد سے انہوں نے دهلی کا قلعه فتح کرلیا ' اور شہنشاه کو قید کرلیا ' دوسرے سال اس پر بغاوت کا مقدمه چلایا گیا اور هند سے باهر برما کے اندر اس کو قید کردیا گیا ' اس کی مسند بھی ختم کردی گئی اور اس کے بعد دهلی کے شہر اور شاهی محل کی وه اهمیت اور حیثیت نہیں رهی جو اس سے پہلے اس کو حاصل تھی ۔

باغیوں کا دوسرا اهم مرکز کانپور تھا ' یه بھی انگریزوں کا ایک فوجی مقام تھا ' اس کی اهمیت کچھ اس وجه سے بھی بڑھ

گئی تھی ' کہ یہاں سے لکھنو جانے والے راستہ پر قابو رکھا جاسکتا تھا ' اس سے قریب ھی کمپنی کی حکومت کے مخالفین کا ایک زبردست مرکز تھا - یہاں مرھٹوں کی آخری لڑائی کے بعد سے پونا کا آخری پیشوا کمپنی کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے زندگی بسر کر رھا تھا ' جب سنہ ۱۸۵۳ع میں اس کا انتقال ھوا تو اس کے لے پالک لڑکے کے نام ' جو لوگوں میں نانا صاحب کے نام سے مشہور تھا ' باز گشت کے اصول کے مطابق کمپنی کا وظیفہ جاری نہیں کیا گیا ' صرف پیشوا کی ذاتی جائداد نانا صاحب کے حوالے کی گئی تھی ' اس وجہ سے وہ کمپنی کا بڑا زبردست دشمن بن گیا تھا ' اور جب جون سنہ ۱۸۵۷ع میں کانپور کے سپاھیوں نے بغاوت کی تو انگریز سپہ سالار نے عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے ایک مختصر انگریزی فوج مقرر کی ' نانا صاحب نے باغیوں کو لیکر ان کا محاصرہ کرلیا ' اور جب مدافعت کی کوئی صورت نہیں رھی تو انگریز سپہ سالار نے اس شرط پر نانا صاحب کی اطاعت کرلی کہ تمام انگریز مردوں ' عورتوں اور بچوں کو الہ آباد چلے جانے کی اجازت دیدی جائیگی ' اور ان کے ساتھ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی جائیگی ' اور جب اس شرط کے مطابق تمام انگریز دریا کے راستہ سے جانے کے ارادہ سے کشتیوں میں سوار ھوئے تو باغیوں نے ان پر گولیاں برسائیں اور پھر ان میں آگ لگادی ' تمام مرد جان سے مارے گئے اور عورتوں اور بچوں کو قید کرلیا گیا اور پھر دو ھفتوں کے بعد ان کو بھی قتل کردیا گیا -

کانپور کی شورش اور بغاوت کا لکھنو پر بھی بڑا اثر پڑا ' سر ھنری لارنس اودھ کے چیف کمشنر کی حیثیت سے وھاں مارچ سنہ ۱۸۵۷ع میں پہنچا تھا ' اس نے جہاں تک ھوسکا ' اپنے پیشرووں کی غلطیوں کی تلافی کی ' مگر اس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ عداوتوں کے تدارک کرنے کا اسکو کافی وقت اور موقعہ نہیں ملا ' اتنے میں لکھنو کے سپاھیوں نے بھی بغاوت کردی ' لارنس نے

شہر کی ریذیڈنسی کی عمارتوں میں پناہ لی جہاں الحاق اودھ سے پہلے شاہ اودھ کے دربار کا انگریز ریذیڈنٹ مقیم رہتا تھا ، اور جب جون کے مہینہ میں اودھ کے اکثر سپاہیوں نے بغاوت کی تو تمام زمیندار انکے ساتھ ہوگئے ، اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ حکومت قایم کرلی ، ریذیڈنسی میں ایک ہزار سے کچھ کم گورے فوجی اور سات سو وفادار ہندی سپاہی تھے ، انکے علاوہ بہت سے غیر محارب انگریز مرد اور عورت بھی تھے ، باغیوں نے سب سے پہلے ریذیڈنسی کا محاصرہ کیا ، انکی تائید کیلئے زمینداروں کے بے قاعدہ سپاہی بھی پہنچ گئے ، ان سب کی تعداد انگریز مدافعین کے مقابلہ میں کئی گنی زیادہ تھی ، اسکے باوجود لارنس نے بڑی دلیری کے ساتھ انکی مدافعت کی ، مگر جب جولائی کی ابتدا میں وہ زخموں سے چور ہوکر انتقال کرگیا تو اسکے جانشین نے مدافعت کو جاری رکھا ، ستمبر کے آخر میں کانپور سے سر ہنری ہیولاک Havelock اور سر جیمس اوٹ رام Outram اپنی فوجوں کو لیکر لکھنو پہنچ گئے ، مگر محصورین کی تعداد کو بڑھانے کے سوا انہوں نے کوئی مفید کام انجام نہیں دیا ، آخر نومبر میں انگریزی فوجوں کا سپہ سالار (کمانڈر ان چیف) سر کالن کیمپبل Colin Campbell ایک تازہ دم فوج لیکر پہنچا اور ان غیر محارب اور زخمی لوگوں کو بصحیح و سلامت نکال لے گیا جو ریذیڈنسی کی عمارتوں میں محصور ہوگئے تھے .

اب ملک کو ہموار اور مطیع کرنے کی ذمہ داری سر کالن کیمپبل پر عائد ہوی ، اور جب ایک مرتبہ اس نے نانا صاحب کی فوجوں کو شکست فاش دیدی تو گنگا اور جمنا کے درمیان کا پورا علاقہ اس کے قبضہ میں آگیا ، مگر اب بھی جنوب کی طرف سے حملوں کا خطرہ برابر لگا ہوا تھا ، سنہ ۱۸۵۸ع کی ابتدا میں مدراس اور بمبئی کی انگریزی فوجیں وسط ہند اور بندیلکھنڈ کے باغیوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگئیں اور ادھر کیمپبل باغیوں کی ان ٹولیوں کو ، جو لکھنو کی شکست

کے بعد سارے اودھ میں پھیل گئی تھیں اور لوٹ مار کرنے لگی تھیں ' ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا ' سنہ ۱۸۵۸ء کے ختم ہونے سے پہلے ان کی اکثر ٹولیوں کا خاتمہ ہوچکا تھا ' اور دوسرے سال تو ان کا پورا ہی خاتمہ کردیا گیا ' اودھ میں انگریزی حکومت پھر سے بحال ہوگئی اور کاشتکاروں کی بجاے ان زمینداروں سے لگان کا تصفیہ کیا گیا ' جو اپنی اپنی جاگیروں کے دعویدار تھے ۔

غدر کی ہولناک خبروں سے انگلستان میں ایک بڑی ہلچل اور بے چینی پیدا ہوگئی تھی ' اور اس کی جزئیات پر بڑی سخت لے دے ہونے لگی تھی ' اہل انگلستان کا عام فیصلہ یہ تھا کہ ہند میں کمپنی کی حکومت از کار رفتہ ہوچکی ہے اور اس کو ختم ہی کردینا چاہئے ' چنانچہ آگست سنہ ۱۸۵۸ء میں پارلیمنٹ نے 'ہند میں بہتر نظم و نسق کا قانون' منظور کیا جس کی روسے نظماے کمپنی اور مجلس نظارت کے تمام اختیارات وزیر ہند (Secretary of State for India) کے سپرد کیے گئے ' جو مجلس و زارت کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے پارلیمنٹ کے سامنے اپنے افعال کا ذمہ دار تھا ' نومبر سنہ ۱۸۵۸ء میں ہند کے حاکم اعلی کیننگ نے ' جو اب گورنر جنرل ہونے کے ساتھ ساتھ وایسراے (نائب شاہ) بھی مقرر ہوگیا تھا ' اس شاہی فرمان کا اعلان کیا جس میں حکومت کی پالیسی کو ظاہر کیا گیا تھا اور یہی اعلان ہند کے اندر نئے دستور کے بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے ۔

اس قانون اور دوسرے قوانین کی روسے جو کئی سال تک وقتاً فوقتاً منظور ہوتے رہے حکومت ہند کی مشینری میں بڑی اہم تبدیلیاں پیدا ہوئیں ۔ ان کا اثر خاص طور پر فوج ' قانونی عدالتوں ' مجلس قانون ساز اور مرکزی مجلس عاملہ (Central Executive) تک محدود تھا ' اب تک کمپنی کی تینوں فوجوں میں انگریز اور ہندی سپاہی دونوں بھرتی ہوتے تھے ' مگر اس کے بعد ہندی فوج میں انگریز سپاہیوں کی بھرتی روک دی گئی ' اس زمانہ

میں هندی فوج کا ایک حصہ هندی سواروں اور پیادوں پر مشتمل هوتا تھا یہ فوج ایسے برطانوی افسروں کے ماتحت هوتی تھی جو فوج میں مستقل ملازم هوتے تھے اور فوج کا دوسرا حصہ برطانوی توپچیوں سواروں اور پیادوں پر مشتمل هوتا تھا ' جو ایک مقررہ میعاد تک فوجی خدمات کے انجام دینے کیلئے انگلستان سے هند آتے تھے - تقریباً اس صدی کے خاتمہ تک ان تینوں علحدہ علحدہ فوجوں میں مقامی جذبہ کام کر رہا تھا .

وارن هیسٹنگز کے زمانہ سے عدالتوں کے اندر دو عملی چلی آرهی تھی ' یہ سنہ ۱۸۶۱ع میں ختم کردی گئی ' اور ان کی بجاے کلکتہ ' مدراس اور بمبئی میں ایک ایک عدالت عالیہ قایم کی گئی ' جن پر حکومت عاملہ (Executive Government) کا کوئی اختیار نہیں تھا ' اور جو دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات کا فیصلہ کرسکتی تھیں ' پانچ سال بعد صوبجات شمال مغربی میں بھی اسی قسم کی ایک عدالت قایم هوی ' مگر دوسری جگھوں پر عدالتوں کا تدریجی طور پر ارتقا هوتا رها ' عام طور پر هر ایک نئے صوبہ کیلئے ایک جوڈیشیل کمشنر مقرر هوتا تھا ' لیکن جب کام زیادہ هوتا گیا اور اس کی اهمیت بڑھتی گئی تو وہ اپنا کام عدالت خاص (Cheif Court) کے حوالے کردیتا تھا ' جو عملاً عدالت عالیہ سے مختلف نہیں هوتی تھی ' اور آگے چلکر یھی عدالت خاص عدالت عالیہ بن جاتی تھی ' یھی عدالت چاهے اس کا نام کچھ بھی هو ' تمام معاملات میں قانونی حکومت کی محافظ سمجھی جاتی تھی ' اس کا کام ماتحت عدالتوں کی نگرانی کرنا اور حاکموں اور عام لوگوں پر قانون کو نافذ کرنا هوتا تھا .

سنہ ۱۸۵۳ع تک گورنر جنرل باجلاس کونسل تمام قوانین کو منظور کرکے ان کو نافذ اور جاری کرتا تھا ' اس سال کے قانون منشور (Charter Act) کی روسے بارہ سرکاری عہدہ داروں کی ایک مجلس قانون ساز Legislative Council بنادی گئی ' اور

سنہ ۱۸٦۱ء میں پہلی مرتبہ غیر سرکاری آدمیوں کو نامزد کرنے کی اجازت دی گئی ' اس کے بعد مجلس قانون ساز میں وایسرائے کی مجلس عاملہ (Executive Council) کے علاوہ کئی نامزد اراکین بھی ہوتے تھے ' جن میں سے آدھے اراکین کا انتخاب غیر سرکاری حلقوں سے کیا جاتا تھا ' اس مجلس قانون ساز کے اختیارات بالکل محدود تھے ' اراکین مجلس مسودۂ قانون (Bill) پر بحث کرنے کے مجاز تھے مگر ان کو سوالات کرنے یا تجویزوں (Resolutions) کے پیش کرنے کی اجازت نہیں تھی ' مدراس اور بمبئی کے صوبوں کو بھی مجالس قانون ساز کے بنانے کا اختیار دیا گیا تھا ان کی مجالس عملہ میں بھی اسی طرح غیر سرکاری اراکین کو نامزد کیا جاتا تھا ' بنگال کے صوبہ میں بھی ایک قانون ساز مجلس بنائی گئی تھی اور صوبجات شمال مغربی اور پنجاب کو بھی اس قسم کے اختیارات دئے گئے تھے مگر کہیں سنہ ۱۸۸٦ء میں جاکر صوبجات شمال مغربی میں اور سنہ ۱۸۹۸ء میں جاکر پنجاب میں قانون ساز مجلسیں بنائی گئیں ۔

کیننگ نے مجلس عاملہ کے طریقۂ کار کی دوبارہ تشکیل کی ' اور وہ طریقہ جاری کیا جس کو موجودہ زمانہ میں قلمدان وزارت کہا جاتا ہے ' یعنی مجلس کے ہر ایک رکن کے ذمہ کسی ایک یا چند خاص محکموں کا انتظام سپرد کیا جاتا تھا ' وہ حکومت ہند کے نام سے احکام جاری کرتا تھا ' اور جہاں کہیں عام پالیسی کے متعین کرنے یا مختلف محکموں کے درمیان اختلاف کے رفع کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو تمام اراکین آپس میں ملکر فیصلہ کرتے تھے ' سنہ ۱۸٦۱ء کے قانون سے قلمدان وزارت کی تقسیم کو قانونی حیثیت عطا کی گئی ' نیز اراکین کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا اور غیر سرکاری آدمیوں میں سے کسی تجربہ‌کار آدمی کو مالیات یا کسی دوسرے صیغے کی خدمت پر مامور کرنے کی اجازت دی گئی ' یہ مجلس عاملہ گورنر جنرل ' قانونی مشیر (Legal Member) ' فوجی رکن (Military Member) اور تین ملازمان دیوانی (Civil Servants) یا دو ملازمان دیوانی اور ایک

تجربہ کار آدمی پر مشتمل ہوتی تھی ، گورنر جنرل ہمیشہ سیاسی معاملات کو اپنے قابو میں رکھتا تھا ، قانونی مشیر عام طور پر ایک بیرسٹر ہوتا تھا جو براہ راست انگلستان سے مقرر ہوکر آتا تھا ، فوجی رکن فوج سے منتخب کیا جاتا تھا ، باقی عہدے تین ملازم دیوانی یا دو ملازم دیوانی اور ایک تجربہ کار آدمی کے درمیان تقسیم کردیے جاتے تھے ، فوج کا سپہ سالار اعظم (Commander-in-Cheif) مجلس کی کارروائیوں میں شریک رہتا تھا ، اور اپنی فوج کی طرف سے نمائندگی کرتا تھا ، مگر اس کو وزارت کا کوئی عہدہ نہیں دیا جاتا تھا ، گورنر جنرل کو اختیار تھا کہ اہم اور فوری معاملات میں مجلس کی اکثریت کے فیصلہ کو مسترد کردے مگر شاذ و نادر ہی اس کی نوبت آتی تھی ۔

یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام اہم تبدیلیاں حکومت کی مشینری کو بہتر بنانے کے لئے لازمی تھیں، انگلستان میں بھی تبدیلی کی ضرورت تھی، مگر اسکا ایک ناگوار نتیجہ پیدا ہوا جس کی پیش بینی نہیں ہوسکی تھی ، اس تبدیلی کا یہ اثر ہوا کہ دفتری حکومت کے کارکنوں میں وہ ولولہ اور جذبہ مفقود ہوگیا ، جس کے متعلق ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ پارلیمنٹ ہند سے باہر رہ کر یہ ولولہ اور جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی ، اب وزیر ہند کا دفتر (India Office) اور وزارتوں کی طرح ایک وزارت بن کر رہ گیا تھا ، مخالفین اور ان کے ہمنوا اخبارات اس کو اپنی مخالفت جاری رکھنے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے ، اور پارلیمنٹ کے وہ اراکین جو حکومت وقت کے حامی ہوتے تھے ، وزیر ہند کے دفتری معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتے تھے ، عام طور پر چند ہی اراکین ایسے ہوتے تھے جن کو ہند کے معاملات سے حقیقی دلچسپی ہوتی تھی ، مگر ان کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا ، جب سالانہ بحث کے موقعہ پر ہند کا میزانیہ (Budget) دارالعوام میں پیش ہوتا تھا تو اراکین کی طبیعتیں چند گھنٹوں کے لئے اچاٹ اور بیزار ہوجاتی تھیں، اور اگر ہند کا کوئی خاص مسئلہ اہمیت اختیار کرلیتا تو وہ

محض انگلستان کے سیاسی فرقوں کی باہمی کشمکش کی وجہ سے ہوتا تھا یا اس لئے کہ اس کا اثر یوروپ کی سیاسی حکمت عملی پر پڑتا تھا ۔

ان حالات میں وزیر ہند ' جو حکومت ہند کی نگرانی اور اس پر قابو رکھنے کا ذمہ دار تھا ' پارلیمنٹ میں اپنی اصلاحی تجاویز پیش نہیں کرسکتا تھا ' کیونکہ اسے ڈر لگا ہوا تھا کہ وہ کہیں اراکین کی نکتہ چینیوں کا نشانہ نہ بن جائے ' اس کے علاوہ اپنی مجلس مشورت کے اراکین کی وجہ سے جو اس کو صحیح معلومات کے فراہم کرنے کے لئے مقرر کئے جاتے تھے ۔ اس کے اختیارات اور بھی محدود ہوگئے تھے ' اگرچہ ان میں سے اکثر اراکین کو ہند کے معاملات کا کافی تجربہ ہوتا تھا تاہم ان کا یہ تجربہ ان کی طویل عہدہ داری کے زمانہ میں ازکار رفتہ ہوجاتا تھا ' کیونکہ پہلے پہل انکو انکی مرضی کے مطابق یہ خدمت سپرد کی جاتی تھی ' پھر سنہ ۱۸۶۹ع کے بعد سے ان کو دس سال کی مدت کے لئے انتخاب کیا جانے لگا تھا جس میں کبھی کبھی مزید پانچ سال کی اور توسیع ہوجاتی تھی ' مصارف حکومت کی منظوری کے متعلق اس مجلس کے اراکین کو وسیع اختیارات حاصل تھے ' وہ اپنے فرایض کے ادا کرنے میں بڑے سرگرم تھے ' لیکن اس مجلس کا دستور ہی کچھ ایسا تھا کہ ان کی کاوشیں محض تنقید کرنے اور کاموں میں رکاوٹیں ڈالنے تک محدود ہوتی تھیں ' بڑی بڑی اصلاحی تجاویز کے پیش کرنے یا ان کے آگے بڑھانے میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا ۔

انگلستان میں اس وقت کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو آزادانہ پارلیمنٹری تحقیقات کی جگہ لے سکے ' جن کے ذریعہ اٹھارویں صدی کے نصف اول میں ملکی نظم و نسق کے ہر ایک پہلو کی جانچ پرتال کی گئی تھی ' اور سنہ ۱۸۸۰ع سے پہلے ہند کے اندر رائے عامہ کی حقیقۃ کوئی آواز نہیں تھی ' اگرچہ ہند کے اخباروں کا اثر اور رسوخ بڑھتا جا رہا تھا ' مگر تعمیری تنقید کو کچھ بھی ترقی نہیں ہو رہی تھی ' ان کا لب و لہجہ

بہت ہی تند و تیز اور بسا اوقات طعن و تشنیع سے بھرا ہوا ہوتا تھا ' اس کی وجہ سے انگریز ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انکا مطالعہ کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے ' وایسرائے ہی کی ایک ذات ایسی تھی جو ملکی نظم و نسق کی واقعی جانچ پرتال کرسکتی تھی ' لارڈ ڈفرن کی مثال سے جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا ' ظاہر ہوتا ہے کہ وایسرائے ملک کے اندرونی نظم و نسق کی پر اثر طریقہ پر اصلاح کرسکتا تھا ' مگر عام طور پر تمام وایسرائے صرف رسمی اور دفتری کام انجام دینے پر اکتفا کرتے تھے ' وہ محض اپنی حکومت کے بڑے بن کر رهنا چاهتے تھے ' ان کا ماحول بھی کچھ ایسا تھ کہ وہ حکومت کے مختلف دفاتر کی جانچ پرتال نہیں کرسکتے تھے ' سنہ ۱۸۶۴ء کے بعد سے وایسرائے گرمی کے چھے مہینے شملہ میں گذارنے لگے ' لوگوں کے ساتھ ان کا تعلق محض سرکاری ہوتا تھا ' سردی کے زمانہ میں ان کا مستقر کلکتہ تھا ' جہاں اهل هند سے راہ و رسم رکھنے کی بجاے وہ یوروپین تاجروں ' کارخانہ داروں اور پیشہ وروں سے میل جول رکھتے تھے ' جن کی تائید میں ایک قابل قدر اور مستعد پریس موجود تھا ' جب کبھی وہ سفر پر نکلتے تو اسی وقت ان کو اهل هند کی معاشرت اور ان کے خیالات کے متعلق صحیح معلومات کے حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا .

یہ واقعات بہت ہی اهم ہیں ' کیونکہ یہی واقعات آئندہ پچاس برس کی تاریخ کا جس کا تذکرہ هم لکھنا چاهتے ہیں ' پس منظر بنتے ہیں درحقیقت اس زمانہ میں حکومت کے اندر بہت ہی غیر معمولی طور پر قابل اور ذهین دفتری کارکن موجود تھے جو بڑی کامیابی کے ساتھ اهل هند کی زیادہ سے زیادہ بھلائی کرنے کے خواهاں تھے ' لیکن وہ ان نئے تاثرات اور خیالات کے سمجھنے سے قاصر تھے جن کی بناء پر اهل هند خود آپ اپنی حکومت کرنے اور اپنے امور کو بہتر طور پر انجام دینے کی خواهش کرتے تھے .

باب ۴۴

اقتصادی تبدیلیاں

سنہ ۱۸۶۰ع تا سنہ ۱۸۸۰ع

وایسرائے :— لارڈ کیننگ سنہ ۱۸۵۶ع تا سنہ ۱۸۶۲ع

لارڈ ایلگن (آٹھواں ارل) سنہ ۱۸۶۲ع سنہ ۱۸۶۳ع میں وفات پائی

سرجان لارنس سنہ ۱۸۶۴ع تا سنہ ۱۸۶۹ع

لارڈ میٹو سنہ ۱۸۶۹ع سنہ ۱۸۷۲ع میں مارا گیا

لارڈ نارتھ بروک سنہ ۱۸۷۲ع تا سنہ ۱۸۷۶ع

لارڈ لٹن سنہ ۱۸۷۶ع تا سنہ ۱۸۸۰ع

غدر کے فرو ہونے کے بعد بیس سال کا زمانہ ایسا ہے کہ اس کو ہند کا تخلیقی دور کہا جاسکتا ہے ، کیونکہ ہند کی اقتصادی اور تمدنی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں عمل میں آئیں ، جن کے پورے نتائج بہت بعد کو ظاہر ہوے ، پہلے پہل یہ تبدیلیاں برطانوی صوبوں میں ہوئیں ، اور بعد میں آہستہ آہستہ ان کا اثر دیسی ریاستوں پر بھی پڑا ، جہاں ہر ایک شعبہ زندگی میں رہنماؤں کی بڑی کمی تھی ، اس صدی کے آخری سالوں میں ریاستیں صوبوں کے نقش قدم پر چل رہی تھیں ، مگر دونوں کی ترقی کے درمیان کچھ فاصلہ ضرور ہوتا تھا ، اس باب میں ہم صرف اقتصادی تبدیلیوں کا ذکر کرینگے ، اور سب سے پہلے اس بات کو بیان کرینگے کہ کس طرح ہند کے بازار سمٹ کر ایک دوسرے سے مل گئے تھے اور کس طرح یوروپ کے بازاروں سے ان کا گہرا تعلق پیدا ہوگیا تھا .

جب سنہ ۱۸۶۹ع میں نہر سویز کھدکر تیار ہوگئی تو لندن کے تجارتی جہاز تین مہینوں کی بجاے صرف پچیس دن

میں بمبئی پہنچنے لگے ' اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ہند کی زرعی پیداوار وسیع پیمانہ پر یوروپ جانے لگی ' اور انگلستان ' فرانس ' اطالیہ اور جرمنی کے بازاروں سے سواحل ہند کا گہرا تعلق قایم ہوگیا ' اور ادھر ریلوں ڈاکخانوں اور تار برقی کی غیر معمولی ترقی سے ملک کے تمام بازار ایک دوسرے سے متحد ہوگئے ' یہ حقیقت تھی کہ ڈلہوزی کے زمانہ میں اگر ایک جگہ افراط کی وجہ سے چیزیں سڑ رہی تھیں تو دوسری جگہ قحط کی وجہ سے لوگ بھوکوں مر رہے تھے ' چالیس سال بعد یہی غذا کی چیزیں ملک کے مختلف گوشوں میں پہنچائی جاسکتی تھیں ' اور لوگوں کی ضروریات کے مطابق معمولی قیمتوں پر ان کو فروخت کیا جاسکتا تھا ' صرف بعض مقامات ایسے تھے جہاں ان چیزوں کا پہنچنا ابھی تک دشوار تھا ' معمولی حالات میں اب کوئی زبردست قحط نہیں پڑسکتا تھا ' کیونکہ اگر ہند سے غذائی چیزیں کافی مقدار میں حاصل نہ ہوں تو پھر برما یا دوسرے دور کے ملکوں سے یہ چیزیں منگوالی جاسکتی تھیں۔

اس تبدیلی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں اور قصبوں کے درمیان بتدریج ایک قسم کا اقتصادی توازن قایم ہوگیا ' ہند کے اندر غذائی چیزوں کی غیر معمولی ارزانی جو بہت سے ابتدائی یوروپین سیاحوں کو نظر آرہی تھی ' در حقیقت انتظام مالگذاری کا نتیجہ تھی ' مغلوں کے زمانہ میں کاشتکاروں کو اپنی پیداوار کا آدھا یا ایک تہائی حصہ فصل کاٹنے کے چند ہفتوں کے اندر محض لگان کے ادا کرنے کیلئے بیچ دینا پڑتا تھا ' اور جب ہر جگہ پیکھ اچھی ہوتی تو ان کی پیداوار کا خریدنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا اور جب یہ اناج یوروپ جانے لگا تو ان کی قیمتیں فصل کاٹنے کے بعد بھی کچھ کم و بیش متعین ہی رہتی تھیں ' کیونکہ بر آمدی تاجر چیزوں کی خریداری میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے ' اور عالمگیر اسباب کی بناء پر قیمتوں کے زیادہ گرنے کی کوئی

امید نہیں کی جاسکتی تھی ، اور جب ان اسباب کی بناء پر چیزوں کی قیمتیں بتدریج بڑھنے لگیں تو شہر کے لوگ جلنے لگے ، کیونکہ ان کی آمدنی اکثر صورتوں میں متعین ہوتی تھی ، مگر قیمتوں کے بڑھنے سے کاشتکاروں کی اکثر تکلیفیں دور ہوگئیں ، خشک سالی کے زمانہ میں بھی لوگوں کو غذائی چیزیں مل سکتی تھیں ، اب کاشتکار ہند کے باشندوں کی ضروریات سے زیادہ اناج پیدا کرتے تھے ، کیونکہ فاضل پیداوار کو باھر بھیجنے کا اب ایک ذریعہ پیدا ھوگیا تھا ، خشک سالی کے زمانہ میں چیزوں کی قیمتیں اتنی بڑھ جاتی تھیں کہ ان کی بر آمد خود بخود بند ھوجاتی تھی اور اسطرح فاضل پیداوار اپنے دیس ھی کے لوگوں کو میسر ھوسکتی تھی ۔

ھند کے تاجر اور سرمایہ دار اب رسل و رسایل کی نئی آسانیوں سے فائدہ اٹھانے لگے تھے اور ان کی تجارت کو بڑی ترقی ھو رھی تھی ، مگر اس کی نوعیت میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا تھا اس درمیان میں یوروپین لوگوں کی ایک جماعت پیدا ھوگئی تھی جو تجارتی لین دین اور سرمایہ داری دونوں طرح کا کام کرتی تھی ، اسکا اس جماعت سے کوئی تعلق نہیں تھا جو پہلے ھی سے یہاں موجود تھی ، ابتدا میں کلکتہ ، بمبئی اور مدراس کی یوروپین کمپنیاں تجارت کرنے کے ساتھ ساتھ ساھوکاری کا کام بھی کرتی تھیں غلط قیاس آرائیوں کی وجہ سے باربار تجارتی نقصانات ھوے ، جس کا اثر زیادہ تر انگریز افسروں پر پڑا ، مگر ملک کی اقتصادی حالت میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ھوی ، آگے چلکر ساھوکاری اور سرمایہ داری تجارت سے بالکل الگ ھوگئی ، سنہ ۱۸۶۰ء میں تینوں صوبوں کے اندر بنک قایم ھوچکے تھے ، جن میں زیادہ تر یوروپین لوگوں کا سرمایہ لگا ھوا تھا ، صرف بمبئی کا ایک بنک پارسیوں کے سرمایہ سے چل رہا تھا لیکن ان سب کا انتظام انگریزی نہج پر تھا ، ابتدا میں ان بنکوں کا دائرہ عمل صرف مرکزی شہروں تک محدود تھا اور دیسی نظام مالیات کے ساتھ

ان کا تعلق خاص طور پر اس وجہ سے قایم ہوا کہ وہ ہند کے بڑے بڑے تاجروں کی ہنڈیوں Bills پر منہائی دینے کے لئے تیار تھے ' ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سنہ ۱۸۶۰ع سے ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے جبکہ بنکوں کے لئے محدود ذمہ داری (Limited Liability) کا اصول پہلی مرتبہ قانوناً تسلیم کرلیا گیا ' مگر اس کے بعد فوراً ہی تباہی پیش آئی ' امریکہ کی خانہ جنگی کے زمانہ میں بمبئی کے ہندی تاجروں نے لنکاشائر کو روئی بیچ کر بہت بڑا نفع کما لیا تھا ' اس کی وجہ سے غیر معمولی تجارتی قیاس آرائیاں شروع ہوگئی تھیں - اور بہت زیادہ تعداد میں بنک اور سرمایہ دارانہ کمپنیاں قایم ہوگئیں ' سنہ ۱۸۶۵ع کے تجارتی بحران میں تقریباً تمام کی تمام کمپنیاں دیوالیہ ہوگئیں ' اس کے بعد یوروپین لوگوں کی کوششوں سے چند بنک قایم ہوے ' لیکن ہند کے لوگوں نے ایک مدت تک کے لئے تجارت کی اس شاخ سے بالکل علحدگی اختیار کرلی .

نہر سویز کے کھل جانے کے بعد یوروپ کی تجارتی کمپنیوں کو بڑی ترقی ہوی ' اور انھی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ہمالیہ کے دامن تک تجارت کا ایک سلسلہ قایم ہوگیا تھا ' دوسرے ملکوں کی طرح ہند کے غیر منظم کاشتکار سب سے زیادہ نقصان میں رہتے تھے ' مقامی خریدار بازار کی قیمت کے متعلق اتنا خیال نہیں کرتے تھے جتنا کہ وہ ایک مخصوص دکاندار کی ضرورت کا لحاظ رکھتے تھے وہ قیمتوں کو بڑھا کر رکھنے کی کوشش تو کرتے تھے مگر جب ان کی قیمتیں مجموعی حیثیت سے گرجاتی تھیں تو ان پر چشم پوشی بھی اختیار کرلیتے تھے ' وہ بازار کی چند رسموں کو بحال رکھنے یا ان کو ترقی دینے کی کوشش کرتے تھے ' کیونکہ یہ انھی کے فائدہ کے لئے ہوتی تھیں ۔ ہر ایک بڑے دیسی بازار میں ایک تبدیلی پیدا ہوی جبکہ ریل وہاں پہنچ گئی ' اب یوروپین کمپنیوں کے نمائندے ان دیسی

لگے - ان کی لگائی ہوی قیمتیں ، عالمگیر حالات کے مطابق بالکل مناسب بھی ہوتی تھیں ، وہ جو کچھ خریدتے تھے ، اس کی قیمت فوراً ہی چاندی کی صورت میں ادا کردیتے تھے ، ان کا تول بالکل ٹھیک ہوتا تھا ، اور وہ قیمتوں میں بھی کبھی کمی نہیں کرتے تھے ، الا یہ کہ مال گھٹیا قسم کا ہو ، ان لوگوں نے حقیقت میں تجارت کے وہ بہترین طریقے سکھائے جن سے ہند کے کاشتکار پہلے سے واقف نہیں تھے ، ان سے ان کاشتکاروں کو خوب فائدہ ہوا جو اپنی چیزوں کے بیچنے کے مختار تھے - مگر وہ کاشتکار ، جو کسی تاجر کے مقروض اور اپنی چیزوں کو اسی کے حوالے کرنے پر مجبور ہوتے تھے ، بہت نقصان اٹھاتے تھے ، لیکن چونکہ چیزوں کی قیمتیں بتدریج بڑھ چکی تھیں اس لئے وہ اب اپنی بچت پیداوار کو بیچ کر اپنی تکلیفات کو بتدریج دور کرسکتے تھے .

و حرفت کے معاملہ میں انفرادی بیوپار کرنے والے جولاہوں اور کاریگروں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا ، مگر ہر جگہ جدید قسم کے کارخانے کثرت سے کھل رہے تھے ، در آمدی اشیاء پر چنگی کا جو معمولی محصول پانچ فیصد سے لیکر دس فیصد تک لگایا جاتا تھا ، اس سے ہند کی مصنوعات کا کوئی تحفظ نہیں ہوسکتا تھا ، کیونکہ ہند کی مصنوعات یوروپ کی مصنوعات کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں ، اس معمولی محصول سے بھی ان کا جو کچھ تحفظ ہوسکتا تھا وہ بھی اس دور کے آخر میں ختم ہوگیا جب کہ اس محصول کو بالکل ہی اٹھا دیا گیا ، ہند میں نفیس چیزوں کی مانگ بھی بہت کم ہوگئی ، کیونکہ لوگوں میں اب ان چیزوں کا مذاق نہیں رہا تھا ، ان کے مقابلہ میں یوروپ کی آرائشی چیزیں زیادہ پسند کی جانے لگی تھیں ، بعض نفیس چیزیں ختم ہونے سے اس لئے بچ گئی تھیں کہ بعض انگریزوں نے ان کی سر پرستی کی تھی .

غدر سے پہلے ریلیں کوئلہ کی کانوں تک پہنچ چکی تھیں ، غدر کے بعد جب زیادہ مقدار میں کوئلہ نکالا جانے لگا تو بڑے

بڑے کارخانے بھی قایم ہونے لگے ' چنانچہ سب سے پہلا سن کا کارخانہ سنہ ۱۸۵۴ع میں کلکتہ کے قریب قایم ہوا ' اس کے بعد ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ' سنہ ۱۸٦۱ع میں بمبئی کے اندر کپڑے کے دس کارخانے تھے ' مگر سنہ ۱۸۸۰ع میں ان کی تعداد پچاس سے بھی کچھ اوپر ہوگئی تھی ' اسی طرح دوسری جگہوں پر کارخانے قایم ہوتے گئے ' چنانچہ سنہ ۱۸٦۱ع میں احمدآباد سنہ ۱۸٦۹ع میں کانپور سنہ ۱۸۷۴ع میں مدراس اور سنہ ۱۸۷۷ع میں ناگپور کا کارخانہ قایم ہوا ' دوسرے مختلف مقامات میں بھی چھوٹے چھوٹے کارخانے قایم ہوے جہاں چمڑا ' کاغذ اون اور سلک اور دیگر خام اشیاء تیار کی جاتی تھیں تمام بڑے کارخانوں میں یوروپین لوگوں کا سرمایہ تھا ' اور وھی ان کا انتظام بھی کرتے تھے ' آگے چلکر ھند کے باشندے بھی کارخانے کھولنے لگے مگر ان کا انتظام عموماً یوروپین لوگوں کے ھاتھ میں ہوتا تھا ' اور جب ھند والے کارخانوں کے حصے خریدنے لگے تو دھیرے دھیرے ان کے مالک بھی بن گئے ' بمبئی میں تھوڑے زمانہ تک پارسی ھی کپڑوں کے کارخانوں کے مالک تھے اور وھی ان کا انتظام بھی کرتے تھے ' کپڑے کی صنعت کا دوسرا اھم مرکز احمد آباد تھا ' یہاں کے کارخانوں میں زیادہ تر ھندووں کا سرمایہ لگا ھوا تھا ' اس دور کے آخر میں کارخانجات کے متعلق ایک قانون بنانے کی ضرورت ھوی ' چنانچہ سنہ ۱۸۸۱ع میں قانون کارخانجات (Factory Act) منظور ہوا ' جس کی روسے سات سال سے کم عمر کے بچوں سے کارخانہ میں کام لینے کی ممانعت کردی گئی ' اور مشینوں کے اطراف کٹھرا لگانا ضروری قرار دیا گیا .

ریلوں ' کانوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے مواقع ایک ایسے وقت پر میسر آئے جبکہ آبادی کے بڑھ جانے کی وجہ سے لوگوں کو ملازمتوں کی بڑی تلاش تھی ' انیسویں صدی کی ایک اھم خصوصیت آبادی کا بہت بڑھ جانا ھے ' اسوقت اس زمانہ کی آبادی کا ٹھیک اندازہ لگانا دشوار ھے کیونکہ سنہ ۱۸۸۱ع

سے پہلے کبھی با قاعدہ مردم شماری نہیں ہوئی تھی، مگر ماضی کے متعلق اتنی معلومات حاصل ہیں کہ ہم بجا طور پر یہ کہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں پیدایش کی شرح عموماً زیادہ اور اسکی ترقی کی رفتار بڑھنے ہی کی طرف مائل تھی، اسوقت آبادی کو گھٹانے والی تین چیزیں تھیں، جنگ، بیماری اور قحط، جنگ اور قحط کے متعلق گذشتہ ابواب میں کافی لکھا جا چکا ہے، لیکن بیماریوں کا جہانتک سوال ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے تین یعنی بخار، ہیضہ اور چیچک ہند کے مختلف مقامات میں صدیوں سے موجود تھے، چوتھی بیماری گلٹی دار طاعون کی تھی، جو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد باہر سے آکر یہاں پھیلتی تھی، اور اسکی وجہ سے بے شمار جانیں ضایع ہوجاتی تھیں، گذشتہ پچاس سال کے اندر ان بیماریوں کے پھیلنے کے اسباب کے متعلق جو تحقیقات ہوی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انکے پھیلنے کیلئے گنجان آبادی کا ہونا بہت ضروری ہے، اگر ایک طرف انسانوں کی وجہ سے جنگ ہوتی تھی اور خشک سالی کی وجہ سے قحط رونما ہوتا تھا تو دوسری طرف بیماری کثرت آبادی کیلئے ایک قدرتی رکاوٹ ثابت ہوتی تھی۔

سنہ ۱۸٦۰ء میں ملک کے اندر کسی قسم کی خانہ جنگی باقی نہیں رہی تھی، جان لیوا بیماریاں بھی بہت کم ہوچکی تھیں اور پچیس برس سے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، کوئی قحط رونما نہیں ہوا تھا، اسکا لازمی نتیجہ آبادی کے اندر چند در چند اضافہ کا ہوجانا ہے، چونکہ اس دور میں بالکل امن و امان قایم ہوچکا تھا اسلئے باہر کے ملکوں کے بہت سے لوگ شمالی ہند میں آکر بسنے لگے تھے، جسکی وجہ سے یہاں کی آبادی اور زیادہ بڑھ رہی تھی، اسکے بر خلاف جنوبی ہند کے لوگ روزگار کی تلاش میں باہر نکلے جا رہے تھے، ایک زمانہ تک سیلون انکی کشش کا مرکز بنا ہوا تھا، اور جب سنہ ۱۸۵۲ء میں نشیبی برما کا الحاق ہوگیا تو یہاں ہند کے مزدور پیشہ آدمیوں کی

بہت مانگ ہوگئی تھی' ان صورتوں کے علاوہ ترک وطن کی ایک صورت غلاموں کی بر آمد کی بھی تھی' جو کم از کم سولھویں صدی سے جاری تھی' ہند کے تاجر ان غلاموں کو ساحل سمندر پر لاتے تھے اور وہاں سے انکو مختلف ممالک کے جہازوں میں روانہ کردیتے تھے' ولندیزی یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں غلاموں کی تجارت وسیع پیمانہ پر جاری تھی' مگر بار بار کے قحط کی بناء پر غلاموں کی تجارت تقریباً بند ہوگئی تھی سنہ ۱۷۸۹ع میں کارنوالیس نے ایک حکم جاری کیا تھا کہ آئندہ سے کمپنی کے علاقہ سے کوئی غلام باہر نہ بھیجا جائے اس حکم کے باوجود ایک زمانہ تک فرانسیسی بندرگاہوں سے ان کو باہر بھیجا جاتا رہا' یہانتک کہ اسکی جگہ ایک نیا طریقہ جاری ہوا جسکو انگریزی میں Indentured Emigration (ترک وطن با قرار نامہ) کہا جاتا ہے .

انیسویں صدی کی ابتدا میں جب غلامی کو بتدریج منسوخ کردیا گیا تو دنیا کے مختلف حصوں میں آزاد مزدورں کی مانگ بڑھ گئی' اب دنیا کے لوگوں کی توجہ قدرتی طور پر اہل ہند کی طرف منعطف ہوگئی تھی - وہ لوگ جو پہلے غلاموں کا بیوپار کرتے تھے' اب مزدوروں کی بھرتی کرنے کیلئے تیار ہوگئے' ہر ایک مزدور کو اپنا سفر خرچ لیکر ایک مقررہ مدت تک کام کرنے کا عہد کرنا پڑتا تھا' اس میعاد کے ختم ہونے کے بعد وہ اپنے وطن کو واپس ہونے کا پورا حق رکھتا تھا' چنانچہ موریشیس' نٹال' برطانوی گیانا' ٹرینی داد' اور دوسرے جزیروں میں جو ہندی باشندے پائے جاتے ہیں ان میں سے اکثر اسی قسم کے بھرتی کیے ہوے ہندی مزدور ہیں' نتائج کے لحاظ سے یہ نیا طریقہ غلام بنانے سے کچھ الگ نہیں تھا' بھرتی کرنے والوں کو خوب روپیہ ملتا تھا' اور وہ بھولے بھالے مردوں اور عورتوں کو پھسلاکر اور طرح طرح کے سبز باغ دکھاکر اور انہیں کچھ روپیہ بطور قرض دیکر انہیں ساحل سمندر تک کھینچ لاتے تھے' اور یہاں بدیسی کارندے پہلے ہی سے جہاز لیے

تیار رہتے تھے ، اور جیسے ہی یہ مزدور پہنچتے وہ فوراً ان کو لیکر وہاں سے چلدیتے ، اس سے ان کارندوں کو بھی کافی آمدنی ہوجاتی تھی ، البتہ اس کا ایک بہتر پہلو یہ تھا کہ زاید آبادی کو باہر جاکر کام کرنے کا ایک اچھا موقع مل گیا ، ان لوگوں نے باہر جاکر خوب کمایا اور بڑی دولت حاصل کی - اگر وہ گھر ہی پر رہتے تو شاید اتنا کبھی نہیں کماسکتے تھے ، حکومت ہند اس طریقہ کی خرابیوں کو دور کرنے کی بڑی کوشش کرتی رہی ، اس کے باوجود پوری انیسویں صدی میں مزدوروں کے اس طرح بھگاکر لیجانے کا طریقہ برابر جاری رہا ۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ طریقہ غلامی سے تو بہتر ہی تھا ۔ مگر نتایج کے لحاظ سے یہ کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں تھا ۔

بہر حال لوگوں کی ہند میں در آمد یا اس سے ان کی بر آمد کچھ اتنے وسیع پیمانہ پر نہیں تھی کہ آبادی کے مسئلہ پر اس کا کچھ اثر پڑسکے ، قانونی حکومت کے تحت رہ کر زاید آبادی کے روزگار کا واحد ذریعہ زراعت ہی تھا ، جولاھوں ، کاریگروں اور سپاھیوں کو بھی کاشتکاری کا پیشہ اختیار کرنا پڑا تھا ، کیونکہ اب اس ملک میں ان کی کوئی مانگ نہیں تھی ، وہ لوگ جو اب تک لوٹ مار پر گزارہ کرتے تھے ، قانونی حکومت کی وجہ سے کاشتکاری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے ، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کے حاصل کرنے کیلئے لوگوں کے درمیان ایک کشمکش شروع ہوگئی ، اس سے پہلے ہند والوں کو کبھی اس قسم کے مسئلہ سے سابقہ نہیں پڑا تھا ، بہت سے لوگ زیادہ لگان ادا کرنے پر آمادہ ہوگئے ، اس لئے زمیندار پرانے کاشتکاروں کو بے دخل کرکے نئے لوگوں کو اپنی زمینیں دینے لگے ، اس کی وجہ سے کاشتکارانہ نظام زراعت کو بہت بڑا خطرہ پیدا ہوگیا تھا ، سب سے پہلے یہ خطرہ بنگال میں نمودار ہوا ، اور اس کے بعد بتدریج اس کے آثار شمالی ہند کے مختلف مقامات میں ظاہر ہونے لگے ، چنانچہ سنہ ۱۸۵۹ء کے قانون کی

روسے اس خطرہ کو دور کرنے کی کوشش کی گئی اور زمینداروں کو اپنے پرانے کاشتکاروں کے بے دخل کرنے اور بلا وجہ زمین کا لگان بڑھانے سے روک دیا گیا ۔

اس دور میں جس کے متعلق ہم یہاں تبصرہ کر رہے ہیں اس کشمکش کی ابتدا ہوی جو اب تک ختم نہیں ہوسکی ' یعنی دیہاتی لوگوں کو اس پر آمادہ کیا جاتا تھا کہ وہ تنگ خیالی کو چھوڑکر وسعت نظر اختیار کریں ہم اس کشمکش کی رفتار کا ایک مجمل خاکہ بھی پیش، نہیں کرسکتے ' کیونکہ پہلا قانون عام تھا اور اس کے بعد ہر ایک صوبہ کیلئے ایک علحدہ قانون منظور ہوا ' جس میں مقامی حالات کے مطابق مفید فرق پایا جاتا تھا ' لیکن عام طور پر جب وقتاً فوقتاً قانون سے بچنے کی تدبیریں کی جاتی تھیں تو ان کو روکنے کیلئے اور زیادہ سخت قوانین نافذ کیے جاتے تھے ' جس کی وجہ سے حکومت پر بڑا بوجھ پڑتا گیا ' اس کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کے آخر میں اگر ایک طرف قیمتیں بہت زیادہ بڑھتی رہیں تو دوسری طرف لگان اپنی جگہ پر قایم رہا ۔ اس میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوا اور اس طرح کاشتکاروں کو لگان کی وہ زاید رقم ملنے لگی جو سرکاری مداخلت کے نہ ہونے کی صورت میں زمینداروں کو مل سکتی تھی ' اس جگہ اس بات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے کہ یہ کاشتکار اس زاید آمدنی کو کس مصرف میں خرچ کرتے تھے ' البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض نے اس سے فائدہ اٹھاکر بہت سی نئی جائدادیں خریدلی تھیں ' اور بعض نے اپنی زندگی کا معیار کچھ بڑھا لیا تھا ' بعض اس کو جمع کرکے رکھنے لگے تھے اور بعض شادی بیاہ اور موت کی غیر منفعت بخش رسموں میں اس کو صرف کرنے لگے تھے بعض نے اس کے ذریعہ اپنے لئے مہلت اور آرام خرید لیا تھا ' حقیقت تو یہ ہے کہ قیمتوں کی تدریجی ترقی سے ان کے پاس اتنی رقم جمع ہوگئی تھی کہ غیر متوقع تنگی کے زمانہ میں بھی ان کی ساری مشکلات حل ہوجاسکتی تھیں ۔

مہلت اور آرام کے خریدنے کے متعلق یہاں کچھ تشریح کرنی لازمی ہے ، اکثر موقعوں پر کاشتکار اپنی پوری یا بعض زمینوں کی دوسروں سے کاشت کراتے تھے اور ان سے اس وقت کا پورا لگان وصول کرتے تھے ، اور یہ لگان اس مقررہ لگان سے یقیناً زیادہ ہوتا تھا ، جو ان کی طرف سے زمینداروں کو ادا کیا جاتا تھا اس طرح جو حصہ بچتا تھا اس پر ان کی زندگی بسر ہوتی تھی ، اس طریقہ کے جاری ہونے کی وجہ سے پرانی خرابیاں نئی شکلوں میں ظاہر ہونے لگیں ، قانون ساز جو اب تک زمینداروں کے خلاف کاشتکاروں کی حفاظت کا بیڑا اٹھائے ہوے تھے ، مجبوراً کاشتکاروں کے خلاف ماتحت کاشتکاروں کو بچانے کیلئے نئے نئے قوانین نافذ کرنے لگے ، اس کی وجہ سے قوانین بہت ہی پیچیدہ اور سخت ہوتے چلے گئے ، حالانکہ لوگوں کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوے قوانین کو جہاں تک ہوسکے آسان ہونا چاہئے تھا .

ہم نے اب تک ان کاشتکاروں کا تذکرہ کیا ہے جو اپنا لگان زمینداروں کو ادا کرتے تھے ، جنوبی ہند کے اکثر کاشتکار حکومت کو براہ راست اپنا لگان ادا کرتے تھے ، اس لحاظ سے لگان کی ایک بڑی رقم ان کو حاصل ہوتی تھی ، کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے سرکار کی طرف سے ان پر معمولی لگان عاید کیا گیا تھا ، اور اس زمانہ میں بھی جب کہ چیزوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں ، اس لگان کی مقدار میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی ، اس کے معنی یہ تھے کہ قیمتوں کے بڑھنے کی وجہ سے جو زاید رقم حاصل ہوتی تھی اس کے حقدار کاشتکار ہی ہوتے تھے ، اس طرح شمالی ہند کی بنسبت جنوبی ہند کے کاشتکاروں کو اس بات کا زیادہ موقع ملا کہ دوسروں سے اپنی زمینوں کی کاشت کرواکے ان سے اس وقت کا پورا لگان وصول کریں اس حیثیت سے بعض بڑے کاشتکار معمولی قسم کے زمیندار بن گئے ، ان کی زندگی اسی زاید رقم پر بسر ہوتی تھی ، جو انہیں ماتحت کاشتکاروں سے حاصل ہوتی تھی .

جنوبی ہند ہی میں سب سے پہلے زراعتی قرضوں کے لینے کی ضرورت پڑی، یوں تو ہر جگہ کاشتکاروں کو پیسہ کی ضرورت ہوتی ہے، مگر ہند نے اندر ان کو روپیہ دینے والا عموماً سودخوار مہاجن یا تاجر ہوتا تھا، ہم کو یہ کچھ نہیں معلوم ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں ان مہاجنوں کا کاروبار کس طرح ہوتا تھا، لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں زمینوں سے زیادہ لگان وصول کیا جاتا تھا، اس لیے ان میں پیسہ لگانا کسی طرح سے پسند نہیں کیا جاتا ہوگا، اس کے علاوہ مالگذاری کے افسر ہر معاملہ میں قرضخواہوں کی بجائے کاشتکاروں اور کسانوں ہی کی تائید کرتے تھے، ان اقتصادی تبدیلیوں کی بناء پر جن کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے، زمینوں میں روپیہ لگانا بہت ہی نفع بخش ثابت ہو رہا تھا، اس کے علاوہ نئی عدالتوں میں کسی ایک خاص گروہ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کی جاتی تھی بلکہ لکھی ہوی شہادتوں پر فیصلہ دیا جاتا تھا، بہت ہی کم کاشتکاروں کو اس کا حق حاصل تھا کہ وہ اپنی زمینوں کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کریں یا رہن رکھیں، اس کے باوجود جنوبی اور شمالی ہند دونوں جگہ بیچنے اور رہن رکھنے کا دستور عام ہوگیا تھا، وہ مہاجن جو اب تک شخصی ذمہ داری پر زیادہ شرح سود کے ساتھ لوگوں کو قرض دیتے تھے بڑی خوشی سے زمین کی ضمانت پر قرض دینے لگے، لیکن یہ مہاجن اکثر جھوٹے دستاویز لکھتے تھے اور ان پڑھ کاشتکاروں سے دستخط لے لیتے تھے، اور جب عدالتوں نے ان دستاویزوں کی بناء پر اپنے فیصلے دینے شروع کیے تو قدرتی طور پر کاشتکاروں میں برھمی پیدا ہوگئی، بعض جگہوں پر مہاجنوں اور کاشتکاروں کے درمیان سخت قسم کے دنگے اور فساد بھی ہوگئے، بمبئی کے بعض علاقوں میں اس قسم کے کچھ فسادات ہوے، تو مقامی حکومت نے سنہ ۱۸۷۹ء میں ایک قانون جاری کیا، اس سے کاشتکاروں کے قرضوں کا مسئلہ پورے

طور پر حل نہیں ہوسکا ' اس کا پورا حل کہیں بیسویں صدی میں جاکر ہوا ۔

بڑے بڑے زمیندار اور کاشتکار جو قرض لینے کی طرف مائل تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اپنی زراعت کو کچھ ترقی دینا چاھتے تھے ' بلکہ وہ ذاتی اخراجات کے لئے روپیہ مانگتے تھے ' قانونی حکومت کے قایم ہوجانے کے بعد قبایلی سرداروں اور خوش قسمت سپاھیوں کے لئے جن کی تربیت ' طاقت هی حق ہے ' کے اصول پر ہوی تھی یہ آسان نہیں تھا کہ امن اور اطمینان کے ساتھ کسی ایک جگہ بس جائیں اور اپنی جاگیروں کا بہترین طور پر انتظام کریں اور کاشتکاروں کی بھلائی اور امداد کریں اور برے وقتوں کے لئے کچھ روپیہ جمع کرکے رکھ چھوڑیں ' ناعاقبت اندیشی اور فضول خرچی تو ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی ' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سب کی جائدادیں مہاجنوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں ' ان مہاجنوں کو ان جائدادوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا وہ تو ان سے صرف روپیہ کمانا چاھتے تھے ' اس لیے اس کو روکنے کیلئے حکومت اس قسم کے ناعاقبت اندیش زمینداروں اور کاشتکاروں کو عدالت محافظان Court of wards کے ماتحت لانے پر مجبور ہوگئی ' اس ادارے کا ابتدائی مقصد نابالغوں اور گوشہ نشین عورتوں کے حقوق کی حفاظت تھا ' اکثر موقعوں پر اس ادارے نے جائدادوں کا اس طرح انتظام کیا کہ ان کی آمدنی سے تمام قرضے ادا ہوگئے ' اور ہند کے بڑے بڑے خاندان تباہ ہونے سے بچ گئے ۔

قرضوں کے علاوہ کاشتکاروں کی زندگی کا ایک برا پہلو یہ تھا کہ ان کی وفات کے بعد ان کی زمینیں ان کے بچوں میں بٹتی چلی جاتی تھیں ' ہند میں اس قسم کا کوئی قانون نہیں تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد بڑا بیٹا اس کی جائداد کا مالک ہو ' ہندو اور مسلم قانون کے مطابق کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی جائداد اس کے وارثوں میں تقسیم ہوجاتی تھی '

مغلوں کے زمانے میں ایک خاندان کے افراد بڑی بڑی جائدادوں کے مالک ہوسکتے تھے ، مگر جب تمام سرسبز و شاداب زمینوں پر لوگوں کا قبضہ ہوگیا تو زاید آبادی کیلئے زرخیز زمینوں کا ملنا بہت دشوار ہوگیا ، اس لئے موجودہ زمینوں ہی کی تقسیم در تقسیم ہوتی رہی ، یہاں تک کہ ایک چھوٹے سے خطہ زمین پر کئی آدمیوں کی زندگی منحصر ہوگئی ، اور پھر ان کی تعداد برابر بڑھتی رہی ، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ زمینوں کی آمدنی ان کے مالکوں کے اخراجات کیلئے کافی نہیں ہوتی تھی ۔ لوگ مجبور ہوکر قرض لینے لگے ، اور جب اس طرف سے بھی نا امیدی ہوگئی تو ان کے سامنے صرف دو صورتیں تھیں ، یا تو محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالیں یا چوری اور ڈاکے پر اپنی زندگی بسر کریں ۔

اس دور کی دیہاتی زندگی کے دو تاریک پہلو یہی تھے کہ کاشتکار بہت زیادہ مقروض اور ان کی جائدادیں بٹتی ہوی چلی جا رہی تھیں ، زراعت کے علاوہ روزگار کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں پیدا ہو رہا تھا ، سائنس کی مدد سے پیداوار کو بڑھانے کا مسئلہ ابھی تک غور و فکر کی حد تک تھا ، اس سلسلہ میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا ، انیسویں صدی کے آخر میں کاشتکاروں کے فائدہ کی صرف یہی ایک چیز تھی کہ چیزوں کی قیمتیں بڑھ رہی تھیں ، اس کے دوسرے معنی یہ تھے کہ اب ان کو لگان کی ادائیگی کے لئے پیداوار کا پہلے سے کم حصہ فروخت کرنا پڑتا تھا اور باقی دوسرے اخراجات کیلئے کام آسکتا تھا ۔

کاشتکاروں کے بعد ان مزارعین (Plantefs) کا ذکر ضروری ہے جو مزدوروں کے ذریعہ ایک بڑے پیمانے پر مختلف زمینوں کے اندر مختلف چیزوں کی کاشت کراتے تھے ، اس کیلئے بعض وقت کوئی تجارتی کوٹھی یا کمپنی قایم کی جاتی تھی ، مزارعین کی کاشت کا یہ رقبہ مجموعی کاشت کا خیال کرتے کچھ زیادہ نہیں تھا مگر اس سے بہت بڑے اقتصادی اور سماجی نتائج پیدا

ہوے ' اس دور میں جس کے متعلق ہم تبصرہ کر رہے ہیں ' صرف چاے اور کافی کی کاشت کرائی جانے لگی تھی ' چاے کی پہلی کاشت سنہ ۱۸۵۰ع کے بعد اسام میں کی گئی ' اور چند دنوں کے بعد دوسری جگہوں پر بھی اس کی کاشت کی جانے لگی ' سنہ ۱۸٦۰ع میں ساٹھ سے زیادہ چاے کی کھیت تیار ہوچکے تھے ' سنہ ۱۸۸۰ع میں ہند کی بر آمدی اشیاء میں چاے ایک اہم چیز تھی ' اور اب تک اس کی اہمیت قایم ہے ' اس کی کاشت میں تمام تر یوروپین لوگوں کا سرمایہ لگایا گیا تھا ' اور اس کی کاشت زیادہ تر ان زمینوں پر کی جانے لگی جو اس وقت بنجر پڑی ہوی تھیں ' اس کا انتظام بھی یوروپین لوگوں ہی کے ہاتھ میں تھا ' بعض جگہ مزدوروں کی بڑی مانگ تھی اس لئے ان کو باہر سے لایا گیا ' اس کی وجہ سے ملک کے اقتصادی ذرایع کو بڑی ترقی ہوی اور لوگوں کی آمدنی میں بہت بڑا اضافہ ہوا .

جنوبی ہند میں ایک زمانہ سے کافی کی کاشت ہوتی تھی ' مگر صرف سنہ ۱۸٦۰ع ہی کے بعد سے اس کی وسیع پیمانہ پر کاشت ہونے لگی تھی چند سال کے اندر اس کی اہمیت چاے کے برابر ہوگئی تھی لیکن جب دوسرے ملکوں میں بھی اس کی کاشت کی جانے لگی ' تو یہاں اسکی اہمیت کچھ کم ہوگئی ' چاے اور کافی کے علاوہ ایک تیسری اہم چیز نیل کی کاشت تھی ' ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ نیل کا مال جزائر غرب الہند (West Indies) سے سنہ ۱٦٦۰ع ہی کے بعد سے یوروپ کے بازاروں میں آنے لگا تھا ' ایک سو سال بعد ان جزیروں میں نیل کی بجاے دوسری اہم چیزونکی کاشت ہونے لگی تھی اسلیے کمپنی نے اسکو ہند سے حاصل کرکے یوروپ روانہ کرنیکا انتظام کیا تھا ' اسکی کاشت پہلے پہل بنگال میں شروع ہوی ' پھر اور آگے مغربی مقامات میں بھی اسکو بویا جانے لگا ' ابتدا

میں نیل کا کاروبار صرف یوروپین لوگ کرتے تھے، مگر وہ خود اسکی کاشت نہیں کرتے تھے، بلکہ کاشتکاروں کو کچھ پیشگی رقم دیکر اسکی کاشت کرواتے تھے، اور فصل کاٹنے کے بعد اس کو خرید لیا کرتے تھے۔

سترھویں صدی میں جب کمپنی نے نیل کا کاروبار شروع کیا تو عام طور پر ھند میں یہی طریقہ جاری تھا، یعنی کاشتکاروں کو پیشگی روپیہ دیکر ان سے نیل کی کاشت کے متعلق ایک معاھدہ لیا جاتا تھا، جس کی روسے وہ پیداوار کی قیمت سے بھی کچھ کم قیمت پر نیل کمپنی کے حوالے کرنے پر مجبور تھے، چونکہ کاشتکاروں پر کمپنی کا بہت سا قرضہ چڑھا ہوا ھوتا تھا، اس لیے عملا وہ ان کے زر خرید غلام ھوگئے تھے، مالکان کمپنی جو کچھ کہتے تھے وہ اسیکے مطابق عمل کرتے تھے، اتنے ھی رقبہ کی وہ کاشت کرتے تھے جتنا کہ ان کو حکم دیا جاتا تھا، اور جو کچھ بھی وہ قیمت پیش کرتے تھے اسکو وہ بلاچوں و چرا قبول کرلیتے تھے، بعض وقت تو یہ مزارعین عمدا کاشتکاروں کو قرضہ دیتے تھے، تاکہ ان پر زیادہ سے زیادہ قابو حاصل رھے اور اپنی مرضی کے مطابق ان سے کاشت کروائی جائے اور اسکے دام دئے جائیں اور خوب نفع کمایا جائے، بنگال کے اندر بہت سے یوروپین مزارعین کا یہی طرز عمل رھا، اور جب سنہ ۱۸٦۰م میں انھوں نے کاشتکاروں کو دوسری زیادہ فائدہ مند چیزوں کی کاشت کو چھوڑ کر نیل کے اگانے پر مجبور کیا تو کئی جگہ فسادات شروع ھوگئے، اور اخباروں نے بھی نسلی اور قومی جذبات کو بھڑکانا شروع کیا، چند سال بعد بہار اور بنارس میں بھی اسی قسم کے مگر کم شدت کے فسادات ھوے، بنگال، بہار اور بنارس میں نیل کی کاشت کرانے والے مزارعین تمام تر یوروپین تھے، مگر دھلی کے قریب اسکی کاشت ھندی سرمایہ داروں کے ذریعہ ھوتی تھی، اور جب کوئلہ سے نیل کا رنگ تیار کیا جانے لگا تو تجارتی حیثیت سے نیل کی کاشت کی اب کوئی اھمیت نہیں رھی۔

اس کے بعد مزدوروں کا مسئلہ آتا ھے ، مغلوں کے زمانہ میں شہروں اور بندرگاھوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو حسب دستور نقد مزدوری دی جاتی تھی ، اور یہ مزدوری اتنی ہوتی تھی کہ اس سے بمشکل ان کی عام ضروریات زندگی پوری ہوتی تھیں ، اور جب کبھی چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا تو ان کی مزدوری کو بھی عارضی طور پر بڑھانا پڑتا تھا ریلوں ، کانوں اور کارخانوں کے قایم ہونے کے بعد حالات میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی ، مزدوروں کی مانگ برابر بڑھتی جا رہی تھی ، چنانچہ اب خود مزدوروں کے اندر رقابت شروع ہوگئی ، پہلے پہل شہروں کے اندر مزدوروں کی اجرت بڑھنے لگی تھی ، کیونکہ دیہاتوں کے مزدور آزاد نہیں تھے ، وہ کسی ایک دولتمند کا کام کرنے پر مجبور تھے ، اور اسکی ملازمت کو چھوڑکر کسی اور جگہ نہیں جاسکتے تھے ، اور اس کے بدلے ان کو کھانے کیلئے غلہ مل جاتا تھا اور اس کے علاوہ مختلف تقریبوں میں کچھ انعام و اکرام حاصل ہوجاتا تھا ، اگر ان سب کو ملایا جاے تو اتنا ہوتا تھا کہ ان کی اور ان کے خاندان کی زندگی بمشکل گذر سکتی تھی ، پہلے پہل دیہاتیوں کی توجہ کارخانوں کی طرف منعطف نہیں ہوی تھی ، البتہ ریلوں اور کانوں میں کام کرنے کیلئے اطراف کے قریوں سے لوگ کھنچے چلے آرہے تھے ۔ اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا دور افتادہ مقامات کے دیہاتی بھی کارخانوں کانوں اور چاے کے کھیتوں میں پہنچنے لگے جہاں ان کو نسبۃً زیادہ مزدوری مل رہی تھی ، اس کی وجہ سے دیہاتوں میں بتدریج انقلاب ہونے لگا تھا زمینداروں اور کاشتکاروں کو اس خیال ہی سے غصہ آنے لگا تھا کہ ان کے مزدور کسی اور جگہ جاکر کام کریں ، وہ جہانتک ہوسکا معمولی مزدوری دینے ہی پر تلے رہے ، لیکن جب مزدوریوں میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا تو ان کو مجبوراً کچھ مزید چیزوں کا بھی سامان کرنا پڑا انہوں نے کہیں تو کچھ پیسے بڑھا دئے اور کہیں ایک دو وقت کی خوراک کا انتظام کیا اور کہیں تمباکو نوشی یا اسی قسم کی دوسری چیزیں پیش کیں اسطرح مزدوروں کی

تحریک ترقی کرتی گئی یہانتک کہ آئندہ چلکر اس کے بڑے بڑے نتائج پیدا ہوے ۔

ہمارا یہ اقتصادی تبصرہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم اس دور کے ان اونچے اور متوسط طبقوں کے حالات زندگی کا ایک جائزہ نہ لیں، جن کی زندگی حکومت وقت کی امداد و اعانت کی محتاج نہیں تھی، اس قسم کی تبدیلی زیر تبصرہ دور کی بجاے اس پوری صدی میں جاری رہی مغلوں کے زمانہ میں اونچے طبقوں کی زندگی شاہی عطیوں اور جاگیروں پر منحصر تھی، جو قلم کی ایک جنبش سے ان کو حاصل ہوجاتی تھیں، اکثر پیشہ ور اپنی روزی کیلئے نہیں تو بھی کم از کم اپنی فارغ البالی اور آسودگی کیلئے شاہانہ سرپرستی کے متوقع ہوتے تھے، اور اس زمانہ میں مذہبی پیشواؤں، تاجروں اور سرمایہ داروں کے سوا متوسط طبقہ کا کوئی وجود نہیں تھا، کمپنی کی حکومت کے زمانہ میں زمینداروں نے اونچے طبقے کی حیثیت حاصل کرلی تھی، اور متوسط طبقہ میں چھوٹے زمیندار، بڑے تاجر، کارخانہ دار اور پیشہ ور شامل تھے ۔

زمینداروں کی عام حالت تو بالکل واضح ہے، مگر اس جگہ اس خاص سبب کو بتانا ہے جس کی وجہ سے بنگال میں متوسط طبقہ کی کثرت ہوگئی یہ حالت صرف اسی صوبہ کے ساتھ خاص ہے ۔ کسی دوسرے صوبہ میں یہ کیفیت نہیں پائی جاتی، ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ بنگال کے اندر زمینوں کا دوامی لگان مقرر کر دیا گیا تھا، اگر پیداوار میں اضافہ ہو تو اس کے حقدار یہی زمیندار ہی ہوتے تھے، اس اضافہ کے حاصل کرنے کی غرض سے بہت سے زمیندار اپنی زمینیں دوسروں کو اجارہ پر دے دیتے تھے اور پیشگی رقمیں وصول کرلیتے تھے، مقامی تاجر اپنی تجارت کو چھوڑ کر دوسروں سے زمینیں لیکر اجارہ پر کاشت کرنے لگے، اس سے ان کی مالی حالت بہت اچھی ہوگئی، مگر جب آبادی بہت بڑھ گئی اور چیزوں کی قیمتوں میں بھی

غیر معمولی اضافہ ہوگیا تو اجارہ پر لی ہوی زمینوں کی یہ آمد ایک آسودہ حال خاندان کے لئے کافی نہیں ہوتی تھی ' اس لیے نوجوانوں کو روزگار کے دوسرے ذرایع تلاش کرنے پڑے ' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متوسط طبقہ کے اندر بے روزگاری بہت زیادہ ہوگئی اور دوسری جگہوں کی بہ نسبت یہ مسئلہ ابھی تک بنگال کے اندر بہت ہی پیچیدہ ہے ۔

دو کے سوا باقی پیشوں کو دھیرے دھیرے فروغ ہوا ' وہ باشندگان ہند جنہوں نے ڈاکٹری ' یا انجینیرنگ یا معماری میں کوئی سند حاصل کی ' عموماً سرکاری ملازمت میں داخل ہوگئے ' بڑے بڑے شہروں کے علاوہ دوسری جگہوں پر خانگی طبیب اور ڈاکٹر بہت کم دکھائی دیتے تھے ' تعلیم کی اشاعت کی وجہ سے ہر جگہ اساتذہ کی مانگ بڑھ گئی تھی ' اسی طرح وکیلوں کی تعداد میں بھی بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا ' جہاں کہیں کوئی عدالت ہوتی تھی وہاں وکیل بھی پائے جاتے تھے ' پرانے زمانہ میں جیسا کہ ہم نے چھتیسویں باب میں بیان کیا ہے ' قانون دانوں کا کوئی وجود نہیں تھا ' جب وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں کمپنی کے ماتحت عدالتیں قایم ہویں تو ہند کے لوگ بھی اس پیشہ کو اختیار کرنے لگے ' ابتدا میں ان کو وکیل کہا جاتا تھا * یہ لوگ ان اشخاص کی طرف سے عدالت میں پیش ہوتے تھے جو انہیں کچھ معاوضہ دے سکتے تھے ' ان لوگوں کو قانون کی ادنی معلومات ہوتی تھیں ' وہ مقدمات کو بہترین انداز میں نہیں پیش کرسکتے تھے ' اس لیے سنہ ۱۷۹۳ع میں بنگال اور مدراس کے لئے اور کچھ دن بعد بمبئی کے لئے یہ قانون بنانا پڑا کہ آئندہ سے عدالتوں میں باقاعدہ قانون دان کام کریں ' اس وقت سے لیکر اس پیشہ کو بڑی اہمیت ہوگئی '

---

* ہند میں ابتداء قانون دانوں کو وکیل کہا جاتا تھا ' جسکے لغوی معنی نایندے کے ہیں ' قانون دان کیلئے اس لفظ کا خاص طور پر استعمال انیسویں صدی کے دوران میں ہوا ہے ۔

بعد کے قوانین کے ذریعہ اسکا منصب اور مرتبہ متعین کیا گیا ' اس زمانہ میں جسکے متعلق ہم یہاں تبصرہ کر رہے ہیں ' سرکاری ملازموں اور تاجروں کے علاوہ ہند کے بہترین دماغ اس پیشہ کی طرف بہت مائل تھے .

قانون دانی کے پیشہ کی ترقی کے تین بڑے سبب تھے پہلا سبب تو یہ تھا کہ ملک میں واقعۃ قانون دانوں کی بڑی مانگ تھی ' ہند کے اکثر باشندے میدان جنگ میں نہیں تو کم از کم عدالتوں میں مقابلہ کے جوہر دکھانا چاہتے تھے ' اس پیشہ سے تمام و کلاء کو نہیں تو کم از کم بڑے قانون دانوں کو کافی آمدنی ہوتی تھی ' عدالتوں کی کثرت پیچیدہ اور ضخیم ضابطۂ قوانین ' تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی ' اور ملک کی عام آسودہ حالی ' یہ سب کچھ ایسے اسباب تھے کہ لوگ آپس میں لڑنے بھڑنے لگے ' اور اس طرح مقدمہ بازیوں کے کثیر مواقع پیدا ہونے لگے دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ اہل ہند فطری طور پر اس پیشہ کی طرف مائل تھے ' ان کو پہلے ہی سے انہ مسائل کی تحقیق اور تدقیق کا ذوق تھا ' وہ کسی ٹھوس کام کرنے کی بجائے لفاظی اور چرب زبانی کو پسند کرتے تھے ' اور سائنس یا تجارت اور صنعت و حرفت کی تعلیم حاصل کرنے کی بجائے وہ علم قانون میں کمال حاصل کرنے کے شیدائی تھے ' تیسرا بڑا سبب یہ تھا ' کہ اس کے سوا دوسرے پیشوں سے کوئی بڑی آمدنی حاصل نہیں ہوسکتی تھی ' اس زمانہ میں استادوں اور اخبار نویسوں کو معمولی تنخواہیں ملتی تھیں ' خانگی طبیب اور ڈاکٹر بمشکل اپنی روزی پیدا کرسکتے تھے ' انجینیروں اور معماروں کی اس وقت کوئی بڑی مانگ نہیں تھی ' نئے کارخانے تمام تر یوروپین لوگوں کے ہاتھ میں تھے ' تجارت پر ایک خاص طبقہ کا قبضہ تھا ' بری یا بحری فوج کی ملازمت انہیں پسند نہیں تھی ' ایسے نوجوان کو جو کسی کی امداد و اعانت یا اعلی سرکاری ملازمت کے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں

هوسکتا تھا ' اور جس میں اپنے لئے کوئی نیا راستہ تلاش کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی صرف دو ہی راستے تھے ' یا تو کم تنخواہ لیکر منشی گری کرے ' یا قانون پڑھکر خوب کمائے ' ان دونوں میں سے کسی ایک راستہ کو اختیار کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا ' اس کا نتیجہ اس کے اسباب سے بھی زیادہ اہم ثابت ہوا تمام برطانوی صوبوں میں قابل آدمیوں کی ایک بڑی جماعت تیار ہوگئی ' جو مفاد کے لحاظ سے آپس میں متحد تھی اور تقریری اور تحریری زبان میں ماہر تھی اور جس کو انگریزی قانون دانوں کا آزاد جذبہ ورثہ میں ملا تھا ' اور جنہوں نے ہند کی ہر ایک عدالت عالیہ میں اپنے پیشہ کے معیار کو بہت بلند بنائے رکھا تھا ' یہی جماعت تھی جس نے آگے چلکر اہل ہند کو سیاسیات سے روشناس کرایا ۔

باب ۴۵

ثقافتی ترقیاں

سنہ ۱۸۶۰ع تا سنہ ۱۸۸۰ع

ثقافتی حیثیت سے اس دور کی ایک اہم خصوصیت قومی اتحاد کی ترقی ہے ، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ڈلہوزی کے زمانۂ حکومت میں مشترک جذبات کا پایا جانا بہت دشوار تھا ، سنہ ۱۸۸۰ع کے قریب پڑھے لکھے لوگوں میں ایک مشترک جذبہ پیدا ہوگیا تھا ، اور وہ اس کے اظہار کا ذریعہ تلاش کر رہے تھے ، یہ ترقی ایک بڑی حد تک حکومت کی سر گرمیوں کا ایک ضمنی نتیجہ تھی ، ریلوں ، ڈاکخانوں اور تار برقی کی ایجاد اور ترقی سے اس قومی اتحاد کی ترقی میں بڑی مدد ملی ، اب حکومت کو کسی خاص صوبہ کی بجاے پورے ہند کے معاملات کا لحاظ کرنا پڑا ، اور سب کیلئے ایک عام قانون بنانے کی حاجت ہوی ، جو اس دور کی ایک بڑی خصوصیت ہے ، جب پورے ہند کی حکومت کا نظم و نسق ایک قسم کا ہوگیا تو اس کا اثر لوگوں پر بھی پڑا اور پڑھے لکھے نوجوانوں میں اتحاد اور یگانگت کا جذبہ پیدا ہوگیا ، سب سے زیادہ اہم انگریزی تعلیم کی اشاعت تھی ، جس کا انتظام سنہ ۱۸۵۴ع کے مراسلہ کے مطابق کیا گیا تھا ، اس موقعہ پر ہم کو وہ بات بھولنی نہیں چاھئے جس کو ہم نے پہلے باب میں بیان کیا ہے یعنی اس ملک کی تاریخ میں افتراق کے کھلے ہوے رجحانات کے ساتھ ساتھ اتحاد اور میل ملاپ کا اندرونی جذبہ بھی کام کرتا رہا ہے ، اگر نظم و نسق کی یگانگت کا یہ طریقہ پورے یوروپ کے لئے استعمال کیا جاتا تو شاید وہاں اتحاد کا یہ جذبہ نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس سے مختلف اقوام کے مقامی اور افتراقی احساسات کو بڑی تقویت پہنچتی ، مگر ہند کی حالت یوروپ سے بالکل مختلف تھی ، یہاں

اتحاد کا جذبہ پہلے ہی سے کام کر رہا تھا ، اور جب حالات زیادہ سازگار ہوگئے تو اس جذبہ کو اور ترقی ہوی ، اور لوگوں میں اس کا شعور بھی پیدا ہوگیا ، اور اتحاد پیدا کرنے والے رشتوں پر بحث ہوتی تھی اور اس کے حصول کے ذرایع سوچے جاتے تھے ، افتراق کے جذبات اگرچہ بالکلیہ ختم نہیں ہوگئے تھے ، مگر نسبتہ دھیمے پڑگئے ، اور ان کی اہمیت کم ہوگئی .

یہ دور جس کے متعلق ہم یہاں تبصرہ کر رہے ہیں ہند کے ضابطہ ہاے قوانین کا ایک سنہرا دور تھا ، اس سلسلہ میں مکالے اور اس کے ساتھیوں کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ضابطہ ہاے دیوانی و فوجداری ، قانون شہادت اور دوسرے بہت سے قوانین تیار ہوے ، جن میں قانون تعزیرات ہند Indian Penal Code دنیا بھر کے تمام قوانین میں سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے ، جج ، میجسٹریٹ اور قانون‌دان سب کے سب اب ایک ہی قانون کی پیروی کرنے لگے تھے ہر ایک صوبہ کے وکیل کلکتہ ، بمبئی ، مدراس اور الہ‌آباد کی بڑی عدالتوں کے فیصلوں کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے ، اور جب کسی قانون کی تعبیر میں اختلاف ہوتا تو پریوی کونسل کی جوڈیشیل کمیٹی اس اختلاف کو رفع کرنے کی کوشش کرتی تھی ، اب قانونی حکومت کے یہ معنے تھے کہ صوبہ‌واری قوانین کی بجاے ایک عام قانون کے مطابق حکومت کی جاے .

حکومت کی سرگرمیوں سے بھی اسی قسم کے نتائج پیدا ہوے ، مرکزی حکومت میں قابل اور پر جوش آدمیوں کی کمی نہیں تھی ، وہ تمام کاموں کو بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام دینے کا پکا ارادہ رکھتے تھے ، ایک صوبہ کے نظم و نسق کا دوسرے صوبہ کے نظم و نسق سے مقابلہ کیا جاتا تھا اور جو طریقہ بھی بہتر اور مفید معلوم ہوتا اس کو اختیار کیا جاتا تھا ، اور دوسروں کو بھی اس کے اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی ، اس طرح نظم و نسق کی یگانگت کا نظریہ بڑی تیزی کے ساتھ

پھیلتا گیا یہاں تک کہ اس کی حیثیت ایک اصول کی سی ہوگئی ، اس یگانگت کا لوگوں پر بڑا اچھا اثر پڑا ، اس اصول کی پابندی سے ضرورت سے زیادہ مرکزیت پیدا ہوگئی جو آگے چلکر ایک زبردست برائی ثابت ہوئی لیکن اس کا ایک فوری اثر یہ ہوا کہ افسروں اور منشیوں میں جو مرکز کی طرف سے جاری ہونے والے ترقی پذیر انتظامی ضابطوں ، حکومت کی پالیسی بنانے والی تجویزوں اور دوسری دستاویزوں کو کام میں لارہے تھے ہند کی یگانگت کا نظریہ بہت مقبول ہوتا گیا ، ججوں اور قانون دانوں کی طرح یہ بھی ہند کو ایک واحد ملک سمجھنے لگے تھے ، اس کے علاوہ اخبار نویسوں نے سرکاری قوانین کو اپنے اخباروں میں چھاپنا شروع کیا جس کی وجہ سے اتحاد کے جذبات اخبار بین حضرات کے دلوں میں اثر کرتے گئے ، اور بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام پڑھے لکھے لوگوں پر قومی اتحاد ہی کا نظریہ زیادہ اثر کرتا جا رہا تھا اس کے مخالف صرف قدامت پسند تاجر تھے ، جن کو اخباروں کے ساتھ کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی ۔

سنہ ۱۸۵۴ع کی مقرر کی ہوئی تعلیمی پالیسی کی بڑی سختی سے پیروی کی جانے لگی اور اسکولوں اور کالجوں کی تعداد دن بدن بڑھتی گئی ، ان کا تعلیمی نصاب انگریزی مضامین پر مشتمل تھا ، اور وقتاً فوقتاً یونیورسٹی ان کی تجویز و تعیین کرتی تھی ، تمام طلبہ کا امتحان لینا بھی اسی یونیورسٹی کا کام تھا ، یہاں بھی یگانگت اور اتحاد کا نظریہ کام کر رہا تھا ، تمام شمالی ہند کیلئے کلکتہ یونیورسٹی معیار بنی ہوئی تھی ، اسی طرح مدراس اور بمبئی جنوبی ہند کیلئے ایک نظیر بن گئے تھے ، ابتدا میں نصاب تعلیم کے اندر سائنس کے مضامین کو شامل نہیں کیا گیا تھا ، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی ، کیونکہ سنہ ۱۸۶۰ع میں خود انگلستان کے اسکولوں اور کالجوں میں سائنس کی تعلیم کا کوئی باقاعدہ بندوبست نہیں تھا ، اگر کسی جگہ اس کا شعبہ کھولا بھی گیا تو ضروری آلات کا فراہم کرنا اتنا گراں ہوتا

تھا کہ اس کی وجہ سے اس کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جاسکتا تھا ، اس کے علاوہ اس زمانہ میں ہند کی صنعت و حرفت میں سائنس کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی ، اب ایلزبتھ سے لیکر وکٹوریہ تک کی انگریزی تاریخ اور شکسپیر اور ملٹن سے لیکر ورڈسورتھ اور ٹینی سن تک کا انگریزی ادب اپنے اندر قومی اتحاد اور یگانگت کا کچھ کم اثر نہیں رکھتا تھا ، اس کے علاوہ ابتدائی انگریز معلم ، جنہوں نے ہندی طالب علموں کو خاص انگریزی لب و لہجہ اور آداب سے آشنا کیا ، حب وطن اور آزادی کے جذبہ سے سر شار تھے ، عہد وکٹوریہ کے انگریزوں کی ایک خاص خصوصیت یہی انکا حب وطن اور جذبہ آزادی تھا ، ہندی طالب علموں پر ان کا اثر پڑنا لازمی تھا ، چنانچہ ہند کی نئی نسل نے بھی ان ہی لوگوں کے ماحول میں نشو و نما پائی تھی .

یونیورسٹیوں کو اس زمانہ میں کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی تھی ، انکی آمدنی کا واحد ذریعہ امتحانوں کی فیس تھی ، اس لئے انکا مقصد یہ تھا کہ اعلی قسم کے تعلیمیافتہ افراد پیدا کرنے کی بجائے کثیر تعداد میں طلب علم پیدا کریں ، کیونکہ بازار میں معمولی گرایجویٹوں اور اعلی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا ، اور ملازمت کے حاصل کرنے کیلئے صرف گرایجویٹ کا ہونا کافی تھا اس سے آگے آنرز یا ڈاکٹریٹ کی ڈگری کی طرف بہت کم طالب علموں کی توجہ ہوتی تھی ہند کی یونیورسٹیوں میں ایک نسل بعد مزید تعلیم کے حاصل کرنے کا ذوق نوجوانوں میں پیدا ہوا ، لیکن ایک معمولی گرایجویٹ بھی قوم کیلئے بہت مفید تھا ، اس میں اتنی صلاحیتیں پیدا ہوجاتی تھیں کہ وہ اپنے دیس کیلئے حقیقی طور پر کام آسکتا تھا .

اسی زمانہ میں ہند کے چند طالب علم خاص پیشوں کی تعلیم کے حاصل کرنے یا ہند کی سیول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کیلئے انگلستان جانے لگے تھے ، لیکن اس میں چند بڑی رکاوٹیں تھیں ، سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ خرچ بہت

زیادہ ہوتا تھا ' اسکے علاوہ اس زمانہ میں سماج کی پابندیاں کچھ ایسی تھیں کہ اگر کوئی ہندو سمندر پار کا سفر کر آتا تو اسکو ذات سے باہر کر دیا جاتا تھا ' اور پھر اسی وقت شامل کیا جاتا جبکہ صرف کثیر کے بعد چند خاص رسموں کو انجام دیں ' اور یہ رسمیں بعض وقت بڑی مکروہ ہوتی تھیں ' یہ نہیں معلوم کہ یہ سماجی پابندی کب سے شروع ہوی ' انڈو چینا ' جاوا اور دوسرے مقامات کے ابتدائی تمدن میں اسکا کوئی سراغ نہیں ملتا ' گیارھویں صدی کے افسانوی ادب سے پتہ چلتا ھے کہ اعلی ذات کے ہندو عام طور پر سمندر کا سفر کرتے تھے ' سترھویں صدی میں بحری سفر شاذ و نادر ہو چلا تھا اور سنہ ۱۸۰۰ع کے بعد سے تو یہ بالکل ہی بند ہو گیا تھا انیسویں صدی کے خاتمہ تک اس پابندی کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا ' مگر اب یہ پابندی بالکل ہی ٹوٹ چکی ھے ' لیکن اس زمانہ میں جس کے متعلق ہم یہاں تذکرہ کر رہے ہیں ' سختی کے ساتھ اس قانون کی پابندی کی جاتی تھی ' اسلیے غیر معمولی جرات اور کردار ہی کے نوجوان انگلستان جاسکتے تھے ' انکی تعداد بہت ہی مختصر تھی ' اول اول آکسفورڈ ' کیمبرج اور لندن کی چار قانونی انجمنوں میں داخلہ کی انکو اجازت نہیں تھی کیونکہ پرانے قانون کے مطابق یہاں انگریزی کلیسا کے پیرو ہونے کی شرط لگی ہوی تھی ' اس لیے ہند کے طالب علم لندن اور اسکاٹلینڈ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے ' جہاں اس قسم کی پابندی عاید نہیں کی گئی تھی مگر سنہ ۱۸۵۰ع کے قریب اس پرانے قانون میں ترمیم کی گئی اور اسکے بعد سے ہند کے طالب علموں کو مذکورۂ بالا اداروں میں داخل ہونے کی اجازت ملی ' ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ نگلستان جانے والے ہندی طالب علموں کی تعداد بہت کم تھی ' مگر ان میں سے اکثر کامیاب ہوکر اپنے وطن لوٹے اور آگے چلکر انہوں نے قومی زندگی کو ترقی دینے میں ایک نمایاں حصہ لیا .

سنہ ۱۸۵۴ع کے تعلیمی مراسلہ میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ ابتدائی تعلیم کا انتظام مادری زبان میں اور اعلی تعلیم

کا انتظام انگریزی میں کیا جاے ' مالی مشکلات کے باوجود مفصلات میں ایک حد تک کامیابی ہوی اور بہت سے اسکول قایم ہوگئے ' مگر دیہات میں جہاں روپیہ پیسہ کی بڑی کھینچ تھی ' تعلیم کو بہت کم ترقی ہوی ' کاشتکاروں کو انگریزی تعلیم سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی ' ان میں سے اکثر اس کے مخالف تھے ' اس طرح اس زمانہ میں کاشتکاروں کی جو نئی نسل نکلی وہ بالکل ان پڑھ اور جاہل تھی ' یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا ' کیونکہ اب تک ابتدائی تعلیم کا کوئی خاص نصاب تیار نہیں ہوا تھا ' جو کاشتکاروں کے مزاج کے مطابق اور ان کے مناسب ہو ' لیکن مفصلات میں کاشتکاروں کے بچے پڑھ لکھ کر دفتروں کے منشی اور شہری زندگی کے دلدادہ ہوگئے .

تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ شہروں میں مادری زبانوں کے اندر نثر نگاری کو بڑی ترقی ہوی ' اور عوام کی ضروریات زندگی کے مطابق کتابیں لکھی جانے لگیں ' ابتدا میں اعلی نثر ادبی زبانوں کے الفاظ اور محاوروں سے پر ہوتی تھی ' چنانچہ اردو میں عربی اور فارسی الفاظ اور محاوروں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا ' اسی طرح ہند کی دوسری زبانوں میں سنسکرت الفاظ اور محاوروں کی بہتات تھی ' معمولی پڑھے لکھے لوگ ان زبانوں کو پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر تھے ' لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ' زبان بھی بالکل سہل اور قابل فہم ہوتی گئی ' دقیق اور بھاری اور نامانوس الفاظ کا استعمال کم ہوتا گیا ' اور عام فہم لفظ استعمال کیے جانے لگے ' اکثر مصنف انگریزی زبان سے واقف ہے ' اس لئے نثر کی مختلف قسموں پر اس کا براہ راست اثر پڑرہا تھا ' خاص کر افسانہ نگاری اور ناول نویسی میں انگریزی ہی کی تقلید کی گئی تھی جو ہر قسم کے خیالات کے اظہار کا بہترین آلہ تھی ' اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مادری زبانوں کو انگریزی ہی کی بدولت اتنی ترقی ملی کہ آج جدید تعلیم ان کے ذریعہ دی جاسکتی ہے .

اس زمانہ کا ادبی سرمایہ کیفیت کے لحاظ سے مختلف تھا ' ادبی شاہکار بہت کم تھے ' مگر زبان بہت شستہ اور پاکیزہ تھی جس کے پڑھنے سے بڑا ہی لطف آنے لگتا ہے ' اس سے اس زمانہ کا ذوق معلوم کیا جاسکتا ہے ' لیکن دوسرے فنون میں کوئی کمال نہیں پیدا کیا گیا تھا ۔ مصوری سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی ' صرف چند مصور عامی مرکزوں سے بہت دور پرانی روایات کے زندہ کرنے میں مصروف تھے ۔ بت تراشی اور نقاشی کا فن ابھی تک زندہ تھا ' مگر اس کے مجسموں اور یادگاروں کی مانگ اہل انگلستان کی طرف سے ہوتی تھی ' کمپنی کے زمانہ میں عمارتیں محض افادی غرض سے تیار کی جاتی تھیں ۔ ان کے بنانے والے معمولی معماروں کی بجائے انجینیر تھے ' اس زمانہ کی اکثر بڑی بڑی عمارتیں مغربی طرز پر بنائی گئی تھیں ' ان سے اس زمانہ کا انگریزی مذاق جھلکتا ہے ' ان میں سے بعض عمارتیں بہت ہی شاندار اور آرام دہ ہیں ان پر ہندی فن تعمیر کے اثرات نہیں پائے جاتے ' بعض دیسی حکمرانوں نے بھی اسی طرز کی عمارتیں تیار کیں ' اس کے باوجود انگریز معمار ہندی اور مشرقی جذبات سے بھی آشنا ہوتے جا رہے تھے ' چنانچہ حال میں جو عمارتیں تیار کی گئی ہیں ان میں ہندی جذبات کا پورا اثر پایا جاتا ہے ۔

اسی زمانہ سے قدیم یادگار عمارتوں کے تحفظ کا اہتمام شروع ہوا ' ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو پرانی عمارتوں کے قایم رکھنے کی طرف کوئی رغبت نہیں تھی ' وہ تو پرانی عمارتوں کی مرمت کرنے کی بجائے نئی عمارتوں کے بنانے کو ترجیح دیتے تھے ' انہیں مذہب کی شان اسی میں نظر آتی تھی کہ نئی شاندار عمارتیں تیار کی جائیں ' پرانی عمارتیں یا تو برباد ہوجاتی تھیں ' یا ان کا ملبہ دوسری نئی عمارتوں میں استعمال کرلیا جاتا تھا ' کمپنی کے زمانہ میں بھی جب کہ افادیت کا جذبہ لوگوں پر غالب تھا ' ان کے تحفظ کی کوئی خاص کوشش نہیں کی

گئی، ان کے خیال کے مطابق ایک پرانی یادگار عمارت محض چونا چڑھا کر مسافر خانہ بنائی جاسکتی تھی۔ لارڈ منٹو نے ان کے تحفظ کی قابل قدر کوششیں کیں، اور مناسب تدبیریں اختیار کیں، لیکن اس سلسلہ میں سب سے پہلے باقاعدہ اور موثر قدم سنہ ۱۸۶۰ء میں اٹھایا گیا جب کہ آثار قدیمہ کا ایک ناظر Archaeological Surveyor مقرر کیا گیا پھر دس سال بعد آثار قدیمہ کا ایک مستقل محکمہ قایم کیا گیا، جس کے بعد سے یادداشتوں اور یادگاروں کی حفاظت کا کام بڑی تیزی سے انجام دیا جانے لگا۔

قومی اتحاد کی تدبیروں سے افتراق کے جذبات کا بالکل ہی قلع قمع نہیں ہوا، ہر ایک علاقہ میں وطنی اور فرقہ وارانہ جذبات کام کر رہے تھے، اس کی وجہ سے آگندہ چلکر وہ نازک حالات پیدا ہوے جن کا حل کرنا پردیسیوں کے لئے بہت ہی مشکل اور پیچیدہ ثابت ہوا۔ ایک مشہور اخبار کے الفاظ کے مطابق اس وقت ہند میں صرف ہندی قوم ہی نہیں تھی، بلکہ بہت سی قومیں بھی تھیں جو ہندی قوم ہی کا ایک حصہ تھیں، جیسے سکھ، بنگالی، مرہٹے وغیرہ، ان میں سے ہر ایک قوم اپنے کو الگ اور ممتاز قوم تصور کرتی تھی، اور ان کے درمیان کبھی کبھی جھگڑے اور فساد ہو جاتے تھے، مگر ان کے ان فرقہ وارانہ جذبات کا اظہار اس صدی کے آخر میں ہوا، اس زمانہ میں جس کے متعلق ہم یہاں تبصرہ کر رہے ہیں، یہ جذبات صرف تحریک ہی کی حد تک تھے، ان کا اثر خاص طور پر ہند کے دو بڑے مذہب کے پیرووں پر پڑا۔

مسلمانوں میں سید احمد خاں جیسا ایک زبردست رہبر پیدا ہوا، جنہوں نے چند سال تک جج کی خدمت انجام دینے کے بعد اپنی باقی ساری زندگی اپنے ہم مذہبوں کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی، وہ مذہب ہی کے دائرہ میں رہ کر اپنی قوم کی سماجی خرابیوں کو دور کرنا چاہتے تھے، انہوں نے

مغربی تعلیم کے حاصل کرنے کی پرزور حمایت کی تاکہ مسلمان
دنیے ہند میں اپنی ٹھیک جگہ لے سکیں ، مسلمانوں نے ان کی
سخت مخالفت کی ، اس کے باوجود انہوں نے اپنے کام کو جاری
رکھا ، اور جب سر سید کی حیثیت سے ان کا انتقال ہوا تو ان
کا مقصد زندگی ایک بڑی حد تک حاصل ہوچکا تھا ، اسلام کو
ایک نئی نظر سے جانچا جانے لگا تھا ، انکی زندہ یادگار علیگڈھ
کا مشہور کالج ہے جس کی بنیاد سنہ ۱۸۷۵ء میں ڈالی گئی تھی ،
آگے چلکر یہی کالج مسلم یونیورسٹی بن گیا ، یہ کالج دوسرے
انگریزی کالجوں سے بالکل مختلف تھا ، یہاں انگریزی تعلیم کے
ساتھ ساتھ مذہبی اصول کے مطابق اخلاقی تربیت کا بھی انتظام
کیا گیا تھا ، سنہ ۱۸۸۰ء کے بعد سے اس کالج کے سند یافتہ
سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے لگے تھے ان میں ذہنی اور
دماغی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بلند اخلاق اور کاموں کا عملی
تجربہ بھی پایا جاتا تھا .

ہندوؤں میں کشب چندر سین جیسا زبردست رہنما پیدا
ہوا جس نے برہمو سماج میں ایک نئی روح پھونکی اور سنہ
۱۸۶۰ء سے لیکر اپنی وفات سنہ ۱۸۸۴ء تک ایسا عمدہ کام کیا
کہ ملک کے ہر ایک گوشہ میں برہمو سماج کی ایک ایک
شاخ قایم ہوگئی ، اس کی کوششوں سے ہندو سماج کی بہت
سی خرابیاں دور ہوئیں ، اس نے شخصی مذہب کو زیادہ ترقی
دی ، اس پر چیتنیا یا اس سے بھی بڑھکر عیسائیوں کا اثر
معلوم ہوتا ہے ، اس زمانہ میں اس مسلک کے پیرووں کی تعداد
میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہورہا تھا ، مگر مضبوط عقیدے
اور کردار کے لوگ اس میں شامل ہورہے تھے ، ہندی معاشرت
اور خیالات پر اس کا بالواسطہ اثر پڑرہا تھا اس تحریک کے
پیچھے چند ایسی طاقتیں تھیں ، جن کو ہندوؤں کے پرانے رسوم
سے بڑی نفرت تھی ، یہ لوگ ہندوانہ رسوم کو تو ترک کرچکے
تھے اور ان کا انکار کرتے تھے ، مگر ان کی جگہ پر کوئی بہترین

بدل نہیں پیش کرسکے ' خاص کر کلکتہ کے علمی حلقوں میں ثبوتیت پسند Positivists اور لا ادری Agnostics لوگ بہت زیادہ پائے جاتے تھے .

اں کے برخلاف ہندووں میں بعض لوگ ایسے بھی تھے ' جو پرانے مذہب اور رسوم کی پوری حمایت کررہے تھے اور مخالفین کے تمام اعتراضات کا جواب دے رہے تھے ' اور بعض ایسے تھے جو مذہب کی اچھی اچھی چیزوں کو اختیار کرلیتے تھے اور باقی کا انکار کردیتے تھے ۔ پہلی جماعت کا سر گروہ مشہور رام کرشن تھا ' جس نے سنہ ۱۸۷۰ع کے بعد سے یہ کہنا شروع کیا کہ تمام مذاہب سچے یا کم از کم اچھے ہیں ' لوگوں کو چاھئے کہ اپنے اپنے مذہب کی پیروی کریں ' اور ہندووں کیلئے سب سے بہتر مذہب ہندومت ھی ھے ' اس نقطہ خیال کے حامیوں کی خصوصیات کو یہاں بیان کرنا بہت مشکل ھے ' تاھم یہ بات یاد رکھنی چاھئے کہ ان کی کوششوں سے ہندومت کا وقار پھر سے قایم ھوگیا ' اورنگ زیب کے زمانہ میں اس کا وقار بہت گھٹ گیا تھا اور اٹھارویں صدی کی طوایف الملوکی کے زمانہ میں خود ہندووں کو اپنے مذہب کی طرف توجہ نہیں رھی تھی ' انیسویں صدی میں عیسائی مشنریوں نے اس پر حملے شروع کردئے تھے اب اس مذہب کے پیرووں نے ان کا جواب دینا شروع کیا ' ان کا دعوی یہ تھا کہ ہندومت دنیا کا ایک زندہ مذہب ھے ۔ اور وہ ایک خدا کی پرستش کی تعلیم دیتا ھے ' ان کے نزدیک آبائی رسوم ' بتوں کی پرستش اور ان پر بھینٹ چڑھانا مذہب کے خلاف نہیں تھا ' ان کے خیال کے مطابق یہ در حقیقت عوام کی پرستش کا ایک ذریعہ تھا .

دوسرے نقطہ خیال کا حامی دیانند تھا ' جس نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی ' کئی سال تک وہ جوگی رہ چکا تھا ' اس نے سنہ ۱۸۶۸ع سے اپنے خاص خیالات کی تبلیغ شروع کی ' اس کا نظریہ یہ تھا

کہ وید کی پرانی کتابیں ہی مذہب کا اصل ماخذ ہیں ، اس نے ان کتابوں کی اس طرح تشریح کرنی شروع کی کہ کٹر ہندو اور مغربی محققین دونوں اس کی تشریحات سے سخت اختلاف کرنے لگے ، اس نے ہندومت کی بعض خاص تعلیمات کو اختیار کرلیا جیسے ایک خدا کی پرستش اور کرما کا عقیدہ وغیرہ ، اور دوسری باتوں کے ماننے سے سخت انکار کردیا ، وہ برہمنوں کی برتری اور ذات پات کی موجودہ قابل اعتراض تقسیم کو نہیں مانتا تھا ، وہ سماجی اور اخلاقی اصلاحات پر بہت زور دیتا تھا ، اور لوگوں کو بہتر اور اعلی تعلیم کے حاصل کرنے کی ترغیب دیتا تھا ، اس کا اصرار تھا کہ خاندان میں عورت کی صحیح حیثیت کو تسلیم کیا جائے ، اس کی تعلیمات میں باطنیت کی بجائے آزاد خیالی کی جھلک پائی جاتی ہے ، اس نے اپنے مخالفین پر اس سختی سے حملے شروع کیے کہ ہندوؤں ، سکھوں ، جینیوں ، مسلمانوں اور عیسائیوں نے اسی سختی کے ساتھ اس کا جواب دینا شروع کیا ، دیانند کی تحریک ابتدا ہی سے بالکل فوجی رنگ اختیار کرچکی تھی ، سنہ ۱۸۷۵ء میں بمبئی کے اندر آریہ سماج کی بنیاد رکھی گئی ، مگر اس کو سب سے بڑی کامیابی پنجاب میں حاصل ہوی اور لاہور اس تحریک کا صدر مقام تھا ، دیانند کی وفات کے بعد بھی اس کی یہ تحریک جاری رہی اور شمالی ہند میں قومی اور فوجی دونوں جذبوں کے ساتھ اس کی تبلیغ ہوتی رہی .

اس طرح اس دور میں اگر ایک طرف تعلیم یافتہ جماعتوں میں قومیت کا نظریہ ترقی کرتا رہا تو دوسری طرف مختلف فرقے اور جماعتیں اپنی جداگانہ حیثیت کو بر قرار رکھنے کی کوششوں میں لگی ہوی تھیں ، خاص طور پر مذہبی معاملات میں ان کی ایک دوسرے سے ٹکر ہوتی رہتی تھی ، اب ہم اس موضوع کو چھوڑکر سرکاری ملازمتوں کا کچھ حال لکھنا چاہتے ہیں - یہ دور درحقیقت سرکاری ملازمتوں کا ایک عبوری دور تھا ، اس میں ان ملازمتوں کا سوال کچھ زیادہ اہم نہیں تھا ، تعلیم یافتہ

لوگوں کو عموماً سرکاری نوکریاں مل جاتی تھیں ' لیکن جب ایک زمانہ گزرگیا تو مختلف فرقے اور قومیں اپنی مردم شماری کے تناسب کے مطابق ملازمتوں کا مطالبہ کرنے لگیں ' مغلوں کے زمانہ میں سرکاری ملازمتیں ہی تعلیم یافتہ جماعتوں کی ایک بڑی آبادی کا ذریعہ معاش تھیں ' اعلی طبقے کے لوگ ایسے عہدوں پر فائز ہوتے تھے جن کو فوجی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے ' کمپنی کے ابتدائی زمانہ حکومت میں تمام تعلیمیافتہ نوجوانوں کو سرکاری ملازمتیں مل جاتی تھیں ' کارنوالیس نے اعلی عہدوں پر انگریزوں کو مقرر کرنا شروع کیا ' غدر کے بعد اہل ہند نے بھی اعلی عہدوں کا مطالبہ کرنا شروع کیا .

اس زمانہ میں فوجی ملازمتوں کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی ' کمپنی کے زمانۂ حکومت میں فوجی ملازمتوں کو دیوانی ملازمتوں سے بالکل الگ کردیا گیا تھا ' تعلیم یافتہ نوجوانوں کو فوج کی ملازمت سے زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی ' کیونکہ اس وقت تک قومی فوج کا احساس پیدا نہیں ہوا تھا ' یہ درحقیقت موجودہ دور کی ایک نمایاں خصوصیت ہے ' دیوانی ملازمتوں میں ان کا مقابلہ پہلے پہل ہند کی سیول سروس والوں سے تھا ' جو سنہ ۱۷۹۳ع سے حکومت کے تمام بڑے عہدوں پر قابض ہوگئے تھے ' کمپنی کے زمانۂ حکومت میں نظماء کمپنی اپنے نمائندوں کو ان عہدوں پر نامزد کرتے تھے . سنہ ۱۸۳۳ع کے قانون منشور کے ذریعہ امتحان مقابلہ کے جاری کرنے کی کوشش کی گئی ' مگر نظماء کمپنی کی مخالفت کی وجہ سے ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوی ' کیونکہ قانون میں اس بات کی تو گنجایش رکھی گئی تھی کہ ہند کے کسی باشندے کو کمپنی کی ملازمت کے دینے سے انکار نہیں کیا جائیگا مگر ہند کی سیول سروس میں داخل ہونے کی کوئی صورت پیدا نہیں کی گئی تھی حالانکہ بڑے عہدوں کے حاصل کرنے کے لئے سیول سروس میں داخل ہونا ضروری تھا ' پہلے پہل ہندیوں کو محض اقتصادی اسباب کی بناء پر بڑی ملازمتیں

دی جانے لگیں ' عدالتوں میں کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ انگریز جج اور میجسٹریٹ اس کو پورا نہیں کرسکتے تھے ' مجبوراً ہند کے باشندوں کو بھی بڑی ملازمتیں دی جانے لگیں ' لیکن ان کی حیثیت ماتحت ملازموں کی تھی ۔

سنہ ۱۸۵۳ع کے قانون منشور کے ذریعہ سیول سروس کے امتحانات مقابلہ کا طریقہ جاری کیا گیا ' یہ امتحانات سیول سروس کمشنر کی طرف سے لندن میں لئے جاتے تھے ' اس وقت ھیلی بری کالج بند کردیا گیا تھا ' اور اس کی جگہ انگلستان کی کسی ایک یونیورسٹی میں ایک مقررہ مدت کے گذارنے کی شرط لگائی گئی تھی ' سنہ ۱۸۵۸ع کے شاہی فرمان کے ذریعہ ھند کے باشندوں کو بھی ان امتحانات میں شریک ھونے کی اجازت دی گئی ' اس فرمان کا ایک مشہور فقرہ یہ تھا '' ھماری رعایا کا ھر ایک فرد خواہ وہ کسی مذھب یا قوم سے تعلق رکھتا ھو ' بلا روک ٹوک اور بلا رو رعایت ھماری ملازمت میں داخل کیا جاے ' جس کے فرایض کے ادا کرنے کی وہ اپنی تعلیم ' قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے اپنے اندر اھلیت رکھتا ھو ' مگر اس کا تعلیمی نصاب اس وقت کے انگریزی نصاب تعلیم کے مطابق تجویز کیا گیا تھا ' جس کی وجہ سے ھند والوں کا انگلستان میں رھکر پڑھنا ضروری ھوگیا تھا چند ھی افراد جن میں غیر معمولی ذھانت اور قابلیت تھی اس میں کامیابی حاصل کرسکے مگر جب سنہ ۱۸۶۸ع میں زیادہ سے زیادہ عمر بائیس کی بجاے انیس کردی گئی تو اھل ھند کا داخلہ اور بھی مشکل ھوگیا ' کیونکہ اس کے دوسرے معنی یہ تھے ' کہ یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے طلبہ کی بجاے اسکول میں پڑھنے والے لڑکے اس میں شریک ھوں ' سنہ ۱۸۹۲ع تک اسی قانون پر عمل درآمد ھوتا رھا ' اھل ھند کیلئے اگرچہ دروازہ اب بھی کھلا ھوا تھا ' تاھم انتہائی مدارج کو پہنچنا بہت ھی دشوار تھا ۔

اس درمیان میں وزیر ھند نے ایک دوسرا ذریعہ پیدا کیا اس سلسلہ میں سنہ ۱۸۰۷ع میں ایک ضروری قانون منظور ھوا '

اس پر بڑی لمبی بحثیں ہوئیں ، اور آخرکار ایسے قوانین جاری کیے گئے جن کی روسے ایسے نوجوانوں کی ایک مختصر تعداد کو جو اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہوں اور جو سماجی حیثیت سے بہت بلند ہوں ، اور جن میں ایک حد تک تعلیمی استعداد اور عمدہ قابلیت ہو ، امتحان مقابلہ میں شرکت کرنے کے بغیر اعلیٰ سرکاری نوکری دینے کی اجازت دی گئی ، لیکن ان قوانین کے ماتحت مقرر کئے ہوئے ملازم کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوسکے ، اکثر موقعوں پر ان کو حکومت کا کام سنبھالنا بہت مشکل ہوگیا تھا ، امتحان مقابلہ کے ذریعہ آئے ہوئے ملازموں کے ساتھ وہ برابری نہیں کرسکتے تھے ، چنانچہ صرف چند ہی افراد بڑی خدمتوں پر پہنچ سکے تھے .

فنی ملازمتوں میں داخل ہونے کی شرایط بالکل مختلف تھیں ، طبی صیغہ کے تمام بڑے بڑے عہدوں پر ان لوگوں کا تقرر ہوتا تھا جو انگلستان جاکر امتحان میں کامیاب ہو آئے تھے اس طرح ہند کے چند لوگوں نے بڑے عہدے حاصل کئے تھے ، تعمیرات عامہ کے محکمہ میں ان لوگوں کو چند مقررہ ملازمتیں دی جاتی تھیں جو ہند کے انجینیرنگ کالجوں میں پڑھکر کامیاب ہوتے تھے ، پولیس ، تعلیم اور جنگلات کے محکموں میں اعلیٰ عہدہ دار انگریزھی ہوتے تھے ، اس زمانہ میں ہند کے لوگوں کو ان عہدوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ، وہ تو حکومت میں سے ایک حصہ چاہتے تھے ، یہ خیال کرنا غلط ہے کہ وہ کچھ اقتصادی اسباب کی بناء پر حکومت کے عہدوں پر قابض ہونا چاہتے تھے ، ان سے ان کو ضرور اچھی آمدنی اور بڑا رتبہ ملتا تھا ، تاہم ان کے حصول سے ان کا ایک اور مقصد بھی تھا ، اور وہ یہ کہ اپنی قوم اور اپنے وطن کی کچھ خدمت کریں ، کیونکہ وطن کی محبت کا جذبہ مدتوں سے ان کے دلوں میں کروٹیں لے رہا تھا ، حکومت ہند اور انگلستان کی رائے عامہ نے اس مسئلہ کے خاص پہلو پر کبھی غور و فکر نہیں کیا تھا ، اس میں ^

نہیں کہ حکومت اپنے تمام وعدوں کو بہتر سے بہتر طریقہ پر پورا کرنا چاہتی تھی ، مگر سالہا سال صرف تجاویز کے مرتب کرنے میں لگ جاتے تھے ، ہند کے وہ باشندے جو کچھ کام کرنا چاہتے تھے حکومت کی اس ڈھیل سے بہت بیزار ہوگئے تھے اور آخرکار ان کے دلوں سے ان کا اعتماد ہی جاتا رہا ۔

اس زمانہ میں اعزازی طور پر کام کرنے کے بہت کم مواقع تھے ، البتہ صوبوں کے صدر مقاموں میں جہاں میونسپل کارپوریشن اور میجسٹریٹ کی عدالتیں تھیں ، قومی خدمتگاروں کو اپنی سرگرمی کے دکھانے کا کچھ موقعہ ملتا تھا ، دوسری جگہوں پر جہاں مقامی خود اختیاری حکومتیں Local self Governments قایم تھیں مختلف کمیٹیوں کے اختیارات بہت ہی محدود تھے ، اور مالی امداد کے ذرایع اتنے کم تھے کہ پر جوش اور قابل آدمیوں کو کام کرنے کا کچھ بھی موقعہ نہیں ملتا تھا ، اور وہ موثر طریقہ پر کوئی کام انجام نہیں دے سکتے تھے ۔

اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ غیر معمولی وفاداری کے جذبہ کا اظہار ہے ، اہل ہند ہمیشہ سے اپنے حکمرانوں کے بڑے وفادار رہے ہیں ، اور جب کمپنی کی لا شخصی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تو اس جذبہ کے اظہار میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی ، اس جذبہ کا اظہار نمایاں طور پر اس وقت ہوا جبکہ شہزادۂ ویلس (شاہ ایڈورڈ ہفتم) نے اپنی تشریف آوری سے سنہ ۱۸۷۵ع میں ہند کو زینت بخشی ، اور دوبارہ اس وقت اس جذبہ کا اظہار ہوا جبکہ سنہ ۱۸۷۷ع میں ملکہ وکٹوریہ کے قیصرۂ ہند ہونے کا اعلان کیا گیا ، جسکی تجویز پارلیمنٹ ہی کی طرفسے ہوی تھی ، ملکہ وکٹوریہ نے کبھی اپنی اس نئی سلطنت کو نہیں دیکھا تھا ، مگر اسکے خطوط اس بات کی کافی شہادت دیتے ہیں کہ وہ اس نئی سلطنت کی بڑی خیر خواہ تھی ، تمام لوگ اسکے اس جذبۂ ہمدردی سے خوب واقف تھے اور اسکی قدر بھی کرتے تھے وہ تمام دیہاتوں میں مشہور ہوگئی

تھی ، اسکو انصاف اور خیرخواہی کا مجسمہ خیال کیا جاتا تھا ، اور ہند والے اپنے حکمرانوں سے انھی دو باتوں کی توقع رکھتے ہیں ، اس زمانہ میں اقتدار اعلی کا نظریہ اپنی جگہ پر قایم تھا ، اور حکومت ہند ان ریاستوں کے معاملات میں دخل دیتی تھی ، جنکا نظم و نسق حد سے زیادہ بگڑ چکا تھا ، اس مداخلت سے انکو چاہے کتنا ھی رنج پہنچا ھو مگر قیصرہ ہند کی وفاداری کے جذبہ میں کوئی فرق نہیں آیا ، ہند کی معاشرت میں ملکہ کی محبت ایک اہم جز بن گئی تھی .

باب ۴۶

سرحد اور مالیات

سنہ ۱۸٦۰ تا سنہ ۱۸۸۰

اس باب میں هم اس بات پر بحث کرینگے کہ هند کی خارجی حکمت عملی کا مالیات عامہ پر کیا اثر پڑا ' انگلستان کے ساتھ تار برقی کا سلسلہ قایم هوجانے کی وجہ سے حکومت هند کے تمام شعبوں میں بڑی بنیادی تبدیلیاں هوگئی تھیں ' اور خاص کر سرحد کی پالیسی پر اس کا بڑا اثر پڑا ' اس سے پہلے گورنر جنرل با جلاس کونسل ضرورت کے وقت انگلستان سے مشورہ لیے بغیر بھی احکام جاری کرسکتا تھا ' اکثر نظماء کمپنی کو هند کے خوشگوار یا ناخوشگوار واقعات کی بعد از وقوع اطلاع دی جاتی تھی ' مگر تار برقی کے سلسلہ کے قایم هونے کے بعد انگلستان سے براہ راست فوری احکام کا حاصل کرنا بہت آسان هوگیا ' اس لیے هر ایک معاملہ کا فیصلہ لندن هی میں کیا جاتا تھا ' پارلیمنٹ اکثر بین الاقوامی مسائل کو پیش نظر رکھ کر اپنا فیصلہ دیتی تھی ' اس کا نتیجہ یہ هوا کہ هند کی سرحدوں کا مسئلہ یوروپ کے سیاسی حالات کے مطابق حل کیا جانے لگا .

هند کے مشرق میں بالائی برما کی ریاست تھی ' اس کے ساتھ حکومت هند کے دوستانہ تعلقات قایم تھے ' یہاں تک کہ تھیبا اس ریاست کا حکمران بنا ' وہ انگریزوں کا کھلا هوا دشمن تھا ' چنانچہ سنہ ۱۸۷۹ع میں اس کے دربار سے انگریز ریذیڈنٹ واپس بلا لیا گیا ' مگر دونوں کے درمیان چھ سال بعد جنگ کی ابتدا هوی جب کہ تھیبا نے هند اور برما کے درمیان تجارت کرنے والی ایک کمپنی کے ساتھ کچھ نا انصافیاں کیں اور جب اس کے سامنے آخری شرطیں پیش کی گئیں تو ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا چنانچہ برطانوی فوجیں برما کے پاے تخت میں

گھس گئیں اور چند دن کے اندر تھیبا نے غیر مشروط اطاعت قبول کرلی ۔ اس کے بعد اس سلطنت کا ھند سے الحاق ھوگیا اور برما حکومت ھند کا ایک صوبہ قرار پایا ۔

مغرب میں بلوچستان کا علاقہ تھا ' جس کو باقاعدہ طور پر حکومت ھند میں شامل کرلیا گیا ' یہاں چند ریاستیں تھیں جن کے حکمران مختلف قبایل سے تعلق رکھتے تھے ' ان میں سے بعض کے ساتھ سنہ ۱۸۵۴ء سے حکومت ھند کے دوستانہ تعلقات قایم تھے ' لیکن اکثر ان ریاستوں کے درمیان جھگڑے ھوتے رھتے تھے ' آخرکار میجر (بعد میں سر رابرٹ) سینڈمان Sandeman کی کوششوں سے سنہ ۱۸۷۶ء میں ان کے ساتھ ایک سمجھوتہ کیا گیا جس کی روسے حکومت ھند نے امن و امان کے قایم کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی گورنر جنرل نے سنہ ۱۸۷۷ء میں سینڈمان کو بلوچستان کا ایجنٹ مقرر کیا ' اس نے پندرہ سال تک اپنے فرایض بڑی خوبی کے ساتھ انجام دئے ' اور جب اس کی وفات ھوی ھے تو اس کی غیر معمولی دوربینی ' ذھانت اور چالاکی سے بلوچستان میں پورا امن قایم ھوچکا تھا اور لوگ بہت خوشحال ھوگئے تھے ۔

بلوچستان کی جنگی اھمیت اس وجہ سے تھی کہ دو راستوں میں سے ایک یعنی قندھار اور کوئٹہ کا راستہ اسکے شمال مغربی حصے میں سے ھوکر گذرتا تھا ' اس دور کے ایک بڑے حصہ میں کوئٹہ کا شمالی اور مشرقی علاقہ افغانستان کے قبضے میں تھا ' مگر معاہدہ گندمک کے بعد ' جسکا ذکر آگے آئیگا ' یہ علاقہ حکومت ھند کے حوالے ھوگیا ' اور افغانستان کی جنگ کے ختم ھونے کے بعد گورنر جنرل نے یہاں اپنا ایک ایجنٹ مقرر کیا ' اور جب سنہ ۱۸۷۹ء اور سنہ ۱۸۹۲ء کے درمیان افغانستان کی سرحد تک ریل بن گئی تو قندھار کے مغلوں کے ھاتھ سے جانے کے بعد پہلی مرتبہ حکومت ھند کو اس راستہ پر پورا اقتدار حاصل ھوگیا ۔

هم پہلے بیان کرچکے هیں ' کہ افغانستان کے امیر دوست محمد خان سے اسکے آخری دور حکومت میں کمپنی کے دوستانہ تعلقات قایم هوگئے تھے ' اور جب سنہ ۱۸۲۳ع میں اسکا انتقال هوگیا تو افغانستان میں جانشینی کے جھگڑے شروع هوگئے ' ایک زمانہ تک حکومت هند ان میں دخل دینے سے گریز کرتی رهی مگر آخرکار شیر علی کی طرفداری کی جس کو دوست محمد خان نے اپنا جانشین قرار دیا تھا ' اس نے حکومت هند کی مدد سے اپنے مخالفین کا زور توڑنے کی کوشش کی ' حکومت هند کی حکمت عملی میں یہ تبدیلی اس وجہ سے پیدا هوی کہ شمال میں روس کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا ' حال هی میں بحیرۂ خزر Caspian Sea کی مشرقی خود مختار ریاستوں میں اس کا اقتدار قایم هوچکا تھا ' اور اس علاقہ میں روسی ترکستان کے نام سے سنہ ۱۸٦۷ع میں ایک فوجی حکومت قایم هوگئی تھی ' اس کی سرحد افغانستان کی شمالی سرحد سے ملتی تھی ' اسوقت اس عملی اقدام کو اسطرح پیش کیا جا رها تھا کہ گویا اس سے تہذیب و تمدن کی ترقی مقصود هے ' مگر اصل مقصد یہ تھا کہ مداخلت هند کے خطرہ کو یوروپ کی سیاست میں ایک سیاسی حربہ کے طور پر استعمال کیا جاسکے .

ان حالات میں هند کا مفاد اسی میں تھا کہ افغانستان میں ایک مضبوط اور دوستانہ حکومت هو ' ممکن هے کہ اس زمانہ میں شیر علی کو اسی قسم کا ایک مضبوط حکمران تصور کیا گیا هو ' لیکن خود اس کی حیثیت بہت هی نازک تھی ' سنہ ۱۸۷۳ع میں اس نے حکومت هند سے روس کے خلاف قطعی امداد کا وعدہ کرنے کا مطالبہ کیا ' لارڈ نارتھ بروک جو اس زمانہ میں هند کا وایسرائے تھا ' اس قسم کا وعدہ کرنے کیلئے تیار تھا ' مگر لندن کے حکام نے اس کے اس طرز عمل سے سخت اختلاف کیا اس کا نتیجہ یہ هوا کہ شیرعلی نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ بہترین شرایط پر روس سے مصالحت کرلی جاے اس اثناء میں

لندن کی وزارت بدل گئی ' اور گلیڈسٹون کی جگہ ڈزرائیلی وزیر اعظم ہوا اس کی خارجی حکمت عملی بالکل جداگانہ تھی ' ہند کے خطرہ کا خیال کرکے برطانوی حکومت نے روس کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ شیر علی سے اپنے دوستانہ تعلقات ترک کرلے مگر اس کی یہ کوشش ناکام رہی ' اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ سرحد کے جنگی مورچوں کو مضبوط کیا جائے اور شیر علی پر دباؤ ڈالا جائے تاکہ وہ برطانوی ریذیڈنٹ کو بھی اپنے دربار میں جگہ دے ' اس فیصلہ کی بناء پر لارڈ نارتھ بروک نے اپنے عہدہ سے استعفا پیش کردیا ' اس کی جگہ لارڈ لٹن گورنر جنرل ہوکر آیا جس کو اس فیصلہ پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کی گئی تھی ' اس کے باوجود وہ شیر علی کو دبانے میں ناکام رہا .

یہ ناکامی ایسے وقت پیش آئی جبکہ سنہ ۱۸۷۷ع کے موسم بہار میں انگلستان اور روس کے درمیان جنگ کا چھڑ جانا یقینی نظر آرہا تھا ' لیکن دوسرے ہی سال حالات میں ایسی تبدیلی ہوی کہ برلن کے معاہدہ کے بعد روس کا خطرہ جاتا رہا ' اس وقت جبکہ اس معاہدہ کے متعلق ابھی تک گفت و شنید ہی ہو رہی تھی ' روس کا سفیر کابل پہنچ گیا تھا ' ادھر لٹن نے بھی اصرار کیا کہ برطانوی سفیر بھی وہاں رکھا جائے ' مگر امیر افغانستان نے اس کو اپنے ہاں جگہ دینے سے مطلق انکار کردیا ' اور برطانوی سفیر کو راستہ ہی سے واپس بھیجدیا ' اس اہانت کی بناء پر کابینۂ وزارت انگلستان کی اجازت سے امیر افغانستان کو ایک الٹی میٹم روانہ کیا گیا ' اور جب مقررہ مدت کے اندر اس کا کوئی جواب نہیں آیا تو کابل کے خلاف اعلان جنگ کردیا گیا ' اور اس پر چڑھائی کی گئی ' شیر علی نے روس کے علاقہ میں پناہ لی جہاں اس کا انتقال ہوگیا ' اس کے بعد اس کا بیٹا یعقوب خاں تخت نشین ہوا جس نے مئی سنہ ۱۸۷۹ع میں انگریزوں سے گندمک کا معاہدہ کیا ' اس کی روسے کابل میں برطانوی سفیر

کا رهنا اور وایسرائے کی بتائی هوی خارجی حکمت عملی پر اس کا کاربند هونا لازمی قرار دیا گیا .

اس کے باوجود یعقوب خان میں اتنی طاقت نهیں تھی کہ افغانستان پر اپنی حکومت کو بر قرار رکھ سکے ' چنانچہ ستمبر سنہ ۱۸۷۹ع میں برطنوی سفیر قتل کردیا گیا ' اور ایک مهینہ بعد سر فریڈرک بعد میں لارڈ) رابرڈس نے کابل پر چڑھائی کی اور اس پر قبضہ کرلیا ' اور پھر یعقوب خان کو وظیفہ دیکر ملک کے مستقبل کے متعلق تجویزیں سونچی جاهی رهی تھیں کہ شیر علی کا بھتیجا عبدالرحمن ' جو اب تک روس کے علاقہ میں پناہ گزین تھا ' تخت کا دعویدار بن کر کھڑا هوگیا . لٹن نے عبدالرحمن کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ امیر عبدالرحمن ایک امدادی رقم کے معاوضہ میں اپنے تمام خارجی معاملات کے انتظام کو حکومت هند کے حوالے کرنے پر رضامند هوگیا ' امیر موصوف سے انگریزوں کی گفت و شنید جاری هی تھی کہ شیر علی کے دوسرے لڑکے ایوب خان نے ' جس کا مغربی افغانستان پر قبضہ هوگیا تھا ' قندهار کی انگریزی فوج پر اچانک حملہ کردیا ' اور اس کو میوند کی لڑائی میں زبردست شکست دی ' امیر عبدالرحمن کے احکام سے رابرٹس ایک فوج لیکر کابل سے قندهار کی طرف بڑھا اور ایوب خان کو شکست دی ' اس کے بعد سے سارا ملک امیر عبدالرحمن کا مطیع اور فرمانبردار هوگیا ' یہ شخص دوست محمد کی طرح عزم اور ارادہ کا پکا تھا ' اور بہت هی سخت گیر واقع هوا تھا ' اس نے عمدا روس کو چھوڑکر انگریزوں سے اپنے دوستانہ تعلقات قایم کرایے تھے ' اب انگریزوں کو بجا طور پر یہ امید هوگئی تھی کہ امیر عبدالرحمن کی مضبوط اور دوستانہ حکومت هند کے سرحدی خطرات کے بچاؤ کا باعث هوگی .

هند کی مالیات میں سرحد کے مسئلہ کو بڑی اهمیت حاصل هوگئی تھی ' هند کے میزانیہ میں سرحد کے دفاعی اخراجات کا

سب سے بڑا حصہ ہوتا تھا ' اس وقت تک کمپنی کا مالی نظام کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں تھا ' آمدنی کے وہی ذرایع تھے جو اس سے پہلے پاۓ جاتے تھے ' البتہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق ان میں کچھ رد و بدل کرلیا جاتا تھا کمپنی کی حکومت کے زمانہ میں تمام اخراجات کا حساب ایک تجارتی کمپنی کے حساب کی طرح رکھا جاتا تھا هم پہلے بتا چکے هیں کہ وارن هیسٹنگز قرض لینے سے پرهیز کرتا تھا ' مگر اس کے جانشینوں نے اس کی حکمت عملی کی پیروی نہیں کی اور هند اور انگلستان کے سرمایہ داروں سے قرض لینا شروع کیا ' اور جب غدر کے بعد هند پر شاهان برطانیہ کا براہ راست تسلط قایم هوا تو کمپنی کا قرضہ بھ ان هی کو ادا کرنا پڑا ' اس کی کل رقم ایک سو ملین اسٹرلنگ تھی سنہ ۱۸۵۹ع میں ایک تجربہکار ماهر مالیات کو وایسراے کی مجلس کا رکن بنایا گیا ' اس کے بعد سے میزانیہ اور بندش اور قابو (Budget and control) کا ایک موثر نظام وجود میں آیا ' اور سنہ ۱۸٦۳ع تک میزانیہ میں جمع اور خرچ برابر برابر هوجاتا تھا اس کے بعد سے ملک کی آمدنی اتنی هوتی تھی کہ جنگی مصارف ' قحط زدوں کی امداد ' اور ریلوں اور نہروں کی تعمیر کے سلسلہ میں جو قرضہ لیا جاتا تھا وہ پورا هوجاتا تھا .

پہلے پہل مرکزی حکومت کو مالیات کے تمام ذرایع پر پورا اختیار حاصل تھا اور وهی صوبہ کی حکومتوں کو روپیہ تقسیم کرتی تھی ' مگر سنہ ۱۸۷۰ع کے بعد سے آمدنی کے بعض ذرایع صوبوں کے سپرد کردۓ گئے ' اس کی وجہ سے صوبائی حکومتوں کو اپنے ذرایع آمدنی کے ترقی دینے کا اچھا موقعہ ملا ' هر ایک صوبہ کا میزانیہ الگ الگ تیار هوتا تھا ' جو مرکزی حکومت کے میزانیہ سے بالکل مختلف هوتا تھا ' اس دور کے آخر میں مرکزی اور صوبائی ذرایع سے حاصل کی هوی کل آمدنی پچاس کرو

روپیوں سے کچھ کم ہوتی تھی * اس میں محصول کے ذریعہ سترہ کرور، دوسرے ذرایع سے دس کرور اور لگان سے بائیس کرور روپیہ وصول ہوتا تھا، بعض لگان کو بھی محصول ہی میں شمار کرتے ہیں اور بعض اس کو اس سے الگ تصور کرتے ہیں۔

محصولوں میں سب سے اہم نمک کا محصول تھا، یہ محصول بہت پرانے زمانہ سے وصول کیا جاتا رہا ہے، البتہ اس کی شرح ہر زمانہ میں مختلف ہوتی تھی، اور اس کے وصول کرنے کے طریقوں میں بھی فرق ہوتا تھا، کمپنی کے زمانہ میں بھی اس کی شرح اور اس کے وصول کرنے کے طریقے مختلف تھے، چنانچہ سنہ ۱۸۷۰ع میں مختلف علاقوں میں نمک کے محصول کی شرح مختلف تھی، اور غیر قانونی نمک کی در آمد یا بر آمد کو روکنے کے لئے کانٹوں کی باڑھ بنادی گئی تھی، اس دور کے خاتمہ پر اس فرق کو بھی مٹادیا گیا اور تمام علاقوں میں ایک ہی شرح مقرر کی گئی، جو بالکل کم رکھی گئی تھی، نمک ہی کا ایک محصول ایسا ہے جو رعایا کے تمام افراد سے وصول کیا جاتا ہے آبکاری، چنگی اور اسٹامپ کے محصول کا بوجھ خاص خاص طبقوں پر پڑتا ہے، آبکاری کے محصول کا مقصد آمدنی میں اضافہ کرنے سے زیادہ الکحل اور دوسری نشہ آور چیزوں کے استعمال کو روکنا ہوتا تھا، مگر یہ دونوں باتیں اس سے حاصل نہیں ہوسکیں، سنہ ۱۸۷۵ع میں چنگی کا محصول گھٹا کر دس سے پانچ فیصدی کردیا گیا اور سنہ ۱۸۸۲ع میں آزاد تجارت کے نظریہ کے ماتحت اس کو بالکل ہی منسوخ کردیا گیا تھا، اور یہ پانچ

* ہند کی آمدنی کو اس زمانہ میں اسٹرلنگ کی صورت میں پیش کرنا ٹھیک نہیں ہوگا کیونکہ معیار تبادلہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ مہزادیہ کو کرور کے اعداد میں ظاہر کیا جائے، ایک کرور دس ملین کے برابر ہوتا ہے، اس وقت جبکہ ایک روپیہ دو شلنگ کے برابر ہوتا تھا ایک کرور روپیہ ایک ملین اسٹرلنگ کے برابر ہوتا تھا، اور جب وہ ایک شلنگ چار پنس کے برابر ہوگیا تو ایک کرور روپیہ دو ملین کے برابر ہوتا تھا۔

فیصدی محصول بھی ایک حفاظتی محصول خیال کیا جاتا تھا موجودہ معیار کے لحاظ سے اگر لگان کا حساب نہ کیا جائے تو اس زمانہ میں محصول بہت ہی کم ہوتا تھا ' اب تک آمدنی پر کوئی باقاعدہ محصول عائد نہیں کیا گیا تھا اگرچہ عارضی طور پر اسی قسم کے دوسرے محصول ایک سے زیادہ مرتبہ عاید کیے گئے تھے .

عام محصول کے علاوہ دوسرے ذرایع آمدنی کے متعلق یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ اس وقت قومی املاک اور جائدادیں بالکل ابتدائی حالت میں تھیں ' ریلوں سے بمشکل وہ سود حاصل ہو رہا تھا جو ان کی اصلی لاگت پر ادا کیا جاتا تھا آب پاشی کی نہروں سے اخراجات کے بعد کچھ آمدنی بچ جاتی تھی ' مگر یہ آمدنی بھی کچھ زیادہ نہیں تھی ' اور جنگلات کی باقاعدہ حفاظت سے جس کا سنہ ۱۸۶۰ع کے بعد سے انتظام کیا جانے لگا تھا ' آمدنی کی کچھ صورتیں ابھی پیدا ہو رہی تھیں ' محصول کے علاوہ سب سے بڑی آمدنی افیم کی پیداوار کے اجاروں سے حاصل ہوتی تھی ' پچھلی حکومتوں کی طرح کمپنی نے افیم کی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھی ' کاشتکار کمپنی کے باقاعدہ پروانوں کے حاصل کرنے کے بعد کوکنار کی کاشت کرتے تھے ' اور اس کی پوری پیداوار سرکاری کارخانوں کے حوالے کردیتے تھے ' جہاں افیم تیار کی جاتی تھی ' اور چین اور دوسرے مشرقی ممالک میں فروخت کی جاتی تھی ' اس کی کل آمدنی لگان کی تقریباً آدھی آمدنی کے برابر ہوتی تھی ' اور اس سے اخراجات کے جانے کے بعد اصل نفع نمک کے محصول کے برابر یا اس سے کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا سب سے آخر میں زمین کا لگان تھا ۔ ہم پہلے بتاچکے ہیں کہ کمپنی کی حکومت سے پہلے لگان کی شرح کا ایک معیار مقرر نہیں تھا ' پوری پیداوار کے ایک تہائی حصہ سے لے کر آدھا حصہ تک وصول کرلیا جاتا تھا ' کمپنی کی حکومت کے قایم ہونے کے بعد اصل آمدنی کا آدھا

ہ وصول کیا جانے لگا ' اگر موسم اچھے رہتے تو اس شرح پر سارا لگان پوری پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ وصول ہو جاتا تھا ' مگر جب بارش نہیں ہوتی اور فصلیں خراب ہوجاتیں تو بہت سا لگان معاف کردینا پڑتا تھا ' اس کے علاوہ محصول کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی بھی کم ہو جاتی تھی اور پھر قحط زدوں کی امداد پر الگ روپیہ صرف کرنا پڑتا تھا اس لحاظ سے ہند کا میزانیہ اطمینان بخش نہیں ہوتا تھا کیونکہ جو میزانیہ مارچ میں ٹھیک ہوتا تھا وہ اکتوبر میں ٹھیک نہیں ہوتا تھا مالی نظام کی درستگی موسموں کے اچھے اور برے ہونے پر موقوف تھی.

حکومت کے مصارف میں سب سے زیادہ خرچ فوج کا تھا ' اس پر سولہ اور اٹھارہ کرور کے درمیان روپیہ صرف ہوتا تھا ' پانچ چھ کرور روپیہ قرضہ عامہ میں اٹھ جاتا تھا اور باقی حکومت کے مختلف محکموں پر صرف کیا جاتا تھا ' عام حالات میں سڑکوں کی تعمیر اور دوسرے ایسے رفاہ عام کے کاموں کیلئے جن سے کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا تھا کچھ رقم باقی رہتی تھی قوم کی تعمیر پر بہت کم روپیہ صرف ہوتا تھا ' تعلیم ' طبی امداد ' اور حفظان صحت کیلئے ہند کے میزانیہ میں بہت کم گنجایش ہوتی تھی ' زراعت اور صنعت و حرفت کے محکمے اب تک قایم نہیں ہوے تھے ' آمدنی کا ایک بڑا حصہ عدالتوں ' پولیس اور لگان کے وصول کرنے والوں پر صرف ہوتا تھا.

اس دور کے میزانیہ میں کبھی خسارہ نہیں ہوا ' البتہ آخری سالوں میں جب کہ افغانستان کے ساتھ جنگ چھڑ گئی حکومت کے مصارف بہت بڑھ گئے تھے ' اس کے علاوہ کئی جگہ قحط ہوگیا تھا ' سنہ ۱۸۶۰ ع میں صوبجات شمال مغربی میں بارش بالکل نہیں ہوی تھی ریلوں کے ذریعہ ان کی خوراک کا انتظام کیا گیا تھا جہاں کہیں ریلیں ہوتیں غذا کا سامان آسانی سے بہم پہنچایا جاسکتا تھا ' اور قحط سے فاقہ کشی اور موت کی

نوبت نہیں آتی تھی ' مگر جہاں ریلیں نہیں ہوتیں وہاں غذا کا انتظام کرنا بہت دشوار تھا ' چنانچہ جب سنہ ۱۸۶۶ ع میں اوریسہ اور مشرقی ساحل کے مقامات میں زبردست قحط پڑا تو لوگوں کی کوئی امداد نہیں کی جاسکی ' ان کی امداد کیلئے بہت سا روپیہ منظور کیا گیا تھا ' لیکن یہ امداد بعد از وقت پہنچی ' سنہ ۱۸۶۹ ع میں راجپوتانہ کے اندر قحط پڑا اور بہت سی جانیں ضایع ہوگئیں سنہ ۱۸۷۳ ع میں بہار کی باری تھی ' مگر یہاں لوگوں کی ضرورت سے زیادہ امداد کی گئی سنہ ۱۸۹۶ ع میں جنوبی ہند اور شمالی ہند کے بعض مخصوص علاقوں میں قحط پڑا ' اور بہت سے لوگ فاقہ کشی سے مرگئے اس کے بعد سے بیس سال تک قحط سے نجات مل گئی تھی ' سنہ ۱۹۰۱ ع میں قحط کے متعلق ایک کمیشن مقرر ہوا ' جس نے قحط کے اسباب اور اس کے انسداد کے متعلق اپنی تجویزیں پیش کیں ' ہند کی اقتصادی تاریخ میں یہ در حقیقت ایک اہم واقعہ ہے ' اس کمیشن نے قحط کی پیش بینی اور اس کے انسداد کے متعلق مختلف طریقے بتائے اور لوگوں کی اقتصادی زندگی کو اس حد تک بہتر بنانے کی تجویزیں پیش کیں جن کی مدد سے خشک سالی کے زمانہ میں بھی قحط کو کامیابی کے ساتھ دور کیا جاسکتا ہے .

اس درمیان میں بے سود قرضہ .Unproductive debt بہت بڑھ چکا تھا ' اس کی وجہ یہ تھی کہ افغانستان کی جنگ پر بہت سا روپیہ صرف ہوگیا تھا اور ایک کثیر رقم قحط زدوں کی امداد کیلئے دینی پڑی تھی اس کے ساتھ سودمند قرضہ Productive debt کا بڑی رواج ہو چلا تھا ' ریلوں اور نہروں کی تعمیر میں لگائے ہوے سرمایہ سے کافی آمدنی ہونے والی تھی ' قریب قریب تمام نہریں حکومت کے خرچ سے تیار کی گئی تھیں ' البتہ ریلوں کی تعمیر کے متعلق پالیسی وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی ابتدائی ریلیں لندن کی بعض کمپنیوں کی

طرف سے قایم کی گئی تھیں ' اور حکومت ان کے پورے سرمایہ پر پانچ فیصدی کی ضامن تھی ' اور اگر منافع اس سے زیادہ ہو تو اس کا ایک حصہ حکومت کو چلا جاتا تھا ' اس کو حق تھا کہ چند سال کی مقررہ مدت کے بعد ان کمپنیوں سے ریلوں کا اجارہ واپس لے لے ' اس طریقہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے بہت سا روپیہ فضول خرچ ہوا کیونکہ ان کمپنیوں کو ریلوں کی تعمیر اور اس کے ساز و سامان کے مصارف کے گھٹانے کی طرف کوئی رغبت نہیں تھی ' وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ ہر حالت میں اپنے سرمایہ کا پانچ فیصدی نفع ان کو مل کر ہی رہیگا ' اسی لیے سنہ ۱۸۶۹ع میں یہ قرار پایا کہ آئندہ سے ریلوں کی تعمیر سرکاری خرچ سے کی جائے ' اور اس کے لئے لوگوں سے روپیہ بطور قرض لیا جائے ' اس وقت سے لیکر زیر نظر دور کے خاتمہ تک حکومت ہی ریل کی تعمیر کا کام کرتی رہی ' لیکن اس کی رفتار بہت ہی سست تھی اور کام ضرورت کے مطابق نہیں ہو رہا تھا سنہ ۱۸۸۰ع میں نو ہزار میل سے کچھ کم لمبی ریلوے لائن تیار ہوچکی تھی ' اس سال قحط کے کمیشن نے یہ سفارش کی کہ قحط کے موثر انسداد کیلئے ابھی کم از کم پانچ ہزار میل لمبی ریلوے لائن بنانی چاهئے ' چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ بعض مخصوص ریلوے لائن کمپنیوں کے ذریعے تیار کیے جائیں ' ان کے ساتھ جو شرایط طے ہوے تھے وہ پہلے کی بہ نسبت حکومت کے حق میں زیادہ مفید تھے ۔

ریلوے لائن کی تعمیر کی رفتار کچھ اس وجہ سے بھی سست پڑگئی تھی کہ قرضہ کے ذریعے کافی رقم نہیں وصول ہو رہی تھی ' لوگوں کو تجارتی منافع میں روپیہ لگانے کی دھیرے دھیرے عادت ہو رہی تھی ۔ ہر سال بڑے بڑے شہروں کے دولتمندوں سے چھوٹی چھوٹی رقمیں بطور قرض لی جاسکتی تھیں ۔ مگر اس قسم کا قرضہ بہت ہی محدود کردیا گیا تھا ' قرض زیادہ تر لندن کے سرمایہ داروں سے لیا جا رہا تھا جہاں سارا کاروبار پاؤنڈ یا

اسٹرلنگ کے حساب سے ہوتا تھا ' اور اسٹرلنگ کے حساب سے روپیہ کے قرض لینے میں اہل ہند کو بڑا اعتراض تھا ' کیونکہ سنہ ۱۸۷۵ع سے لیکر روپیہ کی قدر و قیمت گھٹ گئی تھی ' حکومت ہند کو بہت سا روپیہ اسٹرلنگ کی صورت میں ادا کرنا ہوتا تھا ' وہ افسر جو انگلستان میں چھٹی پر ہوتے یا ملازمت سے سبکدوش ہوکر وطن چلے جاتے ' اپنی تنخواہ اور وظیفہ اسٹرلنگ کی صورت میں پاتے تھے ' اسی طرح یوروپ سے خریدے ہوے جنگ اور ریل کے سامانوں کی قیمت بھی اسٹرلنگ ہی میں ادا کی جاتی تھی ' اور انگلستان کے قرضہ کا سود بھی اسٹرلنگ میں ادا کرنا ہوتا تھا ' اس کے علاوہ پرانی ریلوے کمپنیوں کے سرمایہ کا سود بھی اسی میں ادا کرنا پڑتا تھا ' جب تک زرمتبادلہ کی شرح ایک تھی لندن سے پیسہ قرض لینے میں اہل ہند کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور جب یہ شرح بہت گرگئی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب تک گری رہیگی تو لندن سے قرض لینے میں حکومت ہند کا بہت سا روپیہ زرمتبادلہ کی زاید رقم کے ادا کرنے میں صرف ہوجاتا تھا .

روپیہ کی قیمت کے گرنے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انگلستان میں سونے کا سکہ رائج تھا ' ایک شخص برابر کا سونا دیکر اشرفیاں مول لے سکتا تھا ' مگر ہند میں چاندی کے سکے ڈھالے جارہے تھے ' ایک پونڈ اسٹرلنگ کیلئے کئی اونس چاندی دینی پڑتی تھی ' اور دونوں دھاتوں کی مانگ اور رسد کے اصول کے مطابق انکی قیمتوں میں بھی گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا رہتا تھا ' کمپنی کے زمانہ حکومت میں ان دھاتوں کی قیمتوں کے تناسب میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا ایک پونڈ سونا دس روپیوں میں مل سکتا تھا ' اور اسکی شرح میں محض خفیف سی تبدیلی ہوتی تھی ' مگر جب سنہ ۱۸۶۰ع کے عالمگیر اقتصادی انقلاب کے بعد چاندی کی بہ نسبت سونا گراں ہوتا چلا گیا ' تو کچھ زمانہ تک ان دونوں کی قیمتوں کے تناسب میں کوئی فرق نہیں ہوا ' کیونکہ

یوروپ کے ممالک میں ہند کی طرح چاندی کے سکے ڈھالے جا رہے تھے ' مگر وہاں بھی بہت جلد چاندی کی افراط محسوس ہونے لگی چنانچہ سنہ ۱۸۷۳ع اور سنہ ۱۸۷۴ع میں ان کا ڈھالنا بالکل بند کردیا گیا ' اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی مانگ میں بھی بہت کمی آگئی اور جب ہند میں چاندی کے سکے برابر ڈھلتے ہی رہے تو روپیہ کی بھی قیمت گھٹتی چلی گئی ' سنہ ۱۸۷۸ع میں جبکہ روپیہ کی قیمت زیادہ نہیں گھٹی تھی ' حکومت ہند نے سونے کا سکہ چلاکر اس کا تدارک کرنا چاہا ' مگر انگلستان کی حکومت نے اس تجویز کو نہیں مانا ' اسکے بعد دس سال تک ایک بین‌الاقوامی مالی سمجھوتہ کرنے کی نا کام کوشش کی گئی ' اس دور کے خاتمہ پر جس کے متعلق ہم یہاں تبصرہ کر رہے ہے روپیہ کی قیمت ابھی گرتی ہی جا رہی تھی ' اس وقت ایک روپیہ دو شلنگ کی بجاے ایک شلنگ نو پنس کے لگ بھگ ہوتا تھا ' مگر کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ ایک سال کے اندر روپیہ کی قیمت کس حد تک گرتی جائیگی ' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی ترقی میں بڑی زبردست رکاوٹیں پیدا ہوگئیں ' ریلوں اور نہروں کی تعمیر کیلئے روپیہ فراہم نہیں ہوسکتا تھا ' بہت سا روپیہ کھنچ کر ہند کے باہر چلا جا رہا تھا ' اسی صدی کے ختم ہونے کے بعد ہی زر متبادلہ کا تناسب ایک متعین حالت پر آسکا .

یہ ذہن نشین رہے کہ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ صرف برطانوی ہند سے متعلق تھا ' ریاستوں میں مالیات کی اصلاح ابتک شروع نہیں ہوی تھی ' اکثر ریاستوں میں وہی پرانے طریقے جاری تھے یعنی کاشتکاروں سے جتنا بھی روپیہ مل سکتا تھا وصول کرلیا جاتا تھا حکومت کے مصارف کی کوئی حد نہیں تھی ' اور کوئی با قاعدہ نظام مالیات موجود نہیں تھا ' جہاں کہیں ممکن ہوتا تھا دولت جمع کرکے رکھی جاتی تھی اور اسکو کسی کام میں نہیں لایا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ دیسی راجہ اور حکمران لوگوں کی ایسی بے مصرف دولت پر ہمیشہ ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے .

باب ۴۷

عام حالات

سنہ ۱۸۸۰ع تا سنہ ۱۹۰۵ع

وائسرائے :— لارڈ رپن سنہ ۱۸۸۰ع تا سنہ ۱۸۸۴ع

لارڈ ڈفرن سنہ ۱۸۸۴ع تا سنہ ۱۸۸۸ع

لارڈ لینسڈون سنہ ۱۸۸۸ع تا سنہ ۱۸۹۴ع

لارڈ الگن (ثانی اول) سنہ ۱۸۹۴ع تا سنہ ۱۸۹۹ع

لارڈ کرزن سنہ ۱۸۹۹ع تا سنہ ۱۹۰۵ع

اس دور کی ، جس کے متعلق ہم تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں ، ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان تمام رجحانات کو بڑی ترقی ہوگئی تھی جن کا ذکر گذشتہ تین بابوں میں ہوچکا ہے ، اس دور میں لوگوں کو خاصکر قومی ، عقامی اور فرقہ وارانہ جذبات کے اظہار کرنے کا پورا موقع مل گیا تھا ، ان کو بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس دور کے عام حالات بیان کردئے جائیں .

روس کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ہند کی سرحد پر ابھی تک خطرہ لگا ہوا تھا ، سنہ ۱۸۸۵ع میں جب کہ مرو کے جنوبی علاقہ پر روس کا قبضہ ہوگیا تھا افغانستان کی شمالی سرحد کی تعیین کے متعلق ایک کانفرنس ہوی۔ اس کے متعلق گفت و شنید جاری ہی تھی کہ روس کی فوجیں افغانستان کے علاقہ میں گھس پڑیں ، اس کی وجہ سے یوروپ کی سیاست میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا ، لیکن جنگ ہونے نہ پائی کیونکہ دوسرے ہی سال سرحدوں کی تعیین کا فیصلہ ہوگیا ، سنہ ۱۸۸۶ع کے بعد سے روس کی سر گرمیاں پھر سے شروع ہوگئی تھیں ، اس دفعہ افغانستان کے شمال مشرقی سرحد کے متعلق روس کا جھگڑا تھا ، لیکن اس دفعہ بھی سنہ ۱۸۹۵ع میں دونوں کے درمیان ایک

سمجھوتہ ہوگیا ، سات سال بعد حکومت ہند کو یہ گمان ہوا کہ روس تبت کو ہضم کرلینا چاہتا ہے جس کی سرحدیں ہند اور نیپال سے ملتی تھیں ، مگر اس گمان کی توثیق نہیں ہوسکی کیونکہ تبت نے اپنی سرحد بالکل بند کردی تھی ، اس لئے ایک مشن بھیجا گیا جو راستہ میں لڑ بھڑکر آگست سنہ ۱۹۰۴ع میں پاے تخت پہنچا اور تبت کی حکومت کے ساتھ ایک سمجھوتہ کیا ، اس درمیان میں یوروپ کے سیاسی حالات کچھ اس طرح بدلتے گئے کہ روس اور انگلستان کے درمیان پھر سے دوستانہ تعلقات قایم ہوگئے ، اور تبت کے مسئلہ کی اهمیت باقی نہیں رهی سنہ ۱۹۰۷ع میں دونوں کی ایک مجلس منعقد ہوی تھی جس میں دونوں کے دوستانہ تعلقات کی نوعیت کی تعیین کی گئی ، اس کے بعد سے روس کا خطرہ جاتا رہا .

افغانستان پر سنہ ۱۹۰۱ع تک امیر عبدالرحمٰن کی حکومت رهی ، اس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا حبیب اللہ تخت پر بیٹھا ، باپ اور بیٹا دونوں معاهدہ کی روسے غیر ممالک سے براہ راست تعلقات قایم نہیں کرسکتے تھے ، ان دونوں نے حکومت انگلستان سے براہ راست تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی ، مگر اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوی ، ہند اور افغانستان کے درمیان رهنے والے آزاد قبایل کی شورش پسندی سے دونوں کے درمیان ناچاقی کے اسباب پیدا ہو رہے تھے ، ہم بتیسویں ۳۲ باب میں بیان کرچکے ہیں کہ کس طرح اورنگ زیب ان قبایل کو مطیع بنانے میں ناکام رہا ، اس مدت میں ان کے اخلاق و عادات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوی تھی ، وہ اکثر برطانوی علاقوں پر چھاپہ مارتے رهتے تھے ، جس کی وجہ سے رسل و رسائل اور آمدورفت کے راستے مسدود ہو جاتے تھے ، ہر ایک چھاپہ کے بعد قبایل کی گوشمالی کیلئے فوجیں روانہ کی جاتی تھیں ، اور آگے بڑھکر اهم مورچوں پر قبضہ کرلیا جاتا تھا ، اس کی وجہ سے یہ بدگمانیاں پھیلنے لگیں کہ

حکومت ہند سرحدی قبایل کی آزادی کا خاتمہ کرنا چاہتی ھ ۔ حکومت ہند کے اس طرز عمل سے سرحد کے لوگوں میں ایک طرح کی بیچینی پیدا ھوگئی تھی اور امیر افغانستان کو بھی شکوک و شبہات پیدا ھوگئے تھے ' اور وہ بھی سیاسی چالیں چلنے لگا تھا ' آخر سنہ ۱۸۹۳ع میں امیر عبدالرحمٰن کے ساتھ حکومت ہند کا ایک سمجھوتہ ھوا جس میں سرحدی قبایل کے متعلق افغانی اور برطانوی دائرہ اثر کی توضیح کی گئی تھی ' مگر اس سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا کیونکہ سرحدی قبایل اب بھی امیر کابل کی امداد کے امیدوار تھے ' سنہ ۱۸۹۰ع میں حالات نے ایک نازک صورت اختیار کرلی تھی ' تمام سرحدی قبایل میں آزادی کے جذبہ کے ساتھ مذھبی جوش اور ولولہ بھی پیدا ھوگیا تھا ' اور چترال سے لیکر بلوچستان تک لڑائی کی آگ بھڑک اٹھی ۔ اس کی بناء پر انگریزوں کو وسیع پیمانہ پر فوجی کارروائیاں کرنی پڑیں ' اور آگے بڑھ کر بہت سے جنگی مورچوں پر قبضہ کرلیا گیا ۔

لارڈ کرزن نے اس پالیسی کو بدلا اور آگے کے جنگی مورچوں سے تمام انگریزی فوجیں واپس بلالیں ' اور قریب کے مورچوں کو زبردست فوجوں کے ذریعہ مستحکم کیا اور سرحد سے آگے کے علاقہ میں قبایلی فوج ھی کو امن کا ذمہ دار قرار دیا ۔ جن کی امداد وقتاً فوقتاً حکومت ہند کرتی رھتی تھی ' سنہ ۱۹۰۴ع تک اسی پالیسی پر عمل ھوتا رہا اس کی وجہ سے سرحدی قبایل کا خطرہ بڑی حد تک کم ھوگیا تھا ' لیکن مرکزی علاقہ میں جو وزیرستان کے نام سے مشہور ھے ' کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ھوسکا ' اور اس طرح بیس سال تک یہ علاقہ حکومت ہند کی بے چینی اور بے اطمینانی کا باعث بنا رہا ' ان اصلاحات کو نافذ کرنے کی غرض سے لارڈ کرزن نے سنہ ۱۹۰۱ع میں سرحد کا ایک علحدہ صوبہ بنایا جس میں دریاے سندھ کے مغرب کے پانچ اضلاع ' جو اب تک صوبۂ پنجاب کا جز تھے '

شامل کرلیے گئے ، اس کے ساتھ وہ سرحدی علاقے بھی ملا لیے گئے جو سنہ ۱۸۹۳ع کے سمجھوتے کے مطابق حکومت ہند کے زیر اثر تھے ، اس صوبہ کا حاکم اعلی چیف کمشنر کہلاتا تھا ، وہ مرکزی حکومت کے سامنے پوری سرحد کی حفاظت کا ذمہ دار تھا ، اس کا کام یہ تھا کہ عام ضابطوں کے مطابق مقررہ اضلاع کا انتظام کرے اور سرحدی قبایل کے ساتھ انھی سیاسی دستور کے مطابق دوستانہ تعلقات قایم رکھے ۔

سرحد کی پالیسی کے متعلق اتنی سخت اور طول طویل نکتہ چینیاں ہوی ہیں کہ اس جگہ ان کے اہم نتائج کو پیش کرنا بہتر ہوگا ، سرحد کی تمام مصیبتوں کا اصلی سبب جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں وہاں کی اقتصادی بدحالی ہے ، قبایلی علاقہ سرسبز و شاداب اور زرخیز نہیں ہے ، اور یہاں کے لوگ نہایت ہی مفلس اور تنگ حال ہوتے ہیں ، ان کی اقتصادی مشکلات نہ تو اہم جنگی مورچوں پر قبضہ کرنے سے حل ہوسکتی ہیں اور نہ اپنی سرحد کو بالکل بند کردینے سے ، کیونکہ اس صورت میں چھاپہ مارنے کے سوا ان کی روزی کا کوئی اور ذریعہ نہیں رہتا ؛ ان کے حملوں کا تدارک اسی طرح پر ہوسکتا تھا جس طرح کہ سینڈمان نے بلوچستان میں کیا ، اس نے ایسی تدبیریں اختیار کی تھیں ، جن سے وہاں کے قبایل کو روزی کمانے کے ذرایع پیدا ہوگئے تھے ، یہاں بھی سڑکوں کی تعمیر اور ان کے انتظام کے سلسلہ میں قبایلی آدمیوں کو کام کا ذریعہ پیدا کیا جاسکتا تھا ، آب و ہوا کے موافق پھلوں وغیرہ کی کاشت کی جاسکتی ۔ کی بری اور بحری فوج میں ان کی بھرتی ہوسکتی تھی ، اور اسی قسم کے دوسرے ذریعے اختیار کیے جاسکتے تھے جن سے قبایلی علاقہ کے لوگوں کو کافی آمدنی ہوسکے ، ان کی آئندہ ترقی کا انحصار سیاسی انتظامات کی بجاے اقتصادی ذرایع کی بہتری پر تھا ۔

اب ہم سرحد کے مسئلہ کو چھوڑ کر پھر مالیات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ، سنہ ۱۹۱۰ع کے قریب روپیہ کی قیمت گھٹتی

جارھی تھی ' یہاں تک کہ سنہ ۱۸۹۰ء میں ایک روپیہ ایک شلنگ چار پنس کے برابر ھوگیا تھا ' اس کے بعد ایک بین الاقوامی سمجھوتہ کی ناکام کوشش کی گئی ' اور آخرکار سنہ ۱۸۹۲ء میں چاندی کے سکوں کا ڈھالنا بالکل بند کردیا گیا ' اس کے بعد بھی چند سال تک روپیہ کی قیمت اور گھٹتی رھی ' لیکن اس کے بعد حالات میں پھر تبدیلی پیدا ھوی اور سنہ ۱۸۹۹ء میں اس کی قیمت ایک شلنگ چار پنس کے برابر ھوگئی ' ایک مدت تک یہی تناسب قایم رھا ' پہلے پہل روپیہ کا حساب وزن کے لحاظ سے کیا جاتا تھا ' مگر اب وہ ایک علامتی سکہ قرار پایا ' اور اس کی قیمت ایک پونڈ اسٹرلنگ کے پندرھویں حصہ کے برابر قرار پائی ' اس کا یہ تناسب برابر قایم رھا یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سکوں کا نظام پھر سے درھم برھم ھوگیا .

سنہ ۱۸۸۰ء اور سنہ ۱۹۰۰ء کے درمیان کا زمانہ زبردست مالی مشکلات کا زمانہ تھا ' اس کی وجہ سے حکومت کے مصارف میں حتی الوسع کمی کرنی پڑی اور ھر ایک موقعہ پر کفایت شعاری سے کام لینا پڑا ' قومی جائدادوں کو ترقی دینا مشکل تھا ' اور محصولوں کو بار بار بڑھانا پڑا چنانچہ نمک کا محصول بڑھا دیا گیا اور سنہ ۱۸۸۶ء سے مستقل طور پر آمدنی کا محصول بھی عائد کیا جانے لگا ' سنہ ۱۸۹۴ء میں درآمدی تجارت پر محصول لگایا گیا ' انگلستان کے سیاسی دباؤ کی وجہ سے سوتی کپڑوں کی ان چند قسموں پر جو ھند کے کارخانوں میں تیار ھوتی تھیں ' اور جن کا مقابلہ لنکاشائر کے کپڑوں سے تھا زائد چنگی Excise Duty لگائی گئی ' اس کی وجہ سے ھند کے تاجر بگڑ بیٹھے ' ھند کی دوسری مصنوعات کی حفاظت کے لئے یہاں کے درآمدی اشیاء پر پانچ فیصدی محصول باقی رکھا گیا ' لیکن لنکاشائر کا مفاد اتنا اھم تھا کہ پارلیمنٹ کے بہت سے اراکین اس کے ھمدرد ھوگئے ' اور برطانوی وزارت حکومت ھند پر دباؤ ڈالنے لگی تاکہ اس محصول کو بھی منسوخ کردیا جائے '

چنانچہ آخر میں اس کو بھی منسوخ کردیا گیا اس کا اثر یہ ہوا کہ اہل ہند کے دلوں میں برطانوی حکومت کی نیت کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہوگئے اور دونوں ملکوں کے درمیان مالی تعلقات خراب ہوگئے ۔

غیر ملک کی حفاظتی اشیاء پر لگائے جانے والے محصولوں میں سے ایک وہ محصول بھی تھا ' جو Counter - vailing Duties درآمدی شکر پر لگایا جاتا تھا ' اس کی تاریخ بالکل جداگانہ ہے ' یوروپ کے مختلف ممالک ' جن کا مطمح نظر کافی چیزوں کا پیدا کرنا تھا ' اپنی ضرورت سے زیادہ شکر پیدا کر رہے تھے' اور اس زاید مقدار کو باہر بھیجنے کے لئے مختلف اسانیاں فراہم کر رہے تھے اور شکر کے کارخانوں کو سرکاری امداد بہم پہنچا رہے تھے یہ شکر ہند میں اتنی کم قیمت پر بکتی تھی کہ اس سے ہند کی شکر سازی کی صنعت کو بڑا سخت دھکا لگنے والا تھا اور گنے کی کاشت کو جس پر شمالی ہند کے بہت سے محنتی کاشتکاروں کی زندگی منحصر تھی ' سخت نقصان پہنچنے والا تھا ' چنانچہ سنہ ۱۸۹۹ء میں باہر کی شکر پر اتنا محصول عاید کیا گیا کہ غیر ممالک سے شکر آنی بالکل بند ہوگئی اور دیسی صنعت بحال ہوگئی' اور چند سال بعد جب سائنس کو بڑی ترقی ہوی اور اس صنعت کو مضبوط بنانے کے طریقے معلوم ہوگئے تو تحفظی محصولوں Protective Duties کے ذریعہ شکر سازی کی دیسی صنعت کو ترقی پر لانے کی کوشش کی گئی ۔

زر متبادلہ کی شرح کے متعین ہو جانے کی وجہ سے ہند کے مالیات کو اب کوئی نقصان نہیں تھا ' سنہ ۱۹۱۴ء تک مالیات کی یہی حالت رہی ' تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی سے حکومت کی آمدنی بہت بڑھ گئی تھی ' کبھی کبھی یہ آمدنی غیر معمولی طور پر گھٹ بھی جاتی تھی ' قومی جائدادوں کی آمدنی میں بڑا اضافہ ہوگیا تھا ' زر خیز کاموں کے لئے قرضہ لینے کا دستور جاری رہا ' بے سود قرضے دھیرے دھیرے کم ہوتے

گئی اور آخر بالکل بند ہوگئے اس وقت ہند کی مالی حالت اتنی اچھی تھی کہ اگر افیم کی آمدنی بند بھی ہوجاتی تو اس کو کوئی نقصان نہیں ہوسکتا تھا ' چنانچہ اس دور کے آخر میں چین کے ساتھ ایک سمجھوتہ کیا گیا ' اور چین میں افیم کی در آمد کو بتدریج کم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ' یہاں تک کہ آگے چلکر اس کو بالکل ہی بند کردیا گیا اس کے بعد افیم آمدنی کا ایک اہم ذریعہ نہیں رہی تھی ۔

سنہ ۱۸۹۰ ع کے بعد قحط کی وجہ سے پھر مالی مشکلات شروع ہوگئیں سنہ ۱۸۹۶ ع میں شمالی ہند کے اندر زبردست قحط پڑا پھر سنہ ۱۹۰۰ ع میں جنوبی ہند اور وسط ہند میں قحط کی وجہ سے سخت تباہی ہوئی ' سنہ ۱۸۸۰ ع کے کمیشن کی سفارشات پر سختی سے عمل کیا گیا ' اور کچھ نئے تجربات بھی حاصل کیے گئے ' اور ان کی روشنی میں سنہ ۱۸۹۸ ع اور سنہ ۱۹۰۱ ع کے مقرر شدہ کمیشنوں نے اپنی تجویزیں پیش کیں ' بیسویں صدی کی ابتدا میں قحط زدہ لوگوں کی امداد اور اعانت کے جو طریقے اختیار کیے گئے ان کا خلاصہ یہ تھا ' سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ ان کی امداد اس طور پر کی جاتی تھی کہ ان کو فاقہ کشی سے مرنے یا وطن چھوڑ کر باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی ' دوسری بات یہ تھی کہ قحط کے بعد بیماریوں سے مرنے والے بوڑھوں اور بچوں کو بچانے کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہوسکتا تھا ' کیونکہ پانی کا اچھا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے جب بیماریاں پھیلتی تھیں تو بوڑھے اور بچے اپنی فطری کمزوری کی بناء پر جانبر نہیں ہوسکتے تھے ' تیسری بات یہ تھی کہ پرانے زمانہ میں قحط کے بعد کم از کم ایک نسل تک کاشت نہیں ہوسکتی تھی ' مگر اب وہ حالت نہیں رہی ' صرف قحط کے دوران تک کوئی کاشت نہیں ہوتی تھی اور جب قحط کے آثار دور ہو جاتے اور خوب بارش ہو جاتی تو لوگ پھر سے اپنی کھیتی باڑی کے کام میں

لگ جاتے تھے چوتھی بات یہ تھی کہ قحط زدہ لوگوں کو کام مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ کاشتکاروں کو پیشگی روپیہ دیا جاتا تھا اور ان کے لگان میں بھی کمی کردی جاتی تھی تاکہ وہ پوری ہمت اور حوصلے کے ساتھ قحط کا مقابلہ کرسکیں ' سب سے آخری بات یہ تھی کہ قحط زدوں کی موثر امداد اور قحط کا فوری انسداد اسی وقت پر ممکن ہوتا تھا جبکہ حکومت سونچ سمجھ کر پوری احتیاط کے ساتھ انتظامی تدابیر اختیار کرے اور قحط کی نوعیت کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرکے فوری کارروائی کرے اور مستقل طور پر ہر ایک معاملہ کی نگرانی کرتی رہے ' صوبجات متحدہ کے مشہور قحط میں جو سنہ۱۹۰۸ع میں پیش آیا ' ان تجویزوں سے بہترین فائدہ اٹھایا گیا اور ان کی صداقت آشکار ہوی .

تینوں کمیشنوں کی روداوں میں اس بات پر بہت زور دیا گیا تھا کہ عام حالات میں لوگوں کے بچاو کا ایک مستقل نظام قایم کیا جائے ' چنانچہ ان کی سفارشات کی بناء پر لارڈ کرزن نے آب پاشی ' زراعت اور امداد باہمی کے متعلق ایک بہترین تجویز مرتب کی ' اور اس پر عمل کرنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی ' کیونکہ سنہ ۱۹۰۰ع کے بعد ہند کے اقتصادی حالات بہت بہتر ہوچکے تھے ' سنہ ۱۹۰۳ع میں آب پاشی کے کمیشن نے نئی تعمیرات اور نئے کاموں متعلق اپنی بہترین تجویزیں پیش کیں ' اور ان کی تدریجی تعمیر سے زمین کا ایک بڑا رقبہ سیراب ہونے لگا خشک سالی کے زمانہ میں بھی اس رقبہ کی کاشت کی جاسکتی تھی ' اس روداد میں وہی تجویزیں تھیں جو پہلے ہی سے سب کو معلوم تھیں ' لیکن زراعت اور امداد باہمی کے متعلق جو نظام عمل تیار کیا گیا تھا وہ بعض صورتوں کے لحاظ سے بالکل ہی انوکھا معلوم ہو رہا تھا .

ایک زمانہ سے زراعت کو ترقی دینے کی کوشش کی جا رہی تھی ' اس غرض سے لارڈ میئو نے ایک محکمہ بھی قایم کیا تھا مگر مالی مشکلات کی بنا پر اس کو بند کردینا پڑا ' لیکن قحط کے پہلے کمیشن کی سفارشات پر اس کو دوبارہ قایم کیا گیا ' پہلے پہل اس کا کام یہ تھا کہ زراعت کے متعلق صحیح معلومات فراهم کرے ' تقریباً تمام صوبوں میں یہ کام بڑی کامیابی کے ساتھ انجام پایا ' لیکن روپیہ پیسے ' واقف کار عملے اور ساز و سامان کی کمی کی وجہ سے نئی تحقیقات کرنے یا اپنے تجربات کے یقینی نتائج کو کاشتکاروں تک پہنچانے کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جاسکا ' سنہ ۱۹۰۵ع کے ایک قانون کے مطابق چند واقف کار عہدہداروں کی خدمات حاصل کی گئیں ' کئی کالج تعمیر ہوے ' اور جدید تحقیقات کیلئے تجربہ خانے laboratories قایم ہوے ' اور هند کی زراعت کی مشکلات کو باقاعدہ طور پر حل کرنے کی کوشش کی گئی ۔

کاشتکاروں کے لئے سرمایہ کے فراهم کرنے کا مسئلہ بھی کچھ کم اهم نہیں تھا ' پیداوار کو بڑھانے کیلئے کاشتکاروں کو کم سود کے قرضہ کی ضرورت هوتی هے ' اس کے علاوہ اپنی ضروریات زندگی کیلئے ان کو روپیہ پیسے کی حاجت هوتی هے ' اور جب کوئی روپیہ سود پر لیا جائے تو اس کو پوری کفایت شعاری کے ساتھ ضروری مصارف پر خرچ کرنا پڑتا هے ' انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں بعض ایسے لوگ جو جرمنی اور اطالیہ کے کاشتکارانہ مسائل کا تجربہ رکھتے تھے ' محسوس کرنے لگے کہ کاشتکاروں کی تمام مالی مشکلات باهمی قرضہ کے ذریعہ دور کی جاسکتی هیں ' چنانچہ انھوں نے کاشتکاروں هی کے سرمایہ سے ایک انجمن قایم کی جس سے ضرورتمند لوگوں کو کم سود پر قرضہ دیا جاتا تھا ' اور جو لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے ' اپنی ذمہداری پر قرض کی سفارش کرسکتے تھے ' اور یہی متحدہ ذمہداری فضول خرچیوں کیلئے ایک بڑی روک

تھی ' اور سود پر لیے ہوے پیسہ کو بے مصرف جگہوں پر خرچ نہیں کیا جاسکتا تھا ' انجمن امداد باہمی کا یہ طریقہ ہند میں بھی مقبول ہوتا گیا اور سنہ ۱۸۹۰ع کے بعد سے اس قسم کی انجمنیں قایم کی جانے لگی تھیں ' مختلف تجربوں کے بعد اس کی تحقیقات کیلئے ایک کمیشن مقرر ہوا ' اور سنہ ۱۹۰۴ع میں ایک قانون منظور ہوا جس کے ذریعہ انجمن امداد باہمی کے اداروں کو قانونی حیثیت دی گئی اور ان کی ترقی کے اہم ذرایع تجویز کئے گئے .

اس درمیان میں جب ملک کی صنعت و حرفت کو بڑی ترقی ہوی تو کارخانجات اور مزدوروں وغیرہ کی نگرانی کے مسائل بھی در پیش ہوے ' اس سے پہلے اگرچہ وقتاً فوقتاً مزدوروں کے متعلق قوانین بنائے جاتے تھے مگر حکومت ان مسائل کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں دے رہی تھی سنہ ۱۹۰۵ع میں وایسرائے کی مجلس کی توسیع ہوی اور عہدوں کی دوبارہ تقسیم ہوی ' تجارت اور صنعت و حرفت کو ایک ہی رکن کے ماتحت رکھا گیا ' اسکے بعد سے مرکزی اور صوبائی حکومتیں ان کی ترقی سے زیادہ دلچسپی لینے لگیں ' اس سے پہلے تجارت اور صنعت و حرفت پر غیر سرکاری لوگوں کا قبضہ تھا لیکن حکومت کی تمام کوششیں آزاد تجارت کے حامی وزیر ہند لارڈ مارلے کی پابندیوں سے بالکل رائیگاں ہوگئیں .

زراعت اور صنعت و حرفت کی امداد ایک ایسے وقت پر ہوی جبکہ اس کی اس کو بڑی ضرورت تھی ' کیونکہ کھیتی باڑی کیلئے کافی سے زیادہ آدمی موجود تھے ' اگرچہ کانوں ' کارخانوں اور نقل و حمل اور باربرداری کیلئے آدمیوں کی بڑی ضرورت تھی ' تاہم آبادی بھی بہت بڑھتی جا رہی تھی ' سنہ ۱۸۷۷ع کے قحط میں بے شمار لوگ ختم ہوگئے تھے ' اس کے باوجود جب سنہ ۱۸۹۱ع میں مردم شماری ہوی ' تو سنہ ۱۸۸۱ع کی مردم شماری میں دس فیصدی اضافہ ہوگیا تھا ' اس کے بعد بھی قحط اور طاعون کی وجہ سے آبادی گھٹتی

رهی ، پھر جب آسودگی اور فارغ البالی کا دور آیا تو آبادی بھی اسی تناسب سے بڑھنے لگی تھی پچاس سال تک هند میں گلٹی دار طاعون کا کوئی وجود نہیں تھا ، سنہ ۱۸۹٦ م میں بمبئی کے اندر یہ بیماری نمودار هوی اور دیکھتے دیکھتے بڑی تیزی کے ساتھ دوسرے مقامات میں بھی پھیل گئی ، اس مرض میں تقریباً بیس لاکھ جانیں ضایع هوگئیں ، اس کی وجہ سے لارڈ کرزن نے ان بیماریوں کے علل و اسباب کے متعلق سائنس کی نئی تحقیقات سے بڑا فائدہ اٹھایا ، اور حفظان صحت کے متعلق ایک بہترین تجویز مرتب کی ۔

انیسویں صدی کے خاتمہ تک حفظان صحت کے کارکن ان بیماریوں کے علل و اسباب سے اچھی طرح واقف نہیں تھے ، یہ سچ ہے کہ اس وقت چیچک کیلئے ٹیکہ لگانے کا رواج هوگیا تھا ، اور زیر نظر دور میں اس بیماری سے مرنے والوں کی تعداد آدھی کے قریب گھٹ گئی تھی ، سنہ ۱۸۸۳ ع میں هیضہ کا جرثومہ دریافت هوا ، لیکن اسکی تصدیق و توثیق میں کئی سال لگ گئے تھے ، اسی طرح طاعون کا جرثومہ سنہ ۱۸۹۴ ع میں دریافت هوا ، لیکن پسووں کے ذریعہ اس بیماری کے پھیلنے کا نظریہ دس سال بعد پایۂ ثبوت کو پہنچا ، سنہ ۱۸۹۷ ع میں اس بات کو ثابت کیا گیا کہ موسمی بخار ایک خاص قسم کے مچھروں سے پھیلتا ہے ، اسطرح بیسویں صدی کی ابتدا میں سائنس کے اصول کے مطابق ان بیماریوں کی روک تھام کرنا ممکن هوگیا تھا لیکن حفظان صحت کی آزمودہ معلومات اور لوگوں کی جہالت کے درمیان اتنا بعد تھا کہ بیماریوں کا موثر طریقہ پر تدارک کرنا بہت هی دشوار تھا ۔

نظم و نسق کی مذکورہ بالا اهم تبدیلیوں سے ایک وسیع اور پیچیدہ دفتری حکومت پیدا هوی ، سارے معاملات مرکزی حکومت کے اختیار میں تھے ، اور وہ زیادہ سے زیادہ مهارت پیدا کرنے کی

کوشش کر رہی تھی، اس دور میں فوج کی تاریخ کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی، تینوں صوبوں کا الگ الگ فوجی نظام ختم ہوچکا تھا اور ان کی جگہ پر سارے ہند کیلئے ایک ہی فوج رکھی جانے لگی، اس کو سنہ ۱۹۰۳ع میں ' ہندی فوج ' کے نام سے موسوم کیا گیا، اس کا سب سے بڑا افسر سپہ سالار اعظم (Commander in Cheif) تھا، اور جب لارڈ کچنر ہند کا سپہ سالار اعظم بنا تو اس نے ہندی فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کیا اور ان کو اسطرح ترتیب دیا کہ نہایت آسانی اور تیز رفتاری کے ساتھ سرحد کی حفاظت کیلئے سپاہی روانہ کئے جاسکتے تھے، جب لارڈ کچنر نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق فوج کی تنظیم شروع کی تو ایک معاملہ پر اس کا وایسرائے سے اختلاف ہوگیا، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وایسرائے کی مجلس میں ایک فوجی رکن ہوتا تھا، جس کے ذمہ فوج کے معاملات کی نگرانی ہوتی تھی، سپہ سالار اعظم اس کے ماتحت تھا، کچنر چاہتا تھا کہ یہ فوجی رکن سپہ سالار اعظم ہی ہو، کیونکہ دونوں کا عہدہ الگ الگ ہونے کی صورت میں فوجی تنظیم میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہوجاتی تھیں، کرزن اور مجلس کے دوسرے اراکین کچنر کی راے کے بالکل مخالف تھے، کیونکہ ایسا کرنے سے حکومت کے اختیارات پر زد پڑتی ہے، مگر برطانوی حکومت نے کچنر کی راے کی تائید کی، اس بناء پر کرزن نے اپنے عہدہ سے استعفا پیش کردیا، اور اس وقت سے لیکر فوجی رکن کا عہدہ ختم کردیا گیا ۔

جب ہندی فوج میں صلاحیت اور قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو فوجی بھرتی کا اصول بھی بدل دیا گیا، مدراس اور صوبجات متحدہ* سے بہت کم آدمی بھرتی کئے جانے لگے، اس کی بجاے پنجاب، نیپال اور شمال مغربی ہند کے سرحدی

---

* سنہ ۱۸۷۷ء میں محض نظم و نسق کی خاطر صوبجات شمال مغربی کو اودھ سے ملادیا گیا تھا، اور جب سرحد کا صوبہ الگ بنایا گیا تو صوبجات شمال مغربی کا نام صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ رکھا گیا اور پھر مختصر کرکے صوبجات متحدہ بولا جانے لگا ۔

مقامات سے زیادہ آدمیوں کی بھرتی ہونے لگی تھی اس وقت تک قومی فوج کا نظریہ وجود میں نہیں آیا تھا ، ہند کی دفاع کا دارمدار زیادہ تر ان اقوام پر تھا جن کو اب جنگجو اقوام Martial races سے تعبیر کیا جاتا ہے - اس تبدیلی سے بہت سے اقتصادی اور سماجی نتائج پیدا ہوے جس کی طرف اس تبدیلی کی تجویز کرنے والوں کا خیال بھی نہیں گیا تھا ، سپاہی تمام تر کاشتکار طبقہ سے بھرتی ہوتے تھے ، اور اپنے اهل و عیاں کو اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ روانہ کرتے تھے ، اور وقتاً فوقتاً ان کے روپیہ بھیجتے رہنے کی وجہ سے بہت سے غریب اور مفلس خاندان آسودہ حال ہوگئے تھے ، اب یہ روپیہ گنجان آبادی پر صرف نہیں ہو رہا تھا جہاں اس کی بڑی ضرورت تھی ، اس کی بجاے پنجاب کے اکثر علاقے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ خوش حال ہوتے گئے ، اسی کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کی تعلیم و تربیت کا بھی اهتمام کیا جانے لگا تھا ، جس کی وجہ سے ان کی نظر بہت وسیع ہورھی تھی ، فوجی خدمت کے دوران میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی کہ اس سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ بہترین کاشتکار ثابت ہوسکتے تھے ۰ اگر وہ گھر ھی پر رہتے تو ان کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوسکتا تھا یہی وجہ ھے کہ اس دور کے آخر میں اور صوبوں کی بہ نسبت پنجاب کے کاشتکاروں میں مستعدی اور آزادی کا زیادہ جذبہ پایا جاتا ھے .

اس دور میں شاہی افواج Imperial Service Troops کے قایم کرنے کی طرف ایک عملی قدم اٹھایا گیا ، تمام دیسی حکمران محض نام و نمود اور نمائش کی غرض سے اپنی اپنی فوج رکھتے تھے ، عملاً ان حکمرانوں کو ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی ، اور جب سنہ ۱۸۸۵ع میں روس کا خطرہ بڑھ گیا تو تمام حکمرانوں نے اپنی فوجیں ہند کی مدافعت کے لئے پیش کیں ، چار سال بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر ایک دیسی حکمران چند خاص فوجی رسالے رکھے ، مگر ان کی تربیت برطانوی افسر

انجام دیں اور سب کے سب سپہ سالار اعظم کے ماتحت کام کریں‘ اس تبدیلی کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ امن و امان کے زمانہ میں ہند کے فوجی دستے ایسی جگہوں پر مقیم ہوتے تھے ‘ جہاں سے ان ریاستوں کی فوج کی نگرانی ہوسکے ‘ اس تجویز کے بعد یہی فوجیں دشمن ہونے کی بجاے برطانیہ کی وفادار دوست بن گئیں ‘ اور ہندی فوج کو موقعہ ملا کہ ان ریاستوں کی طرف سے بے خطر ہوکر شمال مغربی سرحد کی حفاظت کرے ۔

اب اس دور کے ان طریقوں کو بیان کرنا ہے جس کے ذریعہ باشندگان ہند اس قابل ہوے کہ باتنخواہ یا بلاتنخواہ اپنے ملک کی خدمت انجام دے سکیں‘ سنہ ۱۸۸۶ع میں پبلک سروس کمیشن نے اپنی مشہور روداد پیش کی جو ہند کی ملازمتوں کی تاریخ میں ایک نہایت ہی شاندار باب ہے ۔ اس کی سفارشات کے مطابق بڑے بڑے عہدوں اور خدمتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا ‘ ایک شہنشاہی خدمت Imperial Service یا ہندی خدمت Indian Service ‘ جس کے لئے انگلستان میں آدمیوں کی بھرتی کی جاتی تھی ‘ اور دوسری صوبائی خدمت Provincial Service جس کے لئے صوبائی ضرورت کے مطابق عام طور پر اس صوبہ کے لوگوں ہی سے عہدہ دار منتخب کئے جاتے تھے ‘ بعض ایسے عہدے جن کے لئے انگلستان میں آدمیوں کا انتخاب کیا جاتا تھا صوبائی حکومتوں کے حوالے کردئے گئے تھے ‘ اس انتظام کے ماتحت صوبوں میں قابل عہدہ داروں کی تعداد بڑھتی گئی ‘ لیکن بعض صورتوں میں اور خاصکر انتظامی خدمت میں اعلی عہدوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ اهل ہند کی دلی خواهشات اس سے پوری نہیں ہوسکتی تھیں ‘ اور اس کے علاوہ ان کو تیزی کے ساتھ اونچے درجوں تک ترقی کرنے کی کوئی گنجایش نہیں تھی ‘ آگے چلکر مرکزی حکومت کی ملازمت کے مقابلہ میں صوبائی ملازمت کمتر درجہ کی خیال کی جانے لگی ‘ یہی وجہ

هے کہ باشندگان هند صوبائی ملازمت میں رهکر ترقی کرنے کی بجاے شہنشاهی ملازمت کے حصول کے خواهاں تھے ، چنانچہ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ انگلستان اور هند دونوں جگہ اس کے امتحانات لیے جائیں ، سنہ ۱۸۹۳ع میں ' ایک ساتھ امتحانات ' کی تجویز دارالعوام نے منظور کرلی تھی لیکن اس وقت کی لبرل حکومت نے اس پر عمل کرنے سے انکار کردیا تھا ، پہلی جنگ عظیم کے بعد هی اس پر عمل کیا جاسکا .

اعزازی ملازمتوں کا جہاں تک تعلق هے لارڈ رپن نے باشندگان هند کی خواهشات اور ان کے جذبات کا پورا لحاظ کیا ، اور ایک وقت تو اس نے مجالس قانون ساز میں انتخاب کا طریقہ رائج کرنے کا ارادہ کیا ، مگر بعد میں یہ ارادہ بدل گیا اور مقامی خود اختیاری حکومت Local Self Government سے اس کی ابتدا کی گئی ، اس سلسلہ میں ایک ضروری قانون منظور هوا جس کی سرکاری عہدہ داروں نے کوئی مخالفت نہیں کی اور تعلیم یافتہ هندیوں نے اس کی تائید کی ، صوبوں کے مرکزی شہروں میں کارپوریشن ایک زمانہ سے قایم تھے ، مگر دوسرے مقامات پر بلدی مجالس Muncipal Boards کا اجرا هند والوں کے لئے بالکل انوکھا تھا ، مغلوں کے زمانہ میں شہر کا کوتوال ایک حد تک خود مختار حاکم کی حیثیت رکھتا تھا ، اور اس کو وسیع اختیارات حاصل تھے ، پہلے پہل انگریزی دور کے میجسٹریٹ اور کلکٹر کی حیثیت اس کوتوال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی ، لیکن اس نے بہت جلد عمائدین شہر کا تعاون حاصل کرلیا تھا ، کہیں کہیں انتخاب کا طریقہ بھی استعمال کیا جانے لگا تھا نئے مجالس میں آدھے پونے اراکین بذریعہ انتخاب آتے تھے ، اور بسا اوقات ان کو اپنا صدر منتخب کرنے کی بھی اجازت تھی ، بلدی مجالس (Muncipal Boards) کی انتظامی حیثیت پر یہاں کوئی عام راے نہیں دی جاسکتی البتہ بعض شہروں کی حالت پہلے سے زیادہ بہتر هوگئی تھی ، اور بعض کا انتظام

بالکل ہی بگڑ گیا تھا ' بعض حالات میں اراکین کی بد عنوانیوں اور بد انتظامیوں کی وجہ سے ان مجلسوں ہی کو توڑ دینا پڑا تھا ان مجلسوں سے ان مقامات میں بہتر نتائج پیدا ہوے جہاں سرکاری عہدہ داروں اور منتخب اراکین میں باہمی تعاون ہوتا تھا ' اس کی تعلیمی اہمیت کے متعلق کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ قومی زندگی کے سیکھنے کا پہلا مدرسہ تھے ' بعض مقامات پر عمائدین اپنے شہر کے حسن انتظام پر فخر و مباہات کرنے لگے تھے اور اس طرح اس کی شہرت کو چمکانے کے خواہاں تھے ' ان کے وجود میں آنے کے بعد سے یہ ممکن ہوگیا تھا کہ ایک شخص اپنے ہمسایہ کی خیر خواہی میں اپنے عزیز وقت کا ایک حصہ صرف کرسکے ' دیہی مجالس (Rural Boards) جو اس زمانہ میں قایم ہوے ' اتنے زیادہ مفید نہیں تھے ' کیونکہ ان کی تنظیم میں بہت بڑی خامیاں تھیں ' اس کے علاوہ ان کے اختیارات اتنے محدود تھے کہ قومی خدمتگاروں کو کام کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا تھا ' بسا اوقات انتخاب کنندوں سے راے کا حاصل کرنا یا قابل اشخاص کو امیدوار بننے پر آمادہ کرنا بہت ہی مشکل تھا ' بعض اوقات تو ضروری کارروائی کے انجام دینے کیلئے اراکین کی ضروری تعداد بھی حاضر نہیں رہتی تھی .

مجالس قانون ساز Legislative Councils کی توسیع اگرچہ لارڈ رپن کے زمانہ میں ملتوی ہوگئی تھی مگر لارڈ ڈفرن نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیا ' وہ باشندگان ہند کے دلی احساسات سے خوب واقف تھا ' اس کے علاوہ اب باشندگان ہند میں قانون سازی کی قابلیت رکھنے والے بہت سے افراد موجود تھے اس نے سنہ ۱۸۸۸ ع میں صوبائی مجالس قانون ساز کی توسیع کے متعلق پارلیمنٹ کے سامنے ایک قطعی تجویز پیش کی ' جس میں انتخاب کے طریقہ کو رائج کرنے پر بہت زور دیا تھا ' اس نے اس کی بھی سفارش کی کہ صوبائی میزانیہ

پر بحث اور اعتراض کرنے کی اراکین کو اجازت دی جائے ' اس وقت انگلستان کے حکام انتخاب کی تجویز سے متفق نہیں تھے ' اور پارلیمنٹ کے بحث مباحثہ کے بعد سنہ ۱۸۹۲ ع میں ایک قانون منظور ہوا ' اس کی روسے حکومت ہند کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق غیر سرکاری عہدہ داروں کا انتخاب کرے ۔

اس کے بعد سے حکومت ہند عوام کی کم و بیش نمائندہ جماعتوں کو دعوت دیتی تھی تاکہ وہ چند ایسے اشخاص کے نام دیں جن کو حکومت رکن کی حیثیت سے نامزد کرسکتی ہو ' اور چونکہ ان جماعتوں کی سفارش کو عام طور پر رد نہیں کیا جاتا تھا اس لئے عملا انتخاب کا طریقہ رائج ہوگیا ' سفارش کرنے والی جماعتیں دو قسم کی تھیں ' ایک بلدی اور دیہی مجالس تھیں ' جن کا منتخب کیا ہوا شخص سارے عوام کا نمائندہ ہوتا تھا ' دوسری وہ جماعتیں تھیں جو خاص خاص مفاد کی حفاظت کرتی تھیں ' جیسے ہند کی جامعات ' ایوان تجارت ' زمینداروں کی انجمنیں وغیرہ ' ان کے علاوہ حکومت ایسے لوگوں کو بھی نامزد کرتی تھی جو غیر منظم اور غیر ترقی یافتہ طبقوں یا فرقوں سے تعلق رکھتے تھے ' اس طرح اس زمانہ کی مجالس قانون ساز مختلف عناصر پر مشتمل ہوتی تھیں اور ان کی یہ خصوصیت اب تک قایم ہے ' مذکورہ بالا اصول پر تشکیل کی ہوی مجالس قانون ساز سنہ ۱۹۰۹ ع تک جاری رہیں ' ان میں سرکاری عہدہ داروں ھی کی کثرت ہوتی تھی ' غیر سرکاری اراکین کی تعداد اگرچہ بڑھ گئی تھی اور ان کا اثر اور اقتدار بڑھ چلا تھا تاہم ملک کی ضروریات یا خواھشات کے پورا کرنے میں ان کی یہ تعداد کافی نہیں ہوسکتی تھی ۔

باب ۴۸

سیاسیات کا فروغ

سیاسیات ہند کی تاریخ میں سنہ ۱۸۸۵ع ایک اہم سال ہے ' مغلوں کے زمانہ میں یا اس سے پہلے عام لوگوں کو حکومت کی کسی تجویز پر اپنی کھلی ہوی راے کے اظہار کرنے یا اپنے عام خیالات کے اظہار کیلئے کسی جماعت یا انجمن کے بنانے کی کوئی گنجایش نہیں تھی ' اس زمانہ میں حکمران اپنے وزیروں اور مشیروں سے خفیہ طور پر مشورہ کرنے کے بعد اپنی حکومت کی سیاسی حکمت عملی کا فیصلہ کرتا تھا ' اور جب ایک مرتبہ فیصلہ ہوجاتا تو اس پر کھلی نکتہ چینی بغاوت کے مترادف سمجھی جاتی تھی ' عوام کو حکومت کی تجویزوں سے زیادہ اس کے اشخاص سے دلچسپی تھی ' اور ان کی روزمرہ زندگی میں کسی حکمران یا وزیر یا ناظم صوبہ کی جانشینی کا سوال زیادہ اہمیت رکھتا تھا ' ان معاملات میں کھلے طور پر کسی کی طرفداری کرنا بہت ہی خطرناک ہوتا تھا کیونکہ ایک کامیاب مدعی سلطنت ناکام مدعی سلطنت کے طرفداروں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنا سکتا تھا ' اس لیے اس زمانہ کی سیاست صرف اسی حد تک تھی کہ ایک دوسرے کے خلاف خفیہ طور پر سازش کی جائے .

سیاسیات پر بحث کرنے کا موقع برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ہی پیش آیا ' اہل انگلستان کی زندگی ان کے لئے نمونہ کا کام دینے لگی ' سنہ ۱۸۳۶ع سے لیکر اخباروں کو پوری آزادی حاصل ہوگئی تھی صرف دو موقعے ایسے تھے جبکہ ان پر کچھ پابندیاں عائد کی گئی تھیں ' غدر کے بعد کیننگ نے جو پابندیاں عائد کیں وہ صرف ایک سال تک جاری رہیں ' اور سنہ ۱۸۷۸ع میں لارڈ لٹن نے دیسی اخبارات کے متعلق جو قانون جاری کیا وہ چار سال کے بعد منسوخ ہوگیا ' بغاوت اور ازالہ حیثیت عرفی کے سوا اخبار نویسوں پر کسی اور قسم کی پابندی نہیں تھی ' وہ انگریزی اخبارات جو انگریزوں کے لئے شایع ہوتے تھے ابتدا ہی

سے حکومت ہند کی کارروائیوں پر کھلی اور آزاد نکتہ چینیاں کرنے لگے تھے ' دیسی اخباروں نے بھی ان کی تقلید کی ' اس طرح ہند کی قومی زندگی میں سیاسی مسائل پر آزاد اور کھلی تنقید کا ذوق بڑھتا گیا ۔ سنہ ۱۸۷۰ع کے بعد سے راے عامہ کے اظہار کیلئے مختلف جماعتیں بنائی جانے لگی تھیں ' خاص کر کلکتہ میں سریندر ناتھ بنرجی اور دوسرے ولایت کے تعلیم یافتہ عوام کو سیاسیات سے آشنا کرنے کی کوشش کر رہے تھے ' اور انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سنہ ۱۸۸۵ع میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی ' اس کا مقصد خالص قومی تھا ؛ اور وہ پورے ہند کو ایک ملک کی حیثیت سے دیکھتی تھی ' لیکن اس کی بناوٹ قومی عناصر سے نہیں ہوی تھی ' کیونکہ اس میں صرف خاص خاص خیال کے لوگ شریک تھے ' مختلف فرقوں اور جماعتوں کی اس کو تائید حاصل نہیں تھی ۔

ہند کی سیاسیات کو برطانیہ کی دو فریقی نظم حکومت (Two Party System) پر قیاس کرنا ٹھیک نہیں ہوگا ' ابتدا میں کانگریس ایک انتہا پسند جماعت تھی ' اور اس کو دیہاتوں کی بجاے قصبوں اور شہروں کی اصلاح سے دلچسپی تھی ' دیہات کے کاشتکاروں ' مزدوروں اور تاجروں کے ساتھ اس کے کوئی روابط نہیں تھے ' زمیندار اور رجعت پسند لوگ قدرتی طور پر کانگریس سے الگ رہے ' اس کے سالانہ جلسوں میں ہندوؤں ھی کی زیادہ تعداد رہتی تھی ' کچھ پارسی اور مسلمان بھی شریک رہتے تھے ' شمالی ہند کے مسلمانوں نے عام طور پر سر سید احمد خاں کی تقلید کی جو کانگریس میں شامل ہونے کو خطرناک سمجھتے تھے ' اور اس سے الگ رہنے کی مسلمانوں کو تاکید کرتے تھے ' ابتدا میں مقامی جماعتوں کا کوئی وجود نہیں تھا ' جو اپنے نمائندوں کو کانگریس کے سالانہ جلسوں میں بھیج سکیں ' اکثر لوگ اپنے آپ منتخب ہوکر کانگریس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے ' شرکت کرنے والے لوگوں میں

زیادہ تر قانون دان ' اساتذہ اور اخبار نویس ہوتے تھے ' برطانوی حکومت کے زمانہ میں انہی تین پیشوں کو بڑی ترقی ہوی تھی ' ابتدائی مرحلہ میں چند انگریزوں اور اسکاچوں نے بھی کانگریس کی امداد کی تھی ' اور اس کا طریقۂ کار انگریزی نہج پر تھا ' اور بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کانگریس کی تحریک کا مقصد حکومت وقت پر بہت بڑا اثر ڈالنا تھا ' اور اس کی وجہ سے دستور وقت کے اندر بڑی تبدیلیاں پیش آئیں.

ابتدا میں کانگریس کے دو زبردست مطالبے تھے ' ایک یہ کہ مجالس قانون ساز میں باشندگان ہند کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی کا حق دیا جائے ' دوسرے یہ کہ سیول سروس کے امتحانات لندن کے ساتھ ساتھ ہند میں بھی لئے جائیں' لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور مطالبات بھی اس کی فہرست میں داخل ہوتے گئے ' پہلے پہل اس کی توجہ سماجی اور سیاسی دونوں قسم کے اصلاحات کی طرف مبذول رہی ' لیکن جب آپس کا اختلاف بڑھنے لگا اور متحدہ محاذ کا قایم کرنا مشکل ہوگیا تو کانگریس صرف سیاسی معاملات تک محدود ہوگئی مگر اس کے ساتھ جداگانہ طور پر سماجی کانفرنس بھی ہوتی تھی جس میں تقریباً وھی لوگ شریک ہوتے تھے جو سیاسی بحثوں میں حصہ لیا کرتے تھے ' البتہ سرکاری عہدہ دار بھی اس میں شریک ہو جاتے تھے ' اور اخلاقی اور سماجی مسائل پر اپنی راے کا اظہار کرتے تھے ' اسی طرح چند دن بعد اقتصادی مسائل پر غور و فکر کرنے کے لئے ایک صنعتی کانفرنس کی جانے لگی اس کے بعد سے کانگریس ایک خالص سیاسی جماعت بن گئی ' چونکہ سیاستدانوں سماجی مصلحوں اور ماھرین اقتصادیات کا ایک دوسرے سے میل جول رہتا تھا اس لئے ان کا ایک دوسرے کے خیالات پر گہرا اثر پڑا .

متحدہ محاذ پیش کرنے کی خواھش در حقیقت ایک زبردست محرک تھی ' اسیلئے ابتدا میں سیاسی مسائل کے اندر بہت کم

اختلاف پایا جاتا تھا ' لیکن سنہ ۱۸۹۰ع کے بعد سے کم انتہا پسند اور زیادہ انتہا پسند جماعتوں کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوگیا ' پہلا گروہ آئینی انقلاب کی تائید میں تھا ' اور دوسرا گروہ فوری انقلاب چاہتا تھا ' اس کی خواہش یہ تھی کہ برطانوی حکومت کو فوراً ختم کردیا جائے ' چند سال تک انکے درمیان بڑی کشمکش ہوتی رہی ' ان کے یہ اختلافات جہاںتک ہوسکتا تھا عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھے جاتے تھے ' کیونکہ یہ تمام مباحث مجلس مضامین (سبجکٹس کمیٹی) میں پیش ہوتے تھے جو عام اجلاس میں پیش ہونے والی تجویزوں کو مرتب کرتی تھی ' اور اس قسم کا ضابطہ تیار کرنے میں کامیاب ہوجاتی تھی جس پر سب کا اتفاق ہوجاتا تھا ' اس وقت اس کا مشہور فارمولا سوراج تھا ' جس کے لفظی معنی حکومت خود اختیاری کے ہوتے ہیں ' سنہ ۱۹۰٦ع میں سوراج کا حصول ہی کانگریس کا مقصد اصلی قرار پایا ' اس سے بعض لوگ انگلستان کی سی آزادی مراد لیتے تھے اور بعض اس سے برطانوی حکومت کے ماتحت ذمہ دارانہ حکومت سمجھتے تھے ' یہ اختلاف اتنا شدید تھا کہ دوسرے سال سورت کے اجلاس میں بڑا ہنگامہ ہوا جس میں اعتدال پسند جماعت کی جیت رہی ' اس واقعہ پر ہند کے سیاسی ارتقاء کا پہلا مرحلہ ختم ہوتا ہے .

پہلے مرحلہ کی بیس سال کی مدت میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی ' اور دیسی اخباروں کا بہت کچھ اثر قایم ہوگیا تھا ' خبروں کے فراہم کرنے کا طریقہ اب بھی ناقص تھا ' ہند اور بیرون ہند کی خبروں کیلئے لوگ انگریزی اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے ' کیونکہ ان کا معیار بہت اونچا تھا ' تعلیم یافتہ لوگوں کی دلچسپی کسی ایک مقام سے محدود نہیں تھی ' وہ بیرون ہند کی سیاسیات سے بھی بہت دلچسپی لینے لگے تھے ' اس وقت سرحد کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا ' جس کی وجہ سے لوگ سیاسی مسائل پر آزادانہ بحث کرنے

سے پرہیز کرتے تھے ' اور جب سنہ ۱۸۹۹ - ۱۹۰۲ء کی جنگ بوئر میں ابتداء انگریزوں کو شکستیں ہونے لگیں تو ہند کے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ اب برطانوی حکومت اتنی قوی اور مضبوط نہیں ہے جتنی کہ وہ اس کو سمجھتے تھے اور پھر سنہ ۱۹۰۴ - ۱۹۰۵ء کی جنگ میں جاپان کو روس پر کامیابی ہوی تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جانے لگا کہ ایشیا یوروپ کے مقابلہ میں بہت مضبوط ہوگیا ہے اس کی وجہ سے باشندگان ہند میں قومی خود داری کے جذبات ابلنے لگے تھے اور وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں ان کی حیثیت کسی طرح بھی کم نہیں ہے ' چنانچہ جب دوسرے ملکوں میں باشندگان ہند کے ساتھ برا سلوک کیا جانے لگا تو ہند کے اندر بھی اس سرے سے اس سرے تک غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی ۔

ہند کے اندر جو واقعات پیش آئے ۔ اس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں میں بھی اسی طرح کا قومی جذبہ کام کرنے لگا تھا ' اس جذبہ کی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہند کے لوگ سرے سے انگریزوں ہی کے مخالف ہوگئے ' اگر کسی سرکاری کارروائی پر تنقید کرنی ہو تو اس کو انگریز عہدہداروں یا انگریز شہریوں کی کارروائی فرض کرکے اس پر تنقید کی جاتی تھی ' اگر کوئی انگریز مزارع یا ریلوے کا ملازم یا سپاہی کوئی غلطی کر بیٹھتا تو دیسی اخباروں کیلئے ایک اچھا خاصہ مسالہ ہاتھ آجاتا اور وہ پوری انگریزی قوم کے اخلاق و عادات پر کڑی تنقیدیں کرنے لگتے تھے ' اگر یہی غلطی ہند کے کسی باشندے سے سرزد ہوتی تو یقینا اتنا ہیجان پیدا نہیں ہوسکتا تھا ' اس زمانہ میں لوگ ہند کی تمام خرابیوں کو انگریزی حکومت کے سر دھرنے کی کوشش کرتے تھے ' ہند کی تاریخ سے نا واقفیت اکثر اس جذبے کی ترقی کا موجب ہوتی تھی ایک نسل پہلے کی درسی کتابیں اب نصاب تعلیم میں رکھنے کی قابل نہیں ہوتی تھیں ' کیونکہ

تاریخی تحقیقات میں کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوی تھی ' ہند کے وہ باشندے جو وکٹوریہ عہد کی تاریخ کو پڑھتے تھے ' متضاد روایات کو بہت جلد قبول کرلینے پر عموماً آمادہ ہوجاتے تھے ' اہل ہند کو یہ گمان تھا کہ ان کی پچھلی تاریخ شاندار روایات سے بھری ہوی ہے ' اور انگریزی حکومت کے آنے کے بعد سے ان پر بڑی تباہیاں نازل ہوی ہیں اور ان کے تہذیب و تمدن کو مغربی تہذیب و تمدن سے بڑا سخت نقصان پہنچا ہے ' اس میں شبہ نہیں کہ بعض صداقت پسند لوگ ان خیالات کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے رہتے تھے ' انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ مختلف خامیوں کے باوجود انگریزی حکومت سے اہل ہند کو بڑا فائدہ پہنچا ہے ' مگر نقارخانہ میں طوطی کی آواز کو کون سن سکتا ہے ' ایسے معاملات میں مدافعت سے مخالفت ہی زیادہ موثر ہوتی تھی ' اور جب زاید چنگی وغیرہ کے سے محصول عائد کیے گئے تو برطانیہ کی مخالفت اور زیادہ کی جانے لگی تھی .

یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ تمام انگریز نا مقبول اور غیر ہر دلعزیز تھے ' وہ انگریز جو اہل ہند کے جذبات کا لحاظ رکھتے تھے ' بہت ہی ہر دلعزیز تھے ' اس کی ایک بہترین مثال لارڈ رپن کی ہے جو ایک بہترین وایسرائے تھا ' اس نے لبرل وزارتوں کے زمانہ میں تقریباً پچاس سال تک اپنے فرایض بڑی نیکنامی سے انجام دئے ' ہند کی تعلیم یافتہ جماعتوں میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی ' کیونکہ اس نے قانون مطابع Press Act اور مسودۂ البرٹ Ilbert Bill (جس کا ذکر آگے آئیگا) کے جیسے بہت سے قوانین کو منسوخ کیا ' اس کے برخلاف لارڈ کرزن محض اہل ہند کی تحقیر کرنے کی وجہ سے بہت ہی غیر مقبول اور بدنام ہوگیا تھا ' ورنہ وہ اپنے عہد کا ایک لائق اور ممتاز حکمران تھا ' اس نے ہند کی ترقی کیلئے وہ کام کیے جو دوسرے وایسراؤں سے نہیں ہوسکے تھے .

اس دور میں ایک منظم تعلیم یافتہ جماعت اپنی متحدہ آواز بلند کرنے لگی تھی، انتہا پسند جماعت بہت ہی جذباتی تھی، رجعت پسند جماعت خاموش تھی اور اس کی ابھی تک کوئی تنظیم نہیں ہوی تھی، انتہا پسند جماعت میں ایسے لوگ تھے جو حکومت کی کارروائیوں پر سخت تنقیدیں کرتے رہتے تھے، ان کا خطاب زیادہ تر ہند کے ان پڑھ اور جاہل لوگوں سے تھا، اس جماعت کے افراد میں یکسانیت نہیں تھی، ان میں سے بعض سچے اور مخلص تھے، اور بعض محض جذبات کی رو میں بہتے تھے، ان کو اپنے مقاصد کے فوری طور پر حاصل کرنے کے سوا کسی اور چیز سے کوئی غرض نہیں تھی، بعض کو حقیقی یا فرضی شکایات تھیں، جن کی بناء پر وہ حکومت کے خلاف احتجاج کرتے تھے، بعض اخبار نویس تھے جو اپنے اخباروں کو مشہور کرنا چاہتے تھے، بعض محض جرائم پیشہ تھے اور سیاست کی آڑ میں اپنا شکار کرتے تھے، ان سب کے مقاصد اگرچہ مختلف تھے مگر نتیجہ ایک ہی تھا، ہر ایک طبقہ دوسرے طبقہ کا مخالف ہوگیا اور ایک طبقہ یا تمام طبقے حکومت کے مخالف ہوگئے، پہلی بات کے ثبوت کیلئے مثالیں آئندہ دی جائینگی، یہاں ہم دوسری بات کے ثبوت کیلئے ایک مثال پیش کرینگے.

قانون تعزیرات ہند کے بنانے والوں نے بچپن کی شادیوں کے رواج کا خیال کرکے رضامندی کی عمر دس سال قرار دی تھی، یعنی اس سے کم عمر بیوی کی رضامندی کسی شوہر کو زنا بالجبر کے الزام سے بری نہیں کرسکتی، اور جب شوہر کی صحبت سے ایک کم سن بیوی کی درد ناک وفات ہوگئی تو حکومت کو اس قانون میں ترمیم کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی، چنانچہ سنہ ۱۸۹۱ع میں ایک قانون منظور ہوا جس میں لڑکی کی عمر دس کی بجائے بارہ کردی گئی تھی، مغربی معیار سے یہ عمر بھی بہت کم تھی بہت سے ترقی پسند ہندوؤں نے اس مسودۂ قانون کی حمایت کی تھی، لیکن کلکتہ اور پونا کے بعض ہندوؤں نے اچانک

اس کے خلاف احتجاج کرنا شروع کیا ' اور عوام سے یہ کہا جانے لگا کہ یہ صریحاً مذہب کے اندر مداخلت ہے اور اس سے ہندومت کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہوگیا ہے ' پونا میں تو خاصکر مسلمانوں اور یوروپین لوگوں پر ناروا حملے کئے جانے لگے تھے' ان دونوں جگہوں پر کھلم کھلا مخالفت ہو رہی تھی ' مگر دوسری جگہوں پر بھی اندر ھی اندر مخالفت ہو رہی تھی' جو لوگ اصل واقعات سے بے خبر تھے یہی سمجھنے لگے کہ حکومت واقعۃً ان کی مقدس رسموں کو مٹانا چاھتی ہے .

پونا کے احتجاج کنندوں کا سر گروہ بال گنگا دھر تلک تھا جو ذات کا برھمن تھا اور ایک ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اخبار کا بھی مالک اور مدیر تھا ' اس نے اتنی مقبولیت حاصل کرلی تھی کہ آگے چلکر کانگریس کی انتہا پسند جماعت کا قائد اور رھبر بن گیا تھا ' اسی نے سنہ ۱۸۹۶ء کے طاعون میں حکومت کی انسدادی تدابیر کے خلاف بڑا زبردست احتجاج شروع کیا تھا ' اور اپنے اخبار میں مختلف مضامین شایع کیے تھے ہند کے لوگ اس بیماری کو بھول چکے تھے' ہیضہ اور چیچک کے واردات عام تھے' لیکن طاعون ایک نیا اور خوفناک مرض تھا ' اور عام لوگ اس بیماری کے تدارک کی ہر ایک تدبیر کو ماننے کیلئے تیار تھے ' اس زمانہ میں اس کے تدارک کا اس کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا کہ مریضوں کو ایک دوسرے سے الگ اور آبادی سے بہت دور رکھا جائے ' ہر گھر جاکر مریضوں کا تلاش کرنا اھل ہند کے جذبات پردہ نشینی و گوشہ نشینی کے بالکل خلاف تھا ' اس وقت ہندی رضاکار بھی میسر نہیں تھے ' اس لیے یہ کام برطانوی سپاھیوں سے لینا پڑا اور جب یہ مشتبہ مقامات کی تلاشی لینے لگے تو تلک کے اخبار میں ان پر بڑی نکتہ چینی کی گئی ' اور اس کے ساتھ حکومت کی تدابیر پر سخت ترین حملے کیے جانے لگے ' اس شورش اور ہنگامہ آرائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو انگریز افسر مارے گئے ' حکومت نے

تلک پر بغاوت کا مقدمہ چلایا اور سزا دی، اس وقت بھی پونا میں حکومت کے خلاف کھلم کھلا مظاہرے ہو رہے تھے، اسی پر بس نہیں بلکہ جب یہ طاعون ملک کے دوسرے حصوں میں پھیلنا شروع ہوا تو عجیب قسم کی خبریں شایع کی جانے لگیں اور حکومت کے خلاف عوام کو مشتعل کیا جانے لگا، جس کی وجہ سے کئی جگہ فسادات ہوگئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مقامی اخباروں میں 'طاعون کے فسادات' کا ایک مستقل عنوان قایم ہوگیا، اس کھلی ہوی مخالفت کی بناء پر طاعون کا بہترین طریقہ پر تدارک بالکل ہی دشوار ہوگیا تھا.

اب ہمیں فرقہ وارانہ سیاست کا ایک جایزہ لینا ہے، وضاحت کیلئے قومی، مقامی، نسلی، اور فرقہ وارانہ تحریکات میں سے ہر ایک پر الگ الگ لکھنا ضروری ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ان کا ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا، بعض اوقات تو یہ تمام تحریکیں ایک دوسرے سے اتنی وابستہ ہوتی تھیں کہ ایک سرسری مبصر کیلئے ایک بے معنی ہڑبونگ معلوم ہوتی تھی، ان تحریکات کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ اپنی حیثیت اور بزرگی کو دوسروں سے منوائیں، قومی عزت میں ہر ایک فرقہ اپنی جگہ پیدا کرنا چاہتا تھا، اور پوری قوم دنیا کی قوموں میں ایک با عزت جگہ لینا چاہتی تھی، اور چونکہ عقل کی جگہ جذبات کام کرتے تھے، اس لئے ایک دوسرے کے درمیان ٹکر کا ہونا لازمی تھا.

مقامی تحریکات میں مہاراشٹر اور بنگال کی فرقہ وارانہ تحریکیں بہت اہم ہیں، مہاراشٹر میں خاصکر تلک کی کوششوں سے سیواجی ایک نئے مسلک کا بانی قرار پاچکا تھا، سنہ ۱۸۹۰ء کے بعد سے وہ ایک بڑا قومی سورما سمجھا جاتا تھا، مرہٹے اس کو نیم دیوتا سمجھتے تھے، ہر سال اس کی یاد میں اس دھوم دھام سے جلسے منائے جاتے تھے کہ پورے مہاراشٹر میں ایک مذہبی جوش اور ولولہ پیدا ہوگیا تھا، چونکہ مسلمانوں کو گراکر سیواجی

کی عظمت کو بڑھانے کی کوشش کی جاتی تھی ، اس لیے فرقہ وارانہ کشمکش شروع ہوگئی تھی اس کے علاوہ یہ تبلیغ کی جانے لگی تھی کہ سیواجی کے عہد میں ہند کے لوگ بالکل آسودہ اور فارغ البال تھے ، اب برطانوی حکومت کی وجہ سے لوگ بالکل بد حال ہوگئے ہیں .

بنگال جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں جغرافیائی اسباب کی بنا پر ہند کے اور صوبوں سے بلحاظ معاشرت بالکل الگ تھا ، مسلمانوں کے زمانہ میں اس خطہ کا تمدن ہی بالکل جدا تھا ، یہ وہ علاقہ تھا جہاں سب سے پہلے کمپنی کی حکومت کے نئے اثرات ظاہر ہوے ، اور پوری انیسویں صدی میں بنگال کی حیثیت ممتاز رہی ، محض نظم و نسق کی خاطر بہار اوریسہ اور چھوٹا ناگپور کو ملاکر ایک صوبہ بنا دیا گیا تھا ، لیکن جب یہ نا قابل عمل ثابت ہوا تو لارڈ کرزن نے اس کے دو حصے کردئے ، مشرقی بنگال کو آسام کے اندر شامل کیا اور مغربی بنگال کو بہار اور چھوٹا ناگپور کے ساتھ ملا دیا ، جب سنہ ۱۹۰۵ع میں اس تقسیم کا اعلان ہوا تو اس صوبہ کے ہندووں نے سخت احتجاج کرنا شروع کیا ، یہ احتجاج حکومت کی توقع کے بالکل بر خلاف تھا ، کیونکہ ہند کے دوسرے حصوں میں ماہرین سیاست نے اس تقسیم کی حمایت کی تھی ، مگر بنگالی یہ کہنے لگے کہ مادر ہند کے دو ٹکڑے ہوگئے ، حالانکہ ہند کے نہیں بلکہ صرف بنگال کے ٹکڑے ہوے تھے ، اس علاقہ کی انقلابی تحریک جس کا ذکر آئندہ باب میں آئیگا ، بہت کچھ اس تقسیم کا نتیجہ تھی ، لیکن یہاں اس کی اہمیت صرف اس وجہ سے ہے کہ اس سے مقامی جذبہ وطنیت کی حقیقت اور گہرائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ، جس کو اس وقت تک محسوس نہیں کیا گیا جب تک کہ اس کا کھلے طور پر اظہار نہیں ہوگیا .

اس دور میں نسلی امتیازات اس حد تک ترقی کرچکے تھے کہ یوروپین لوگوں اور خاص کر انگریزوں کے ساتھ باشندگان ہند کو دلی نفرت پیدا ہوگئی تھی ، اس کی مثال مسودۂ البرٹ

کے خلاف باشندگان ہند کا احتجاج ہے ، سنہ ۱۸۸۳ء میں قانونی مشیر البرٹ کے نام سے یہ مسودہ پیش ہوا تھا ، اگرچہ وہ خود اس کا بانی نہیں تھا ، اس کا مقصد یہ تھا کہ نظم و نسق کی ایک بے قاعدگی کو دور کیا جائے ، ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ انگریز ممبروں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے ہندی جج بھی مقرر کیے جانے لگے تھے جو غیر اہم مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے ، اس وقت ان کو انگریزوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار دینے کی نہ تو کوئی ضرورت تھی اور نہ ان کی طرف سے کبھی اس کا مطالبہ کیا گیا تھا ۔ ان دنوں مقدمات کا انگریز منصف سے فیصلہ کرانا لازمی تھا ۔ بعض خاص قسم کے اختیارات حاصل تھے [illegible] ہندوستانی سیول سروس کے [illegible] ملازمت کی خدمت کے بعد پر ضلع میجسٹریٹ ہوگئے تھے ، اور یہ ایک کھلی ہوئی بے قاعدگی تھی کہ ضلع کا سب سے بڑا حاکم اس وقت کے قانون کے مطابق اپنے ماتحت انگریزوں کے مقدمات کا فیصلہ نہ کر سکے ، چنانچہ اس مسودہ قانون کے ذریعہ اس بے قاعدگی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی ، مگر بنگال اور بہار کے انگریز مزارعین نے اس کی سخت مخالفت کی ، یہ لوگ دور افتادہ ضلاع میں چائے اور نیل کی کاشت کراتے تھے ، اور ہندی مجسٹریٹوں کے اجلاس میں اپنے مقدمات کا فیصلہ کرانے سے انکار کرتے تھے ، اور مقامی انگریز عہدہ داروں نے بھی ان مزارعین کی تائید کی ، اور ان سب کا سرگروہ بنگال کا لفٹنٹ گورنر تھا ، اس مسودہ سے انگریزوں کا اختلاف محض نسلی امتیازات کی بناء پر تھا ، اور یہ اختلاف اس حد تک آگے بڑھا کہ اخبارات میں ایک دوسرے پرلے دے شروع ہوگئی ، آخر میں ایک سمجھوتہ ہوا ، مگر اس سے پہلے دونوں فریق کے مفادوں کو کافی نقصان پہنچ چکا تھا ، انگریزوں سے اہل ہند کی ناراضی اور نفرت اور بڑھ گئی اور دونوں کے درمیان بڑی کشیدگی پیدا ہوگئی ، دیسی اخباروں میں باربار اس کا مظاہرہ کیا جانے لگا تھا ۔

اس سمجھوتہ کی ایک شرط ایسی تھی کہ اس سے عملاً بہت ہی ناخوشگوار نتائج پیدا ہوے ' اس شرط کی روسے یوروپین لوگوں کو حق حاصل تھا کہ اپنے مقدمات ایسے جوریوں Juries کے سامنے پیش کریں جن میں سے آدھے یوروپین قوم یا نسل سے ہوں ' یوں تو اکثر مقامات پر قابل جوریوں کا ملنا بہت مشکل تھا ' اور پھر بڑی حیثیت کے اکثر یوروپین لوگ کسی نہ کسی عذر کی بناء پر جوری نہیں بنتے تھے ' اس لیے ریلوے یا کارخانوں میں کام کرنے والے انگریزوں یا اینگلو انڈین لوگوں کو جوری بنایا جانے لگا ' یہ لوگ عدل و انصاف سے زیادہ اپنی قوم اور نسل کے خیر خواہ تھے ' اور ایسے مقدمات میں جن میں سے ایک فریق باشندگان ہند ہوتے تو اپنی قوم یا نسل کے لوگوں کی کھلی ہوی جانبداری کرتے تھے اور اخباروں میں بھی انہی کی حمایت کی جاتی تھی .

اس صدی کے آخر میں دونوں کے درمیان انتہائی کشیدگی کا ایک اور سبب یہ تھا کہ انگریز اہل ہند کو اپنی انجمنوں اور مجلسوں میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے ' اگر مساوات کے اصول پر کوئی شریک ہونے کی کوشش کرتا تو اس میں مختلف قسم کی رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں ' بڑے بڑے انگریز عہدہ دار کلبوں کے اعزازی رکن بن جاتے تھے ' اور بعض کا انتخاب راے شماری سے ہوتا تھا ' اور جب کوئی ہندی انتخاب کیلئے کھڑا ہوتا تو راے شماری کے ڈبے میں کالی گولیاں ڈالی جاتی تھیں جو نا منظوری اور حقارت کی ایک علامت ہوتی تھی ' بعض لوگ اس شرمندگی سے بچنے کیلئے اپنے نام واپس لے لیتے تھے اگرچہ بہت کم ہندی ان کلبوں میں شریک ہونے کی کوشش کرتے تھے تاہم قومی تحقیر اور تذلیل کی بناء پر اہل ہند کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگتی تھی ' یوروپین لوگوں میں بھی بہت سے حضرات کم درجہ کے ہوتے تھے مگر نسلی امتیازات کی بناء پر وہ اپنے کو اہل ہند سے افضل سمجھتے تھے '

اس کی وجہ سے کئی مرتبہ ناگوار حادثے ہوے اور ہر ایک حادثہ کشیدگی کو بڑھانے میں موثر ثابت ہوا ، ملک بھر میں اس کا اثر یہ ہوا کہ اگر ایک طرف چند انگریز عہدہ داروں کے بہت سے ہندی دوست تھے اور ان میں سے بعض کو اہل ہند کے اندر بڑی مقبولیت حاصل رہی تو دوسری طرف انگریز اپنی سوسائٹی کو بالکل الگ اور ممتاز سمجھنے لگے ' جس میں کسی ہندی کو شریک ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی ' اور اہل ہند کو کم تر درجہ پر رکھنے کیلئے اصرار کیا جا رہا تھا ، جس سے وہ ہمیشہ بچنے کی کوشش کر رہے تھے .

فرقہ وارانہ کشمکش کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک خاص مذہب اور عقیدے کے پیرو اپنی برتری کو قایم رکھنا چاہتے تھے ' اس لحاظ سے پارسیوں اور عیسائیوں کے کوئی خاص مطالبات نہیں تھے ' سکھ پنجاب میں تھے اور اس کے علاوہ دوسری جگہوں میں نہیں پائے جاتے تھے ' ہند میں بسے ہوے یوروپین اور مخلوط النسل * لوگ سارے ملک میں پھیلے ہوے تھے ' اور ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ اس قسم کے مسائل کے پیدا ہونے کی کوئی گنجایش نہیں ہوسکتی تھی ' اب صرف دو ہی گروہ ایسے رہ گئے تھے جنھوں نے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کی یعنی مسلمان اور ہندو پست اقوام .

شہروں اور دیہاتوں میں اب بھی ہندو اور مسلمان عام طور پر اتحاد کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہیں ' لیکن کبھی کبھی دو

---

* ان کا نام رکھنا بھی کچھ پر فریب ہے ، ابتدا میں مخلوط النسل لوگوں کو ' ایسٹ انڈین ، کہا جاتا تھا ' بعد میں بطور تحقیر ' دوغلا ، کہا جانے لگا ، اس ذلت سے بچنے کے لئے ان کو ' یوریشین ' بولا جانے لگا ، پھر انہی کی درخواست پر حکومت ہند نے ان کا نام ' اینگلو انڈین ' تسلیم کرلیا ، لیکن انگریزی ادب میں اس اصطلاح سے وہ لوگ مفہوم ہوتے ہیں جو انگلستان میں پیدا ہوے اور ایک زمانہ تک ہند میں زندگی بسر کی مگر سرکاری کاغذات اور اخباروں میں اس سے مراد مخلوط النسل کے لوگ لئے جاتے ہیں -

چیزوں کی وجہ سے ان کا یہ اتحاد ٹوٹ جاتا ہے اور سخت خون ریزی ہونے لگتی ہے، یعنی گاے کی قربانی اور جلوس نکالنا، بعض مسلمان گاے کے گوشت کو پسند کرتے ہیں اور اس کا کوئی لحاظ نہیں کرتے کہ ہندو گاے اور اس کے بچھڑے کو مقدس مانتے ہیں، اس کے علاوہ ایک بہت بڑی عید کے موقعہ پر جو حضرت اسحاق یا بقول مسلمانوں کے حضرت اسمٰعیل کی نجات کی یاد میں منائی جاتی ہے، مسلمان مذہبی طور پر گاے کی قربانی * کو واجب سمجھتے ہیں ہندو اور مسلمان وقتاً فوقتاً مذہبی جلوس نکالنے کے عادی ہیں؛ جس کے ساتھ کبھی کبھی ساز اور باجہ بھی ہوتا ہے، اور جب اس کی آواز سے مسلمانوں کی نمازوں میں خلل پیدا ہوتا ہے تو وہ برافروختہ ہوجاتے ہیں، ہم کو ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اس قسم کے جھگڑوں کو کہاں تک اہمیت حاصل تھی، اور ان کے حقیقی اسباب کیا تھے، البتہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ اس قسم کے جھگڑے اکثر ہوا کرتے تھے، انگریزوں کے زمانہ میں بھی اس قسم کے جھگڑے عام ہوگئے تھے، عموماً مقامی عہدہداروں اور عمائدین شہر کی کوششوں سے ان کا پرامن تصفیہ کرادیا جاتا تھا، اور جہاں کہیں ان کی کوششیں بارآور نہیں ہوتیں اور احتجاج کرنے والے اپنی باتوں پر اڑ جاتے تو یہی جھگڑے فساد کی شکل اختیار کرلیتے تھے۔

سنہ ۱۸۸۰ع کے بعد سے آریہ سماج کے بانی دیانندنے گاؤکشی کو بند کرانے کی تحریک شروع کی، مختلف جگہوں پر

* اسلام کی اصطلاح کے مطابق گاے کی قربانی سنت ہے اور ہر ایک آزاد مسلمان کے لئے، جو گاے کی قربانی دے سکتا ہو، ضروری ہے، فقہ کی ایک معتبر کتاب کے مطابق ہر ایک آدمی کی طرف سے ایک بکرے کی قربانی دینی چاہئے اور اگر گاے یا اونٹ ہو تو سات آدمی کی طرف سے قربانی دی جاسکتی ہے، اور اگر ایک گاے کی سات سے کم آدمیوں کی طرف سے قربانی دی جاے تو یہ جائز ہے، اور اگر یہ تعداد بڑھ جاے اور آٹھ یا آٹھ سے زیادہ ہوجاے تو ایک گاے کی قربانی کافی نہیں (ہدایہ، مترجمہ سی ہملٹن مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۷۰ع صفحہ ۵۹۲ -)

اس تحریک کو بڑا فروغ حاصل ہوا ، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ مذہبی جذبات بھڑکنے لگے ، اور کئی جگہ بلوے ہوگئے اور بڑی خون ریزی ہوی سنہ ۱۸۹۰ع کے بعد کا زمانہ هندو مسلم تعلقات کی تاریخ میں ایک بہت ہی بھیانک زمانہ ہے ، بہت کچھ نقصانات ہونے کے بعد یہ تحریک دھیمی پڑی ، مگر اس کی وجہ سے دونوں قوموں کے اندر اپنی قوت اور طاقت کے منوانے کا جذبہ کافی ترقی کر گیا تھا ، اسی زمانہ میں بعض پرجوش مسلمانوں نے اسلام کو ہندوانہ رسوم اور عقاید و خیالات سے پاک کرنے کی تحریک شروع کی ، جو ان کی نظر میں مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے ، اس کے بالمقابل ہندوؤں نے شدھی سنگھٹن کا راگ الاپا ، اور نو مسلم اور نو عیسائی ہندوؤں کو پھر سے اپنے حلقہ میں شریک کرنے کی کوشش کی ، ایک دوسرے کے مخالفانہ پروپگنڈوں سے ، جو اب تک برابر جاری ہیں ، ہندو مسلم تعلقات خطرناک حد تک کشیدہ ہوگئے تھے یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بالکل ہی جدا ہوگئے تھے ، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں بڑھ گئی تھیں ، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ سمجھوتہ اور مصالحت کی بجاے اپنی طاقت اور قوت کے ذریعہ تمام جھگڑوں کا فیصلہ کیا جانے لگا ، احتجاج کرنے والوں کو اچھا موقع ملا کہ عوام کے جذبات سے کھیل کر ہر ایک مقامی جھگڑے کو اتنا بڑھائیں کہ ملک کے ہر ایک گوشہ پر اس کا اثر پڑ سکے ، اس سلسلہ میں اخباروں نے بھی ان جذبات کے پھیلانے میں بڑا کام کیا ہے ۔

اپنی حیثیت کو منوانے کا جذبہ ہندوؤں کے دونوں گروہوں میں بھی پورے طور پر ظاہر تھا ، جن کے متعلق پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۔ ہندومت کے اصول کی سچائی کے معتقد یعنی رام کرشن اور اسکے پیرو یہ تبلیغ کرنے لگے تھے کہ ہندومت کے

کے تمام اصول سچے اور اچھے ہیں ، اور مغربی تہذیب پوری کی پوری خراب ہے ، اور ہر ایک ہندو کا یہ فرض ہے کہ جہاں تک ہوسکے مغربی تہذیب کے زہریلے اثرات کو دور کرنے کی کوشش کرے ، اس تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ قومی اور نسلی امتیازات بہت زیادہ ترقی کرگئے ، آریہ سماجیوں نے بھی قریب قریب اسی قسم کی باتیں کرنی شروع کی تھیں ، یہ لوگ ہندومت کی بعض چیزوں کو تسلیم کرتے تھے اور بعض کا انکار کرتے تھے ، لیکن گاؤکشی کے خلاف ان کی تحریک مسلمانوں اور یوروپین لوگوں سے ہندوؤں کی کشیدگی کا باعث بنی رہی ۔

مسلمانوں میں اب بغاوت کا جذبہ باقی نہیں رہا تھا ، یہ خیال عام ہوگیا تھا کہ وہ برطانوی حکومت کے تحت پر امن زندگی گذار سکتے ہیں ، سر سید احمد خاں کی کوششوں سے مسلمانوں میں مغربی تعلیم پھیل چکی تھی ، اور اب مسلمان سیاست میں بھی حصہ لینے لگے تھے ، لیکن ان کے نظریوں میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا ، بعض متحدہ قومیت کے حامی تھے ، اور بعض عالمگیر برادری اور حکومت الہی کے قائل تھے ، ان کی نظر میں نسلی اور جغرافیائی حدود اور امتیازات کی کوئی وقعت نہیں تھی ، اس صدی کے دوسرے نصف میں مسلمان خود اپنی ذات سے یہ سوال کرنے لگے کہ آیا وہ پہلے مسلمان ہیں اور بعد میں ہندی یا پہلے ہندی ہیں اور بعد میں مسلمان ، زیر نظر دور میں مسلمان زیادہ تر عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے اعتراضات کی تردید میں مصروف تھے ، اسلام بھی اور مذاہب کی طرح اپنی برتری اور افضلیت چاہتا ہے ، اور اس زمانہ کے مسلمانوں میں بھی اپنی برتری کا احساس کام کرتا رہا ، خلافت کا تخیل ابھی تک زندہ تھا ، اور اسی وجہ سے وہ ترکی کے انقلابات کو جہاں سلطان وقت ابھی تک خلیفہ مانا جا رہا تھا ، * بڑی تشویش

* ہند کے مسلمانوں کا عام نظریہ یہی ہے ، مگر اس کی صحت ابھی تک مشکوک ہے ۔

کی نظر سے دیکھتے تھے ' سنہ ۱۹۰۵ء تک اور اسکے بعد بھی مسلمانوں کا ایک پر جوش طبقہ اپنے آپ کو پہلے مسلمان اور بعد میں ہندی خیال کرتا تھا ۔

ہندوؤں کے حلقہ میں نیچ قوموں کا احساس خودی بھی ترقی کر رہا تھا ' ان کو پست یا اچھوت اقوام کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ' یہ لوگ ایک زمانہ سے سماجی اور اقتصادی حقوق سے محروم تھے اور ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جا رہا تھا ' اس وقت تک تو وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ قدرت نے ان کو نیچ اور پست بنایا ہے ' لیکن جب عیسائی مشنری ان کو غیرت دلانے لگے تو ان کا احساس خود داری خود بخود بیدار ہوگیا ' پرانے عیسائی مبلغ محض اپنے عقیدہ کی سچائی کے معتقد تھے ' وہ دوسروں کو ان کے معتقد ہونے کی کھلی دعوت نہیں دیتے تھے ' ان کا کام صرف تعلیم اور ارشاد تھا ' اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے عیسائی بن جاتے تو اس کی ضرور آؤبھگت کرتے تھے ' سنہ ۱۸۸۰ع کے بعد سے بہت سے امریکن مشنری ہند کے مختلف گوشوں میں پھیل گئے تھے ' ان کی توجہ زیادہ تر نیچ اور پست قوموں کو عیسائی بنانے کی طرف مبذول رہی ' ان میں سے بعض خاص خاص تبلیغی اداروں میں تربیت دیکر بھیجے جاتے تھے' ان لوگوں نے بالکل آزادی کے ساتھ اپنا کام کرنا شروع کیا اور بہت سے لوگوں کو عیسائی بنا دیا ' اور نیچ قوم کے لوگوں میں بیداری پیدا کردی اور اب وہ یہ سوال کرنے لگے تھے کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں نیچ کیوں ہیں ؟ اس کے بعد سے بہتر حیثیت حاصل کرنے کی جد و جہد ہونے لگی ' عیسائیوں کی نجات دھندہ فوج Salvation Army کے لوگوں نے بھی ان میں مذہبی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی چنانچہ اس دور کے آخر میں اچھوت اقوام کا مسئلہ بہت ہی اہمیت اختیار کرگیا تھا ۔

اچھوتوں کی تحریک کے خلاف اونچی ذات کے ہندوؤں میں دو طرح کا رد عمل پیدا ہوا ' ایک طبقہ تو اپنے پرانے خیالات

پر جما رہا اور وہ کسی سماجی تبدیلی کو قبول کرنے کیلئے آمادہ نہیں تھا ، مگر ایک دوسرا طبقہ بھی ایسا تھا جو پرانے دستور کو توڑنے کیلئے آمادہ ہوگیا ، اس نقطۂ خیال کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ نیچ ذات کے لوگوں کے تمام مطالبات بالکل حق بجانب ہیں ، اور ہندوؤں پر یہ ایک بدنما داغ ہے کہ پردیسی نیچ ذاتوں کو نجات دلانے کا کام کریں جو درحقیقت اونچی ذات کے ہندوؤں کے کرنے کا تھا ، ان خیالات کی ترقی کی وجہ سے ہندوؤں میں بھی سماجی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا ، جس کی طرف اس سے پہلے کوئی خاص توجہ نہیں تھی ، عیسائی مشنریوں کی طرح بعض اونچی ذات کے ہندوؤں نے بھی نیچ قوموں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ، اور بہت سی اصلاحی انجمنیں قایم کیں ۔

احساس خودی کا یہ جذبہ سیاسیات کے علاوہ تہذیب و تمدن میں بھی ظاہر ہوگیا تھا ، اس دور کے ادب ، موسیقی ، ناٹک ، فنون لطیفہ ، سائنس اور دوسرے تفریحی مشاغل میں بھی اپنا کام کر رہا تھا ، اہل ہند ہر ایک شعبۂ زندگی میں انگریزوں کے برابر یا ان سے بڑھکر کام کرنا چاہتے ہے ، چنانچہ انہوں نے کئی ادبی جرائد اور رسائل جاری کئے ، ناچ گانے کی گشتی کمپنیاں قایم کیں ، اور تفریحی مشاغل کا ہر جگہ انتظام کیا ، ان سب میں انگریزوں کی تقلید کی جاتی تھی ، لیکن جذبات کے لحاظ سے وہ ہندی تھے ، کلکتہ اور بمبئی میں ایک نئے آرٹ کی ابتدا ہوی جس کے معلم اگرچہ انگریز تھے ، مگر اس کی بنیاد ہند کی قدیم روایات پر رکھی گئی تھی ، اگرچہ اس سے بیرونی اثرات بالکلیہ دور نہیں ہوسکے تھے ، تاہم اس کی شکل بالکل بدل گئی تھی ، چنانچہ یہ نیا آرٹ جس سے یوروپین لوگ اتنا مانوس نظر آتے ہیں ، در حقیقت لطیف اور خوبصورت ہندی روایات کا حامل ہے ۔

سائنس کی تعلیم کیلئے اہل ہند کو باہر جانا پڑتا تھا کیونکہ اپنے دیس میں اس کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ

انتظام نہیں تھا ، کرزن کی کوششوں سے ہند کے اداروں میں سائنس کی تعلیم کی طرف ابھی ابھی توجہ کی جارہی تھی ، کیمبرج کے کامیاب امیدواروں کی فہرست میں اہل ہند کی تعداد سال بسال بڑھتی جا رہی تھی ، اور سنہ ۱۸۹۹ء میں ایک ہندی شخص کیمبرج کے ریاضی کے درجہ میں اول آیا ، اور اہل ہند کے مقالات کو انگریزوں کی علمی انجمنوں کے رسائل میں جگہ ملنے لگی تھی ، اور اس طرح سائنس کی تحقیقات کے ساتھ ان کو ایک دلی لگاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا ۔

سائنس کے علاوہ دوسرے مضامین کی تعلیم کیلئے بھی ہندی طلبہ انگلستان کا سفر اختیار کرتے تھے ، سنہ ۱۸۸۰ء میں ہندی طلبہ کی کل تعداد ایک سو ساٹھ تھی ، بیس سال بعد ان کی تعداد سات سو سے بھی زیادہ ہوگئی تھی ، لیکن جیسے جیسے تعداد بڑھتی گئی ان کی قابلیت اور لیاقت کا معیار بھی گھٹتا گیا ، اور نا کام طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ، جب ان کی تعداد کافی ہوگئی تو ہند کے طالب علم اپنی خاص انجمنیں بنانے لگے ، اور اس کے بعد سے برطانوی طلبہ کے ساتھ انکا میل جول بہت کم ہوگیا ، بہت کم طالب عام مشکلات میں مبتلا ہوے ، اولین طالب علموں کے متعلق اہل انگلستان کی راے بہت اچھی تھی ، لیکن جب نا کام طلبہ کی تعداد بڑھتی گئی تو ان کی راے بھی بدلتی گئی ، اور انگریز ان کو اپنے سے بھی کمترخیال کرنے لگے ۔ اسطرح دونوں کے تعلقات میں اور کشیدگی بڑھتی چلی گئی ۔

اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت منظم تفریحی کھیلوں کا رواج ہے ۔ اس کی وجہ سے انگریزوں اور باشندگان ہند کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقعہ ملا ، مغلوں کے زمانہ میں وسط ایشیاء کے خانہ بدوشوں کو چوگان بازی کا بڑا شوق تھا ، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمالیہ کے پہاڑی مقامات کے علاوہ دوسری جگہوں پر اس کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی ،

انگریزوں نے اس کو دوبارہ میدانوں میں رواج دیا، جہاں بڑے شوق کے ساتھ چوگان بازی ہونے لگی، خاص کر راجپوت ریاستوں کے لوگوں کو اس کھیل سے غیر معمولی دلچسپی تھی، ان میدانوں میں مغرب اور مشرق کے کھلاڑی بڑے خلوص اور تپاک کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے تھے، کرکٹ فٹ بال، ہاکی اور لان ٹینیس) مشہور انگریزی کھیل ہیں جن کا رواج انگریزی تعلیم کی بدولت انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں ہوا، اس دور میں کھیل ہی کے میدان ایسی جگہ تھے جہاں انگریز اور ہندی صلح و آشتی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل سکتے تھے، اس سلسلہ میں یہ بیان کرنا غیر موزوں نہ ہوگا کہ رنجیت سنگھجی نے، جو آگے چل کر نوانگر کے جام صاحب کہلائے، کرکٹ میں وہ نام پیدا کیا کہ اہل ہند کی غیر مشکوک قابلیتوں کا سکہ تمام لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا.

باب ۴۹

سیاسی بے چینی اور اصلاحات

سنہ ۱۹۰۶ تا سنہ ۱۹۱۴م

وایسرائے :— لارڈ منٹو سنہ ۱۹۰۵ع تا سنہ ۱۹۱۰ع

لارڈ ھارڈنگ سنہ ۱۹۱۰ع تا سنہ ۱۹۱۶ع

لارڈ کرزن کی روانگی اور پہلی جنگ عظیم کا درمیانی زمانہ اس حیثیت سے بہت مشہور ہے کہ اس دور میں اگر ایک طرف اہم دستوری تبدیلیاں ہوتی رہیں تو دوسری طرف انقلابی سازشیں بھی کی جارہی تھیں ' مگر ان کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے ہم ملک کے عام حالات بیان کردینا چاہتے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۱ع میں شہنشاہ جارج پنجم نے اپنے ورود مسعود سے ہند کو زینت بخشی اور راجہ اور پرجا دونوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی ' جس سے شہنشاہ کی ذات کے ساتھ ان کی دلی عقیدت ظاہر ہو رہی تھی ' اس موقعہ پر حکومت ہند نے چند فیصلوں کا اعلان کیا جن میں سے ایک پایۂ تخت کا بدلنا اور دوسرا بنگال کا ایک مستقل صوبہ قرار دینا تھا ' حکومت کا مستقر کلکتہ کی بجائے نئی دھلی قرار پایا ' اور بنگال کو مشرق طرف آسام سے اور مغرب طرف بہار ' اوریسہ اور چھوٹا ناگپور سے الگ کرکے ایک علحدہ صوبہ بنایا گیا ۔

شہنشاہ کی ذات کے ساتھ دلی عقیدت کو اہل ہند کے اس جذبہ سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ آیا وہ برطانوی حکومت کے ماتحت ہوکر رہیں یا آزاد ہوجائیں ' تعلیم یافتہ باشندگان ہند کی ایک بڑی تعداد برطانوی حکومت کے ساتھ تعلق رکھنے کی خواہشمند تھی یا کم از کم اس کو ضروری قرار دیتی تھی ' لیکن چند افراد ایسے بھی تھے جو برطانوی حکومت سے بالکل ہی قطع تعلق کرلینا چاہتے تھے ' ان کے خیالات کو کچھ اس وجہ

سے بھی مقبولیت حاصل ہونے لگی تھی کہ دوسری نو آبادیات میں باشندگان ہند کے ساتھ برا سلوک کیا جانے لگا تھا ، جنوبی آفریقہ میں تو اس مسئلہ نے بہت ہی نازک صورت اختیار کرلی تھی ، نٹال کے ان باشندگان ہند کے ساتھ جو معاہدوں اور اقرار ناموں پر دستخط کرکے یہاں مزدوری کرنے کے لئے آئے تھے ، اور جن میں سے بہتوں کی میعاد ملازمت ختم ہوچکی تھی ، بہت ہی برا طرز عمل اختیار کیا گیا تھا ، آزاد باشندگان ہند بھی اس طرز عمل سے مستثنی نہیں تھے ، سب پر رسوا کن محصول اور ذلیل پابندیاں عائد کی جا رہی تھیں ، ان کو کمترین درجہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا ، ٹرانسوال میں بھی اسی قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں ، جب ٹرانسوال خود مختار تھا ، برطانوی حکومت نے بارہا حکومت ٹرانسوال کے طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا تھا ، اس کے الحاق کے بعد اہل ہند کی حیثیت اور بھی بدتر ہوگئی تھی ، جنوبی آفریقہ میں ایک زمانہ تک ہندی شور مچاتے اور مظاہرے کرتے رہے ، ہند میں بھی جنوبی آفریقہ کی حکومت کے طرز عمل کے خلاف احتجاجات ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۱۱ع میں ہند سے مزید آدمیوں کے نٹال جانے کی ممانعت ہوگئی ، اور اس کے ساتھ ساتھ ہند کی رائے عامہ اقرار ناموں کے ذریعہ مزدوروں کی بھرتی کرنے کی سخت مخالف ہوتی جا رہی تھی کیونکہ باشندگان ہند کے خیال میں اس طریقہ سے اپنی قومی خودداری کو بڑی ٹھیس لگ رہی تھی ، آخر حکومت ہند نے سنہ ۱۹۱۵ع میں اس طریقہ کی بھرتی کو بالکل ہی ممنوع قرار دیدیا ۔

سرحد پر امیر حبیب‌اللہ خاں کے ساتھ حکومت ہند کے دوستانہ نہیں تو کم از کم واجبی تعلقات ضرور تھے ، وہ لندن کی حکومت کے ساتھ براہ راست تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کررہا تھا ، سرحد کے آزاد قبایل کی ایک حد تک روک تھام ہوگئی تھی ، مگر اس علاقہ میں ایک نئی اور خطرناک صورت حال

پیدا ہو رہی تھی ' انیسویں صدی میں آزاد قبایل کے پاس عمدہ قسم کے جنگی ہتھیار نہیں تھے ' اس صدی کے آخر میں سرحدی علاقہ میں ان کی تجارت ہونے لگی تھی ' جدید قسم کے ہتھیار اور گولہ بارود خلیج فارس کے راستہ سے لائے جاتے تھے ' پہلے پہل بلوچستان کے راستہ سے یہ سامان پہنچایا جانے لگا تھا ' لیکن آگے چلکر مشرقی ایران کے راستہ سے یہ سامان سرحد جانے لگا تھا ' یہاں تک کہ سنہ ۱۹۰۶ع میں ان کی تجارت بڑے وسیع پیمانہ پر ہو رہی تھی ' چار سال بعد انگریزوں نے خلیج فارس کی زبردست ناکہ بندی کی ' لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا کیونکہ اس سے پہلے ہی سرحدی قبایل کے ہاتھوں میں کافی سامان جا چکا تھا ' اور وہ ان نئے ہتھیاروں سے بالکل مسلح ہوگئے تھے ' اس کی وجہ سے حکومت ہند کو ہر وقت ایک قسم کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا ۔

خود ہند کے اندر آبادی ایک بڑی حد تک بڑھ چکی تھی طاعون کی شدت میں اب کمی ہوگئی تھی اور دیہاتوں میں نہ بھی ہو تو کم از کم شہروں میں ہیضہ اور دوسری قسم کی بیماریوں پر قابو حاصل ہوگیا تھا ' میلوں دور تک ریلوں اور نہروں کے نکل آنے سے تجارت کو بڑا فروغ ہوگیا تھا ' ملک کے بعض حصوں میں زراعت اور امداد باہمی کے نئے محکموں سے اچھے نتائج پیدا ہو رہے تھے ' اس دور کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت صنعت و حرفت کی ترقی ہے ' ابتدا میں اس کی تحریک محض جذبات سے لبریز تھی ' کوئی عملی اقدام نہیں کیا جا رہا تھا ' تعلیم یافتہ نوجوانوں کا خیال تھا کہ جب ہند ہی میں ساری چیزیں تیار ہوسکتی ہیں تو باہر سے مال کے در آمد کرنے کی کیا ضرورت ہے ' چنانچہ یہ ایک سیاسی عقیدہ ہوگیا تھا کہ ضرورت کی تمام چیزیں ہند ہی میں تیار ہونی چاہئیں ' اسی بناء پر در آمدی کپڑے کا بعض جگہ مقاطعہ کیا جانے لگا تھا اور دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ بے روزگار تعلیم یافتہ ہندیوں

کو کام دلانے کیلئے دیسی مصنوعات کو فروغ دینا چاہئے ' کالجوں سے جو طالب علم پڑھ کر نکلتے تھے ' ان میں سے ایک مختصر تعداد ہی کو سرکاری ملازمت مل سکتی تھی ' باقی لوگ کوئی دوسرا پیشہ اختیار نہیں کرسکتے تھے کیونکہ ہر ایک پیشہ میں ضرورت سے زیادہ آدمی موجود تھے ' اس لیے لا محالہ ان کی نظر ان کارخانوں پر پڑتی تھی جن کے مالک اور منتظم پردیسی تھے اس سلسلہ میں جو مذاکرے ہوے ان کا ما حصل یہی تھا کہ سائنس اور صنعت و حرفت کی تعلیم اور تحقیق کیلئے تمام آسانیاں فراہم کی جائیں ' حکومت وقت کو بھی ان ضروریات کا پورا احساس تھا مگر وہ اس وقت تک اس کی طرف توجہ نہیں کرسکتی تھی جب تک کہ ماہرین تعلیم رائے عامہ کی تائید نہ کریں .

اس دور کا ایک اہم کارنامہ لوہے اور فولاد کا کارخانہ تھا جو چھوٹا ناگپور میں قایم ہوا ' یہاں تین ضروری چیزیں یعنی خام دھات ' کوئلہ اور چونے کا پتھر دستیاب ہوتا تھا ' اسی کارخانہ کے قیام سے وسیع پیمانہ کی صنعت کی ابتدا ہوی ' اس سے پہلے صنعتی کارخانے معمولی حیثیت کے ہوتے تھے ' اور دھیرے دھیرے ان کو ترقی دی جاتی تھی ' ان کارخانوں کے ہندی سرمایہ دار یوروپ اور امریکہ کے ماہرین کی خدمات حاصل کرتے تھے ' جو بڑی تحقیقات کے بعد کام کی نوعیت کے متعلق بڑے پیمانہ کی تجویزیں پیش کرتے تھے ' جس سے اہل ہند پہلے سے آشنا نہیں ہوتے تھے ' ان ماہرین کی تمام تجویزیں یوروپ کی جدید تحقیقات ور مہارت پر مبنی ہوتی تھیں ' ان کی یہ تجویزیں اس وجہ سے کامیاب نہیں ہوسکیں کہ اگر ایک طرف کارخانوں کے مالک تحفظی محصولوں Protective duties کو اپنی صنعت کی کامیابی کا ذریعہ سمجھتے تھے تو دوسری طرف انگلستان میں آزاد تجارت کے اصول کو ابھی تک تسلیم کیا جا رہا تھا ' اور جان (بعد میں لارڈ) مارلے سے جو سنہ ۱۹۰۵ع میں وزیر ہند مقرر ہوا کسی سرکاری

امداد کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی ، حکومت ہند نے اس مشکل کو اس طرح رفع کیا کہ اس نے پٹڑیوں کی خریداری کا ذمہ اپنے اوپر لے لیا اور دوسری مراعات بھی عطا کیں اس کے بعد ایک بہت بڑا فولادی کارخانہ کھولا گیا اور اس طرح چھوٹا ناگپور کے جنگل میں جمسیٹھ جی ٹاٹا * کے نام سے جمشید پور اور ٹاٹا نگر کے دو شہر وجود میں آئے جن کی تعمیر اور تنظیم سائنس کے جدید اصول کے مطابق کی جا رہی ہے ۔

جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا ہند کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی دلچسپی صنعت و حرفت کے ساتھ بڑھتی گئی ، سیاست کے بعد ان کی توجہ صنعت ہی کی ترقی کی طرف مبذول رہی عوام کی مفلسی ، زراعت کی ترقی ، پرانی دستکاریوں کی بحالی ، آزاد تجارت کے فوائد اور نقصانات ، کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت اور اس قسم کے دوسرے مباحث پر مذاکرے ہوتے تھے ، ان مباحث پر اس انداز سے بحث کی جاتی تھی جس سے مذاکرہ کرنے والوں کی نا واقفیت ظاہر ہوتی تھی ، ہر ایک کے متعلق خیالی خاکے بنائے جاتے تھے ، لیکن ان بحثوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ نصاب تعلیم میں ان مضامین کو شامل کرنے کی طرف لوگوں کو توجہ ہوی اور اس طرح یونیورسٹیوں میں اقتصادیات کے مضمون کو بھی جگہ دی گئی ، اور مختلف شعبے بنائے گئے اور ہر ایک کیلئے باقاعدہ اساتذہ مقرر کئے گئے ، ابتدا میں طلبہ کو صرف اقتصادیات کی سطحی معلومات ہوتی تھیں ، وہ بسا اوقات زیادہ نمبر لینے کی غرض سے ان کورٹ لیا کرتے تھے ۔

تعلیم کے میدان میں بہت سی ترقیوں میں سے ایک ترقی یہ تھی کہ کرزن نے تعلیمات کے متعلق ایک مفید تجویز پیش کی اور سنہ ۱۹۰۴ع میں قانون جامعات (Universities Act) منظور ہوا ، اس کے بعد سے یونیورسٹیوں کی حیثیت محض ممتحنوں

* فارسی زبان کا اصل لفظ جمشید ہے مگر ٹاٹا ہمیشہ اپنا نام جمسیٹھ لکھتے تھے ۔

کی نہیں رہی بلکہ تمام الحاقی کالجوں پر ان کو اختیار حاصل ہوگیا تھا ان میں پوسٹ گرایجویٹ (Post Graduate) تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا تھا لیکن چونکہ یونیورسٹیوں پر ایک حد تک حکومت کا بھی اختیار تھا اس لئے اصلی مقاصد کے حصول میں بڑی رکاوٹ پیش آتی تھی ' صنعت و حرفت اور پیشہ کی تعلیم کی طرف بھی تھوڑی بہت توجہ کی گئی تھی ' ابتدائی اور ثانوی مدارس میں بچوں کی تعلیم کیلئے پہلے سے زیادہ امدادی رقم دی جانے لگی تھی ' حکومت لوگوں کی عام تعلیم کا انتظام کرنے کی کوشش کر رہی تھی ' جس کی طرف تعلیم یافتہ لوگ حکومت کو توجہ دلاتے رہتے تھے ' اس حیثیت سے اس دور کی ایک اہم شخصیت گوپال کرشن گوکھلے کی ہے ' جو اپنے زمانہ کا ایک ممتاز ماہر تعلیم تھا ' اس نے سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس کو حکومت نے منظور نہیں کیا ' اسی نے سب سے پہلے اس پر زور دیا تھا کہ ملک بھر میں عام ابتدائی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہئے ' وہ اور اس کے ساتھی سارے ہند کو ایک ملک تصور کرتے تھے اور اعلی تعلیم یافتہ اور عام لوگوں کے آپس کے امتیاز کو ختم کردینا چاہتے تھے .

سماجی اصلاحات کے مسائل سے متعلق مختلف بحثوں میں بھی یہی نظریہ کام کر رہا تھا ان سماجی مسایل میں سے ایک اہم مسئلہ گرام سدھار کا بھی تھا ' مگر اس زمانہ میں پورے عوام کی اصلاح کا کوئی خیال نہیں تھا بلکہ لوگ خاص خاص گروہوں کو ترقی پر لانے کی کوشش کر رہے تھے - ان کی توجہ زیادہ تر اچھوتوں کی طرف مبذول تھی - گو کھلے اور اسکے رفقائے کار کا یہ کہنا تھا کہ وہ باشندگان ہند جو دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں مساوی درجہ پانے پر اصرار کرتے ہیں ' پہلے اپنے درمیان مساوات کے اصول کو قایم کریں ' اونچے اور متوسط طبقوں میں اس تبلیغ کا صرف اتنا ہی اثر ہوا کہ ذات پات کی بندھنیں

کچھ ڈھیلی ہوگئیں ' سب سے زیادہ انقلاب عورتوں میں ہوا ' وہ پڑھ لکھ کر مردوں کی برابری کرنے لگیں ' اور گھر کی چار دیواری سے نکل کر قومی تحریکات میں زبردست حصہ لینے لگیں ' اب بچپن کی شادیوں کا رواج کم ہو چلا تھا ' تعلیم یافتہ عورتیں بڑی عمر کو پہنچ کر شادی کرنے لگی تھیں ' ان مسائل پر خوب بحثیں ہوتی تھیں اور کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا تھا - اکثر لوگ اپنے پرانے طریقوں پر قایم رہے لیکن بعض پرجوش کارکن اپنے خیالات برملا ظاہر کرتے تھے جن کا اثر بتدریج ہو رہا تھا - یہاں تک کہ آج ہند کی معاشرت بالکل ہی بدل گئی .

اب ہم ان دستوری تبدیلیوں کا جائزہ لیتے ہیں جو اس دور میں پیش آئیں' کرزن نے یوں تو حکومت کے مختلف شعبوں میں تبدیلیاں کیں مگر مجلس قانون ساز کے اندر کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی - حالانکہ وہ اب بالکل فرسودہ ہوچکی تھی ' لیکن کانگریس برابر یہ مطالبہ کرتی رہی کہ ہند کے اندر بھی اسی قسم کی ذمہ دارانہ حکومت قایم کی جائے جو دوسری نو آبادیات میں پائی جاتی ہے - وایسرائے ہند لارڈ منٹو اور وزیر ہند مارلے کو اس کے اس مطالبہ سے بالکل اتفاق نہیں تھا ' مگر ان دونوں نے ملکر ایک دوسری تجویز پیش کی جو تاریخ ہند میں منٹو مارلے اسکیم کے نام سے مشہور ہے ' اس کے ذریعہ مجالس قانون ساز کی توسیع کی گئی اور باشندگان ہند کو کچھ اختیارات بھی دئے گئے مگر ذمہ دارانہ حکومت کے عطا کرنے سے بالکل انکار کردیا گیا تھا ۰ اس اسکیم کا نفاذ سنہ ۱۹۰۹ع میں ہوا .

جب قانون ساز اراکین کی تعداد بڑھ گئی تو مختلف مفادات کی نمائندگی بھی کچھ مشکل نہیں تھی ۰ اب مجالس قانون سازمیں مختلف نقطۂ خیال کے لوگ جمع ہوگئے تھے ' مقامی حلقہائے انتخاب میں ' باقاعدہ انتخاب کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا ۰ یہ حلقے ان نمائندوں پر مشتمل ہوتے تھے جن کو بلدی اور دیہی مجالس کے اراکین منتخب کرتے تھے ۰ ہند کی منظم جماعتیں

بھی انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندے بھیجتی تھیں ' ان کیلئے نامزد اراکین کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم تبدیلی یہ تھی کہ مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت تسلیم کرلی گئی تھی جو اب سیاست میں حصہ لینے لگے تھے ' وہ ہندو اکثریت کے حلقوں سے انتخاب کے لئے کھڑا ہونا پسند نہیں کرتے تھے ' ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کے لئے جداگانہ انتخاب رکھا جاے اور ان کی تعداد سے زیادہ ان کی نشستیں متعین کی جائیں ہندوؤں کی سخت مخالفت کے باوجود حکومت وقت نے ان کے یہ دونوں مطالبات تسلیم کرلئے تھے ' اور دستور میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے اصول کو قانوناً مان لیا تھا ۔

ان مجالس قانون سازمیں تین قسم کے اراکین تھے ' ایک سرکاری ' دوسرے منتخب اور تیسرے وہ غیر سرکاری لوگ جو خاصکر مختلف غیر منظم مفاد کی نمائندگی کرنے کیلئے نامزد کئے جاتے تھے ' صوبوں کی مجالس قانون سازمیں سرکاری اراکین کی تعداد بہت کم تھی ' اگر منتخب اور نامزد اراکین کسی ایک مسئلہ پر متفق ہوجائیں تو وہ بآسانی حکومت کو شکست دے سکتے تھے ' مگر مرکزی مجلس قانون سازمیں ابھی تک سرکاری اراکین ہی کی کثرت تھی ' اراکین کو اعتراضات کرنے ' سوالات پوچھنے اور تجویزوں کے پیش کرنے کی اجازت تھی ' اگرچہ غیر سرکاری اراکین رسمی طور پر کچھ کر نہیں سکتے تھے لیکن عملاً حکومت کے نظم و نسق پر ان کا بڑا اثر پڑ رہا تھا وہ اپنے خیالات کو پر زور طریقے پر پیش کرسکتے تھے اور حکومت پر اس طرح دباؤ ڈال سکتے تھے ' کہ وہ اپنی صفائی پیش کرنے پر مجبور ہوجاے ' اس حیثیت سے وہ ملک کی رہنمائی اور راے عامہ کے بدلنے کا فرض انجام دیتے تھے ' منٹو اور مارلے کتنا ہی یہ دعوی کریں کہ ان کا مقصد ہند میں پارلیمنٹری طریقہ کو جاری کرنے کا نہ تھا ' لیکن عملاً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی مجالس قانون ساز پارلیمنٹری طریقہ پر ڈھل گئیں ' اگر اس میں کسی چھز کی

کمی تھی تو وہ صرف ذمہ دارانہ وزارت کی تھی جو اب تک باشندگان ہند کو حاصل نہیں ہوسکی تھی، ملک کے نظم و نسق کی متعلق حکومت ہند مجالس قانون ساز کی بجائے لندن کی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ تھی، بسا اوقات حکومت ہند کو اس قسم کی حکمت عملی کی تائید کرنی پڑتی جس کو وہ خود ماننے کیلئے تیار نہیں ہوتی تھی، اور جو لندن کی حکومت کی طرف سے اس پر عائد کی جاتی تھی، اس طرح ان مجالس قانون ساز کی کارروائیوں میں حقیقت کا عنصر بہت کم ہوتا تھا، باشندگان ہند ایسی بڑی تجویزیں پیش کرسکتے تھے، جن پر عمل کرنا بہت دشوار تھا اور جن کے متعلق انہیں یقین تھا کہ ان پر کبھی عمل نہیں ہوگا، تعمیری اور تنقیدی دونوں موقعوں پر بے جوڑ اور غیر ذمہ دارانہ باتیں کی جاتی نہیں، حالانکہ اس وقت ہند کے سیاسی کارکنوں کو حقیقت سے آشنا ہونے کی بہت ضرورت تھی اس قانون کے نفاذ کے بعد حکومت کے اعلی عہدوں میں باشندگان ہند کو بھی لیا جانے لگا، چنانچہ سنہ ۱۹۰۹ع میں وایسرائے کی مجلس عاملہ میں ایک ہندی مشیر قانون کو بھی لیا گیا اور اسی کے ساتھ ساتھ وزیر ہند کے دفتر میں دو ہندی اراکین کا تقرر عمل میں آیا.

اس دور کی دوسری اہم خصوصیت انقلابی سازشوں کا ظاہر ہونا ہے، یہ سازشیں زیادہ تر طالب علموں کے طبقہ سے ہوتی تھیں، ان کی سیاسی سرگرمیوں سے امن عامہ کو بہت بڑا خطرہ پیدا ہوگیا تھا، طالب علموں کی آبادی کا لحاظ کرتے اس قسم کے انقلابی بہت کم تھے، ان کی اکثریت انقلابیوں سے متفق نہیں تھی، اس مقصد سے تلک نے پونا میں طالب علموں کی بھرتی کرنی شروع کی تھی جن کا کام حکومت کے ان قوانین کے خلاف مظاہرہ کرنا ہوتا تھا جن کا بیان گذشتہ باب میں ہوچکا ہے، بظاہر جسمانی ورزش کے لئے مختلف انجمنیں بنائی جاتی تھیں، مگر ان کا مقصد حقیقت میں اپنے منصوبوں کو بروےکار لانا

ہوتا تھا ' سنہ ۱۸۹۷ء میں جو بے شمار سیاسی قتل ہوے ان میں ان انجمنوں ھی کے کارکنوں کا ہاتھ تھا - پہلی سزا کے بعد تلک نے کچھ دنوں تک عملی جد و جہد ترک کردی تھی ' لیکن اس کے خیالات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوی تھی ' سنہ ۱۹۰۷ء میں اس کے خیالات کا اثر نہ صرف طالب علموں پر بلکہ مغربی ہند کے دیہات کے کسانوں پر بھی پڑا ' سنہ ۱۹۰۸ء میں اس نے ایک سلسلۂ مضامین شایع کیا جس میں سیاست کے اندر تشدد سے کام لینے کی تبلیغ کی اور قتل و خون کو جائز قرار دیا ' اور سیاسی جنگ میں بم کے استعمال کی حمایت نہیں کی بھی تو کم از کم اس کو پسند کیا ' اس کے بعد اس کو چھ سال تک کی قید کی سزا ملی ' اس دوران میں ہند کے مغربی حصہ میں ایک حد تک امن قایم ہوگیا تھا ' اور سازشیں بہت کم ہوگئی تھیں .

اس دور میں سازشوں کا سب سے بڑا مرکز بنگال تھا ' بنگال کی وجہ سے جو ناراضی اور برہمی لوگوں میں پیدا ہوگئی تھی وہ متوسط طبقہ کی بے روزگاری سے اور بھی بڑھ گئی تھی اور ان کے اندر ایک طرح کی بیچینی پیدا ہوگئی تھی ' اور تلک کے طریقوں کو یہاں زیادہ فروغ ہونے لگا تھا ' اسکولوں میں وسیع پیمانہ پر ان کی تبلیغ ہونے لگی تھی ' دوسرے صوبوں میں بہت سے تعلیمی ادارے سرکاری امداد پر قایم تھے اور اس کی وجہ سے حکومت ان پر اپنی نظر رکھ سکتی تھی ' مگر بنگال میں زیادہ تر نجی مدرسے تھے - جن کو حکومت کی طرف سے کوئی امداد نہیں ملتی تھی - انکے علاوہ بہت سے خانگی مدرسے بھی تھے ' جو خاص اپنے پیسے سے چلتے تھے ' ان پر حکومت کو کسی قسم کا اختیار نہیں تھا مقصد یہ تھا کہ کم سے کم خرچ پر زیادہ سے زیادہ سطحی قسم کے طالب علم پیدا کریں ' سازش کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد انہی مدرسوں سے فراہم ہوتی تھی ' ان کی تعلیم و تربیت اعلی پیمانہ پر نہیں تھی ' وہ

اپنے مستقبل سے بالکل مایوس تھے ، وہ وطنیت کے جذبہ سے سرشار تھے وہ اپنے رھنماؤں سے جو کچھ سنتے اور انتہا پسند اخباروں میں جو کچھ پڑھتے ، اس کو بے چون و چرا تسلیم کرلیتے تھے ، ان کا کام ھی یہ تھا کہ بڑے بڑے سرکری عہدہ داروں کو اپنی گولی کا نشانہ بنائیں ، دن دھاڑے ڈاکہ ڈالیں اور لوٹ مار کریں اور بدیسی مال کا زبردستی مقاطعہ کریں .

قتل کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے عہدہ دار دھشت اور خوف کے مارے اپنا کام چھوڑدیں ان دھشت انگیزوں نے لفٹننٹ گورنر سے لیکر پولیس کے افسروں تک کی جان لینے کی کوشش کی جو صرف اپنے فرایض ادا کرنا چاھتے تھے . انھوں نے ان باشندگان ھند کو بھی قتل کیا جنھوں نے پولیس کو سراغ رسانی اور دوسرے کاموں میں مدد دی اس میں بعض وقت ان کو کامیابی بھی ھوی اس مقصد کے حاصل کرنے کیلئے انھوں نے عام طور پر بم اور پستول کو استعمال کیا ، اور ریلوں کو گرانے کی کوشش کی ، منظم ڈاکہ ڈالنے سے ان کی غرض یہ تھی کہ انکی سازشی سرگرمیوں کے جاری رکھنے کیلئے سرمایہ ھاتھ آئے ، طالب علموں نے پورے تشدد کے ساتھ در آمدی مال کا مقاطعہ کرنا شروع کیا ، اور قانونی چارہ جوئی کرنے کی بجاے دھشت انگیزی کی کوشش کی ، دوسرے صوبوں میں بھی ان متشددانہ طریقوں کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ، مگر یہ کوشش عام طور پر کامیاب نہیں ھوسکی ، البتہ پنجاب میں ، جہاں چند لوگوں کو خاص قسم کی شکایات پیدا ھوگئی تھیں ، سنگین جرائم کا ایک سلسلہ شروع ھوگیا تھا ، اس کے ساتھ ساتھ لندن میں بھی سازش کا ایک مرکز قایم کیا گیا تھا اور ایک جلسہ میں ایک انگریز افسر اور ایک ھندی کو گولی کا نشانہ بنایا گیا ، اسی کے بعد سے اھل انگلستان کو معلوم ھوا کہ یہ تحریک کس حد تک آگے بڑھ چکی ھے ، اسی طرح ممالک متحدہ امریکہ میں بھی ایک خفیہ سازشی انجمن قایم کی گئی تاکہ ھند کے سازشی افراد کی منظم طریقہ پر رھنمائی کی جائے .

ان جرائم کے مقدمات کا فیصلہ اکثر وقتی قوانین کے مطابق ہوتا تھا، مگر انتہا پسند اخبارات کو اپنے قابو میں رکھنے کیلئے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ حکومت کو نئے اختیارات حاصل ہوں، کیونکہ تلک کے خیالات سے متاثر ہوکر بعض اخبارات نے اپنے پڑھنے والوں کو قانون کے توڑنے کی ترغیب دینی شروع کردی تھی، چنانچہ سنہ ۱۹۰۸ع میں ایک قانون منظور ہوا جس کے ذریعہ اس قسم کے انتہا پسند اخباروں کو دبانے کی کوشش کی گئی، پھر دو سال بعد قانون مطابع (Press Act) جاری ہوا، اس کا مقصد اخباروں کا احتساب کرنا نہیں تھا، بلکہ کچھ ایسے طریقوں سے ان کی نگرانی کرنی تھی جن سے اشتعال انگیزی بالکل بند ہوجائے، اس کے باوجود بنگال میں برابر تشدد برتا جا رہا تھا، اور ایک زمانہ تک وہاں سازشیں ہوتی رہیں، چونکہ تشدد کی تحریک متوسط طبقے کے اندر، جو اقتصادی بدحالیوں سے بالکل پریشان تھا اچھی طرح جڑ پکڑ چکی تھی اس لئے بنگال کے دونوں حصوں کو ملا دینے کے بعد بھی تشدد میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی، ملک کے دوسرے حصوں میں بھی تشدد کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے، سنہ ۱۹۱۲ع میں دھلی کے اندر وایسرائے پر حملہ کیا گیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پایہ تخت دھلی میں بھی سازشی لوگ اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے.

یوں تو ہر ایک سنجیدہ اور متین شخص سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے تشدد کے استعمال کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، لیکن ہند کے تین طبقے علانیہ اس کے مخالف تھے، والیان ریاست جو پہلے ہی سے برطانوی ہند کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتے تھے، انتہا پسند اخباروں کے بڑھتے ہوے اثر کو خطرناک خیال کرنے لگے اور انھوں نے وایسرائے کے ایک مراسلہ کے جواب میں ان اخباروں پر پابندیاں عاید کرنے کی پر زور حمایت کی، گو کھلے اور دوسرے ہندو رہنماؤں نے، جو اعتدال پسند جماعت سے تعلق رکھتے تھے، انتہا پسند لوگوں

کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا ' تیسرا طبقہ مسلم لیگ کا تھا ' اس میں ہر نقطہ خیال کے لوگ شریک تھے ' اس کے باوجود اس نے برطانوی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا باقاعدہ اعلان کیا ' مسلم لیگ کی بنیاد سنہ ۱۹۰۸ء میں پڑی تھی ' سر سید احمد خاں کی وفات کے بعد سے لیکر دس سال تک مسلمانوں کا کوئی خاص رہبر نہیں تھا ' آئینی انقلابات کی بناء پر انھیں اس کا احساس پیدا ہوا کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک سیاسی جماعت بنائیں ' چنانچہ نئے رہبروں کی سرکردگی میں مسلمانوں نے سیاست کے اندر ایک زبردست حصہ لینا شروع کیا .

مجموعی حیثیت سے اس دور میں قومیت سے زیادہ فرقہ وارانہ جذبات کا غلبہ رہا ' هندو بالکل بٹے ہوئے تھے ' ان کے ساتھ مسلمانوں کا سیاسی حیثیت سے کوئی اتفاق نہیں تھا ' کیونکہ وہ دستور میں اپنی جداگانہ حیثیت کا مطالبہ کر رہے تھے ' دوسری اقلیتیں مسلمانوں کے نمونہ کی تقلید کر رہی تھیں ' اس کے باوجود قومیت کا جذبہ اندر اندر ترقی کرتا رہا ' اور اس کا اثر خاموش طبیعت کے رجعت پسند اور چیخ پکار کرنے والے انتہا پسند دونوں طبقوں پر پڑ رہا تھا ' بعض نوجوان زمیندار اور تاجر پیشہ ور سیاستدانوں کا ساتھ دینے لگے تھے ' اس طرح وہ اپنے والدین کی همدردی کھوتے جارہے تھے ' بعض ریاستیں یہ محسوس کرنے لگی تھیں کہ اب ان کا مفاد هند هی کے ساتھ وابستہ ہے ' الغرض خیالات میں ایک طرح کی تبدیلی ہوتی جارهی تھی .

اس دور میں ریاستوں کے اندر بھی اہم تبدیلیاں ہو رہی تھیں ' اگرچہ ان میں سے اکثر اب بھی ترقی کی دوڑ میں برطانوی هند کے صوبوں سے بالکل پیچھے تھیں ' تاهم ان میں سے بعض ان کی برابری کر رہی تھیں اور بعض تو ان سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں ' ریاستوں کے نظام مالیات کی بہت کچھ اصلاح ہوگئی تھی ' میزانیہ اور حساب کتاب کا طریقہ رائج ہوگیا تھا ' ان افسروں کے ذریعے جو پڑوس کے

صوبوں سے مستعار لئے جاتے تھے ' لگان کی تشخیص کی جانے لگی تھی ' یہ افسر اپنے ساتھ نئے طریقے لائے جن سے وہ واقف تھے اور ان کو ریاستوں میں جاری کیا ' بچت رقم کو ہنڈی میں تبدیل کیا جانے لگا یا ایسے رفاہ عام کے کاموں میں صرف کیا جانے لگا جن سے ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہوسکتا تھا ' خزانے کو بھرکر رکھنے کا پرانا دستور جاتا رہا جس سے والی ریاست اپنی ضروریات پر بلا روک ٹوک خرچ کرسکتا تھا ' اب اس کی جگہ مالیات عامہ Public Finance کا صحیح تصور پیدا ہوگیا تھا ۔ تعلیم ' حفظان صحت اور دوسرے شعبوں میں برطانوی ہند کی تقلید کی جانے لگی تھی بلکہ بعض اوقات اس سے بہتر نظام کے قایم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ' جنوبی ہند میں ریاست میسور اور شمالی ہند میں ریاست گوالیار نے اقتصادی ترقی کے لئے پہلا عملی قدم اٹھایا ' حیدرآباد میں اردو زبان اور ثقافت سے خاص دلچسپی لی جانے لگی تھی ' بروڈہ میں ابتدائی تعلیم کو عام کیا گیا اور بہت سی سماجی اصلاحات ہوئیں ' ٹراونکور اور کوچین میں برطانوی ہند سے بھی زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب تھا ' یہ ریاستیں دوسروں کیلئے نمونہ کا کام دے رہی تھیں ' بہت سی دوسری ریاستوں نے برطانوی ہند کے قابل افراد کی خدمات حاصل کیں اور ان کو وزارت کے عہدہ پر مامور کیا ' اس کی وجہ سے برطانوی ہند کے تمام طریقے ان ریاستوں میں بھی رائج ہوگئے ' اس کے باوجود ریاستوں کا تنوع باقی تھا ' بعض راجپوت رئیس اب بھی اپنے پرانے طریقوں پر کاربند تھے ' لیکن اگر ریاستوں پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ریاستیں برطانوی ہند سے بہت زیادہ متاثر ہوتی جا رہی تھیں ۔

باب ۵۰

پہلی جنگ عظیم کے نتایج

وایسرائے :— لارڈ هارڈنگ تا سنہ ۱۹۱٦ع

لارڈ چیمسفورڈ سنہ ۱۹۱٦ع تا سنہ ۱۹۲۱ع

جنگ کی وجہ سے برطانوی سلطنت میں هند کو ایک نمایاں حیثیت حاصل هوگئی ، اور اس نے ذمہ دارانہ حکومت کی پہلی منزل طے کرلی ، اور اب یہ قطعی امید هوگئی کہ آئندہ چلکر اس کو درجہ نوآبادیات Dominion Status عطا کیا جائیگا ، یعنی هند کی حیثیت کنیڈا یا آسٹریلیا کے برابر تسلیم کی جائیگی ، یہ تبدیلی کچھ بیرونی اثرات یا دباؤ کا نتیجہ نہیں تھی ، بلکہ مخصوص حالات کی بناء پر تھی ، اور خاصکر اس وجہ سے کہ باشندگان هند نے بڑی مشکلات کے وقت برطانوی حکومت کی امداد کی تھی .

جب سنہ ۱۹۱۴ع میں جنگ چھڑی تو هند کیلئے کوئی خاص خطرہ نہیں تھا ، ابتدا میں جرمنی کے ایک جنگی جہاز نے مشرقی ساحل پر اپنی طاقت کا کچھ مظاهرہ کیا لیکن جب انگلستان کا بحری بیڑا بہت مضبوط هوگیا ، تو هند کے سمندروں میں دشمن کے جہازوں کی سرگرمیاں بند هوگئیں ، نیپال اور تبت زمینی لڑائیوں میں اتحادیوں کی مدد کرتے رهے ، باوجود اس کے کہ جرمنی کے کارندے افغانستان میں اپنا جال بچھا رهے تھے ، امیر افغانستان اتحادیوں کا وفادار رها ، اور جب سنہ ۱۹۱۷ع میں روس کو شکست هوگئی تو افغانستان کی طرف سے ایک نیا خطرہ پیدا هوگیا کیونکہ جرمنی کیلئے ترکی سے لیکر افغانستان تک کا راستہ بالکل کھلا هوا تھا ، ایران میں اتنی طاقت نہیں تھی ، کہ جرمنوں نے بڑھتے هوے ریلے کو روک سکے ، چنانچہ افغانستان کی مغربی سرحد پر دشمنوں کی سرگرمیاں شروع

ہوگئیں ' مگر چونکہ جرمنی دوسرے محاذوں پر لڑنے میں مصروف تھا اس لئے افغانستان پر حملہ کرنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی '

جب جنگ شروع ہوی تو ہند میں ابتداءً ایک کھلبلی مچی ' تمام والیان ریاست نے اپنی فوجیں پیش کیں ' اور اس کے ساتھ بعض والیان ریاست نے میدان جنگ میں بذات خود حصہ لیا ' پیشہ ور سپاہی بخوشی فوج میں بھرتی ہوگئے ' کیونکہ ان کو اپنی خدمات کے پیش کرنے کا اس سے بہتر کوئی موقعہ نہیں مل سکتا تھا ' والیان ریاست اور پیشہ ور سپاہیوں کے متعلق تو سب کی توقع یہی تھی کہ وہ اتحادیوں کا ساتھ دینگے ' لیکن تعجب تو یہ تھا کہ باشندگان ہند نے بھی عام طور پر اتحادیوں کی تائید کی ' اس میں تعلیم یافتہ اور ان پڑھ کی کوئی تمیز نہیں تھی ' حالانکہ اس جنگ کے ساتھ ان کا کوئی مفاد وابستہ نہیں تھا ' چنانچہ جب فرانس کو ہند کی فوجیں روانہ کی گئیں تو اس پر عام خوشی کا اظہار کیا گیا ' اور سمجھا گیا کہ اپنی برتری کو دنیا والوں پر ظاہر کرنے کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا ' تمام سیاسی اختلافات کچھ دنوں تک کیلئے رک گئے .

یہ جنگ جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی ' باشندگان ہند کا ہیجان بھی کم ہوتا گیا ' اور سیاسی مباحث تازہ ہوگئے ' سنہ ۱۹۱۵ء کے اواخر میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس کی صدارت سر ایس - پی - سنہا نے کی تھی ' یہ وایسرائے کی مجلس عاملہ کے پہلے ہندی رکن تھے ' اور کچھ دن بعد لارڈ سنہا کی حیثیت سے برطانوی پارلیمنٹ کے پہلے ہندی رکن ہوے ' پھر ایک صوبہ کے پہلے ہندی گورنر قرار پائے انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں باشندگان ہند کے نقطۂ نظر سے ہند کی حیثیت کو واضح الفاظ میں پیش کیا ' انہوں نے صاف طور پر بیان کیا کہ منٹو مارلے اصلاحات اب بالکل بیکار ہوچکے ہیں ' برطانیہ کو چاہئے کہ ہند کے متعلق اپنی حکمت عملی کو واضح طور پر بیان کرے ' اور یہ جتائے کہ

باشندگان ہند کا سیاسی نصب العین کیا ہونا چاہئے ' لارڈ چیمسفورڈ نے بھی یہی ضرورت جتائی تھی ' جو اس وقت ہند میں اپنی رضاکارانہ فوج کے ساتھ قابل قدر خدمات انجام دے رہے تھے ' تھوڑے دنوں کے بعد جب وہ وایسرائے بنائے گئے تو انھوں نے برطانوی سلطنت کے ماتحت خود اختیاری حکومت کے نظریہ کے مطابق اپنی تجاویز مرتب کیں اور برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیں تاکہ اس کی طرف عملی قدم اٹھایا جائے .

اگر ایک طرف انگلستان میں ان تجاویز پر غور ہو رہا تھا تو دوسری طرف ہند میں سیاسی جماعتوں کے درمیان اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی ' سنہ ۱۹۱۶ع میں کانگریس پر انتہا پسند جماعت کا پھر سے غلبہ ہوگیا تھا ' اسی زمانہ میں کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ ایک سمجھوتہ کیا جو میثاق لکھنو Lucknow Pact کے نام سے مشہور ہے ' اس میں مسلمانوں کے حقوق اور ان کی حیثیت کو واضح کیا گیا تھا ' اور ان کے حق جداگانہ انتخاب اور مجالس قانون ساز میں چند مقررہ نشستوں کے مطالبہ کو مان لیا گیا تھا ' اس کے بعد ہند کے تمام ماہرین سیاست ایک کاغذی دستور کے تیار کرنے میں مصروف ہوگئے تھے یہاں تک کہ آگسٹ سنہ ۱۹۱۷ع میں وزیر ہند ای۔ ایس مانٹیگو نے لارڈ چیمسفورڈ کی پیش کردہ تجاویز کے متعلق برطانوی سلطنت کی طرف سے ایک مشہور اعلان کیا جس کے الفاظ یہ ہیں .

" ملک معظم کی سلطنت کی حکمت عملی ' جس کے ساتھ حکومت ہند کو بھی پورا اتفاق ہے ' یہ ہے کہ آئندہ سے حکومت کے تمام شعبوں سے باشندگان ہند کو زیادہ سے زیادہ تعلق ہوگا اور یہاں کے خود اختیاری اداروں کو اس طرح تدریجی طور پر ترقی دیجائے کہ آگے چلکر ہند کو برطانوی سلطنت کے ماتحت ذمہ دارانہ حکومت کا درجہ حاصل ہو "

اس اعلان میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ یہ ترقی تدریجی ہوگی اور اس کی تمام منزلیں برطانوی حکومت کی

طرف سے متعین ہونگی اور ملک کا امن و امان باشندگان ہند ہی کے تعاون اور ان کے احساس ذمہ داری کی ترقی پر منحصر ہوگا۔

اس اعلان سے اگرچہ انگلستان والوں کو کچھ تعجب سا ہوا مگر انہوں نے اس کی کوئی مخالفت نہیں کی ' یہ کہنا غالباً صحیح ہوگا کہ اہل انگلستان نے سنہ ۱۹۱۴ع تک ہند کے مسئلہ پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا ' عوام تو یہی سمجھتے تھے کہ ہند ایک دور افتادہ محکوم ملک ہے جس میں غیر ذمہ دار سیاستدان اور احتجاج کنندے گڑ بڑ مچاتے رہتے ہیں ' لیکن اس کے باوجود برطانوی حکومت اس کو ترقی پر لانے کی کوشش کر رہی ہے ' وہ صرف اسی خیال سے خوش تھے ' انہیں اس مسئلہ پر زیادہ غور و فکر کی حاجت بھی نہیں تھی ' مگر جب جنگ چھڑ گئی تو انہوں نے ہند کے مستقبل پر بھی غور و فکر کرنا شروع کیا ' ہند کی فوجوں نے فرانس اور کئی ایک محاذ جنگ پر شاہی فوجوں کی بڑی مدد کی تھی ' ان دنوں مختلف واقعات کی بناء پر انگریزوں میں یہ احساس ہو چلا تھا ' کہ اس محکوم ملک کو نوآبادیات کا درجہ ملنا چاہئے ' چنانچہ اسی احساس کی بناء پر سنہ ۱۹۱۷ع اور سنہ ۱۹۱۸ع کی امپیریل کانفرنس میں ہند کے نمائندوں کو بھی شریک کیا گیا تھا ' کیونکہ سنہ ۱۹۱۷ع کی کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ دوسری نوآبادیات کی طرح ہند کو بھی ایسے اختیارات ملنے چاہئیں جن کی بناء پر برطانوی سلطنت کے دوسرے حصوں کی رعایا کے داخلہ کے متعلق کوئی قانون بنایا جاسکے ' اس فیصلہ سے ان جھگڑوں کے طے کرنے میں آسانی ہوگئی جو کنیڈا اور آسٹریلیا اور ہند کے مابین باشندگان ہند کی قانونی حیثیت کے متعلق پیدا ہوگئے تھے ' اور جب سنہ ۱۹۲۱ع میں تیسری کانفرنس ہوی تو اس میں یہ تجویز پیش ہوی کہ کسی ایک نوآبادی میں جائز طریقہ پر بسے ہوے باشندگان ہند کو عام شہری حقوق حاصل ہونگے ' اس تجویز سے صرف جنوبی آفریقہ کی ایک حکومت

نے اختلاف کیا ' جس کی وجہ سے دونوں کے تعلقات کشیدہ ہوگئے اور پھر چھ سال تک ہند اور جنوبی آفریقہ کے درمیان بڑی کشمکش جاری رہی ۔

جب مقصد اصلی طے پاگیا تو وزیر ہند یہاں تشریف لائے اور وایسرائے سے ملکر اس بات کا تصفیہ کیا کہ اس سلسلہ میں پہلا قدم کیونکر اٹھایا جاے ' انہوں نے صوباڈی حکومتوں اور ملک کے ماہرین سیاست سے بھی مشورہ کیا ' اس کے بعد دستوری اصلاحات کے متعلق ایک روداد مرتب کی جو تاریخ میں مانٹیگو چیمسفورڈ روداد کے نام سے مشہور ہے ' سنہ ۱۹۱۸ام کے موسم گرما میں یہ روداد چھپ کر شایع ہوی ' پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ Select Committee نے تیار کردہ مسودہ قانون پر نظر ثانی کی اور کچھ تبدیلیاں بھی کیں ' اس کے بعد یہ مسودہ قانون ہند سنہ ۱۹۱۹ام کے نام سے جاری ہوا ' اس جگہ اس قانون کی جزئیات پر بحث کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ ہند کے ان سیاسی حالات کا ایک جائزہ لیں جو اس مذکورۂ بالا اعلان کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے ۔

اس اعلان کا فوری رد عمل تو یہ تھا کہ لوگوں کی ایک بڑی حد تک تشفی ہوگئی' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو کچھ تعجب بھی ہوا ' کیونکہ سالہا سال کے قومی مطالبات اور غیر سرکاری دستور ساز اراکین کے دباؤ ڈالنے کے بعد یہ چیز حاصل ہوی تھی' مگر جب اسپر غور و فکر کرنا شروع کیا تو ان پر حقیقت منکشف ہوگئی اور ان کی آراء میں بھی اختلاف پیدا ہوگیا ' رجعت پسند لوگ اپنے مستقبل کے متعلق کچھ خوفزدہ ہوگئے ' انتہا پسند طبقہ اس اعلان سے مطمئن نہیں ہوسکا ' اس نے اس کو مزید احتجاج کا ایک ذریعہ بنالیا ' فرقہ وارانہ کشمکش بڑھنے لگی ' اور ہر ایک فرقہ نے نئے دستور میں اپنے حقوق کی حفاظت کا مطالبہ کرنا شروع کیا ' گوکھلے جیسے قاید کے سنہ ۱۹۱۵ام میں مرجانے کے بعد اعتدال پسند لوگ بہت کمزور ہوچکے

تھے ' اور جب کانگریس پر انتہا پسند لوگوں کا غلبہ ہوگیا تو اعتدال پسند اس سے الگ ہوگئے ' مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی اتحاد نہیں تھا ' اس وقت کے حالات بھی کچھ ایسے ناسازگار تھے کہ سیاسی مسایل پر بحث و مباحثہ ختم نہیں ہوسکتا تھا سنہ ۱۹۱۸ع کی ابتدا میں ایشیا کے اندر دشمنوں کے خطرہ کا تدارک کرنے کے لئے ہند کے سارے وسائل استعمال کیے جاچکے تھے - ہند کے بعض علاقوں میں قحط کے آثار نمایاں ہوگئے تھے' کیونکہ یہاں بارش بالکل نہیں ہوی تھی مگر سرکاری امداد کی اتنی ضرورت پیش نہیں آئی جس کی توقع کی جاتی تھی - اس سال کے آخر میں عالمگیر انفلوئنزا کی بیماری پھیلنے لگی تھی اور لوگ پورے ملک کی شرح اموات کے لحاظ سے دگنی تعداد میں مرنے لگے تھے ' یہ زمانہ حد درجہ کی پریشانی ' بے چینی اور بے اطمینانی کا تھا .

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاھئے کہ اس وقت ملک کے اندر امن و امان قایم ہوگیا تھا ' بنگال میں انقلابیوں نے سازشوں کا ایک بہت بڑا جال بچھا رکھا تھا ' اور آئے دن قتل و خون اور ڈاکہ زنی کے واردات ہوتے رہتے تھے ' ان کے ساتھ جرمن کارندے بھی اپنا کام کرتے جا رہے تھے ' ان کا مقصد یہ تھا کہ شورش پسندوں کے ہاتھ میں ہتھیار دے کر سیام کے راستہ سے برما پر حملہ کیا جاے ' پنجاب میں سکھوں کے اندر ایک مدت سے انقلابی تحریک جاری تھی جس کی ابتدا امریکہ کے سکھ انقلابیوں کی طرف سے ہوی تھی ' اور جس کا ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے ' برطانوی کولمبیا میں آنے والے سکھوں کے ذریعے سازشیں کی جاتی تھیں اور سنگین جرائم کا ارتکاب کیا جاتا تھا ' جس کی وجہ سے حکومت کو ان کے خلاف خاص تدابیر اختیار کرنی پڑیں ' شمالی ہند کے بعض مسلمانوں میں اس وجہ سے بے چینی پیدا ہوگئی تھی کہ ترکی جو مسلمانوں کا خلیفہ مانا جاتا تھا جرمنی کے ساتھ ہوگیا تھا اور اس بناء پر ہند سے بھی

اسکی جنگ چھڑ گئی تھی ، ان حالات میں چند مسلمان نوجوانوں نے سرحد کو پار کیا اور وہاں کے پرجوش آزاد قبایل سے جا ملے ، اور پھر جرمنی کی مدد سے ہند میں ایک اسلامی سلطنت کے قایم کرنے کی جان توڑ کوششیں شروع کردیں ، عام طور پر تمام باشندگان ہند حکومت کے ساتھ تھے ، صرف چند ہی افراد ایسے تھے جو انقلاب برپا کرنے کے لئے آمادہ تھے، ان کی تعداد اگرچہ بہت کم تھی ، مگر ان میں مذہبی جوش اور ولولہ اتنا تھا کہ حکومت ہند کو واقعی ان سے خطرہ پیدا ہوگیا تھا ، انقلابیوں کی سرگرمیوں کے متعلق حکومت نے سنہ ۱۹۱۷ء میں رولٹ کمیٹی مقرر کی جس کا صدر رولٹ Rowlatt نامی ایک انگریز تھا۔ اس نے اپنی روداد میں انقلابیوں کی تمام کوششوں کو پورے طور پر واضح کیا اور ان کے خطرات کی طرف حکومت اور عوام کو توجہ دلائی ۔

ملک کی اقتصادی بدحالی کا بھی لوگوں کے بر انگیختہ کرنے پر کچھ کم اثر نہیں پڑا ، ہند کو اس جنگ سے عام طور پر فائدہ ہوا تھا ، چیزوں کی مانگ بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی قیمتیں بھی بہت بڑھ گئی تھیں ، جنگی اسلحہ کی ضرورت کی بناء پر بہت سے صنعتی کارخانے قایم ہوگئے تھے ، جن میں سے بعض جنگ کے اختتام کے بعد بھی جاری رہے، مزدوریوں میں عام طور پر اضافہ ہوگیا تھا ، اور تجارت کو بھی بڑی ترقی ہوگئی تھی ، مگر انقلابیوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا کیونکہ گرانی کی وجہ سے ان کی تکلیفیں اور بڑھ گئی تھیں ، ان کی آمدنی محدود تھی اور ان کا زمانہ بڑی سختی سے کٹ رہا تھا ، خاص کر متوسط طبقے کے لوگ ، جن میں سے اکثر انقلابی تھے بڑی تکلیفیں اٹھا رہے تھے، اور انقلابی نوجوانوں کے ناجائز طریقوں کو اختیار کرنے کیلئے صرف یہی ایک سبب کافی تھا ۔

ہند کے مالیات عامہ پر تو اس اقتصادی بدحالی کا بہت برا اثر پڑا ، صنعتی اور تجارتی ذرایع وغیرہ سے جو کثیر آمدنی

حکومت کو حاصل ہو رہی تھی ، وہ جنگ کے مصارف اور بے سود قرضہ کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں تھی ، سنہ ۱۹۱۴ء سے پہلے بے سود قرضہ بالکل ختم ہوچکا تھا مگر جنگ کی وجہ سے یہ قرضہ پھر بڑھ گیا تھا ، اس دور میں سب سے زیادہ مصیبت اور تکلیف سکوں کے نظام کے درھم برھم ہونے کی وجہ سے تھی ، حالانکہ اس صدی کی ابتدا سے لیکر اس وقت تک ملک کی آسودگی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی - مگر اب حالات بالکل بدل رہے تھے ، اس بات کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے عالمگیر جنگی مالیات کا ایک جائزہ لینا چاھئے - ہم یہاں صرف اس کے نتیجہ سے بحث کرینگے مانگ اور رسد کے حالات کی بناء پر اس وقت روپیہ کا علامتی سکہ ایک اسٹرلنگ پونڈ کے مقررہ پندرھویں حصہ سے بھی زیادہ قیمت رکھتا تھا ، اس پونڈ کی قیمت اپنے پرانے معیار پر باقی نہیں رھی تھی اس طرح کم روپیوں میں پہلے سے زیادہ تعداد میں پونڈ خریدے جاسکتے تھے ، اور زر متبادلہ کی شرح بڑھنے لگی تھی ، اس پیچیدہ اور فنی مسئلہ کو ہم زیادہ طول نہیں دینا چاھتے ، البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جنگ کے بعد بھی یہ شرح بڑھتی گئی ، یہاں تک کہ ماہرین مالیات کی ایک تجربہ کار جماعت نے ایک روپیہ کو ایک پونڈ کے دسویں حصہ کے برابر قرار دیا ، لیکن یہ شرح بھی قایم نہیں رہ سکی ، اس لیے چند سال تک اس کو اپنی رفتار پر چھوڑ دیا گیا ، آخر سنہ ۱۹۲۶ء میں ، بازار کی عام شرح کے مطابق اس کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس کے برابر قرار دی گئی ۔

جنگ کے زمانہ کے تجربات کی بناء پر ھند کی قوموں کے درمیان نسلی اختلافات بہت کم ہوگئے تھے - میدان جنگ میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے ، ایک عام خطرہ سے دو چار ہونے اور زندگی کے اپنے پرانے معیار بدل جانے کی وجہ سے قومی احساسات میں بھی ایک بڑی تبدیلی ہوگئی تھی - مانٹیگو چیمسفورڈ کی روداد کے خاتمہ میں ھندوؤں اور مسلمانوں سے اتحاد اور اتفاق کی پر زور

اپیل کی گئی تھی' اور لوگوں کو صلح و آشتی کی طرف توجہ دلائی گئی تھی' جس کی تبلیغ آج سے دو ہزار سال پہلے مہاراجہ اشوک نے کی تھی' اس کے بعد سے دونوں کے درمیان یہ دوستی بڑھتی ہی گئی ۔

اب ہم کو ان تدابیر کا ایک جایزہ لینا ہے جو سنہ ۱۹۱۷ع کے اعلان کے بعد اختیار کی گئی تھیں' یہ اعلان دو الگ الگ چیزوں کے متعلق تھا' یعنی سرکاری ملازمتیں اور دستور' پہلے کے متعلق اب یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ تمام اعلی عہدوں کیلئے جن کو پہلے شاہی خدمت (Imperial Service) کہا جاتا تھا اور جن کو اب کل ہند کی خدمت All India Service کہا جاتا ہے' ہند ہی میں آدمی بھرتی کیے جائیں' ان میں سے بعض عہدوں کے لئے تو انگلستان میں بھرتی بالکل بند کردی گئی' اسطرح کہ چند سال بعد تمام انگریز عہدہ داروں کے سبکدوش ہونے کے بعد' ان تمام عہدوں پر خالص باشندگان ہند کا قبضہ ہوجائے دوسری ملازمتوں میں اور خاصکر سیول سروس کے عہدوں کیلئے ہند اور انگلستان دونوں جگہ بھرتی شروع کی گئی' اور اسکا کچھ اسطرح انتظام کیا گیا کہ آگے چلکر باشندگان ہند کی تعداد اور زیادہ ہوجائے' ان تدبیروں سے ملازمتوں کے سوال کی اہمیت بہت کم ہوگئی' لیکن اسکے باوجود حکومت کو مختلف قوموں کے مطالبات کا خیال رکھنا پڑتا تھا' اور ان کی بھرتی کے متعلق سخت قسم کی نگرانی کرنی ہوتی تھی' اس کے بعد بھی باشندگان ہند یوروپین عہدہ داروں کو اور گھٹانے اور وزیر ہند کے اختیارات کو اور کم کرنے کا برابر مطالبہ کر رہے تھے ۔

اب رہا دستور ہند تو اسکا جہانتک تعلق ہے وزیر ہند کے اختیارات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی' البتہ یہ اصول تسلیم کرلیا گیا تھا کہ جہاں کہیں حکومت ہند اور مجلس قانون ساز کے درمیان کسی مالی مسئلہ پر اتفاق ہوجائے تو وزیر ہند کوئی

مداخلت نہیں کرسکتا تھا ' اور یہ بھی مان لیا گیا تھا کہ پارلیمنٹ صوبوں کے وزیروں کی خاص ذمہ داریوں میں کوئی دخل نہیں دیگی اسکے ساتھ ایک پرانی بے قاعدگی بھی دور ہوگئی ' اسوقت ایک وزیر ہند حکومت ہند کا آقا اور گماشتہ دونوں سمجھا جاتا تھا ' وہ حکومت ہند کے نام احکام جاری کرتا تھا اور تجارتی معاملات میں اس کی نیابت کے فرایض بھی انجام دیتا تھا ۔ لیکن سنہ ۱۹۲۱ع سے تمام تجارتی معاملات وزیر ہند کی بجائے ہائی کمشنر کے سپرد کردئے گئے ' جو اپنے فرایض کی بجا آوری کیلئے حکومت ہندوستان کی بجائے حکومت ہند کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا ۔ اس کے تقرر کے بعد سے وزیر ہند کو صرف سیاسی معاملات کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا ۔

ہند کی مرکزی حکومت کے اختیارات محدود ہوگئے تھے ' اب اس کو صوبائی وزیروں کے ان معاملات میں جو خاص ان کے ماتحت تھے ' دخل دینے کا کوئی حق نہیں تھا ' مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے ذرایع آمدنی الگ الگ کردئے گئے تھے ' جس کی وجہ سے مرکزی حکومت کو صوبائی حکومتوں کے مالی معاملات میں مداخلت کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا ' مرکزی حکومت کی مجلس عاملہ کے سات ارکین میں سے تین ہندی مقرر کیے گئے ' اور مرکزی حکومت کے دو ایوان قرار پائے ' ایوان عام Assembly اور ایوان خاص Council of State ' ان دونوں میں مختلف نقطۂ خیال کے لوگ جمع تھے ' ایوان عام کے دو تہائی ارکان بذریعۂ انتخاب مقرر کئے جاتے تھے ' ان میں سے آدھے مقامی حلقہ ہائے انتخاب سے چنے جاتے تھے اور باقی مخصوص قوموں اور مفادوں کی نمائندگی کرتے تھے ' باقی ایک تہائی ارکان کو حکومت نامزد کرتی تھی ' ان میں سے بعض سرکاری نمائندے ہوتے تھے اور بعض ایسی قوموں کی طرف سے نامزد کئے جاتے تھے جو سیاسی حیثیت سے منظم نہیں ہوتی تھیں ' جب کسی تجویز پر غیر سرکاری ارکین

متفق ہوجاتے تو حکومت کو شکست اٹھانی پڑتی تھی ' مگر تمام اہم معاملات میں حکومت کو مجلس قانون ساز کے برخلاف اپنا فیصلہ دینے کا اختیار تھا ' اور وہ ایوان عام کے فیصلوں کو مسترد کرسکتی تھی ' یا ایوان خاص کو ملاکر کوئی قانون منظور کرسکتی تھی ' اس ایوان خاص میں سرکاری نامزد اراکین چند ہی ہوتے تھے ' اکثر اراکین بذریعہ انتخاب منتخب ہوتے تھے ' چونکہ ان کا انتخاب ایسے حلقوں سے ہوتا تھا جہاں راے دھندوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی ' اس لئے اکثر اراکین قدامت پسند یا اعتدال پسند لوگوں کے نمایندے ہوکر آتے تھے ' ایوان عام کے منتخب اراکین بحث مباحثہ کے وقت مختلف اراکین پر اپنا اثر ڈال سکتے تھے ' اور مختلف کمیٹیوں میں اپنی قوت دکھا سکتے تھے ' لیکن کسی حیثیت سے بھی ان کو ذمہ دارانہ اختیارات حاصل نہیں تھے ' ان کو صاف طور پر معلوم تھا کہ اگر وہ کثرت آرا سے کسی تجویز کو ایوان عام میں منظور کرا بھی لیں تو حکومت اپنے خاص اختیارات کی بنا پر اس تجویز کو مسترد کرسکتی ہے ۔

مرکزی مجلس قانون ساز کے بالمقابل ایوان والیان ریاست (Chamber of Princes) تھا ۔ اس کا کوئی تعلق مجلس قانون ساز کے ساتھ نہیں تھا ' انیسویں صدی میں حکومت ہند ہر ایک ریاست کے ساتھ انفرادی طور پر الگ الگ تعلق قایم کیے ہوی تھی ' اور والیان ریاست کے درمیان براہ راست ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا ' لیکن جب سارا ملک ایک ہونا شروع ہوا تو ایک ایسے ادارہ کی ضرورت محسوس ہوی ' جس کے ذریعے والیان ریاست کے عام خیالات معلوم کیے جاسکیں ' اس مقصد سے جنگ کے دوران میں چند بے ضابطہ کانفرنسیں ہوئیں ' لیکن جنگ کے اختتام کے بعد باقاعدہ طور پر ایک ایوان قایم کیا گیا ' ابتدا میں یہ ایوان محض مشورہ دے

سکتا تھا ، اس کو عاملانہ اختیارات حاصل نہیں تھے ، کئی ایک بڑی ریاستیں اور چند چھوٹی ریاستیں ایک مدت تک اس سے الگ رہیں۔

اهم دستوری تبدیلیاں زیادہ تر صوبوں هی میں کی گئی تھیں ، اس وقت یہ نظریہ تھا کہ تمام صوبائی معاملات وزراء کے اختیار میں هوں اور وہ اپنی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ هوں ، لیکن اس زمانہ کے حالات کے مطابق اس نظریہ پر عمل کرنا دشوار تھا ، اس لیے اس قسم کا نظام وجود میں آیا جس کو آجکل دو عملی طرز حکومت Diarchy کہا جاتا ھے ، هر ایک بڑے صوبہ کا حاکم اعلی گورنر هوتا تھا ، اس کی ایک مجلس عاملہ هوتی تھی جس کے بعض اراکین انگریز اور بعض هندی هوتے تھے ، ان کے ساتھ هندی وزراء کی بھی ایک جماعت هوتی تھی ، حکومت کے تمام شعبوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا ، ایک محفوظ Reserved اور دوسرا منتقلہ Transferred محفوظ شعبوں کا ذمہ دار گورنر باجلاس کونسل هوتا تھا ، اور وہ پارلیمنٹ کے سامنے اپنے افعال کا جوابدہ هوتا تھا ، منتقلہ شعبوں کا انتظام گورنر اور وزیر دونوں ملکر انجام دیتے تھے ، یہ وزیر وہ هوتے تھے جن کو گورنر صوبہ کی مجلس قانون ساز کے اراکین میں سے چن لیتا تھا وہ اپنے خاص خاص عہدوں کے لئے مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ هوتے تھے ۔ وہ صرف انھی شعبوں کے ذمہ دار هوتے تھے جو ان کے سپرد کئے هوئے هوتے تھے ان کو ان شعبوں سے کوئی سروکار نہیں هوتا تھا جو خاص گورنر باجلاس کونسل کے اختیارات میں هوتے تھے ۔

ان شعبوں کی تقسیم کے سلسلہ میں هر ایک صوبہ کے حالات کے مطابق کچھ نہ کچھ فرق هوتا تھا ، عام طور پر امن عامہ ، مالگذاری اور مالیات کے شعبے محفوظ سمجھے جاتے تھے ، اور گورنر کو نئے محصولوں کے عائد کرنے کا پورا اختیار دیا گیا تھا ، البتہ مقامی حکومت (لوکل گورنمنٹ) تعلیم ، حفظان

اور اقتصادی ترقی کے محکمے وزراء کے ماتحت تھے ' ان کے اختیارات اگرچہ محدود تھے لیکن ان کو کام کرنے کی بڑی گنجایش تھی ' ظاہر ہے کہ اس قسم کے دو عملی نظام پر عمل کرنا بہت دشوار تھا ' انفرادی حیثیت سے گورنر کو وسیع اختیارات حاصل تھے جن کو وہ ضرورت کے وقت استعمال کرسکتا تھا ' اس قسم کے نظام پر اسی وقت کامیابی کے ساتھ عمل ہوسکتا تھا جبکہ ارباب حکومت کے درمیان باھمی اتحاد اور تعاون ھو ' اور اس سے بھی بڑھکر یہ بات تھی کہ مجلس قانون ساز کے اراکین ان کے کاموں میں رکاوٹیں نہ ڈالیں اور ان کو اپنی تجویزوں پر آزادی کے ساتھ عمل کرنے دیں .

چند صوبے ایسے بھی تھے جہاں صرف ایک ھی ایوان تھا ' اس میں بھی مختلف جماعتوں کے نمائندے ھوتے تھے ' ھر ایک صوبہ کے خاص حالات کی بناء پر نمائندگی کا اصول مختلف ھوتا تھا ' لیکن عام طور پر ھر ایک صوبائی مجلس قانون ساز میں سرکاری افسروں اور غیر سرکاری نامزد اراکین کا ایک مختصر گروہ ھوتا تھا - اس لحاظ سے منتخب اراکین کی تعداد زیادہ ھوتی تھی - اور ان کا انتخاب تین جماعتوں کی طرف سے ھوتا تھا - یعنی مقامی ' فرقہ وارانہ اور خاص جماعت . اس کا مقصد یہ ھوتا تھا کہ تمام اھم جماعتوں کی طرف سے نمائندے منتخب کیے جائیں ' شہر اور دیہات اور مسلمان ' سکھ ' اور یورپین لوگ ' جامعات ' اور زمیندار ' تاجر اور مزارعین وغیرہ کی طرف سے نمائندے چنے جاتے تھے ' اگرچہ انگلستان کی بہ نسبت ھند کے اندر بہت کم لوگوں کو رائے دھندگی کا حق دیا گیا تھا ' مگر رائے دھندہ لوگوں کی تعداد پہلے کی بہ نسبت اب بہت زیادہ ھوگئی تھی ' دو عملی طرز حکومت کا نفاذ در حقیقت ایک عقیدہ کی چیز تھی ' رائے دھندگی کا حق ایسے لوگوں کو دیا گیا تھا جو زیادہ تر جاھل اور غیر تجربہ کار تھے ' ان کو ایسے نمائندوں کے

انتخاب کرنے کا اختیار دیا گیا تھا جو ان وزراء کو اپنے قابو میں رکھ سکتے تھے جن کے ذمہ صوبہ کی تمام سماجی اور اقتصادی ترقیاں سونپ دی گئی تھیں ' انتخاب کنندوں کی لیاقت اور قابلیت اور ان کے نمائندوں کے اوصاف کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا ' اس قانون کے نفاذ سے امید اور بیم کی حالت پیدا ہوگئی تھی کیونکہ کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ آیا اس سے بہتر نتائج پیدا ہونگے یا بدتر ' لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس سے ایک نئے دور کی ابتدا ہوگئی تھی جس کی مثال اس سے پہلے پائی نہیں جاتی تھی .

باب ۵۱

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہند کی حالت

سنہ ۱۹۱۹ء تا سنہ ۱۹۴۳ء

بیرونی تعلقات

وائسرائے : لارڈ چیمسفورڈ تا سنہ ۱۹۲۱ء

لارڈ ریڈنگ سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۶ء

لارڈ اروِن سنہ ۱۹۲۶ء تا سنہ ۱۹۳۱ء

لارڈ ولنگڈن سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۶ء

لارڈ لنلتھگو سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۴۳ء

لارڈ ویول سنہ ۱۹۴۳ء۔

سنہ ۱۹۱۹ء کے دستور کے بعد سے جدید سیاسیات ہند کا دور شروع ہوتا ہے ' برطانوی پارلیمنٹ نے ایک وفاقی دستور بنایا جس میں ریاستوں کو بھی شامل کیا اور سنہ ۱۹۳۵ء میں اس کو قانون کی شکل دی ' سنہ ۱۹۳۷ء کے موسم بہار میں اس کے ایک حصہ پر عمل شروع ہوا ' لیکن قبل اس کے کہ اس کی جزئیات پر یکے بعد دیگرے عمل ہو ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی ' اس وقت سے لیکر یہ بات محسوس کی جانے لگی کہ جنگ کے بعد ہند کو ایک نئے دستور کے بنانے کی ضرورت پڑیگی ' چنانچہ برطانوی حکومت نے دستور کے بنانے کے متعلق اپنا رویہ بدل دیا اور اس کی ذمہ داری باشندگان ہند ہی کے سپرد کردی۔

اس وقت ان واقعات کا جو گذشتہ پچیس سال کے اندر ہند میں رونما ہوے ' صحیح اندازہ لگانا قبل از وقت ہوگا ' یہاں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۹ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۷ء تک کی ملک کی ترقی کا ایک عام خاکہ پیش کیا جائے اور اس

کے ساتھ ساتھ اس سے بھی زیادہ مختصر اور غیر مکمل دور پر ان واقعات کو قلمبند کیا جائے جو سنہ ۱۹۳۷ع کے بعد رونما ہوئے ہیں .

اس دور کی سماجی اور اقتصادی ترقیوں کا ایک جائزہ لینے سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ بیرونی تعلقات کی تاریخ کو مختصر طور پر بیان کیا جائے ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہماری نظر افغانستان کی طرف جاتی ہے .

سنہ ۱۹۱۹ع میں امیر حبیب اللہ مارا گیا ، اور اس کی جگہ اس کا بیٹا امان اللہ تخت پر بیٹھا ۔ اس وقت پنجاب کی زبردست سیاسی ہیجان کی وجہ سے جس کا ذکر آئندہ باب میں ہوگا ، ہند کی سیاسی حالت بالکل نازک ہوگئی تھی ۔ امان اللہ ایک پر جوش اور ناتجربہ کار نوجوان تھا ، اس نے سرحد پر حملہ کیا اور شکست کھائی ۔ اور طول طویل گفت و شنید کے بعد سنہ ۱۹۲۱ع میں اس کے ساتھ ایک سمجھوتہ ہوا جس کی رو سے اس کو براہ راست لندن یا دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی اجازت مل گئی ۔ سنہ ۱۹۲۶ع میں اس نے شاہ افغانستان کا لقب اختیار کیا اور اپنے ملک میں بہت سی سماجی اور انتظامی اصلاحات جاری کیں ، چونکہ یہ اصلاحات قبل از وقت تھیں اس لئے اس کے ملک میں ایک انقلاب برپا ہوگیا اور کئی تبدیلیوں کے بعد سنہ ۱۹۲۹ع میں نادرشاہ تخت پر بیٹھا ، اور اس نے لندن اور ہند کی حکومتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قایم کیے ، انقلابات کے زمانہ میں برطانیہ اور ہند کے بہت سے نمائندے اور باشندے کابل میں موجود تھے ، ان کی جانوں کو بڑا ہی زبردست خطرہ لاحق ہوگیا تھا ، ان سب کو شاہی ہوائی بیڑے کے ہوا بازوں نے بچالیا ، اور یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جو اس وقت بالکل ہی ناممکن معلوم ہو رہا تھا ، سنہ ۱۹۳۳ع میں نادرشاہ مارا گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ظاہرشاہ تخت پر بیٹھا ، یہ اس کی خوش

قسمتی تھی کہ اس کو ہاشم خاں جیسا مدبر وزیر مل گیا جو رشتہ کے لحاظ سے اس کا ماموں ہوتا ہے ۔

سینتالیسویں باب میں ہم ان مشکلات کا مختصر طور پر تذکرہ کرچکے ہیں جن سے حکومت ہند کو سرحد کے آزاد قبایل کو قابو میں رکھنے کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً سابقہ پڑتا تھا ' ہم یہ بھی بیان کرچکے ہیں کہ یہ مشکلات نہ تو جنگی مورچوں پر قبضہ کرنے سے حل ہوسکتی تھیں اور نہ ہند کی سرحد کو بالکل ہی بند کردینے سے ' بلکہ ایسی تدابیر ہی سے ان کا حل ہوسکتا تھا جن سے آزاد قبایل کو روزی کا سامان مہیا ہو ' کیونکہ اسی صورت میں ان کو ہند پر چھاپہ مارنے کی ضرورت نہیں ہوتی ' یہی ایک حکمت عملی ایسی تھی جس پر اب تک کامیابی کے ساتھ عمل کیا جاسکا ' پہلی جنگ عظیم کے بعد سے سرحد کا وہ مرکزی علاقہ ' جس کو وزیرستان کہا جاتا ہے ' بڑی شورش کا مرکز بنا رہا ' یہاں تک کہ حکومت ہند کو سنہ ۱۹۲۳ع میں اور اسکے بعد اس علاقہ میں اپنے فوجی دستے مستقل طور پر متعین کرنے پڑے ' ان کی وجہ سے رسل و رسایل اور آمد و رفت کے راستے پھر سے کھل گئے ' اور ان آزاد قبایل کے ساتھ ایک اطمینان بخش سمجھوتہ ہوا ' اس کے بعد سے وزیرستان کے متعلق حکومت ہند کی اختیار کردہ پالیسی ایک بڑی حد تک کامیاب رہی ' کیونکہ ایک دو دفعہ کے سوا یہاں کوئی بڑی شورش نہیں ہوی ' البتہ حکومت ہند کو اس علاقہ پر کڑی نگرانی رکھنی پڑتی تھی ۔

مسلمانان ہند مشرق وسطی کے اسلامی ملکوں کے ساتھ ہمیشہ سے دلچسپی لیتے رہے ہیں ' سیاسی مذاق رکھنے والے باشندگان ہند کو ان ممالک کے دستوری انقلابات سے بڑی دلچسپی تھی ' چنانچہ جب عربستان میں ابن سعود کو عروج حاصل ہوا ' اور ایران میں خاندان قاچار پر زوال آیا اور ایران کی مجلس دستور ساز نے رضا شاہ پہلوی کو اپنا آئینی بادشاہ (Constitutional Monarch) مقرر کیا تو اہل ہند نے ان خبروں سے بڑی دلچسپی لی ' پہلی

جنگ عظیم کے دوران میں بعض باشندگان ہند کو عراق کے اندر تجارت کرنے اور ملازمتوں کے حاصل کرنے کے مواقع ہاتھ آئے تھے اور جب جنگ کے بعد ان پر پابندیاں عائد کی جانے لگیں تو ہند کے اندر بے چینی شروع ہوگئی ' سنہ ۱۹۲۰ء اور پھر سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد انگریزوں اور مصریوں کے درمیان جو سیاسی مناقشے ہوے ان سے ہند میں بھی دلچسپی کا اظہار کیا جاتا تھا ' یہودیوں اور مسلمانوں کے بالمقابل مطالبات کی بنا پر فلسطین کا مسئلہ بہت ہی نازک ہوگیا تھا ' چونکہ ہند میں بھی ہندووں اور مسلمانوں کے درمیان اسی قسم کی کشمکش تھی اس لیے دونوں قومیں فلسطین کے مسئلہ کا گہرا مطالعہ کرنے اور وہاں کی منتدبانہ طریقہ حکومت Mandatory Government پر غور و فکر کرنے لگی تھیں -

ایک زمانہ تک اہل ہند اور خاص کر مسلمانوں کی توجہ ترکی کی طرف منعطف رہی جہاں سنہ ۱۹۲۰ء میں مصطفی کمال برسر اقتدار آگیا تھا ' اور اس نے سیورس Sevres کے معاہدہ کو توڑ کر یونانیوں کے ساتھ لڑائی شروع کردی تھی ' ہند کے مسلمان ترکوں کے ہمدرد تھے ' انھوں نے زخمی اور قابل رحم ترکوں کی امداد کے لئے ہلال احمر کے نام سے ایک طبی وفد روانہ کیا تھا ' برطانوی حکومت کی ترکی سے مخالفانہ روش پر ہندو اور مسلمان دونوں برافروختہ ہوگئے تھے ' ہند کے اندر تحریک خلافت کے رضاکاروں نے ترکی سلطان کو خلیفہ اسلام بنانے کی عملی جد و جہد شروع کردی تھی ' اور چونکہ یہ تحریک مذہبی حیثیت رکھتی تھی ' اس لئے عام مسلمان بھی اس کے ساتھ ہوگئے تھے ' کانگریس اور خلافت کے کارکن ایک زمانہ تک ایک دوسرے کے ساتھ مل کر عملی جد و جہد کرتے رہے ' اس کی تفصیل آئندہ باب میں دی جائیگی ' لیکن جب ترکی کا سلطان اپنے وطن سے نکل گیا اور سنہ ۱۹۲۳ء میں لوزان Lausanne کا معاہدہ ہوا تو ایک نئی جمہوریت بر سر اقتدار آئی ' جس کے

اندر مذہب یا اتحاد اسلامی کی بجاے قومیت کے جذبات کارفرما تھے ' اس لئے یہاں ہند کے اندر خلافت کی تحریک مردہ ہوگئی ' اس کے باوجود ترکی جمہوریت کی سماجی اور سیاسی اصلاحات کے ساتھ مسلمانان ہند کی دلچسپی برابر قایم رہی ۔

شمالی سرحد ہند پر تبت کے ساتھ ہند کے دوستانہ تعلقات قایم رہے ۔ سنہ ۱۹۲۳ ع کے معاہدہ کی روسے نیپال کے ساتھ ہند کی دوستی اور بھی مضبوط ہوگئی تھی ' اس کے بعد اس نے براہ راست لندن کی حکومت کے ساتھ اپنے تعلقات قایم کرلیے ' گذشتہ پچیس سال کے دوران میں دونوں ملکوں کے درمیان ثقافتی اور تجارتی تعلقات ایک بڑی حد تک مضبوط ہوگئے ہیں ۔

نیپال سے آگے چین کا وسیع ملک ہے' جس کے ساتھ سنہ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں ہند کے بڑے تعلقات تھے' دونوں ملکوں کے درمیان براہ راست تعلقات کی ابتدا افیم کی تجارت سے ہوی جس کا کچھ حال ہم چھیالیسویں اور سینتالیسویں باب میں بیان کرچکے ہیں ۔ اس تجارت کی بناء پر بین الاقوامی حلقوں میں بڑی غلط فہمیاں پھیلنے لگی تھیں ' اس لیے اس صدی کی ابتدا میں حکومت ہند نے اس تجارت کو بند کرنے کی طرف ایک عملی قدم اٹھایا ' پہلی جنگ عظیم کے بعد چین کو افیم کا بھیجنا بند کردیا گیا تھا اور اب تو اس کی تجارت بالکل ہی ختم کردی گئی تھی گذشتہ پچاس برسوں میں ہند اور چین کے درمیان کپڑے کی تجارت ہونے لگی تھی ۔ چین کے ساحلی مقامات پر بہت سے ہندی تاجر بس گئے تھے ۔ ان کے ذریعہ ہند کا بہت سا کپڑا چین کے بازاروں میں بکنے لگا تھا ' اور جب چین میں سیاسی انقلاب ہوا تو ہند کے قومی حلقوں میں اس کے ساتھ خاص دلچسپی پیدا ہوگئی تھی ' اور جب سنہ ۱۹۳۱ع میں جاپان نے چین پر حملہ کیا تو باشندگان ہند کی کھلی ہمدردی چین والوں کے ساتھ ہی تھی ' دوسری جنگ عظیم کے بعد سے دونوں ملکوں کے درمیان راہ و رسم شروع ہوگئی ہے اور سفارت خانے اور فوجی اور ثقافتی تعلقات قایم ہوگئے ہیں ۔

جاپان کے ساتھ ھند کے ثقافتی تعلقات اتنے گھرے نہیں تھے جتنے کہ اب چین کے ساتھ قایم ھیں ' تاھم جب اس صدی کی ابتدا میں اس کو روس پر فتح ھوی اور اس کی صنعت و حرفت کو غیر معمولی ترقی ھونے لگی تو اھل ھند کی نظر میں اس کی وقعت اور عزت بڑھ گئی ' پہلی جنگ عظیم سے پہلے اور اس کے دوران میں جاپان کے ساتھ ھند کے تجارتی تعلقات قایم تھے ' یہاں کی بہت سی روئی جاپان کے کارخانوں کو جاتی تھی ' پہلی جنگ عظیم کے بعد بھی اسکا سلسلہ قایم رھا ' سنہ ۱۹۳۴ع میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک تجارتی معاھدہ ھوا ' بعض ھندی طلبہ صنعتی تعلیم کے حاصل کرنے کی غرض سے جاپان گئے ' لیکن انھوں نے ھمارے دیس کی صنعتی ترقی میں کوئی زیادہ حصہ نہیں لیا ' جب سے کہ جاپان نے چین کے خلاف اپنی جارحانہ حکمت عملی اختیار کر رکھی ھے ' ھند کے تمام گروہ اس کے مخالف ھوگئے ھیں اور سب نے اسکی حکمت عملی اور سیاسی چالوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا ھے حال میں باشندگان ھند کو چین ملایا اور برما میں بہت سے نقصانات کا سامنا کرنا پڑا ۔

برما کو فتح کرنے کے بعد حکومت ھند نے اس کو ھند ھی کا ایک صوبہ قرار دیا ' اور اس کا سارا نظم و نسق ھندی صوبوں کے نمونہ پر قایم کیا ' یہاں مقامی حالات کے سازگار ھونے کی بناء پر بہت سے ھندی تاجر ' سوداگر ' کسان اور پیشہ ور برما جاکر بس گئے ' بندرگاھوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے تمام مزدور ھند کے مشرقی سواحل سے آئے ھوے تھے ' اور جب برما میں قومیت کا جذبہ ترقی کرگیا تو باشندگان برما کو باشندگان ھند سے ایک قسم کی عداوت پیدا ھوگئی ' کیونکہ دونوں کے اقتصادی مفادات میں اکثر ٹکر ھوتی تھی ' اور ھند کے مال کے آنے سے برما کے کارخانوں کو جو دوسرے درجہ کے تھے ' کوئی فروغ نہیں ھو رھا تھا ' برمیوں کا یہ الزام تھا

کہ حکومت ہند ان کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کر رہی ہے' باشندگان ہند کا یہ کہنا تھا کہ ہند کا جتنا روپیہ اس ملک کی فتح اور اس کے نظم و نسق پر صرف ہوا ہے ' اس کا کچھ بدلہ اہل ہند کو نہیں ملا ' سنہ ۱۹۳۵ء کے دستور ہند کے بنانے کے زمانہ میں دونوں قوموں کے درمیان باہمی عداوت بہت بڑھ گئی تھی ' آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ برما کو ہند سے الگ کردیا جاے اور اس کا تعلق براہ راست حکومت انگلستان سے قایم کیا جاۓ' اسکے بعد ہند اور برما کے درمیان کئی تجارتی اور مالی معاہدے ہوے مگر اس کے باوجود دونوں کے درمیان کشیدگی کچھ کم نہیں ہوی ' اس سلسلہ میں برما کے اندر باشندگان ہند کے خلاف بہت سے بلوے اور فسادات ہوے ' جن کا رد عمل ہند میں بھی ہوا اور یہاں برمیوں کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکنے لگے ' اور جب سنہ ۱۹۴۲ء میں جاپان نے برما پر قبضہ کرلیا تو ایک بالکل نئی صورت حال پیدا ہوگئی ' اس کے متعلق مختصر طور پر آئندہ ابواب میں ث کی جائیگی .

اس صدی کی ابتدا ہی سے سمندر پار ملکوں کے اندر بسے ہوے اہل ہند کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کی بناء پر روشن خیال اہل ہند میں بھی ایک طرح کی برہمی پھیل گئی تھی ہم چوالیسویں اور انچاسویں باب میں بیان کرچکے ہیں کہ جب انیسویں صدی میں نئے ممالک کو کم اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی ضرورت پیش آئی تو ہند کی گنجان آبادیوں سے اس قسم کے لوگوں کو فراہم کیا جانے لگا ۔ اور ان سے اقرار ناموں پر دستخط لیکر ان کو مختلف ملکوں کی طرف روانہ کیا جانے لگا حکومت ہند نے سنہ ۱۹۱۵ء میں اس دستور کو بالکل ہی ممنوع قرار دیا اور اس نے سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک قانون منظور کیا جس کی روسے فنی مہارت نہیں رکھنے والے مزدوروں

کے غیر ممالک میں جانے پر بڑی پابندیاں عاید کی گئیں اور حکومت کو اختیار دیا گیا' کہ جہاں کہیں حالات اطمینان بخش نہ ہوں اس قسم کے مزدوروں کو وہاں جانے سے قانوناً روک دے برما کے علاوہ سیلون اور ملایا میں بہت سے ہندی مزدور جاکر بس گئے تھے' حکومت ہند نے ان ممالک میں اپنے نمائندے مقرر کئے تاکہ وہ یہاں کے ہندی مزدوروں کی دیکھ بھال کریں' اور ان کی مزدوری' خوش حالی اور شہری حقوق کی نگہداشت کریں' اگر دو حکومتوں کے درمیان کوئی مشکل پیش آجاتی تو عموماً سمجھوتوں کے ذریعہ اس کو حل کیا جاتا تھا۔

ان اقراری مزدوروں (indentured labourers) کے علاوہ جو ابتدائی زمانہ میں جنوبی افریقہ چلے گئے تھے کچھ آزاد ہندی تاجر' کاریگر اور پیشہ ور لوگ بھی تھے جو جنوبی آفریقہ اور نیز مشرقی آفریقہ کے ممالک میں جاکر بس گئے تھے' پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک زمانہ سے جنوبی آفریقہ میں بسے ہوے ہندیوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا تھا' پہلی جنگ عظیم کے بعد کنیا میں بھی ایک پیچیدہ صورت حال پیدا ہوگئی تھی' وہ تاجر اور کاریگر جو ہند سے نیوزیلینڈ اور کنیڈا جاکر بس گئے تھے اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ ان کو برطانیہ کی اور رعایا کے برابر شہری حقوق نہیں دئے جا رہے ہیں۔

گذشتہ باب میں ہم مختصر طور پر بیان کرچکے ہیں کہ لندن کی امپیریل کانفرنس کے اجلاسوں میں اس مسئلہ پر پوری طرح بحث ہوی تھی' سنہ ۱۹۱۸ع کی کانفرنس میں ایک تجویز یہ منظور ہوی تھی کہ برطانوی دولت عامہ کے ماتحت رہنے والی ہر ایک خود مختار حکومت کو حق حاصل ہے کہ وہ غیر ملکیوں کو اپنے ملک کے اندر آنے کے متعلق پابندیاں عاید کرے' پھر سنہ ۱۹۲۱ع میں ایک دوسری تجویز منظور ہوی جس میں اصولی حیثیت سے اہل ہند کے اس مطالبہ کو مان لیا گیا تھا کہ برطانوی سلطنت کے مختلف حصوں میں بسے

ہوے باشندگان ہند کو اوروں کی طرح شہری حقوق حاصل ہونگے - اس تجویز سے صرف جنوبی آفریقہ کے نمائندے نے اختلاف کیا ، سری سرینواس شاستری اور دوسرے نمائندگان ہند کی کوششوں سے آسٹریلیا ، نیوزیلینڈ اور کنیڈا میں بسے ہوے باشندگان ہند پر سے بہت سی پابندیاں اٹھالی گئیں ، لیکن مزید اہل ہند کی آمد کو ممنوع قرار دیدیا گیا ، اس وقت ان نوآبادیوں کے ساتھ ہند کے دوستانہ تعلقات قایم ہیں ، سنہ ۱۹۴۳ع کے قحط میں کنیڈا اور آسٹریلیا نے ہند کی جو قابل قدر مدد کی ، اس کی ہر جگہ بڑی تعریف ہوی ، آسٹریلیا اور ہند اپنے اپنے ہائی کمشنر مقرر کر رہے ہیں جن کی وجہ سے ان دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات اور بھی مضبوط ہوجائینگے .

کنیا میں بھی باشندگان ہند کی حیثیت کو سنہ ۱۹۲۳ع میں ایک حد تک بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ، مگر اس کے باوجود باشندگان ہند کو بلند مقامات میں بود و باش اختیار کرنے کی اجازت نہیں ، اس قسم کی پابندیاں ابھی تک اہل ہند کی شکایات کا موجب بنی ہوی ہیں .

جنوبی آفریقہ ہی ایک ایسا ملک ہے جس کے ساتھ ہند کے تعلقات ہمیشہ سے کشیدہ رہے ، یہاں تقریباً دو لاکھ ہندی آباد ہیں ، ان میں سے اسی فیصدی لوگ ایسے ہیں جو یہیں جنوبی آفریقہ میں پیدا ہوے ہیں ، ایک زمانہ سے ان پر مختلف قسم کی پابندیاں عاید کی جاتی رہی ہیں ، اور وقتاً فوقتاً مزید قانون سازی سے ان کی حیثیت کو بد سے بدتر کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے ، سنہ ۱۹۲۱ع کی امپیریل کانفرنس کے بعد سے دونوں ملکوں کے درمیان براہ راست نامہ و پیام ہونے لگے تھے ، اور سمجھوتہ کی کوشش ہو رہی تھی ، آخرکار سنہ ۱۹۲۷ع میں کیپ ٹاؤن کا معاہدہ ہوا ، اس کی روسے باشندگان ہند کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ مغربی طرز معاشرت اختیار کرلیں ، یا جنوبی آفریقہ چھوڑ کر چلے جائیں ، دونوں صورتوں میں حکومت نے اپنی

امداد کا وعدہ کیا تھا ، اس کے ساتھ جنوبی آفریقہ میں حکومت ہند کی طرف سے ایک ایجنٹ بھی مقرر ہوا ' جو اب ہائی کمشنر کہلاتا ہے سنہ ۱۹۳۲ء میں اس معاہدہ کی تجدید کی گئی ' اگرچہ چھوٹی چھوٹی مشکلات اب بھی باقی تھیں اور دونوں حکومتوں کے درمیان آراء کا اختلاف موجود تھا تاہم سنہ ۱۹۴۳ء تک دونوں حکومتوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قایم رہے یہاں تک کہ جب جنوبی آفریقہ میں یہ قانون نافذ ہوا کہ ڈربن اور نٹال کی بعض مخصوص مقامات میں باشندگان ہند کوئی زمین خرید نہیں سکتے ' تو ان دونوں ملکوں کے درمیان پھر سے تعلقات کشیدہ ہوگئے ' اور جب جنوبی آفریقہ کی حکومت نے ہند کے نمائندوں کے مطالبات تسلیم نہیں کئے تو ہند کی مجلس قانون ساز نے بھی اس کے خلاف اسی قسم کا ایک قانون نافذ کر دیا *.

پہلی جنگ عظیم کے بعد سے برطانوی دولت عامہ کی مسلموں میں ہند کے نمائندوں کو بھی با عزت جگہ دی جانے لگی چنانچہ سنہ ۱۹۱۷ء اور سنہ ۱۹۱۸ء کی جنگی کانفرنسوں میں ہند کے نمائندے بھی بلائے گئے تھے ' سنہ ۱۹۱۷ء کی کانفرنس میں ایک تجویز یہ منظور ہوی تھی کہ آئندہ سے تمام امپیریل کانفرنسوں میں ہند کے نمائندوں کو بھی شریک کیا جائے ' اسی بناء پر نمائندگان ہند اس کی مختلف کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں ' لارڈ سنہا کو انگلستان کی وزارت کا ایک عہدہ دیا گیا تھا امپیریل کانفرنسوں کی مختلف کمیٹیوں میں ' جو اقتصادی حکمت عملی کے تمام مسائل کے تصفیہ کیلئے بنائی جاتی تھیں ' نمائندگان ہند دوسری نوآبادات کے نمائندوں کے دوش بدوش کام کرتے رہے ہیں .

۱۹۳۰ء کی بحری کانفرنس کے بعد جو بحری معاہدہ ہوا اس میں ہند کو بھی برطانوی دولت عامہ کا ایک اہم جز قرار

* سنہ ۱۹۴۴ء کے موسم بہار میں دونوں ملکوں کے درمیان مصالحت اور سمجھوتے کی کوشش کی گئی .

دیا گیا ' سنہ ۱۹۳۲ع کی شاہی اقتصادی کانفرنس میں جو اٹاوہ میں ہوی اور بعد کی لندن کی کانفرنسوں میں بھی ہند کے نمائندوں نے بہت حصہ لیا اور نمایاں کام انجام دیا موجودہ جنگ کے دوران میں دوسری نوآبادیات کے نمائندوں کے دوش بدوش نمائندگان ہند بھی کابینہ جنگ کے اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں ۔

بین‌الاقوامی حیثیت سے بھی ہند کا مرتبہ بہت اونچا ہوگیا ' پہلی جنگ عظیم کے بعد ہند کی جنگی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ' اور صلح کی گفت و شنید کے وقت ہند کے نمائندوں کو بھی شریک کیا گیا اور ورسیلز Versailles اور انجمن اقوام League of Nations کے معاہدوں پر ان کے بھی دستخط لئے گئے ' اگرچہ ہند کے قومی حلقوں کا یہ اعتراض اب بھی اپنی جگہ پر تھا کہ اس انجمن کی مجلس عاملہ میں باشندگان ہند کو کوئی نشست نہیں دی گئی ہے تاہم نمائندگان ہند ابتدا ہی سے اس انجمن کی تمام کارروائیوں میں عملی حصہ لیتے رہے ہیں ' اس انجمن کے عام اجلاسوں اور انکی مختلف مستقل اور عارضی مجلسوں میں یا انکی ضمنی مجلسوں میں جو مخدر اور منوم دواؤں narcotic drugs کے متعلق مقرر کی جاتی تھیں ' نمائندگان ہند کا بڑا اثر تھا ' سنہ ۱۹۲۹ع سے لے کر نمائندگان ہند ایک ہندی ہی کی قیادت میں اس انجمن اقوام کے اجلاسوں میں شریک ہونے لگے تھے ' اور ہند ہی کے نمائندے کی حیثیت سے اعلحضرت آغا خاں نے سنہ ۱۹۳۰ع کے اجلاس عام کی صدارت کی ۔

بین الاقوامی ادارۂ مزدوران International Labour Orga-nisation میں نمائندگان ہند کا اس سے بھی زیادہ حصہ تھا ' ہند میں مزدوروں کے مسائل بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں ' اسی وجہ سے جنیوا کی کانفرنس میں یہ محسوس کیا گیا کہ باشندگان ہند کو اس ادارہ کا ایک اہم کام سپرد ہونا چاہئے ' مزدوروں کی مختلف کانفرنسوں اور مجلسوں میں حکومت ' آجر اور مزدور

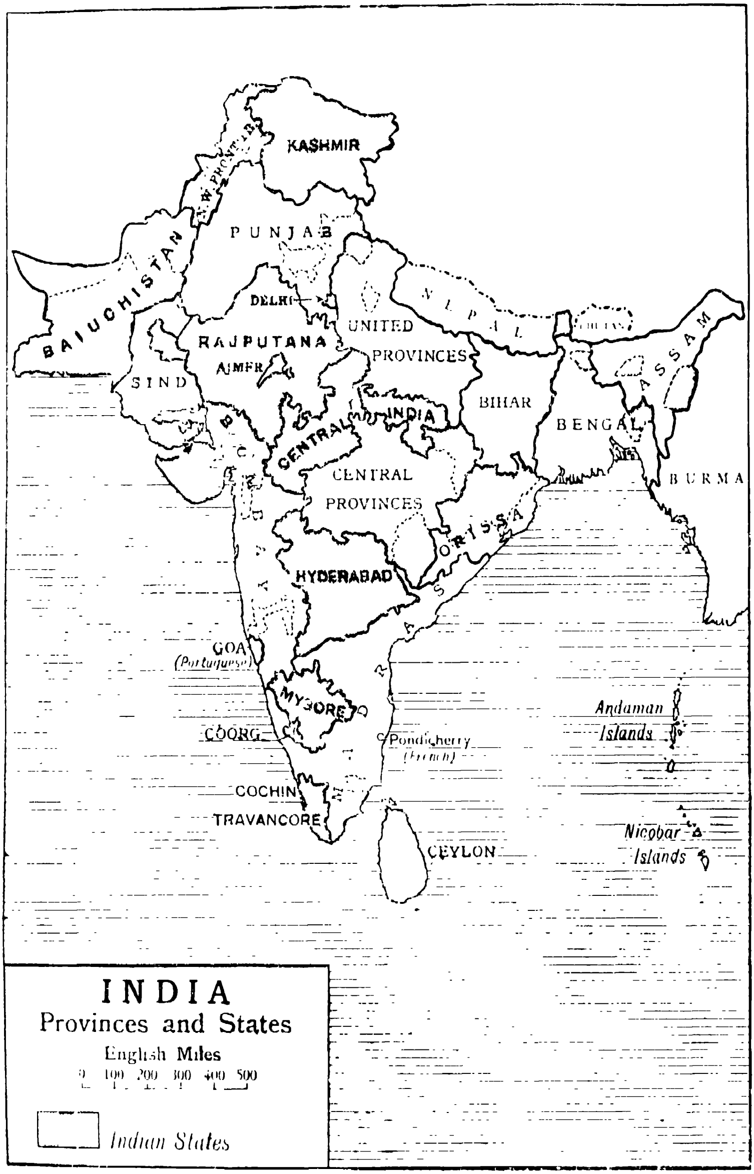
تینوں کے نمائندے ایک ہندی ہی کی قیادت میں شریک ہوتے رہے، اور اپنی قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے، سنہ ۱۹۲۷ء میں ایک ہندی شخص ہی اس کے سالانہ اجلاس عام کا صدر بنا، اب ہند کو دنیا کے اہم صنعتی ملکوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے اور اس ادارہ کی مجلس عاملہ میں ہند کو بھی ایک مستقل نشست دی گئی ہے مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں اس ادارہ کی کارروائیوں اور تجویزوں کا ہند کے باشندوں اور قانون ساز مجلسوں پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔

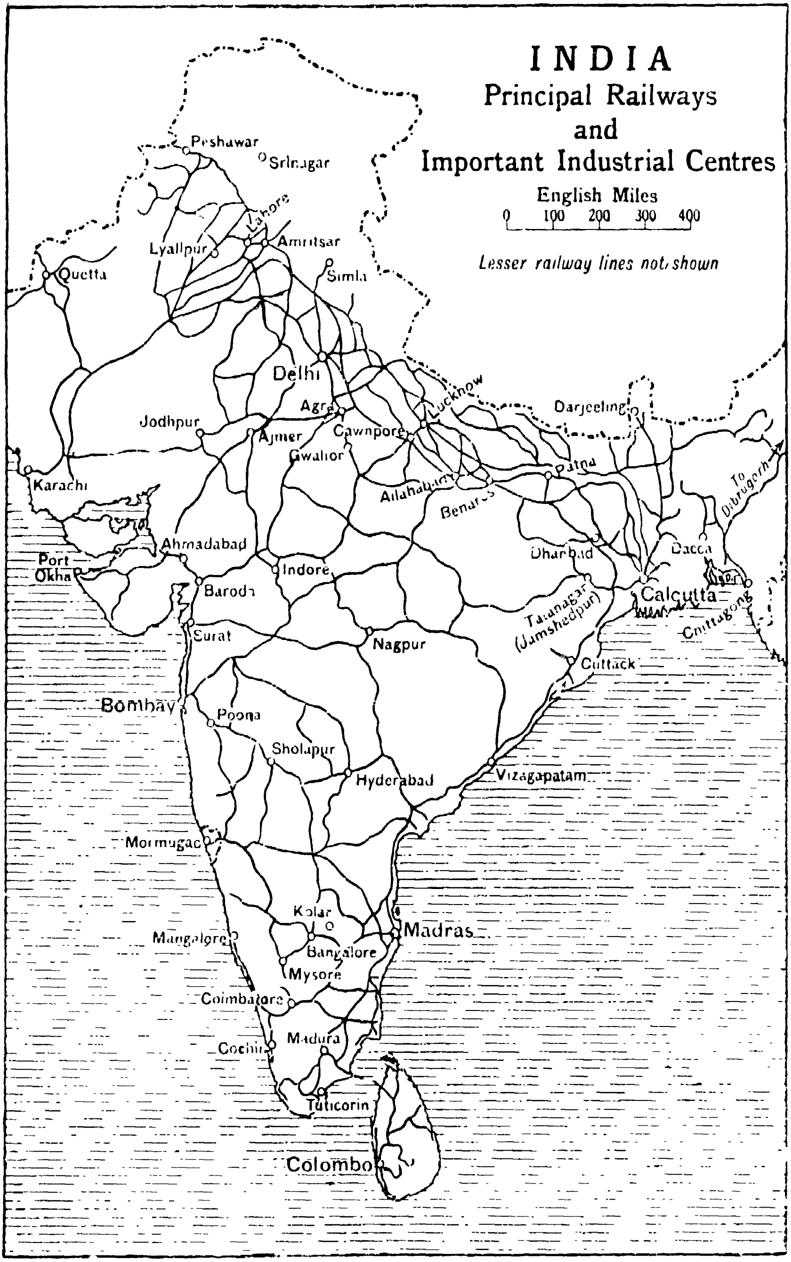
اسی طرح ان تمام بین‌الاقوامی کانفرنسوں میں جو اقتصادی معاملات، اور رسل و رسایل اور بار برداری کے مسائل کے طے کرنے کے لئے منعقد کی گئی تھیں۔ نمائندگان ہند کی بڑی آؤ بھگت کی گئی انہوں نے فوجی اور بحری کانفرنسوں کی کارروائیوں میں بھی شرکت کی سنہ ۱۹۲۱ء کی واشنگٹن کی بحری ہتھیاروں کی کانفرنس Naval Armaments Conference میں برطانوی سلطنت کے وفد میں نوآبادیات کے نمائندوں کے ساتھ ساتھ ہند کا نمائندہ بھی موجود تھا، نیز سنہ ۱۹۳۰ء کی بحری کانفرنس میں جو لندن میں ہوی، حکومت ہند کا نمائندہ بھیجا گیا تھا، اسی طرح جنیوا کی تخفیف اسلحہ کی کانفرنس Disarmament Conference میں بھی ہند نے اپنی پوری نمائندگی کی۔

اب ہند کی حیثیت اتنی اونچی ہوچکی تھی کہ باشندگان ہند غیر سرکاری بین‌الاقوامی مجالس میں بھی مساویانہ طور پر حصہ لے سکتے تھے، جیسے کہ پارلیمنٹری یونین، ادارہ ہاے آجرین عالم World Employers Organisations اور بحرالکاہل کی کانفرنسیں تھیں۔ ثقافتی حیثیت سے بھی ہند کو بڑی اہمیت حاصل ہوی، لندن اور دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں جدید ہندی فنون لطیفہ کی بڑی بڑی نمائشیں ہویں، وادی سندھ کے قبل از تاریخ آثار قدیمہ کی بر آمد کے بعد دنیا بھر کے لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوگئی، اورینٹل کانگریسوں میں

ہند کے محققین نے بھی زبردست حصہ لیا ، سائنس کی ترقی کے لئے کلکتہ میں جو اجلاس ہوا اس میں برٹش اسوسیئیشن کے نمائندے بھی شریک ہوئے ، سنہ ١٩٢٣ع میں لندن کی رائل سوسائٹی کا ایک اجلاس ہند میں ہوا ، اور رابندرناتھ ٹیگور اور محمد اقبال جیسے ہندی شاعروں کو دنیا کے باعزت شعرا کی صف میں جگہ دی گئی .

اس قسم کی کوششوں سے نہ صرف ان لوگوں کو ، جو ان مجلسوں میں حصہ لیتے رہے ، بین‌الاقوامی معاملات سے واقفیت اور تجربہ حاصل کرنے کا موقع ملا ، بلکہ عام باشندگان ہند کو بھی بین‌الاقوامی معاملات سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی ، بیرون ہند کے متعلق مختلف قسم کی ناواقفیتیں اور غلط فہمیاں آہستہ آہستہ دور ہونے لگیں ، اس کے بالمقابل یوروپ اور امریکہ کے لوگ بھی ہند کی ثقافت اور اس کے مسایل سے بہت دلچسپی لینے لگے ہیں یہاں تک کہ بین‌الاقوامی حیثیت سے ہند کو ایک نمایاں درجہ حاصل ہوگیا ہے .


KASHMIR
N.W. FRONTIER
PUNJAB
BALUCHISTAN
DELHI
RAJPUTANA
AJMER
SIND
UNITED PROVINCES
NEPAL
BIHAR
BENGAL
ASSAM
BURMA
CENTRAL INDIA
CENTRAL PROVINCES
ORISSA
HYDERABAD
BOMBAY
MADRAS
GOA (Portuguese)
MYSORE
COORG
Pondicherry (French)
COCHIN
TRAVANCORE
CEYLON
Andaman Islands
Nicobar Islands
INDIA
Provinces and States
English Miles
0 100 200 300 400 500
Indian States



INDIA
Principal Railways
and
Important Industrial Centres
English Miles
0 100 200 300 400
Lesser railway lines not shown
Peshawar
Srinagar
Lahore
Amritsar
Lyallpur
Quetta
Simla
Delhi
Agra
Lucknow
Darjeeling
Jodhpur
Ajmer
Cawnpore
Gwalior
Karachi
Allahabad
Benares
Patna
To Dibrugarh
Ahmadabad
Port Okha
Baroda
Indore
Dhanbad
Dacca
Calcutta
Chittagong
Tatanagar (Jamshedpur)
Surat
Nagpur
Cuttack
Bombay
Poona
Sholapur
Hyderabad
Vizagapatam
Mormugao
Kolar
Madras
Mangalore
Bangalore
Mysore
Coimbatore
Madura
Cochin
Tuticorin
Colombo

باب ۵۲

دستوری مسایل

پہلا رخ

گذشتہ باب میں ہم نے ہند کے ان بین الاقوامی تعلقات پر ایک تبصرہ کیا ہے ، جو دنیا کی دو بڑی جنگوں کے درمیان ظہور پذیر ہوے ، یہ ذہن نشین رہے کہ سنہ ۱۹۱۹ ع کے دستوری اصلاحات سے ان تعلقات کی نوعیت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوی ، اس سلسلہ میں حکومت ہند کے اختیارات وہی تھے جو اس سے پہلے تھے ، گورنر جنرل باجلاس کونسل کسی حکمت عملی کے اختیار کرنے ، یا قانون بنانے یا نظم و نسق کے قایم کرنے میں ہند کی مجلس قانون ساز کی بجاے وزیر ہند کے توسط سے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ تھا ، حکومت ہند کو عملا تمام اندرونی اور بیرونی معاملات میں آزادی دی گئی تھی ، تا وقتیکہ برطانوی حکومت کی کسی اہم حکمت عملی کے ساتھ اس کی ٹکر نہ ہو ، برطانیہ اور ہند کی حکومتوں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہوا تھا کہ برطانوی یا بین الاقوامی مجلسوں کیلئے دونوں کی مرضی سے ہند کے نمائندے منتخب کئے جائینگے ، اور ان کے نام ہدایات جاری کئے جائینگے ، بعض اوقات یہ پابندی بھی ضروری نہیں تھی ، چنانچہ حکومت ہند کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ براہ راست دوسری نو آبادیات اور خاصکر جنوبی آفریقہ کے ساتھ گفت و شنید کرے ، اسی طرح ایک مجلس مال Fiscal convention میں اس اصول کو تسلیم کرلیا گیا تھا کہ اگر محاصل سے متعلق معاملات میں حکومت ہند اور مجلس قانون ساز متفق ہوجائیں تو وزیر ہند یا برطانوی پارلیمنٹ اس میں کبھی مداخلت نہیں کریگی ، اسی مجلس کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ حکومت ہند

کو غیر ملک کے تحفظی مال پر لگائے جانے والی تمام زاید چنگیوں Countervailing excise duties کو منسوخ کرنے تفریقی تحفظ discriminating protection کی حکمت عملی پر کاربند ہونے ' اور نیز سنہ ۱۹۳۲ ع میں اٹاوہ Ottawa کا معاہدہ کرنے اور پھر سنہ ۱۹۳۴ ع میں ہند اور جاپان کے درمیان تجاری معاہدہ کرانے میں بڑی آسانی ہوگئی ' اس قسم کی تدبیروں کے متعلق آئندہ تفصیل سے بیان کیا جائیگا ۔

اس باب میں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ سنہ ۱۹۱۹ ع سے لیکر سنہ ۱۹۳۵ ع تک جب کہ ایک نئے دستور ہند کا نفاذ ہوا سنہ ۱۹۱۹ ع کے دستوری اصلاحات کے نفاذ سے کیا نتیجے پیدا ہوے ۔ سنہ ۱۹۱۹ ع کے دستوری اصلاحات کا نفاذ بالکل ہی غیر موزوں اور غیر مناسب حالات میں ہوا تھا ۔ سنہ ۱۹۱۸ ع بڑی تکلیفوں اور پریشانیوں پر ختم ہوا تھا ' کیونکہ اس سال بارش نہیں ہوی تھی ' اور ملک کے مختلف حصوں میں قحط کے آثار نمایاں تھے ' مگر پرانے قحطوں کے تجربات کو وقت پر کام میں لایا گیا اور حالات اتنے نازک نہیں ہوے جس کی پہلے سے توقع کی جاتی تھی ۔ البتہ چیزوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں ' ان لوگوں کو جن کی آمدنی محدود تھی ' یا ان مزدوروں کو جن کی مزدوری قیمتوں کے برابر نہیں بڑھی ہوی تھی ' بہت ہی تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا تھا ' خصوصاً جنگ کے بعد کی عام کوفت تو سب لوگوں کو ہی محسوس ہو رہی تھی ۔

ہند کی اکثر سیاسی جماعتیں ان دستوری اصلاحات سے بالکل مطمئن نہیں تھیں ' اس وقت کانگریس پر انتہا پسندوں کا غلبہ ہوگیا تھا ' ان حالات میں کانگریس کا ایک نیا رہبر موہن داس کرم چند گاندھی منظر عام پر آیا یہ شخص گجرات کا رہنے والا اور ایک زبردست قانون داں تھا ' جنوبی آفریقہ میں وہ ایک مدت تک زندگی بسر کرتا رہا اور وہاں کے باشندگاں ہند کی شکایات

کو دور کرنے کیلئے وھاں کی حکومت کے ساتھ لڑتا رھا ' اور جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو اس نے لوگوں کو اس میں حصہ لینے کی بڑی ترغیب دی جنگ کے ختم ھونے کے بعد جب وہ اپنے وطن لوٹا تو اس کا عزم بالجزم اور اس کی سادگی اور درویش منشی اس کی غیر معمولی مقبولیت کا ذریعہ بن گئی ' اور وہ ھندوؤں کے تمام طبقوں میں ھر دلعزیز ھوگیا ' اور کانگریس میں تو اس کو حاکمانہ اقتدار حاصل ھوگیا .

ان غیر اطمینان بخش حالات میں جبکہ نیا دستور ابھی تک نافذ نہیں ھوا تھا ' پرانی مجلس قانون ساز نے سنہ ۱۹۱۹ع کی ابتدا میں رولٹ کمیٹی کی سفارشات کو ' جس کے سب سیاسی گروہ سخت مخالف تھے ' ایک مسودۂ قانون کی صورت میں پیش کیا ' ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس قانون سے لوگوں کی شخصی آزادی پر بڑی زد پڑتی ھے ' اور ایک ایسے وقت جبکہ نئے دستوری اصلاحات نافذ ھونے والے ھیں ' رولٹ کمیٹی کی سفارشات پر کاربند ھونا سخت مضر اور خطرناک ھوگا ' گاندھی جی نے جو بے تشدد عدم تعاون non-violent non - co-operation کی تحریک کے علمبردار تھے ' ھند میں وہ طریقہ رائج کیا جس کو آج مقاومت بے مزاحمت Passive resistance کہا جاتا ھے ' وہ اور ان کے ساتھیوں نے صاف طور پر یہ اعلان کیا کہ اگر یہ مسودہ منظور کیا جائیگا تو کھلم کھلا اس کو توڑنے کی کوشش کی جائیگی ' اس کے بعد اس مسودہ کے خلاف زبردست مظاھرے ھوتے رھے ' یہاں تک کہ مارچ سنہ ۱۹۱۹ع میں یہ مسودہ منظور ھوگیا لیکن قبل اس کے کہ اس پر عمل ھو سب سے پہلے خود دھلی میں اور پھر پنجاب اور ھند کے دوسرے مقامات میں تشدد کے واقعات ھونے لگے ' ان حالات میں امیر افغانستان نے سرحد پر حملہ کردیا جس کا ذکر پچھلے باب میں گزر چکا ھے ' پنجاب کے بعض حصوں میں حکومت کا نظم و نسق قایم نہیں رھا ' اور وھاں فوجی حکومت (Martial Law) قایم ھوگئی اسی زمانہ میں امرتسر کے قریب جلیانوالہ باغ

کا مشہور عام دردناک حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے سارے ہند میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑگئی اس حادثہ میں بہت سے آدمی جان سے مارے گئے تھے ، اس کے بعد بتدریج حکومت کا نظم و نسق ٹھیک ہوا ، اور پنجاب سے فوجی حکومت ہٹالی گئی ، پھر ایک کمیشن کے ذریعہ اس ناگوار حادثہ کی تحقیقات ہوی ، اور اس نے فوجی حکومت کے بعض قابل اعتراض پہلووں پر سخت ملامت کی ، لیکن اس سے باشندگان ہند کی کچھ زیادہ تشفی نہیں ہوی ، ایک زمانہ تک لوگوں کے دل و دماغ پر اس ناگوار حادثہ کا اثر باقی رہا .

سنہ ۱۹۱۹ع کے موسم خزاں میں پارلیمنٹ کے اندر مسودۂ اصلاحات (Reform Bill) پیش ہوا ، اس پر بحث ہو ہی رہی تھی کہ اس کے قبول کرنے یا نہ کرنے پر ہند کی سیاسی جماعتوں میں اختلاف پیدا ہوگیا ، اور جب اس سال کے دسمبر میں یہ مسودہ قانون بنا تو ہند میں اعتدال پسند Moderate یا آزاد خیال Liberal لوگ اپنی جماعت الگ بنا چکے تھے ۔ اس میں وہ تمام افراد شامل تھے جن کو حکومت اور قانون سازی میں تیس سال کا تجربہ تھا .

اس جماعت کا مقصد بھی انتہا پسند جماعت کی طرح سوراج یا حکومت خود اختیاری کا حصول تھا ، مگر اعتدال پسند لوگ برطانوی دولت عامہ سے اپنا رشتہ توڑنا نہیں چاہتے تھے ، ان کا ارادہ تھا کہ سنہ ۱۹۱۹ع کے دستوری اصلاحات کو کام میں لاکر ہند کیلئے نوآبادیات کا درجہ حاصل کیا جائے ، کانگریس پر انتہا پسند لوگوں کا قبضہ تھا ، وہ بے تشدد عدم تعاون کے اصول پر ایک سال کے اندر حقیقی معنی میں سوراج حاصل کرلینا چاہتے تھے ، اس لیے انہوں نے نئے انتخابات کا مقاطعہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ، اس کے باوجود عام انتخابات میں اعتدال پسند منتخب ہوکر آئے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے اور انہی لوگوں نے سنہ ۱۹۲۱ع کی ابتدا میں نئے دستور کے مطابق پہلی مجلس قانون ساز بنائی ،

ایسے نازک موقعہ پر ترکی کا مسئلہ پیش آیا جس کی وجہ سے تمام مسلمانان ہند میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہوگیا' پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی کے سامنے ایسی شرطیں پیش کی گئی تھیں جن کو مسلمانان ہند سخت نا پسند کرتے تھے ' پر جوش قسم کے مسلمان عوام میں ہجرت کی تبلیغ کرنے لگے' اس طرح شمالی ہند کے بہت سے مسلمانوں نے افغانستان جاکر بسنے کی کوشش کی ' اس سلسلہ میں لوگوں کو بے حد جانی اور مالی نقصان ہوا ' اور جب وہ ہر پھر کر اپنے وطن لوٹے تو ان کی حالت بہت ہی تباہ ہوچکی تھی ' بعض مسلمان ایسے بھی تھے ' جو گاندھی جی اور کانگریس کے دوسرے رہنماؤں کے مشورہ پر عمل کرنے کیلئے تیار تھے ' پنجاب کے سکھوں میں بھی ایک ہیجان پھیلا ہوا تھا اور سارے ملک میں ایک قسم کی بے چینی پیدا ہوگئی تھی' کانگریس اور خلافت کے کارکنوں نے سیول نا فرمانی کی تحریک شروع کی ' اور لوگوں کو پرامن طریقہ پر ایسے قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی ترغیب دی جو ان کی نظر میں قابل اعتراض تھے ' عوام اگرچہ اپنے رہنماؤں کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے کیلئے تیار تھے تاہم انہیں عدم تشدد کا کوئی تجربہ نہیں تھا ' نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ تشدد کے واقعات ہونے لگے ' سنہ ۱۹۲۱ع کے موسم گرما میں مالابار کے ماپلا مسلمانوں نے ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا ' اور اپنے پڑوسی ہندووں کیلئے دہشت اور خوف کا باعث بن گئے تھے ۔ آخرکار ہندووں کا ایک بڑا طبقہ یہ محسوس کرنے لگا کہ دونوں مذہبوں کے پرجوش پیرووں کے درمیان کوئی اتحاد اور اتفاق نہیں ہوسکتا ' اور جب ترکی میں قومیت کا جذبہ ترقی کرگیا اور خلافت کو منسوخ کیا گیا تو ہند کے پرجوش مسلمان بھی کچھ ٹھنڈے پڑگئے ' اس دوران میں حکومت ہند اور نئی مجلس قانون ساز کے ارباب اقتدار قانونی حکومت کو برقرار رکھنے میں مصروف تھے ' اور جب بتدریج کانگریس

اور پرجوش مسلمانوں کا اتحاد ٹوٹا تو سنہ ۱۹۲۱ع کی تحریک عدم تعاون خود بخود نا کام ہوگئی ' اور جب سنہ ۱۹۲۲ع میں گاندھی جی پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں قید و بند کی سزا ملی تو ملک کے کسی گوشہ میں بھی کوئی ہیجان نہیں پیدا ہوسکا آخرکار دوسرے سال بیماری کی وجہ سے گاندھی جی کو رھا کردیا گیا ۔

اس مدت میں نئی مجالس قانون ساز اپنے نئے اختیارات کو کام میں لاکر اپنا فرض ٹھیک طور پر ادا کرنے کی کوشش کر رھی تھیں ' اور مرکزی اور صوبائی حکومتیں اپنا کام باقاعدگی کے ساتھ انجام دے رہی تھیں ' سرکاری اور غیر سرکاری اراکین دونوں نے ملکر مختلف اصلاحی تجویزیں منظور کیں سنہ ۱۹۰۸ع اور سنہ ۱۹۱۰ع کے قانون مطابع کی ایک حد تک ترمیم کی گئی ' عدالتوں میں نسلی امتیازات کے برتنے کے متعلق ایک اطمینان بخش سمجھوتہ کیا گیا ' حالانکہ گذشتہ صدی میں اسی البرٹ کے مسودہ Ilbert Bill کے خلاف ایک بڑا زبردست ہنگامہ ہوا تھا ' مزدوروں کے متعلق ایک نیا اور بہتر قانون بنایا گیا ' اور سمندر پار کے باشندگان ہند کی حالت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ کی گئی ' فوج کے ذمہ دار عہدوں پر باشندگان ہند کا تقرر ہوا ' مالی کمیشن Fiscal Commission کی سفارشات پر حکومت ہند نے تفریقی تحفظ discriminating protection کے اصول کو تسلیم کرلیا تھا ' اور حکومت کا سالانہ میزانیہ اراکین مجلس قانون ساز کی جانچ پرتال کیلئے پیش کیا جانے لگا تھا ۔

مرکزی مجلس قانون ساز کی خاص کر آخری نشستوں میں اس کے اور حکومت کے درمیان دو مسئلوں پر سخت اختلاف ہوگیا تھا ' غیر سرکاری اراکین اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ کس طرح انگلستان اور مشرق وسطی کے دستور اور آئین بدلتے جارہے ہیں ' وہ چاہتے تھے کہ ہند کے دستور میں بھی حسب ضرورت تبدیلیاں کرکے انتہا پسندوں کو راضی اور ان کو خاموش کریں ' لیکن حکومت نے ان کے مطالبات کی طرف کبھی کوئی

توجہ نہیں دی ' ان کا سب سے بڑا اختلاف نمک کے محصول کے بڑھانے پر تھا ' ان اسباب کی بناء پر جن کو آئندہ بیان کیا جائیگا ' ہند کے میزانیہ میں ہر سال خسارہ پڑتا تھا ' اور اس کو پورا کرنے کیلئے حکومت ہند نے نمک کا محصول دگنا کردینا چاہا ' اس محصول کی تاریخ بہت لمبی ہے ' مگر یہ یاد رہے کہ لارڈ کرزن کے زمانہ میں اس محصول کو بہت گھٹا دیا گیا تھا ' کیونکہ یہی ایک محصول ایسا تھا ' جو ہر اعلی اور ادنی آدمی کی جیب پر پڑتا تھا ' سنہ ۱۹۲۳ء کے موسم بہار میں مجلس قانون ساز کی سخت مخالفت کے باوجود حکومت نے اس محصول کو دگنا کردیا اور جب دوسرے سال بھی حکومت کو شکست ہوگئی تو گورنر جنرل نے اپنے خاص اختیارات کو کام میں لاکر نمک کا محصول بڑھا دیا .

صوبوں میں گورنر منتخب اراکین میں سے چند کو وزارت کے عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز کرتا تھا ' ان کے ماتحت منتقلہ شعبے ہوتے تھے ' اور محفوظ شعبے مجلس عاملہ کے ان اراکین کے ذمے ہوتے تھے جو قدامت پسند طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ' جن میں زیادہ تر زمیندار ' قانون دان اور کارخانہ دار ہوتے تھے ' مختلف صوبوں میں بہت سے مفید قوانین نافذ کئے گئے ' جیسے بنگال میں کلکتہ کا قانون مجلس بلدی Calcutta Municipal Act بمبئی کا قانون مجالس مقامی Local Boards Act مدراس کا قانون امداد سرکاری برائے کارخانجات State Aid to Indus-trics Act اور اودھ کا قانون مالگذاری Tenancy Act اور اس کے علاوہ قانون نظم و نسق دیہات Village Administration Act اور قانون تعلیم ابتدائی Primary Education Act جاری کئے گئے .

حکومت کے خرچ و اخراجات کے جانے کے بعد اتنی کم رقم بچتی تھی کہ وزراء قومی تعمیر کے کاموں کے متعلق اپنی خاص تجویزوں کو بروےکار نہیں لاسکتے تھے ' مالیات کا محفوظ شعبے میں شمار تھا ' اگر انکی تجویزوں پر عمل کیا جائے تو محصولوں

کو بڑھانے کے سوا کوئی اور صورت نہیں تھی ' اور وہ محصول کو اس خوف سے نہیں بڑھاتے تھے کہ کہیں ملک کی انتہا پسند جماعت ان کو نشانہ ملامت نہ بنالے ' مدراس کی مجلس قانون ساز میں غیر برھمن اراکین کی اکثریت تھی ' اور اس وقت کے گورنر لارڈ ولنگڈن نے ان ھی اراکین سے اپنے وزیر منتخب کیے تھے' اس طرح یہاں دو فریقی نظام حکومت Two Party System شروع ہوگیا تھا ' دوسرے صوبوں میں منتخب افراد مختلف جماعتوں کی نمائندگی کر رہے تھے ۔ اس لئے یہاں کے وزیروں کو زیادہ تر سرکاری اراکین ھی پر اعتماد کرنا پڑتا تھا ۔

اس موقعہ پر کانگریس کے بعض بڑے رھنماؤں کے رویہ میں تبدیلی پیدا ھوی ' وہ اچھی طرح محسوس کرنے لگے کہ تعمیری کام سے بالکل علحدگی کی بناء پر ملک کے تعلیم یافتہ حلقوں میں کانگریس کے ساتھ ان کی دلچسپی کم ھوتی جا رھی ھے ' انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ مجالس قانون ساز سے باھر رہ کر لڑنے کی بجائے ان کے اندر داخل ھوکر دستور ھی کو توڑنے کی کوشش کی جائے ' چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ع کے انتخابات میں کانگریس نے بھی اپنے امیدوار کھڑے کیے ' اور اعتدال پسندوں کے خلاف زبردست پروپگنڈا کرنا شروع کیا ' ان کا سب سے بڑا حربہ اعتدال پسندوں کی وہ شکست تھی جو دستوری اصلاحات اور نمک کا محصول بڑھانے کے سلسلہ میں ان کو حکومت کی طرف سے ملی تھی ' کانگریسیوں نے عوام کو جتانا شروع کیا کہ کس طرح تعلیم ' حفظان صحت اور معیار زندگی کو ترقی دینے میں اعتدال پسند وزیروں کے اختیارات بالکل محدود ھیں ' اور وہ یہ چاھتے ھیں کہ مجالس قانون ساز میں پہنچ کر دستور کو توڑیں اور وسیع اختیارات حاصل کریں ' اور چونکہ کانگریسیوں نے بارھا قید و بند کی مصیبتیں برداشت کی تھیں اس لیے عوام کو انکے ساتھ ایک بڑی حد تک ھمدردی تھی' اس انتخاب میں بہت سے کانگریسیوں نے کامیابی حاصل کی اور جب سنہ ۱۹۲۶ع میں دوسرا انتخاب ھوا تو اور زیادہ کانگریسی امیدوار کامیاب ھوکر مجالس قانون ساز میں پہنچ گئے ۔

کانگریس کے نئے اراکین کا مقصد اگرچہ نئے دستور کو توڑنا تھا تاہم جب وہ اندر پہنچے تو حکومت ہی کے کل پرزے بن گئے ، صرف بنگال اور صوبہ متوسط ہی دو صوبے ایسے تھے جہاں کانگریسیوں نے ہر قدم پر روڑا ڈالنا شروع کیا ، یہاں تک کہ وزیروں کو اپنا کام کرنا بہت دشوار ہوگیا ، بسااوقات گورنر کو صوبہ کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑتا تھا ، تاہم مرکزی اور دوسرے صوبوں کی مجالس قانون ساز میں بہت سے مفید قوانین بنائے گئے ، جن میں سے اکثر کو کانگریسیوں کی تائید حاصل تھی ، لیکن اب اراکین میں پہلے کی طرح توازن اور حسن ظن باقی نہیں رہا تھا ، کانگریسیوں کے داخل ہونے کے بعد زیادہ تر یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ دستور وقت میں فوری اور مزید اصلاح کی جائے مگر حکومت ان کے مطالبہ کو اس وجہ سے تسلیم نہیں کرتی تھی کہ سنہ ۱۹۱۹ء کے شاہی اعلان کے مطابق هند کو درجہ نو آبادیات فوراً نہیں دیا جاسکتا تھا ، اور رایل کمیشن کے تقرر سے پہلے جو سنہ ۱۹۱۹ء کے دس سال بعد مقرر کیا جانے والا تھا ، دستور میں کوئی اہم تبدیلی نہیں کی جاسکتی تھی .

اس دور میں سیاسی بے چینی کم و بیش بالکل مقامی ہوگئی تھی ، بنگال میں سازشی لوگ ابھی تک اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے ، پنجاب کے سکھ بھی گڑبڑ کر رہے تھے ، بمبئی میں مزدور اپنی باقاعدہ انجمنوں کے ذریعہ شور و غل مچا رہے تھے ، لیکن سب سے زیادہ ہنگامہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی نفاق کی وجہ سے تھا ، مختلف جگہوں پر خون ریزیاں ہونے لگی تھیں ، اس وقت یہ بتانا مشکل ہے کہ آیا ان خون ریزیوں کے پیچھے دونوں طرف کے عوام کی تائید تھی یا نہیں البتہ یہ تمام جھگڑے چند مذہبی دیوانوں اور شورش پسندوں کی وجہ سے ترقی پاجاتے تھے ، ان کا کام ہی یہی تھا کہ عوام کے جذبات کو برانگیختہ کریں ، اور جب جذبات بالکل بھڑک

اٹھتے تھے تو لڑائیوں کی نوبت پہنچ جاتی تھی' دونوں طرف کے متین اور سنجیدہ اشخاص ان جھگڑوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جھگڑنے والوں پر ہمیشہ لعنت ملامت کرتے رہتے تھے' اس قومی نفاق کے باوجود ہندو اور مسلمان مجالس قانون ساز میں اکثر ملکر کام کرتے تھے' اور دونوں کا یہی مطالبہ تھا کہ دستور کی اصلاح کی جاے' مگر دونوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن ہند کو حکومت خود اختیاری ملنے والی ہے' اس لیے دونوں قومیں اپنے اپنے سیاسی حقوق کے تحفظ کی کوشش کر رہی تھیں' اس کے علاوہ اس زمانہ میں حکومت نے سیول سروس والوں کی تنخواہوں کے بڑھانے اور اس ملازمت میں باشندگان ہند کی تعداد کو زیادہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا' تعلیم اور تعمیرات عامہ وغیرہ کے محکموں میں صرف باشندگان ہند ہی کی بھرتی ہونے لگی تھی' مسلمان اور دوسری اقلیتوں کا مطالبہ یہ تھا کہ ہر ایک محکمہ میں ان کی مردم شماری کے تناسب سے انہیں ملازمتیں دی جائیں' اور چونکہ ہر ایک درجہ کی ملازمت میں ان کی تعداد کے متعین کرنے کا بھی مطالبہ ہورہا تھا اس لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ناچاقی زیادہ ہوتی جارہی تھی۔

سنہ ۱۹۲۴ع میں مسلم لیگ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی' اس کا مطالبہ یہ تھا کہ ہند کو درجہ نوآبادیات عطا کیا جاے' اور یہاں پارلیمنٹری طرز کی حکومت قایم ہو' نیز مسلمانوں کا انتخاب جداگانہ اصول پر مبنی ہو' تمام صوبے خودمختار ہوں اور ان پر امور عامہ کے سوا کسی اور معاملہ میں مرکزی حکومت کا کوئی اختیارنہ ہو' یہ آخری شرط بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کے حق میں بہت مفید تھی' کیونکہ اس صورت میں ان کو اپنی اکثریت کی بناء پر آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ مل سکتا تھا' اسی زمانہ میں ہندوؤں کا ایک طبقہ مذہب کے متعلق کانگریسیوں کی غیر جانبدارانہ حکمت عملی سے

بیزار ہوگیا تھا ، ان کو خوف تھا کہ کہیں یہ کانگریسی ہندو مفاد ہی کو قربان نہ کردیں ، چنانچہ انہوں نے اپنی ایک علحدہ جماعت بنائی جو آج ہندو مہا سبھا کے نام سے مشہور ہے ۔

ان حالات میں جب برطانوی حکومت نے دستوری اصلاحات کے تیار کرنے میں دیر لگائی تو ہند کی مختلف جماعتوں کے بعض سیاسی رہنماؤں نے سنہ ۱۹۲۸ء کی ابتدا میں ایک اجلاس کیا اور ایک متفقہ دستور کا خاکہ تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی سنہ ۱۹۲۸ء کے موسم خزاں میں تمام جماعتوں کی کانفرنس All Parties conference میں اس متفقہ دستور کا خاکہ پیش ہوا اور سب لوگوں نے اس کو قبول بھی کرلیا ، اس کے متعلق آخری فیصلہ کرنے کیلئے تمام جماعتوں کے سربرآوردہ لوگوں کا ایک اجتماع ہونے والا تھا لیکن کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کی وجہ سے اس اجتماع کی نوبت ہی نہیں آئی ، اور بعد میں حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ لوگ اس متفقہ دستورکے خاکے کو ہمیشہ کیلئے بھول گئے ۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ سنہ ۱۹۱۹ء کے دستور میں یہ بتایا گیا تھا کہ دس سال بعد اس پر نظر ثانی کرنے کیلئے ایک رایل کمیشن مقرر کیا جائیگا ، مگر انگلستان کی رجعت پسند حکومت نے اس مدت کو گھٹاکر سنہ ۱۹۲۷ء میں ایک کمیشن مقرر کیا ، جس کے صدر سرجان (بعد میں لارڈ) سائمن تھے ، چونکہ اس کے تمام ارکان برطانوی پارلیمنٹ سے چنے گئے تھے اور ہند کے نمائندوں کو اس میں کوئی جگہ نہیں دی گئی تھی اس لیے ہند کی تمام سیاسی جماعتیں ناراض ہوگئیں ، اور ان سب نے ملکر اس کے مقاطعہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ، سنہ ۱۹۲۸ء کی ابتدا میں یہ کمیشن ہند آیا ، اور پھر دوسرے سال موسم سرما میں اس نے ہند کا دورہ کیا ، پہلی مرتبہ تو ہند کی راے عامہ کے معلوم کرنے میں اسے کوئی کامیابی نہیں ہوی ، البتہ دوسری مرتبہ اس کو تحقیقات کرنے کا کچھ موقع مل گیا کیونکہ ہند کے بعض سربرآوردہ

لوگ ان کی مدد کرنے کیلئے تیار ہوگئے تھے۔ بہر حال اس کمیشن نے مئی سنہ ۱۹۳۰ء میں اپنی روداد شایع کی، مگر اس سے پہلے ہند کے اندر دو اہم واقعات پیش آئے جن کا ہند کی سیاست پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

جب سنہ ۱۹۲۹ء کے موسم گرما میں انگلستان کے اندر مزدوروں کی حکومت برسر اقتدار آئی تو وایسرائے ہند لارڈ اروِن جو بعد میں ویکونٹ ہالی فاکس کے نام سے مشہور ہوے، انگلستان ہو آئے، وہاں سے واپس آنے کے بعد انہوں نے دو اعلان شایع کیے، پہلا اعلان یہ تھا :—

"ان شکوک و شبہات کے مد نظر جو برطانیہ عظمیٰ اور ہند دونوں ملکوں میں سنہ ۱۹۱۹ء کے دستور کے تیار کرنے کے متعلق حکومت برطانیہ کے مقاصد کی تشریح کے سلسلہ میں ظاہر کیے جاتے ہیں۔ مجھکو ملک معظم کی حکومت کی طرف سے صاف طور پر اس بات کا اعلان کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ اس کی راے میں سنہ ۱۹۱۹ء کا اعلان خود اس بات کا مقتضی ہے کہ ہند کی دستوری ترقی کا منتہا اور غرض و غایت درجہ نوآبادیات کا حصول ہونا چاہئے"

دوسرے اعلان کا خلاصہ یہ تھا کہ سائمن کمیشن کی روداد کے حاصل ہونے کے بعد اس کے متعلق کوئی کارروائی کرنے سے پہلے برطانوی حکومت ہند کی تمام سیاسی جماعتوں اور ریاستوں کے نمائندوں کو جمع کرکے دستور سازی کے مسئلہ کے تمام پہلووں پر ان بحث کریگی اور ان کی راے لیگی۔

ہند کے والیان ریاست کے نمائندوں کی اس مجوزہ کانفرنس میں شمولیت کا مسئلہ ذرا تشریح طلب ہے، یہ یاد ہوگا کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں دہلی کے اندر ایک ایوان والیان ریاست قایم کیا گیا تھا، جس میں چھوٹی بڑی ریاستوں کے نمائندے شریک ہوتے تھے، اور عام معاملات کے متعلق راے اور مشورہ دیتے تھے، وایسراے اس کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا۔

اس میں بہت سے سرکاری عہدہ دار بھی شریک ہوتے تھے ۔ تاکہ ان امور کے متعلق جن کا تعلق برطانوی ہند اور ریاستوں کے ساتھ ہوتا تھا ، کوئی مفید مشورہ دے سکیں ہند کی مجلس قانون ساز کے ساتھ اس ایوان کا کوئی باقاعدہ تعلق نہیں تھا ، اس کے باوجود برطانوی ہند اور ریاستوں کے اقتصادی اور تمدنی مفادات کچھ اس قسم کے تھے ، کہ برطانوی ہند کے اندر تبدیلیوں کے واقع ہونے سے ریاستوں پر بھی ان کا اثر پڑنا لازمی تھا ، اسی لئے ہر ایک صاحب نظر اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ ریاستوں کو نظر انداز کرکے صرف برطانوی ہند کے متعلق کوئی دیرپا دستور تیار نہیں کیا جاسکتا ۔

سائمن کمیشن کی آخری سفارشات کا خلاصہ یہ تھا کہ صوبوں کی دو عملی طرز حکومت diarchy کو ترقی دیکر مکمل ذمہ دارانہ حکومت بنائی جائے ۔ گورنروں کو خاص اختیارات دئے جائیں تاکہ وہ امن و امان کو قایم رکھیں اور اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرسکیں ، رائے دھندوں کی تعداد زیادہ کی جائے اور مجالس قانون ساز کی توسیع کی جائے ، مرکز میں وفاقی طرز حکومت ہو ، جس کے نمائندے دونوں ایوانوں میں صوبوں کی مجالس قانون ساز سے منتخب کئے جائیں ، مرکزی مجلس عاملہ Central Executive میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ، اس کمیشن کا منتہائے نظر کل ہند کا وفاق All India Federation تھا مگر اس پر فوری عمل در آمد نہیں ہوسکتا تھا ، روداد میں درجہ نوآبادیات کا کوئی ذکر نہیں تھا ، ان کا خیال تھا کہ ہند میں جمہوری طرز کی حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی ۔

ہند کے ماہرین سیاست کو اس روداد سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی کیونکہ اس میں درجہ نوآبادیات اور لندن کی گول میز کانفرنس کا کوئی ذکر نہیں تھا ، جس کے متعلق چند مہینے پہلے وایسرائے ہند نے اعلان کیا تھا ، تاہم اعتدال پسند ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس کا خیر مقدم کیا ، انھیں یہ امید تھی

کہ گول میز کانفرنس میں درجہ نوآبادیات ھی کا دستور مرتب کیا جائیگا ، مگر کانگریس نے جس پر انتہا پسندوں کا غلبہ ہوگیا تھا ' درجہ نوآبادیات کو بھی ماننے سے انکار کردیا اور اپنا نصب العین مکمل آزادی قرار دیا ' اس نے لندن کی کانفرنس میں اپنے نمائندوں کے بھیجنے سے بھی انکار کردیا ' سنہ ۱۹۳۰ع میں سیول نافرمانی شروع ہوی اور لوگوں نے ساحل گجرات پر گاندھی جی کی قیادت میں نمک بنانا شروع کیا ' سنہ ۱۹۲۱ع کی طرح اس سیول نافرمانی کی ابتدا عدم تشدد سے ہوی اور اس کا اختتام تشدد پر ہوا ' مگر اس مرتبہ مسلمان عام طور پر اس تحریک سے بالکل الگ رہے ' حکومت نے حسب معمول سیول نافرمانی کو روکنے کی تدابیر اختیار کیں ' گاندھی جی اور بہت سے کانگریسی رہنماؤں اور کارکنوں کو جیل کی کوٹھریوں میں بند کردیا ' یہ تحریک اس سال کے آخر تک جاری رہی یہاں تک کہ اس سال نومبر اور دسمبر میں گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس لندن میں ہوا ۔

اس اجلاس میں بہت سے والیان اور بعض وزراء ریاست بھی شریک ہوے تھے ' اگرچہ کانگریس نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر ہند کی دوسری تمام جماعتوں کے نمائندے بلائے گئے تھے - جن میں اعتدال پسند ہندو اور مسلمان ' ہندو مہاسبھا ' ہند کے عیسائی یوروپین اور اینگلو انڈین ' سکھ اور اچھوت شامل تھے - برطانوی پارلیمنٹ کی تینوں جماعتوں کے نائب ور وکیل Spokesmen بھی اس میں شریک تھے ' ابتدا ھی میں بیکانیر کے مہاراجہ نے دیسی ریاستوں کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوے درجہ نوآبادیات کے عام مطالبہ کی تائید کی ' اور اس تجویز کی سفارش کی کہ ہند کا دستور وفاقی بنیادوں پر مرتب کیا جاے ' جس میں والیان ریاست اپنی مرضی سے اس شرط پر شریک ہونگے کہ ان کے حقوق کی حفاظت کا وعدہ کیا جاے گا ' دوسرے والیان ریاست نے بھی اس بات پر زور دیا کہ

وفاقی حکومت ایک بڑی حد تک وفاقی مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہوگی اس کے بعد ایک کمیٹی نے مجلس قانون ساز اور مجلس عاملہ کے متعلق اپنی تفصیلی تجویزیں پیش کیں ' دوسری کمیٹیوں نے صوبجاتی خودمختاری ' حلقہ ہاے انتخاب ' دفاع اور ملازمتوں کے متعلق اپنے متفقہ فیصلے پیش کیے ' اقلیتوں کے متعلق جداگانہ طرز انتخاب کے بحال رکھنے کی تجویز کو عام طور پر مان لیا گیا تھا ' مگر اس میں اختلاف تھا کہ آیا یہ حق صرف مسلمانوں کو حاصل ہو یا دوسری اقلیتوں کو بھی یہ حق عطا کیا جاے ' یا ایک مدت تک کے لئے جداگانہ انتخاب کے اصول پر عمل کیا جاے اور پھر اس کو منسوخ کردیا جاے ' اس وقت برطانیہ کے وزیر اعظم میکڈونلڈ تھے ' انہوں نے پہلے اجلاس کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوے یہ اعلان کیا کہ برطانوی حکومت صوبوں کے اندر مکمل ذمہ دارانہ حکومت اور وفاقی مرکز میں دو عملی طرز کی ذمہ دارانہ حکومت کی قراردادوں کو تسلیم کرتی ہے ' وزیر موصوف نے یہ بھی کہا کہ اگر کہیں کوئی تحفظات Safeguards عائد بھی کئے جائینگے تو وہ اس طرح کے ہونگے کہ ذمہ دارانہ حکومت کی ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی اپنے اس اعلان پر غور و فکر کرنے کے لئے انہوں نے گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں کو غیر مشروط طور پر رہا کردیا ' اس کے بعد گاندھی جی اور وایسراے ہند لارڈ ارون کے درمیان کئی مرتبہ گفت و شنید ہوی اور مارچ سنہ ۱۹۳۱ع میں ایک معاهدہ ہوا جو گاندھی ارون میثاق کے نام سے مشہور ہے ' سیول نافرمانی ملتوی ہوگئی اور حکومت نے بھی اپنے تمام احکام واپس لے لئے ' اس کی وجہ سے بڑی تیزی کے ساتھ حالات میں تبدیلی پیدا ہوگئی اور ملک میں پورے طور پر امن اور امان قایم ہوگیا .

اس کانفرنس کا دوسرا اجلاس سنہ ۱۹۳۱ع کے موسم خزاں میں ہوا ' اس میں گاندھی جی نے کانگریس کے مختار کل نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی ' ہند کی دوسری جماعتوں کے نمائندے

وھی تھے جو پہلے اجلاس میں شریک ھوے تھے' البتہ اس مرتبہ مزدوروں کی حکومت کے نمائندوں کی بجاے انگلستان کی قومی حکومت کے نمائندے شریک ھوے تھے - بحث تمام تر دو مسئلوں کے متعلق تھی ' یعنی نو عملی طرز کی وفاقی حکومت اور اقلیتوں کی نمائندگی ۔ گاندھی جی نے مرکز میں دو عملی طرز کی حکومت کو قبول نہیں کیا ' اور اقلیتوں کے مسئلہ پر بھی کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ھوسکا ' اقلیتوں کے تمام نمائندوں نے جداگانہ طرز انتخاب کا مطالبہ کیا تھا ۔ اس اجلاس کے خاتمہ پر انگلستان کی قومی حکومت نے جس میں برطانیہ کی تمام سیاسی جماعتیں شامل تھیں ۔ اسی حکمت عملی کی توثیق اور تصدیق کی ' جس کی وضاحت پہلے اجلاس کے خاتمہ پر کی گئی تھی ۔

اس درمیان میں ھند کے اندر پھر سے سیول نافرمانی شروع ھوگئی ۔ کانگریسیوں کا الزام یہ تھا کہ گاندھی ارون میثاق کی شرایط پر پوری طرح عمل نہیں کیا گیا ' اور صاف طور پر یہ اعلان کردیا کہ وہ مکمل آزادی سے کم تر درجہ کو قبول کرنے کے لئے ھرگز تیار نہیں ھیں ۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عالمگیر اسباب کی بناء پر پیداوار کی اھم چیزوں کی قیمتیں بہت گرگئی تھیں' اس کی وجہ سے کاشتکاروں کو بڑی سخت تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔ اکثر صوبوں میں کانگریسی کاشتکاروں کو اس بات پر ابھارنے لگے کہ وہ حکومت کو لگان ادا نہ کریں اس کی وجہ سے صوبہ سرحد میں بہت بڑا ھنگامہ ھوا ' اور صوبہ بنگال میں دھشت انگیزی کے واقعات ھونے لگے ۔ وایسراے ھند لارڈ ولنگڈن نے فسادات کو روکنے کی بہت کوشش کی اور تمام کانگریسیوں کو جیلوں میں بند کردیا ' ان میں سے ایک گاندھی جی بھی تھے جو لندن سے واپس آنے کے بعد اپنی جماعت کی سرگرمیوں کا ساتھ دینے لگے تھے ' اس کے بعد گول میز کانفرنس کے ساتھ کانگریس کا تعاون بالکل ھی ختم ھوگیا ۔

اس کانفرنس کے تیسرے اجلاس سے پہلے برطانوی حکومت نے چند کمیٹیاں مقرر کیں تاکہ ہند کا دورہ کرکے حق رائے دھی ' مالیات ' اور وفاق میں والیان ریاست کی شمولیت کے مسئلوں پر اپنی تحقیقات پیش کریں ' چونکہ اقلیتوں کے مسئلہ پر کوئی باھمی سمجھوتہ کی امید نہیں تھی اسلیے وزیر اعظم میکڈونلڈ نے اپنی جانب سے فرقہ وارانہ فیصلہ Communal Award صادر کیا ' اس میں تمام اقلیتوں کیلئے جداگانہ طرز انتخاب تسلیم کرلیا گیا تھا ' بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کیلئے بھی جہاں وہ اکثریت میں تھے یہی اصول مان لیا گیا تھا ' پست اقوام کو ایک اقلیت کی حیثیت سے جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا تھا ' اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو اور پنجاب میں سکھوں اور ھندووں کو اپنی مردم شماری کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی گئی تھیں ' گاندھی جی اس وقت پونا جیل میں بند تھے ' انہوں نے اس فیصلہ کو سخت نا پسند کیا کیونکہ اس میں اچھوتوں کو عام ھندووں سے الگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی ' چونکہ ان کی نظر میں یہ ایک بہت بڑی نکبت تھی اس لئے اس کو روکنے کیلئے انہوں نے مرن برت شروع کردیا ' آخر ھندووں اور اچھوتوں نے ملکر ایک سمجھوتہ کیا جو ' میثاق پونا ' کے نام سے مشہور ھے ' اس کی رو سے اچھوتوں کو زیادہ نشستیں مل گئیں ' اور طریقہ انتخاب یہ اختیار کیا گیا کہ اچھوت پہلے اپنے چند نمائندوں کو منتخب کریں ' اور پھر وہ اور عام ھندو دونوں ملکر ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں ' لیکن اس سمجھوتے سے دونوں فریق کو تشفی نہیں ھوسکی ' کیونکہ عام ھندو یہ خیال کرتے تھے کہ اس سمجھوتہ کی وجہ سے ان کی نشستیں کم ھوگئیں ' اور اچھوت اپنی جگہ پر یہ سمجھنے لگے کہ ان کی نمائندگی کے معاملہ میں عام ھندووں کو دخل اندازی کا موقعہ دیدیا گیا ھے .

بہر حال اس کانفرس کا تیسرا اور آخری اجلاس سنہ ۱۹۳۲ء کے موسم خزاں میں ہوا ' اس میں بحث اس بات پر تھی کہ وفاقی ایوانوں کیلئے طریقہ انتخاب کیا ہونا چاہئے اور حکومت کی طرف سے مالی اور دوسرے تحفظات کس نوعیت کے ہونے چاہئیں اس اجلاس کے بعد برطانوی حکومت نے ایک طویل مسودۂ قانون تیار کیا اور پھر اس کی نظر ثانی کیلئے اس کو پارلیمنٹ کی ایک متحدہ کمیٹی کے حوالہ کیا ' اس میں بعض باشندگان ہند بھی مدد دینے کیلئے خاص طور پر بلائے گئے تھے ' بڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ مسودہ سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون ہند کی صورت میں منظور ہوا ' آئندہ باب میں ہم اس قانون کی جزئیات پر بحث کرینگے اور بتائینگے کہ ان پر کہاں تک عمل ہوسکا .

باب ۳۸

دستوری مسایل

دوسرا رخ

سنہ ۱۹۳۵ع - سنہ ۱۹۴۲ع

سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور کی تین خصوصیتیں ہیں ' صوبجاتی خود مختاری ' مرکز میں دو عملی جس میں ریاستیں بھی شامل رہینگی ' اور اس مرکز سے ان تعلقات کا الگ کرلینا جو اقتدار اعلی اور ریاستوں کے مابین قایم ہیں ' ہر ایک میں بہت سے مستثنیات اور تحفظات تجویز کیے گئے تھے ' مرکز میں وفاقی حکومت اس وقت تک قایم نہیں ہوسکتی جب تک کہ اتنی ریاستیں ' جن کی آبادی تمام ریاستوں کی کم از کم آدھی آبادہ کے برابر ہو ' اس میں شریک ہونے پر آمادہ نہ ہوں - وفاقی حکومت میں ریاستوں کی شمولیت کے مسئلہ پر گفت و شنید ہو ہی رہی تھی ' کہ دوسری جنگ عظیم چھڑگئی جس کی وجہ سے یہ گفت و شنید ملتوی ہوگئی اور اس وقت سے لیکر اب تک اس کے متعلق پھر کوئی گفتگو نہیں ہوسکی .

برطانوی ہند اور ریاستوں کے تعلقات کے مسئلہ کو حال میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے' ان تعلقات کی ابتدائی تاریخ پچھلے صفحات میں پیش کی جا چکی ہے ' ڈلہوزی کے زمانہ میں برطانوی حکومت نے ہند کے والیان ریاست کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا اس سے دو اصول پیدا ہوے ایک اصول بازگشت اور دوسرا اصول اقتدار اعلی اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کس طرح پہلا اصول آگے چلکر ترک کردیا گیا اور دوسرا اصول اپنی جگہ پر قایم رہا کیننگ نے سنہ ۱۸۶۰ع میں اقتدار اعلی کے اصول کو استعمال کیا اور دو نئے اصول بنائے جن کی اب تک برطانوی حکومت پیروی کر رہی ہے ' ایک یہ

ھے کہ والیان ریاست کے خاندانوں کو بر قرار رکھ کر ریاستوں کی انفرادی حیثیت کو قایم رکھا جاے اور دوسرا یہ ھے کہ بر وقت مداخلت کے ذریعہ ریاستوں کی بد عنوانیوں اور بد انتظامیوں کو روکا جاے ' * حکومت ھند کی آئندہ تمام کارروائیوں میں یہی دو اصول کام کرتے رھے ھیں ' اور گذشتہ پچیس برس کے عرصہ میں کئی موقعوں پر اقتدار اعلی کو ریاست کی بد انتظامیوں کے معاملہ میں دخل دینا پڑا تھا ' لارڈ ریڈنگ نے برطانوی حکومت کی منظوری سے سنہ ۱۹۲۱ع میں یہ اعلان کیا کہ تاج برطانیہ کی برتری معاھدوں اور میثاقوں ھی پر مبنی نہیں ھے ' بلکہ ان کے بغیر بھی یہ برتری اپنی جگہ پر قایم ھے ' اور اس کے علاوہ غیر ملکی حکومتوں اور ان کی پالیسیوں کے معاملہ میں اس کو پورے شاھی اختیارات حاصل ھونگے ' برطانوی حکومت کا حق اور فرض ھے کہ ریاستوں کے معاھدوں اور میثاقوں کا لحاظ رکھنے کے ساتھ ساتھ سارے ھند میں بہترین طریقہ پر امن اور امان قایم کرے ۔

ریاستوں کا کل رقبہ پورے رقبہ ھند کے دو پانچویں حصہ کے برابر ھے اور تقریباً ھند کی کل آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ریاستوں میں آباد ھے ' یوں تو چھوٹی بڑی ریاستیں تقریباً پانچ سو ھیں ' لیکن ان میں سے صرف ایک سو بیس والیان ریاست ایسے ھیں جو ایوان والیان ریاست کے رکن ھیں ' اور ریاستوں کا ایک بڑا رقبہ اور ان کی آبادی ان ھی کے ماتحت ھے ' رقبہ اور سیاسی ' اقتصادی اور تمدنی حالات کے لحاظ سے ان ریاستوں میں بہت بڑا فرق ھے ' رقبہ کے لحاظ سے کشمیر سب سے بڑی ریاست ھے ۔ اس کا کل رقبہ ۸۶۰۰۰ مربع میل ھے مگر آبادی کے لحاظ سے ریاست حیدرآباد سب سے بڑی ریاست ھے ' یہاں تقریباً ایک کرور ساٹھ لاکھ نفوس بستے ھیں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تین سو سے زیادہ ھیں ' ان کا کل رقبہ چھ ھزار مربع میل سے کچھ

* بٹلر کمیٹی کی روداد پیراگراف ۲۲ Cmd ۳۳۰۲ ۔

زیادہ ہے ' اور انکی کل آبادی دس لاکھ کے قریب ہے ' ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اکثر والیان ریاست اور باشندے ہندومت کے پیرو ہیں ۔

سنہ ۱۹۳۰ع کے دستور سے پہلے تاج برطانیہ حکومت ہند کے توسط سے ریاستوں اور ان کے والیان پر اپنا اقتدار قایم کئے ہوے تھا ' حکومت ہند سے مراد اس وقت گورنر جنرل اور اس کی مجلس عاملہ تھی ' سنہ ۱۹۱۹ع کے دستوری اعلانات اور اصلاحات کے بعد بعض ریاستیں اپنے مستقبل پر غور و فکر کرنے لگی تھیں ' کہ اگر برطانوی ہند کو ذمہ دارانہ حکومت دیدی جائے تو اس کے ساتھ ان ریاستوں کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے ' بعض ریاستوں نے یہ مطالبہ شروع کیا تھا کہ برطانوی ہند کی بحری چنگی کی رقم سے ان کو بھی حصہ ملنا چاہئے ' نیز اسی قسم کے دوسرے اقتصادی مسائل اٹھ کھڑے ہوے ' ان کو حل کرنے کے لئے سنہ ۱۹۲۷ع میں سرھارکورٹ بٹلر کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی تاکہ اقتدار اعلی اور دیسی ریاستوں کے درمیان سیاسی تعلقات اور برطانوی ہند اور ریاستوں کے درمیان مالی اور اقتصادی تعلقات کا فیصلہ کرے ' پہلے مسئلہ کے متعلق کمیٹی کی راے وہی تھی جس کو لارڈ ریڈنگ نے ظاہر کیا تھا ' اور جس کا خلاصہ بیالیسویں باب میں دیا جا چکا ہے ' دوسرے مسئلہ کے متعلق کمیٹی نے دونوں کے تعلقات کو ہموار کرنے کے لئے چند تدبیریں بتائی تھیں ' مگر کوئی تفصیلی سفارشات پیش نہیں کیں ' کمیٹی کا ایک اہم تبصرہ یہ تھا کہ اس کی راے میں ریاستوں کی مرضی کے بغیر ان کے اور اقتدار اعلی کے تعلقات برطانوی ہند کی کسی ایسی نئی حکومت کے حوالے نہیں ہونے چاہئے ' جو ہند کی مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہو ' اس لئے والیان ریاست اور ان کے وزیروں کو گول میز کانفرنس میں دعوت دیکر بلانا کچھ بے سبب نہیں تھا ' ہم اوپر یہ بتاچکے ہیں کہ اس کے اجلاسوں میں ان والیان ریاست کا

کیا طرز عمل رہا ' اور آخرکار سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون ہند میں وفاقی حکومت کس طرح تجویز کی گئی ۔

اس قانون کے تحت وفاقی مجلس قانون ساز کے دو ایوان قرار دیے گئے ' ایک ایوان خاص Upper House اور دوسرا ایوان عام Lower House والیان ریاست کو ایوان خاص کے دو پانچویں اراکین کو اور ایوان عام کے ایک تہائی اراکین کو نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا ' ان ایوانوں میں ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ' جن کا اوپر ذکر ہوا ہے ' نمائندگی کا کوئی حق نہیں دیا گیا وایسرائے کو ایوان خاص کے چند اراکین کے نامزد کرنے کا حق دیا گیا اور باقی اراکین کیلئے یہ تجویز کیا گیا کہ صوبوں کے مقامی حلقوں سے جداگانہ انتخاب کے اصول پر ان کا براہ راست قرار دیا گیا کہ برطانوی ہند کے اراکین کا انتخاب صوبائی مجلس قانون ساز کریں ۔

ان مسائل کی فہرستیں الگ الگ کردی گئیں جن کے متعلق وفاقی اور صوبائی مجالس قانون ساز کو قانون بنانے کا اختیار حاصل تھا ' بعض مسائل ایسے بھی تھے جنکے متعلق قانون بنانے کا دونوں کو اختیار دیا گیا تھا ۔ مگر جب کسی مسئلہ کے متعلق وفاقی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے درمیان اختلاف پیدا ہوجائے تو گورنر جنرل کو اس کے فیصلے کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا کہ وہ مسئلہ کس کے ماتحت ہو ۔

گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا کہ مجلس قانون ساز کے اراکین میں سے اپنی مجلس عاملہ کو منتخب کرے جو اپنے افعال کیلئے مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہونگے مگر دفاع اور امور خارجہ دو اہم مسئلے ایسے تھے جن کو مشیروں کے تحت رکھا گیا اور یہ مشیر گورنر جنرل کے سامنے جوابدہ قرار دئے گئے دفاع اور امور خارجہ کے متعلق مجلس قانون ساز بحث کرنے کی مجاز تھی مگر ان پر کوئی رائے شماری نہیں ہوسکتی تھی ' گورنر جنرل کی اجازت کے بغیر سکوں ' نوٹوں اور دستور

کی ترمیم کے متعلق کوئی قانون پیش نہیں کیا جاسکتا تھا ' وفاق کی مالی حالت اور اسکے استحکام کے متعلق گورنر جنرل پر بہت سی ذمہ داریاں عاید کی گئی تھیں ' اس پر صوبائی گورنروں کی ذمہ داریوں کی طرح اور بہت سی ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں جن کو آئندہ بیان کیا جائیگا .

وفاق میں شامل ہونے سے پہلے ہر ایک والی ریاست کو اسکی اجازت تھی کہ ان مسائل کو متعین کردے جن کے متعلق وفاقی حکومت ریاست کے اندر قانون نافذ کرسکتی ہے ' ورنہ اندرونی معاملات میں اسکو پوری آزادی حاصل تھی ' یہ قرار دیا گیا تھا کہ حکومت ہند کی بجائے تاج برطانیہ کا نمائندہ اقتدار اعلی کے تمام احکام ریاستوں پر جاری کریگا ' اگرچہ گورنر جنرل اور نمائندہ تاج کے عہدے اور ان کے اختیارات الگ الگ ہونگے تاہم ایک ہی شخص کو ان دونوں عہدوں کا ذمہ دار بنایا جاسکتا ہے ' آجکل یہ دونوں عہدے ایک ہی شخص کے ماتحت ہیں ' اس آخری تبدیلی پر عمل شروع ہوگیا ہے چنانچہ اب حکومت ہند یعنی وایسرائے اور اس کی مجلس عاملہ کو ریاستوں پر وہ اختیارات حاصل نہیں ہیں جو گورنر جنرل کو بحیثیت نمائندہ تاج کے ریاستوں پر حاصل ہوتے ہیں -

چونکہ وفاقی نظام کی تمام جزئیات پر اب تک عمل نہیں ہوسکا ' اس لئے مرکزی حکومت کا ڈھانچہ اب بھی وہی ہے جو سنہ ١٩١٩ع کے دستور میں تجویز کیا گیا تھا ' یہ اب تک وزیر ہند کے ماتحت ہے ' اور اس کے توسط سے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہے ' مرکزی مجلس قانون ساز پرانے دستور ہی کے مطابق کام کر رہی ہے ' اس کا آخری انتخاب سنہ ١٩٣٤ع میں ہوا اور ایوان خاص کے اراکین سنہ ١٩٣٧ع میں منتخب ہوے تھے ' ان دونوں کی میعاد زندگی میں وقتاً فوقتاً توسیع ہوتی جا رہی ہے .

صوبوں کے متعلق سب سے پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ برما کو ہند سے بالکل الگ کردیا گیا اور اب اس کا تعلق براہ راست انگلستان کی حکومت کے ساتھ ہے ' ہند میں دو نئے صوبے بنائے گئے ' سندھ کو بمبئی سے الگ کرکے ایک علحدہ صوبہ قرار دیا گیا ' اور بہار اور مدراس کے چند اضلاع کو لیکر اوریسہ کا نیا صوبہ بنایا گیا ' کل گیارہ صوبوں میں سندھ اور سرحد کے صوبوں میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت ہے ' پنجاب میں ستاون فیصدی مسلمان آباد ہیں ' باقی ہندو اور سکھ ہیں ' بنگال میں پچپن فیصدی مسلمان آباد ہیں اور باقی ہندو ہیں ' باقی سات صوبوں میں ہندوؤں کی بڑی اکثریت ہے ' اگر پورے برطانوی ہند کی آبادی کا لحاظ کیا جائے تو پینسٹھ فیصدی ہندو ہیں جن میں پست اقوام بھی داخل ہیں ' ستائیس فیصدی مسلمان اور باقی آٹھ فیصدی دوسری اقلیتیں ہیں ۔

سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور میں چھ صوبوں کے لئے دو ایوان مقرر کئے گئے اور حق رائے دھی کی بنیاد جائداد کی ملکیت پر رکھی گئی ' ایوان عام کیلئے اس ملکیت کی مقدار کم رکھی گئی اور اراکین کی تعداد بڑھادی گئی ' مسلمانوں ' سکھوں ' ہندی عیسائیوں ' اینگلو انڈین اور یوروپین لوگوں میں سے ہر ایک کیلئے جداگانہ طرز انتخاب تجویز کیا گیا ' پست اقوام کیلئے وہ طریقہ تجویز ہوا جس کا ذکر گذشتہ باب میں ہوچکا ہے ' زمینداروں ' مزدوروں ' تجارت اور صنعت و حرفت کے پیشہوروں کو بھی چند نشستیں دی گئی ہیں ' مختلف مذاہب کی عورتوں کو بھی نمائندگی کا حق دیا گیا اور ان کیلئے بھی چند مخصوص نشستیں متعین کی گئیں ' سرکاری عہدہداروں کو کوئی نشست نہیں دی گئی اور گورنروں کو اس ایوان کیلئے اراکین کے نامزد کرنے کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا ۔

البتہ ایوان خاص میں گورنروں کو چند اراکین کے نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا ہے ' بنگال اور بہار میں یہ طریقہ تجویز

کیا گیا ہے کہ ایوان عام سے چند اراکین کو منتخب کریں اور باقی ریاستوں کیلئے مختلف قومیں اپنے نمائندے روانہ کریں، بنگال کے ہندووں کے سوا باقی تمام اقلیتوں کو اپنی مردم شماری کے تناسب سے بھی زیادہ نشستیں دی گئی ہیں۔

حکومت کا عاملانہ اختیار Executive power وزیروں کی مجلس کے سپرد کیا گیا جس کا گورنر ان اراکین میں سے چنتا ہوتا تھا جو بذریعہ انتخاب کامیاب ہوکر آئے ہیں یہ وزیر مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ قرار دیے گئے تھے۔ مختلف ذرایع آمدنی کو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان بانٹ دیا گیا تھا، سنہ ۱۹۱۹ع کے دستور میں جو شعبے صوبائی حکومت کے ماتحت تھے، ان کے متعلق قانون بنانے کا پورا حق صوبائی مجالس قانون ساز اور مجلس عاملہ کو دیدیا گیا تھا، اور اب مرکزی حکومت اور مرکزی مجلس قانون ساز کو ان پر کوئی اختیار نہیں رہا، ہند کی سیول سروس پولیس اور تمام طبی ملازمتوں کیلئے وزیر ہند ہی کو تقرر کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، اور وہی ان کے متعلق قانون بنانے کا مجاز تھا گورنروں کا تقرر ملک معظم کے اختیار میں تھا، اور وہ گورنر جنرل کے توسط سے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ قرار دیے گئے تھے ان پر چند خاص ذمہ داریاں عاید کی گئی تھیں جن میں سے چند یہ تھیں۔ اگر تمام صوبہ میں یا صوبہ کے کسی خاص حصے میں امن کو خطرہ ہو تو وہ اس کی فوری روک تھام کرے، سیول سروس والوں کے حقوق کی نگہداشت کرے، اقلیتوں کے جائز حقوق کی حفاظت کرے، اور برطانوی تجارت کے ساتھ کوئی تفریق نہ ہونے دے، گورنر جنرل پر بھی وفاقی حکومت میں اسی قسم کی ذمہ داریاں عاید کی گئی تھیں، مگر چونکہ وفاقی حکومت اب تک قایم نہیں ہوسکی، اس لئے اس کو اپنی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

اس قانون میں اس قسم کی دفعات بھی رکھی گئی تھیں جن سے برطانوی رعایا اور تجارتی کمپنیوں کی حفاظت مقصود تھی ، اگر ہند کی وفاقی یا صوبائی حکومت ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک کرے تو ان دفعات کے ذریعہ اس کا خاطر خواہ تدارک ہوسکتا تھا ۔

قانون کی ایک اہم دفعہ یہ تھی کہ اگر کسی صوبہ میں دستور کے مطابق حکومت کا نظام ٹوٹ جاے تو گورنر اس صوبہ کے تمام قانونی اور انتظامی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے ، ایسے موقعوں پر وہ حکومت ہند کی بجاے گورنر جنرل کے احکام کا تابع ہوگا ، دوسری جنگ عظیم کا خیال کرکے گورنر جنرل کو ایک خاص قانون کے ذریعہ مخصوص اختیارات عطا کیے گئے ، تاکہ ضرورت کے وقت وہ ان کو استعمال کرسکے ۔

ہم نے ایک بہت ہی طول طویل اور پیچیدہ قانون کا ایک اجمالی خاکہ دیا ہے ، مختصر یہ ہے کہ وفاقی حکومت میں دو عملی رکھی گئی ، اور دفاع اور امور خارجہ پورے طور پر وایسراے کے ماتحت رکھے گئے ، گورنر جنرل اور گورنروں کو بہت سے خصوصی اختیارات عطا کیے گئے ، اس قانون میں نہ صرف اقلیتوں کیلئے بلکہ برطانوی رعایا کے ان افراد کیلئے بھی جو ہند میں آباد ہوگئے تھے ، تحفظات تجویز کیے گئے ، حکومت ہند کو سیول سروس والوں پر کوئی اختیار نہیں دیا گیا ، ظاہر ہے کہ اس قسم کا قانون نوآبادیات کا دستور نہیں ہوسکتا ، لیکن جیسا کہ ایک سرکاری نمائندے * نے مسودہ حکومت ہند Government of India Bill پر تبصرہ کرتے ہوے کہا ہے ، اگر حکومت برطانیہ اور ہند کے درمیان آزادانہ گفت و شنید ہو اور اس کے لئے خاص طور پر انتظامات کیے جائیں تو ہند کو برطانوی سلطنت کے ماتحت رہ کر درجہ نوآبادیات کا مل جانا کچھ غیر موزوں نہیں ہے ۔

* رڈ ccxcvii (سنہ ۳۵ - ۱۹۳۴ء) ۱۳ - ۱٦۱۱ بحوالہ کتاب انڈین پالیٹکس مصنفہ کوپلینڈ جلد اول صفحہ ۱۴٦ ۔

جب یہ قانون منظور ہوا تو لوگوں کی رائے اس کے متعلق مختلف ہوگئی ، آزاد خیال لوگ تحفظات کے اصول سے متفق نہیں تھے ، تاہم مرکز اور صوبوں میں اس دستور کو چلانے پر وہ تیار ہوگئے تھے ، مسلمان وفاقی دستور کو پسند نہیں کرتے تھے ، اس کے باوجود وہ جہانتک ہوسکے صوبوں کی خود مختاری سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے ' اس وقت مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ ریاستوں کے ہندو نمائندوں کو وفاق میں شریک کرکے ہندو اکثریت کو غالب کرنے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ صرف برطانوی ہند کیلئے ایک مکمل ذمہ دارانہ حکومت عطا کی جائے کانگریس نے تو پورے قانون ہی کو مسترد کردیا ، کانگریسی وفاق کو اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ اس میں دو عملی طرز کی حکومت تجویز کی گئی تھی ، اور والیان ریاست کو اراکین کے نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا تھا ، صوبوں کی حکومت کے ساتھ ان کو اس لیے اتفاق نہیں تھا کہ اس میں بہت سے تحفظات تجویز کیے گئے تھے ' حکومت نے ایک طرف والیان ریاست سے وفاق کی شمولیت کے مسئلہ پر گفت و شنید کی تاکہ ان کے اراکین کی ضروری تعداد کو شامل کرکے مرکز پر وفاقی حکومت قایم کی جائے تو دوسری طرف صوبوں کے اندر نئے دستور کو نافذ کرکے اس کو چلانا شروع کیا .

سنہ ۱۹۳۷ء کی ابتدا میں صوبوں کی مجالس قانون ساز کے انتخابات ہوے ، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اس میں زبردست حصہ لیا ، کانگریس کا یہ دعوی تھا کہ وہ مجالس قانون ساز میں پہنچکر دستور کو توڑنے کی کوشش کریگی ، اس نے اپنا ایک منشور manifesto بھی شایع کیا جس میں قصبات اور دیہات کے متعلق اصلاحات کی مختلف تجویزیں تھیں ' اس نے فرقہ وارانہ فیصلہ کے خلاف سخت پروپگنڈا شروع کیا ، مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ اقلیت کی حیثیت سے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے ، اس کے پاس بھی سماجی اصلاحات کا ایک زبردست لائحۂ عمل تھا ،

ان انتخابات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو اکثریت کے چھ صوبوں اور صوبۂ سرحد میں کانگریس کامیاب ہوگئی، بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی قطعی اکثریت رہی، سندھ اور آسام میں بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں کامیاب ہوئیں جس کی وجہ سے یہاں کے حالات بہت ابتر ہوگئے تھے۔

اپریل سنہ ۱۹۳۷ء میں سندھ اور آسام کے اندر مخلوط وزارت قایم ہوئی، بنگال اور پنجاب میں قانون کے مطابق وزارتیں بنائی گئیں، کانگریس کی مجلس عاملہ نے صوبوں کے کانگریسی اراکین کے نام یہ ہدایت جاری کی کہ وہ اس وقت تک کوئی وزارت نہ بنائیں جب تک کہ گورنر اس بات کا پکا وعدہ نہ کریں کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات کو جا و بےجا استعمال نہیں کرینگے، دستور کی دفعات کچھ ایسی تھیں کہ گورنر بذات خود اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کرسکتے تھے، چنانچہ انہوں نے غیر کانگریسی اراکین کی مدد سے وزارتیں بنانے کی کوشش کی، اس موقعہ پر وایسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے ایک اپیل کی اور کہا کہ تمام گورنر اپنی ذمہ داریوں کی حد بندیوں کے باوجود اس بات پر آمادہ ہیں کہ وہ نہ صرف اپنے وزیروں کے ساتھ جھگڑا مول لینے سے پرھیز کرینگے بلکہ اگر اس قسم کا کوئی موقعہ پیش آجائے تو اس کو حل کرنے کی ہر ایک تدبیر اختیار کرینگے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ قانون میں جس مقصد سے تحفظات تجویز کیے گئے ہیں اس کو بھی قربان نہیں کیا جاسکتا، آخر میں انہوں نے اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر کیا کہ وہ ہند میں جمہوری طرز حکومت کے اصولوں کو رائج کرنے کی کوشش کرینگے اس کے بعد کانگریس نے اپنی پابندی ہٹالی اور اپنے اراکین کو صوبوں میں وزارت بنانے کی اجازت دیدی۔

صوبائی وزارتوں کا کام مختلف جگہ مختلف رہا، پنجاب میں وہاں کے قابل اور تجربہ کار مدبر اور وزیراعظم سر سکندر حیات خان نے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو ملاکر ایک مخلوط

وزارت بنائی جو ان کی وفات سنہ ۱۹۴۲ع تک قایم رہی ان کے بعد ان کا جانشیں ان کی بتائی ہوی حکمت عملی پر کام کرتا رہا ' بنگال میں پہلی وزارت مارچ سنہ ۱۹۴۳ع تک برقرار رہی اس کے بعد آپس کے سیاسی افتراق کی بناء پر وزارت بدلتی رہی موجودہ وزارت میں ان وزیروں کی اکثریت ہے ' جو مسلم لیگ کے پیرو ہیں - آسام اور سندھ میں کسی ایک جماعت کو بھی واضح اکثریت حاصل نہیں ہوسکی ' اس کی وجہ سے یہاں وزارت اکثر بدلتی رہی ' چھ ہندو اکثریت کے صوبوں میں جہاں کانگریس کو اکثریت حاصل تھی ہندووں اور ایسے مسلمانوں نے ' جنھوں نے کانگریس کی پالیسی کو قبول کرلیا تھا ' ملکر وزارت بنائی ان صوبوں میں اور نیز صوبۂ سرحد میں کانگریسی وزارتیں دوسری جنگ عظیم کے چھڑنے تک قایم رہیں - اور جب کانگریسی وزارتوں نے ان اسباب کی بناء پر جن کو آگے چلکر بیان کیا جائیگا اپنا استعفا پیش کردیا تو گورنروں نے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے ' اس کے بعد سنہ ۱۹۴۱ع میں اوریسہ میں غیر کانگریسی اراکین کی ایک مخلوط وزارت قایم ہوی ' اور سنہ ۱۹۴۳ع میں صوبۂ سرحد کے اندر مسلم لیگ نے اپنی وزارت بنائی ۔

جنگ سے پہلے تمام صوبوں کی وزارتیں نظم و قانون کے قایم کرنے میں کوشاں رہیں ' اور کسی ایک جگہ بھی کوئی بڑا ہنگامہ نہیں ہوا ' اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ع میں وایسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے یہ تسلیم کیا کہ ان وزارتوں نے اپنے فرایض بڑی تن دہی اور کامیابی کے ساتھ انجام دئے ہیں ' اکثر صوبوں میں سماجی اصلاحات کے متعلق قوانین بنائے گئے ' بنگال اور پنجاب میں ایسے قوانین جاری کیے گئے جو اکثریت کے حق میں بہت مفید تھے ' اس وجہ سے اقلیتوں کو بڑی شکایات پیدا ہوگئی تھیں ' اس کے برخلاف مسلمانوں کا یہ الزام تھا کہ صوبجات متحدہ (اتر پردیش) اور بہار میں ان کے

حقوق پامال کیے گئے ہیں ' مدراس کے اسکولوں میں ہندی جبری طور پر رائج کی گئی ' اس کی بناء پر باشندگان مدراس نے اس کی سخت مخالفت کی ' صوبہ متوسط کی تعلیمی تجاویز کو مسلمانوں نے سخت ناپسند کیا ' اور صوبہ کے اندر اور باہر اس کے خلاف بہت شور و غل مچایا گیا ۔

ان معاملات کے متعلق گورنروں نے اپنے خاص اختیارات کو استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھا مگر ان کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کی خلیج اور وسیع ہوتی چلی گئی ' جب غیر ملکوں میں کانگریس نے اپنی شہرت کو چار چاند لگانے کی کوشش کی تو مسلم لیگ نے بھی اس کے خلاف جوابی کوششیں شروع کردیں ' ہندو مہاسبھا کانگریس کی مذہبی رواداری پر برابر حملے کرتی رہی اور عام ہندوؤں میں فوجی جذبہ پیدا کرتی رہی ' مسلم لیگ کا یہ دعوی تھا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے ' بعض مسلمان اس کے اس دعوی سے اختلاف کرتے رہے ' ہند کے دستوری اصلاحات کے متعلق مسلم لیگ کا نظریہ وقتاً فوقتاً بدلتا رہا ' وہ وفاقی طرز حکومت سے متفق نہیں تھی کیونکہ اس کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ ریاستوں کے نامزد اراکین کی وجہ سے مرکزی مجلس قانون ساز میں ہندوؤں کو مستقل طور پر اکثریت حاصل ہوجائیگی ' آگے چل کر اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہند کیلئے جمہوری طرز حکومت بہتر ہے ' بشرطیکہ اکثریت ہی کو پورے اختیارات عطا نہ کیے جائیں ' پھر سنہ ۱۹۴۰ع کے موسم بہار میں مسلم لیگ نے یہ تجویز * پیش کی کہ مسلمانوں کے لئے کوئی دستور بھی اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوسکتا جب تک کہ اکثریت کے تمام خطوں کی شمال مغربی اور مشرقی حلقوں میں دوبارہ حدبندی کرکے ان کو آزاد ریاستوں کا درجہ نہ دیدیا جائے ' جن میں سے ہر ایک

---

* مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی تجویز سنہ ۱۹۴۰ع دیکھو کوپلینڈ جلد دوم صفحہ ۱۹۶ اور ۲۰۶ ۔

ریاست کے حصے خود مختار اور مقتدر ہونگے یہ وھی تجویز ھے جس کو آج پاکستان کے نام سے تعبیر کیا جاتا ھے ' اس کے لئے ایک نیا لفظ بنایا گیا ھے جس کے حقیقی معنی پاک لوگوں کے دیس کے ھیں ۔

اس درمیان میں وفاق کی شمولیت کے متعلق ریاستوں کا طرز عمل بدل گیا ' والیان ریاست کانگریس اور مسلم لیگ کے ان اعتراضات پر غور کر رھے تھے جو انکی شمولیت وفاق کے بارے میں کئے جاتے تھے ' کانگریس ریاستوں کے معاملات میں ' جہاں باشندگان ریاست نے دستوری اصلاحات کے نفاذ کے لئے گول میز کانفرنس سے پہلے ھی عملی جد و جہد شروع کردی تھی ' بڑی دلچسپی لینے لگی تھی ' اور یہ عملی جد و جہد در حقیقت برطانوی ھند کے دستوری بحران کا فطری نتیجہ تھی ' برطانوی حکومت کا طرز عمل یہ تھا کہ اگر والیان ریاست دستوری اصلاحات کو نافذ کرنا چاھیں تو اس میں وہ کوئی رکوٹ نہیں ڈالیگی ' مگر وہ والیان ریاست کو دستوری اصلاحات کے نافذ کرنے پر مجبور بھی نہیں کریگی * کانگریس نے پہلے پہل یہ اعلان کیا کہ وہ ریاستوں کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دیگی ' دستوری اصلاحات کے لئے عملی جد و جہد خود باشندگان ریاست کی طرف سے ھونی چاھئے † لیکن کچھ زمانہ کے بعد کانگریس کے رھنماوں نے بھی اس میں عملی حصہ لینا شروع کیا ' اور وہ کل ھند باشندگان ریاست کی کانفرنسوں میں شریک ھونے لگے ‡ ' اور جب بہت سی بڑی اور بعض چھوٹی ریاستوں میں ھڑبونگ ھوی تو اس کو سختی کے ساتھ کچلنے کی کوشش کی گئی ' مگر اب یہ بالکل ظاھر تھا کہ والیان ریاست کل ھند وفاق میں شریک نہیں ھونگے ' جنگ سے پہلے وایسرائے نے والیان ریاست کے ساتھ شمولیت وفاق کے مسئلہ پر گفت و شنید شروع کی تھی ' مگر جنگ کے چھڑ جانے کی وجہ سے یہ گفت و شنید بھی بند ھوگئی اور ابتک اسکی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاسکی ۔

---

* کوپلینڈ جلد دوم صفحہ ١٦٩

† ایضا صفحہ ١٧٣

‡ ایضا ١٧٤

اس کے باوجود بعض ریاستوں کے اندر دستوری اصلاحات کے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی ' بڑی ریاستوں میں ریاست میسور اس معاملہ میں سب سے آگے رہی ' یہاں بھی دو ایوان بنائے گئے ہیں ' اور اراکین کو تمام دستوری اور مالی تجویزوں پر بحث کرنے کا اختیار دیا گیا ہے ' پانچ وزیروں میں سے دو غیر سرکاری اراکین ہوتے ہیں جو مجلس قانون ساز سے چنے جاتے ہیں ' کوچین میں دو عملی طرز کی حکومت قایم کی گئی ہے حیدر آباد میں ایک نیا دستور بنایا گیا ہے جس پر اب تک عملدرآمد نہیں ہوسکا ' اس میں جماعتوں کی تقسیم مذھبی بنیادوں پر رکھنے کی بجائے پیشوں کے لحاظ سے کی گئی ہے ' مجلس قانون ساز کے اراکین کی آدھی تعداد بذریعہ انتخاب چنی جائیگی ' چند خاص باتوں کے سوا ان کو قانون سازی اور میزانیہ پر بحث کرنے کا پورا اختیار ہوگا ' کشمیر اور رامپور میں بھی اسی قسم کا ایک دستور بنایا گیا ہے گوالیار ' اندور اور بروڈہ میں ریاست میسور کے دستور کی پیروی کرنے کی کوشش کی گئی ہے ' مگر یہاں اختیارات بہت محدود ہیں ' راجپوتانہ میں بھی دستور سازی کی ابتدا ہوگئی ہے ' جیپور کی ریاست میں ایک مفید دستور بنایا گیا ہے ' بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بھی قانون سازی یا مشورہ کے لئے مجلسیں بنائی گئی ہیں ' جن کو محدود اختیارات حاصل ہیں .

حال ہی میں ریاستوں کے اندر ایک اور اہم اصلاح ہوی ہے ' یعنی اکثر بڑی ریاستوں میں عدالتیں قایم کی گئی ہیں ' جن میں سند یافتہ ججوں کی بھرتی کی جاتی ہے ' ان پر حکومت کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا ہے ' تمام بڑی ریاستوں میں مقتدر عدالت ہاے عالیہ قایم ہوگئی ہیں ' چھوٹی ریاستوں کے لئے ان کا انتظام کرنا بہت مشکل ہے ' لیکن یہ تحریک جڑ پکڑتی جارہی ہے کہ چند ایسی ریاستیں ' جن کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں ' آپس میں ملکر ایک متحدہ عدالت عالیہ

قایم کریں ' جیسا کہ اوریسہ اور پنجاب کی بعض ریاستوں میں ہو رہا ہے' اسی طرح بعض چھوٹی ریاستیں اپنے لئے ایک متحدہ پولیس کا بھی بندوبست کر رہی ہیں ' اور وایسرائے ان کو اس بات کی طرف بھی توجہ دلا رہے ہیں کہ اپنی ریاستوں کے نظم و نسق کو درست کرنے کے لئے ایک متحدہ نظام عمل تجویز کریں ۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہند میں چھوٹی ریاستوں کی تعداد تین سوسے زیادہ ہے ' ان میں سے اکثر محض برطانوی ہند کی جاگیرداریوں کی حیثیت رکھتی ہیں ' اور یہ ریاستیں زیادہ تر مغربی ہند میں واقع ہیں ' ان کے ذرایع آمدنی اتنے محدود ہیں کہ وہاں جدید طرز کی کوئی حکومت قایم نہیں کی جاسکتی ' پچھلی صدی میں ان کا سارا انتظام برطانوی افسر انجام دیتے رہے ' ایوان والیان ریاست میں بھی ان کو نمائندگی نہیں دی گئی ہے ' اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے ان ریاستوں ' کو جن کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں ' ملاکر ایک ذمہ دارانہ حکومت قایم کی جاے ۔ تاکہ لوگوں کی سماجی اصلاح کی جاسکے ۔ اس فیصلہ پر عملدر آمد ہونے کے وقت لارڈ لنلتھگو نے یہ اہم اعلان کیا کہ ان کی راے میں کسی ریاست کو زندہ رہنے کا اس وقت تک کوئی حق نہیں ہے جب تک کہ اپنی رعایا کا بھلا کرنے کی اس میں اہلیت پیدا نہ ہوجاے ۔

اب ہم ان واقعات کو مختصر طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں جو ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کے اعلان جنگ کے بعد پیش آئے' کانگریس نے اپنے ایک اجلاس میں نازیوں اور فاسسٹوں کے رویہ کی بڑی سخت مذمت کی لیکن چونکہ باشندگان ہند کی مرضی اور ان کی راے لینے کے بغیر جنگ کا اعلان کردیا گیا اس لیے وہ حکومت ہند کے ساتھ اس وقت تک کوئی تعاون نہیں کرسکتی جب تک کہ ہند اور باشندگان ہند کے آزاد ہونے کا اعلان نہ کردیا جاے اور جس حد تک بھی اس اعلان پر

عملدرآمد ہوسکے اس پر عمل شروع نہ کردیا جائے مسلم لیگ نے اس شرط پر جنگی تعاون کا وعدہ کیا کہ آئندہ اس کی مرضی کے بغیر دستور میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائیگی ' دوسری جماعتوں نے جنگ کی تائید تو کی مگر ان کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ دستور کی ہر ممکن اصلاح کی جائے ' وایسرائے نے کہا کہ برطانوی حکومت کا منشا ہند کو درجہ نوآبادیات کا عطا کرنا ہے ' اور جنگ کے خاتمہ کے بعد سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور میں ترمیم کی جائیگی ' کانگریس کو اس جواب سے کوئی تشفی نہیں ہوی ' اس نے صوبوں کے وزیروں کے نام حکم جاری کیا کہ وہ اپنی وزارتیں چھوڑکر چلے آئیں ' چنانچہ انہوں نے وزارتوں سے استعفا دیدیا اور گورنروں نے اپنے اپنے صوبہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا .

انگلستان کے اندر مئی سنہ ۱۹۴۰ع میں حکومت بدل گئی ' چرچل وزیر اعظم اور امیری وزیر ہند بنے ' اس سال کے ماہ آگست میں وایسرائے نے برطانوی حکومت کی طرف سے ایک اعلان شایع کیا ' جس کی وجہ سے دستور ہند کے مسئلہ کی نوعیت ہی بالکل بدل گئی ' اب تک تو دستور کے مختلف مرحلوں اور منزلوں کے تعین کا اختیار برطانوی پارلیمنٹ کو تھا ' اور اب یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ باشندگان ہند ہی آپ اپنا دستور بنائینگے ' اور جنگ کے بعد ایک دستور ساز مجلس بنائی جائیگی جس میں ہر جماعت کا نمائندہ لیا جائیگا ' لیکن اپنی ذمہ داریوں کو منتقل کرنے سے پہلے برطانوی حکومت اچھی طرح اطمینان کرلیگی کہ نئی حکومت سے ہند کی با اثر جماعتوں کو کوئی شدید اختلاف تو نہیں ہے ' اور اگر ان کو کسی دستور کے ماننے پر جبر کیا جائیگا تو برطانوی حکومت اس کا ساتھ نہیں دیگی ' اس کے ساتھ تمام سیاسی جماعتوں سے اپیل کی تھی کہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے وہ برطانوی حکومت کی دل و جان سے تائید کریں .

اس ' اعلان آگست ' سے اعتدال پسند اور ہندو مہاسبھا کے لوگ مطمئن ہوگئے ' مسلم لیگ نے اگرچہ اس کو مسترد نہیں کیا تاھم وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں اپنی برابر برابر نمائندگی کا مطالبہ کرتی رھی ' کانگریس جنگ کے ختم ہونے تک کا کوئی انتظار نہیں کرنا چاھتی تھی ' اس نے بطور اخلاقی احتجاج انفرادی سیول نافرمانی شروع کردی ' اس کی وجہ سے بہت سے کانگریسی رھنما اور کارکن جیلوں میں بند کردئے گئے .

ایک سال بعد وایسرائے کی مجلس عاملہ میں توسیع کی گئی جس کی وجہ سے اب ہندی اراکین کی اکثریت ہوگئی - اسی زمانہ میں وایسرائے کے آگست سنہ ۱۹۴۰ع کے اعلان کے بعد ایک قومی مجلس دفاع National Defence council قایم کی گئی جس کے کل تیس ارکان تھے ' جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے تمام حصوں سے منتخب کیے گئے تھے ' وایسرائے اس کے وقتی اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا اور جنگ جیتنے کے متعلق مختلف تدبیریں سونچی جاتی تھیں .

ہند کی دونوں اھم سیاسی جماعتوں کے مخالفانہ طرز عمل کے باوجود سنہ ۱۹۳۹ع سے لیکر دو سال تک ہند کی جنگی تیاریوں کی تدریجی ترقی میں کوئی زبردست رکاوٹ پیدا نہیں ہوی ' دسمبر سنہ ۱۹۴۱ع میں جاپان بھی جنگ میں شریک ہوگیا ' اور سنہ ۱۹۴۲ع کی ابتدا میں ہند کے مشرقی سمندروں اور ملکوں میں اس کو پے درپے کامیابیاں ہونے لگیں سنگاپور ' ملایا اور جزائر ہند پر جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا ' وہ برما میں بھی گھس پڑے اور ہند پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگے .

اس موقعہ کی نزاکت کا احساس کرکے برطانوی وزیر اعظم نے مارچ سنہ ۱۹۴۲ع میں یہ اعلان کیا کہ کابینۂ جنگ کے رکن سر اسٹافورڈ کرپس دشمن حملہ آور کے خطرہ سے مملکت ہند کو بچانے کی خاطر ہند کی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر جمع

کرنے کیلئے برطانوی حکومت کی طرف سے ایک مسودۂ اعلان Draft Declaration ساتھ لیکر ہند پہنچ رہے ہیں ' چنانچہ وہ دھلی کے اندر تین ہفتے رہے ' اور برطانوی ہند کی تمام اہم سیاسی جماعتوں کے نمائندوں اور والیان ریاست کے مندوبین سے اپنی لائی ہوی تجاویز کے متعلق گفت و شنید کرتے رہے .

اس مسودۂ اعلان میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ہند میں ایک ایسی مجلس قانون ساز ترتیب دی جائیگی جس کو نوآبادیات کا درجہ حاصل ہوگا ' اور یہ دوسری نوآبادیات کی طرح تاج برطانیہ سے وابستہ رھیگی اور اس کی حیثیت دوسری نوآبادیات سے کسی طرح بھی کم نہ ہوگی ' اور تمام اندرونی اور بیرونی معاملات میں وہ کسی کی تابع اور محکوم نہ ہوگی ' اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ذیل کی قراردادیں پیش کی گئی تھیں .

(۱) جنگ کے خاتمہ کے بعد ایک دستور ساز مجلس مرتب ہوگی جس میں والیان ریاست اپنے نامزد اور صوبائی مجالس قانون ساز اپنے نمائندے روانہ کرینگے .

(۲) ایک یا ایک سے زیادہ صوبے اگر انڈین یونین سے الگ رہنا چاھیں تو ان کو اس کا اختیار دیا جائیگا ' اور ان کو اپنی علحدہ یونین کے بنانے کی اجازت ہوگی .

(۳) دستور ساز مجلس برطانوی حکومت سے اس بات کا عہد کرے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کریگی جو نسلی اور مذھبی اقلیتوں کی حفاظت وغیرہ کے سلسلہ میں برطانوی حکومت پر عاید ھیں .

(۴) جب تک کوئی نیا دستور مرتب نہ ہوجائے ' برطانوی حکومت حکومت ہند اور ہند کی تمام سیاسی جماعتوں کی تائید اور تعاون سے ہند کے دفاع کی ذمہ دار ہوگی .

کانگریس دو وجہ سے ان قراردادوں کو قبول نہیں کرسکی ' ایک تو یہ کہ والیان ریاست اپنے نمائندے نامزد کرینگے اور باشندگان ریاست کو ان پر کوئی اختیار نہ ہوگا ' دوسری یہ

کہ کسی صوبہ یا ریاست کے شامل نہ ہونے سے ہند کی یگانگت باقی نہیں رہیگی ، کانگریس نے یہ مطالبہ کیا کہ فوری طور پر ایک قومی حکومت قایم کی جائے جس کو واقعی پورے اختیارات حاصل ہوں ، مسلم لیگ نے ان قراردادوں سے اس لئے اختلاف کیا کہ اس کی راے میں ان تجویزوں کا اولیں مقصد ایک انڈین یونین کا قایم کرنا تھا ، اور ایک سے زیادہ یونین کے قیام یعنی مقصد پاکستان کو پس پشت ڈالدیا گیا تھا ۔ اب اس کا قایم ہونا ممکنات بعید سے ہوگیا تھا ، مسلم لیگ نے دستور ساز مجلس کے طریقہ انتخاب کو بھی قبول نہیں کیا ، سکھ اس لئے سخت ناراض تھے کیونکہ پنجاب کو کل ہند یونین سے الگ ہو جانیکی صورت پیدا کردی گئی تھی ، اور والیان ریاست یہ چاہتے تھے کہ دستور ساز مجلس میں داخل ہونے سے پہلے ان کے خاص حقوق اور مراعات کی حفاظت کا ان سے وعدہ کیا جاے جو ان کو معاهدوں اور میثاقوں کے ذریعہ اس وقت حاصل تھے .

سر اسٹافورڈ کرپس کو بڑی امید تھی کہ دستور ساز مجلس کی تجویز کے ساتھ ساتھ اس مسودہ اعلان کے اصول کو بھی مان لیا جائیگا ، اور دوران جنگ کیلئے مرکز پر ایک قومی حکومت بن جائیگی ، کانگریس نے وایسراے ہند سے اس وعدہ کا مطالبہ کیا کہ قومی حکومت کے قیام کی صورت میں وہ سخت ضرورت کے وقت بھی اپنے خاص اختیارات کو استعمال نہیں کریگا ، اس کا یہ مطالبہ اس بناء پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کیلئے پہلے سے دستور وقت میں ترمیم کی ضرورت تھی ، اور جنگ کے دوران میں برطانوی حکومت قانون سازی کا کام نہیں کرنا چاہتی تھی ، ان اسباب کی بناء پر سمجھوتہ کی تمام کوششیں بیکار ہوگئیں اور سر اسٹافورڈ کرپس انگلستان واپس ہوگئے ، اس کے باوجود پارلیمنٹ میں وزیر ہند نے یہ اعلان کیا کہ اگرچہ یہ مسودہ واپس لے لیا جا چکا ہے ، مگر برطانوی حکومت کی آئندہ حکمت عملی اسی اصول پر مبنی رهیگی .

کرپس کی یہ قراردادیں ایسے وقت پر ناکام ہوی تھیں جب کہ حالات بالکل ھی نازک ہوچکے تھے ' جولائی میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ تجویز پاس کی کہ ہند میں برطانوی اقتدار کو فوراھی ختم ہو جانا چاھئے ' اگر برطانیہ ہند سے واپس جانے پر آمادہ نہ ہوتو کانگریس گاندھی جی کی قیادت میں عدم تشدد کی وہ ساری طاقت استعمال کریگی جو سنہ ١٩٢٠ع کے بعد سے اس کو حاصل ہوگئی ہے ' اس تجویز سے دوسری تمام جماعتوں نے سخت اختلاف کیا اور اس کی پوری مذمت کی ' ٨ آگست کو بمبئی میں کل ہند کانگریس کمیٹی کا ایک زبردست اجلاس ہوا ' جس میں چند کے سوائے سب نے ملکر اس تجویز کی متفقہ تائید کی ' دوسرے دن حکومت نے کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دیا اور اب تک یہ غیر قانونی جماعت ہے ' گاندھی جی اور ان کے اکثر رفقاء کار جیلوں میں بند کر دئے گئے ہیں ان میں سے بعض کو رھا کردیا گیا ہے لیکن ان کی ایک بڑی تعداد اب بھی جیلوں میں بند ہے ' مئی سنہ ١٩٤٤ع میں گاندھی جی کو صحت کی خرابی کی وجہ سے غیر مشروط طور پر رھا کیا گیا ' سنہ ١٩٤٢ع کے موسم خزاں میں ہند کے مختلف گوشوں میں جو شدید بد نظمی پیدا ہوی اس کو اس سال کے آخر میں بتدریج دبانے کی کوشش کی گئی ۔

ستمبر سنہ ١٩٤٢ع میں برطانوی وزیر اعظم چرچل نے دارالعوام میں ایک بیان دیا جس سے دستور سازی کے مسئلہ کی موجودہ حیثیت واضح ہوتی ہے ' انھوں نے کہا کہ ملک معظم کی حکومت کی طرف سے پیش کیے ہوے اعلان کے اہم اصول کو جن پر سر اسٹافورڈ کرپس کی تجاویز ہند کی بنیاد ہے ' تاج برطانیہ اور پارلیمنٹ کی قطعی حکمت عملی کا نچوڑ سمجھنا چاھئے ' یہ اصول اپنی پوری وسعت اور قوت کے ساتھ اب بھی اپنی جگہ پر ہیں نہ تو ان میں کوئی اضافہ کرسکتا ہے اور نہ کوئی ان میں سے کچھ گھٹا سکتا ہے ۔

باب ۵۴

دفاع اور مالیات

اس دوسری جنگ عظیم میں ہند کے اندر ایسے نئے مسائل پیدا ہوگئے تھے ' جن سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا ' گذشتہ جنگ عظیم میں معمولی قسم کے ہتھیاروں اور کثیر تعداد میں سپاہیوں کی ضرورت تھی ' اور اب اس جنگ میں جدید قسم کے آلات اور تربیت یافتہ سپاہیوں کا فراہم کرنا لازمی تھا ' اس جنگ میں پہلے پہل مغرب کی طرف سے ہند کو خطرہ لاحق ہوا تھا ' لیکن آگے چل کر یہ خطرہ مشرق کی طرف سے نمودار ہوا اور ادھر ہند کی فوجوں کو روانہ کرنا پڑا ' پچھلی جنگ میں برطانوی بحری بیڑا ہند کے سمندروں کا محافظ تھا ' مگر اس جنگ میں خود ہند کے بنے ہوے جنگی جہاز بحری لڑائیوں میں زبردست حصہ لے رہے ہیں ' ان دونوں جنگوں کے درمیان ہند کی مدافعت کے لئے جو تدریجی طریقے اختیار کیے گئے ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ۔

ہم تینتالیسویں اور سینتالیسویں باب میں بیان کرچکے ہیں کہ کس طرح غدر کے بعد اور پھر اس موجودہ صدی کی ابتدا میں ہند کی فوجی تنظیم میں تبدیلیاں کی گئی تھیں ' پہلی جنگ عظیم کے بعد ہند کی فوج میں تقریباً ایک ہائی برطانوی اور یوروپین سپاہی اور افسر تھے ' خاص ہندی فوج ایک لاکھ پچاس ہزار تھی ' ان کی تربیت کے لئے برطانوی افسر مقرر تھے ' ہند کا اپنا کوئی توپ خانہ یا ہوائی بیڑا نہیں تھا ' اور ہند کی فوج میں ہندی افسر بہت ہی کم تھے ' مملکت ہند کے صرف شمالی علاقوں سے فوجیوں کی بھرتی ہوتی تھی ' ہند کے شاہی بحری بیڑے کا کام صرف اتنا تھا کہ فوجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجائے' اور بندرگاہوں اور سمندروں کی نگرانی کرے ' برطانوی بحری بیڑے کو سالانہ ایک لاکھ پونڈ کی رقم دی

جاتی تھی ، اور ہند نے پہلی جنگ عظیم کے اخراجات کے لئے برطانوی خزانہ کو بطور عطیہ کے دس کرور اسٹرلنگ * دئے تھے سنہ ۱۹۲۲ع میں دفاع کا میزانیہ اڑسٹھ کرور تک پہنچ گیا تھا ، دوسرے سال اس کو گھٹا کر باسٹھ کرور کیا گیا .

اس زمانہ میں باشندگان ہند اور اراکین مجلس قانون ساز کی طرف سے بارہا یہ مطالبہ ہوتا تھا کہ دفاع کے محکمہ کی اصلاح کی جائے ، ان کا اعتراض یہ تھا کہ مرکزی اور صوباتی آمدنی کا تقریباً تیس فیصدی حصہ فوج پر خرچ ہو جاتا ہے ، اور لوگوں کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لئے کوئی رقم نہیں بچتی ، اگرچہ باشندگان ہند کو فوج کے ذمہ دار عہدوں میں لینے کی اجازت تھی تاہم بہت کم ہندیوں کی بھرتی کی گئی تھی اور ان کی باقاعدہ بھرتی اور تربیت کا بھی کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا ، اس لئے اس بات پر زیادہ زور دیا جانے لگا کہ ہند کی ایک قومی فوج تیار کی جائے اور ملک کے ہر گوشہ سے اس فوج کے تمام ذمہ دار عہدوں میں قابل ہندیوں کی بھرتی کی جاے .

اس کے بعد حکومت ہند نے ان اعتراضات کے رفع کرنے کے لئے بہت سی تدبیریں اختیار کیں ، سپاہیوں کی تعداد بالکل کم کردی گئی یہاں تک کہ سنہ ۱۹۳۵ع میں فوج کا پورا خرچ چوالیس کرور ہوگیا تھا ، ہند کی برطانوی فوج کے اخراجات کے لئے برطانوی خزانہ سے سالانہ پندرہ لاکھ اسٹرلنگ کی امدادی رقم دی جانے لگی . سینڈھرسٹ Sandhurst میں منتخب ہندی نوجوانوں کی فوجی تربیت کا انتظام کیا گیا ، اور جب ہند میں توپ خانہ اور ہوائی بیڑا بھی قایم کیا گیا تو وولوچ Woolwich اور کرانول Cranwell میں ہندی نوجوانوں کو اس کی تربیت دی جانے لگی . گول میز کانفرنس کے اجلاسوں کے بعد ہند میں بھی ایک فوجی کالج قایم کیا گیا ، اور ابتدائی فوجی تربیت کے

* اسٹرلنگ کی قیمت کے معلوم کرنے کے لئے دیکھو حاشیہ صفحہ ۴۹۴ .

لئے* بہت سے اسکول بھی کھولے گئے اور بتدریج تمام ذمہ دار عہدوں میں هندیوں کی بھرتی کی جانے لگی ' پہلے پہل آٹھ منتخب رسالے Units ان کی بھرتی کے لئے خاص کیے گیے تھے ' اس کے بعد ان کے لئے ایک دستہ Division مخصوص کیا گیا ' اور اس جنگ کے شروع ہونے کے بعد سے تو پوری فوج میں ان کی بھرتی ہونے لگی ہے ' اور بری اور ہوائی فوج میں ملک کے تمام گوشوں سے آدمی لئے جانے لگے ہیں' اب هندی افسر پینتیس فی صدی سے بھی کچھ زیادہ ہیں * هند کے ہوائی بیڑے میں شاهی ہوائی بیڑے Royal Air Force کے چند منسلک افراد کے سوا باقی تمام آدمی اور افسر هندی ہیں ' تمام صوبوں اور قوموں سے فوج کے مختلف عہدوں کے لئے آدمیوں کی بھرتی ہونے لگی ہے ' جب هند کے صرف شمال مغربی علاقوں سے فوج کی بھرتی کی جاتی تھی تو پوری فوج میں ایک تہائی سے زیادہ مسلمان تھے ' اور اب جب کہ دوسرے صوبوں کے اعلی اور ادنی طبقہ کے هندوؤں کی بھرتی ہونے لگی ہے ' مسلمانوں کا تناسب گھٹتا ہوا جا رہا ہے .

گذشتہ چند سال کی مدت میں هندی فوج کا ڈھانچہ بالکل بدل دیا گیا ہے ' اس وقت بھی جبکہ دفاعی اخراجات کو کم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی ' هندی فوج کو جدید ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی تدبیریں کی جا رہی تھیں ' چنانچہ اس کے متعلق تفصیلی تجویزیں مرتب کی گئیں اور لارڈ چیٹفیلڈ Chatfield کے تحت ایک کارآزمودہ کمیٹی نے ان تجویزوں پر نظر ثانی کی اور ان میں کچھ جزوی ترمیمات بھی کیں ' اور چند خاص شرطوں پر برطانوی حکومت نے بڑی امداد دینے کا وعدہ کیا ' ان تجویزوں پر ابھی پورا عمل بھی نہیں ہوا تھا کہ موجودہ جنگ چھڑ گئی ' گولہ بارود اور سامان جنگ کی فوری

* ایسٹ انڈیا اسوسئیشن میں جنرل مولسورتھ Molesworth کا
ایشیاٹک ریویو جنوری سنہ ۱۹۴۴ع صفحہ ۳

ضرورت کی وجہ سے حکومت ہند اس بات پر مجبور ہوگئی کہ وہ صنعتی ترقی کے اہم مسایل کا فوری حل نکالے ' چنانچہ بہت سے نئے کارخانے قایم کیے گئے ' اور مزدوروں کی تربیت کی گئی ' اور نقل و حمل کے ذرایع اور گوداموں کو ترقی دی گئی .

اس درمیان میں بحری دفاع کے طریقوں میں بھی ایک بڑا انقلاب ہوا 'شاہی ہندی جہازرانی Royal Indian Marine کو شاہی ہندی بحری بیڑے Royal Indian Navy میں تبدیل کیا گیا ' اور جہازوں کے چلانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کیلئے ہندی افسر مقرر کیے گئے ' ابتدا میں صرف آدھے درجن کے قریب ہندی جہاز تھے ' اب ان جہازوں کی ایک کافی تعداد تیار ہوگئی ہے ' جس کے چلانے والے اور انتظام کرنے والے سب کے سب ہندی ہیں ' اور ہند کے مختلف علاقوں سے بھرتی ہوے ہیں - اس جنگ کے دوران میں ہند کے اندر اور باہر بہت سے نئے جہاز تیار کیے گئے ' جو ایک طرف مغرب میں بحر اوقیانوس اور دوسری طرف آسٹریلیا تک کا چکر لگاکر آئے ہیں ' مشرق کے شاہی ہوائی بیڑے کے ساتھ ساتھ ہند کے ہوائی بیڑے کو بھی بڑی ترقی ہو رہی ہے ' اور بہت سے نوجوان اس میں بھرتی ہوتے جا رہے ہیں .

جنگ چھڑنے سے پہلے ہی حکومت ہند یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اس ملک کو ممکن حملوں سے بچانے کیلئے مختلف احتیاطی تدابیر کا اختیار کرنا ضروری ہے چنانچہ سرحد پر ایک کڑی نگرانی رکھی گئی ' اور ہند سے امدادی فوجیں ملایا ' عدن اور سومالی لینڈ روانہ کی گئیں ' ہند کے سرکاری حلقوں کا ابتدا میں یہ خیال تھا کہ ہند کی بری فوج میں توسیع کی کوئی ضرورت نہیں ہے ' لیکن یہ خیال بعد کو غلط ثابت ہوا ' کیونکہ جب فرانس شکست کھا گیا اور سنہ ۱۹۴۰ع کے موسم گرما میں اطالیہ بھی اتحادیوں کے خلاف جنگ میں داخل ہوگیا تو بحر روم سے یوروپ جانے کا راستہ بالکل بند ہوگیا '

ہر جگہ فوجی بھرتی کیلئے جد و جہد شروع کی گئی اور بہت سے نوجوان فوج میں بھرتی ہونے کیلئے تیار ہوگئے ' حکومت ہند کے پاس کافی جہاز نہیں تھے ' تمام سمندر مخدوش ہوگئے تھے ' جہازوں کو بہت ہی لمبا چکر کاٹ کر اپنی منزل مقصود تک پہنچنا پڑتا تھا ' مختلف جنگی محاذوں پر سپاہیوں اور ہتھیاروں کی ضرورت تھی ' جدید ہتھیاروں اور سامانوں کا حاصل کرنا بہت ہی مشکل ہوگیا تھا ' ہند کے اندر باوجود سارے انتظامات کے ' جن کا اوپر ذکر ہوا ' جنگ کا کافی ساز و سامان نہیں تھا ' بڑی تیزی اور بھرتی کے ساتھ نوجوان فوجیوں کو تربیت کرنا بہت ہی دشوار تھا ' لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود ہند کی فوج کو بڑی ترقی ہوی ' اور سنہ ۱۹۴۳ع کے ختم کے قریب بیس لاکھ نوجوانوں کی فوج میں بھرتی ہوگئی تھی ' ان کے علاوہ ریاستوں کی فوجیں بھی ہند کے اندر اور سمندر پار برطانوی ہند کی فوجوں کے دوش بدوش دشمنوں سے لڑ رہی تھیں ' ان تمام فوجوں کو جدید آلات اور ہتھیاروں سے مسلح کیا گیا اور ان کی ملازمت کی شرایط پہلے سے بہتر رکھی گئیں ' ہم حکومت نیپال کی فوجوں کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے جنہوں نے اتحادیوں کی طرف سے بڑے بہادرانہ کارنامے انجام دئے ہیں .

ہند کے اندر جیسے جیسے فوجیوں کی تعداد بڑھتی گئی اسی تناسب سے جنگی ساز و سامان بھی فراہم کیا جانے لگا ' چند خاص چیزوں کے سوا باقی تمام چیزیں یہیں تیار کی جانے لگیں . آخر یہاں اتنا سامان تیار ہونے لگا تھا کہ وہ نہ صرف ہند کی جنگی ضروریات کے لئے کافی تھا ' بلکہ کچھ سامان مغربی محاذ جنگ پر بھی بھیجا جاتا تھا ' دھلی کے اندر مشرقی ممالک کی ایک رسدی مجلس (Eastern Group Supply Council) قایم کی گئی تھی ' تاکہ ان تمام برطانوی ممالک کی جنگی ضروریات کے مطابق ' جو سویز سے مشرق میں واقع ہیں ' باقاعدہ طور

پر سامان جنگ مہیا کیا جائے ۔ اور ان کو بھیجا جائے ۔

ہند کی ان فوجوں کو جو ابتدا میں مشرق وسطی بھیجی گئی تھیں مزید امداد اور کمک ملی ' ایران ' شام اور عراق اور آفریقہ کے براعظم پر سومالی‌لینڈ سے لیکر تونسیا تک ہندی جانبازوں نے جو دلیرانہ کارنامے انجام دئے وہ آج بھی ہمارے فخر اور ناز کا باعث ہیں ' اس وقت یہ فوجیں اطالیہ میں بڑی بہادری کے ساتھ لڑ رہی ہیں ' ان کے کارناموں کے متعلق تفصیل سے کچھ لکھنے کا ابھی موقعہ نہیں آیا ہے ' لارڈ ویول نے مختلف جنگی محاذوں پر ہندی فوجوں کو لڑایا تھا ' انہوں نے حال ہی میں یہ تسلیم کیا ہے کہ ' مشرق وسطی میں ہماری کامیابی در حقیقت ہند کی فوجوں اور اس کے مہیا کیے ہوے جنگی سامانوں کی وجہ سے ہے ' اور ان کے اس احسان کو کبھی نہیں بھلانا چاہئے' * .

بد قسمتی سے وہ فوجیں جو مشرق کی طرف بھیجی گئی تھیں ' بڑی مصیبتوں کا شکار ہوگئیں ' جاپان کے جارحانہ حملہ کے وقت ہانگ کانگ ' ملایا اور سنگاپور میں بہت کم فوجیں رہ گئی تھیں ' ان جگہوں پر ہندی فوج کا تقریباً وہی حال ہوا جو برطانیہ ' کنیڈا اور آسٹریلیا کی فوجوں کا ہوا ' یعنی یہ سب یا تو مارے گئے یا قید کرلئے گئے ' برما میں جب لڑائی شروع ہوی تو یہاں بھی برطانیہ اور ہند کی فوج کافی نہیں تھی ' ہوائی بیڑا بھی ان کی بر وقت امداد نہیں کرسکتا تھا ' اس لئے ان کو مجبوراً آسام کی طرف ہٹنا پڑا ' پہاڑ اور جنگل ان کے سامنے تھے ' اور بنا بنایا کوئی راستہ موجود نہیں تھا ' آب و ہوا بھی ان کے موافق نہیں تھی ' اور جب بہت سے شہری برما چھوڑکر ہند چلے آئے تو راستہ میں ان کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں ' بہت سے تو راستہ ہی میں ختم ہوگئے اور جو بچے کچھے لوگ ہند پہنچے ان کا ساز و سامان کرنا بہت دشوار تھا ' سرکاری اور غیر سرکاری اداروں پر ان کی وجہ سے بہت بڑا مالی بوجھ پڑ گیا تھا ۔

---

* ایشیاٹک ریویو جنوری سنہ ۱۹۴۴ع صفحہ ۱۴ .

اس باب کی ابتدا میں ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ کس طرح ہند کی دفاعی فوجوں کو اچانک مغربی محاذ جنگ سے مشرقی محاذ جنگ کی طرف توجہ کرنی پڑی تھی ، کیونکہ برما پر قابض ہونے کے بعد جاپان ہند پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا ۔ لیکن اب یہ خطرہ زیادہ سخت نہیں رہا ، اور ہند ، برطانیہ ، امریکہ ، نیپال اور چین کی اتحادی فوجیں برما کو واپس لینے کی زبردست تیاریاں کر رہی ہیں ۔

امریکہ اور چین کے ساتھ ہند کے باہمی تعلقات پر ان مذکورۂ بالا لڑائیوں کا بڑا اثر پڑ رہا ہے ، ہند میں امریکہ کی بہت سی فوجیں موجود ہیں ، جن کیلئے ایک بڑی تعداد میں جنگی ساز و سامان امریکہ سے روانہ کیا جا رہا ہے ، اور وہاں ہند کا سفارت خانہ بھی قایم ہے ، ہند کے حدود کے اندر چینی سپاہیوں کی تربیت ہو رہی ہے ، اور دونوں ملکوں کے درمیان بری اور ہوائی رسل و رسایل کو بڑی ترقی دینے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔

ظاہر ہے کہ ہند کے میزانیہ میں دفاعی ضروریات کے لئے جو رقم تجویز کی گئی ہے وہ کسی حال میں بھی موجودہ جنگ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کیلئے کافی نہیں ، اس سلسلہ میں بہتر یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم سے لیکر حکومت ہند کی مالیات کا ایک جایزہ لے لیا جائے ۔

سنہ ۱۹۲۱ع اور سنہ ۱۹۳۵ع کے دستوری اصلاحات کی وجہ سے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مالی تعلقات میں چند بنیادی تبدیلیاں ہوگئی تھیں ، سنہ ۱۸۷۰ع کے بعد سے یہ دستور ہوگیا تھا کہ مرکزی حکومت آمدنی کے چند مخصوص ذرایع کو وقتاً فوقتاً صوبائی حکومت کے حوالہ کر دیتی تھی اور کبھی کبھی ان کیلئے الگ امدادی رقم بھی منظور کرتی تھی ، سنہ ۱۹۱۲ع کے بعد سے یہ طریقہ مستقل طور پر جاری کردیا گیا تھا ، اور جب مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات میں صوبوں کو ایک حد تک

خود مختاری عطا کی گئی تو ان کے ذرایع آمدنی کی بھی وضاحت کردینی پڑی ' چنانچہ چند مخصوص ذرایع آمدنی پر صوبوں کو کامل اختیار دیدیا گیا تاکہ وہ اپنے حدود کے اندر رہ کر محصولوں کو گھٹا بڑھا سکیں ' محصولات در آمد و بر آمد customs duties محصولات آمدنی Income tax اور محصولات ریلوے فطری طور پر مرکزی حکومت کے حوالے کئے گئے ' اور مالگذاری' Land Revenue زاید چنگی Excise duties اور دوسرے چھوٹے بڑے محصول صوبائی حکومتوں کے سپرد کیے گئے ' اس تقسیم کی وجہ سے مرکزی حکومت کے میزانیہ میں بڑا گھاٹا ہوجاتا تھا ' اس لئے بڑی بحث و تمحیص کے بعد برطانوی حکومت نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ صوبائی حکومتیں اپنی آمدنی سے تھوڑی رقم ' جو ہر سال بتدریج گھٹتی جائیگی ' مرکزی حکومت کو ادا کریں ' صوبوں کو یہ شکایت تھی کہ اس قسم کا انتظام کرنے سے ان کو اپنی آمدنی کے بڑھانے کی بہت کم گنجایش رہتی ہے حالانکہ قومی تعمیر کے محکموں کی دن بدن بڑھتی ہوی ذمہداریوں کی وجہ سے صوبوں پر مالی بوجھ بہت زیادہ بڑھتا جا رہا ہے ' اور چونکہ بنگال میں دوامی بندوبست کی بناء پر مالگذاری کی رقم مقررہ تھی اس لئے اس صوبہ کو سب سے زیادہ تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا ' لیکن صوبوں کو زیادہ دنوں تک امدادی رقم کے دینے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ مرکزی حکومت کی آمدنی روز افزوں بڑھتی گئی اور اسی تناسب سے صوبوں کی امدادی رقم بھی گھٹتی چلی گئی ' یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۰ع میں صوبوں نے امدادی رقم دینی بالکل ہی بند کردی ' اس کے باوجود صوبوں کی آمدنی بالکل محدود تھی ' اور عالمگیر کساد بازاری کے بعد تو مرکزی حکومت کو الٹے چند صوبوں کی مالی امداد کرنی پڑی تھی ' سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور کے نفاذ کے بعد ہند کے اقتصادی حالات کچھ بہتر ہوے ' اس کی تفصیل آئندہ آئیگی .

اب ہمیں مرکزی حکومت کے مالی ذرایع کا ایک جایزہ لینا ہے ، چند سال تک تو اس کی آمدنی بہت کم رہی ، ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سنہ ۱۹۱۹ع میں زرمتبادلہ کے متعلق ایک نئی پالیسی اختیار کی گئی تھی ۔ اب اس کے گرجانے کی وجہ سے حکومت ہند کو سخت نقصان ہو رہا تھا ، روپیہ کی قیمت دو شلنگ پر قایم نہیں رہی ، اور یہ بتدریج گھٹ کر ایک شلنگ چھ پنس ہوگئی اس کے بعد سے اب تک یہی معیار قایم ہے ، اس کے علاوہ دوسرے اسباب بھی کچھ ایسے پیش آئے کہ ملک کی اقتصادی مشکلات اور زیادہ ہوگئیں ، پہلی جنگ عظیم کے اخراجات سے سود کی مد بڑھ گئی تھی ، اور بے سود قرضہ بھی بہت چڑھ گیا تھا ، سنہ ۱۹۱۹ع کی جنگ افغان کے برے اثرات اب تک قایم ہے ، سنہ ۱۹۱۸ع کی عالمگیر صلح کے بعد تجارت ٹھنڈی ہوگئی تھی ، وہ ممالک ، جہاں ہند کے برآمدی مال کا ایک بڑا حصہ کھپتا تھا ، بہت تباہ ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے ، ہند کی برآمدی تجارت بہت گھٹ گئی تھی اور محصولات در آمد و برآمد بہت کم ہوگئے تھے ، ملک کے اندر ہر چیز گراں ہوگئی تھی ، مزدور الگ ہڑبونگ مچا رہے تھے ، سرکاری اور غیر سرکاری ملازموں اور مزدوروں کی تنخواہیں اور مزدوریاں بڑھ گئی تھیں ، سنہ ۱۹۲۱ع اور سنہ ۱۹۲۲ع کے میزانیہ میں سخت گھاٹا ہوگیا تھا ، اس کو پورا کرنے کیلئے ایک طرف نمک وغیرہ پر محصول بڑھانا پڑا جس کے خلاف مجلس قانون ساز اور عوام دونوں نے احتجاج کیا ، اور دوسری طرف فوجی اخراجات میں تخفیف کرنے کا مطالبہ شروع ہوا ۔

خوش قسمتی سے سنہ ۱۹۲۵ع کے قریب حالات کچھ بہتر ہوے ، صنعتی کارخانوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور اندرونی اور بیرونی تجارت کو ایک حدتک ترقی ملی درآمد برآمد ، آمدنی اور ریلوے کے محصولات سے کافی آمدنی ہونے لگی ، اور حکومت کو رسل و رسایل اور دوسری شہری ضروریات کی ترقی کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ملا ۔

سنہ ۱۹۲۹ع کی کساد بازاری سے پھر مشکلات پیدا ہوگئی تھیں ' یہ کساد بازاری تین سال تک قایم رہی ' ملک بھر میں سیاسی ہیجان پھیلا ہوا تھا ' کارخانوں کے مزدور الگ گڑبڑ کر رہے تھے ' ہند کی برآمدی اشیاء کی قیمتیں بہت گر چکی تھیں ' اسی طرح غیر ملکی مصنوعات کی قیمتیں بھی گھٹ گئی تھیں جن کی ہند میں درآمد ہوتی تھی مگر اتنی نہیں جتنی کہ برآمدی اشیاء کی قیمتیں گھٹی تھیں ' سیاسی ہڑبونگ سے ملک کی اندرونی تجارت پر بہت برا اثر پڑا تھا ' کسانوں اور کاشتکاروں میں بڑی بے اطمینانی اور بے چینی پھیلی ہوی تھی ' بعض صوبوں میں اور خاص کر صوبجات متحدہ میں مالگذاری اور زمین کے لگان کو کم کرنا پڑا تھا ' سنہ ۱۹۳۱ع میں پونڈ کا سونے کا پرانا معیار باقی نہ رہا ' اور روپیہ کی قیمت بھی گر گئی تھی ' حکومت نے کچھ تو کفایت شعاری اور نئے قرضوں سے کام لیکر اور محصول بڑھا کر اور کچھ درآمد برآمد اور آمدنی کے محصولوں کو زیادہ کرکے اس مصیبت سے نجات حاصل کی ۔

اس موقعہ پر ایک اہم تبدیلی کی وجہ سے ہند کے اقتصادی حالات کچھ بہتر ہونے لگے ' سنہ ۱۹۳۱ع سے ہند کا سونا باہر جانے لگا ' ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ قدیم زمانہ سے باشندگان ہند کو سونا چاندی اور دوسری قیمتی دھاتوں کو جمع کرکے رکھنے کی عادت تھی ' ہند کی برآمدی تجارت یہاں کی درآمدی تجارت سے بڑھی ہوی تھی ' اور دونوں میں جو فرق ہوتا تھا اس کو سونے اور چاندی کی صورت میں محفوظ کرلیا جاتا تھا ' باشندگان ہند کی یہ عادت پوری انیسویں صدی میں قایم رہی ' سنہ ۲۵ - ۱۹۲۴ع میں تو سونے چاندی کی در آمد اور سالوں کی بہ نسبت بہت زیادہ بڑھی ہوی تھی ' لیکن جب کسادبازاری کے بعد چیزوں کی قیمتیں گھٹ گئیں اور محض زمین کی پیداوار پر کاشتکاروں کا گذارہ نہیں ہوسکتا تھا تو انہیں

اپنے ذاتی اخراجات کیلئے اپنا جمع کیا ہوا سونا اور اپنی چاندی بیچنی پڑی اور جب روپیہ کی قیمت بھی کم ہوگئی تو ہند کا سارا سونا اور پوری چاندی کھنچ کر باہر چلی گئی، اس زمانہ کے ماہرین اقتصادیات کو اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ اس زمانہ کی ضروریات پر وہ دولت صرف ہوگئی جس کو وہ ایک اہم سرمایہ سمجھتے تھے ' لیکن ملک کی اقتصادی زندگی پر اس کا بہترین اثر پڑا یعنی دولت بے مصرف پڑی رہنے کی بجائے لوگوں کے کام آنے لگی تھی ۔

دوسری جنگ عظیم کی ابتدا میں لوگ عام طور پر روپیہ پیسہ بچانے لگے تھے 'ور حکومت نے بھی جنگ کے لئے سیونگس سرٹیفکیٹ Savings Certificates اور دفاعی قرضے Defence Loans خرید کرکے لوگوں میں پس اندازی کا شوق پیدا کیا - اس کا ملک کی اقتصادی زندگی پر یہ اثر پڑا کہ بے مصرف دولت مفید کاموں میں خرچ ہونے لگی ' انجمنہائے امداد باہمی Co-operative Societies سے بھی اس تحریک کو بڑی مدد ملی ' اپنی خامیوں اور ناکامیوں کے باوجود اب ان انجمنوں کو ملک بھر میں مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے ۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ حکومت کے مالی شعبوں میں تبدیلی ہونے کے بعد ملک کی اقتصادی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑا ' ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سنہ ۱۸۶۰ع کے اقتصادی بحران کے بعد تقریباً تمام بنک یوروپین لوگوں کے ہاتھ میں تھ تیس سال بعد جب بہت سے بنک محض خیانت یا بد انتظامی کی وجہ سے دیوالیہ ہوگئے تو ہند کے باشندوں کو اس شعبہ زندگی میں کام کرنے کی ہمت نہیں رہی ' مگر سنہ ۱۹۰۵ع کی سیاسی اور قومی بیداری کے بعد باشندگان ہند نے اوسط درجے کے بہت سے بنک قایم کرنے شروع کیے ' ان میں سے چند پہلی جنگ عظیم کے بعد بھی قایم رہے ' اس کے بعد سے اب تک بہت سے بنک قایم ہوے جن کو جدید اصولوں پر چلایا جا رہا ہے '

ان میں سے بعض تو بہت زیادہ ترقی کرچکے ھیں ، قرائن سے صاف پتہ چلتا ھے کہ آئندہ پرانے قسم کے تمام دیسی بنک قومی نقطۂ نظر سے کام کرنے لگینگے ، اس دور کی ایک بڑی ترقی یہ ھے کہ تینوں صوبوں کے بنکوں کو ملاکر ایک امپیریل بنک آف انڈیا قایم کیا گیا ' ایک زمانہ تک یہ بنک ایک مرکزی بنک کے فرایض انجام دیتا رھا ؛ مختلف جگہوں پر اس کی شاخیں قایم کی گئیں جن سے ھر جگہ کے تاجروں کو بڑی سہولتیں پیدا ھوگئیں ' آخر صحیح معنی کرکے ایک مرکزی بنک ریزروبنک آف انڈیا کے نام سے سنہ ۱۹۳۲ع میں قایم ھوا ' اس سے سکہ سازی اور حکومت کے مالی لین دین کو بڑی مدد مل رھی ھے '

بنکوں کی طرح بیمہ Insurance اور محاسبی Accounting کا کام بھی یوروپین لوگ ھی کرتے تھے' لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد باشندگان ھند بھی ان شعبوں میں کام کرنے لگے ' ابتدا میں اس بات کا خطرہ لگا ھوا تھا کہ کہیں ناقابل اور بے اصول کارکنوں کی وجہ سے ان کمپنیوں کا دیوالہ نہ نکل جائے مگر جب ان کے تحفظ اور ان کی نگرانی کے متعلق ایک قانون بن گیا تو یہ خطرہ بھی جاتا رھا ' زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیاں اس وقت باشندگان ھند ھی کے ھاتھ میں ھیں ' لیکن دوسرے قسم کے بیموں کا کام ابتک غیر ھندی لوگ ھی انجام دے رھے ھیں .

سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور سے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مالی تعلقات میں مزید تبدیلیاں ھوگئیں ' اسکے بعد سے صوبائی حکومتوں کے ذرایع آمدنی مستقل ھوگئے ' ان پر مرکزی حکومت کو کوئی اختیار نہیں رھا ' آمدنی کا وہ آدھا محصول بھی ' جس کو مرکزی حکومت لیتی تھی ' صوبوں کے حوالے ھوگیا ' مگر اسکے ساتھ یہ شرط لگائی گئی تھی کہ اگر جنگ ھو یا کوئی غیر معمولی صورت حال پیش آجائے تو صوبے اپنی آمدنی سے مرکزی حکومت کی مدد کریں اس انتظام کے بعد سے صوبوں کو آمدنی کا ایک

ایسا ذریعہ مل گیا تھا جس میں دن بدن اضافہ ہوسکتا تھا ، پانچ صوبوں پر مرکزی حکومت کا جو قرضہ تھا وہ معاف کردیا گیا اور باقی صوبوں کو مناسب شرطوں پر قرضہ کی آسانیاں مہیا کی گئیں ، اسکے علاوہ اسام ، اوریسہ ، سندھ اور سرحد کے چار دست نگر صوبوں کو ایک غیر معین مدت تک مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا گیا ، اور صوبجات متحدہ کو پانچ سال تک امدادی رقم دینے کا وعدہ کیا گیا ۔

صوبوں نے اپنی اس خود مختاری سے فائدہ اٹھاکر بعض جگہ لگان گھٹایا اور کاشتکاروں کو خوش حال بنانے کی کوشش کی ، اور بعض جگہ امتناع مسکرات کی حکمت عملی اختیار کی جسکی وجہ سے آبکاری کا بہت بڑا محصول بند ہوگیا ، تاہم انہوں نے نئے محصول عاید کیے ، جن سے اتنی رقم نکل آتی ہے کہ وہ تعلیم ، زراعت اور صحت عامہ کے محکموں کو ترقی دے سکیں ۔

مرکزی حکومت میں سب سے زیادہ خرچ فوج کا ہے ، دوران جنگ کے دفاعی اخراجات کے متعلق ہند اور انگلستان کے مابین ایک مالی معاہدہ ہوا تھا جس میں ہند کی طرف سے اس اصول کو تسلیم کرلیا گیا تھا کہ حکومت ہند موجودہ گرانی کے حساب سے جنگ سے پہلے کے معمولی دفاعی اخراجات کے علاوہ موجودہ جنگی تدابیر کا وہ خرچ بھی ادا کریگی جو خاص ہند کے تحفظ اور فایدہ کیلئے صرف کیا جاتا ہے ، اسکے علاوہ حکومت ہند نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ بیرون ملک کی ہندی فوجوں کے اخراجات کیلئے ایک کرور روپیہ نقد ادا کریگی ، لیکن عملا ہند اور برطانیہ کی حکومتوں نے دونوں سے متعلق جنگی تدابیر کے خرچ کو اپنے درمیان بانٹ لیا ہے ، سنہ ۴۰ - ۱۹۳۹ء سے لیکر سنہ ۴۴ - ۱۹۴۳ء تک مرکزی حکومت ہند کا پورا خرچ ایک ہزار کرور سے کچھ زیادہ تھا ، اس میں سے محض دفاع پر تقریباً ۷۹۵ کرور روپیہ خرچ ہوا ، اسکے معنی یہ تھے کہ معمولی حالات سے ۵۷۰ کرور روپیہ زیادہ خرچ ہوا ۔

ان پانچ برسوں میں قدرتی طور پر مصارف جنگ بہت زیادہ ہوگئے تھے ' اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت بھی جنگ کے اخراجات برداشت کر رہی تھی ' جب ہند کو بھی ایک فوجی مرکز بنایا گیا تو برطانوی حکومت کو جنگی سامانوں وغیرہ کی خریداری کیلئے بہت سا روپیہ صرف کرنا پڑا یہ تمام روپیہ اسٹرلنگ کی صورت میں ریزرو بنک میں جمع کردیا جاتا تھا ' اسی حساب سے یہ بنک فوجی اخراجات کیلئے روپیہ تقسیم کرتا تھا ' امریکہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا ' اسطرح ہند کا بہت سا روپیہ اسٹرلنگ کی صورت میں انگلستان کے ذمہ واجب الادا ہوگیا ' اس سے فائدہ اٹھاکر ہند نے نہ صرف اپنا اسٹرلنگ کا قرضہ ادا کیا بلکہ بہت سی ریلوے کمپنیوں کے برطانوی حصہ داروں کے حصے بھی خریدلیے ' اس کے باوجود قرضہ کا ایک بڑا حصہ ابھی تک انگلستان کے ذمہ واجب الادا ہے .

اس انتظام کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہند کے اندر بہت زیادہ تعداد میں نوٹ جاری کئے گئے ' یہاں تک کہ ہر جگہ ان کی بھرمار ہوگئی ' حکومت نے اس کا انسداد کرنے میں بڑی کاہلی کی ' سنہ ۱۹۴۲ع کے آخر میں نوٹوں اور پیسوں کی بھرمار کو مختلف ذرایع سے روکا جاسکتا تھا ' نئے محصول لگا کر یا ایک وسیع پیمانہ پر پس اندازی (Savings) کی مہم شروع کرکے بہت سا روپیہ وصول کرلیا جاسکتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ چیزوں کی قیمتیں متعین کرکے ان کی راتب بندی کی جاسکتی تھی اور بہت سا مال باہر سے منگوایا جاسکتا تھا ' لیکن حکومت ملک کے سیاسی ہیجان کی وجہ سے اس کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی ' اس کے علاوہ اس وقت جہازوں کی بڑی کمی تھی ' روپیے پیسے کی بھرمار کا ایک بڑا برا اثر یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۴۳ع میں ملک کے مختلف گوشوں میں قحط کے آثار پیدا ہوگئے تھے .

اس کے بعد سے روپیہ کی زاید مقدار inflation کے مسئلہ پر بڑا غور و فکر ہوتا رہا سنہ ۱۹۴۳ع کے موسم بہار میں اس کو روکنے کی مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں ، بہت سے نئے محصول عاید کیے گئے ، اور پس اندازی کی زبردست مہم شروع ہوی ، یہاں تک کہ اس سال دفاعی قرضہ کی صورت میں ۲۷۹ کرور روپیہ حاصل ہوا اب باہر سے مال منگوانے کی بڑی کوشش ہو رہی ہے ، برطانیہ اور امریکہ کی حکومتیں ہند کے روپیوں کا حساب چکانے کیلئے اپنے اپنے ملک کے ذرایع آمدنی سے سونا دے رہی ہیں ، تمام چیزوں کی قیمتیں متعین کی جا رہی ہیں ، اور مفصلات میں بھی ان کی راشب بندی ہو رہی ہے ، قیمتیں بھی ایک معیار پر آگئی ہیں اور ان کی باقاعدہ نگرانی کی جا رہی ہے .

ہم نے حال کی مالی تاریخ کا ایک ابتدائی خاکہ پیش کیا ہے ، اس کا بہترین تجزیہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ لڑائی ختم ہو جاے .

باب ۵۵

اقتصادی ترقیاں

گذشتہ پچیس برسوں کے اندر ہند کی قومی زندگی میں ایک زبردست انقلاب ہوگیا ہے ' سب سے زیادہ تبدیلی لوگوں کی اقتصادی زندگی میں ہوی ہے رسل و رسایل اور آمد و رفت کے ذرایع کی ترقی سے قومی زندگی کو بڑی ترقی ملی ہے ' اس سلسلہ میں ہم کو سب سے پہلے نئی بندرگاہوں کی تعمیر کے متعلق عرض کرنا ہے - سمندری ساحل کے کٹے ہوے زمینی حصے جدید قسم کے جہازوں کی لنگر اندازی کیلئے موزوں اور مناسب نہیں تھے ' بیس سال پہلے صرف چٹا گانگ ' کلکتہ ' مدراس ' بمبئی اور کراچی کی پانچ بندرگاہیں تھیں ' جہاں بڑے جہاز آکر لنگر انداز ہوسکتے تھے ' اب اسحاق پٹن ' توتگڑی اور کوچین وغیرہ کی نئی بندرگاہیں تیار ہوگئی ہیں ' جن کی وجہ سے بحری تجارت کو بڑی ترقی ہو رہی ہے ' بعض ریاستوں نے کاٹھیاواڑ اور گجرات کے ساحل پر چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں بنالی ہیں ' اس کے علاوہ جہازوں کے بنانے کے بہت سے کارخانے قایم ہوگئے ہیں ؛ اٹھارویں صدی تک ہند کے جہاز عام طور پر ایشیائی سمندروں میں چکر لگایا کرتے تھے ' اور اس کے بعد بھی ہند کے ساحل پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے بہت سے لکڑے کے جہاز تیار ہوتے تھے ' اور جب بھاپ کی قوت وجود میں آئی تو ہند کی پرانی جہاز سازی کی صنعت بالکل ختم ہوگئی ' اس صدی کی ابتدا میں اگرچہ پچاس ہزار سے زیادہ نواجوان جو آسام ' بنگال اور بمبئی سے تعلق رکھتے تھے ' مختلف جگہوں کے جہازوں میں کام کرتے تھے ' مگر کوئی ایک جہازی کمپنی بھی باشندگان ہند کی نہیں تھی ' سب پر غیر ملکیوں کا قبضہ تھا ' امن اور جنگ دونوں زمانوں میں ہند کے جہازیوں نے اپنی بہادری ' محنت ' اور تنظیم کی بدولت ساری دنیا میں

بہت نام کمایا ' سنہ ۱۹۲۰ع کے بعد سے ہند کی مجلس قانون ساز یہ چاہتی تھی کہ خود باشندگان ہند جہازرانی کی کمپنیاں قایم کریں ' مگر اس سلسلہ میں سوائے اس کے کہ جہازیوں کی ایک تربیت گاہ قایم ہو ' کوئی اور مفید کام نہیں ہوسکا ' موجودہ جنگ کی وجہ سے باشندگان ہند کو اپنی خاص کمپنیاں قایم کرنے کا موقعہ مل گیا ' اب ہند کے اندر بڑے بڑے جہاز کثیر تعداد میں تیار ہونے لگے ہیں ' اور نئی جگہوں پر جنگی اور تجارتی جہازوں کی تعمیر اور ان کی مرمت کا کام ہو رہا ہے ۔

گذشتہ جنگ عظیم میں ریلوں کی تعمیر کا کام رک گیا تھا ' مگر اب ان کی نئے سرے سے تنظیم ہو رہی ہے اور ان کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے ' ان کے ذریعہ اندرونی مقامات تک چیزوں کو پہنچایا جاسکتا ہے ' موجودہ جنگ عظیم میں ہند کی ریلوں نے مشرق وسطی میں بہت کام کیا ' انگلستان میں اسٹرلنگ کے جمع ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند ایک کے سوا باقی تمام بڑی بڑی ریلوے لائنوں کو خرید چکی ہے ' اب ہند میں نئی بڑی ریلوں کے نکالنے کی زیادہ گنجایش نہیں ہے ' البتہ اس کی جگہ پر موٹروں ' بسوں اور لاریوں کو بڑی ترقی ہو رہی ہے ' ان کی وجہ سے دیہاتی زندگی کا نقشہ بدلتا جا رہا ہے ' وہ لوگ جو اپنی پرانی گاڑیوں میں بیٹھ کر سفر کرنے کے عادی تھے اب موٹروں کے ذریعہ سفر کرنے لگے ہیں ' ملک کے گوشہ گوشہ میں موٹر لاریاں پہنچ چکی ہیں اور سامانوں کے لیجانے اور لانے میں بہت ہی مفید ثابت ہو رہی ہیں لیکن ان نئے حالات کے مطابق سڑکوں کی تعمیر نہیں ہو رہی ہے ' اگرچہ مرکزی حکومت کی طرف سے سڑکوں کی تعمیر کیلئے صوبوں کو ایک بہت بڑی رقم ملتی ہے تاہم کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوسکا ہے ' بنگال کے قدرتی حالات کچھ ایسے ہیں کہ وہاں اچھی سڑکوں کا تعمیر کرنا بہت ہی مشکل ہے ' اس کے علاوہ بہت سی نہریں ایسی ہیں جن کو اگر صاف

کیا جائے تو نقل و حرکت اور آمد و رفت کیلئے مفید اور کار آمد ہوسکتی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ریلوں، سڑکوں اور نہروں کی تعمیر اور مرمت کا مناسب طریقہ پر انتظام کیا جائے۔

انیسویں صدی کے وسط سے بہت کم خرچ پر ڈاک اور تار بھیجنے کا انتظام ہوگیا تھا، پہلی جنگ عظیم کے بعد بہت سے ٹرنک ٹیلیفون قایم کیے گئے جس سے ملک کی اندرونی تجارت کی ترقی میں بڑی آسانیاں پیدا ہوگئیں، اور جب تار کے ساتھ سنہ ۱۹۲۶ع میں لاسلکی کا انتظام بھی ہوگیا تو بیرونی تجارت کو بڑی زبردست ترقی ہوی۔ اس کے علاوہ چونکہ ہند مغربی اور مشرقی ممالک کے بیچ میں واقع ہے، اس لئے تمام ہوائی جہازوں کو اس پر سے ہوکر گذرنا پڑتا ہے، سنہ ۱۹۲۷ع سے ہوائی جہازوں کا سلسلہ شروع ہوا اور دو سال بعد ہند اور انگلستان کے درمیان ہوائی ڈاک کا انتظام کیا گیا۔ باشندگان ہند مختلف ہوائی کمپنیاں قایم کرنے لگے تاکہ اس ملک کے بڑے بڑے شہروں کو ایک دوسرے سے ملایا جائے، موجودہ جنگ عظیم سے پہلے ہند سے یوروپ جانے کے لئے تین دن سے بھی کم وقت لگتا تھا۔ اس وقت ہوائی جہازوں کا مستقبل بہت شاندار نظر آتا ہے کیونکہ سال کے ایک بڑے حصہ میں موسم بہت ہی پرسکون ہوتا ہے۔

رسل و رسایل کی ترقی سے نہ صرف زراعتی اور صنعتی پیداوار زیادہ ہونے لگی بلکہ بازاروں تک چیزوں کے پہنچنے میں بڑی آسانیاں پیدا ہوگئیں، اس صدی کی ابتدا میں لارڈ کرزن نے زراعت کے متعلق جو پالیسی اختیار کی تھی اس کے آج اچھے نتائج نکل رہے ہیں، اس وقت زراعت کو ترقی دینے کے لئے چند ایسے کارکن مقرر کئے گئے تھے، جنہوں نے جدید سائنس کے مطابق پیداوار کو بڑھانے اور فصلوں کو بہتر بنانے کی بڑی کوشش کی، انہوں نے پودوں کے توالد و تناسل کے متعلق بھی بڑی تحقیقات کیں جس سے زراعت کو بڑا فائدہ پہنچا، سنہ

۱۹۲۷ع میں مارکوئیس آف لنلتھگو کی صدارت میں ایک رایل کمیشن مقرر کیا گیا ، جس نے زراعت کے تمام شعبوں کا احتیاط کے ساتھ جایزہ لیا اور اس کی سفارش پر ایک امپیریل کونسل قایم ہوی ، تاکہ زراعت ، بیطاری اور بازاروں کے متعلق اپنی تحقیقات پیش کرے اور ان کو مناسب طریقے پر استعمال کرے ، صوبوں اور ریاستوں نے اس کی مالی امداد کی اور اس کے کام میں ہاتھ بٹایا ، اس سے بہترین نتائج پیدا ہوے ، عمدہ اور فائدہ مند قسم کے گیہوں کی کاشت کی جانے لگی ہے جنگ سے پہلے عمدہ قسم کی روئی بہت کم اگائی جاتی تھی ، اور اب اس کی کاشت کے رقبہ میں بہت بڑا اضافہ ہوگیا ہے ، گنے کی کاشت میں تو زبردست انقلاب ہوگیا ہے ، پہلے ایک ہی قسم کے گنے کی کاشت ہوتی تھی ، جس سے بہت کم پیداوار ہوتی تھی ، اب اس کی جگہ بہت سی قسم کے گنوں کی کاشت ہونے لگی ہے ، جس سے زیادہ مقدار میں شکر نکل سکتی ہے ، ہند میں شکر سازی کی صنعت اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ ملک کی ضروریات اس سے پوری ہو جاتی ہیں ، پودوں کی بیماریوں کے متعلق بھی بہت کچھ تحقیقات کی گئی ہے اور اور مفید کھادوں کا پتہ لگایا گیا ہے ، جانوروں کی نسل کو بڑھانے اور ترقی دینے کی کوشش جا رہی ہے اور بازاروں میں جدید طریقوں کو رائج کیا جا رہا ہے .

بہت سی نئی نہروں کی تعمیر سے زراعت کو بڑی ترقی ہو رہی ہے ، دریاے سندھ پر ایک زبردست بند لائڈ بیریج Lloyd Barrage تعمیر کیا گیا ہے جو دنیا کا سب سے بڑا بند سمجھا جاتا ہے ، اس کی وجہ سے سندھ کے بے آب و گیاہ اور چٹیل میدان سرسبز و شاداب اور زرخیز زمینوں میں تبدیل ہوگئے ہیں ، پنجاب میں بہت سی نئی نہریں نکالی جا چکی ہیں جن سے اس کی اور یہاں کی ریاستوں کی خوش حالی بڑھتی جا رہی ہے ، مدراس میں کاویری سے نئی نہروں کے نکالنے کا

کام اب تک جاری ہے ، صوبجات متحدہ میں ساردا نہر تکمیل کو پہنچ چکی ہے .

کاشتکاروں کی حالت کو بہتر بنانے کیلئے اور بہت سے دوسرے طریقے اختیار کیے گئے ، اصل میں ان صوبوں کے اندر ، جہاں زمین کا لگان عارضی طور پر متعین ہوتا ہے ، تشخیص کے اصول اور طریقوں کو عارضی انتظامی قانون ہی کے ذریعے بدلا جاسکتا ہے ، سنہ ۱۹۱۹ع کے دستوری اصلاحات کے بعد سے ان عارضی قوانین کو مستقل قوانین کی شکل دی گئی جن میں مجلس قانون ساز ہی ترمیم اور اصلاح کرسکتی تھی ، کئی جگہوں پر لگان کی تشخیص کا معیار گھٹایا گیا اور دو بندوبستوں کے درمیان ایک لمبی مدت رکھی گئی ، تاکہ اس مدت میں جو زاید آمدنی ہو اس پر کاشتکاروں اور اجارہ داروں کا حق ہو جائے ، شمالی ہند کے اکثر صوبوں میں نئے قانون کے ذریعے کاشتکاروں کو بہت سے حقوق دئے گئے : صوبجات متحدہ اور بہار میں کانگریسی وزارتوں نے بہت بڑا کام کیا ، البتہ بنگال میں دوامی بندوبست کی وجہ سے بڑا جھگڑا پیدا ہوا ، اور اس مسئلہ کی تحقیقات کیلئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا ، مگر اس طریقہ بندوبست کو بدلنے کیلئے جو تجویزیں پیش کی گئی ہیں ، وہ اتنی گراں ہیں کہ اس کی وجہ سے اس صوبہ کے مالی ذرایع پر بہت بڑا بوجھ پڑجاتا ہے .

کاشتکاروں کی مالی امداد کیلئے مختلف صوبوں میں بہت سے طریقے اختیار کیے گئے ، کسانوں کیلئے مالیات کا مسئلہ ہمیشہ سے بہت اہم رہا ہے ، تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے دیہاتیوں میں باہمی قرضہ کی تحریک کو بڑی تیزی کے ساتھ ترقی نہیں ہو رہی ہے ، بعض جگہوں پر غیر کاشتکار طبقہ کو جائداد کا حق منتقل کرنے سے قانونا منع کیا گیا ہے ، اور ایک جگہ ایک ایسا قانون نافذ کیا گیا ہے جس کے ذریعہ مہاجنوں کو جبرا کاشتکاروں کے قرضہ کے گھٹانے کا حکم دیا

گیا ہے ' اس صورت میں کاشتکاروں کو آئندہ قرضہ کا ملنا بہت دشوار ہو جائیگا .

اگرچہ زراعت کی ترقی کیلئے بہت کچھ کوشش کی جا چکی ہے مگر اس کو کسی حالت میں بھی اطمینان بخش نہیں کہا جاسکتا لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ مذکورۂ بالا طریقوں کے جاری کرنے کے بعد خود کاشتکاروں کو بھی یہ محسوس ہونے لگا ہے کے زراعت کے متعلق ان کے آبائی طریقے کچھ زیادہ مفید اور کارآمد نہیں رہے ' اور اب ان میں ایک بڑی حد تک تبدیلی کی ضرورت ہے ' چنانچہ پرانے ایک قسم کے طریقوں کی بجائے مختلف جدید طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں ' اور مزید ترقی کی اب بھی بہت کچھ گنجایش ہے ' کاشتکاروں کی زمینیں اتنی کم اور پھیلی ہوی ہیں کہ ان کی کاشت کیلئے سائنس کے جدید طریقوں کا استعمال کرنا کوئی مفید ثابت نہیں ہوگا ' اب ضرورت اس کی ہے کہ دوسری چیزوں کی کاشت کو چھوڑکر محض غذائی اشیاء کو اگایا جاے ' ہند کی آبادی اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ آئندہ سب کیلئے غذا کا فراہم ہونا بہت دشوار ہے ' اور جب کوئی ناگہانی آفت آجائے تو اس وقت اور بھی مشکلات پیش آجاتی ہیں ' جیسا کہ سنہ ۱۹۴۳ع میں بنگال میں ہوا ' جب عام طور پر ملک میں غذائی اشیاء کی کمی ہوگئی اور بنگال میں کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہوسکا تو سینکڑوں لوگ بھوک سے مرنے لگے اور جب اس کے بعد بیماریوں کا حملہ ہوا تو ہزاروں کی تعداد میں لوگ ختم ہوگئے ' بنگال کے قحط کے متعلق ابھی تک کوئی پوری تحقیقات نہیں ہوسکی ' اور یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ پچھلے قحطوں کے تجربات اور جدید وسائل سے فائدہ اٹھانے میں کون سی چیز مانع ہوی .

ایک زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ضرورت سے زیادہ کاشتکاروں کو دوسری ملازمتوں کی طرف متوجہ کیا جاسکتا ہے ' خاص کر صنعتی کارخانوں میں ان کیلئے جگہ پیدا کی جاسکتی

ہے ' لیکن گذشتہ چند سالوں میں صنعتی کارخانوں کو اگرچہ بہت ترقی ہوی ' تاہم اس کے ساتھ ساتھ آبادی بھی اسی تناسب سے بڑھ گئی ' اس لحاظ سے غذائی اشیاء اور قوت بخش چیزوں کے کثیر پیداوار کی آج اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ آج سے پچاس سال پہلے تھی .

دیہاتوں میں آج کل بہت سا کام دیہاتی کاریگروں سے لیا جا رہا ہے ' یہاں جدید اشیاء کی اتنی بڑی مانگ نہیں ہے ' صوبائی حکومتوں اور قومی اداروں کی طرف سے ہاتھ کے بنے ہوے کپڑے کی بڑی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے ' اس کے ساتھ ساتھ شکر ' دیاسلائی ' سگریٹ ' شیشہ ' سیمنٹ اور دوسری کیمیائی اشیاء کے کارخانوں کو بڑی ترقی ہو رہی ہے ' دیہاتیوں کو بھی ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ' جب ابتداء بمبئی کے ہندی تاجروں کو کپڑوں کے کارخانوں میں بڑا فائدہ ہوا تو اس صدی کی ابتدا میں دوسرے مقامات پر بھی باشندگان ہند مختلف کارخانے قایم کرنے لگے ' لوہے اور فولاد کا ایک بہت بڑا کارخانہ قایم ہوا جس کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے ' اس کارخانہ سے ملک کو بہت بڑا فائدہ پہنچا ' اس کے باوجود ہند میں مختلف چیزوں کی کمی تھی ' جن کو باہر سے منگوانا پڑتا تھا ' اس کی وجہ سے ہند کے اقتصادی حالات پر بہت برا اثر پڑتا تھا ' آخر حکومت نے سرتھامس ہالینڈ کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ ہند میں صنعت کی ترقی کی تجاویز پیش کرے ' سامان جنگ کے تیار کرنے کی تجویزوں پر غور و فکر کرنے کے لئے ایک مجلس Indian Munition Board کے نام سے بنائی گئی تھی اس سے مقامی صنعتوں کو بہت بڑی مدد ملی ' پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ملک کی تمام اہم صنعتوں کو بہت بڑا فروغ ہوا تھا اور کپڑا ' لوہا اور انجینرنگ کا سامان کافی مقدار میں تیار کیا جانے لگا تھا .

اب یہ امید کی جاتی ہے کہ اس دوسری جنگ عظیم کے بعد صنعتی ترقی کے لئے حکومت کوئی مفید حکمت عملی

اختیار کریگی ، نئے دستور کی وجہ سے اس کی ترقی میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہوگئی ہیں ' کیونکہ تمام صنعتی کارخانے صوبوں کے اختیار میں دئے گئے ہیں اور ان کے پاس اتنا روپیہ اور عملہ نہیں ہے کہ ان کارخانوں کی اعلی پیمانہ پر کوئی مدد ہوسکے پہلی جنگ عظیم کے بعد چند سال تک مرکزی حکومت کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا ، اس کی وجہ سے ہالینڈ کمیشن کی سفارشات پر کوئی عمل نہیں ہوسکا ۔ تاہم صنعت کو ترقی دینے کے اب بھی دو ذریعے موجود تھے ۔ فوجی اور غیر فوجی ضروریات اور سرکاری ریلوں کے ساز و سامان کی سب سے بڑی خریدار مرکزی حکومت ہی ہوتی ہے ' اور اس حیثیت سے مختلف کارخانوں کی ' جو ان چیزوں کو پیدا کرتے ہیں ' بڑی مالی امداد ہوجاتی ہے ' دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ ان صنعتوں کا تحفظ کیا جاے جن کے لئے ملک میں خام اشیاء مل سکتی تھیں اور جن کے لئے مزدوروں کو تیار کیا جاسکتا تھا ' اس طرح کے صنعتی کارخانوں کو سرکاری مراعات دینے سے اسی وقت فایدہ ہوسکتا ہے جبکہ آگے چلکر ان کو سرکاری تحفظ کی ضرورت باقی نہ رہے ' ان سرکاری مراعات اور تحفظ سے لوہا اور فولاد ' دیاسلائی کا ماوا اور کاغذ ، شکر ' روئی اور سلک وغیرہ کے کارخانوں نے بڑا فایدہ اٹھایا ' ان میں سے بعض اس حد تک ترقی کرچکے ہیں کہ اب ان کو کسی سرکاری امداد کی ضرورت نہیں رہی ' تاہم دوران جنگ میں ان کے محصولات کا اب بھی بوجھ اٹھایا جا رہا ہے '

ہند کی صنعتی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ان جگہوں پر جہاں خام اشیاء مل سکتی ہیں کوئلہ کی کافی مقدار فراہم نہیں ہوتی برقابی تجویزوں hydroelectric schemes کی ترقی سے یہ رکاوٹ آہستہ آہستہ دور ہو رہی ہے' اور کئی صوبوں اور ریاستوں میں اس کا سلسلہ قایم ہوگیا ہے .

موجودہ جنگ کے دوران میں ہند کی صنعتوں میں جو اہم انقلاب ہوا ہے اس کا اس وقت کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا

جاسکتا، ان کا ذکر پچھلے باب میں سرسری طور پر ہوچکا ہے، تاہم ایک باقاعدہ نظام عمل اور تحقیقات کی بڑی ضرورت ہے اور موجودہ حکومت ان دونوں مسئلوں کی طرف خاص توجہ دے رہی ہے .

صنعت اور تجارت میں بہت بڑا گہرا تعلق ہے، جب ہند میں کپڑے کے کارخانے کھل گئے تو برطانیہ عظمی کے کپڑے کی درآمد کم ہوگئی ۔ مالی معاہدے (fiscal convention) کے بعد حکومت ہند کو اس کا اختیار حاصل ہوگیا کہ ان تمام محصولات کو منسوخ کردے جو غیر ملکی تجارت کو فروغ دینے کی خاطر دیسی صنعتوں پر لگائے جاتے تھے، ایک زمانہ سے ہند کی تمام سیاسی جماعتیں ان محصولات کے خلاف زبردست احتجاج کرتی آرہی تھیں، اور جب برطانوی حکومت نے اپنی سلطنت کے اندر جو ممالک ہیں ان کے برآمدی مال پر محصول لگانے کی تجویز پیش کی تو اس کے خلاف پھر سے احتجاج شروع ہوگیا، اور جب لارڈ کرزن کے زمانہ میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا تو حکومت ہند نے یہ رائے دی کہ محصولات کی پالیسی میں ہند ہی کے مفاد کو ترجیح دینی چاہئے .

سنہ ١٩٣٢ء میں یہ مسئلہ پھر اٹھایا گیا اور برطانوی حکومت نے اپنے تمام برطانوی ممالک کیلئے باہمی ترجیح کا طریقہ تجویز کیا ، اس کے معنی یہ تھے کہ ہند کا برآمدی مال برطانوی ممالک میں اس وقت تک فروخت نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ ہند ان سے باقاعدہ مسابقت نہ کرے، اس باہمی ترجیح کی تجویز سے ہند کی برآمدی تجارت کو بڑا سخت دھکا لگنے والا تھا کیونکہ برطانیہ ہی سب سے زیادہ ہند کے برآمدی مال کا خریدار تھا ، اٹاوہ کی کانفرنس میں ہند کے نمائندوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہند میں برطانیہ کی بعض چیزوں کو ترجیح دی جائے اور اسی کے مقدار برطانیہ کے اندر ہند کی چند خاص چیزوں کو ترجیح دی جائے ، ہند کی مجلس قانون‌ساز

نے اس تجویز کو منظور کرلیا ، اس کے بعد سنہ ۱۹۳۴ء میں جاپان کے ساتھ ایک تجارتی معاہدہ ہوا ، اور وہ ہند کی ادنی اور زاید از ضرورت روئی کو خریدنے لگا ، ہند کا فائدہ اسی میں تھا کہ اس معاہدہ پر برابر عمل ہوتا رہے ، لیکن موجودہ جنگ کی وجہ سے یہ معاہدہ ختم ہوگیا ، اور اس جنگ کے بعد اس مسئلہ پر پھر سے غور و فکر کرنا ہوگا .

ہند کی برآمدی اور درآمدی تجارت کی چیزوں کی نوعیت میں بہت زیادہ انقلاب ہوگیا ہے ہند کی برآمدی چیزوں میں سن اور چائے اب بڑی بہت اہمیت رکھتی ہیں ، لیکن ہند کا کپڑا پہلے سے بھی زیادہ مقدار میں باہر بھیجا جانے لگا ہے ، اور اسی تناسب سے روئی کی برآمد گھٹ گئی ہے ہند کی دوسری مصنوعات بھی بہت زیادہ مقدار میں باہر جانے لگی ہیں ، اور ان کا مستقبل بہت شاندار معلوم ہوتا ہے ، صنعتی کارخانوں کے قایم ہونے سے اگرچہ باہر کی بہت سی چیزوں کی یہاں مانگ نہیں ہے تاہم ہند کو اب بھی مشینوں گاڑیوں اور دوسرے قسم کے سامانوں کی بہت ضرورت ہے ، جنگ کے بعد تو ان کی اور زیادہ ضرورت ہوگی . حکومت ہند نے اپنی برآمدی تجارت کو فروغ دینے کیلئے مختلف ممالک میں اپنے نمائندے مقرر کئے ہیں ، جن کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ ہند کی تجارت کو ترقی دیں .

نئے حالات کی بناء پر ہند میں مزدوروں کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے ، کارخانوں کے قایم ہونے کے بعد چند ایسے نئے مسئلے پیدا ہوگئے ہیں جن کی طرف حکومت یا ہند کے اہل الرائے نے کبھی کوئی توجہ نہیں کی تھی ، مزدوروں کو میلے کچیلے اور گندے ماحول میں زندگی کرنی ہوتی تھی ، ہند کے کارخانوں کے مزدوروں کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ شہری زندگی کے عادی نہیں ہوتے ہیں ، وہ مختلف دیہات سے آتے ہیں اور اپنی ملازمت کے زمانہ میں

بھی اکثر اپنے وطن کو جاتے رہتے ہیں ' اور جب ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہیں تو پھر اپنے ہی وطن میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوجاتے ہیں ' اکثر تو اپنے اہل و عیال کو بھی وطن ہی میں رکھتے ہیں کیونکہ شہری زندگی بہت گراں ہوتی ہے ' اور شہروں کی گنجان آبادی میں صاف آب و ہوا نہیں مل سکتی اور ان کی صحت بھی اچھی نہیں رہ سکتی ' شہری ملازمت کو محض اسی لئے پسند کیا جاتا ہے کہ یہاں مزدوری کچھ بڑھکر ملتی ہے ' یہ تمام مزدور مختلف صوبوں اور قوموں کے ہوتے ہیں اور بعض وقت تو مختلف بولیاں بولتے ہیں ' اس لئے اس صورت میں وہ اتحاد نہیں پیدا ہوسکتا اور اتنی ترقی نہیں ہوسکتی جتنی کہ ایک جگہ سکونت پذیر ہونے کی صورت میں ہوسکتی ہے ۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ تک کارخانوں کے مزدوروں کی کوئی خاص تنظیم نہیں ہوی تھی ' لیکن جب گرانی زیادہ ہوگئی اور ان کو اسی تناسب سے مزدوری نہیں ملنے لگی تو ان میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہوگئی اور انھوں نے اپنے مالکوں کے خلاف ہڑتال کرنی شروع کی ۔ اکثر مزدور اپنی تجارتی انجمنوں Trade Unions کے ذریعہ مطالبات پیش کرتے تھے اور ان کے ذریعہ ان مطالبات کا تصفیہ کیا جاتا تھا ' ان انجمنوں کے حالات بالکل مختلف تھے ' بعض رہنما تو ایسے تھے جو محض ذاتی اغراض کی بناء پر مزدوروں کی تائید کرتے تھے ' حقیقی معنوں میں مزدوروں کے اندر باقاعدہ تنظیم نہیں ہوی تھی ' ان انجمنوں کے اندر بہت سے اختلافات بھی موجود ہیں ' لیکن آج ان انجمنوں کی بڑی اہمیت ہوگئی ہے اور ان کو کچھ بے غرض اور معتبر رہنما بھی میسر آگئے ہیں ' ان سے مزدوروں کو بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے ' پہلی جنگ عظیم کے بعد حکومت نے مزدوروں کے متعلق مختلف قوانین بنائے ہیں اور ان کو نافذ کیا ہے ۔

ہند کے مزدوروں کے متعلق جو قوانین نافذ کیے گئے تھے وہ بین الاقوامی معیار سے بہت گرے ہوے تھے ' چنانچہ جب بین الا قوامی جمعیت مزدوران International Labour Organisation میں ہند کے نمائندے شریک ہوے تو ان کو ان مسائل پر دنیا بھر کے لوگوں کی رائے عامہ کا مقابلہ کرنا پڑا ' اسی زمانہ میں ہند کے اندر سنہ ۱۹۱۹ء کا دستور نافذ ہوا ' جس میں ہند کی مجلس قانون ساز کو گھروں کے سوا مزدوروں کے باقی تمام مسائل کے متعلق قانون بنانے کا اختیار دیا گیا تھا ' گھروں کے متعلق قانون بنانے کا اختیار صرف صوبائی حکومتوں کو عطا کیا گیا تھا ' اور اس کے ساتھ ان کو بھی کان کنی کے سوا باقی تمام اختیارات حاصل تھے مرکزی حکومت کو حق حاصل تھا کہ کسی خاص معاملہ میں صوبوں کی تجویز کو مسترد کردے ' مرکزی حکومت کی نگرانی میں کان کنی کے سوا باقی تمام قوانین کے نفاذ کا ذمہ دار صوبوں کو قرار دیا گیا تھا ' چونکہ صوبوں کے ذرایع آمدنی بالکل محدود تھے ' اس لئے ان قوانین کے نفاذ کیلئے ایک بڑا عملہ مقرر نہیں کیا جاسکتا تھا .

مرکزی حکومت نے مزدوروں کے متعلق جدید اصول پر قانون کو ڈھالنے کی کوشش کی ' اس معاملہ میں مجلس قانون ساز نے حکومت کے ساتھ پورا تعاون کیا اور بڑی حد تک اس کو آجروں اور مالکوں کی تائید بھی حاصل رہی ' اور ایک باضابطہ قانون تیار ہوگیا ' کارخانجات اور کان کنی کے متعلق بھی قوانین نافذ کیے گئے ' اور ایک ایسا نظام بنایا گیا جس کے ذریعہ مزدوروں کو ان کے نقصان کا عوض مل سکے ' مزدور سبھائیں قانونی طور پر جائز قرار دی گئیں ' اور ان کی حفاظت کے مختلف طریقے اختیار کئے گئے ' مزدوروں کے جھگڑوں کو چکانے کیلئے مفید قوانین بنائے گئے ' مگر مالی مشکلات کی بنا پر ان میں سے بہت سے ایسے قوانین پر عمل نہیں ہوسکا ' جو مزدوروں کے حالات کی تحقیقات و تدقیقات کے متعلق بنائے گئے تھے ' آخر برطانوی دارالعوام کے سابق اسپیکر وھٹلے Whitley کی صدارت میں

ایک رایل کمیشن مقرر کیا گیا ' جس نے اس ضرورت کو ایک حد تک پورا کیا ' اور جب سنہ ۱۹۳۱ع میں اس کمیشن کی روداد شایع ہوی تو اسی کی بنیاد پر مزید قوانین بنائے گئے ' پرانے قوانین کو اور آسان اور وسیع تر کیا گیا ' اور آسام کی چاے کے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے ضابطہ قوانین میں ترمیم کی گئی .

سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور کے نافذ ہونے کے بعد مرکزی حکومت کے اختیارات بھی بدل گئے ' اگرچہ اس کو کانوں کے اندر کام کرنے والے مزدوروں کے متعلق قوانین بنانے کا پورا اختیار تھا ' لیکن وہ صوبوں کو ان قوانین کے نفاذ پر مجبور نہیں کرسکتی تھی تا وقتیکہ وہ ایک مالی امدادی رقم ان کے لئے منظور نہ کرے ' اس لئے مرکزی حکومت صرف ایسے قوانین بناتی تھی جو صوبوں کیلئے مثال کا کام دے سکیں ' ان کو اختیار تھا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق ان پر عمل کریں ' اب اس میں شبہ ہے کہ آیا مختلف صوبوں کے مختلف قوانین ملک کے لئے مفید ثابت ہونگے یا مضر .

اس نئے دستور کے بعد محض صوبوں میں دکانوں اور تجارتی کمپنیوں کے متعلق بھی چند قوانین بنائے گئے ہیں ' بمبئی میں کارخانوں کے جھگڑوں کے متعلق Industrial Disputes Act کے نام سے ایک جامع قانون بنایا گیا ہے .

اس میں شبہ نہیں کہ ہند میں مزدوروں کے متعلق بہت سے عمدہ قوانین کا نفاذ ہوا ہے ' لیکن ابھی بہت کچھ کرنا ہے ' چند مخصوص مقامات کے سوا باقی تمام جگہوں پر مزدوروں کیلئے آرام دہ مکانات کا کوئی انتظام نہیں ہے ' بیماری بڑھاپا اور بے روزگاری کے خلاف کوئی خاص تحفظات نہیں ہیں دیہات کے ان مزدور پیشہ لوگوں کا ' جن کے پاس کوئی زمین نہیں ہے ' کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا ' اور ان کی حالت کے بہتر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے ' ان مختلف مسائل کے متعلق تحقیق و تدقیق اور مناسب تدارک کرنے کی اب بھی بڑی ضرورت ہے .

باب ۵۶

سماجی ترقی

گذشتہ بیس سال کے اندر آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے بہت سی نئی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں ، کل ہند کی مردم شماری سب سے پہلے سنہ ۱۸۹۱ع میں ہوی تھی ' اس وقت ہند کی کل آبادی اڈھائیس کرور تھی' سنہ ۱۹۴۱ع میں یہ اڑتیس کرور ننوے لاکھ ہوگئی ، اس کے معنی یہ ہوے کہ گذشتہ پچاس سال کے اندر ہند کی آبادی میں دس کرور ننوے لاکھ کا اضافہ ہوا ہے ابتدائی تیس برس میں اس اضافہ کی شرح کچھ زیادہ نہیں تھی کیونکہ اگر ایک طرف آبادی بڑھتی جاتی تھی تو دوسری طرف سے قحط ' گلٹی دار طاعون اور زہریلے بخار کی وجہ سے یہ آبادی گھٹتی بھی جاتی تھی' اسکے متعلق پچھلے ابواب میں کافی بحث کی جاچکی ہے ' سنہ ۱۹۲۱ع کے بعد سے کوئی بڑا قحط نہیں پڑا اور کوئی جان لیوا بیماری نہیں پھیلی ' جس کی وجہ سے سنہ ۱۹۲۱ع اور سنہ ۱۹۳۱ع کے درمیان دس فی صدی اور سنہ ۱۹۳۱ع اور سنہ ۱۹۴۱ع کے درمیان پندرہ فی صدی کا اضافہ ہوا ' ان ملکوں میں ' جہاں زندگی کا معیار نسبۃ بہت بلند ہے' آبادی کے بڑھنے سے کوئی برا اثر نہیں پڑتا ' لیکن ہند میں پہلے ہی سے ایک بڑی آبادی کو کھانے کے لئے کافی غذا ' پہننے کے لئے کپڑا اور رہنے کے لئے مکان میسر نہیں ہے ' اور جب آبادی میں بہت بڑا اضافہ ہوگیا تو ایسی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں جن کا حل کرنا بہت دشوار ہے ' اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں صنعت اور تجارت کو ترقی دیکر بھی ان مشکلات کو دور نہیں کیا جاسکتا ، کیونکہ زاید آبادی کے ایک قلیل حصے کو ان سے روزی مل سکتی ہے ' اگر ہند کی آبادی اسی شرح سے بڑھتی رہے تو زندگی کا موجودہ معیار بھی قایم نہیں رہ سکتا

تا وقتیکہ کثیر مقدار میں غذائی اشیاء کی پیداوار نہ ہو لیکن بظاہر حالات سازگار نہیں معلوم ہوتے ' کیونکہ ہند میں کاشت کے قابل زمینیں کچھ زیادہ نہیں ہیں ' چراگاہوں اور جنگلوں کو کاشت کی زمینوں میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا ، بلکہ اس کے برخلاف ان کے موجودہ رقبہ کو اور بڑھانے کی ضرورت ہے ' پنجاب اور سندھ میں چند بے آب و گیاہ اور چٹیل زمینوں کو آب پاشی کے نئے انتظامات سے سر سبز و شاداب کیا گیا ہے ' مگر دوسرے صوبوں میں اس قسم کی کوشش کے لئے بہت کم گنجایش ہے ' بنگال میں جہاں کی آبادی دس سال کے اندر پانچ کرور سے چھ کرور ہوگئی ہے ' زمینوں کا مسئلہ بہت ہی اہم ہوگیا ہے ' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زمینوں کی پیداوار کو بڑھانے کے لئے بہت کچھ کیا جاچکا ہے اور بہت کچھ کیا جا رہا ہے ' مگر ان رکاوٹوں کی بناء پر جن کی تفصیل کسی پچھلے باب میں دی جاچکی ہے ' پیداوار کو بتدریج ہی بڑھایا جاسکتا ہے ' اس کے علاوہ طبی امداد اور حفظان صحت کی تدابیر سے مہلک بیماریوں پر قابو حاصل کیا جا رہا ہے ' یہ اب تک آبادی کو کم کرنے کا ایک بڑا سبب بنی ہوی تھیں ' ان حالات میں یہ ظاہر ہے کہ ہند میں لوگوں کے معیار زندگی کو بالاتر کرنے کے لئے نہ صرف صنعتی اور زراعتی پیداوار کو بڑھانے کی ضرورت ہے ' بلکہ معاشرتی رسوم و رواج اور عادات و اخلاق کے اندر بھی بڑی تبدیلی کی حاجت ہے ' تاکہ ہند کے اندر پیدایش کی شرح کم ہوجائے ۔

لوگوں کی صحت کو بہتر بنانے کی طرف بہت کچھ توجہ کی جاچکی ہے ' لیکن اس کے نتائج اب بھی اطمینان بخش نہیں ہیں ' اب بھی ایک ہزار میں بائیس بچیس آدمی مرتے اور تقریباً پینتیس بچے پیدا ہوتے ہیں ۔ زندگی کی سہولتوں کے نہ ہونے سے تقریباً آدھی آبادی کی اوسط عمر بیس سال سے بھی کم ہے' چیچک اور ہیضہ کے انسداد کی ایک بڑی حد تک تدبیر کی

جاچکی ہے، لیکن بعض جگہوں پر موسمی بخار مزمن اور مہلک ہوگئے ہیں، میلوں ٹھیلوں کی وجہ سے یہ بیماریاں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھیلتی رہتی ہیں اور چونکہ شہر اور قصبے کسی ترتیب کے بغیر بڑھتے جاتے ہیں اور لوگوں کو کھلی ہوا میسر نہیں آتی اس لئے دق کا مرض بھی بڑھتا جا رہا ہے، رسل و رسایل اور آمدورفت کی کثرت سے دیہات بھی شہروں اور قصبوں کی گندی اور مہلک بیماریوں سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں۔ مذہبی احکام کی بنا پر لوگوں میں صفائی کی جو عادتیں ڈالی گئی ہیں، وہ ان بیماریوں کے بچاو کیلئے کافی نہیں ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ وسیع پیمانہ پر حفظان صحت کی تدابیر اختیار کی جائیں اور لوگوں کو صحت اور تندرستی کے عام اصول کی تعلیم دی جائے، تاکہ وہ نہ صرف بیماریوں کا علاج کرسکیں بلکہ ان کی پہلے ہی سے روک تھام کرسکیں۔

مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ان موجودہ خطرات کا بہت احساس ہوگیا ہے، سنہ ۱۹۱۹ء کے دستور کے بعد صحت عامہ کا شعبہ صوبائی حکومتوں کے ماتحت تھا اور ہر صوبہ میں وزیر صحت حتی المقدور ملک کی عام بیماریوں کے تدارک کرنے کی کوشش کرتے تھے، لیکن اسوقت تک یہ کام وسیع پیمانہ پر انجام نہیں پاسکا جب تک کہ صوبائی حکومتوں کی آمدنی میں اچھا خاصہ اضافہ نہیں ہوگیا، چنانچہ حال ہی میں حفظان صحت کے اداروں کو ترقی دی گئی ہے اور لوگوں میں احتیاطی تدابیر کی اشاعت کی جا رہی ہے، مرکزی حکومت نے بیماریوں کی تحقیقات کیلئے چند ادارے قایم کیے ہیں اور حال ہی میں ایک کمیٹی بنائی ہے تاکہ موجودہ حالات کا ٹھیک جایزہ لیکر آئندہ کے متعلق مفید تجویزیں پیش کرے۔

حفظان صحت کے اصولوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ طبی امداد کے بہم پہنچانے کی بھی کوشش کی جا رہی رہے، طب کے دیسی طریقے اب بھی مقبول ہیں، ان میں اصلاح کرکے اور جدید

اصول کے مطابق ان کو ترقی دی جا رہی ہے ' گذشتہ ایک سو سال کے اندر مغربی طریقہ طب اور جراحی کو بڑا فروغ حاصل ہوا ' اب ہر بڑے شہر میں تربیت یافتہ ڈاکٹروں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے ' مگر غربت اور افلاس کی وجہ سے دیہات میں ڈاکٹروں کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا ہے ' مختلف صوبوں اور ریاستوں میں گشتی شفاخانوں کا تجربہ کیا جا رہا ہے ' اور کئی مقامات پر مستقل ہاسپتال بھی قایم ہیں ' ان تدبیروں سے ملک کی صحت عامہ بلا شبہ ترقی کریگی ' اور مزدوروں کی جسمانی حالت و قوت اور عمر کو بڑھانے میں وہ ضرور مفید ثابت ہونگی .

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ رسل و رسایل کی کثرت سے دیہات قصبوں اور شہروں سے قریب تر ہوگئے ہیں ' ان شہروں میں جہاں کارخانے قایم ہیں ' دیہاتیوں کی آمد و رفت بڑھ گئی ہے ' مختلف اسباب کی بناء پر ان کی ذہنیتیں بھی بدل رہی ہیں ' امداد باہمی کی تحریک کو بڑا فروغ ہوتا جا رہا ہے ' پنجاب کے سپاہی جب پچھلی جنگ عظیم میں فرانس کے کاشتکاروں کا معیار زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تو انہوں نے بھی اپنی زندگی کا معیار بہت کچھ بلند کرلیا ' اور جب اس دوسری جنگ سے بھی سپاہی اور جہازی اپنے گھروں کو لوٹینگے تو ان میں بھی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کا جذبہ کار فرما ہوگا . گذشتہ پچیس سال کی سیاسی تحریکات کا بھی دیہاتیوں پر بڑا اثر پڑا . تعلیم کی بدولت ان کی ذہنیتیں بدلتی جا رہی ہیں اور وہ نئے خیالات اور نئے طریقوں سے آشنا ہوتے جا رہے ہیں ' ایک نسل پہلے تعلیم یافتہ لوگوں اور دیہاتیوں کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل تھی ' مگر اب یہ خلیج پٹتی جا رہی ہے ' اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ چلکر دونوں کے تعلقات بہت خوشگوار ہوجائینگے .

آبادی اور وسعت کے لحاظ سے شہر بھی بہت ترقی کرتے جا رہے ہیں ' کل آبادی کا آٹھواں حصہ شہری زندگی کا عادی

ھوگیا ھے ' بمبئی کے صوبہ میں تو ایک چوتھائی سے زیادہ آبادی شہروں میں رھتی ھے ' صنعت اور تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ قصبات بھی بڑھتے اور پھیلتے جارھے ھیں ' بعض مرکزی شہر تو غیر معمولی طور پر بڑھ گئے ھیں ' گذشتہ دس سال کے اندر کئی شہروں کی آبادی پچاس فیصدی سے زیادہ بڑھ گئی ھے ' گذشتہ مردم شماری کے ناظر (Census Commissioner) کا بیان ھے کہ اپنی تمام خامیوں کے باوجود قصبوں کو بڑی ترقی ھو رھی ھے * اس سے پہلے سنہ ۱۹۳۱ع کی مردم شماری کے ناظر نے کہا تھا † کہ ضرورت سے زیادہ آدمیوں کے آجانے کی وجہ سے بمبئی میں ایک [illegible] زیادہ آبادی کو بڑی تکلیف ھوگئی ھے ' بعض شہروں میں اصلاح و ترقی کے ادارے (Improvement Trust) قائم ھوگئے ھیں ' مگر منظم طریقہ پر کام کرنے اور نگرانی کرنے کی ھر جگہ بڑی ضرورت ھے ' خاصکر ایسی حالت میں جبکہ شہروں اور دیہات پر اثر پڑنے لگا ھے ' حفظان صحت کے عام اصولوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاھئیے ' اس کی بھی بہت ضرورت ھے کہ بڑے اور گنجان شہروں میں کارخانوں کو ترقی دینے کی بجائے مختلف مقامات پر نئے کارخانے ایجاد کئے جائیں ۔

قصبات اور دیہات کے لوگ بھی تعلیم پانے لگے ھیں ' پہلے چند خاص طبقوں کو تعلیم کی طرف توجہ تھی اور اب ھر ایک طبقہ تعلیمی سہولتوں سے فایدہ اٹھا رھا ھے ' سنہ ۱۹۱۹ع کے دستور کے بعد سے صوبائی حکومتیں تعلیم کو پھیلانے کی کوشش کرتی رھی ھیں ' بمبئی ' بنگال ' مدراس اور پنجاب میں قابل قدر کام ھوا ھے ' بہار اور صوبجات متحدہ میں ابھی بہت کچھ کرنا ھے ' تراونکور ' کوچین اور بروڈہ کی ریاستیں ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں برطانوی ھند کے صوبوں سے بھی بازی

* مردم شماری کی روداد سنہ ۱۹۴۱ع جلد اول صفحہ ۲۶

† مردم شماری کی روداد سنہ ۱۹۳۱ع جلد اول صفحہ ۵۲

لے گئی ھیں ، اگرچہ مردوں کے مقابلہ میں تعلیم یافتہ عورتوں کا تناسب کم ھے ، لیکن عورتیں اس میدان میں بہت آگے بڑھتی جا رھی ھیں ، اگر کل ھند کا شمار کیا جاے تو ھر پانچ مردوں میں سے ایک مرد اور بیس عورتوں میں سے ایک عورت کو لکھنا پڑھنا آتا ھے ، قرائن سے اندازہ ھوتا ھے کہ آئندہ چلکر یہ فرق بھی مٹ جائیگا ، ھند کی سماجی ترقی میں یہی ایک چیز زیادہ امید افزا نظر آرھی ھے ۔ ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں پہلے دو زبردست رکاوٹیں تھیں ۔ ایک سرمایہ کا نہ ھونا اور دوسری قابل اور موزوں اساتذہ کا نہ ھونا ۔ لیکن اب ھند کی مرکزی اور صوبائی حکومتیں تعلیم پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کیلئے تیار ھیں ۔ اور دیہات میں خاص طور پر تعلیم یافتہ عورتوں کے ذریعہ یہ امید کی جاسکتی ھے کہ آئندہ اساتذہ کی ایک بڑی تعداد فراھم ھوجائیگی ، دور اندیش مبصرین کی راے یہ ھے کہ اب دیہاتیوں میں وہ پرانی ضد نہیں رھی کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول نہیں بھیجینگے ابتدائی تعلیم کا نصاب تیار کرنے کے وقت دیہاتیوں کی ضروریات کا کوئی خیال نہیں کیا گیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ ان کے بچے پڑھ لکھکر شہری زندگی کے عادی ھوگئے ۔ یہ مسئلہ اب بھی ھماری توجہ کا مستحق ھے ، اور ضرورت ھے کہ گہرے مطالعہ اور مختلف تجربات کے بعد اس کا کوئی مفید حل نکالا جائے ۔

ثانوی تعلیم کی اصلاح میں بھی ماھرین تعلیم کو اسی قسم کی دشواریاں پیش آرھی ھیں ، اس سے پہلے تمام طلبہ کی غرض و غایت یہ تھی کہ ثانوی تعلیم کے بعد یونیورسٹیوں کی سند حاصل کرلیں ، لیکن ان کی ایک بڑی تعداد دونوں مقاصد کے حاصل کرنے میں ناکام رھی ۔ اور جب صنعت اور حرفت اور پیشہ کے علم سے بھی عاری رھے تو محض زبانداني کے ذریعہ معاش کا حاصل کرنا ان کے لئے دشوار ھوگیا ، اور بے روزگاری کا مسئلہ نازک ھوتا چلاگیا ، اور اب جبکہ ملک میں صنعتی

کارخانوں کو فروغ ہو رہا ہے، فنی مہارت رکھنے والے کاریگروں کی بڑی ضرورت ہے تاکہ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچکر ملک کو فائدہ پہنچا سکیں، اسی طرح زمینوں کی پیداوار کو بڑھانے کیلئے جدید اصول کے واقفکاروں کی بڑی ضرورت ہے، صنعت و حرفت اور پیشہ کی تعلیم کا بندوبست کیا جا رہا ہے اور بہت سے ادارے کھولے جا رہے ہیں۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے ان کو ترقی کرنے کا موقعہ مل گیا ہے، کیونکہ وہ نوجوان جو اب جنگی ہتھیاروں اور سامانوں کے بنانے میں مصروف ہیں، آئندہ امن کے زمانہ میں شہریوں اور دیہاتیوں کی ضروریات کا سامان مہیا کرینگے، بہت سے نوجوان برطانوی جزائر میں کام سیکھ کر آئے ہیں، اور یہی لوگ صنعت اور کاریگری میں نئے خیالات اور نئے طریقوں کے جاری کرنے کے باعث ہونگے، اس وقت انجینیرنگ اور دوسری صنعتوں کی اعلی تعلیم کیلئے ملک میں خاطر خواہ آسانیاں فراہم کی جا رہی ہیں - اس کے علاوہ صوبوں اور ریاستوں کی حکومتیں مناسب اور موزوں طالب علموں کو صنعت و حرفت کی تربیت کے لئے یوروپ اور امریکہ بھیجنے کا بندوبست کرتی رہتی ہیں - بہت سے نوجوانوں نے صحیح قسم کی علمی و عملی تربیت پاکر ہند کے صنعتی کارخانوں میں ملازمت حاصل کرلی ہے - اس کی وجہ سے مشرق اور مغرب کی صنعتوں کے سارے امتیازات خود بخود مٹتے چلے جا رہے ہیں۔

گذشتہ پچیس برس کی مدت میں یونیورسٹیوں کا نقطۂ نظر اور انکا ڈھانچہ بہت کچھ بدل گیا ہے، پہلی جنگ عظیم کے دوران میں سر میکائیل سیڈلر Michael Sadler کے تحت ایک کارآزمودہ کمیشن کلکتہ یونیورسٹی کے متعلق تحقیقات کرنے کیلئے مقرر کیا گیا تھا، اس نے ثانوی اور اعلی تعلیم کے متعلق بہت سی مفید اور اہم تجویزیں پیش کیں، اس کی سفارشات کا بہت اچھا نتیجہ نکل رہا ہے، پرانی یونیورسٹیاں نئے انداز پر ڈھل چکی ہیں، اور مختلف صوبوں اور ریاستوں میں جدید

طرز کی نئی یونیورسٹیاں قایم ہوگئی ہیں ' ان یونیورسٹیوں

کے سوا تمام یونیورسٹیوں میں تعلیم دینے کا بھی انتظام کیا گیا ہے ' اور ان میں سے بعض کے ساتھ باقاعدہ کالج ملحق ہیں ' اور بعض کے ساتھ کوئی کالج ملحق نہیں ہے اذکا مقصد یہ ہے کہ طلبہ میں تحقیق اور علم کا سچا ذوق پیدا کیا جاے ' سائنس ' اقتصادیات ' تاریخ ' لسانیات اور دیگر شعبوں میں قابل قدر کام ہو رہا ہے ' یوروپ اور امریکہ کے تعلیمی اداروں سے ان کا گہرا تعلق پیدا ہوگیا ہے ' اور ہندی اہل قلم کی تصنیفات دنیا کے ہر ایک حصہ میں وقعت کی نظر سے دیکھی جا رہی ہیں ' ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں اقتصادیات ہند کے موضوع کے ساتھ ایک گہری دلچسپی پیدا ہوگئی ہے ' اور مختلف مفکرین اہل ہند کی غربت اور افلاس کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ' اکثر طلبہ میں یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ پیداوار کی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی کا معیار بھی بلند ہونا چاھئے ' چنانچہ بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گرام سدھار کی تحریک میں زبردست حصہ لے رہی ہیں .

دوسرے ملکوں کی طرح ہند کی یونیورسٹیوں میں پیشہ کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے ' ہند میں قانون دانی کے پیشہ کو ایک زمانہ سے بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے ' اور بہت سے نوجوانوں نے گرایجویٹ ہونے کے بعد اس فن میں سند حاصل کی ہے ' اب بہت سے نوجوان انجینیرنگ اور دوسرے فنون کی تحصیل کی طرف توجہ کر رہے ہیں ' ہند کے اندر طب اور ڈاکٹری کے بہت سے کالج قایم ہوگئے ہیں ' جہاں جدید قسم کے آلات موجود ہیں ' مگر دیہاتیوں کی ضروریات کا خیال کرتے ابھی بہت سے ایسے کالجوں کے کھولنے کی ضرورت ہے جہاں جراحی تحقیقات کا پورا بندوبست ہو .

اس وقت ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں ثانوی اور اعلی تعلیم کس زبان کے ذریعہ دی جاے ' ایک

نسل پہلے بہت سے اسکولوں اور کالجوں کی تمام درسی کتابیں انگریزی زبان میں تھیں ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک کیلئے انگریزی ایک مشترکہ زبان بن گئی ۔ لیکن ایک نئی زبان کے سیکھنے میں طلبہ کے تخلیقی اور تنقیدی جوہر پورے طور پر کھل نہیں سکتے تھے اسلئے آجکل بہت سے صوبوں میں ثانوی تعلیم مادری زبان میں ہوتی ہے اور انگریزی ثانوی زبان کی حیثیت سے لازمی قرار دی گئی ہے ، مکالے اور بیننگ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ابتدائی تعلیم کے سوائے باقی تمام مرحلوں میں انگریزی ہی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے ، ان کا یہ مقصد آج پورا ہوچکا ہے جب مغربی ممالک کے ساتھ انگریزی کے سیکھنے کی وجہ سے اہل ہند کا گہرا تعلق قایم ہوگیا تو ہماری دیسی زبانوں پر بھی انگریزی ادب کا اثر پڑا ، اور انکے نظم و نثر میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو گیا اور نیز ان میں قابل قدر اور بہترین تاریخی فنی اور سائنٹفک کتابیں لکھی جانے لگیں

اخبارات اور رسایل کی بھی اسی طرح بڑی ترقی ہو رہی ہے ، سارے ملک میں انگریزی اخبارات اور رسایل بڑے ذوق اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں ۔ مگر عوام اور خاص کر دیہات کے وہ لوگ جو انگریزی نہیں جانتے ہیں مادری زبانوں کے بہترین اور عمدہ اخبارات اور رسایل پڑھتے ہیں ۔

ان رسایل کے مضمون نگاروں میں عورتیں بھی شریک ہیں ، آجکل بہت سی لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا رہی ہیں ، ان کی تعداد ہر سال بڑھتی جا رہی ہے ۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جو فنی قابلیت کے لحاظ سے لڑکوں کا مقابلہ کرسکتی ہیں ، ان کی ایک قابل قدر تعداد سائنس اور دوسرے علوم و فنون میں کمال حاصل کر رہی ہے ، پیشوں کی تعلیم کی طرف بھی ان کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے ، ہندی ثقافت کی ترقی میں بھی وہ حصہ لے رہی ہیں ، اس موجودہ دور میں ہند کے فنون لطیفہ کو بڑی ترقی حاصل ہوی ہے اور مصوری ، موسیقی ، ناٹک ، رقص

وسرود وغیرہ میں عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگی ہیں۔

ان فنون لطیفہ کی تحریک کا عورتوں اور لڑکیوں کے سماجی و اخلاقی عادات پر بڑا گہرا اثر پڑ رہا ہے، ان کے ساتھ دلچسپی پیدا ہونے کے بعد عورتیں اور لڑکیاں گھریلو زندگی اور گرھستی کو خیرباد کہہ رہی ہیں، آج سے تیس سال پہلے پردہ کا بڑا سخت رواج تھا اور اب غالباً ایک نسل کے بعد شمالی ہند کے اعلیٰ اور متوسط طبقوں سے بالکل پردہ اٹھ جائیگا، بچپن کی شادی کا رواج بھی کم ہوتا جا رہا ہے، لڑکے اور لڑکیاں زیادہ عمر کو پہنچ کر شادی کرنے لگی ہیں، اور اب تو قانون کے ذریعہ شادی کی عمر لڑکوں کیلئے اٹھارہ اور لڑکی کیلئے چودہ قرار دی گئی ہے، سو سال پہلے ہندو بیواؤں کی شادی کو قانون کے ذریعہ جائز قرار دینا پڑا تھا، اور اب ان کی شادی کا رواج عام ہوگیا ہے، اور کثیر ہندو خاندانوں میں بھی بیواؤں کی شادیاں ہونے لگی ہیں، اگرچہ ہندو اور مسلم قانون کے مطابق ایک سے زیادہ بیویاں کرنا جائز تھا، مگر ان دونوں طبقوں میں بہت کم اس پر عمل ہو رہا تھا، اور اب تو دونوں مذہب کی تعلیم یافتہ عورتیں اس دستور کے بند کرانے کیلئے باقاعدہ جہاد کر رہی ہیں۔

ہند کی عورتیں خود ایک بڑی حد تک اپنی حیثیت کو بلند کرنے کی ذمہ دار ہیں، یہ انقلاب اگرچہ زیادہ تر متوسط طبقہ کی عورتوں میں ہوا ہے، لیکن ان کا اثر قصبوں اور دیہاتوں کے دوسرے غریب طبقوں پر بھی پڑ رہا ہے، اور ان لوگوں کے نظریات بدلتے جا رہے ہیں، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذریعہ آبادی کا مسئلہ بھی ایک بڑی حد تک حل ہوجائیگا کیونکہ بہت سی عورتیں بڑی عمر کو پہنچکر شادیاں کرنے لگی ہیں، اور چونکہ ہر ایک میں زندگی کو بہتر بنانے کی خواہش پیدا ہوگئی ہے، اس لئے اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ آئندہ ولادتوں کی شرح کم ہوجائیگی اور بچے اور زیادہ تندرست اور تنومند ہوتے جائینگے۔

سماجی زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی ایک انقلاب ہو رہا ہے ، ذات پات کی بندھنیں ٹوٹ رہی ہیں ، اب ہر شخص جو پیشہ بھی چاہے اختیار کرسکتا ہے ، دوسرے طبقوں کے ساتھ ملکر کھانے پینے وغیرہ کے متعلق پرانی پابندیاں اٹھتی جا رہی ہیں ، اور بتدریج آئندہ یہ تمام پابندیاں اٹھ جائیں گی ۔ پہلے ہندوؤں کی مختلف ذاتوں کے درمیان آپس میں شادی بیاہ بالکل ممنوع تھا ، لیکن جب سے کہ ہند کی مجلس قانون ساز نے ان کو جائز قرار دیا ہے ، اس قسم کی شادیاں عام ہوتی جا رہی ہیں ۔

یہ سماجی انقلاب پہلی جنگ عظیم کے بعد سے شروع ہوا تھا ، اور اب اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں رفاہ عام کے کاموں میں حصہ لے رہے ہیں ، ہر ملک کے اندر آزادی اور ترقی کا جذبہ کار فرما ہے ، بہت ممکن ہے کہ آئندہ چلکر ہند کی معاشرت میں اس سے زیادہ اہم تبدیلیاں ہوں ۔

تتمہ

کرپس کی تجاویز کے ناکام ہونے کے بعد سیاسی جمود اور تعطل کو توڑنے کی مختلف کوششیں کی گئیں ، اس سلسلہ میں بہت سے ہنگامے ہوئے جن کا اوپر بیان ہوچکا ہے ۔* سنہ ۱۹۴۴ع کے موسم خزاں میں گاندھی جی اور مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کے درمیان کئی دن تک گفت و شنید ہوتی رہی ۔ آخر میں یہ بھی ناکام ہوئی ۔ سنہ ۱۹۴۵ع کی ابتدا میں آزاد خیال جماعت کے لیڈر سر تیج بہادر سپرو کی ماتحت ایک غیر سرکاری جماعت نے دونوں فریقوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی ، آخرکار مارچ کے مہینہ میں وائسرائے ہند لارڈ ویول انگلستان گئے اور برطانوی حکومت کے ساتھ کئی دن تک گفتگو کرتے رہے اور جب وہ جون کے مہینہ میں ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے ایک عارضی تجویز کا اعلان کیا ، اس میں سنہ ۱۹۴۲ع کی کرپس کی قراردادوں کو دھرایا گیا تھا ، اور یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ ہند کے تمام سیاسی رہنما آپس میں ملکر کوئی متفقہ دستور پیش کرینگے ، اور ان سے یہ خواہش کی تھی کہ وہ جاپان کی جنگ جیتنے میں برطانوی حکومت کا ساتھ بٹائیں ، اس مقصد سے انہوں نے حکومت وقت میں حسب ذیل تبدیلیاں تجویز کیں ۔

وائسرائے اور سپہ سالار اعظم کے سوا وائسرائے کی مجلس عاملہ کے تمام اراکین ہندی ہونگے ، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو برابر کی نمائندگی دی جائیگی ، چنانچہ لارڈ ویول نے تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو شملہ میں بلاکر اس تجویز کے متعلق ان سے گفتگو کی ، اور ان سے اپنے نمائندے منتخب کرنے کیلئے کہا ، کانگریس کی مجلس عاملہ کے تمام اراکین کو قید سے رہا کیا ، ان میں سے بعض نے اس کانفرنس میں حصہ لیا ۔

---

* دیکھو صفحہ ٦١٥ اور ٦١٦

اس عارضی تجویز کے لئے پرانے قانون کو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ' خطرناک حالات میں وایسرائے کو اب بھی حق حاصل تھا کہ اپنی مجلس عاملہ کے فیصلہ کو مسترد کردے ' اسی طرح ہند کی ریاستوں کے ساتھ برطانیہ کا براہ راست تعلق اب بھی قایم رہا ' اگر یہ تجویز قبول ہوجاتی تو اس کے یہ معنی تھے کہ تمام بیرونی معاملات وایسرائے کی بجائے کسی ایک ہندی رکن کے ماتحت ہوتے ' اور حکومت ہند غیر ممالک میں اپنے نمائندے بھیج سکتی تھی دوسری نوآبادیات کی طرح ہند میں بھی برطانیہ کا ایک ہائی کمشنر مقرر ہوتا .

اس تجویز کے مطابق ان صوبوں میں جہاں حکومت کی باگ ڈور گورنروں کے ہاتھ میں تھی ' مخلوط وزارتیں قایم ہونے والی تھیں ' اور یہ بھی طے پایا تھا کہ نئی مجلس عاملہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے عام انتخابات کی تاریخ کا فیصلہ کریگی .

اس تجویز کے متعلق خود لارڈ ویول کی یہ رائے تھی کہ یہ نہ صرف ترقی کی طرف ایک قدم لے جاتی ہے بلکہ کئی قدم آگے لا کھڑا کرتی ہے ' لیکن جب مسلم لیگ نے یہ اصرار کیا کہ مجلس عاملہ کے تمام مسلمان ارکان اسی کے نامزد کردہ ہوں تو یہ تجویز مسترد ہوگئی .

اس کے بعد لندن کی وزارت بدل گئی اور مخلوط وزارت کی بجائے مزدوروں کی حکومت قایم ہوگئی ' اور اس نے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ ہند کے سیاسی رہنماؤں کی رائے کے مطابق ہند کے اندر مکمل خود اختیاری حکومت کو جلد از جلد قایم کرنے کی کوشش کی جائے گی ' لارڈ ویول دوبارہ انگلستان گئے اور وہاں کی حکومت سے گفتگو کی ' واپس آنے کے بعد انہوں نے یہ اعلان کیا :—

آئندہ سال کے موسم سرما میں مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کا عام انتخاب ہوگا ' اس کے بعد تمام صوبوں میں وزارتیں بنائی جائینگی ' اور سنہ ۱۹۳۵م کے دستور کی دفعہ ۹۳

پر عملدرآمد بند ہو جائیگا ' برطانوی وزیر اعظم اٹلی کے قول کے مطابق سنہ ۱۹۴۲ م کی کرپس کی تجاویز اب بھی اپنی جگہ پر ہیں ' عام انتخابات کے بعد وایسرائے صوبائی مجالس قانون ساز اور ریاستوں کے نمائندوں سے ملکر اس بات کا فیصلہ کریگا کہ آیا دستور ساز مجلس کی ترتیب ' اس کے اختیارات اور اس کا طریقہ کار کرپس کی قراردادوں کے مطابق ہوگا یا اس کے متعلق کوئی دوسری صورت اختیار کی جائے گی ' برطانوی حکومت ایسی شرطوں پر غور کر رہی ہے جن کے مطابق ہند اور برطانیہ کے درمیان معاہدہ ہوگا اس درمیان میں ہند کی فوری سماجی اور اقتصادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وایسرائے ایک ایسی مجلس عاملہ بنائیگا جس کو ہند کی اہم سیاسی جماعتوں کی تائید حاصل ہوگی ' لیکن صاف طور پر اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ عارضی انتظامات کس طرح عمل میں آئینگے .

لارڈ ویول نے جون کے مہینہ میں جو تجویز پیش کی تھی اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ آئندہ سے ہند کے تمام امور خارجہ ایک ہندی رکن کے ہاتھ میں ہونگے ' چنانچہ حال ہی میں نئے عالمگیر نظام کے متعلق غور و فکر کرنے کیلئے جو کانفرنس سان فرانسسکو میں ہوی ' اس میں خالص باشندگان ہند کی ایک نمائندہ جماعت نے شرکت کی اور اسکی کارروائیوں میں اہم حصہ لیا .

ہم نے چودویں باب میں بیان کیا ہے کہ جاپانی حملے کے بعد برما کی ہندی فوج آسام کی طرف ہٹ گئی تھی ' اور جاپانی آسام میں گھس پڑے تھے ' لیکن اس کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور اب ہند کی فوجوں نے نہ صرف دشمنوں کو آگے بڑھنے سے روکا بلکہ برما کو واپس لینے کی زبردست طیاریاں ہو رہی ہیں ' ہندی فوجوں نے ان لڑائیوں میں وہ بہادری دکھائی ہے کہ جنرل لیس Leese کو بھی ان کی کھلم کھلا تعریف کرنی پڑی ' اطالیہ میں بھی ہندی فوجوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے ' چنانچہ اطالیہ میں لڑنے والی اتحادی فوجوں کے امریکی سپہ سالار اعظم

جنرل مارک کلارک Mark Clark نے ان کی بہادری کا بارہا اعتراف کیا ہے ' یہ بات قابل ذکر ہے کہ کل ایک سو چون اعلیٰ تمغوں میں جن کو وکٹوریہ کراس Victoria Cross کہا جاتا ہے ' تیس تمغے ہندی فوجوں کو ملے ہیں ' ان میں سے صرف تین ہندی فوج کے برطانوی افسروں نے حاصل کئے ہیں ' باقی ہندی سپاہیوں کو ملے ہیں ' حکومت ہند جنگ کے بعد کے فوجی نظم و نسق کی تبدیلیوں پر غور و فکر کر رہی ہے ' اور فوج کے ذمہ دار عہدوں میں زیادہ سے زیادہ باشندگان ہند کی بھرتی کی تجویز سوچ رہی ہے ' اس وقت فوج کے مختلف دستے ہندی سپہ سالاروں کی قیادت میں لڑ رہے ہیں .

وایسرائے کی پیش کی ہوی عارضی تجویز کو قبول کرلینے کے متعلق یہ دلیل دی جاتی ہے کہ سیاسی جمود اور تعطل کی وجہ سے سماجی اور اقتصادی ترقی رک گئی ہے ' اور جنگ کے بعد کی تمام اصلاحات کیلئے عوام کے تعاون کی بڑی سخت ضرورت ہے ' مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور ریاستیں ایک باقاعدہ نظام عمل کے متعلق غور و فکر کررہی ہیں ' اس کیلئے ہند کے میزانیہ میں کثیر رقم کی گنجایش پیدا کی جارہی ہے ' حکومت کے تمام شعبوں کی دوبارہ تنظیم ہورہی ہے اور قابل لوگوں کو مقرر کیا جارہا ہے .

پچپنویں ۵۵ باب میں اس بات کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی کہ سنہ ۱۹۴۲ع کے بنگال کے قحط اور وبا اور دوسرے صوبوں میں غذائی اشیاء کی کمی کے اسباب کے متعلق پوری تحقیقات ہونی چاہئے ' چنانچہ جولائی سنہ ۱۹۴۴ع میں حکومت ہند نے ایک کمیشن مقرر کیا ' جس کے اراکین میں انگریز اور ہندی دونوں شامل تھے ' اس کمیشن نے اپنی طول طویل تحقیقات کے بعد ایک روداد شایع کی ہے ' اس کا اندازہ یہ ہے کہ بنگال کے اندر تقریبا پندرہ لاکھ آدمی اس قحط اور وبا میں مرے ہیں ' اس کی ذمہ داری مرکزی اور صوبائی دونوں

حکومتوں پر عائد ہوتی ہے کیونکہ ان دونوں نے ضروری تدابیر کے اختیار کرنے میں بڑی سہل انگاری سے کام لیا ۔ اور تمام امور پر باقاعدہ نگرانی نہیں رکھی اور کوئی باضابطہ حکمت عملی اختیار نہیں کی ' اس کے متعلق مرکزی اور صوبائی حکومت نے اب تک کوئی صفائی نہیں پیش کی ہے ۔

۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء

LIBRARY

LAL BAHADUR SHASTRI

National Academy of Administration

MUSSOORIE

Accession No.

1. **Books are issued for 15 days only but may have to be recalled earlier if urgently required.**
2. **An over-due charge of 25 Paise per day per volume will be charged.**
3. **Books may be renewed on request, at the discretion of the Librarian.**
4. **Periodicals, Rare and Refrence books may not be issued and may be consulted only in the Library.**
5. **Books lost, defaced or injured in any way shall have to be replaced or its double price shall be paid by the borrower.**

Help to keep this book fresh, clean & moving